www.iqbalkalmati.blogspot.com

تحریکِ آزادئ ہند

اور

مُسلمان

حصّہ اوّل

(مشتمل بر مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اوّل و دوم و مسئلہ قومیت)
مسلمانانِ ہند کی جدید تاریخ پر اسلامی نقطۂ نظر سے نقد و تبصرہ، اور
آزادی کی تحریک میں اُن کے صحیح مقام کی تشریح و توضیح

تالیف: سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب: خورشید احمد

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

مندرجات

مقدمہ ۱۱

حصّہ اوّل

ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ۲۱

تقدیم ۳۳

میرا نقطۂ نظر ۳۴

باب-۱- آنے والا انقلاب اور مسلمان ۳۹

ہندوستان میں اسلام کی گزشتہ تاریخ پر ایک نظر ۴۰

انحطاط کا آغاز اور اس کے ابتدائی آثار ۴۲

انگریزی حکومت کے دور میں مسلمانانِ ہند کی حالت ۴۳

(ا) انگریزی حکومت کی پالیسی ۴۵

(ب) مغربی تعلیم کا اثر ۴۶

(ج) قومی انتشار ۴۸

آنے والے انقلاب کی نوعیت ۴۹

جدید انقلابی دور کی ابتدائی علامتیں ۵۱

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انقلاب کی تیز رفتاری ۵۱

باب ۔۲۔ حالات کا جائزہ اور آئندہ کے امکانات ۵۲

مسلمانوں کی چار بنیادی کمزوریاں ۵۳

(۱) اسلام سے ناواقفیت ۵۴

(۲) قومی انتشار اور بدنظمی ۵۵

(۳) نفس پرستی ۵۶

(۴) منافقت ۵۷

قومی تحریک کی حقیقت ۵۸

قومی تحریک میں شامل ہونے کے نتائج ۶۰

باطل کی جگہ باطل ۶۱

کیا آئینی ضمانتیں اور تحفظات کافی ہو سکتے ہیں؟ ۶۲

عوام کا جمود اور سیاسی جماعتوں کی بے راہ رویاں ۶۴

باب ۔۳۔ ہمارا سیاسی نصب العین ۶۷

ہندوستان میں آزادیٔ مسلم کا کم سے کم مرتبہ ۶۸

کانگریس کے "بنیادی حقوق" ہمارے منتہائے نظر نہیں ہو سکتے ۶۹

مسلمانوں کے لیے صرف ایک راستہ ہے ۷۱

باب ۔۴۔ راہ عمل ۷۳

ہندوستان میں مسلمانوں کی دو حیثیتیں ۷۳

آزادیٔ وطن کے دو راستے ۷۵

(ا) وطن پرستی ۷۶

(ب) مسلمانوں کی آزادی ۷۸

کانگریس کی طرف بلانے والوں کی غلطی ۷۹

چند غور طلب حقائق ۸۱

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسلامی جماعت کو مضبوط بنانے کے لیے ضروری تدابیر ۸۳
ایک غلط فہمی کا ازالہ ۸۵

حصّہ دوم

اصلاح کا راستہ

۸۹
باب ۔ ۵ ۔ مسائل حاضرہ میں قرآن اور اسوۂ رسولؐ کی رہنمائی ۹۱
انتشارِ خیال و تشتّتِ عمل ۹۳
ہدایت صرف کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ میں ہے ۹۴
بعثتِ محمدیؐ کے وقت عرب کی حالت اور حضورؐ کا طریق عمل ۹۵
مسلمانوں کو کس طرح جمع کیا جاسکتا ہے؟ ۹۷
مسلم قوم کس طرح بنائی گئی تھی؟ ۱۰۰
مسلمانوں کی قومی تحریکات کے ناکام ہونے کی وجہ ۱۰۳
اسلامی تنظیم کے اصول ۱۰۴
باب ۔ ۶ ۔ اسلام ——— ایک جامع تہذیب ۱۰۹
دین و دنیا کی علیحدگی کا جاہلی تصوّر اور ہماری قومی سیاست میں اس کے اثرات ۱۰۹
مذہب کا اسلامی تصوّر ۱۱۱
ہماری سیاست میں جاہلی تصوّر کے اثرات ۱۱۵
مسلمانوں کا اصل قومی مسئلہ ۱۲۳
باب ۔ ۷ ۔ شبہات اور جوابات ۱۲۹
ناقابلِ عمل ۱۲۹
جواب ۱۳۰
جنگِ آزادی اور مسلمان ۱۳۴

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جواب ۱۳۵
سیاسی جنگ اور جدید طبقہ ۱۳۶
جواب ۱۳۷
ہندو اور مسلمان ۱۳۸
جواب ۱۳۸
مسلمانوں کی اصل ضرورت ۱۴۰
جواب ۱۴۰
سلطنت در سلطنت ۱۴۲
جواب ۱۴۴
شبہ دارالاسلام ۱۴۴
جواب ۱۴۵
مصالحت کے امکانات ۱۴۷
جواب ۱۴۷
ہندوستان کی سیاسی ترقی ۱۴۸
جواب ۱۴۸
خوف و ہراس ۱۵۰
جواب ۱۵۰

حصہ سوم

کانگریس، متحدہ قومی تحریک اور مسلمان ۱۵۷
تقدیم ۱۵۹
باب ۔ ۸۔ مسلمانوں کی غلط نمائندگی اور اس کے نتائج ۱۶۹
باب ۔ ۹۔ آزادی اور قومی تشخص ۱۸۷

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آزادی کیوں؟ ۱۸۸
آزادی اور قومی وجود ۱۹۴
باب ۔ ۱۰ ۔ قوم پرستوں کے نظریات ۱۹۹
اصول موضوعہ ۲۰۰
اشتراکیت ۲۰۷
اسلامی تہذیب کیا ہے؟ ۲۱۲
نیا حربہ ۲۱۶
باب ۔ ۱۱ ۔ آزادی کی فوج کے مسلمان سپاہی ۲۲۱
باب ۔ ۱۲ ۔ حصولِ آزادی کا طریقہ ۲۴۳
اسلام کے نظامِ اجتماعی پر حملہ ۲۴۳
کانگریس کے طریقِ کار کے نتائج ۲۴۸
باب ۔ ۱۳ ۔ جنگ آزادی کا مطمحِ نظر ۲۵۵
باب ۔ ۱۴ ۔ قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ ۲۶۹
کیا مسلمان اس کو قبول کرسکتے ہیں؟ ۲۶۹
مغرب میں وطنیت کے تجربات ۲۷۲
جمہوریت کے بڑے مرکز ۲۷۷
ہندوستان اور قومی ریاست ۲۷۹
باب ۔ ۱۵ ۔ بُنیادی حقوق ۲۸۹
ا ۔ دَورِ جدید میں حکومت کا دائرۂ عمل ۲۹۱
۲ ۔ بنیادی حقوق کی افادیت ۲۹۴
۳ ۔ کراچی ریزولیوشن کا تجزیہ ۳۰۴

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۔ ۱۶ ۔ متحدہ قومیت اور اسلام ۳۱۱

غیر علمی زاویہ نظر ۳۱۲

اثبات مدعا کے لیے حقائق سے چشم پوشی ۳۱۶

قومیں اوطان سے کہاں بنتی ہیں؟ ۳۱۷

لغت اور قرآن سے غلط استدلال ۳۱۹

ایک اور لفظی مغالطہ ۳۲۱

بناء فاسد علی الفاسد ۳۲۴

افسوسناک بے خبری ۳۲۶

وطنی قومیت کا حقیقی مدعا ۳۲۸

اشتراک لفظی کا فتنہ ۳۳۱

باب ۔ ۱۷ ۔ کیا ہندوستان کی نجات نیشنلزم میں ہے؟ ۳۳۵

نیشنلزم بربنائے مصلحت ۳۳۷

نیشنلزم اور اسلام ۳۴۰

یورپین نیشنلزم کی حقیقت ۳۴۲

مغربی نیشنلزم اور خدائی تعلیم کا بنیادی اختلاف ۳۵۰

مغربی نیشنلزم کا انجام ۳۵۷

دنیا نیشنلزم کی لعنت میں کیوں مبتلا ہے؟ ۳۶۰

نیشنلزم ہندوستان میں ۳۶۲

نیشنلزم کے لوازم ۳۶۲

کیا ہندوستان کی نجات نیشنلزم میں ہے؟ ۳۶۴

ہندوستانی نیشنلزم کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ ۳۶۵

کیا ہندوستان کا کوئی بھی خواہ یہاں نیشنلزم کا خواہشمند ہو سکتا ہے؟ ۳۶۹

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فرنگی لباس ۳۷۱

باب ۔ ۱۸ ۔ اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم ۳۷۹

استدراک ۳۹۱

باب ۔ ۱۹ ۔ جنگِ آزادی کی نوعیت ۳۹۹

۱۔ سوراج ۴۰۱

۲۔ "کامل آزادی" کی اصل حقیقت ۴۰۵

کانگریس کے اصل عزائم ۴۱۰

۳۔ کانگریس اور ہندو مہاسبھا ۴۱۱

۴۔ کانگریس اور انگریزی حکومت ۴۱۵

۵۔ کانگریس کا اصل مقصد ۴۱۶

۶۔ پارٹی سسٹم اور اس کے اثرات ۴۱۷

۷۔ جداگانہ انتخاب ۴۲۰

۸۔ مسلمانوں کی حالت ۴۲۱

۹۔ وردھا اسکیم ۴۲۶

۱۰۔ ودیا مندر تعلیمی اسکیم ۴۲۷

۱۱۔ زبان کا مسئلہ ۴۴۷

استدراک ۴۵۹

باب ۔ ۲۰ ۔ کانگریس اور مسلمان ۴۶۱

غلط فہمی کا ازالہ ۴۶۶

حصہ چہارم

ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کی راہیں ۴۷۳

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

باب۔۱۲۔ مسلمان کیا کریں؟ ——— تین تجاویز ۴۷۵

اصل مسئلہ ۴۷۵

مسلمان ایک قوم ۴۷۸

پہلا خاکہ ۴۸۵

دُوسرا خاکہ ۴۹۱

تیسرا خاکہ ۴۹۲

آخری سوال ۴۹۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از: مرتّب

مسلمان اور غلامی ——— یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ مسلمان کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ غلامی کی فضا میں اپنے دین کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ اسلام پر اسی وقت پوری طرح عمل ہو سکتا ہے جب انسان ساری بندشوں کو توڑ کر صرف خدا کا مطیع ہو جائے۔ اسلام غلبہ اور حکمرانی کے لیے آیا ہے، دوسروں کی چاکری اور باطل نظاموں کے تحت جزوی اصلاحات کے لیے نہیں آیا۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون۔

(الصف: ۹)

وہی ہے ذات باری تعالیٰ جس نے بھیجا اپنا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس دین کو دنیا کے تمام ادیان پر غالب کر دے خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔

اسلام نے مسلمانوں کا مزاج یہ بنایا ہے کہ طاغوت کی حکومت، خواہ وہ کسی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رنگ میں ہو، کھل کر اس کی مخالفت کی جائے۔ اسے کبھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کیا جائے اور خدا کی حاکمیت کو سیاسی حیثیت سے عملاً قائم کرنے اور اس کے قانون کو زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری کرنے کی کوشش کی جائے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں یہی کشمکش اور کوشش نظر آتی ہے۔

برِ صغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے سامنے یہ مسئلہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بہت نمایاں ہو کر اُبھرا۔ سلطنتِ مغلیہ کے ختم ہونے تک صورتِ حال یہ تھی کہ گو مجموعی طور پر ملک کا نظام اجتماعی اسلام کے مطابق نہ تھا لیکن ایک طرف مسلم معاشرہ میں ہماری ثقافت کی روایات بڑی مضبوطی سے جاگزیں تھیں، اور دوسری طرف ساری خرابیوں کے باوجود ملک کا قانون شریعتِ اسلامی پر مبنی تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی کوششوں کا محور مزید اصلاح و تبدیلی اور نظام اجتماعی کے بگاڑ کو دُور کرنا تھا۔ برطانوی سامراج کی آمد نے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو ختم کر دیا اور نئے حکمرانوں کی تمام قوت اسی کام پر صرف ہوئی کہ مسلمانوں کی ملّی زندگی میں نظریاتی نقطۂ نظر سے جو بگاڑ آ چکا تھا اس کو بڑھائیں اور اسے اس کی انتہا تک پہنچا دیں تاکہ مسلمان سیاسی، معاشی، ذہنی، مذہبی، اخلاقی، ثقافتی غرض ہر حیثیت سے غلام بن جائیں اور ان کا جداگانہ وجود باقی نہ رہے۔

مسلمانوں نے اس نئی حیثیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ زندہ رہنا چاہتے تھے لیکن مسلمان کی حیثیت سے، محض ہندوستان میں بسنے والی ایک مخلوق کی حیثیت سے نہیں۔ انہوں نے آزادی کی کوشش کی۔ سید احمد شہیدؒ نے جہاد کا اعلان کیا اور تحریکِ مجاہدین نے آخری دم تک اعدائے اسلام کا مقابلہ کیا۔ فرائضی تحریک نے مشرقی ہند میں جہاد کا علم بلند کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی مسلمانوں ہی کے خون سے سینچی گئی اور اس طرح اپنی تمام خرابیوں اور کمزوریوں کے باوجود مسلمانوں نے اسلام سے اپنی مزاج کا بار بار اظہار کیا کہ وہ غیر اللہ کی غلامی کو قبول نہیں کر سکتا اور طاغوت کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں "سمجھوتہ بندی" کی روش کو خاصی تقویت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی حیثیت ایک ہاری ہوئی فوج کی سی تھی اور جو لوگ ذہناً مغرب سے شکست کھا چکے تھے انہوں نے جدید تہذیب و تمدن سے سمجھوتہ کرنے اور اس کے رنگ میں اپنے کو رنگنے ہی کی روش کی طرف مسلمانوں کو بلایا۔ لیکن بحیثیت مجموعی قوم نے اس راستہ کو اختیار نہ کیا اور پورے معاشرہ میں ایک کشمکش جاری رہی۔ ایک دوسرے گروہ نے نئے تقاضوں اور نئے حالات سے کُلی طور پر صرفِ نظر کیا اور اپنے کو ماضی کے حسین نظاروں میں گم رکھا۔ لیکن یہ روش بھی چلنے والی نہ تھی۔ بیسویں صدی کے شروع ہی سے حالات نے ایک ایسا رُخ اختیار کیا جس میں ملکی معاملات میں مسلمانوں کی شرکت لابدی ہو گئی۔ نئی تحریکات اُبھریں۔ سیاسی اسٹیج پر بڑی گہما گہمی ہوئی۔ پرانی دوستیاں ٹوٹیں اور نئی دشمنیاں پیدا ہوئیں۔ وقتی اور ہنگامی طور پر بڑے بڑے کارنامے بھی انجام دیے گئے۔ لیکن ابھی تک مسلمانوں کے سامنے وہ راہ واضح نہ ہوئی تھی جو ایک طرف انہیں غلامی سے نجات دلاتے اور آزادی کے وسیع میدانوں کو ان کے لیے مسخر کرے، اور دوسری طرف ان کے رشتہ کو ان کے دین اور ان کی ثقافت و تہذیب سے مستحکم تر کرکے ان تاریخی تقاضوں کو بر آنے کا موقع دے جن کے اظہار کے لیے ملتِ اسلامیہ ہند کا اجتماعی ضمیر بے چین تھا۔ سیاست کی زمام کار بڑی حد تک ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جو ملت کے مزاج اور دین کے تقاضوں کا پورا شعور نہیں رکھتے تھے۔ علماء جو ایک مدت سے قوم کی قیادت کر رہے تھے اب آہستہ آہستہ ان میں سے اکثر اس مقام سے ریٹائر ہو رہے تھے اور نئے حالات اور نئے مسائل کے حقیقی فہم کا کوئی ثبوت نہیں فراہم کر رہے تھے۔ اس دو گونہ عدم مطابقت کی وجہ سے قوم کے ہاتھ وہ راہ نہیں آ رہی تھی جسے اس کی روح تلاش کر رہی تھی۔

ان حالات میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے احیائے اسلام کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ ایک طرف موصوف نے ۱۹۳۲ء میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کو عقلی

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دلائل کے ساتھ پیش کیا اور ذہنوں سے شکوک کے اُن کانٹوں کو نکالا جو الحاد، بے دینی اور اشتراکیت کی یلغار نے پیوست کر دیے تھے۔ پھر انہوں نے ان تمدنی، معاشرتی اور معاشی مسائل کا حل بھی اسلام کی روشنی میں بتایا جو سوچنے سمجھنے والے طبقات کو پریشان کیے ہوئے تھے۔ تعمیر افکار کے اس عمل کے ساتھ ساتھ مولانا مودودی صاحب نے ملت کو ان اجتماعی مسائل کا احساس بھی دلایا جن کے زغہ میں وہ گھر گئی تھی، ان خرابیوں کی نشاندہی بھی کی جو اس کی سیاسی جدوجہد کو کمزور تر کر رہی تھیں اور ان خطوط کو بھی واضح کیا جن پر اپنی اجتماعی جدوجہد کو منظم کر کے وہ آزادی اور اسلام دونوں کو حاصل کر سکتی تھی۔ یہ کام ابھی ایک تدریجی رفتار کیساتھ جاری تھا کہ ہندوستان میں یکایک حادثے پر حادثہ پیش آنے لگا۔ ہوا یوں کہ بڑھتا ہوا ہندو قوم پرستی کیطرف منتقل ہونیوالا اقتدار، برطانوی تدریج سے ہندو قوم پرستی کیطرف منتقل ہونیوالا تھا۔ اس پر قیمہ پر مضامین مولانا مودودی صاحب نے ۱۹۳۷ء میں لکھنے شروع کیے اور ۱۹۴۰ء کے آغاز تک ترجمان القرآن میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ اس کے بعد یہی مضامین "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے دو جلدوں میں شائع ہوئے اور اس کتاب کے نو دس ایڈیشن تقسیم ملک سے قبل نکل چکے تھے۔ بلاشبہ اس کتاب نے ایک نسل کو متاثر کیا، متحدہ قومیت کے طلسم کو چاک کیا اور اسلامی قومیت کے احساس کو پختہ کر کے اسے ایک سیاسی نصب العین کی شکل دی۔

(۲)

برطانوی ہند کے مسلمانوں کو انگریز کی غلامی کے دور میں جو سب سے بڑا خطرہ پیش آیا وہ "متحدہ قومیت" کا تھا۔ یہ خطرہ ۱۹۲۵ء میں تحریک خلافت کے غیر مؤثر ہو جانے کے بعد سے شدید تر صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ہر میدان میں شکست پر شکست کھانے سے ان پر شدید مایوسی کا غلبہ تھا۔ کوئی قومی تنظیم باقی نہیں رہی تھی۔ قومی لیڈر ایک ایک کر کے یا تھک گئے تھے، یا اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، اور یا پھر قوم کا اعتماد کھو بیٹھے تھے۔ نت نئے فتنے ابھر رہے تھے اور کوئی نہ تھا جو ان کا مقابلہ کرے۔ ان حالات میں کانگریس نے مسلمانوں کو نرم نوالہ سمجھ کر نگل لینا چاہا اور اس غرض کے لیے متحدہ قومیت کی تحریک کو تیز تر کر دیا۔ علمی میدان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں مغرب کی پوری سیاسی فکر کی بناء پر متحدہ قومیت کے تصور کو پیش کیا جا رہا تھا اور کوئی اس سیلاب کا مقابلہ کرنے والا نہ تھا۔ رابطہ عوام (Mass Contact) کے نام پر مسلمانوں کو ان کی اپنی تنظیمات سے کاٹ کر کانگریس میں ضم کرنے کی سعی بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہی تھی۔ پھر مسلم نام رکھنے والے اہل علم روٹی کے مسئلہ کو سب سے اہم مسئلہ قرار دے کر اشتراکیت کی تبلیغ بالکل کھلے بندوں اور جمعیت العلماء کے اخبارات تک کے ذریعہ کر رہے تھے۔ علماء کا ایک بڑا طبقہ انگریز کی مخالفت میں متحدہ قومیت تک کی تائید پر اتر آیا تھا۔ ان حالات میں صاف نظر آ رہا تھا کہ ملت اسلامیہ ہند کی کشتی ڈانواں ڈول ہے اور اگر حالات کو بدلنے کی فوری کوشش نہ کی گئی تو اس کشتی کو بچانا ممکن نہ رہے گا۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں زیر نظر مضامین لکھے گئے۔ ان میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ کیا ہے، ان کے زوال کے اسباب کیا ہیں، ان کی حقیقی کمزوریاں کیا ہیں، ان کو بے جا استعمال کرنے کی کیا کوششیں ہو رہی ہیں، انہیں کون کون سے خطرات درپیش ہیں اور ان خطرات کا مقابلہ وہ کیوں کر کر سکتے ہیں۔ پھر ان میں کانگریس کی متحدہ قومیت کی تحریک کا پورا پس منظر اور اس میں مسلمانوں کے لیے پوشیدہ خطرات کا مفصل جائزہ ہے۔ یہ وہ پہلی کوشش ہے جس میں متحدہ قومیت پر علمی اور عقلی تنقید کی گئی ہے اور اتنے بلند علمی معیار سے کی گئی ہے کہ آج تک اس کے پائے کی کوئی دوسری چیز ملک کے سامنے نہیں آئی۔ بلاشبہ برصغیر ہند و پاکستان سے شائع ہونے والے بیسویں صدی کے لٹریچر میں متحدہ قومیت کے بارے میں علامہ اقبال اور مولانا مودودی کی تحریرات اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔

پھر مولانا کے ان مضامین کی یہی خصوصیت نہیں ہے کہ اپنے علمی اور منطقی طرز استدلال، تاریخی استشہاد، حسن بیان اور قوت اثر کی بناء پر یہ منفرد ہیں، بلکہ ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ ان کی وجہ سے اسلامی تصور قومیت نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک سیاسی نصب العین کی شکل اختیار کی اور مسلمانوں کے سامنے ایک جداگانہ قوم ہونے اور اپنی جداگانہ قومیت اور تہذیب کو محفوظ رکھنے اور ترقی دینے کے لیے اپنی آزاد مملکت قائم کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اور بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوا۔

تحریک پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر تھی۔ اس تصور کو پیش کرنے، کیسے نکھارنے اور فروغ دینے میں مولانا مودودی صاحب کی تحریرات کا حصّہ کیا تھا، اسے اُس شخص کی زبان سے سُنیئے جو قائدِ اعظم اور خان لیاقت علی خان کا دستِ راست تھا ـــــــ یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری، اُس کی مجلسِ عمل (Committee of Action) اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کے سیکرٹری، جناب ظفر احمد انصاری صاحب۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس موضوع پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے "مسئلہ قومیت" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین لکھا جو اپنے دلائل کی محکمی، زورِ استدلال اور زورِ بیان کے باعث مسلمانوں میں بہت مقبول ہوا اور جس کا چرچا بہت تھوڑے عرصے میں اور بڑی تیزی کے ساتھ مسلمانوں میں ہو گیا۔ اِس اہم بحث کی ضرب متحدہ قومیت کے نظریہ پر پڑی اور مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا احساس بڑی تیزی کے ساتھ پھیلنے لگا۔ قومیت کے مسئلہ پر یہ بحث محض ایک نظری بحث نہ تھی بلکہ اس کی ضرب کانگریس اور جمعیت العلمائے ہند کے پورے موقف پر پڑتی تھی۔ ہندوؤں کی سب سے خطرناک چال یہی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے اُن کی جداگانہ قومیت کا احساس کسی طرح ختم کر کے ان کے ملی وجود کی جڑیں کھوکھلی کر دی جائیں۔ خود مسلم لیگ نے اس بات کی کوشش کی کہ اس بحث کا مذہبی پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تاکہ عوام کانگریس کے کھیل کو سمجھ سکیں اور اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔ [1]"

آگے چل کر مولانا انصاری صاحب پھر لکھتے ہیں:

"دراصل پاکستان کی قرارداد سے پہلے ہی مختلف گوشوں سے "حکومتِ الٰہیہ"، "مسلم ہندوستان" اور "خلافتِ ربانی" وغیرہ کی آوازیں اُٹھنے لگی تھیں۔ علامہ اقبال نے ایک "مسلم ہندوستان" کا تصور پیش کیا تھا ——— مودودی صاحب کے لٹریچر نے حکومتِ الٰہیہ کی آواز بلند کی تھی۔ چوہدری افضل حق نے اسلامی حکومت کا نعرہ بلند کیا تھا۔ مولانا آزاد سبحانی نے خلافتِ ربانی کا تصور پیش کیا تھا۔ جگہ جگہ سے اس آواز کا اُٹھنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مسلمان اپنے مخصوص طرزِ فکر کی حکومت قائم کرنے کی ضرورت پوری شدت سے محسوس کر رہے تھے اور حالات کے تقاضے کے طور پر ان کے عزائم خفتہ اُبھر کر سامنے آ رہے تھے۔ [2]"

علامہ اقبال مرحوم مولانا مودودی کی ان تحریرات سے بے حد متاثر تھے۔ بقول میاں محمد شفیع مدیر اقدام علامہ موصوف "ترجمان القرآن" کے ان مضامین کو پڑھوا کر سنتے تھے۔ انہی سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن چھوڑ کر پنجاب آنے کی دعوت دی اور اسی دعوت پر مولانا ۱۹۳۸ء میں پنجاب آ گئے۔ میاں محمد شفیع صاحب "لاہور کی ڈائری" میں لکھتے ہیں:

---

[1] تحریک پاکستان اور علماء ——— نظریۂ پاکستان نمبر ——— چراغِ راہ، صفحہ ۲۴۲۔

[2] ایضاً صفحہ ۲۴۳۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تو در حقیقت نیشنلسٹ مسلمانوں کی ضد تھے اور میں یہاں پوری ذمّہ داری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میں نے حضرت علامہ اقبال کی زبان سے کم وبیش اس قسم کے الفاظ سُنے تھے کہ "مودودی ان کانگریسی مسلمانوں کی خبر لیں گے"۔ جہاں علامہ اقبال بالکل واضح طور سے آزاد اور مدنی کے نقاد تھے وہاں وہ مولانا کا "ترجمان القرآن" جستہ جستہ مقامات سے پڑھوا کر سُننے کے عادی تھے۔ اور اس امر کے متعلق تو میں سو فی صدی ذمّہ داری سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ علامہ نے مولانا مودودی کو ایک خط کے ذریعے حیدر آباد دکن کے بجائے پنجاب کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی دعوت دی تھی بلکہ وہ خط انہوں نے مجھ سے ہی لکھوایا تھا[۱]"

مارشل لاء حکومت کے قائم کردہ دستوری کمیشن کے مشیر اور کمپنی لاء کمیشن کے صدر سید شریف الدین پیرزادہ صاحب اپنی تازہ ترین کتاب "ارتقائے پاکستان" (Evolution of Pakistan) میں لکھتے ہیں:

"مولانا مودودی نے "ترجمان القرآن" کے ایک سلسلۂ مضامین کے ذریعے جو ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئے، کانگریس کے چہرے سے نقاب اُتاری اور مسلمانوں کو متنبہ کیا۔ موصوف نے برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیا، کانگریس کی لادینیت کی قلعی کھولی اور یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کے مخصوص حالات میں اس کے لیے جمہوریت ناموزوں ہے۔ اس لیے کہ اس میں مسلمانوں کو ایک ووٹ اور ہندوؤں کو چار ووٹ ملیں گے۔

---

[۱] "لاہور کی ڈائری"، ہفت روزہ "اقدام" لاہور۔ ۹ر جون ۶۳ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُنہوں نے ہندوؤں کے قومی استعمار کی بھی مذمت کی اور اس رائے کا اظہار کیا کہ محض مخلوط انتخاب یا اسمبلیوں میں کچھ زیادہ نمائندگی (Weightage) اور ملازمتوں میں ایک شرح کا تعیّن مسلمان قوم کے سیاسی مسائل کا حل نہیں ہے۔ جو تجویز اُنہوں نے پیش کی اس میں تین متبادل صورتوں کی نشاندہی کی گئی تھی[۱]۔"

اِن صورتوں میں آخری صورت تقسیم ملک کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سیّد شریف الدین پیرزادہ صاحب ارتقائے پاکستان کے سلسلہ میں جس نتیجہ پر پہنچے ہیں اس میں اِس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ:

"وہ تجاویز اور مشورے جو سر عبداللہ ہارون، ڈاکٹر لطیف، سر سکندر حیات، "ایک پنجابی"، سیّد ظفر الحسن، ڈاکٹر قادری، مولانا مودودی، چودھری خلیق الزمان وغیرہ نے دیئے، وہ ایک معنی میں پاکستان تک پہنچنے والی سڑک کے سنگہائے میل ہیں[۲]۔"

ہمیں اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے مندرجہ بالا اقتباسات کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن صرف ان لوگوں کی سہولت کے لیے جو اس زمانہ کی پُوری تاریخ سے واقف نہیں ہیں ہم نے یہ چند تائیدی بیانات بھی شامل کر لیے ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" اور "مسئلہ قومیت" نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔

(۳)

قیامِ پاکستان کے لیے مسلم لیگ نے جو جدوجہد کی اس میں مولانا مودودی صاحب نے عملاً جس وجہ سے شرکت نہیں کی وہ مسلم لیگ کے طریقِ کار سے مولانا کا اختلاف

---

[۱] صفحہ ۱۹۰

[۲] صفحہ ۲۵۸۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ:

(۱) اگر ہمارے پیش نظر ایک اسلامی ریاست ہے تو ضروری ہے کہ ہم قوم کو اس مقصد کے حصول کے لیے اخلاقی حیثیت سے بھی تیار کریں۔ صرف سیاسی جنگ اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے علمی، فکری، اخلاقی، تہذیبی، سیاسی، غرض ہر میدان میں کام کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر اس مقصد کا حصول مشکل ہے۔

(ب) تحریک کی ہمہ گیر اور اس کے ہر شعبہ اور سطح کی قیادت کے انتخاب میں پوری احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ اشتراکیوں، ملحدوں اور بے دینوں، جاگیرداروں اور زمین داروں، سب کو بلا سوچے سمجھے ایک ساتھ جمع کر دینے سے جو بھیڑ جمع ہو جاتی ہے وہ کبھی بھی قوم کی رہنمائی صحیح سمت میں نہیں کر سکتی۔ یہ تو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور اپنے اپنے مقاصد کے لیے قوم کو استعمال کرنے کی کوشش کریں گے اور نتیجتہً اصل منزل کھوٹی ہو جائے گی۔

(ج) مسلمانوں کی بنیادی حیثیت ایک اصولی جماعت اور داعی گروہ کی ہے اور کسی قیمت پر بھی یہ حیثیت متاثر نہیں ہونی چاہیے۔

طریق کار کے اختلاف کو مولانا نے صاف طور پر ظاہر کر دیا تھا، چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلسِ عمل کے ایک خط کے جواب میں مولانا نے لکھا تھا:

"آپ حضرات ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ میں اس کام میں کسی قسم کے اختلافات کی وجہ سے حصہ لینا نہیں چاہتا۔ دراصل میری مجبوری یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حصہ لوں تو کس طرح۔ ادھوری تدابیر میرے ذہن کو بالکل اپیل نہیں کرتیں اور ترقیع دوزی (Patch Work) سے ہی مجھ کو کبھی دلچسپی رہی ہے۔ اگر کلی تخریب اور کلی تعمیر پیشِ نظر ہوتی تو میں بدل و جان اس میں ہر خدمت انجام دینے کے لیے تیار تھا۔ میرے لیے یہی مناسب ہے کہ اس باب میں عملاً کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے ایک طالب علم کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرح دیکھتا رہوں کہ سوچنے والے اس جزوی اصلاح و تعمیر کی کیا صورتیں نکالتے ہیں اور کرنے والے اسے عمل میں لا کر کیا نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اگر فی الواقع انہوں نے اس طریقہ سے کوئی بہتر نتیجہ نکال دکھایا تو وہ میرے لیے ایک انکشاف ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کو دیکھ کر میں مسلکِ کلی سے مسلکِ جزئی کی طرف منتقل ہو جاؤں۔"

(ترجمان القرآن۔ جولائی۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء)

اندیشے صحیح ثابت ہوئے

یہ تھا طریقِ کار کے بارے میں مولانا کا اختلاف اور اس کی نوعیت[1]۔ مولانا کی رائے کے بارے میں دو آراء ہو سکتی ہیں، لیکن مستقبل کا مورخ بمشکل ہی اس بات کو نظر انداز کر سکے گا کہ تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان میں اسلامی نظام کو قائم کرنے کی راہ میں جو جو مشکلات پیش آئی ہیں اور آ رہی ہیں اور آزادی کے سولہ سال کے بعد بعد بھی ملک ابھی تک صرف اصولاً ہی ایک اسلامی ریاست ہے، عملاً حقیقی اسلامی ریاست میں تبدیل نہیں ہو سکا ہے، بلکہ اسلامی خطوط پر تبدیل کرنے والوں کو جس طرح جیل، قتل اور پھانسی سے سابقہ پیش آ رہا ہے اُس کا پیشگی شعور مولانا مودودی صاحب کی تحریرات میں صاف پایا جاتا ہے اور آنے والے واقعات نے ان کے اندیشوں کی تکذیب کرنے کے بجائے توثیق کی ہے۔

(۴)

یہ تھے وہ وجوہ جن کی بناء پر مولانا نے عملاً شرکت نہیں کی لیکن علمی طور پر وہ نظریہ پاکستان کی برابر خدمت کرتے رہے۔ اسلام کے نظامِ حیات کے

---

[1] یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۴۶ء میں خود مسلم لیگ کیبنٹ مشن اسکیم کو قبول کر کے عملاً اس بات کے لیے تیار ہو گئی تھی کہ پاکستان کے علاوہ بھی کسی دوسری تجویز پر عمل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس سے پوری مسلمان قوم کے مسئلہ کا حل نکل آئے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خدوخال واضح کرتے رہے اور تصورِ پاکستان کی بھی تائید کرتے رہے۔ جب مسلمانوں کے ایک گروہ نے کہا کہ ہندوستان کی تقسیم اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کو کیسے گوارا کیا جا سکتا ہے تو مولانا مودودی صاحب نے کہا:

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب تک کی تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا۔ اس بت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرہ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔[1]"

جس وقت پاکستان کے مطالبہ کو اسرائیل کے مطالبہ کے مثل قرار دیا گیا تو مولانا مودودی صاحب نے اس کی پُرزور تردید کی اور لکھا:

"میرے نزدیک پاکستان کے مطالبہ پر یہودیوں کے قومی وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی۔ فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے۔ یہودیوں کی اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک واقعی ان کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان کی اصل

---

[1] سیاسی کشمکش حصہ سوم طبع ششم صفحہ ۷۶-۷۷۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک ان کا قومی وطن نہیں ہے اور ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم کو دنیا کے مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں لا بسایا جائے اور اسے بزور ہمارا قومی وطن بنا دیا جائے۔ بخلاف اس کے مطالبہ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے۔ مسلمانوں کا کہنا صرف یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کیساتھ لگے رہنے سے ان کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے ان کو محفوظ رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے "ہندو ہندوستان" اور "مسلم ہندوستان" کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ بالفاظ دیگر مسلمان یہ نہیں کہتے کہ ہمارے لیے ایک قومی وطن بنایا جائے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے اس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

یہ چیز وہی ہے جو آج کل دنیا کی ہر قوم چاہتی ہے۔ ہم اصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مسلط ہو۔ ہمارے نزدیک اصولاً ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ اس لیے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے اگر مسلمان یہ مطالبہ کرتے ہیں، تو جس طرح دوسری قوموں کے معاملہ میں یہ مطالبہ صحیح ہے اسی طرح ان کے معاملہ میں بھی صحیح ہے [۱]۔

---

[۱] ترجمان القرآن - جولائی، اکتوبر ۱۹۴۲ء - و رسائل و مسائل جلد اول، صفحہ ۲۶۰ - ۲۶۱۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ریفرنڈم میں پاکستان کی حمایت

صوبہ سرحد اور سلہٹ کے ریفرنڈم کے موقع پر مولانا مودودی صاحب نے پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے کا مشورہ دیا اور لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کے لیے فرمایا:

"اگر میں صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔ اس لیے کہ جب ہندوستان کی تقسیم ہندو اور مسلم قومیت کی بنیاد پر ہو رہی ہے تو لامحالہ ہر اس علاقے کو جہاں مسلمان قوم کی اکثریت ہو اس تقسیم میں مسلم قومیت ہی کے علاقے کے ساتھ شامل ہونا چاہیے۔"[1]

اسی موقع پر پاکستان کے آئندہ نظام کے سلسلہ میں مولانا نے فرمایا:

"وہ نظام اگر فی الواقع اسلامی ہوا جیسا کہ وعدہ کیا جا رہا ہے تو ہم دل و جان سے اس کے حامی ہوں گے، اور اگر وہ غیر اسلامی نظام ہوا تو ہم اسے تبدیل کر کے اسلامی اصولوں پر ڈھالنے کی جدوجہد اسی طرح کرتے رہیں گے جس طرح موجودہ نظام میں کر رہے ہیں۔"[2]

۹، ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کے کل ہند اجتماع میں، ۳ جون ۱۹۴۷ء کی تجویز تقسیم سے تقریباً ایک ماہ قبل، مولانا مودودی نے خطاب عام کے اختتام پر فرمایا:

"اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا ایک

---

[1] سہ روزہ کوثر۔ مورخہ ۵ جولائی ۱۹۴۷ء، و رسائل و مسائل جلد اول صفحہ ۳۶۲۔

[2] ایضاً صفحہ ۳۶۳۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصّہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے گا اور دوسرا حصّہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہوگا۔ پہلے حصّہ میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عام کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان خدائی دستور و قانون مانتے ہیں۔ غیر مسلم حضرات وہاں ہماری مخالفت کرنے کے بجائے ہمیں کام کرنے کا موقع دیں اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلہ میں یہ خدا پرستانہ خلافت، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہوگی، کہاں تک خود باشندگانِ پاکستان کے لیے اور کہاں تک تمام دنیا کے لیے رحمت و برکت ثابت ہوتی ہے۔[۱]

یہ تھے وہ جذبات جن کا اظہار مولانا مودودی صاحب نے تقسیم سے قبل کیا اور اس طرح علمی حیثیت سے ایک محاذ کو مضبوط تر کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ جن مقامات پر علمی اور عملی تعاون ہو سکتا تھا اس سے کبھی گریز نہیں کیا۔

اسلامی تصورِ قومیت پر ان کے مضامین مسلم لیگ کے حلقوں میں بہت بڑے پیمانے پر استعمال ہوتے رہے اور سب سے بڑھ کر جب یو۔پی مسلم لیگ نے اسلامی نظامِ مملکت کا خاکہ تیار کرنے کے لیے علماء کی ایک کمیٹی بنائی تو مولانا مودودی صاحب نے اس کی رکنیت قبول کی اور اس کام میں پوری دلچسپی لی۔ حال میں وہ مسودہ چھپا ہے جو اس کمیٹی سے وابستہ ایک معاونِ تحقیق مولانا محمد اسحاق سندیلوی نے بطور ابتدائی خاکہ (Working Paper) تیار کیا تھا۔ اس کے پیش لفظ میں مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

---

[۱] جماعت اسلامی کی دعوت، ترجمان القرآن جلد ۲۱ - عدد ۵ صفحہ ۲ - ۲۰۳ -

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"غالباً ۱۹۴۰ء یا شاید اس سے بھی کچھ قبل جب مسلم لیگ کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا، اربابِ لیگ کو خیال پیدا ہوا کہ جس اسلامی حکومت (پاکستان) کے قیام کا مطالبہ شدّ و مد سے کیا جا رہا ہے خود اس کا نظام نامہ یا قانونِ اساسی بھی تو خالص اسلامی بنانا چاہیئے۔ اس غرض سے یو۔پی کی صوبہ مسلم لیگ نے ایک چھوٹی سی مجلس ایسے ارکان کی مقرر کر دی جو اس کے خیال میں شریعت کے ماہرین تھے کہ یہ مجلس ایسا نظام نامہ مرتب کر کے لیگ کے سامنے پیش کرے۔ اس مجلس نظامِ اسلامی کے چار ممبران کے نام تو اچھی طرح یاد ہیں:

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی (۲) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
(۳) مولانا آزاد سُبحانی (۴) عبدالماجد دریابادی[1]"

اس سلسلہ میں قمرالدین خان صاحب ریڈر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کے ایک حالیہ مضمون کا اقتباس بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ موصوف نے لکھا ہے کہ وہ مولانا مودودی صاحب کے ایماء پر ۱۹۴۲ء میں قائد اعظم سے ملے اور

"راجہ آف محمود آباد کی مدد سے گل رعنا (دہلی) میں ہماری ملاقات کا انتظام کیا گیا۔ قائد اعظم پینتالیس منٹ تک بڑے صبر سے میری بات سنتے رہے اور پھر کہا کہ مولانا (مودودی) کی خدمات کو وہ نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کا حصول اُن کی زندگی اور کردار کی تطہیر سے زیادہ فوری اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے کہا کہ جماعت

---

[1] پیش لفظ مولانا دریابادی۔ اسلام کا سیاسی نظام، از مولانا محمد اسحاق سندیلوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور لیگ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جماعت اگر ایک اعلیٰ مقصد کے لیے کام کر رہی ہے تو لیگ اُس فوری حل طلب مسئلے کی طرف متوجہ ہے جسے اگر حل نہ کیا جا سکا تو جماعت کا کام مکمل نہ ہو سکیگا۔ [1]

یہ ہے تحریک پاکستان کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کی اصل پوزیشن۔ افسوس ہے کہ کچھ ناعاقبت اندیش حضرات نے اصل حقائق کو جاننے اور سمجھنے کے بجائے اپنے مخصوص مفادات کی خاطر ان کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔ توقع ہے کہ ہماری مندرجہ بالا گزارشات اصل حقیقت کو واضح کرنے میں مدد دیں گی۔

(۵)

اب آخر میں ہم چند معروضات اس کتاب کے بارے میں بھی پیش کرتے ہیں:

اس کتاب کی تاریخی اہمیت کے بارے میں دو آراء ممکن نہیں۔ لیکن یہ کتاب ایک عرصہ سے ناپید تھی اور تحریک آزادی کے طلباء اور دوسرے عام لوگوں کو اسے حاصل کرنے میں سخت ترین دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ ایک عرصہ سے اس بات کا مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے تاکہ ہمارے ماضی کا یہ آئینہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہم یہ کتاب دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔

پھر تھوڑے دنوں سے مولانا مودودی صاحب پر بے بنیاد الزامات لگانے کی ایک ناپاک مہم جاری ہے۔ ان کی تحریرات کو توڑ مروڑ کر اور سیاق و سباق سے الگ کر کے ان کی طرف ایسی ایسی باتیں منسوب کی جا رہی ہیں جن میں صداقت کا کوئی عنصر نہیں۔ ان تمام اتہامات کا بہترین

---

[1] ہفت روزہ The Quid-e-Azam by - مضمون (Thinker) Reminson [2] بابت ۲۷ دسمبر ۱۹۶۳ء

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جواب یہ کتاب ہے۔ ہم اصل مضامین کو پبلک کے سامنے پیش کر رہے ہیں تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ حق پر کون ہے اور جھوٹی الزام تراشیاں کون کر رہا ہے۔

ہمارا اصل پروگرام تو یہ تھا کہ اشاعت نو کے وقت اس کتاب کو از سرِ نو ایڈٹ کریں گے اور وہ چیزیں اس میں سے حذف کر دیں گے جن کا تعلق محض وقتی چیزوں سے تھا۔ لیکن الزامات کی حالیہ مہم کی وجہ سے ہم نے یہ تبدیلی نہیں کی ہے اور تمام مضامین کو اسی طرح پیش کیا جا رہا ہے جس طرح وہ اوّلاً لکھے گئے تھے۔ البتہ اگر کسی چیز کی وضاحت کی ضرورت محسوس کی گئی ہے تو اس پر مزید حواشی کا اضافہ کر دیا ہے۔

مرتب نے صرف اُن جملوں کو حذف کیا ہے یا ان میں کچھ تبدیلی کی ہے جن کا تعلق اصل مضمون سے نہیں بلکہ کتاب کی موجودہ شکل سے ہے۔ اس پہلو سے چند مقامات پر ایڈیٹنگ کی گئی ہے۔ اسی طرح حصّوں کی تقسیم اور مضامین کی ترتیب بھی جدید ہے۔ اس کتاب میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" حصّہ اوّل اور حصّۂ دوم کے سارے مضامین اور "مسئلہ قومیت" سے تین مضمون شامل کیے گئے ہیں۔ اسی طرح تحریک آزادیٔ ہند کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کے بیشتر مضامین اسی ایک جلد میں آگئے ہیں۔

کتاب کا نام بھی ہم نے نیا رکھا ہے، اور اس کی تین وجوہ ہیں:

اوّلاً "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا عنوان اب ایک حد تک غیر موزوں ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ابتدائی نام میں "موجودہ" سے مراد ۱۹۳۷ء اور ۱۹۲۹ء کے حالات تھے نہ کہ آج کے۔ اس بنا پر ہم نے ضروری سمجھا کہ اس نام کے بجائے دوسرا نام رکھیں تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ پیدا ہو۔

ثانیاً موجودہ مجموعہ میں "مسئلہ قومیت" کے تین مضامین بھی شامل ہیں جو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" میں نہ تھے بلکہ الگ رسالہ کی حیثیت سے چھپے تھے۔

ثالثاً اب کتاب کی مستقل حیثیت کو جس نام سے زیادہ خوبی کے ساتھ ظاہر کیا جا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سکتا ہے اور جو اس کے مندرجات کی بہترین طریقے پر نشاندہی کر سکتا ہے، وہ وہی نام ہے جو ہم نے اب دیا ہے، یعنی "تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان" اس طرح یہ نئی کتاب ہماری تاریخی جدوجہد کے ایک باب کو پیش کرتی ہے اور اس برصغیر کی تاریخ کا طالب علم اس سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب ایک طرف بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرے گی اور دوسری طرف طلباءِ تاریخ کے لیے بڑا قیمتی اور مفید مواد پیش کرے گی۔

خورشید احمد

۱۴ / شعبان ۱۳۸۳ھ (دسمبر ۱۹۶۳ء)

۱۔ نیو کونتس روڈ

کراچی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصّہ اوّل

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

ایک تاریخی جائزہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ مضامین مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ۱۹۳۷ء میں لکھے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمان تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ایک ہاری اور منتشر شدہ فوج کی مانند تھے جس کے باقی ماندہ عناصر کو ہندو سامراج، متحدہ قومیت اور آزادی وطن کے نام پر اچک لینے میں مصروف تھا۔ مسلمانوں پر پراگندگی کی کیفیت طاری تھی اور مستقبل ان کے لیے ایک تاریک اور ہیبت ناک رات کی مانند تھا۔ اس زمانہ میں مولانا مودودی صاحب نے مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لے کر ان کو بتایا کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے کون کون سے مختلف راستے ہیں۔ ان کی اپنی کمزوریاں اور مسائل کیا ہیں اور بحیثیت قوم ان کی راہِ نجات کیا ہے۔ یہ مضامین مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اوّل میں شائع ہو چکے ہیں۔

(مرتب)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تقدیم[1]

آنکھیں بند کر کے چلنا ایک شخص کے لیے جتنا مہلک ہو سکتا ہے، اس سے بہت زیادہ مہلک ایک قوم کے لیے ہوتا ہے۔ آپ کھلے میدان میں بھی بند آنکھوں کے ساتھ چل کر ٹھوکر سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ لیکن سڑک پر جہاں آمد و رفت کا ہجوم ہو اور رہ نوردوں کے درمیان کشمکش ہو رہی ہو، اگر آپ آنکھیں بند کر کے چلیں گے، تو یقیناً آپ کو کسی مہلک حادثہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ایسی ہی حالت ایک قوم کی بھی سمجھ لیجیے۔ معمولی حالات میں جب کہ فضا میں کوئی غیر معمولی ہنگامہ نہ ہو، اس کے لیے آنکھیں بند کر کے چلنا محض نقصان ——— جسمانی نہیں عقل و بصیرت کی آنکھیں ——— اور مضرت کا موجب ہوتا ہے مگر جب کوئی انقلاب درپیش ہو، جب قسمتوں کا فیصلہ ہو رہا ہو، جب زندگی و موت کا مسئلہ سامنے ہو، ایسے وقت میں اگر وہ آنکھیں بند کر کے چلے گی تو اُسے تباہی اور ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد سے کامل پندرہ برس تک مسلمان جس انتشارِ فکر و عمل

---

[1] یہ مضمون رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ میں لکھا گیا۔

میں مبتلا رہے اس کو دیکھ کر دل خون ہوا جاتا تھا، مگر ہمیشہ یہی خیال لب کشائی سے روکتا رہا کہ میدان میں مجھ سے زیادہ علم اور تجربہ اور قوت واثر رکھنے والے موجود ہیں، وہ کبھی نہ کبھی حالات کی اصل خرابی کو محسوس کریں گے، اور اس کو رفع کرنے کے لیے متحد ہو کر وہ تدبیریں اختیار کریں گے، جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کو اختیار کرنی چاہئیں۔ لیکن دن پر دن گزرتے چلے گئے اور یہ اُمید بر نہ آئی، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جو ہندوستانی مسلمان کے لیے قسمت کے فیصلے کا آخری وقت ہے۔ دل کی آنکھوں نے صاف دیکھ لیا کہ اب اگر اس قوم نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو سیدھی ہلاکت کے گڑھے کی طرف جائے گی اور اس کے ساتھ چشم دل ہی نے نہیں، چشم سر نے بھی یہ دیکھا کہ جن کی تدبیر و تدبر پر اس قوم کے مستقبل کا انحصار ہے وہ اب بھی حالات کو اس فراست کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں جسے "فراستِ مومن" کہا گیا ہے، اور اسی کوتاہی کی بنا پر ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کو ان مختلف راستوں کی طرف چلا رہے ہیں جن میں سے کوئی بھی منزلِ نجات کی طرف نہیں جاتا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ضمیر نے آواز دی کہ یہ وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اب دین و ملت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ مسلمانوں کو، ان کے عوام اور خواص، علماء اور زعماء، سب کو ان حقیقی خطرات کی طرف توجہ دلائی جائے، جو مسلم قوم ہونے کی حیثیت سے ہمیں درپیش ہیں، اور اس کے ساتھ انہیں یہ بھی یاد دلایا جائے کہ تمہارے لیے ہدایت کا اصلی سرچشمہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سیرت پاک میں ہے جسے چھوڑ کر محض اپنی فکر و تدبیر پر اعتماد کر لینا ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

میرا نقطۂ نظر

میں نے ان مضامین میں اسلامی ہند کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ حالت پر محض ایک مورخ یا ایک سیاسی آدمی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ ایک خالص تاریخی، یا سیاسی، یا

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

معاشی نقطۂ نظر رکھنے والے آدمی کو میرے بیان سے اختلاف ہو۔ لیکن میں یہ گمان نہیں کرتا کہ جو شخص میری طرح ایک مسلمان کی نظر سے حالات کو دیکھے گا، اسے میرے بیان سے اختلاف ہوگا۔ اسی طرح میں نے ہندوستان کے موجودہ حالات اور ان کی کار فرما قوتوں کا جو تجزیہ کیا ہے، اس میں بھی میرے پیش نظر اسلامی معیارِ تحقیق ہے، اور ان حالات میں مسلمانوں کے اصل قومی مسائل کو سمجھنے اور ان کا حل تلاش کرنے کی جو کوشش میں نے کی ہے، وہ بھی ایک مسلمان کی حیثیت سے کی ہے۔ درحقیقت اس تمام بحث میں میرے مخاطب صرف وہی لوگ ہیں جو اوّل بھی مسلمان ہیں اور آخر بھی مسلمان ہیں اور مسلمان کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو صرف "ہندوستانی" ہیں، یا پہلے "ہندوستانی" اور پھر سب کچھ ہیں، تو ان سے مجھے سروکار ہی نہیں۔ وہ ایک جہاز کے مسافر ہیں، اور میں دوسرے جہاز کا مسافر ہوں۔ ان کی منزلِ مقصود دوسری ہے اور میری منزلِ مقصود دوسری۔ ان کو صرف "ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے سیاسی آزادی اور معاشی استقلال درکار ہے، عام اس سے کہ مسلمان رہیں یا نہ رہیں۔ اور مجھے وہ آزادی درکار ہے جس کے ذریعہ سے میں اپنی زوال پذیر اسلامی طاقت کو سنبھال لوں، اپنی زندگی کے مسائل کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے حل کروں، اور ہندوستان میں "مسلم قوم" کو پھر سے ایک خود مختار قوم دیکھوں۔ ان کے لیے ہندوستان کا سیاسی و معاشی استقلال بجائے خود ایک مقصد ہے اور میرے لیے وہ حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہے، جو اگر حصولِ مقصد میں مددگار نہ ہو تو مجھے بجائے خود اس ذریعہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ پس میرے اور ان کے درمیان مقصدی اختلاف ہے۔ اس لیے ان سے بحث کرنا تو میرے نزدیک محض تضیعِ وقت ہے۔ البتہ جو لوگ اس مقصد میں مجھ سے متفق ہیں ان کو میں دعوت دیتا ہوں کہ وہ ان مضامین کو غور سے ملاحظہ فرمائیں، جو کچھ حق پائیں اسے قبول کریں، اور جس چیز میں غلطی پائیں اس کا غلط ہونا دلیل و حجت سے ثابت کر دیں، تاکہ میں بھی اپنے خیالات کی اصلاح کر دوں۔

میں جانتا ہوں کہ جو لوگ مقصد میں مجھ سے اتفاق رکھتے ہیں ان میں سے

بھی بہت سے حضرات میرے ان خیالات سے متفق نہیں ہیں، جن کا اظہار میں نے اپنے مضامین میں کیا ہے۔ مگر اس قسم کے جن حضرات نے اخبارات میں اور پرائیویٹ خطوط میں میرے مضامین پر تنقیدیں کی ہیں، ان کی تنقیدوں کو دیکھ کر میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا۔ آخر انہیں اختلاف کس چیز سے ہے؟ عموماً ان کی تحریروں کو دیکھ کر تو میں نے یہ اندازہ کیا ہے کہ وہ محض سرسری نظر میں یہ دیکھ کر کہ ایک شخص ان کے طریق کار سے اختلاف کر رہا ہے، پوری طرح اس کے خیالات کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، اور تنقید لکھنی شروع کر دیتے ہیں۔ اکثر حضرات نے میرے اوپر وہ اعتراض کیے ہیں جن کا جواب میں خود ہی اپنے مضامین میں دے چکا ہوں! اس سے معلوم ہوتا کہ اگر انہوں نے ان مضامین کو پڑھا بھی ہے تو دل کے دروازوں کو بند کر کے پڑھا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ یہ طریقہ اہلِ حق کے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہم کوئی مجلسِ مناظرہ تو قائم نہیں کر رہے ہیں جس کا مقصد محض دماغی زور آزمائی ہوتا ہے، اور جس میں ہر فریق پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر کے شریک ہوتا ہے کہ دوسرے کی بات نہ مانے گا، اور اپنی بات پر اڑا رہے گا۔ ہمارا مقصد تو اس ملّت کی حفاظت اور سربلندی ہے، جو ہم میں سے ہر ایک کو یکساں عزیز ہے۔ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر جو شخص کچھ کہہ رہا ہے، اس کی بات کو کھلے دل کیساتھ سُنیئے، پوری طرح سُنیئے، ٹھنڈے دل سے اس پر غور کیجیے، اور یہ فرض نہ کر لیجیے کہ جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے، وہ وحی کے ذریعہ سے نازل ہوا ہے، اس لیے اس کے خلاف جو کچھ بھی کہا جائے وہ بہر حال باطل ہی ہونا چاہیئے۔ وہ غریب آپ سے لڑنے کے لیے نہیں اُٹھا ہے، بلکہ غور و فکر کی دعوت دینے کے لیے اُٹھا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ قدم اُٹھانے سے پہلے اپنی منزلِ مقصود معین کر لیں اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے وہ راستہ معلوم کریں جو یقیناً صحیح ہو، جس کی صحت اتنی ہی یقینی ہو جتنی ہدایت ربانی کی صحت یقینی ہے۔ پس آپ جویائے حق بن کر اس کے معروضات کا مطالعہ کریں اور دوران مطالعہ میں صواب کو خطا سے تمیز کرتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چلے جائیں۔ جو کچھ صواب نظر آئے اسے قبول کرلیں۔ اور جس چیز میں خطا پائیں اس کے متعلق واضح طور پر بتادیں کہ اسے کس بنا پر آپ خطا سمجھتے ہیں۔ آیا وہ کتاب اللہ کے خلاف ہے؟ سُنّتِ رسول اللہ کے خلاف ہے؟ عقل کے خلاف ہے؟ یا کسی اور چیز کیخلاف ہے جو تمیزِ حق و باطل کی معیار ہو؟ اس توضیح سے راقم کو بھی اپنے خیالات پر نظرِ ثانی کرنے کا موقع ملے گا اور نیک نیتی کے ساتھ مباحثہ کرکے ہم سب ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔ یا اگر اختلاف باقی بھی رہا تو کم از کم غلط فہمیاں باقی نہ رہیں گی۔

میں نے اس سلسلہ مضامین میں جو کچھ لکھا ہے اس سے میرا مقصد مسلمانوں کے کسی گروہ کی حمایت کرنا اور کسی دوسرے گروہ کو جمہور مسلمین کے سامنے خطاکار ٹھیرانا نہیں ہے، اس لیے تمام ناظرین سے میری استدعا ہے کہ وہ ان مضامین کو پڑھتے وقت اپنے ذہن کو گروہی تعصبات اور بدگمانی سے محفوظ رکھیں۔ میں گروہ بندی سے ہمیشہ دامن کش رہا ہوں اور مجھے فطرتاً اس چیز سے نفرت ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام گروہ اپنے احزابی تعصبات سے دل کو پاک کرکے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے اپنی قوم کو اور ہندوستان کے موجودہ حالات کو دیکھیں اور اسلامی ذہنیت کیساتھ اپنے لیے راہِ نجات تلاش کریں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ جب ایک نظر اور ایک ہی ذہنیت کے ساتھ مشاہدہ اور تفکر کیا جائے گا، اور نفسانیت کا شیطانی عنصر بیچ میں نہ رہے گا، تو یہ نزاعات جو عین خانہ بربادی کے موقع پر گھر والوں کے درمیان برپا ہیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب

آنے والا انقلاب اور مسلمان

ہندوستان[1] میں تیزی کے ساتھ ایک نیا انقلاب آ رہا ہے جو بلحاظ اپنے اثرات اور اپنے نتائج کے ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بھی زیادہ شدید ہوگا۔ پھر اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر ایک دوسرے انقلاب کا سامان تمام دنیا میں ہو رہا ہے، اور بہت ممکن ہے کہ یہ وسیع تر انقلاب اس برِصغیر پر اثر انداز ہو کر یہاں کے متوقع انقلاب کا رُخ اچانک پھیر دے اور اس کو ہماری توقعات سے بہت زیادہ پُرخطر بنا کر رہے۔

جو لوگ خس و خاشاک کی طرح ہر رَو پر بہنے کے لیے تیار ہیں، اور جن کو خدا نے اتنی سمجھ بوجھ ہی نہیں دی ہے کہ اپنے لیے زندگی کا کوئی راستہ متعین کر سکیں، ان کا ذکر تو قطعاً فضول ہے۔ انہیں غفلت میں پڑا رہنے دیجیے، زمانہ کا سیلاب جس رُخ پر بہے گا وہ آپ سے آپ اسی رُخ پر بہہ جائیں گے۔ اسی طرح اُن لوگوں سے بھی قطع نظر کیجیے جو آنے والی انقلابی قوتوں پر سمجھ بوجھ کر

---

[1] یہ مضمون محرم ۱۳۵۶ھ میں لکھا گیا تھا۔ مرتب

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایمان لاتے ہیں اور بالارادہ اسی رُخ پر جانا چاہتے ہیں جس پر زمانہ کا طوفانی دریا جارہا ہے - اب صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں، جو مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے ہیں، مسلمان مرنا چاہتے ہیں، اور یہ تمنا رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب زندہ رہے اور ہماری آئندہ نسلیں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی راہِ راست پر قائم رہیں - ان لوگوں کے لیے یہ وقت روا روی سے گزار دینے کا نہیں بلکہ گہری سوچ اور غایت درجہ کے غور و فکر کا ہے - وہ اگر اس نازک وقت میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیں گے تو ایک جُرم عظیم کا ارتکاب کریں گے اور اس جُرم کی سزا صرف آخرت ہی میں نہ ملے گی بلکہ اسی دنیا کی زندگی میں ان پر چھا جائے گی - زمانہ کا بے درد ہاتھ ان کی آنکھوں کے سامنے تہذیبِ اسلامی کے ایک ایک نشان کو مٹائے گا اور وہ بے بسی کے ساتھ اس کو دیکھا کریں گے - زمانہ ان کے قومی وجود کو ملیا میٹ کرے گا - ایک ایک کرکے ان امتیازی حدود کو ڈھائے گا جن سے اسلام غیر اسلام سے ممیز ہوتا ہے ہر اس خصوصیت کو فنا کر دے گا جس پر مسلمان دنیا میں فخر کرتا رہا ہے - وہ یہ سب کچھ دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے - ان کی آنکھیں خود اپنے گھروں میں اپنی نوخیز نسلوں کو خدا پرستی سے دور، اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی اخلاق سے عاری دیکھیں گی، اور آنسو تک نہ بہا سکیں گی - ان کی اپنی اولاد اس فوج کی سپاہی بن کر اُٹھے گی جسے اسلام اور اس کی تہذیب کے خلاف صف آرا کیا جائے گا۔ وہ اپنے جگر گوشوں کے ہاتھ سے تیر کھائیں گے اور جواب میں کوئی تیر نہ چلا سکیں گے -

یہ انجام یقینی ہے اگر کام کے وقت کو غفلت میں کھو دیا گیا - انقلاب کا عمل شروع ہو چکا ہے اس کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں، اور اب فکر و عمل کے لیے بہت ہی تھوڑا وقت باقی ہے -

ہندوستان میں اسلام کی گزشتہ تاریخ پر ایک نظر

اسلامی ہند کی تاریخ پر جو لوگ نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے

کہ [...] ے میں اسلامی تہذیب کی بنیاد ابتدا ہی سے کمزور ہے۔ صدرِ اوّل میں اور اس سے متصل بعد کی قرنوں میں اسلامی سیلاب کی جو لہریں ہندوستان تک پہنچیں وہ زیادہ تر خس و خاشاک اور کثافتیں لے کر آئیں۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں ہندوستان دارالاسلام کی آخری سرحدوں پر تھا اور وہ سب لوگ جو اسلام کے مرکزی اقتدار یا اصولی عقیدہ و مسلک کے خلاف بغاوت کرتے تھے، عموماً بھاگ بھاگ کر اسی طرف آجاتے تھے۔ چنانچہ سندھ اور کاٹھیاواڑ اور گجرات وغیرہ ساحلی علاقوں میں جو گمراہیاں آج تک پائی جاتی ہیں وہ اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ اس کے بعد چھٹی صدی ہجری میں جب اصل دھارے نے ہندوستان کی طرف رُخ کیا تو وہ خود عجمی کثافتوں سے بہت کچھ آلودہ ہو چکا تھا۔ امراء میں روحِ جہاد اور علماء میں روحِ اجتہاد سرد ہو چکی تھی۔ ہمارے حکمران زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کو خراج اور توسیعِ مملکت کی فکر تھی۔ اور ہمارے مذہبی پیشواؤں میں اکثریت ان حضرات کی تھی جن کی زندگی کا مقصد حکومت کے مناصب حاصل کرنا اور ہر قیمت پر اپنے مذہبی اقتدار کی حفاظت کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ یہاں صحیح معنوں میں کبھی اسلامی حکومت قائم ہوئی۔ نہ حکومت نے پوری طرح وہ فرائض انجام دیے جو شرعاً اس پر عائد ہوتے تھے، نہ اسلامی علوم کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم ہوا، نہ اشاعتِ اسلام کی کوئی خاص کوشش کی گئی، نہ اسلامی تہذیب کی ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت جیسی ہونی چاہیے ویسی ہو سکی۔ علماء اور صوفیہ کے ایک مختصر گروہ نے بلاشبہ نہایت زریں خدمات انجام دیں اور انہی کی برکت ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں کچھ علمِ دین اور کچھ اتباعِ شریعت پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک قلیل گروہ ایسی حالت میں کیا کر سکتا تھا جب کہ قوم کے عوام جاہل، اور ان کے سردار اپنے فرائض سے غافل ہوں۔

اسلام کی عام کشش سے متاثر ہو کر ہندوستان کے کروڑوں آدمی مسلمان ہوئے، مگر اسلامی اصول پر ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کی اسلامی آبادی کا سوادِ اعظم ان تمام مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم و عقائد

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں گرفتار رہا جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ان میں رائج تھے۔

جو مسلمان باہر سے آئے تھے اُن کی حالت بھی ہندوستانی نومسلموں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔ ان پر عجمیت پہلے ہی غالب ہو چکی تھی۔ نفس پرستی اور عیش پسندی کا گہرا رنگ ان پر چڑھ چکا تھا۔ اسلامی تعلیم و تربیت سے وہ خود پوری طرح بہرہ ور نہ تھے۔ زیادہ تر دُنیا ان کو مطلوب تھی۔ خالص دینی جذبہ ان میں سے بہت کم، بہت ہی کم لوگوں میں تھا۔ وہ یہاں آکر بہت جلدی عام باشندوں میں گھل مِل گئے، کچھ ان کو متاثر کیا، اور کچھ خود ان سے متاثر ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مسلمانوں کا تمدن اسلامیت، عجمیت اور ہندیت کی ایک معجونِ مرکب بن کر رہ گیا۔

عام طور پر جو طرزِ تعلیم یہاں رائج ہوا وہ اسی ڈھنگ کا تھا جسے انگریزوں نے بعد میں اختیار کیا۔ اس کا بنیادی مقصد حکومت کی خدمات کے لیے لوگوں کو تیار کرنا تھا۔ قرآن اور حدیث کے علوم جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد قائم ہے، یہاں کے نظامِ تعلیمی میں بہت ہی کم بار پا سکے۔

طرزِ حکومت بھی قریب قریب اسی ڈھنگ کا رہا جس کی تقلید بعد میں انگریزوں نے کی، بلکہ اپنی قومی تہذیب کی حفاظت اور ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت کا جتنا خیال انگریزوں نے رکھا ہے، اتنا بھی مسلمان حکمرانوں نے نہ رکھا۔ خصوصیت کے ساتھ مغل فرماں رواؤں نے اِس باب میں جس سہل انگاری سے کام لیا ہے اس کی مثال تو شاید کسی حکمران قوم میں نہ مل سکے گی۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کی تعلیم اور سیاست دونوں اپنی قومی تہذیب کی حفاظت سے دست کش ہو جائیں اس کو زوال سے کوئی قوت نہیں بچا سکتی۔

انحطاط کا آغاز اور اس کے ابتدائی آثار

گیارھویں صدی ہجری میں انحطاط اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا۔ مگر عالمگیر کی طاقت ور شخصیت اس کو روکے ہوئے تھی۔ بارھویں صدی کے ابتداء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں جب قصرِ اسلامی کا یہ آخری محافظ دنیا سے رخصت ہوا تو وہ تمام کمزوریاں یکایک نمودار ہو گئیں جو اندر ہی اندر صدیوں سے پرورش پا رہی تھیں۔ تعلیم و تربیت کی خرابی اور قومی اخلاق کے اضمحلال اور نظامِ اجتماعی کے اختلال کا پہلا نتیجہ سیاسی زوال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مسلمانوں کی سیاسی جمعیت کا شیرازہ دفعتہً درہم برہم ہو گیا۔ قومی اور اجتماعی مفاد کا تصور ان کے دماغوں سے نکل گیا! انفرادیت اور خود غرضی پوری طرح ان پر مسلط ہو گئی۔ ان میں ہزاروں ہزار خائن اور غدار پیدا ہوئے جن کا ایمان کسی نہ کسی قیمت پر خریدا جا سکتا تھا اور جو اپنے ذاتی فائدے کے لیے بڑے سے بڑے قومی مفاد کو بے تکلف بیچ سکتے تھے۔ ان میں لاکھوں بندگانِ شکم پیدا ہوئے جن سے ہر دشمنِ اسلام تھوڑی سی رشوت یا حقیر سی تنخواہ دے کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بد سے بدتر خدمت لے سکتا تھا۔ ان کے سوادِ اعظم سے قومی غیرت اور خودداری اس طرح مٹ گئی کہ دلوں میں اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ وہ دشمنوں کی غلامی پر فخر کرنے لگے۔ غیروں کے بخشے ہوئے خطابات اور مناصب میں ان کو عزت محسوس ہونے لگی۔ دین اور ملت کے نام پر جب کبھی ان سے اپیل کی گئی وہ پتھروں سے ٹکرا کر واپس آئی۔ اور جب کبھی کوئی غیرت مند شخص اقتدارِ قومی کے گرتے ہوئے قصر کو سنبھالنے کے لیے اٹھا، اس کا سر خود اس کی اپنی قوم کے بہادروں نے کاٹ کر دشمنوں کے سامنے پیش کر دیا۔

اس طرح ڈیڑھ صدی کے اندر اسلام کا اقتدار ہندوستان کی سرزمین میں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ اور سیاسی اقتدار کے مٹتے ہی یہ قوم افلاس، غلامی، جہالت اور بد اخلاقی میں مبتلا ہو گئی۔

انگریزی حکومت کے دور میں مسلمانانِ ہند کی حالت

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دراصل ایک سیاسی انقلاب کی تکمیل اور ایک دوسرے انقلاب کی تمہید تھا۔ جن کمزوریوں نے مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھینا تھا، وہ سب علیٰ حالہٖ قائم تھیں۔ اور ان پر مزید کمزوریوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کے اندر اسلامی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تہذیب کی بنیاد پہلے سے کمزور تھی۔ اس کمزوری نے جب حکومت کے منصب سے ان کو ہٹا دیا اور افلاس و غلامی کی دوہری مصیبت میں وہ گرفتار ہوئے، تو دوسری اور کمزوریاں رونما ہو گئیں۔

دین اور اخلاق اور تہذیب اور تمدن یہ سب چیزیں بلند تر انسانیت سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان کی قدر و عزت وہی لوگ کر سکتے ہیں جو حیوانیت سے بالاتر ہوں۔ پیٹ اور روٹی اور کپڑا اور آسائش بدن اور لذات نفس وہ چیزیں ہیں جو انسان کی حیوانی ضروریات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور جب انسان مقام حیوانی سے قریب تر ہوتا ہے تو اس کی نگاہ میں یہی چیزیں زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ان کی خاطر بلند تر انسانیت کی ہر متاع گراں مایہ کو نہ صرف قربان کر دیتا ہے۔ بلکہ حیوانی زندگی کی آخری حدوں پر پہنچ کر اس میں یہ احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ میرے لیے کوئی چیز ان چیزوں سے اعلیٰ و ارفع بھی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان جب اپنا سیاسی اقتدار کھو رہا تھا، اس زمانہ میں اس کی انسانیت بالکل فنا نہیں ہوئی تھی، اس لیے وہ پیٹ اور بدن پر انسانیت کی گراں قدر متاعوں کو قربان تو کر رہا تھا، مگر اس کو یہ احساس ضرور تھا کہ یہ متاعیں گراں قدر ہیں، اور کسی نہ کسی طرح ان کی بھی حفاظت کرنی چاہیے۔ لیکن جب وہ سیاسی اقتدار کھو چکا تو افلاس نے پیٹ اور بدن کے سوال کو ضرورت سے زیادہ اہم بنا دیا، اور غلامی نے غیرت اور خودداری کے تمام احساسات کو مٹانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی انسانیت روز بروز پست ہوتی چلی گئی، اور حیوانیت کا اثر بڑھتا اور چڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ابھی ایک صدی بھی پوری نہیں گزری ہے اور حال یہ ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل پہلی نسل سے زیادہ نفس پرست، بندۂ شکم اور آسائش بدن کی غلام بن کر اٹھ رہی ہے۔ ستر برس پہلے وہ مغربی تعلیم کی طرف یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہم صرف اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے ادھر جا رہے ہیں، اپنے دین و اخلاق اور اپنی قومی تہذیب و تمدن کو ہم کھونا نہیں چاہتے۔ اور واقعہ بھی یہ تھا کہ اس وقت تک یہ چیزیں ان کی نگاہ میں کافی اہمیت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رکھتی تھیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، وہ بنیادی کمزوریاں جنہوں نے ان کو حکومت کے منصب سے ہٹایا تھا ان میں پہلے سے موجود تھیں، اور وہ نئی کمزوریاں جو غلامی و افلاس کی حالت میں فطرۃً پیدا ہوتی ہیں، ان کے اندر تیزی سے پیدا ہو رہی تھیں۔ ان دونوں قسم کی کمزوریوں کی بدولت ایک طرف دین و اخلاق کی اہمیت اور قومی تہذیب و تمدن کی قدر و عزت روز بروز ان میں کم ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف خود غرضی و نفسانیت کے روز افزوں غلبہ نے ان کو ہر اس شخص کی غلامی پر آمادہ کر دیا جو ان کو کچھ مال اور جاہ اور اپنے ہم جنسوں میں کچھ سربلندی عطا کر سکتا ہو خواہ ان چیزوں کے بدلہ میں وہ انسانیت کے جس گوہرِ بے بہا کو چاہے خرید لے۔ تیسری طرف انفرادیت اور خود پرستی جو ڈھائی سو برس سے ان کی قومیت کو گھن کی طرح لگی ہوئی ہے، انتہائی حد کو پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی، اور وہ تمام صفات ان سے نکل گئیں جن کی بدولت ایک قوم کے افراد اپنے قومی مفاد کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کی حمایت کے لیے مجتمع ہو سکتے اور مشترک جدوجہد کر سکتے ہیں۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ اس دوسرے انقلاب کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا سکے۔ تاہم مختصراً اس کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کریں گے تاکہ ہندوستان میں اسلام کی موجودہ پوزیشن واضح طور پر سامنے آجائے اور یہ اندازہ کیا جا سکے کہ اب جو تیسرا انقلاب سامنے آرہا ہے، وہ ان حالات میں مسلمانوں پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔

(۱) انگریزی حکومت کی پالیسی

جس روز سے برطانوی سامراج نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے، اسی روز سے اس کی یہ مستقل پالیسی رہی ہے کہ مسلمانوں کا زور توڑا جائے۔ اسی غرض کے لیے مسلمان ریاستوں کو مٹایا گیا اور اس نظامِ عدل و قانون کو بدلا گیا جو صدیوں سے یہاں قائم تھا۔ اسی غرض کے لیے انتظامِ مملکت کے قریب قریب ہر شعبے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں جن کا مآل یہ تھا کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد کر دیا جائے اور ان پر رزق کے دروازے بند کر دیے جائیں۔ چنانچہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے اندر اس پالیسی کے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو قوم کبھی اس ملک کے خزانوں کی مالک تھی وہ اب روٹیوں کو محتاج ہو چکی ہے۔ اس کو معیشت کے ذرائع سے ایک ایک کر کے محروم کر دیا گیا ہے اور اب اس کی ۹۰ فی صدی آبادی غیر مسلم سرمایہ دار کی معاشی غلامی میں مبتلا ہے۔ ساہوکار سے برطانوی سامراج کا مستقل اتحاد ہے اور برطانوی نظام عدالت اس کے لیے وہی خدمت انجام دے رہا ہے جو سود خوار پٹھان کے لیے اس کا ڈنڈا انجام دیتا ہے۔

(ب) مغربی تعلیم کا اثر

سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد مسلمانوں میں جاہ اور عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونے کے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا دروازہ صرف ایک ہی رکھا گیا، اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا۔ روٹی اور عزت کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے۔ وہاں ہاتفِ غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کے لیے نہیں ہے۔ یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نامسلمان بن کر آؤ۔ اپنے دل کو، اپنے دماغ کو، اپنے دین اور اخلاق کو، اپنی تہذیب اور آداب کو، اپنے اصولِ حیات اور طرزِ معاشرت کو، اپنی غیرت اور خودداری کو قربان کرو، تب روٹی کے چند ٹکڑے اور عزت کے چند کھلونے تم کو دیے جائیں گے۔ انہوں نے خیال کیا کہ بہت ہی سستے داموں بہت ہی قیمتی چیز مل رہی ہے۔ بیچو اس کباڑخانے کو۔ یہ چیزیں جو روٹی اور خطاب و منصب جیسی بے بہا چیزوں کے معاوضے میں مانگی جا رہی ہیں، آخر ہیں کس کام کی؟ انہیں تو رہن رکھ کر بنئے سے چار پیسے بھی نہیں مل سکتے۔

مسلمان جب مغربی تعلیم کی طرف گئے تو یہی کچھ سمجھ کر گئے۔ زبانوں نے گو ایسا نہیں کہا، مگر جذبات اور تخیلات تو ایسے ہی کچھ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش ۹۰ فیصدی لوگوں پر اس تعلیم کے وہی اثرات ہوئے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ اسلامی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تعلیم سے وہ قطعی کورے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کو ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اسلامی لٹریچر کی کوئی چیز ان کی نظروں سے نہیں گزرتی۔ وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے اور مسلمان کس کو کہتے ہیں اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہے۔ خواہشاتِ نفس کو انہوں نے اپنا معبود بنا لیا ہے۔ اور یہ معبود اس مغربی تہذیب کی طرف انہیں لیے جا رہا ہے جس نے نفس کی ہر خواہش اور لذتِ نفس کی ہر طلب کو پورا کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ وہ مسلمان ہونے پر نہیں بلکہ ماڈرن ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اہلِ فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔ لباس میں، معاشرت میں، کھانے اور پینے میں، میل جول اور بات چیت میں، حتّٰی کہ اپنے ناموں تک میں وہ ان کا ہو بہو چربہ بن جانا چاہتے ہیں۔ انہیں ہر اس طریقہ سے نفرت ہے جس کا حکم مذہب نے ان کو دیا ہے۔ اور ہر اس کام سے رغبت ہے جس کی طرف مغربی تہذیب انہیں بلاتی ہے۔ نماز پڑھنا ان کے ہاں معیوب ہے، اتنا معیوب کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے ان کی سوسائٹی میں نکو بنایا جاتا ہے اور اگر بنانے کی جرأت نہیں ہوتی تو کم از کم حقارت آمیز حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ آخر یہ کون سی مخلوق ہے جو اب تک خدا کا نام لیے جا رہی ہے۔ بخلاف اس کے سینما جانا ان کے نزدیک نہ صرف مستحسن ہے بلکہ ایک مہذب انسان کے لوازمِ حیات میں سے ہے۔ اور جو شخص اس سے اجتناب کرتا ہے، اس پر حیرت کی جاتی ہے کہ یہ کس قسم کا تاریک خیال مُلّا ہے جو بیسویں صدی کی اس برکتِ عظمٰی سے محروم رہنا چاہتا ہے۔ ان میں اب وہ طبقہ سرعت سے بڑھ رہا ہے جو مذہب اور خدا سے اپنی بیزاری کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا اور صاف کہنے لگا ہے کہ ہمیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ چیز اب تک ہمارے مردوں میں تھی، مگر اب عورتوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔ جو طبقے ہماری سوسائٹی کے پیش رو اور مقتدا ہیں، وہ اپنی عورتوں کو کھینچ کھینچ کر باہر لا رہے ہیں۔ ان کو بھی اسلام اور اس کی تہذیب سے بیگانہ اور مغربی تہذیب اور اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے طور طریقوں اور اس کے تخیلات سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ عورت میں انفعال اور تاثر کا مادّی فطری طور پر مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ جو راستہ مردوں نے ستر برس میں طے کیا ہے، عورتیں اس کو بہت جلد طے کریں گی اور ان کی گودوں میں جو نسلیں پرورش پا کر اٹھیں گی ان میں شاید اسلام کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔

(۳) قومی انتشار

خود غرضی، انفرادیت اور نفس پرستی کے غلبہ کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے قومیت کا احساس مٹتا جا رہا ہے اور ان کی اجتماعی طاقت فنا ہو رہی ہے۔ پندرہ سال سے ان کے اندر سخت انتشار برپا ہے۔ ان کی کوئی قومی پالیسی نہیں، کوئی ایک شخص نہیں جو ان کا لیڈر ہو، کوئی ایک جماعت نہیں جو ان کی نمائندہ ہو، کسی بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی وہ جمع نہیں ہو سکتے، ایک بن سری فوج ہے جو راس کماری سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک ریوڑ ہے جس میں کوئی نظم نہیں۔ ایک بھیڑ ہے جس میں کوئی رابطہ نہیں۔ ہر فرد آپ ہی اپنا لیڈر اور اپنا پیرو ہے۔ انجمنیں اور جمعیتیں ہزاروں ہیں، مگر حال یہ ہے کہ ایک ہی انجمن کے ارکان باہم برسر پیکار ہو جاتے ہیں، اور علانیہ ایک دوسرے کے مقابلہ پر آجاتے ہیں۔ اوّل اوّل ان کو اپنی اُس طاقت کا گھمنڈ تھا جو کبھی ان میں پائی جاتی تھی۔ مگر ہمسایہ قوموں نے دس سال کے اندر ان کو بتا دیا کہ طاقت کس چیز کا نام ہے۔ یہ آپس میں لڑتے رہے، اور وہ منظم ہو گئیں۔ انہوں نے خود اپنے سرداروں میں سے ایک ایک کو کھینچ کر زمین پر گرا دیا، اور اُنہوں نے ایک سردار کی اطاعت کر کے اسے تمام ملک میں بے تاج و تخت کا بادشاہ بنا دیا ــــــ یہ اپنی قوتیں اپنی تخریب میں ضائع کرتے رہے اور وہ حکومت سے پیہم مقابلہ کر کے اپنا زور بڑھاتے رہے ــــــ انہوں نے ملک کے تازہ انتخاباتؔ میں شخصی اغراض کو سامنے رکھا اور بیسیوں پارٹیاں بن کر اسمبلیوں میں پہنچے۔ اُنہوں نے اجتماعی اغراض کو مقدم رکھ کر تمام ملک میں منضبط جدوجہد کی اور ایک مستحکم جمعیت کی شکل میں حکومت کے ایوانوں پر قبضہ

ؔ اشارہ ہے ۱۹۳۷ء کے انتخابات کیطرف جنکی بدولت ہندوستان کے ۸ بڑے صوبوں پر کانگریس کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر لیا۔ ان نتائج کو دیکھ کر مسلمانوں پر اب وہی اثر ہو رہا ہے جو ایک باقاعدہ فوج کو دیکھ کر ایک منتشر انبوہ پر ہوا کرتا ہے۔ ایک منظم جماعت کی کامیابیوں سے وہ مرعوب ہو گئے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت کا اقتدار اب بہت جلد انگریز کے ہاتھ سے منتقل ہو کر اس نئی جماعت کے ہاتھ میں آنے والا ہے۔ لہٰذا اب وہ سمت قبلہ بدلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں، ان کے سجدوں کا رُخ واسٹر نگل لاج سے ہٹ کر آنند بھون کی طرف پھرنے لگا ہے، اور آج نہیں تو کل پھر کر رہے گا۔

آنیوالے انقلاب کی نوعیت

یہ ہے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن۔ اب دیکھئے کہ جو انقلاب آ رہا ہے وہ کس نوعیت کا ہے۔

اب تک ہندوستان کی حکومت ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں رہی ہے جو اس ملک کی آبادی میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے اثرات تو وہ ستے جو آپ اپنے دیکھ لیے۔ اب جو جماعت برسر اقتدار آ رہی ہے، وہ ملک کی آبادی کا سوادِ اعظم ہے۔ گزشتہ ڈھائی سو برس میں مسلمانوں نے جو زنانہ خصوصیات اپنے اندر پیدا کی ہیں، ان کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیجئے کہ ان کو جدید ہندی قومیت میں جذب ہوتے کتنی دیر لگے گی۔

جدید ہندی قومیت کا لیڈر وہ شخص[1] ہے، جو مذہب کا علانیہ مخالف ہے۔ ہر اس قومیت کا دشمن ہے جس کی بنا کسی مذہب پر ہو۔ اس نے اپنی دہریت کو کبھی نہیں چھپایا۔ یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہ کمیونزم پر ایمان رکھتا ہے۔ اس امر کا بھی وہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ میں دل اور دماغ کے اعتبار سے مکمل فرنگی ہوں۔ یہ شخص ہندوستان کی نوجوان نسل کا رہنما ہے، اور اس کے اثر سے وہ جماعت نہ صرف غیر مسلم قوموں میں بلکہ خود مسلمانوں کی نوخیز نسلوں میں بھی روز افزوں تعداد میں پیدا ہو رہی ہے جو

---

[1] اشارہ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف ہے۔ مرتب

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیاسی حیثیت سے ہندوستانی وطن پرست اور اعتقادی حیثیت سے کمیونسٹ اور تہذیبی حیثیت سے مکمل فرنگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ڈھنگ پر جو قومیت تیار ہو رہی ہے اس سے مغلوب اور متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمان کتنی مدت تک اپنی قومی تہذیب کے باقی ماندہ آثار کو زندہ رکھ سکیں گے۔

مسلمانوں کے انتشار اور بدنظمی کو دیکھ کر اب ان کے مستقل قومی وجود کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا جا رہا ہے۔ جن لوگوں کی عمریں عوام کی رہنمائی اور اقوام کی نبض شناسی میں گزری ہیں ان سے یہ راز کب تک چھپا رہ سکتا تھا کہ اس قوم کا شیرازۂ قومیت بڑی حد تک بکھر چکا ہے، وہ خصوصیات اس سے فنا ہو رہی ہیں جو کسی جماعت کو ایک قوم بناتی ہیں اور اب اس کے افراد کسی دوسری قومیت میں جذب ہونے کے لیے کافی حد تک مستعد ہو چکے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی بنا پر اب یہ اسکیم بنائی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کرنے کے بجائے ان کے افراد کو خطاب کیا جائے اور ان کو جدا جدا اکائیوں کی شکل میں رفتہ رفتہ اپنی طرف کھینچا جائے[1]۔ یہ کس چیز کی تمہید ہے؟ جس شخص کو اللہ نے تھوڑی سی بصیرت بھی عطا کی ہے وہ اس کو سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ مسلمان انگریزی اقتدار کے زمانہ میں جس کیرکٹر کا اظہار کرتے رہے ہیں اس کو سامنے رکھ کر غور کیجیے، کیا اسمبلیوں کی نشستوں اور آئندہ معاشی اور سیاسی فائدوں کا لالچ ان کے افراد کو فوج در فوج اس طرف کھینچ کر نہ لے جائے گا جس طرف انہیں کھینچا جا رہا ہے؟ اور کیا یہ وہی سب کچھ نہ کریں گے جو انگریزی اقتدار کی غلامی میں کر چکے ہیں؟

مسلمانوں کی اصلی کمزوری کو تاڑ لیا گیا ہے۔ آپ نے سُنا کہ انہیں کھینچنے کے لیے جو صدا بلند کی جا رہی ہے وہ کون سی صدا ہے؟ وہی پیٹ اور روٹی کی ذلیل صدا جو ہمیشہ خود غرض اور شکم پرست حیوانات کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہے۔ ان سے کہا جا رہا

---

[1] کانگریس نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بعد اس پالیسی پر خصوصیت سے عمل کیا تھا۔ مرتب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ تہذیب کیا بلا ہے؟[1] اور تمہاری تہذیب کی خصوصیت بجز پاجامے اور ڈاڑھی اور لوٹے کے اور ہے ہی کیا؟ اس میں آخر کون سی اہمیت ہے؟ اصل سوال تو پیٹ کا سوال ہے، اسی سوال کو حل کرنے کے لیے ہم اُٹھے ہیں۔ اب اگر دہریت اور کمیونزم کا زہر بھی تھوڑا تھوڑا ہر نوالے کے ساتھ پیٹ میں اُتر جائے تو اس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ جو قوم اس سے پہلے انہی نوالوں کے ساتھ الحاد اور فرنگیت کا زہر بھی اُتار چکی ہے، اس کے حلق میں ویسی ہی چند اور چٹنیاں کیوں پھنسنے لگیں۔

جدید انقلابی دور کی ابتدائی علامتیں

اس نوعیت کا ہے وہ انقلاب جو اب آرہا ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس انقلاب کے دامن سے وابستہ ہیں، ان کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی صورتیں، ان کے لباس، ان کی بات چیت، ان کی چال ڈھال، ان کے آداب و اطوار، ان کے خیالات سب کچھ ہمارے سامنے اس مسلمان کا نمونہ پیش کر رہے ہیں جو اس آنے والے انقلاب میں پیدا ہوگا۔ ہم ابھی سے دیکھ رہے ہیں کہ مسٹروں کے بجائے شریمت اور مسوں کے بجائے شریمتیاں ہمارے ہاں پیدا ہونے لگی ہیں۔ گڈ مارننگ کی جگہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا جانے لگا ہے۔ ہیٹ کی جگہ گاندھی کیپ لے رہی ہے، اور بعض علمائے دین فتویٰ دے رہے ہیں کہ یہ تشبّہ کی تعریف سے خارج ہے۔ غرض دماغ اور دل اور جسم سب اپنا رنگ بدل رہے ہیں، اور کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ[2] کی لعنت جو ان پر ستر سال پہلے نازل ہوئی تھی اب ایک دوسری شکل اختیار کر رہی ہے۔

انقلاب کی تیز رفتاری

دنیا میں انقلاب کی رفتار بہت تیز ہے اور روز بروز تیز ہوتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے

۱؎ پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے ہندو اہل قلم نے یہ اعتراضات کیے تھے۔ ان کا جواب اس کتاب میں آگے آئے گا۔ مرتب

۲؎ ترجمہ:۔ ہو جاؤ بندر ذلیل و خوار (البقرہ ۶۵)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو تغیرات صدیوں میں ہوا کرتے تھے ۔ اب وہ برسوں میں ہو رہے ہیں ۔ پہلے انقلاب بیل گاڑیوں اور گھوڑوں پر سفر کیا کرتا تھا ۔ اب ریل اور تار اور انتہائی اسپیڈ پر حرکت کر رہا ہے ۔ آج وہ حالت ہے کہ

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اگر ہندوستان کے باہر کوئی اچانک واقعہ بھی پیش آیا تب بھی اس متوقع انقلاب کے رونما ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگے گی ۔ اور کوئی عالمگیر جنگ چھڑ گئی جو تلوار کی طرح دنیا کے سر پر لٹک رہی ہے ۔ تو غالباً فیصلہ کا وقت اور بھی زیادہ قریب آ جائے گا ۔

باب ۲

حالات کا جائزہ اور آئندہ کے امکانات

پچھلے باب میں ہم نے محض سرسری طور پر مسلمانوں کو اُس انقلاب سے آگاہ کیا تھا جو عنقریب ہندوستان میں رونما ہونے والا ہے اور جس کے آثار اب پوری طرح نمایاں ہو چکے ہیں ——— ہمارا اصل مقصد مسلمانوں کو اس آنے والے انقلاب میں اپنے قومی تشخص اور اپنی تہذیب کی حفاظت کے لیے تیار کرنا ہے۔ مگر یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی موجودہ پوزیشن اور اس جدید انقلاب کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں، اور یہ نہ جان لیں کہ اس پوزیشن میں اس نوعیت کا انقلاب ان کی قومی تہذیب پر کس طرح اثر انداز ہوگا اور اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی چار بنیادی کمزوریاں

پچھلی صحبت میں ہم مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن پر جو سرسری تبصرہ کر چکے ہیں اس سے آپ نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ اجتماعی حیثیت سے اس وقت مسلمانوں میں کس قسم کی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن آگے جو کچھ ہم کو کہنا ہے اس کو پوری طرح

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ واضح طور پر اُن چار اہم ترین کمزوریوں سے واقف ہو جائیں جو مسلمانوں کی قومی طاقت کو گھن کی طرح کھا گئی ہیں اور درحقیقت انہی کی وجہ سے یہ سوال پیدا بھی ہوا ہے کہ آئندہ اس انقلاب میں کیا مسلمان اپنی اسلامی تہذیب کی حفاظت کر سکیں گے۔ ورنہ اگر یہ کمزوریاں نہ ہوتیں تو کسی مسلمان کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

(۱) اسلام سے ناواقفیت

مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کا سوادِ اعظم اسلامی تہذیب اور اس کی اسلامی خصوصیات سے ناواقف ہے، حتیٰ کہ اس میں ان حدود کا شعور تک باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کو غیر اسلام سے ممیز کرتی ہیں۔ اسلامی تعلیم، اسلامی تربیت اور جماعت کا ڈسپلن تقریباً مفقود ہو چکا ہے، ان کے افراد منتشر طور پر ہر قسم کے بیرونی اثرات کو قبول کر رہے ہیں، اور جماعت اپنی کمزوری کی بنا پر بتدریج ان اثرات کو اپنے اندر جذب کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کا قومی کیرکٹر اب مردانہ کیرکٹر نہیں رہا بلکہ زنانہ کیرکٹر بن گیا ہے جس کی نمایاں خصوصیت تاثر اور انفعال ہے۔ ہر اٹھا ہوا فتنہ ان کے خیالات کو بدل سکتا ہے، ان کے عقائد کو پھیر سکتا ہے، ان کی ذہنیت کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے، ان کی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ سکتا ہے، ان کے اصولِ حیات میں اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔ اوّل تو وہ اتنا علم ہی نہیں رکھتے کہ یہ امتیاز کر سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کس خیال اور کس عملی طریقے کو قبول کر سکتے ہیں اور کس کو قبول نہیں کر سکتے۔ دوسرے ان کی قومی تربیت اتنی ناقص ہے کہ ان کے اندر کوئی اخلاقی طاقت ہی باقی نہیں رہی۔ جب کوئی چیز قوت کے ساتھ آتی اور گرد و پیش میں پھیل جاتی ہے، تو خواہ وہ کتنی ہی غیر اسلامی ہو، یہ اس کی گرفت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اور غیر اسلامی جاننے کے باوجود طوعاً و کرہاً اس کے آگے سپر ڈال ہی دیتے ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ نظامِ جماعت حد سے زیادہ مختل ہو چکا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں اتنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قوت ہی نہیں رہی کہ وہ اپنے افراد کو حدودِ اسلامی کے باہر قدم رکھنے سے باز رکھ سکے، یا اپنے دائرے میں غیر اسلامی خیالات اور طریقوں کی اشاعت کو روک سکے۔ افراد کو قابو میں رکھنا تو درکنار ہماری سوسائٹی تو اب افراد کے پیچھے چل رہی ہے۔ پہلے چند سرکش افراد اسلامی قانون کے خلاف بغاوت کرتے ہیں، سوسائٹی چند روز اس پر ناک بھوں چڑھاتی ہے، پھر دیکھتے دیکھتے وہی بغاوت ساری قوم میں پھیل جاتی ہے۔

(۲) قومی انتشار اور بدنظمی

انفرادیت اور لامرکزیت کی روز افزوں ترقی نے مسلمانوں کے شیرازۂ قومیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اور اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت اب ان میں نہیں پائی جاتی۔ شخصی اغراض اور ذاتی مفاد کی بنا پر جماعتیں بنتی ہیں اور پھر خود غرضی کی چٹان ہی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ کوئی بڑی سے بڑی قومی مصیبت بھی آج مسلمانوں کے رہنماؤں اور ان کے قومی کارکنوں کو اتحادِ عمل اور مخلصانہ و بے غرضانہ عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد سے مسلسل مصیبتیں مسلمانوں پر نازل ہوئیں۔ پیہم خطرات ان کے سامنے آئے۔ مگر کوئی ایک چیز بھی ان کو اشتراکِ عمل کے لیے جمع نہ کر سکی۔ تازہ ترین واقعہ مسجد شہید گنج کا ہے جس نے اس قوم کی کمزوریِ کارانا پیوں سے زیادہ عیزوں پر فاش کر دیا۔ ان کے اندر اتنی زندگی تو ضرور باقی ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو تڑپ اٹھتے ہیں۔ مگر وہ اخلاقی اوصاف باقی نہیں ہیں جن کی بدولت یہ قومی مفاد کی حفاظت کے لیے اجتماعی کوشش کر سکیں۔ ان میں اتنی تمیز نہیں کہ صحیح رہنما کا انتخاب کر سکیں۔ ان میں اطاعت کا مادہ نہیں کہ کسی کو رہنما تسلیم کرنے کے بعد اس کی بات کو مانیں اور اس کی ہدایت پر چلیں۔ ان میں اتنا ایثار نہیں کہ کسی بڑے مقصد کے لیے اپنے ذاتی مفاد، اپنی ذاتی راحت، اپنی آسائش، اپنے مال اور اپنی جان کی قربانی کسی حد تک بھی گوارا کر سکیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

(۴) نفس پرستی

افلاس، جہالت اور غلامی نے ہمارے افراد کو بے غیرت اور بندۂ نفس بنا دیا ہے۔ وہ روٹی اور عزت کے بھوکے ہو رہے ہیں۔ ان کا حال یہ ہو گیا ہے کہ جہاں کسی نے روٹی کے چند ٹکڑے اور نام ونمود کے چند کھلونے پھینکے، یہ کتوں کی طرح ان کی طرف لپکتے ہیں، اور ان کے معاوضے میں اپنے دین و ایمان، اپنے ضمیر، اپنی غیرت و شرافت، اپنی قوم و ملت کیخلاف کوئی خدمت بجالانے میں ان کو باک نہیں ہوتا۔ مسلمان کا ایمان جو کبھی سارے جہان کی دولت سے بھی زیادہ قیمتی تھا آج اتنا سستا ہو گیا ہے کہ ایک حقیر سی تنخواہ اسے خرید سکتی ہے، ایک ادنیٰ درجہ کی کرسی پر وہ قربان ہو سکتا ہے، ایک آبرو باختہ عورت کے قدموں پر وہ نثار کیا جا سکتا ہے، ایک خطاب یا ذرا سی شہرت عطا کر کے یا دو چار جے کے نعرے لگا کر اس کو خرید لیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ سو برس کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں نے جو کچھ کرنا چاہا، اس کے لیے خود مسلمانوں ہی کی جماعت سے ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں خائن اور غدار ان کو مل گئے، جنہوں نے تقریر سے، تحریر سے، ہاتھ اور پاؤں سے، حتیٰ کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور قوم کے مقابلہ میں دشمنوں کی خدمت کی۔ یہ ناپاک اور ذلیل ترین وصف جب ہمارے افراد میں موجود ہے تو جس طرح چھ ہزار میل دور کے رہنے والوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، اسی طرح ہم سے ایک دیوار بیچ رہنے والے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اگر ہماری فاش گوئی کسی کو بری نہ معلوم ہو تو ہم صاف کہہ دیں کہ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ پرانی مارکیٹ میں جب سے سرد بازاری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں، نئی مارکیٹ میں ایمان کی خرید و فروخت کا بیوپار بڑھ رہا ہے۔ ہمارے کان خود اپنی قوم کے لوگوں کی زبان سے جب کمیونزم کا پروپیگنڈا سنتے ہیں، متحدہ ہندی قومیت میں جذب ہو جانے کی دعوت سنتے ہیں، اور یہ آوازیں سنتے ہیں کہ اسلامی کلچر کوئی جداگانہ کلچر نہیں ہے تو ہمارا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حافظہ ہم کو یاد دلاتا ہے کہ کچھ اسی نوعیت کی آوازیں اُس وقت بھی بلند ہونی شروع ہوئی تھیں، جب سرکارِ برطانیہ کی غلامی کا آہنی پھندا ہمارے گلوں میں پڑ رہا تھا۔

(۴) منافقت

ہماری قوم میں منافقین کی ایک بڑی جماعت شامل ہے، اور اس کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے کہ بکثرت اشخاص، تعلیم یافتہ، صاحبِ قلم، صاحبِ زبان، صاحبِ مال و زر، صاحبِ اثر اشخاص ایسے ہیں جو دل سے اسلام اور اس کی تعلیمات پر یقین نہیں رکھتے، مگر نفاق اور قطعی بے ایمانی کی راہ سے مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہیں۔ یہ اسلام سے عقیدۃً اور عملاً نکل چکے ہیں، مگر اس سے برأت کا صریح اعلان نہیں کرتے، اس لیے مسلمان ان کے ناموں سے دھوکا کھا کر انہیں اپنی قوم کا آدمی سمجھتے ہیں، ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں، ان سے معاشرت کے تعلقات رکھتے ہیں، اور ان زہریلے جانوروں کو اپنی جماعت میں چل پھر کر اور رہ بس کر زہر پھیلانے کا موقع دے رہے ہیں۔ نفاق کا خطرہ ہر زمانے میں مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ رہا ہے مگر اس نازک زمانہ میں تو یہ ہمارے لیے پیامِ موت ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھیے کہ یہ منافقین کیسا مہلک زہر ہماری قوم میں پھیلا رہے ہیں۔ یہ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس کی اساسی تعلیمات پر حملے کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو دہریت اور الحاد کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ان میں بے دینی اور بے حیائی اور قانونِ اسلامی کی خلاف ورزی کو نہ صرف عملاً پھیلاتے ہیں بلکہ کھلم کھلا زبان و قلم سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔[۱] ان کی تہذیب کو مٹانے کی ہر کوشش میں آپ دیکھیں گے کہ یہ دشمنوں سے چار قدم آگے ہیں۔ ہر وہ اسکیم جو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے لیے کہیں سے نکلی ہو اس کو مسلمانوں کی جماعت میں نافذ کرنے کی خدمت یہی ناپاک گروہ اپنے ذمہ لیتا ہے اور اسلامی قومیت کا ایک جز ہونے کی وجہ سے اس کو اپنا کام کرنے کا خوب موقع مل جاتا ہے۔

۱؎ بلکہ اب تو بہت سے مسلمانوں کے رہنما اور اسلامی تہذیب کے محافظ بھی ایسے ہی ہو گئے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

یہ حالت ہے اس وقت ہماری قوم کی، اور اس حالت میں یہ ایک بڑے انقلاب کے سرے پر کھڑی ہے۔ انقلاب کی فطرت بحرانی اور طوفانی فطرت ہوتی ہے۔ وہ جب آتا ہے تو آندھی اور سیلاب کی طرح آتا ہے۔ اس کے زور کا مقابلہ اگر کچھ کر سکتی ہیں تو مضبوط جمی ہوئی چٹانیں ہی کر سکتی ہیں۔ بوسیدہ عمارتیں جو اپنی جڑ چھوڑ کر محض فضا کے سکون و جمود کی بدولت کھڑی ہوں، ان کا کسی انقلابی طوفان میں ٹھیرنا غیر ممکن ہے۔ اب جو کوئی صاحب بصیرت انسان اس وقت مسلمانوں کی حالت پر نگاہ ڈالے گا، وہ بیک نظر معلوم کرے گا کہ ان کمزوریوں کے ساتھ یہ قوم ہرگز کسی انقلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے انقلابی دور میں اپنے قومی تشخص اور اسلامی تہذیب کے خصائص کو بچالے جانا، اور اپنے آپ کو پامال سے محفوظ رکھنا بہت ہی مشکل ہے۔ اول تو جہالت کی بنا پر وہ بہت سے اجنبی اثرات کو بے جانے بوجھے قبول کرے گی۔ پھر زمانہ کی گردش اس کو بہت سی ایسی چیزوں سے متاثر کر دے گا جن کو وہ جانتی ہو گی کہ اسلامی تعلیمات کے خلاف اور اسلامی تہذیب کے منافی ہیں۔ اس طرح ایک بڑی حد تک تو بلا مقابلہ ہی شکست واقع ہو گی۔ اس کے بعد جو تھوڑے بہت احساسات باقی رہ جائیں گے، وہ اگر کبھی شدید حملے پر بیدار بھی ہوتے، اور اس قوم نے اپنے وجود کی حفاظت کرنی بھی چاہی تو نہ کر سکے گی، کیونکہ اپنی بدنظمی اور انتشار کی بدولت اس کے لیے کوئی متحدہ جدوجہد کرنا مشکل ہو گا، اور اسی گروہ سے ہزاروں لاکھوں خائن، غدار اور منافق اس کے قومی وجود کو پامال کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔

قومی تحریک کی حقیقت

مسلمانوں کی حالت کا جائزہ آپ لے چکے۔ اب آئندہ انقلاب کے نتائج کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان قوتوں کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے جو اس انقلابی تحریک میں کام کر رہی ہیں۔

ہندوستان کی جدید وطنی حرکت دراصل نتیجہ ہے اس تصادم کا جو انگریزی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اقتدار اور ہندوستان کے درمیان گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہو رہا ہے۔ یہ تصادم محض سیاسی نہیں ہے، بلکہ فکری اور عمرانی بھی ہے، اور یہ عجیب بات ہے کہ فکری اور عمرانی تصادم کا جو نتیجہ ہوا ہے وہ سیاسی تصادم کے نتیجہ سے بالکل برعکس ہے۔ انگریزی سیاست کے جور و استبداد اور معاشی لوٹ نے تو ہندوستان کے باشندوں کو آزادی کا سبق دیا، اور ان میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ بندِ غلامی کو توڑ کر پھینک دیں۔ لیکن لیکن انگریزی علوم و فنون اور انگریزی تہذیب و تمدن نے ان کو پوری طرح مغرب کا غلام بنا دیا، اور ان کے دماغوں پر اتنا زبردست قابو پا لیا کہ اب وہ زندگی کا کوئی نقشہ اس نقشہ کے خلاف نہیں سوچ سکتے جو ان کے سامنے اہلِ مغرب نے پیش کیا ہے۔ وہ جس قسم کی آزادی کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں اس کی نوعیت صرف یہ ہے کہ ہندوستان سیاسی حیثیت سے آزاد ہو، اپنے گھر کا انتظام آپ کرے، اور اپنے وسائلِ معیشت کو خود اپنے مفاد کے لیے استعمال کرے۔ لیکن یہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر کے انتظام اور اپنی زندگی کی تعمیر کا جو نقشہ ان کے ذہن میں ہے وہ از سرتاپا فرنگی ہے۔ ان کے پاس جتنے اجتماعی تصورات ہیں، جس قدر عمرانی اصول ہیں سب کے سب مغرب سے حاصل کیے ہوئے ہیں۔ ان کی نظر فرنگی نظر ہے، ان کے دماغ فرنگی دماغ ہیں، ان کی ذہنیت پوری طرح فرنگیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ بلکہ مغلوبیت کے بحران نے ان کو یا کم از کم ان کے سب سے زیادہ پُرجوش طبقوں کو، فرنگیوں میں سے بھی اس قوم کا متبع بنا دیا ہے جو انتہا پسندی میں تمام فرنگی اقوام کو پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ وہ پکے مادہ پرست ہیں۔ ان کی نگاہ میں اخلاق و روحانیت کی کوئی قیمت نہیں۔ ان کو خدا پرستی سے نفرت ہے۔ مذہب کو وہ شر و فساد کا ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں کو وہ پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت دینے کے لیے تیار نہیں۔ ان کو ہر ایسی قومیت اور ہر ایسے قومی امتیاز سے چڑ ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ رواداری جو مذہب کے ساتھ برت سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اس کی عبادت گاہوں اور اپنے مراسم میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

جیسے دیں۔ باقی رہی اجتماعی زندگی تو اس میں مذہب اور مذہبیت کے ہر اثر کو مٹانا ان کا نصب العین ہے، اور ان کے نزدیک اس اثر کو مٹائے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں۔ ہندوستانی قومیت کا جو نقشہ ان کے پیشِ نظر ہے، اس میں مذہبی جماعتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ تمام امتیازی حدود کو توڑ کر وطنیت کی بنیاد پر ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک ہی طرز پر تعمیر ہو اور وہ طرز اپنے اصول و فروع میں خالص مغربی ہو۔

قومی تحریک میں شامل ہونے کے نتائج

چونکہ اس جماعت کے مقاصد میں سیاسی آزادی کا مقصد سب سے مقدم ہے، اور وہی اس وقت حالات کے لحاظ سے نمایاں ہو رہا ہے، اس لیے مسلمانوں کے آزادی پسند طبقے اس کی طرف کھنچ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی غلامی ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے ایک مشترک مصیبت ہے۔ اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے مشترک جدوجہد کرنا ہر آئینہ معقول ہے، اور جو گروہ اس جدوجہد میں سب سے زیادہ سرگرم ہو، اس کی طرف دلوں کا مائل ہونا اور اس کے ساتھ شریکِ عمل ہو جانا بظاہر ضروری نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے علماء اور سیاسی رہنماؤں میں سے ایک بڑی جماعت اور مخلص جماعت کانگریس کی طرف جا رہی ہے اور عامہ مسلمین کو بھی ترغیب دے رہی ہے کہ اس میں شریک ہو جائیں۔ لیکن عمل کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ایک مرتبہ اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔

مسلمانوں کی جو کمزوریاں ہم نے اوپر بیان کی ہیں وہ سب آپ کے سامنے ہیں۔ ان کو پیشِ نظر رکھ کر غور کیجیے کہ ان کمزوریوں کے ساتھ جب یہ قوم کانگریس میں شریک ہو گی اور اس کے عوام سے کانگریسی کارکنوں کا رابطہ قائم ہوگا تو آزادیٔ وطن کی تحریک کے ساتھ ساتھ اور کس کس قسم کی تحریکیں ان کے درمیان پھیلیں گی۔ کس کس طرح مسلمانوں کے عوام ان اجتماعی نظریات، ان ملحدانہ افکار اور ان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غیر اسلامی طریقوں سے متاثر ہوں گے جو اس جماعت میں شائع و ذائع ہیں۔ کس طرح اسلامی جماعت کے رگ و ریشہ میں اس فکری و عمرانی انقلاب کے عناصر پیوست جائیں گے جو سیاسی انقلاب کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ کس طرح مسلمانوں کے اندر ایک ایسی رائے عام تیار کرنے کی کوشش کی جائے گی جو علی رغم انف علماء وزعماء جدید ترین مغربی و اشتراکی بنیادوں پر اجتماعی زندگی کی تعمیر کے ہر نقشہ کی تائید کرنے والی ہو۔ کس طرح مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے خود مسلمانوں کی جماعت سے وہ لوگ تیار کیے جائیں گے جو اسلامی کلچر کے خلاف ہر قسم کے طریقے رائج کرنے اور ہر قسم کے قوانین وضع کرنے میں حصہ لیں گے۔ ان حالات میں آپ کے پاس کون سی قوت ہے جس سے آپ اپنی قوم کو قابو میں رکھ سکیں گے؟ آپ نے اپنے عوام کو اسلامی تہذیب کے حلقہ میں رکھنے کا کیا بندوبست کیا ہے؟ آپ نے ان کو غیر اسلامی اثرات سے بچانے کا کیا انتظام کیا ہے؟ آپ نے اپنے غداروں اور منافقوں کے فتنے کا کیا علاج سوچا ہے؟ آپ کے پاس یہ اطمینان کرنے کا کون سا ذریعہ ہے کہ کسی سخت وقت میں آپ اسلامی مقاصد کی خدمت کے لیے مسلمانوں کو جمع کر سکیں گے اور ان کی متحدہ طاقت آپ کی پشت پر ہوگی؟

باطل کی جگہ باطل

انگریز کے اقتدار کا خاتمہ کرنا یقیناً ضروری ہے، بلکہ فرض ہے۔ کوئی سچا مسلمان غلامی پر ہرگز راضی نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کے دل میں ایمان ہو گا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ چاہے گا کہ ہندوستان انگریز کے پنجۂ استبداد میں رہے۔ لیکن آزادی کے جوش میں یہ نہ بھول جانا چاہیے کہ انگریزی اقتدار کی مخالفت میں مسلمان کا نظریہ ایک وطن پرست کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے۔ اگر آپ کو انگریز سے اس لیے عداوت ہے کہ وہ انگریز ہے، چھ ہزار میل دور سے آیا ہے، آپ کے وطن کا رہنے والا نہیں ہے، تو یہ اسلامی عداوت نہیں بلکہ جاہلی عداوت ہے اور اگر آپ اس سے اس لیے عداوت رکھتے ہیں کہ وہ غیر صالح ہے، ناجائز طریقے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے حکومت کرتا ہے، عدل کے بجائے جور پھیلاتا ہے، اصلاح کی جگہ فساد کرتا ہے، تو یہ بلاشبہ اسلامی عداوت ہے، لیکن اس لحاظ سے آپ کو دوستی اور دشمنی کا معیار اصول کو قرار دینا پڑے گا نہ کہ وطنیت کو۔ جو کچھ انگریز کرتا ہے، اگر وہی کچھ دوسرے کریں تو آپ محض اس بنا پر ان کی حمایت نہیں کر سکتے کہ وہ ہمارے ہم وطن ہیں۔ مسلمان کی نگاہ میں وطنی اور غیر وطنی کوئی چیز نہیں۔ وہ غیر ملک کے صہیب اور سلمان کو گلے لگا سکتا ہے مگر اپنے وطن کے ابوجہل اور ابولہب سے دوستی نہیں کر سکتا۔ پس اگر آپ مسلمان ہیں تو وطنیت کے ڈھنگ پر نہ سوچیے بلکہ حق پرستی کے ڈھنگ پر سوچیے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزی غلامی کے جوئے کو [illegible] آپ کا فرض ہے، مگر کسی ایسی حکومت کے قیام میں مدد دینا آپ کے لیے ہرگز جائز نہیں جس کی بنیاد انہی اصولوں پر ہو جن پر انگریزی حکومت کی بنیاد قائم ہے، عام اس سے کہ وہ وطنی حکومت ہو یا غیر وطنی۔ آپ کا کام باطل کو مٹا کر دوسرے باطل اور بدتر باطل کو قائم کرنا نہیں ہے۔ آپ انگریزی حکومت کے خلاف ہر اس گروہ سے موالات کیجیے جو اس کو مٹانا چاہتا ہو۔ مگر یہ بتائیے کہ اس ظالم حکومت کو مٹا کر ایک عادل حکومت قائم کرنے کے لیے آپ نے کیا انتظام کیا ہے؟ کون سی طاقت آپ نے فراہم کی ہے جس سے آپ دوسری حکومت کی تشکیل حق کے اصولوں پر کرا سکیں؟ یہ نہیں تو جانے دیجیے یہی بتا دیجیے کہ آپ نے خود اپنی قوم کو باطل کے اثرات سے بچانے کا کیا بندوبست فرمایا ہے؟

کیا آئینی ضمانتیں اور تحفظات کافی ہو سکتے ہیں؟

آپ کہتے ہیں کہ ہم اپنی تہذیب اور اپنے قومی طریقوں کی حفاظت کے لیے آئینی ضمانتیں لیں گے۔ ہم دستورِ اساسی میں ایسے تحفظات رکھوائیں گے جن سے اسلامی مفاد پر آنچ نہ آنے پائے۔ بلاشبہ یہ سب کچھ آپ کر سکتے ہیں۔ مگر شاید آپ نے غور نہیں فرمایا کہ آئینی ضمانتیں اور دستورِ اساسی کے تحفظات اور دوسرے تمام کاغذی مواثیق صرف اسی قوم کے لیے مفید ہو سکتے ہیں جس میں ایک طاقت ور رائے عام موجود ہو، جو اپنے آپ کو سمجھتی ہو، اپنی تہذیب کو جانتی ہو، اس کی خصوصیات کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہچانتی ہو، اس کی حفاظت کا ناقابلِ تسخیر ارادہ رکھتی ہو اور منفرداً و مجتمعاً اس کی طرف سے مدافعت کے لیے ہر وقت سینہ سپر ہو۔ یہ صفات اگر آپ کی قوم میں موجود ہیں تو آپ کو کسی آئینی ضمانت اور کسی دستوری تحفظ کی بھی ضرورت نہیں، اور اگر آپ کی قوم ان صفات سے عاری ہے تو یقین رکھیے کہ کوئی ضمانت اور کوئی تحفظ ایسی حالت میں کارآمد نہیں ہو سکتا۔ آپ دستورِ اساسی کی ضمانتوں کو زیادہ سے زیادہ خارجی حملوں کے مقابلہ میں استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر اندرونی انقلاب کا آپ کے پاس کون سا علاج ہے؟ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ کل مخلوط تعلیم شروع ہوتی ہے[1] اور آپ کی قوم کے افراد خود اپنی مرضی سے دھڑا دھڑ اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کو مخلوط مدارس میں بھیجتے ہیں۔ کون سا دستوری تحفظ اس تحریک کو اور اس کے زہریلے نتائج کو روکنے کے لیے استعمال کیا جائے گا؟ فرض کیجیے کہ سول میرج کے طریقہ پر نکاحوں کا رواج پھیلتا ہے اور آپ کی قوم خود اس تحریک سے متاثر ہو جاتی ہے، کونسی آئینی ضمانت اس کی روک تھام کر سکے گی؟ فرض کیجیے کہ آپ کی اپنی قوم میں پروپیگنڈہ کی قوت اور تعلیم کے وسائل سے ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جاتی ہے جو قوانین اسلامی میں ترمیم و تنسیخ پر راضی ہو بلکہ مُصر ہو، آپ کی اپنی قوم کے افراد ایسے قوانین کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جو اصولِ اسلام کے خلاف ہوں، خود آپ ہی کے ووٹوں کی اکثریت سے ایسی تجویزیں پاس ہو جاتی ہیں جو آپ کے تمدن کو اسلامی مناہج سے ہٹا دینے والی ہوں، وہ کون سے "بنیادی حقوق" ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ ان چیزوں کو منسوخ کرائیں گے؟ فرض کیجیے کہ آپ کی قوم بتدریج ہمسایہ قوم کے طرزِ معاشرت، آداب و اطوار، عقائد و افکار کو قبول کرنا شروع کرتی ہے، اور اپنے قومی امتیازات کو خود بخود مٹانے لگتی ہے۔ کونسا کاغذی میثاق اس تدریجی انجذاب کی روک تھام کر سکے گا؟ آپ اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سب تمہارے خیالی مفروضات ہیں۔ اس

---

[1] یہ تحریر ۱۹۳۶ء کی ہے۔ چند سال بعد یہ خدشہ ایک حقیقت بن گیا۔ (مرتب)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیے کہ جو مسلمان اس وقت وطنی تحریک میں شامل ہیں ان کے نمونے آپ کے سامنے موجود ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ ان کا طرزِ عمل انگریز کے غلاموں سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ وہی ذہنی غلامی، وہی زنانہ انفعال و تاثر، وہی انجذابی کیفیت یہاں بھی نمایاں ہے جو اُستاذہ فرنگ کے حاشیہ نشینوں میں نظر آتی ہے۔ پھر جب اپنی قوم کی کمزوری اور اس کی موجودہ مزاجی کیفیت کے کھلے ہوئے علائم اور آثار آپ کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں تو آخر کس بھروسہ پر آپ ساری قوم کو دھرلے جانا چاہتے ہیں؟ فرمائیے تو سہی کہ آپ نے باطنی انقلاب اور تدریجی انجذاب کو روکنے کے لیے کون سا تحفظ کیا ہے؟

عوام کا جمود اور سیاسی جماعتوں کی بے راہ رویاں

مسلمانوں میں اس وقت زیادہ تر تین گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ آزادیٔ وطن کے لیے بے چین ہے اور کانگریس کی طرف کھنچ رہا ہے یا کھنچ گیا ہے۔ دوسرا گروہ اپنی قومی تہذیب اور اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے انگریز کی گود میں جانا چاہتا ہے اور آئندہ انقلاب کے خطرات سے بچنے کی یہی صورت مناسب سمجھتا ہے کہ سرکارِ برطانیہ کا معاون بن کر آزادی کی تحریک کو روکے۔ تیسرا گروہ عالمِ حیرت میں کھڑا ہے اور خاموشی کے ساتھ واقعات کو دیکھ رہا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی ہم نے اوپر واضح کر دی۔ دوسرے گروہ کی غلطی بھی کچھ کم خطرناک نہیں۔ یہ لوگ اپنی کمزوریوں کی اصلاح کرنے کے بجائے دوسروں کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان کے ضعف کی تلافی غیروں کے سہارے سے ہو جائے گی۔ ایسی ذلیل پالیسی دنیا میں نہ کبھی کامیاب ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ جو قوم خود رہنے کی طاقت نہ رکھتی ہو، جس میں خود اپنے موقف پر کھڑے رہنے کا بل بوتا نہ ہو، وہ کب تک دوسروں کے سہارے جی سکتی ہے؟ کب تک کوئی سہارا اس کے لیے قائم رہ سکتا ہے؟ کب تک زمانے کے انقلابات اس کی خاطر رُکے رہ سکتے ہیں؟ انگریز قیامت تک کے لیے

ہندوستان پر حکومت کرنے کا پٹہ لکھوا کر نہیں لایا ہے۔ ہر قوم کے لیے ایک مدت ہوتی ہے۔ انگریز کے لیے بھی بہر حال ایک مدت ہے، اور وہ آج نہیں تو کل پوری ہو گی۔ اس کے بعد وہی قوم برسرِ اقتدار آئے گی جس میں ہمت و استطاقت ہو گی۔ حاکمانہ اوصاف ہوں تو وہ قوم تم ہو سکتے ہو، اور اگر تم ان سے عاری ہو تو بہر حال تمہاری قسمت میں محکومی کی ذلت اور ذلت کی موت ہی ہے۔ جو گھن کھائی ہوئی لاش کسی عصا کے سہارے پر کھڑی ہو وہ ہمیشہ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ عصا کبھی نہ کبھی ہٹ کے رہے گا، اور لاش کبھی نہ کبھی گر کے رہے گی۔

تیسرے گروہ کی غلطی سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ دنیا ایک عرصۂ جنگ ہے جس میں تنازع للبقاء کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس معرکہ میں ان کے لیے کوئی کامیابی نہیں جو زندہ رہنے کے لیے مقابلہ اور زحمت کی قوت نہ رکھتے ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ ایک دَور کے خاتمہ اور دوسرے دَور کے آغاز کا وقت تو قوموں کی قسمتوں کے فیصلے کا وقت ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں سکون اور جمود کے معنی ہلاکت اور موت کے ہیں۔ اگر تم خود ہی مرجانا چاہتے ہو تو بیٹھے رہو اور اپنی موت کی آمد کا تماشا دیکھے جاؤ۔ لیکن زندہ رہنے کی خواہش ہے تو سمجھ لو کہ اس وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ یہ سستی رفتار کا زمانہ نہیں ہے، صدیوں کے تغیرات اب مہینوں اور برسوں میں ہو جاتے ہیں۔ جس انقلاب کے سامان اس وقت ہندوستان اور ساری دنیا میں ہو رہے ہیں وہ طوفان کی سی تیزی کے ساتھ آرہا ہے۔ اب تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ دس پندرہ برس کی مہلت ہے۔ اگر اس مہلت میں تم نے اپنی کمزوریوں کی تلافی نہ کی اور زندگی کی طاقت اپنے اندر پیدا نہ کی تو پھر کوئی دوسری مہلت تمہیں نہ ملے گی۔ اور تم وہی سب کچھ دیکھو گے جو دوسری کمزور قومیں اس سے پہلے دیکھ چکی ہیں۔ اللہ کا کسی قوم کے ساتھ رشتہ نہیں ہے کہ وہ اس کی خاطر اپنی سُنّت کو بدل ڈالے۔

جمود بہر حال ٹوٹنا چاہیے، حرکت کی ضرورت ہے اور شدید ضرورت ہے۔ مگر نری حرکت کسی کام کی نہیں۔ حکمت اور تدبّر کے ساتھ حرکت ہونی چاہیے خصوصاً

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نازک اوقات میں تو حرکت بلا تدبر کے معنی خود اپنے پاؤں چل کر خندق میں جا گرنے کے ہیں۔ یہ اندھے جوش اور ابلہانہ شتاب روی کا وقت نہیں۔ قدم اُٹھانے سے پہلے ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لے کر سوچیے کہ قدم کس سمت میں اٹھانا چاہیے؟ آپ کی منزلِ مقصود کیا ہے؟ اس کی طرف جانے کا صحیح راستہ کون سا ہے؟ اس راستہ پر چلنے کے لیے آپ کو کس سامان کی ضرورت ہے؟ کن کن مرحلوں سے بسلامت گزر جانے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کرنی پڑیں گی؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۳

ہمارا سیاسی نصب العین

کسی راستہ پر چلنے سے پہلے منزلِ مقصود کا تعین ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ حرکت اور سفر کو بذاتِ خود تو مقصود نہیں بنایا جا سکتا۔ کم از کم ذی عقل و ہوش انسان کے لیے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ محض چلنے کی خاطر چلیں اور منتہائے نظر کوئی نہ ہو۔ لہذا مسلمانوں کے تمام سوچنے والے لوگوں کو سب سے پہلے یہ طے کرنا چاہیے کہ ان کا منتہائے نظر یا نصب العین کیا ہے۔ اس کے بعد طریق کار اور راہِ عمل کا انتخاب زیادہ آسان ہو جائے گا۔ کیونکہ جب وہ مقام متعین ہو جس تک ہمیں جانا ہے تو وہ راستہ بڑی آسانی سے دریافت ہو سکتا ہے جو اس مقام تک پہنچنے کا سب سے زیادہ سیدھا اور سب سے زیادہ اقرب راستہ ہو۔

عام طور پر آزاد خیال مسلمان اپنی "قوم پرستی" کی نمائش کرنے کے لیے کہتے ہیں کہ نصب العین ہندوستان کی کامل آزادی ہے۔ لیکن یہ بات عموماً بغیر سوچے سمجھے کہہ دی جاتی ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہماری منزلِ مقصود محض آزادی ہی نہیں ہے بلکہ ایسی آزادی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام نہ صرف قائم رہے بلکہ عزت اور طاقت والا بن جائے۔ آزادیٔ ہند ہمارے نزدیک مقصود بالذات

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں ہے بلکہ اصل مقصد کے لیے ایک ضروری اور ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مقصود ہے۔ ہم صرف اس آزادی کے لیے لڑنا چاہتے ہیں، بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اپنے مذہب کی رُو سے لڑنا فرض جانتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ ملک کلیۃً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بدتر ہو جائے تو ہم بلا کسی مداہنت کے صاف صاف کہتے ہیں کہ ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت ہے۔ اور اس کی راہ میں بولنا، لکھنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا اور جیل جانا سب کچھ حرام، قطعی حرام ہے۔

یہ ایسی صاف بات ہے جس میں دو رائیں ہونے کی گنجائش ہی نہیں خصوصاً جو شخص قرآن اور سنت پر نظر رکھتا ہے اور منافق نہیں ہے وہ تو اس کے برحق ہونے میں چون وچرا نہیں کر سکتا۔

ہندوستان میں آزادیٔ مسلم کا کم سے کم مرتبہ

منزلِ مقصود کا انتہائی مقام یعنی ہندوستان کو کلیۃً دارالاسلام بنانا تو اتنا بلند مقام ہے کہ آج کل کا کم ہمت مسلمان اس کا قصد کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا، خیر جانے دیجیے اس کو ـــــ اس سے فروتر درجہ میں جس مقصد کے لیے ہمیں لڑنا ہے وہ کم سے کم یہ ہے کہ ہندوستان نہ تو بیرونی کفار کے تسلط میں رہے اور نہ اندرونی کفار کے کامل تسلط میں چلا جائے، بلکہ آزاد ہو کر شبہ دارالاسلام بن جائے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کو سمجھ لیجیے کہ شبہ دارالاسلام سے کیا مراد ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے معنی یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کے سے نام رکھنے والوں کو اسمبلیوں اور کونسلوں کی نشستیں اور سرکاری عہدے مل جائیں اور ہندوستان کے معاشی ثمرات میں ان کو بھی متناسب حصہ ملے، اور آزاد ہندوستان کی تمام عمرانی ترقیات سے (خواہ وہ ترقیات کسی صورت میں ہوں) انہیں بلا امتیاز مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے، تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے۔ ہم جس کو شبہ دارالاسلام سمجھتے

ہیں، اور جو چیز درحقیقت اس نام سے موسوم ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہم محض "ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "مسلمان" ہونے کی حیثیت سے حصہ دار ہوں، اور ہمارا حصہ اس قدر طاقتور ہو کہ

(۱) ہم اپنی قوم کی تنظیم اصولِ اسلامی کے مطابق کر سکیں۔ یعنی ہم کو حکومت کے ذریعہ سے اتنی قوت حاصل ہو کہ ہم مسلمانوں کے لیے اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکیں، ان کے اندر غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روک سکیں، ان پر اسلامی احکام جاری کر سکیں، اور اپنی قوم میں جو اصلاحات ہم خود اپنے طریق پر نافذ کرنے کی ضرورت سمجھیں ان کو خود اپنی طاقت سے نافذ کر سکیں، مثلاً زکوٰۃ کی تحصیل، اوقاف کی تنظیم، قضائے شرعی کا قیام، قوانینِ معاشرت کی اصلاح وغیرہ۔

(۲) ہم اس ملک کے نظم و نسق اور اس کی تمدنی و معاشی تعمیرِ جدید میں اپنا اثر اس طرح استعمال کر سکیں کہ وہ ہمارے اصولِ تمدن و تہذیب کے خلاف نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ وسیع پیمانہ پر تمام ملک کی اجتماعی زندگی اور معاشی تنظیم اور تدبیرِ مملکت کی مشین جو شکل بھی اختیار کرے گی اس کا اثر دوسری قوموں کی طرح ہماری قوم پر بھی پڑے گا۔ اگر یہ تعمیرِ جدید اس نقشہ پر ہو جو اپنے اصول و فروع میں کلیتہً ہماری تہذیب کی ضد ہے تو ہماری زندگی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے ناگزیر ہو جائے گا کہ یا تو ہم تمدن و معیشت کے اعتبار سے غیر مسلم بن جائیں یا پھر ہماری حیثیت اس ملک میں تمدنی و معاشی اچھوتوں کی سی ہو کر رہ جائے۔ اس نتیجہ کو صرف اسی طرح روکا جا سکتا ہے کہ ہندِ جدید کی تشکیل پر ہم اپنا اثر کافی قوت کے ساتھ ڈال سکیں۔

(۳) ہندوستان کی سیاسی پالیسی میں ہمارا اتنا اثر ہو کہ اس کی طاقت کسی حال میں بیرونِ ہند کی مسلمان قوموں کیخلاف استعمال نہ کی جا سکے۔

کانگریس کے "بنیادی حقوق" ہمارے منتہائے نظر نہیں ہو سکتے

یہ مقصد جس کی ہم نے توضیح کی ہے وہ کم سے کم چیز ہے جس کے لیے ہم کو لڑنا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاہیئے۔ مدافعت کا پہلو صرف کمزور اختیار کرتے ہیں اور ان کا آخری انجام شکست ہے۔ اگر آپ اپنا مقصد صرف ان حقوق کے حصول کو بناتے ہیں جن کا اطمینان کانگریس نے اپنے "بنیادی حقوق" والے ریزولیوشن میں دلایا ہے تو آپ دھوکے میں ہیں۔ آپ کی تہذیب، زبان، پرسنل لا، اور مذہبی حقوق کا تحفظ بھی (جسے آپ کافی سمجھے بیٹھے ہیں) دراصل اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ فارورڈ پالیسی اختیار کر کے حکومت کی تشکیل میں طاقت ور حصہ دار بننے کی کوشش کریں۔ اس میں اگر آپ نے غفلت کی اور حکومت کا اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں تو یقین رکھیے کہ کوئی دستور آپ کو من حیث المسلم ہلاک ہونے سے نہ بچا سکے گا۔

انگریزی حکومت نے بھی آپ کے بہت سے حقوق تسلیم کر رکھے ہیں۔ مگر غور کیجیے وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو خود اپنے حقوق سے دست بردار کرا دیا؟ انگریز نے آپ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ اپنی زبان میں لکھنا، پڑھنا، بولنا سب چھوڑ دو، زکوٰۃ نہ دو، شراب پیو، اور اپنے مذہب کے سارے احکام کو نہ صرف بالائے طاق رکھ دو، بلکہ ان کا مذاق تک اڑاؤ۔ پھر کس چیز نے آپ کی قوم کے لاکھوں کروڑوں افراد کو ایک صدی کے اندر اپنے دین و ایمان سے عملاً منحرف کر ڈالا؟ انگریز نے آپ سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ اپنی معاشرت بدل دو، اپنا لباس بدل دو، اپنے مکانوں کے نقشے بدل دو، اپنے آداب و اخلاق بدل دو، اپنی صورتیں بگاڑ لو، اپنے بچوں کو انگریز بناؤ، اپنی عورتوں کو میم صاحب بناؤ، اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کے سارے اصول چھوڑ کر پوری زندگی ہمارے نقشے پر ڈھال لو۔ پھر وہ کون سی چیز ہے جس نے آپ سے یہ سب کچھ کرا ڈالا؟ ذرا دماغ پر زور ڈال کر سوچیے، کیا اس کا سبب غیر مسلم اقتدار کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ ڈھائی تین لاکھ انگریز چھ ہزار میل دُور سے آتے ہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ قصداً آپ کے اندرونی معاملات اور آپ کے تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے اقتدار کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بیرونی جبر سے نہیں، بلکہ اندرونی

انقلاب سے آپ کی کایا پلٹ جاتی ہے اور آپ خود بخود اپنے اُن بنیادی اور فطری حقوق تک سے دست بردار ہو جاتے ہیں جن کو کوئی حکومت اپنی رعایا سے نہیں چھینتی اور نہیں چھین سکتی۔ اب ذرا اندازہ لگائیے کہ اگر آزاد ہندوستان کی حکومت غیر اسلامی نقشہ پر بن گئی اور اس کا اقتدار ان ہندوستانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں، تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ وہ انگریزوں کی طرح قلیل التعداد بھی نہیں، آپ سے الگ تھلگ رہنے والے بھی نہیں، اور پھر غیر ملکی بھی نہیں ہیں کہ سیاسی پالیسی ان کو تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے روکے۔ ان کے اقتدار میں آپ کے اندرونی تغیّر و انقلاب کا کیا حال ہوگا اور دستورِ مملکت کی کون کون سی دفعات آپ کو اپنے حقوق کی پامالی سے روکیں گی؟

مسلمانوں کے لیے صرف ایک راستہ ہے

پس جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں کے لیے ایسی آزادیٔ وطن کی خاطر لڑنا تو قطعی حرام ہے جس کا نتیجہ انگلستانی غیر مسلموں سے ہندوستانی غیر مسلموں کی طرف اقتدارِ حکومت کا انتقال ہو۔ پھر ان کے لیے یہ بھی حرام ہے کہ وہ اس انتقال کے عمل کو بیٹھے ہوئے خاموشی سے دیکھتے رہیں۔ اور ان کے لیے یہ بھی حرام ہے کہ اس انتقال کو روکنے کی خاطر انگلستانی غیر مسلموں کا اقتدار قائم رکھنے میں معاون بن جائیں۔ اسلام ہم کو ان تینوں راستوں پر جانے سے روکتا ہے۔ اب اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں۔ اور ہندوستان میں اسلام کا وہ حشر دیکھنے کے لیے تیار نہیں جو اسپین اور سسلی میں ہو چکا ہے تو ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم آزادیٔ ہند کی تحریک کا رُخ حکومتِ کفر کی طرف سے حکومتِ حق کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں۔ اور اس غرض کے لیے ایک ایسی سرفروشانہ جنگ پر کمر بستہ ہو جائیں جس کا انجام یا کامیابی ہو یا موت۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

ہم آزادیٔ ہند کے مخالف نہیں بلکہ ہر آزادی خواہ سے بڑھ کر اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے خواہش مند ہیں۔ اور اس کے لیے جنگ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن وطن پرست کے نصب العین سے ہمارا نصب العین مختلف ہے۔ وہ صرف ایسی آزادی چاہتا ہے جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کی نجات ہو اور ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کے ساتھ "مسلم" کی نجات بھی ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۴

راہِ عمل

اب ہم کو اس سوال پر غور کرنا ہے کہ ہندوستان میں اسلامی قومیت کا وہ نصب العین جس کو ہم نے پچھلے صفحات میں بیان کیا تھا کس طریقہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس نصب العین سے کسی "مسلم" فرد یا گروہ کو اختلاف نہیں۔ اختلاف جو کچھ بھی ہے اس امر میں ہے کہ ہمارے لیے صحیح راستہ کون سا ہے؟ اب ہمیں ان مختلف راستوں پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہیے جو ہمارے سامنے ہیں۔ اس کے بعد راہِ راست خود بخود واضح ہو جائے گی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی دو حیثیتیں

ہندوستان میں ہماری دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت ہمارے "ہندوستانی" ہونے کی ہے، اور دوسری حیثیت "مسلمان" ہونے کی۔

پہلی حیثیت میں ہم اس ملک کی تمام دوسری قوموں کے شریکِ حال ہیں۔ ملک قلاش اور فاقہ کشی میں مبتلا ہوگا تو ہم بھی مفلس اور فاقہ کش ہوں گے۔ ملک کو لوٹا جائے گا تو ہم بھی سب کے ساتھ لوٹے جائیں گے۔ ملک میں جور و ظلم کی حکومت ہوگی تو ہم بھی اسی طرح پامال ہوں گے جس طرح ہمارے اہلِ وطن ہوں گے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملک پر غلامی کی وجہ سے بہ حیثیت مجموعی جتنی مصیبتیں نازل ہوں گی، جتنی لعنتیں برسیں گی، ان سب میں ہم کو برابر کا حصّہ ملے گا۔ اس لحاظ سے ملک کے جتنے سیاسی و معاشی مسائل ہیں وہ سب کے سب ہمارے اور دوسری اقوام ہند کے درمیان مشترک ہیں۔ جس طرح ان کی فلاح و بہبود ہندوستان کی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے، اسی طرح ہماری بھی ہے۔ سب کے ساتھ ہماری بہتری بھی اس پر منحصر ہے کہ یہ ملک ظالموں کے تسلط سے آزاد ہو۔ اس کے وسائل ثروت اسی کے باشندوں کی ترقی اور بہتری پر صرف ہوں۔ اس کے بسنے والوں کو اپنے افلاس، اپنی جہالت، اپنی اخلاقی پستی، اور اپنی تمدنی پس ماندگی کا علاج کرنے میں اپنی قوتوں سے کام لینے کے پورے مواقع حاصل ہوں، اور کوئی جابر قوم ان کو اپنی ناجائز اغراض کے لیے آلۂ کار بنانے پر قادر نہ رہے۔

دوسری حیثیت میں ہمارے مسائل کچھ اور ہیں جن کا تعلق صرف ہم ہی سے ہے۔ کوئی دوسری قوم ان میں ہماری شریک نہیں ہے۔ اجنبی استیلاء نے ہمارے قومی اخلاق کو، ہماری قومی تہذیب کو، ہمارے اصولِ حیات کو، ہمارے نظامِ جماعت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ ڈیڑھ سو برس کے اندر غلامی ان تمام بنیادوں کو گھن کی طرح کھا گئی ہے جن پر ہماری قومیت قائم ہے۔ تجربے نے ہم کو بتا دیا ہے اور روزِ روشن کی طرح اب ہم اس حقیقت کو دیکھ رہے ہیں کہ اگر یہ صورتِ حال زیادہ مدت تک جاری رہی تو ہندوستان کی اسلامی قومیت رفتہ رفتہ گھل گھل کر طبعی موت مر جائے گی اور یہ برائے نام ڈھانچہ جو باقی رہ گیا ہے یہ بھی نہ رہے گا۔ اس حکومت کے اثرات ہم کو اندر ہی اندر غیر مسلم بناتے جا رہے ہیں۔ ہمارے دل و دماغ کی تہوں میں وہ جڑیں سوکھتی جا رہی ہیں جن سے اسلامیت کا درخت پیدا ہوتا ہے۔ ہم کو وہ جنسیش پلایا جا رہا ہے جو ہماری ماہیت کو بدل کر خود ہمارے ہی ہاتھوں سے ہماری مسجد کو منہدم کرا دے۔ جس رفتار کے ساتھ ہم میں یہ تغیرات ہو رہے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے ایک مبصر اندازہ لگا سکتا ہے کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس عمل کی تکمیل اب بہت قریب آ گئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیسری چوتھی پشت تک پہنچتے پہنچتے ہمارا سوادِ اعظم خود بخود غیر مسلم بن جائے گا اور شاید گنتی کے چند نفوس اس عظیم الشان قوم کے مقبرے پر آنسو بہانے کے لیے رہ جائیں گے۔ پس ہماری قومیت کا بقاء و تحفظ اس پر منحصر ہے کہ ہم اس حکومت کے تسلط سے آزاد ہوں اور اُس نظامِ اجتماعی کو از سر نو قائم کریں جس کے مٹ جانے ہی کی بدولت ہم پر مصائب نازل ہو رہے ہیں۔

آزادیٔ وطن کے دو راستے

ہماری یہ دونوں حیثیتیں باہم متلازم ہیں۔ ان کو نہ عقلاً منفک کیا جا سکتا ہے نہ عملاً۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ آزادی ان دونوں حیثیتوں سے ہماری مقصود ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے جتنے مسائل ہمارے اور تمام دوسرے باشندگانِ ہند کے درمیان مشترک ہیں ان کو حل کرنے کے لیے مشترک طور پر ہی جدّوجہد کرنی چاہیئے اور یہ بھی سراسر درست ہے کہ مسلم ہونے کی حیثیت سے جو آزادی ہم چاہتے ہیں وہ بھی بہر طور ہمیں اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ہمیں ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے آزادی حاصل ہو جائے لیکن یہ تماثل اور توافق جو بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے اس میں ایک بڑا دھوکا چھپا ہوا ہے۔ اور در حقیقت اسی مقام پر بہت سوں نے دھوکا کھایا ہے۔ غائر نگاہ سے آپ دیکھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کوئی سیدھی سڑک نہیں ہے جس پر آپ آنکھیں بند کر کے بے تکان چلے جائیں۔ ٹھیک اسی مقام پر جہاں آپ آ کر ٹھیرے ہیں ایک دوراہا موجود ہے۔ دو سڑکیں بالکل مختلف سمتوں میں جا رہی ہیں اور آپ کو قدم اُٹھانے سے پہلے عقل و تمیز سے کام لے کر فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ جانا کدھر ہے؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

(۵) وطن پرستی

آزادیٔ وطن کا ایک راستہ وہ ہے جس کو ہم صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے اختیار کر سکتے ہیں۔ اس راہ کے بتانے والے اور اس پر ہندوستانیوں کو چلانے والے وہ لوگ ہیں جن کے پیشِ نظر "وطنی قومیت" کا مغربی تصوّر ہے، اور اس تصوّر کی تہ میں انسانیت کا ہندو تصوّر گہرا جما ہوا ہے۔ ان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مختلف قومی امتیازات جو مذہب اور تہذیب کی تفریق پر قائم ہیں مٹ جائیں اور سارا ملک ایک قوم بن جائے۔ پھر اس "قوم" کی زندگی کا جو نقشہ ان کے سامنے ہے وہ اشتراکیت اور ہندویت سے مرکب ہے، اور اس میں مسلمانوں کے اصولِ حیات کی رعایت تو درکنار، اس کے لیے کوئی ہمدردانہ نقطۂ نظر بھی ان کے پاس نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جس کی گنجائش وہ اس "ہندی قومیت" میں نکال سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ جن معاملات کا تعلق انسان اور خدا کے مابین ہے ان میں ہر گروہ کو اعتقاد اور عمل کی آزادی حاصل رہے۔ مگر جو معاملات انسان اور انسان کے درمیان ہیں ان کو وہ خالص وطنیت کی بنیاد پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ منظم مذہب (Organized Religion) یعنی ایسا مذہب ان کے نزدیک اصولاً قابلِ اعتراض ہے جو اپنے متبعین کو ایک مستقل قوم بناتا ہو، اور اس کو تعلیم، معیشت، معاشرت، تمدّن، اخلاق اور تہذیب میں دوسرے مذاہب کے متبعین سے الگ ایک ڈھنگ اختیار کرنے اور ایک ضابطہ کی پابندی کرنے پر مجبور کرتا ہو۔ وہ ہندوستان کے موجودہ حالات کی رعایت ملحوظ رکھ کر کچھ مدّت تک اس قسم کے "منظم" مذہب کو ایک محدود اور دھندلی شکل میں باقی رکھنا گوارا کر لیں گے چنانچہ اسی گوارا کر لینے کے انداز میں انہوں نے ہندوستان کے مختلف فرقوں کو ان کی زبان اور "پرسنل لا" کے تحفظ کا یقین دلایا ہے۔ مگر وہ کسی ایسے نظام کو برداشت نہیں کر سکتے جو اس "منظم مذہب" کو مزید طاقت اور مستقل زندگی عطا کرنے والا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس وہ ہندوستانِ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جدید کی تعمیر اس طرز پر کرنا چاہتے ہیں جس میں یہ "منظم مذہب" رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر طبعی موت مر جائے اور ہندوستان کی ساری آبادی ایک ایسی قوم بن جائے جس میں سیاسی پارٹیوں اور معاشی گروہوں کی تفریق تو چاہے کتنی ہی ہو، مگر تعلیم و تہذیب، تمدن و معاشرت، اخلاق و آداب اور تمام دوسری حیثیات سے سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔ اور وہ رنگ نظرۃً وہی ہونا چاہیے جو اس تحریک کے محرکوں کا رنگ ہے۔

یہ راستہ جس کی خصوصیات کو آج ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے، ہم صرف اسی وقت اختیار کر سکتے ہیں جب کہ ہم اپنی مذہبی حیثیت کو قربان کرنے پر راضی ہو جائیں۔ اس راستہ پر چل کر ہم کو وہ آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جو ہمیں مسلمان ہونے کی حیثیت سے درکار ہے۔ بلکہ اس راستے میں سرے سے ہماری یہ حیثیت ہی گم ہو جاتی ہے۔ اس کو اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انگریزی حکومت کے ماتحت جس انقلاب کا عمل ڈیڑھ سو برس سے ہماری قوم میں ہو رہا ہے وہ ہندوستانی حکومت کے ماتحت اور زیادہ شدت و سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچے اور اس کی تکمیل میں ہم خود مددگار بنیں، اور وہ اتنا مکمل انقلاب ہو کہ پھر اس کے ردِّ عمل کا کوئی امکان نہ رہے۔ انگریزی حکومت کے اثر سے مغربی تہذیب میں خواہ ہم کتنے ہی جذب ہو جائیں، بہرحال انگریزی قومیت میں جذب نہیں ہو سکتے۔ بہرحال ہمارا ایک الگ اجتماعی وجود باقی رہتا ہے جس کا پھر اپنی سابقہ صورت پر واپس ہونا ممکن ہے۔ لیکن یہاں تو صورتِ حال ہی دوسری ہے۔ ایک طرف ہمارے ہر امتیازی نشان حتیٰ کہ ہمارے احساسِ قومیت تک کو فرقہ پرستی (Communalism) قرار دے کر اس کے خلاف نفرت انگیز پراپیگنڈا کیا جاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مستقل جماعت (Community) کی حیثیت سے ہمارا وجود ناقابلِ برداشت ہے۔ دوسری طرف ہماری قوم کے ان لوگوں کو قوم پرست (Nationalist) کہا جاتا ہے جو ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہیں، "بندے ماترم" کے نعرے لگاتے ہیں، مندروں میں پہنچ کر عبادت تک میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصّہ لے گزرتے ہیں، اپنی صورتوں اور لباسوں میں پورا ہندویت کا رنگ اختیار کرتے ہیں، اور مسلمان قوم کے مفاد کا نام تک لیتے ہوئے انہیں ڈر لگتا ہے کہ مبادا ان پر فرقہ پرستی (Communalism) کا الزام نہ آجائے جو ان کے نزدیک کفر کے الزام سے زیادہ بدتر ہے۔ تیسری طرف ہم سے صاف کہا جاتا ہے کہ ایک جماعت بن کر نہ آؤ، بلکہ افراد بن کر آؤ اور سیاسی پارٹیوں میں، مزدور اور سرمایہ دار کی تفریق میں، زمیندار اور کسان کی تقسیم میں، زر والے اور بے زر کے تنازع میں منقسم ہو جاؤ، بالفاظِ دیگر اس رشتے کو خود ہی کاٹ دو جو مسلم اور مسلم میں ہوتا ہے اور اس رشتہ میں بندھ جاؤ جو ایک پارٹی کے مسلم اور غیر مسلم ممبروں میں ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہے اُسے سمجھنے کے لیے کچھ زیادہ عقل و فکر کی ضرورت نہیں اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہ ہے کہ تحریکِ آزادیٔ وطن کے دوران ہی میں ہمارا اجتماعی وجود فنا بھی ہو جائے، اور ہم جُدا جُدا قطروں کی شکل اختیار کر کے جدید نیشنلزم کی خاک میں جذب بھی ہو جائیں۔ پھر بحیثیت مسلمان قوم کے ہم نشأۃِ ثانیہ کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

جو لوگ صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے آزادی چاہتے ہیں، اور جن کی نگاہ میں آزادی کے منافع اس قدر قیمتی ہیں کہ اپنی اسلامی حیثیت کو وہ بخوشی ان پر قربان کر سکتے ہیں، وہ اس راستہ پر ضرور جائیں۔ مگر ہم یہ تسلیم کرنے سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ کوئی سچا مسلمان ایسی تحریکِ آزادیٔ وطن میں جان بوجھ کر حصّہ لینا گوارا کرے گا۔

(۲) مسلمانوں کی آزادی

آزادیٔ وطن کے لیے دوسرا راستہ صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں کسی باشندۂ ہند کے ہندوستانی ہونے کی حیثیت اور اس کے مسلم یا ہندو یا عیسائی یا سکھ ہونے کی حیثیت میں کوئی تناقض نہ ہو، جس میں ہر گروہ کو دونوں حیثیتوں سے آزادی حاصل ہو، جس کی نوعیت یہ ہو کہ مشترک وطنی مسائل کی حد تک تو امتیازِ مذہب و ملت کا شائبہ تک نہ آنے پائے مگر جداگانہ قومی مسائل میں کوئی قوم دوسری قوم سے تعرض نہ کر سکے، اور ہر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قوم کو آزاد ہندوستان کی حکومت میں اتنی طاقت حاصل ہو کہ وہ اپنے ان مسائل کو خود حل کرنے کے قابل ہو۔

جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں، ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ کرنا ہمارے لیے قطعاً ناگزیر ہے لیکن ہم جس قسم کی آزادی کے لیے لڑ سکتے ہیں، اور لڑنا فرض جانتے ہیں وہ یہی ہے۔ رہی وہ آزادی جو "وطن پرستوں" کے پیش نظر ہے، تو اس کی حمایت میں لڑنا کیا معنی، ہم تو اسے انگریزوں کی غلامی سے بھی زیادہ ملعون سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کے علمبردار مسلمانوں کے لیے وہی کچھ ہیں جو کلائیو اور ولزلی تھے اور ان کے پیرو "مسلمانوں" کی حیثیت بھی میر جعفر اور میر صادق سے مختلف نہیں۔ گو صورتیں اور حالات مختلف ہیں، مگر دشمنی اور غداری کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

کانگریس کی طرف بلانے والوں کی غلطی

اب سوال یہ ہے کہ یہ آزادی جس کو ہم اپنا مقصود بتا رہے ہیں کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟ مسلمانوں میں آج کل دو گروہ نمایاں ہیں جو مختلف تجویزیں پیش کر رہے ہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ آزادیٔ وطن کے لیے جو جماعت جدوجہد کر رہی ہے اس کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرو اور جب وہ انہیں منظور کر لے تو اس کے

لہ بعض حضرات نے اس فقرے کی سختی کی شکایت کی ہے۔ ان کے اطمینان قلب کے لیے میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اس فقرے میں میرا روئے سخن ان لوگوں کی جانب نہیں جو سچے مسلمان ہیں اور محض اجتہادی غلطی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ بلکہ میں دو قسم کے لوگوں کو میر جعفر و میر صادق سے تشبیہ دے رہا ہوں۔ ایک وہ جن کے دلوں سے درحقیقت اسلام نکل چکا ہے مگر وہ مسلمانوں کے بھیس میں رہ کر امتِ مسلمہ کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے اپنی اغراض کو اپنا معبود بنا لیا ہے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سجدہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ساتھ شریک ہو جاؤ۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلا کسی شرط کے اس آزادی کی تحریک میں حصہ لو۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں۔ پہلے گروہ کی غلطی یہ ہے کہ وہ کمزوروں کی طرح بھیک مانگنا چاہتا ہے۔ بالفرض اگر اس نے مطالبہ کیا اور انہوں نے مان بھی لیا تو نتیجہ کیا نکلے گا؟ جس قوم میں خود زندہ رہنے اور اپنی زندگی اپنے بل بوتے پر قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں اس کو دوسرے کب تک زندہ رکھ سکیں گے؟ رہا دوسرا گروہ تو وہ آزادی کے جوش میں اپنی قوم کی ان بنیادی کمزوریوں کو بھول جاتا ہے جنہیں گزشتہ صفحات میں ہم تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ اگر ثابت کر دیا جائے کہ وہ کمزوریاں واقعی نہیں ہیں، اور مسلمان درحقیقت اس قدر طاقتور ہیں کہ جدید نیشنلزم سے ان کی قومیت اور قومی تہذیب کو کسی قسم کا خطرہ نہیں، تو ہم اپنی رائے واپس لینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا اور ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ نہیں کیا جا سکتا، تو پھر صاف سن لیجئے کہ اس مرحلہ پر مسلمانوں کو کانگریس کی طرف دعوت دینا دراصل ان کو خودکشی کا مشورہ دینا ہے۔ محض جذبات سے اپیل کر کے آپ حقائق کو نہیں بدل سکتے۔ جس مریض کی آدھی جان نکل چکی ہے اس کے سامنے سپہ سالار بن کر آنے سے پہلے آپ کو حکیم بن کر آنا چاہیئے۔ پہلے اس کی نبض دیکھئے اور اس کے مرض کا علاج کیجئے پھر اس کی کمر سے تلوار بھی باندھ دیجئے گا۔ یہ کہاں کی ہوشمندی ہے کہ مریض تو بستر پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور آپ اس کے سرہانے کھڑے خطبہ دے رہے ہیں کہ اٹھ بہادر اپنی طاقت کے بل پر کھڑا ہو، باندھ کمر سے تلوار اور چل میدانِ کارزار میں!

یہ دونوں راستے جنہوں نے اختیار کیے ہیں، ان میں متعدد حضرات ایسے ہیں جن کے لیے ہمارے دل میں غایت درجہ کا احترام موجود ہے۔ ان کے خلوص ایمان میں ہم کو ذرہ برابر شک نہیں۔ مگر ان کی جلالتِ شان کا پورا پورا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ اس وقت مسلمانوں کی غلط رہنمائی کر رہے ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں، اور اس غلط رہنمائی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن اور مستقبل کے امکانات پر کافی غور وخوض نہیں کیا ہے۔

چند غور طلب حقائق

ہمارے رہنماؤں کو قدم اٹھانے سے پہلے حسبِ ذیل حقائق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

(۱) مسلمانوں کی حیاتِ قومی کو برقرار رکھنے کے لیے وہ چیز بالکل ناگزیر ہے جس کو آج کل سیاسی اصطلاح میں سلطنت کے اندر ایک سلطنت کہا جاتا ہے۔ ان کی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جب تک کہ خود ان کی اپنی جماعت میں کوئی قوتِ ضابطہ اور ہیئتِ حاکمہ موجود نہ ہو۔ ایسی ایک مرکزی طاقت کے بغیر کسی غیر مسلم نظامِ حکومت میں رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا اجتماعی نظام رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر فنا ہو جائے اور وہ بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ ہی نہ رہ سکیں۔

(۲) اٹھارہویں صدی کے سیاسی انقلاب نے ہم کو اس چیز سے محروم کر دیا اور اس کی بدولت جو اضمحلال ہماری سوسائٹی میں رونما ہوا اسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک مسلسل اور پیہم انحطاط کی طرف لے جانے کے بعد یہ انقلاب ہم کو ایک ایسے مقام پر چھوڑ رہا ہے جہاں ہماری جمعیت پراگندہ، ہمارے اخلاق تباہ، ہماری سوشل لائف ہر قسم کی بیماریوں سے زار و نزار اور ہمارے دینی و اعتقادات کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اور ہم موت کے کنارے پر کھڑے ہوتے ہیں۔

(۳) اب ایک دوسرے انقلاب کی ابتدا ہو رہی ہے جس میں دو قسم کے امکانات ہیں۔ اگر ہم نے اسی غفلت سے کام لیا جس سے گزشتہ انقلاب کے موقع پر کام لیا تھا، تو یہ دوسرا انقلاب بھی اسی سمت میں جائے گا جس میں پہلا انقلاب گیا تھا اور یہ اس نتیجہ کی تکمیل کر دے گا جس کی طرف ہمیں اس کا پیش رو لے جا رہا تھا۔ اور اگر ہم غیر مسلم

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نظامِ حکومت کے اندر ایک مسلم نظامِ حکومت (خواہ وہ محدود پیمانہ ہی پر ہو) قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے، تو انقلاب اپنا رُخ بدل دے گا اور ہمیں اپنے نظمِ اجتماعی کو پھر سے مضبوط کر لینے کا ایک موقع ہاتھ آجائے گا۔

(۴) سلطنت کے اندر ایک سلطنت قائم کرنا کسی سمجھوتے اور کسی میثاق کے ذریعہ سے ممکن نہیں کوئی غیر مسلم سیاسی جماعت، خواہ وہ کیسی ہی فیاض اور وسیع المشرب ہو، اس کے لیے بخوشی آمادہ نہیں ہو سکتی، نہ اس کو بحث و مباحثہ کی طاقت سے کسی دستوری قانون میں داخل کرایا جاسکتا ہے۔ اور بالفرض یہ ہو بھی جائے تو ایسی غیر معمولی چیز جس کی پشت پر کوئی طاقت ور رائے عام اور منظم قوت موجود نہ ہو عملی سیاست میں نقش بر آب سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتی۔ درحقیقت یہ چیز اگر کسی ذریعہ سے پائیدار بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ہم خود اپنے نظام کی قوت اور اپنے ناقابلِ تسخیر متحدہ ارادے سے اس کو بالفعل قائم کر دیں اور یہ ایک ایسا حاصل شدہ واقعہ بن کر ہندوستان کے آئندہ نظامِ حکومت کا جز بن جائے جس کو کوئی طاقت واقعہ سے غیر واقعہ نہ بنا سکے۔

(۵) یہ کام اس طرح انجام نہیں پاسکتا کہ ہم سرِدست انقلاب کو اسی رفتار پر چلنے دیں اور اس کی تکمیل ہونے کے بعد جب ہندوستان میں مکمل طور پر ایک غیر مسلم نظامِ حکومت قائم ہو جائے، اس وقت سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کی کوشش کریں۔ اس چیز کو صرف وہی شخص قابلِ عمل خیال کر سکتا ہے جس کو عملی سیاست کی ہوا تک چھو کر نہ گزری ہو۔ ایک ہوش مند آدمی تو بادنیٰ تامل یہ سمجھ لے گا کہ انقلاب کا رُخ صرف دورانِ انقلاب ہی میں بدلا جاسکتا ہے، اور سلطنت کے اندر سلطنت صرف اسی صورت میں بن سکتی ہے۔ جب کہ سلطنت کی تعمیر کے دوران میں اس کی بنا ڈال دی جائے۔

(۶) جس قسم کی تنظیم اس مقصد کے لیے درکار ہے وہ کانگریس کے فریم میں

داخل ہو کر نہیں کی جا سکتی۔ کانگریس ایک منظم جماعت ہے۔ اور ہر منظم جماعت میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ افراد کو اپنے دائرے میں لے کر اپنی فطرت اور اپنے مخصوص نفسیات کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ مسلمانوں میں اگر مضبوط اسلامی کیرکٹر اور طاقتور اجتماعی نظم موجود ہو تو البتہ وہ کانگریس کے فریم میں داخل ہو کر اس کے نفسیات اور اصول و مقاصد میں تغیر پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ جن کمزوریوں میں مبتلا ہیں (جن کی تشریح پہلے کی جا چکی ہے) ان کو لیے ہوئے منتشر افراد کی صورت میں ان کا ادھر جانا تو صرف ایک ہی نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہمارے جمہور پر کانگریسی نفسیات کا غلبہ ہو جائے، وہ اکابر کانگریس کی رہنمائی تسلیم کر کے ان کے اشارات پر چلنے لگیں اور اسلامی مقاصد کے لیے مسلمانوں میں ایک رائے عام تیار کرنے کے جو امکانات ابھی باقی ہیں وہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔ ہر شخص جس کو خدا نے دیدۂ بینا عطا کیا ہے اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ نیشنلسٹ قسم کے مسلمان اگر کانگریس کے اندر کوئی بڑی قوت پیدا کر لیں اور حکومت کے اقتدار میں انہیں کوئی بڑا حصہ مل جائے تب بھی وہ مسلمانوں کے لیے کچھ مفید نہ ہوں گے، بلکہ غیر مسلموں سے کچھ زیادہ ہی نقصان رساں ثابت ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ ہر معاملہ میں پالیسی اور طریق کار تو وہی اختیار کریں گے جو ایک غیر مسلم کرے گا، مگر ایسا کرنے کے لیے ان کو اس سے زیادہ آزادی اور جرأت حاصل ہو گی جو ایک غیر مسلم کو حاصل ہو سکتی ہے اس لیے کہ بدقسمتی سے ان کے نام مسلمانوں کے سے ہوں گے۔

اسلامی جماعت کو مضبوط بنانے کیلئے ضروری تدابیر

مذکورہ بالا حقائق کو پیش نظر رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ ہمارے لیے اب صرف ایک ہی راستہ باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ میں شریک ہونے سے پہلے اپنی کمزوریوں کو دور کریں اور اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس سے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ مسلمان کی آزادی کا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصول بھی ممکن ہو۔ اس غرض کے لیے ہم کو اپنی قوتیں جن کاموں پر صرف کرنی چاہئیں وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) مسلمانوں میں وسیع پیمانہ پر اصولِ اسلام اور قوانین شریعت کا علم پھیلایا جائے اور ان کے اندر کم از کم اتنی واقفیت پیدا کر دی جائے کہ وہ اسلام کے حدود کو پہچان لیں اور یہ سمجھ سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کن خیالات اور کن عملی طریقوں کو قبول کر سکتے ہیں اور کن کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نشر و تبلیغ صرف شہروں ہی میں نہیں ہونی چاہیے بلکہ دیہات کے مسلمانوں کو شہری مسلمانوں سے زیادہ اس کی ضرورت ہے۔

(۲) علم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عملاً احکامِ اسلامی کا متبع بنانے کی کوشش کی جائے اور خصوصیت کے ساتھ ان ارکان کو پھر سے استوار کیا جائے، جن پر ہمارے نظامِ جماعت کی بنیاد قائم ہے۔

(۳) مسلمانوں کی رائے عام کو اس طرح تربیت کیا جائے کہ وہ غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روکنے پر مستعد ہو جائیں، اور ان کا اجتماعی ضمیر (Social Conscience) احکامِ اسلامی کے خلاف افراد کی بغاوت کو برداشت کرنا چھوڑ دے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جس چیز کے استیصال پر توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے وہ تشبہ بالاجانب ہے، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو ہم کو غیروں میں جذب ہونے کے لیے تیار کرتی ہے۔

(۴) ہمیں اپنی اجتماعی قوت اتنی مضبوط کرنی چاہیے کہ اپنی جماعت کے ان غداروں اور منافقوں کا استیصال کر سکیں جو اپنے دل کے چھپے ہوئے کفر و نفاق کی وجہ سے یا ذاتی اغراض کی خاطر اسلامی مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

(۵) ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ جمہور مسلمین کی قیادت کا منصب نہ انگریز کے غلاموں کو حاصل ہو سکے، نہ ہندو کے غلاموں کو، بلکہ ایک ایسی جماعت کے قبضہ میں آجائے جو ہندوستان کی کامل آزادی کے لیے دوسری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمسایہ قوموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر بدل و جان آمادہ ہو، مگر اسلامی مفاد کو کسی حال میں قربان کرنے پر آمادہ نہ ہو۔

(۹) مسلمانوں میں اس قدر اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل پیدا کر دیا جائے کہ وہ تنِ واحد کی طرح ہو جائیں اور ایک مرکزی طاقت کے اشاروں پر حرکت کرنے لگیں۔

اس وقت مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے شاید بعض لوگ یہ خیال کریں گے کہ ایسا ہونا محال ہے۔ خود میرے متعدد دوستوں نے کہا کہ تم خیالی پلاؤ پکا رہے ہو۔ یہ قوم اس قدر گر چکی ہے کہ اب کوئی اعجازی قوت ہی اس کو سنبھالے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اس قوم کو سنبھالنے کا موقع، آخری موقع باقی ہے۔ ہمارے خواص خواہ کتنے ہی بگڑ چکے ہوں، مگر ہمارے عوام میں ابھی ایمان کی دبی ہوئی ایک چنگاری موجود ہے اور وہی ہمارے لیے آخری شعاعِ اُمید ہے قبل اس کے کہ وہ بجھے، ہم اس سے بہت کچھ کام لے سکتے ہیں بشرطیکہ چند مردِ مومن ایسے اٹھ کھڑے ہوں جو خلوصِ نیت کے ساتھ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہوں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ہم کانگریس سے تصادم چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے تو ہمارا مقصد وہی ہے جو کانگریس کا ہے۔ (یعنی ملک کی آزادی[1]) اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس مشترک مقصد (آزادی) کے لیے ہم کو بالآخر کانگریس کے ہی ساتھ تعاون کرنا ہے۔ لیکن سردست ہم اس سے صرف اس لیے

---

[1] یعنی غیر ملکی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لیے۔ باقی رہا حصولِ آزادی کا وہ طریقہ جو کانگریس نے اختیار کیا یعنی "متحدہ قومیت" اور "وطن پرستی"، تو اسی مضمون اور اس پوری کتاب میں اس پر تنقید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ راستہ مسلمانوں کی راہ سے کتنا مختلف اور اسلام سے دُور لے جانیوالا ہے۔ اس مضمون میں چند پیراگراف قبل مولانا فرما چکے ہیں کہ جو لوگ اس تحریک کو پروان چڑھا رہے ہیں وہ ان کے خیال میں "کلائیو اور ولزلی" اور ان کے مسلمان متبع "میر جعفر اور میر صادق" ہیں (صفحہ ۷۶ پیرا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

علیحدہ رہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنے مفاد کا تحفظ کرنے کے لیے ہم کو جس اخلاقی قوت اور اجتماعی نظم کی ضرورت ہے وہ ہم میں نہیں ہے۔ سب سے پہلے ہم اپنی کمزوریوں کو دُور کرنا چاہتے ہیں اور اس غرض کے لیے ہم کو ایسی فضا درکار ہے جو مزاحمت اور تصادم سے پاک ہو۔ پس اگر کانگریس ہم سے تعرض کیے بغیر اپنا کام جاری رکھے تو ہمیں اس سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اس کے برعکس ہماری ہمدردیاں مشترک ہندوستانی مقاصد کی حد تک اس کے ساتھ رہیں گی۔ البتہ اگر وہ ہماری غیر منظم جماعت کو اپنے نظم میں جذب کرنے کی کوشش کرے گی، اور براہِ راست ہمارے عوام میں "وطن پرستی" اور "اشتراکیت" کی تبلیغ شروع کر دے گی اور اس غرض کے لیے ہماری قوم کے ان منافقوں سے کام لے گی جن کی حیثیت ہماری نگاہ میں دوسری قسم کے منافقوں (یعنی انگریزی اقتدار کے ایجنٹوں) سے کچھ بھی مختلف نہیں تو اس صورت میں ہم کو مجبوراً اس سے لڑنا پڑے گا، اور اس لڑائی کا تمام تر الزام خود اسی پر عاید ہوگا۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی موجودہ پالیسی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اپنے مسلک کی تبلیغ کرنا اور مخالف خیالات رکھنے والوں کو تبدیلِ خیال (Conversion) پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنا ہر جماعت کا حق ہے۔ ہم کہتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۵) سے کچھ بھی مختلف نہیں، اور اس تحریک کو وہ "شدھی" کی تحریک قرار دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے مولانا کے اس جملہ کو غلط معنی پہنا کر یہ جھوٹا دعویٰ کیا ہے کہ وہ "کٹر کانگریسی تھے"! جو شخص بھی اس کتاب کو پڑھے گا وہ اس بہتان کی حقیقت سے واقف ہو جائے گا، اور اسے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ مولانا کے مخالفین بددیانتی کی کس سطح پر اتر آتے ہیں۔ نیز یہاں یہ وضاحت بھی بے موقع نہ ہوگی کہ مولانا مودودی صاحب اپنی زندگی کے کسی دَور میں بھی ایک دن کے لیے بھی کانگریس کے ممبر نہیں رہے اور نہ اس سے کسی اور حیثیت میں وابستہ رہے۔ (مرتب)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں کہ اگر آپ کو یہ حق حاصل ہے تو ہم کو بھی جوابی تبلیغ کا حق پہنچتا ہے۔ وطن پرستی اور اشتراکیت کی تبلیغ ہماری نگاہ میں شدھی کی تبلیغ سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہے اور دونوں کی مزاحمت ہمارے لیے ناگزیر ہے۔ اگر آپ اس تصادم کے لیے تیار ہیں اور اس کو ہندوستان کے مستقبل کے لیے مفید سمجھتے ہیں تو یہ آپ کی سخت نادانی ہے۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصّہ دوم

اِصلاح کا راستہ

قرآن و سنّت کی روشنی میں مسلمانوں کیلئے صحیح راہِ عمل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حالات کا جائزہ لینے اور راہِ عمل کی نشاندہی کرنے کے بعد مولانا مودودی صاحب نے اس سلسلۂ مضامین میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ مسائل حاضرہ میں قرآن و سنّت کی راہنمائی کیا ہے اور مسلمانوں کے ملی و قومی عزائم کیا ہو سکتے ہیں۔ ان مضامین میں مولانا محترم مسلمانوں کے قومی نصب العین کو بیان فرماتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ اپنی تہذیب، اپنے دین اور اپنی روایات کا تحفظ اور ان کی بنیاد پر ایک نئی زندگی کی تشکیل ہے۔ یہ مضامین بھی مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اوّل میں شائع ہو چکے ہیں۔ (مرتب)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسائل حاضرہ میں
قرآن اور اُسوۂ رسولؐ کی رہنمائی

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف ۳)

پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف خدا کے پاس سے نازل کی گئی ہے۔ خدا کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرنے لگو۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۔ (آلِ عمران ۳۱)

اے نبی کہہ دو اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو۔ خدا تم کو دوست بنا لے گا اور تمہیں بخش دے گا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۔

(الاحزاب ۲۱)

تمہارے لیے یقیناً اللہ کے رسول میں عمل کا اچھا نمونہ موجود ہے

جو کوئی اللہ کی رحمت کا اُمیدوار ہو اور آخرت کے آنے کی توقع رکھتا ہو اور اللہ کو بہت یاد رکھنے والا ہو اس کے لیے (تو پیروی کا صحیح نمونہ وہی ہے)

جو لوگ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، یا جنہوں نے کبھی قرآن پڑھا ہے ان کی نظر سے اس کتاب پاک میں یہ آیات ضرور گزری ہوں گی۔ بہت سوں کو ان کے معانی سے بھی واقفیت ہوگی۔ خصوصاً آخری آیت سے تو کوئی وعظ اور کوئی اصلاحی خطبہ خالی نہیں ہوتا مگر آج ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ایک بار پھر یہ آیات نظروں کے سامنے لائی جائیں۔ کیونکہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ شاید ساری مسلمان قوم ان آیات کو بھول گئی ہے۔

جملاً ہر مسلمان اس بات کو جانتا اور مانتا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم کو قرآن اور اسوۂ رسول ہی کا اتباع کرنا چاہیئے۔ اور ہمارے لیے ہدایت انہی دو چیزوں میں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ہدایت جس کے اتباع کا حکم اس قطعیت کے ساتھ ہم کو دیا گیا ہے، آیا اس کا دائرہ صرف طہارت اور استنجا اور عبادات اور باصطلاحِ زمانۂ حال "مذہبی" معاملات ہی تک محدود ہے یا ہماری زندگی کے چھوٹے اور بڑے، دینی اور دنیوی، قومی اور ملکی تمام معاملات پر حاوی ہے؟ نیز یہ ہدایت صرف اس زمانہ اور اس ملک کے لیے تھی جس میں قرآن نازل ہوا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے، یا درحقیقت یہ زمانی و مقامی قیود سے مبرا ہے اور اس میں ہر زمانے اور ہر ملک کے مسلمانوں کے لیے ویسی ہی سچی اور صحیح رہنمائی موجود ہے جیسی ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے عربوں کے لیے تھی؟ اگر پہلی بات ہے تب تو نعوذ باللہ قرآن کا یہ مطالبہ ہی غلط ہے کہ سب رہنماؤں کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے، اور تمام دنیا کے طریقوں کو ترک کرکے صرف اُس ایک شخص کے اسوہ کا اتباع کیا جائے جو ہمارے پاس قرآن لایا تھا۔ اس صورت میں تو اتباع کرنے کے بجائے ہم کو اپنے ایمان ہی پر نظرِ ثانی کرنی پڑے گی لیکن اگر بات دوسری ہے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو یہ کیا ماجرا ہے کہ تم وضو اور غسل کے مسائل میں، نکاح اور طلاق کے معاملات میں، ترکے اور وراثت کے مقدمات میں تو اس سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرتے ہو۔ لیکن جن مسائل کے حل پر تمہاری قوم کی زندگی و موت کا مدار ہے ان میں نہیں دیکھتے کہ قرآن تمہیں کون سا راستہ دکھاتا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کس طرف تمہاری رہنمائی کرتی ہے۔

انتشارِ خیال و تشتتِ عمل

ہندوستان میں ہر طرف ایک بے چینی نظر آتی ہے۔ ساری مسلمان قوم پر ایک پریشانی چھائی ہوئی ہے۔ مستقبل کا سوال ایک درشنی ہنڈی کی طرح مسلمانوں کے سامنے آن کھڑا ہوا ہے، اور تقاضا کر رہا ہے کہ یا تو میرا معاملہ صاف کرو یا دیوالہ نکالو لیکن اس قوم کا حال کیا ہے؟ جس کا جدھر منہ اٹھ رہا ہے چلا جا رہا ہے۔ اور جس کے ذہن میں جو بات آ رہی ہے کہہ رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ کوئی مارکس اور لینن کے اسوے کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہے، کوئی ہٹلر اور مسولینی کی سنت پر عمل کر رہا ہے، کوئی گاندھی اور جواہر لال کے پیچھے چلا جا رہا ہے، کوئی فرائض کی فہرست میں ایک نئے فرض (جنگ آزادی) کا اضافہ کر رہا ہے، کسی پر نشستوں اور ملازمتوں کے فی صدی تناسب کا بھوت سوار ہے، کوئی حرکت اور عمل کا پجاری بنا ہوا ہے اور ہانکے پکارے کہہ رہا ہے کہ اگر پشاور کی گاڑی نہیں چلتی تو راس کماری ہی کی طرف جانے والی گاڑی پر سوار ہو جاؤ، اس لیے کہ منزلِ مقصود کوئی نہیں، حرکت ہی فی نفسہ موجود ہے۔ غرض ہر شخص جو کچھ بول سکتا ہے ایک نئی تجویز قوم کو سنا دیتا ہے اور ہر شخص جو کچھ لکھ سکتا ہے ایک ماہرانہ و مبصرانہ مقالہ لکھ کر شائع کر دیتا ہے۔ مگر اس تمام شور و شغب اور اس پورے ہنگامے میں کسی کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ ہمارے پاس قرآن نامی بھی کوئی کتاب ہے جس نے زندگی کے ہر مسئلہ میں ہماری رہنمائی کا ذمہ لے رکھا ہے اور ہم سے کبھی یہ بھی کہا گیا تھا کہ زندگی کے ہر معاملہ میں تمہارے لیے ایک عملی نمونہ موجود ہے

ہدایت صرف کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہؐ میں ہے

مسلمانوں کو مختلف راستوں کی طرف بلایا جا رہا ہے۔ ہر راستہ کی طرف بلانے والوں میں بڑے بڑے مقدس علماء ہیں۔ بڑے بڑے نامور لیڈر ہیں۔ بڑے بڑے زبان آور خطیب اور ماہرِ فن انشا پرداز ہیں۔ ہر وادی کے سرے پر ایسے لوگ کھڑے ہیں جن کی آزمودہ کاری مسلّم، قومی خدمت ناقابلِ انکار، اور سیاسی مہارت تا بصیرت معروف و مشہور۔

ہر رہنما بڑی قابلیت کے ساتھ اپنے اپنے راستے کے نشیب و فراز دکھا رہا ہے اور دوسرے راستوں کے خدشات بیان کر رہا ہے۔ یہ سب کچھ قابلِ قدر ہے۔ مگر مسلمان کی فطرت کہتی ہے ایتونی شیئا من کتاب اللہ وسنۃ رسولہ حتی اقبل۔ میرے سامنے شخصیتوں کو نہ لاؤ۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، عالم و فاضل ہو، مفسرِ قرآن ہو، معلّمِ حدیث ہو، ماہرِ سیاست ہو، عمل اور قربانی کا نمونہ ہو، اس کی حرمت میرے سر اور آنکھوں پر، مگر جو ہدایت وہ دے رہا ہے، اگر وہ اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے تو میرے لیے لائقِ اتباع نہیں۔ ہاں اگر وہ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ میں کوئی دلیل اپنے پاس رکھتا ہے تو شخصی عظمت کی آمیزش سے الگ کر کے اس کو اور صرف اس کو سامنے لاؤ۔ اس لیے کہ وہی لائقِ اتباع ہے، اسی میں سچی ہدایت ہے، اور اسی کی پیروی میں فلاح و نجات ہے۔ اس کے بتائے ہوئے راستہ میں خواہ کتنی ہی دشواریاں ہوں، کتنے ہی خدشات اور کتنے ہی نقصانات ہوں، آخری اور دیرپا اور یقینی کامیابی اسی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آئیے آج اسی نقطۂ نظر سے قرآن اور سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر غور کریں کہ ہمارے اس وقت کے قومی مسائل میں اس کے اندر کیا ہدایت ہے۔ کچھ پروا نہیں اگر کوئی اس بات کو دقیانوسیت اور رجعت پسندی کہہ کر ناک بھوں چڑھائے۔ حالات جدید سہی، جغرافی ماحول مختلف سہی، مگر جس ہدایت کی طرف ہم رجوع کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے ہیں، ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہر زمانہ میں جدید ہے، ہر دور میں وقتی ہے، اور ہر جغرافی ماحول میں مقامی ہے۔

بعثتِ محمدی کے وقت عرب کی حالت اور حضورؐ کا طرزِ عمل

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت آپؐ کے وطن کی سیاسی حالت کیا تھی اور اس حالت میں آپؐ نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس وقت عرب ہر طرف ظالم سلطنتوں سے گھرا ہوا تھا اور خود ملک کے اندر ہمسایہ قوموں کا امپیریلزم نفوذ کر چکا تھا۔ آپؐ کی پیدائش سے چند ہی روز قبل حبشی فوجیں یلغار کرتی ہوئی خاص اس شہر تک پہنچ گئی تھیں جس میں آپؐ پیدا ہوئے۔ عرب کا سب سے زیادہ زرخیز صوبہ یمن پہلے حبشیوں کے اور پھر ایرانیوں کے تسلط میں جا چکا تھا۔ عرب کے جنوبی اور مشرقی سواحل ایرانیوں کے زیرِ اثر تھے۔ عراقِ عرب کا علاقہ نجد کے حدود تک ایرانیوں کے اثر میں تھا۔ شمال میں عقبہ اور معان تک بلکہ تبوک تک سلطنتِ روم کے اثرات پہنچے ہوئے تھے۔ دونوں ہمسایہ سلطنتیں عرب کے قبائل کو اپنی اغراض کے لیے ایک دوسرے سے لڑاتی تھیں اور اندرونِ عرب میں اپنے اثرات پھیلا رہی تھیں متعدد مرتبہ قسطنطنیہ کا قیصر مکہ کی چھوٹی سی ریاست کے معاملات میں مداخلت کر چکا تھا۔ عربی قوم کو ہر ملک گیر طاقت اپنے قبضہ میں لانا چاہتی تھی، کیونکہ اس قوم کا ملک بنجر تھا، مگر قوم بنجر نہ تھی۔ جہانگیری کے لیے بہترین سپاہی اس سے فراہم ہو سکتے تھے۔

ان حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپؐ نے کیا کیا؟

اگرچہ آپؐ کو اپنے وطن اور اپنی قوم سے فطری محبت تھی اور آپؐ سے بڑھ کر حریت پسند کوئی نہ تھا مگر آپؐ نے ایک قوم پرست (Nationalist) یا وطن پرست (Patriot) کی حیثیت اختیار نہ کی۔ بلکہ ایک حق پرست اور خدا پرست کی حیثیت اختیار کی۔ آپؐ کی نگاہ میں مقدم کام یہ نہ تھا کہ اپنے اہلِ وطن کی قوت کو مجتمع کر کے اجنبی استیلاء کی جڑیں خاکِ وطن سے اکھاڑ پھینکیں بلکہ دوسرے ہر

کام سے مقدم یہ کام تھا کہ حق پرستوں کا ایک جتھا بنائیں اور اُس کے اندر ایسی طاقت پیدا کر دیں کہ وہ صرف عرب ہی میں نہیں ، بلکہ خود روم و ایران میں بھی ظلم و عدوان کے استیلاء کا خاتمہ کر دے ۔ آنحضرت ؐ کے اہلِ وطن آپؐ کے بہترین اوصاف سے واقف تھے ۔ انہوں نے عرب کی بادشاہی کا تاج آپؐ کے سامنے پیش کیا تھا ، اس شرط پر کہ آپؐ اپنے اس جتھے کی توسیع و تنظیم سے باز آ جائیں ۔ اگر آپؐ وطن پرست ہوتے تو خدمتِ وطن کا موقع اس سے بہتر اور کون سا ہو سکتا تھا ؟ مگر آپؐ نے اس تاج کو ٹھکرا دیا ، اور اسی کام میں لگے رہے جس کے بار آور ہونے کی کم از کم اس وقت کوئی شخص امید نہ کر سکتا تھا ۔ اس وقت آپؐ کی جمعیت دس بارہ آدمیوں سے زیادہ نہ تھی ۔ تمام ملک میں کوئی قبیلہ اور کوئی گروہ آپؐ کا ساتھی نہ تھا ۔ بلکہ سب مخالف اور سخت مخالف تھے ۔ ظاہر اسباب کے لحاظ سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ اسکیم کب کامیاب ہو گی جس کو آپؐ لے کر اٹھے تھے ۔ اس بات کا ہر وقت امکان تھا کہ واقعۂ فیل کی طرح کا کوئی دوسرا واقعہ پھر پیش آ جائے اور حجاز بھی یمن اور ارضِ غسان کی طرح اجنبی حکومت کا غلام بن جائے ، مگر آپؐ نے ہر حال میں یہی ضروری سمجھا کہ پہلے حق پرستوں کی جمعیت کو بڑھائیں اور مضبوط کر لیں ، پھر جیسی صورتِ حال ہو اس کے مطابق ملکیوں اور غیر ملکیوں کے ساتھ کوئی معاملہ کریں ۔

اس کی کیا وجہ تھی ؟ کیا آپؐ "کمیونسٹ" تھے ؟ کیا آپؐ نعوذ باللہ اپنے وطن کے غدار تھے ؟ کیا خاکم بدہن آپؐ غیر ملکی امپیریلزم کے ایجنٹ تھے ؟ ہرگز نہیں ۔ تاریخ کے ناقابلِ انکار حقائق گواہ ہیں کہ کسی فرزندِ وطن نے اپنے وطن کو اتنی سر بلندی عطا نہیں کی جتنی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت عرب کو نصیب ہوئی ۔ اور تاریخ ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ کسی داعیِ دین نے غیر مذہب والوں کے ساتھ اتنے تحمل ، اتنی فیاضی ، اتنی رواداری ، اور اتنی فراخ حوصلگی کا برتاؤ نہیں کیا ۔ پھر یہ بھی دنیا کو معلوم ہے کہ اللہ کے رسول ؐ نے کبھی روٹیوں کی تقسیم اور منافع کے بٹوارے کا سوال نہیں اٹھایا ۔ آپؐ نے نہ کبھی کی زندگی میں اس بنیاد

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر مصالحت کی کہ ریاست، قریش کے دارالندوہ اور جنگی و سیاسی عہدوں میں مسلمانوں کی اتنی نمائندگی ہو، اور نہ مدنی زندگی میں اس مسئلہ کو مدارِ صلح قرار دیا کہ یہود کے معاشی وسائل میں مسلمانوں کا اتنا حصّہ ہو۔

اب غور کیجیے کہ جب وہاں نہ کمیونزم تھا، نہ وطن دشمنی تھی، نہ اعدائے وطن سے ساز باز تھا، تو پھر کون سی چیز تھی جس کی بنا پر آپ نے عرب کی سیاسی نجات اور تمدّنی و معاشی فلاح پر اپنی بہترین قوتوں اور قابلیتوں کو صرف کرنے سے انکار کیا اور ہر کام سے پہلے خدا کا نام لینے والوں کی ایک طاقتور جمعیت بنانا اور زمین میں اس کا دبدبہ قائم کرنا ضروری سمجھا؟ اس کا جواب ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نصب العین وطن پرست کے نصب العین سے بالکل مختلف تھا۔ اِس نصب العین کی راہ میں باہر کے قیصر و کسریٰ اور گھر کے ابوجہل اور ابولہب دونوں یکساں سدِّ راہ تھے۔ اِس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ناگزیر تھا کہ واقعات کی رفتار اور ملک کے مستقبل اور آئندہ کے امکانی خدشات، سب کی طرف سے بے پروا ہو کر ایک ایسی جماعت کو منظم کیا جائے جو باطل کے غلبہ کو کسی صورت میں قائم نہ رہنے دے، اور اپنی طاقت سے زمین میں ایسی حالت قائم کر دے جس میں خدا پرستانہ تہذیب امن کے ساتھ پھل پھول سکے۔ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ[1]

وہی نصب العین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمان قوم کو دے گئے ہیں۔ مسلمان قوم ایک قوم ہی اِس بُنیاد پر بنی ہے کہ یہ نصب العین اس کے تمام افراد کا مشترک اور واحد نصب العین ہے۔ اِس نصب العین کو سلب کر لیجیے، پھر مسلمان

---

[1] اور ان لوگوں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر و فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔ (انفال: ۳۹)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قوم کسی قوم کا نام نہیں ۔ یہاں عرب اور عجم کی کوئی خصوصیت نہیں ۔ زمان و مکان کا کوئی سوال نہیں ۔ مسلمان اگر مسلمان ہے تو ہر حال میں یہی اس کا نصب العین ہے ۔

مسلمانوں کو کس طرح جمع کیا جا سکتا ہے ؟

اب ایک دوسری نظر اسی کتاب ہدایت اور اسی سیرت پاک پر ڈالیے ۔ یہ جتھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا ، اس کی بنیاد کسی مادرِ وطن کی فرزندی ، کسی نسلِ انسانی کے انتساب ، کسی سیاسی و معاشی مفاد کے اشتراک پر نہ تھی بلکہ ایک مخصوص عقیدے اور ایک مخصوص طرزِ عمل پر تھی ۔ اس کو جوڑنے والی طاقت خدا کی محبت اور بندگی تھی نہ کہ اغراض کی محبت اور مادی مقاصد کی بندگی ۔ اس کی طرف لوگوں کو بلانے والا نعرہ اذان کا نعرہ تھا ، نہ کہ وطنیت کا نعرہ ۔ اس کے اجزاء کو سمیٹ کر ایک بنیانِ مرصوص بنانے والی چیز ایک اَن دیکھے خدا کی عبادت تھی ، نہ کہ کوئی محسوس مرئی علامت ۔ اس کو حرکت میں لانے والی چیز رضائے الٰہی کی طلب تھی نہ کہ منافع مادی کی طلب ۔ اس میں عمل کی گرمی پھونکنے والی قوت اعلائے کلمۃ اللہ کی خواہش تھی نہ کہ نسل و وطن کو سربلند کرنے کی تمنا ۔

اس قوم کے نفسیات دنیا سے نرالے ہیں ۔ جو چیزیں دنیا کو جمع کرنے والی ہیں وہ اس قوم کو منتشر کر دینے والی ہیں ۔ جو صدائیں اپنے اندر دوسروں کے لیے غیر معمولی کشش رکھتی ہیں وہ اس قوم کے دل میں اُلٹی نفرت پیدا کر دیتی ہیں ——— جن مرئی علامتوں پر دوسرے گرویدہ ہوتے ہیں مسلمان ان کیلئے کوئی جذبہ عقیدت اپنے اندر نہیں پاتے ——— جن چیزوں میں دوسروں کو گرما دینے کی طاقت ہے وہ ان کے دلوں میں اُلٹی سردی پیدا کر دینے کا اثر رکھتی ہیں ——— جو چیزیں دوسروں کو عمل پر اُبھارنے والی ہیں وہی ان کو میدانِ عمل سے دُور بھگانے والی ہیں ۔

سارے قرآن کو اُٹھا کر دیکھ جاؤ ۔ پوری سیرت نبوی پر نظر ڈالو اور خلافت راشدہ کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دَور سے اِس زمانہ تک کی اسلامی تاریخ پڑھ لو۔ تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کی فطرت کیا ہے اور مسلمان قوم کا مزاج کس قسم کا ہے۔

جو قوم اس سوال پر صدیوں سے جھگڑ رہی ہے کہ نبیؐ پر سلام بھیجتے وقت بھی کھڑا ہونا چاہیئے یا نہیں، کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ "بندے ماترم" کا گیت سُننے کے لیے تعظیماً کھڑی ہو گی؟ جس قوم کے دل میں مرئیات سے عقیدت کے بجائے سخت نفرت بٹھائی گئی ہے، کیا تمہیں اُمید ہے کہ وہ کسی جھنڈے کو سر جھکا کر سلامی دے گی؟ جو قوم تیرہ سو برس تک خدا کے نام پر بُلائی جاتی رہی ہے، کیا تم سمجھتے ہو کہ اب وہ بھارت ماتا کے نام پر پروانہ وار دوڑی چلی آئے گی؟ جس قوم کے دل میں عمل کی گرمی پیدا کرنے والا داعیہ اب تک محض اعلائے کلمۃ اللہ کا داعیہ رہا ہے، کیا تمہارا گمان ہے کہ اب معدے اور بدن کے مطالبات اس میں حرارت پیدا کریں گے؟ یا کونسلوں کی نشستوں اور ملازمتوں کے تناسب کا سوال اس کے قلب و رُوح کو گرما دے گا؟ جس قوم کو عقیدے اور عمل کی وحدت پر جمع کیا گیا تھا، کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ سیاسی اور معاشی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر کوئی طاقتور عملی قوم بن جائے گی؟ تخیل کی بنیادوں پر نظریات کی عمارتیں اُٹھانے والے جو چاہیں کہیں، مگر جس کسی نے قرآن اور سُنت سے اسلام کے مزاج کو سمجھا ہے، وہ بادنیٰ تامل یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ مسلمان قوم کی فطرت جب تک بالکل مسخ نہ ہو جائے، وہ نہ تو ان محرکات سے حرکت میں آسکتی ہے اور نہ ان جامعات کے ذریعہ سے جمع ہو سکتی ہے۔ غیر مسلم بلاشبہ اِن ذرائع سے جمع ہو جائیں گے اور ان میں حرکت بھی ان محرکات سے پیدا ہو جائے گی کیونکہ ان کو جمع کرنے اور حرکت میں لانے والی کوئی اور چیز نہیں ہے۔ ان کا مذہب ان کو منتشر کرتا ہے اور صرف وطن کی خاک ہی ان کو جمع کرتی ہے۔ ان کے معتقدات ان کے دلوں کو سرد کرنے والے ہیں، ان میں حرارت صرف معدے ہی کی گرمی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ مگر مسلمان جس کو خدا کے نام پر جمع کیا گیا تھا اور جس میں ایمان کی گرمی پھونکی گئی تھی، آج تم اس کو ذلیل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مادّی چیزوں کے نام پر جمع نہیں ہوسکتے، اور نہ ادنیٰ درجہ کی خواہشات سے اس میں حرارت پیدا کرسکتے ہو۔ اس طریقہ میں اگر تم کو کامیابی نصیب ہوسکتی ہے تو صرف اس وقت جب کہ تم مسلمان کو فطرتِ اسلام سے ہٹادو اور اسے بلندیوں سے گرا کر پستیوں میں لے آؤ۔

اس کے معنی یہ نہ سمجھو کہ مسلمان وطن کا دشمن ہے۔ ہرگز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وطن کی اصلاح و ترقی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ خلفائے راشدین نے وطن اور ابنائے وطن کی کیا کچھ خدمت نہ کی؟ بعد کے مسلمان جس جس ملک میں گئے، انہوں نے اس کو جنّت بنا کر نہیں چھوڑا؟ غیر مسلم قوموں کے ساتھ فیاضانہ معاملہ کرنے میں کیا کبھی کوئی کوتاہی کی گئی؟ پس اُوپر ہم نے جو کچھ کہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے ملک یا اپنی قوم کے معاشی اور تمدّنی مسائل سے بالکل بے پروا ہے بلکہ ہم یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان کی اصلی قوّتِ محرکہ یہ چیزیں نہیں ہیں، اس کی جمعیت ان بنیادوں پر قائم نہیں ہوتی ہے، اس میں زندگی کی حرارت پیدا کرنے والی آگ یہ نہیں ہے۔ وہ طاقت ور اور منظم ہونے کے بعد ان سب مسائل کو حل کرنے میں حصّہ لے سکتا ہے اور دوسروں سے بڑھ کر حصّہ لے سکتا ہے، مگر اس کو طاقت ور اور منظم بنانے کے ذرائع یہ نہیں ہیں بلکہ کچھ اور ہیں۔

مسلم قوم کس طرح بنائی گئی تھی

اب ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ یہ دیکھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نئی قوم کن طریقوں سے بنائی تھی اور اس میں کن ذرائع سے وحدت اور قوّتِ عمل پیدا کی تھی۔

جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت لے کر اُٹھے تھے تو ساری دنیا میں تنہا آپ ہی ایک مسلم تھے۔ کوئی آپ کا ساتھی اور ہم خیال نہ تھا۔ دنیوی طاقتوں میں سے کوئی طاقت آپ کو حاصل نہ تھی۔ گرد و پیش جو لوگ آباد تھے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان میں خودسری اور انفرادیت انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی کسی کی بات سُننے اور اطاعت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ وہ نسل اور قبیلہ کی عصبیت کے سوا کسی اور عصبیت کا تصور ہی نہ کر سکتے تھے۔ ان کے ذہن ان خیالات اور مقاصد سے دُور کا لگاؤ بھی نہ رکھتے تھے جن کی تبلیغ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھے تھے۔ اس ماحول اور ان حالات میں کون سی طاقت تھی جس سے ایک تنہا انسان، بے یار و مددگار اور بے وسیلہ انسان نے ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچا؟ کیا آنحضرتؐ نے عربوں کو یہ لالچ دیا تھا کہ میں تم کو زمین کی حکومت دلواؤں گا؟ رزق کے خزانے دلواؤں گا؟ دشمنوں پر فتح اور غلبہ بخشوں گا؟ بیرونی غاصبوں کو نکال باہر کروں گا۔ اور عرب کو ایک طاقت ور سلطنت بنا دوں گا؟ تمہاری تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقی دوں گا؟ تمہارے وسائلِ معیشت بڑھاؤں گا اور تمہیں ایک ترقی یافتہ اور غالب قوم بنا کر چھوڑوں گا؟ ظاہر ہے کہ ایسا کوئی لالچ آپؐ نے نہیں دلایا تھا۔ پھر کیا آپؐ نے امیروں کے مقابلہ میں غریبوں کی، اور سرمایہ داروں اور زمین داروں کے مقابلہ میں مزدوروں اور کاشت کاروں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا تھا؟ سیرتِ نبویؐ گواہ ہے کہ یہ چیز بھی نہ تھی۔ پھر کیا آپؐ نے کوئی سیاسی یا تعلیمی یا تمدنی یا معاشی یا فوجی تحریک اُٹھائی تھی اور اس کی طرف لوگوں کو کھینچنے کے لیے نفسیاتی حربوں سے کام لیا تھا؟ واقعات شاہد ہیں کہ ان میں سے بھی کوئی چیز نہ تھی۔ پھر غور کیجیے کہ آخر وہ کس چیز کی کشش تھی جس نے عربی اور عجمی، امیر اور غریب، آقا اور غلام سب کو آپؐ کی طرف کھینچا؟ دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف دو چیزیں تھیں ایک قرآن کی تعلیم۔ دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت۔ لوگوں کے سامنے یہ پیغام پیش کیا گیا تھا اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ؎

؎ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ (آلِ عمران۔ ۶۴)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان کو اس بات پر جمع کیا گیا تھا کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ [1]

ان کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ [2]

ان کے سامنے یہ نصب العین رکھا گیا تھا کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ [3]

پھر جس شخص نے ان کو یہ دعوت دی تھی اس کا حال یہ تھا کہ کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ۔ وہ جو کچھ کہتا تھا سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر خود اس پر عمل کر کے دکھاتا تھا۔ وہ فضیلتِ اخلاق اور عملِ صالح کا مجسمہ تھا اور اس کی زندگی میں راست بازی اور راست روی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

یہی دو چیزیں تھیں جنہوں نے ہر طرف سے لوگوں کو کھینچا اور وہ قوم بنادی جس کا نام مسلمان ہے۔ نوعِ انسانی کے مختلف طبقوں اور گروہوں میں سے جن جن لوگوں کے لیے ان دو چیزوں میں کشش تھی، وہ اس مرکز کی طرف کھنچتے چلے گئے اور انہی سے مسلمان قوم وجود میں آئی۔ دوسرے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں سمجھیے کہ اسلامی جمعیت نام ہی اس جمعیت کا ہے جو قرآن اور سیرتِ نبوی کی کشش سے وجود میں آئی ہے۔

---

[1] لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ (اعراف۔ ۳)

[2] بے شک میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ (انعام۔ ۱۶۳)

[3] یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے منع کریں۔ (الحج۔ ۴۱)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جہاں زندگی کے وہ اصول اور مقاصد ہوں گے جو قرآن نے پیش کیے ہیں اور جہاں طرزِ عمل وہ ہوگا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا وہاں "مسلمان" جمع ہو جائیں گے ، اور جہاں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں گی وہاں اُن لوگوں کے لیے قطعاً کوئی کشش نہ ہوگی جو "مسلمان" ہیں۔

مسلمانوں کی قومی تحریکات کے ناکام ہونے کی وجہ

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہماری قومی تحریکات میں بنیادی نقص کون سا ہے جس کی وجہ سے مسلمان کسی تحریک کی طرف بھی فوج در فوج نہیں کھنچتے اور داعی کی آواز بہرے کانوں سے سنتے ہیں؟ ان کی فطرت وہ آواز سننا چاہتی ہے اور وہ طرزِ عمل دیکھنا چاہتی ہے جس کی کشش نے ان کو ساری دنیا سے الگ ایک قوم بنایا تھا۔ مگر افسوس کہ نہ وہ آواز کسی طرف سے آتی ہے اور نہ وہ طرزِ عمل کہیں نظر آتا ہے۔ بلانے والے ان کو ایسے مقاصد کی طرف بلاتے ہیں جو ان کی زندگی کے اصلی مقاصد نہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ علوّ اور تمکّن فی الارض کی طرف آؤ۔ حالانکہ یہ مسلمان کا نصب العین نہیں ہے بلکہ اپنے نصب العین (اعلائے کلمۃ اللہ) کے لیے اس کی بے غرضانہ جدوجہد کا طبعی نتیجہ ہے۔ کوئی اُن کو وطن پرستی کی طرف بلاتا ہے، حالانکہ اسی چیز کو چھوڑ کر تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہوئے تھے۔ کوئی ان کو نہایت ادنیٰ درجہ کے مادی فوائد کی طرف بلاتا ہے، حالانکہ مسلمان کی نگاہ میں ان کی حیثیت متاعِ غرور سے زیادہ نہیں۔ پھر جو لوگ مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے اُٹھتے ہیں ان کی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ادنیٰ جھلک تک نظر نہیں آتی۔ کہیں مکمل فرنگیت ہے۔ کہیں نہرو اور گاندھی کا اتباع ہے۔ کہیں جبّوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق لپٹے ہوتے ہیں۔ زبان سے وعظ، اور عمل میں بدکاریاں۔ ظاہر میں خدمتِ دین اور باطن میں خیانتیں، غداریاں اور نفسانی اغراض کی بندگیاں۔ جمہور مسلمین بڑی بڑی اُمیدیں لے کر ہر نئی تحریک کی طرف دوڑتے ہیں۔ مگر مقاصد کی پستیاں اور عمل کی خرابیاں دیکھ کر ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔

خیر یہ ایک دوسری داستان ہے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

طریق تنظیم پر غور کیجیے کہ مسلمان قوم کی تنظیم اگر ہو سکتی ہے تو اسی طریق پر ہو سکتی ہے۔

اسلامی تنظیم کے اصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی جمعیت اس ڈھنگ پر بنائی تھی کہ پہلے تو آپؐ نے انسانی گروہ میں سے صرف ان لوگوں کو چھانٹ لیا جن کی فطرت میں ایک خالص صداقت اور ایک پاک زندگی کی طرف کھنچنے کی صلاحیت تھی۔ پھر تعلیم و تربیت کے بہترین ذرائع سے کام لے کر ان میں سے ایک ایک فرد کی اصلاح فرمائی، اس کے دل میں زندگی کا ایک بلند مقصد بٹھا دیا، اور اس کے کیرکٹر میں اتنی مضبوطی پیدا کی کہ وہ اس مقصد کے لیے جم کر جدّ و جہد کرے اور کسی فائدہ کا لالچ یا کسی نقصان کا خوف اسے اس مقصد کی راہ سے نہ ہٹا سکے۔ اس کے بعد ان افراد کو ملا کر ایک جماعت بنا دیا تاکہ افراد میں جو کچھ کمزوریاں باقی رہ جائیں، جماعت کی طاقت ان کو دُور کر دے۔ اجتماعی ماحول ایسا بن جائے جس میں نیکیاں پرورش پائیں اور برائیاں ابھر نہ سکیں۔ افراد اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل میں ایک دوسرے کے مددگار رہیں، اور اجتماعی طاقت سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اس تعمیر کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی ماہرِ فن انجینئر اینٹوں کے ڈھیر میں سے چھانٹ کر بہترین اینٹیں لے۔ پھر ان کو اس طرح پکائے کہ ایک ایک اینٹ بجائے خود پختہ ہو جائے۔ پھر ان سب کو نہایت عمدہ سیمنٹ سے جوڑ کر ایک مستحکم عمارت بنا دے۔

اس تنظیم کے بڑے بڑے اصول یہ تھے:-

۱- جماعت کے تمام افراد کم از کم دین کے جوہر سے واقف ہوں تاکہ وہ کفر و اسلام میں تمیز کر کے اسلام کے طریقہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ سکیں۔

۲- اجتماعی عبادات کے ذریعہ سے افراد میں اخوت، مساوات اور تعاون کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۳۔ جماعت کے تمدن و معاشرت میں ایسے امتیازی خصائص اور حدود مقرر کیے جائیں جن سے وہ دوسری اقوام میں خلط ملط نہ ہو سکیں اور باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے ایک الگ قوم بنے رہیں۔ اسی لیے تشبہ بالاجانب کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی۔

۴۔ تمام اجتماعی ماحول پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر چھایا رہے تاکہ جماعت کے دائرہ میں کوئی انحراف اور کوئی بغاوت راہ نہ پا سکے۔ سرکشی کا پہلا اثر ظاہر ہوتے ہی اس کا استیصال کر دیا جائے اور منافقین کے ساتھ غلظت اور شدت کا ایسا برتاؤ ہو کہ یا تو وہ جماعت سے نکل جائیں یا اگر رہیں تو کوئی فتنہ نہ اُٹھا سکیں۔

۵۔ پوری مسلمان قوم ایک انجمن ہو، اور ہر مسلمان مرد اور عورت کو جزوِ اسلامی حق کی بنا پر اس کی رُکنیت کا مساویانہ مرتبہ حاصل ہو ——— ایسے تمام انتسابات اور امتیازات کو مٹا دیا جائے جو مسلم اور مسلم میں تفریق کرتے ہوں۔ ہر فردِ مسلم کو قومی معاملات میں حصہ لینے اور رائے دینے کا پُورا حق حاصل ہو، حتیٰ کہ ایک غلام بھی کسی کو امان دیدے تو وہ پوری قوم کی طرف سے امان ہو۔

۶۔ جماعت کے تمام افراد ایک نصب العین پر متحد ہوں اور اس کے لیے جدوجہد اور قربانی کرنے کا جذبہ ان میں موجود ہو ——— ایک گروہ صرف اسی نصب العین کی خدمت کے لیے وقف رہے۔ اور بقیہ افرادِ جماعت اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرنے کے ساتھ ساتھ پہلے گروہ کی ہر ممکن طریقہ سے مدد کرتے رہیں اور مجموعی طور سے پوری جماعت اور اس کے ہر ہر فرد کے دل میں یہ خیال بیٹھا ہوا ہو کہ اس کی زندگی کا اصل مقصود روزی کمانا نہیں بلکہ اسی ایک نصب العین کی خدمت کرنا ہے۔

تنظیم کے یہی اصول تھے جن سے وہ زبردست جماعت پیدا ہوئی جو دیکھتے دیکھتے آدھی دُنیا پر چھا گئی ——— اس طریقِ تنظیم کی رفتار ابتدا میں بہت سست

تھی، حتیٰ کہ پندرہ برس تک وہ چند سو سے زیادہ افراد کو اپنے دائرے میں نہ لا سکی۔ مگر اس میں یہ قاعدہ مدنظر رکھا گیا تھا کہ توسیع (Expansion) کے ساتھ استحکام (Consolidation) بھی ہوتا رہے۔ اس لیے یہ نظامِ جماعت جتنا پھیلتا گیا اتنا ہی مضبوط ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب ایک معتدبہ جماعت اس طریق پر منظم ہو گئی تو وہ اتنی طاقت کے ساتھ اٹھی کہ دنیا کی کوئی چیز اس کے سیلِ رواں کو نہ روک سکی۔ قرآن مجید میں اس کی چھوٹی سی ابتداء، پھر تدریجی ترقی، پھر غیر معمولی شان و شوکت کے ساتھ اس کے ظہور کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے:- كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ[1]

مسلمان قوم کے مزاج کے ساتھ یہی طریقِ تنظیم مناسبت رکھتا ہے۔ یہ قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے —— اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا، اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی دوری یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا، اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر گروہ بندیوں اور فرقوں کی مصیبتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے، بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہلِ مغرب سے لے لیے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں ہے کہ جو چیزیں دوسری قوموں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمان قوم کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔ اس قوم کو اگر کوئی چیز راس آسکتی ہے تو ایک ایسی جمہوری تحریک ہے

---

[1] (وہ) گویا ایک کھیتی ہے جس نے (پہلے زمین سے) اپنی سوئی نکالی۔ پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر موٹی ہوگئی اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے تاکہ کافروں کا جی جلائے۔ (الفتح - ۲۹)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو پوری قوم کو ایک انجمن سمجھ کر شروع کی جائے اور جس میں توسیع و استحکام کے اس تناسب کو ملحوظ رکھا جائے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملحوظ رکھا تھا۔ اب ہم اگر کچے اور کمزور مسالے سے ریت کی سطح پر ایک عمارت کھڑی کر دیں گے اور اس سے قلعے کا کام لینا چاہیں گے تو لامحالہ وہ سیلِ حوادث کی ایک ٹکر بھی نہ جھیل سکے گی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۶

اسلام ــــــ ایک جامع تہذیب

دین و دُنیا کی علیحدگی کا جاہلی تصوّر

اور

ہماری قومی سیاست میں اسکے اثرات

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے یہ بھی ایک شعبہ ہے، یا دوسرے الفاظ میں یہ انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لیے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے۔ اس کا تعلق کلیۃً صرف اس رشتہ سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنے ہوں اس کے لیے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق ہو کر صرف اسی ایک شعبہ کا ہو جائے مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں، بلکہ نجات مطلوب ہو، اور اس کے ساتھ یہ خواہش بھی ہو کہ معبود اُن پر نظرِ عنایت رکھے اور ان کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے اس کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیے بس اتنا کافی ہے کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس ضمیمہ کو بھی لگائے رکھے۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈھنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ چند مذہبی رسموں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے ابنائے نوع سے، اپنے گرد و پیش کی ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے، اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز، ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں۔

یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدّن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدّن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں، اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک ضمیمہ ہو، اس پر پوری زندگی کی عمارت ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ مذہب اور تہذیب و تمدّن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے پر تھوڑا یا بہت اثر ضرور ڈالا، مگر یہ اثر اس قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتب ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ مذہب نے تہذیب و تمدّن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادّی علائق سے نفرت، لذاتِ دنیوی سے کراہت، عالمِ اسباب سے بے تعلقی، انسانی تعلقات میں انفرادیت، تنافر اور تعصب کے عناصر داخل کر دیے۔ یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پرور نہ تھا۔ بلکہ دنیوی ترقی کی راہ میں انسان کے لیے ایک سنگِ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدّن نے جس کی بنیاد سراسر مادیت اور خواہشاتِ نفس کے اتباع پر قائم تھی، مذہب پر جب کبھی اثر ڈالا اس کو گندا کر دیا۔ اس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں، اور اس سے ہمیشہ یہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اس گندی اور بد سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہے، مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا جائے، تاکہ نہ خود اپنا ضمیر ملامت کرے نہ کوئی دوسرا اس کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ اسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادتوں تک میں ہم کو لذت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جن کو مذہبی دائرے کے باہر خود ان مذاہب کے پیرو بھی بداخلاقی سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اس تعامل سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ دنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدّن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی دیواروں پر قائم ہوتی ہے۔

سچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دنیا سے الگ رہے اور دنیا کے معاملات کو دنیا والوں نے اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر ——— جن کو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور ہر زمانۂ مابعد میں ناقص ہی ثابت ہوتے ——— جس طرح چاہا چلایا اور اس کے ساتھ اگر ضرورت سمجھی تو اپنے معبود کو خوش کرنے کے لیے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کرلیں۔ مذہب چونکہ ان کے لیے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا اس لیے اگر وہ ساتھ رہا بھی تو محض ایک ضمیمہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم، ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں اور ہر قسم کی تمدّنی کج راہیوں کے ساتھ یہ ضمیمہ منسلک ہو سکتا تھا۔ اس نے ٹھگی اور قزاقی کا بھی ساتھ دیا، جہاں سوزی اور غارتگری کا بھی، سُود خواری اور قارونیت کا بھی، فحش کاری اور قحبہ گری کا بھی۔

مذہب کا اسلامی تصوّر

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لیے بھیجے گئے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے اس جاہلی تصوّر کو مٹا کر ایک عقلی و فکری تصوّر پیش کریں اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدّن کا ایک مکمل نظام قائم کرکے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپؐ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو۔ زندگی کی رُوح اور اس کی قوتِ محرکہ ہو، فہم و شعور اور فکر و نظر ہو، صحیح و غلط میں امتیاز کرنے والی کسوٹی ہو، زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

راہِ راست اور راہِ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے ، راہِ کج سے بچائے ، راہِ راست پر استقامت اور پیش قدمی کی طاقت بخشے ، اور زندگی کے اس لاانتہا سفر میں ، جو دنیا سے لے کر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے ، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کے ساتھ گزار دے ۔

اسی مذہب کا نام اسلام ہے ۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لیے نہیں آیا ہے ، بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پرانے جاہلی تصور کے ماتحت ایک ضمیمۂ زندگی قرار دیا جائے ۔ یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے ، اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی ۔ اس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو اسی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلقات کے یہ شعبے الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیگانہ نہیں ہیں ، بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزاء ہیں اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا مدار ہے ۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہ ہو ۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تکمیل و تصحیح کرتے ہیں ، دونوں مل کر ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں ، اور مذہب کا اصل کام اسی کامیاب زندگی کے لیے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے ۔ جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں ہے اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے ۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۔ " اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے "

اسلام ایک خاص طریقِ فکر (Attitude of Mind) اور پوری زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر (Outlook on Life) ہے ۔ اور پھر وہ ایک خاص طرزِ عمل ہے جس کا راستہ اسی طریقِ فکر اور اسی نظریۂ زندگی سے متعین ہوتا ہے ۔ اس طریقِ فکر اور طرزِ عمل سے جو ہیئت حاصل ہوتی ہے وہی مذہب اسلام ہے ، وہی تہذیبِ اسلامی ہے ، اور وہی تمدنِ اسلامی ہے ۔ یہاں مذہب اور تہذیب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمدن الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طریقِ فکر اور نظریۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر مسئلہ کا تصفیہ کرتا ہے۔ انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں۔ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں۔ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، عزیزوں اور قرابت داروں کے، پڑوسیوں اور معاملہ داروں کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہب والوں کے، دشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوعِ انسانی کے، حتیٰ کہ کائنات کی ہر چیز اور قوت کے کیا حقوق ہیں؟ وہ ان تمام حقوق کے درمیان کامل توازن اور عدل قائم کرتا ہے اور ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پورے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا، بغیر اس کے کہ ظلم کی راہ سے ایک حق کو دوسرے حق پر قربان کرے۔

پھر یہی طریقِ فکر اور نظریۂ حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ روحانی منتہائے نظر معین کرتا ہے، اور زندگی کی تمام سعی و جہد کو، خواہ وہ کسی میدان میں ہو، ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راجع ہوں۔

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر (Value) متعین کی جاتی ہے۔ اسی معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے جو شے اس مرکزی مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہوتی ہے اسے اختیار کر لیا جاتا ہے، اور جو شے سدِّ راہ ہوتی ہے اسے ردّ کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات تک یہ معیار یکساں کارفرما ہے۔ وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں، لباس میں، صنفی تعلقات میں، لین دین میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیے، تاکہ وہ مرکزِ مقصود کی طرف جانے والی سیدھی راہ پر قائم رہے، اور ٹیڑھے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مرتب کیے جائیں جن سے معاشرت، معیشت،

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیاست، غرض ہر شعبۂ زندگی کا ارتقاء ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزلِ مقصود کی طرف جانے والے ہوں، اور وہ راہیں نہ اختیار کرے جو اس سے دُور ہٹانے والی ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہو اور جو چیزیں اس کے لیے مسخر کی جائیں ان کو وہ کن طریقوں سے استعمال کرے، تاکہ وہ اس کے مقصد کی خادم بن جائیں، اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اس کی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں اور دشمنی میں، جنگ میں اور صلح میں، اشتراکِ اغراض میں اور اختلافِ مقاصد میں، غلبہ کی حالت میں اور مغلوبی کے دَور میں، علوم و فنون کے اکتساب میں، اور تہذیب و تمدّن کے لین دین میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیئے، تاکہ خارجی تعلقات کے ان مختلف پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں بلکہ جہاں تک ممکن ہو بنی نوعِ انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی طوعاً یا کرہاً، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر اس مقصد کی خدمت لے لیں جو اصل فطرت کے اعتبار سے ان کا بھی ویسا ہی مقصد ہے جیسا کہ پیروانِ اسلام کا ہے۔

غرض وہ ایک ہی نقطۂ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدانِ کارزار تک، طریقِ عبادت سے لے کر ریڈیو اور ہوائی جہاز کے طریقِ استعمال تک، غسل و وضو اور طہارت و استنجاء کے جزوی مسائل سے لے کر اجتماعیات، معاشیات، سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک، مکتب کی ابتدائی تعلیم سے لے کر آثارِ فطرت کے انتہائی مشاہدات اور قوانینِ طبعی کی بلند ترین تحقیقات تک، زندگی کی تمام مساعی اور فکر و عمل کے تمام شعبوں کو ایک ایسی وحدت بناتا ہے جس کے اجزاء میں ایک مقصدی ترتیب اور ایک ارادی ربط پایا جاتا ہے، اور ان سب کو ایک مشین کے پرزوں کی طرح اس طرح جوڑتا ہے کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصوّر تھا، اور جاہلیت کے خیر سے بنے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصوّر کبھی پوری طرح نہ آسکا۔ آج دنیا علم و عقل کے اعتبار سے پہلی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے مگر آج بھی اتنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شہرۂ آفاق یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائے ہوئے لوگ بھی اس انقلاب انگیز تصوّر کے ادراک سے اسی طرح عاجز ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے ان پڑھ اور کودن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصوّر وراثت میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے اس کی گرفت دماغوں پر ابھی تک مضبوط جمی ہوئی ہے۔ عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی بہترین تربیت سے بھی اس کے بند نہیں کھلتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے تاریک حجروں میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے سمجھیں اور دین داری کو عبادات کے دائرے میں محدود خیال کریں تو جائے تعجب نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی تاریک خیال۔ جاہل عوام اگر مذہب کو باجے، تعزیے اور گائے کے سوالات میں محدود سمجھیں تو یہ بھی مقامِ حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگانِ نورِ علم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی ظلمت دُور نہیں ہوئی؟ وہ بھی مذہبِ اسلام کو انہی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم قدیم جاہلی تصوّر کے تحت سمجھتا ہے۔

ہماری سیاست میں جاہلی تصوّر کے اثرات

فہم و ادراک کے اس قصور کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بڑا حصّہ نہ صرف خود غلط روش پر چل رہا ہے، بلکہ دنیا کے سامنے اسلام اور اس کی تہذیب و تمدن کی نہایت غلط نمائندگی کر رہا ہے۔ مسلم جماعت کے اصلی مسائل جن کے حل پر اس کی حیات و ممات کا مدار ہے، سرے سے ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتے، اور یہ ضمنی غیر متعلق مسائل کو اصل مسائل سمجھ کر عجیب عجیب طریقوں سے ان کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ مذہب کا پرانا محدود تصور ہی ہے جو مختلف شکلوں میں ظہور کر رہا ہے۔

کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں، پھر مسلمان۔ اور یہ کہتے وقت ان کے ذہن میں مذہب کا یہ تصور ہوتا ہے کہ اسلام جغرافی تقسیم قبول کر سکتا ہے۔ ترکی اسلام، ایرانی اسلام، مصری اسلام، ہندوستانی اسلام، اور پھر پنجابی، بنگالی، دکنی اور مدارسی اسلام الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ ہر جگہ مسلمان اپنے اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے ایک الگ طریق فکر اختیار کر سکتا ہے، زندگی کا ایک جداگانہ نقطۂ نظر اور نصب العین قبول کر سکتا ہے، ان تمام سیاسی، معاشی اور اجتماعی نظاموں میں جذب ہو سکتا ہے جو مختلف قوموں نے مختلف اصولوں پر قائم کیے ہیں، اور پھر بھی وہ مسلمان رہ سکتا ہے، اس لیے کہ اسلام ایک "مذہبی ضمیمہ" ہے جو دنیوی زندگی کے ہر ڈھنگ اور ہر طریقہ کے ساتھ چسپاں ہو سکتا ہے۔

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو دین اور دنیا کے معاملات میں واضح امتیاز کرنا چاہیے۔ دین کا تعلق ان معاملات سے ہے جو انسان اور خدا کے درمیان ہیں، یعنی اعتقادات اور عبادات۔ ان کی حد تک مسلمان اپنی راہ پر چل سکتے ہیں، اور کوئی ان کو اس راہ سے نہ ہٹانا چاہتا ہے، نہ ہٹا سکتا ہے۔ رہے دنیوی معاملات تو ان میں دین کو دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ ان کو انجام دیتے ہیں، اسی طرح مسلمانوں کو بھی انجام دینا چاہیے۔

ایک تیسرے صاحب کا ارشاد ہے کہ اپنے مذہبی، تمدنی اور لسانی حقوق کے لیے مسلمانوں کو بلاشبہ ایک الگ نظام کی ضرورت ہے مگر سیاسی اور معاشی اغراض کے لیے ان کو الگ جماعت بندی کی ضرورت نہیں۔ ان معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ یہاں مسلمانوں کے مختلف طبقوں کو اپنے اپنے مفاد اور اپنی اپنی اغراض کے لحاظ سے ان مختلف جماعتوں میں شامل ہونا چاہیے جو غیر مذہبی اصولوں پر سیاسی و معاشی مسائل کو حل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔

ایک اور صاحب جو مسلم قوم کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے اٹھے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ اصل چیز ایمان باللہ اور اعتقاد یوم آخر اور اتباع کتاب و سنت نہیں ہے، بلکہ عناصر کی تسخیر اور قوانین طبعی کی دریافت اور نظم و ضبط کی طاقت سے ان عناصر مسخرہ و قوانین معلومہ کو استعمال کرنا ہے، تاکہ نتیجہ میں علو اور تمکن فی الارض حاصل ہو۔ یہ صاحب مادی ترقی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں۔ اس لیے جو وسائل اس ترقی میں مددگار ہوں، وہی ان کے نزدیک اصل اہمیت رکھتے ہیں۔ باقی رہا وہ ذہن جو علم و عقل کی تہ میں کام کرتا ہے، اور جو اپنے طریق فکر اور زاویۂ نظر کے لحاظ سے وسائل ترقی کے استعمال کا مقصد اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا راستہ اور تمکن فی الارض کا مدعا متعین کرتا ہے، سو وہ ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا ــــــ وہ ذہن چاہے جاپانی ذہن ہو، یا جرمن، یا اطالوی یا فاروقی یا خالدی، ان کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ ان کے نزدیک یہ سب یکساں "اسلامی" ذہن ہیں، کیونکہ ان سب کے عمل کا نتیجہ ان کو ایک ہی نظر آتا ہے، یعنی علو اور تمکن فی الارض۔ ان کی نگاہ میں جس کو "زمین کی وراثت" حاصل ہے، وہی "صالح" ہے، اگرچہ وہ ابراہیم کے مقابلہ میں نمرود ہی کیوں نہ ہو۔ جو غالب اور بالادست ہے، وہی "مومن" ہے اگرچہ وہ مسیح کے مقابلہ میں بت پرست رومی فرمانروا ہی کیوں نہ ہو۔

ایک بڑا گروہ جو مسلمانوں کے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے اٹھا ہے اس کے نزدیک اسلام اور اس کی تہذیب کی حفاظت صرف اس چیز کا نام ہے کہ ان کے مذہب اور "پرسنل لا" کی حفاظت کا اطمینان دلایا جائے، ان کی زبان کو اپنے رسم الخط سمیت ایک سرکاری زبان تسلیم کر لیا جائے، اور جن لوگوں کی شخصیت پر اسلام کا لیبل لگا ہوا ہو صرف انہی کو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہو۔ انتخابی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں متناسب نمائندگی ان کے نزدیک سب سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، اور اگر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ خالص اسلامی مسائل میں کوئی تصفیہ اس وقت تک نہ ہوگا جب تک خود مسلمان نمائندوں کی غالب اکثریت

اس کو قبول نہ کرے قرآن کے نزدیک گویا اسلامی حقوق کا پورا پورا تحفظ ہو گیا۔

دیکھا آپ نے یہ شکلیں کس قدر مختلف ہیں۔ مگر حقیقت ان سب میں ایک ہے۔ یہ سب مختلف مظاہر ہیں اسی جاہلی تصورِ مذہب کے جو اسلامی تصورِ مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں نت نئی شکلوں کے ساتھ بغاوت کرتا رہا ہے۔

اگر یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ مسلم کسے کہتے ہیں اور حقیقی معنی میں اسلامی جماعت کا اطلاق کس گروہ پر ہوتا ہے، تو ان کی تمام غلط فہمیاں دُور ہو سکتی ہیں۔

قانونی حیثیت سے ہر وہ شخص "مسلم" ہے جو کلمۂ طیبہ کا زبانی اقرار کرے اور ضروریاتِ دین کا منکر نہ ہو۔ لیکن اس معنی میں جو شخص "مسلم" ہے اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہے۔ ہم اس کو کافر نہیں کہہ سکتے، نہ وہ حقوق دینے سے انکار کر سکتے ہیں جو مجرد اقرارِ اسلام سے اس کو مسلم سوسائٹی میں حاصل ہوتے ہیں۔

یہ اصل اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی سرحد میں داخل ہونے کا پروانہ ہے۔ اصل اسلام یہ ہے کہ تمہارا ذہن اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے، تمہارا طریق فکر وہی ہو جو قرآن کا طریق فکر ہے ——— زندگی اور اس کے تمام معاملات پر تمہاری نظر وہی ہو، جو قرآن کی نظر ہے، تم اشیاء کی قدریں (Values) اسی معیار کے مطابق متعین کرو، جو قرآن نے اختیار کیا ہے، تمہارا انفرادی و اجتماعی نصب العین وہی ہو جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ تم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں مختلف طریقوں کو چھوڑ کر ایک طریقہ اسی معیارِ انتخاب کی بنا پر انتخاب کرو، جو قرآن اور طریق محمدی کی ہدایت سے تم کو ملا ہے۔

اگر تمہارے ذہن کو یہ چیز اپیل نہیں کرتی، اور تمہاری نفسیات قرآن کی نفسیات کے سانچے میں ڈھلنا قبول نہیں کرتے، تو کوئی تم کو دائرۂ اسلام میں آنے یا رہنے پر مجبور نہیں کرتا۔ عقل اور راست بازی کا اقتضاء یہ ہے کہ تم کو اس دائرے کے باہر اپنے لیے مناسب جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ لیکن اگر تمہارا ذہن اس چیز کو قبول کرتا ہے اور تم اپنے نفسیات کو قرآنی نفسیات کے ساتھ متحد کر لیتے ہو، تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر زندگی کے کسی معاملہ میں بھی تمہارا راستہ اس راستہ سے الگ نہیں ہو سکتا جسے قرآن سبیل المومنین کہتا ہے۔

اسلامی ذہن یا قرآنی ذہن ——— کہ حقیقت میں یہ ایک ہی چیز ہیں ———

جس نظریۂ زندگی کے تحت چند اعتقادات پر ایمان لاتا ہے، چند عبادات تجویز کرتا ہے، چند شعائر (جو عام اصطلاح میں "مذہبی شعار" کہے جاتے ہیں) اختیار کرتا ہے، ٹھیک اسی نظریہ کے تحت وہ کھانے کی چیزوں میں، پہننے کے سامان میں، لباس کی وضعوں میں، معاشرت کے طریقوں میں، تجارتی لین دین میں، معاشی بندوبست میں، سیاست کے اصولوں میں، تمدن و تہذیب کے مختلف مظاہر میں، مادی وسائل اور قوانین طبعی کے علم کو استعمال کرنے کے مختلف طریقوں میں بعض کو رد کرتا ہے اور بعض کو اختیار کرتا ہے۔ یہاں چونکہ نقطۂ نظر ایک ہے، طریقِ فکر ایک ہے، نصب العین ایک ہے، ترک و اختیار کا معیار ایک ہے، اس لیے زندگی بسر کرنے کے طریقے، سعی و جہد کے راستے، معاملاتِ دنیا کی انجام دہی کے اصول الگ نہیں ہو سکتے۔ جزئیات میں عمل کی شکلیں الگ ہو سکتی ہیں، احکام کی تعبیروں اور فروعات پر اصول کے انطباق میں تھوڑا بہت اختلاف ہو سکتا ہے، ایک ہی ذہن کی کارفرمائی مختلف مظاہر اختیار کر سکتی ہے، لیکن یہ اختلاف عوارض کا اختلاف ہے، جوہری اختلاف ہرگز نہیں ہے۔ جس بنیاد پر اسلام میں زندگی کی پوری اسکیم مرتب کی گئی ہے، اور اس کے تمام شعبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے وہ کسی قسم کا اختلاف قبول نہیں کرتی۔ آپ خواہ ہندوستانی ہوں یا ترکی، یا مصری، اگر آپ مسلمان ہیں تو یہی اسکیم اپنی اسی اسپرٹ کے ساتھ آپ کو اختیار کرنی پڑے گی اور اس اسکیم کو رد کرنا پڑے گا جو اپنی اسپرٹ اور اپنے اصولوں کے لحاظ سے اس کے خلاف ہو۔

یہاں آپ "مذہبی" اور "دنیوی" شعبوں کو ایک دوسرے سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام کی نگاہ میں دنیا اور آخرت دونوں ایک ہی مسلسل زندگی کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ سعی و عمل کا ہے، اور دوسرا مرحلہ نتائج کا ــــــ آپ زندگی کے پہلے مرحلے میں دنیا کو جس طرح برتیں گے، دوسرے مرحلے میں ویسے ہی نتائج ظاہر ہوں گے ــــــ اسلام کا مقصد آپ کے ذہن اور آپ کے عمل کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں آپ دنیا کو صحیح طریقہ سے برتیں تاکہ دوسرے مرحلہ میں صحیح نتائج حاصل ہوں۔ پس یہاں پوری دنیوی زندگی "مذہبی" زندگی ہے، اور اس میں اعتقادات و عبادات سے لے کر تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے اصول و فروع تک ہر چیز ایک معنوی اور مقصدی ربط کے ساتھ مربوط ہے۔ اگر آپ اپنے سیاسی و معاشی معاملات کو اسلام کی تجویز کردہ اسکیم کے بجائے کسی اور اسکیم کے مطابق منظم کرنا چاہتے ہیں، تو یہ جزوی ارتداد ہے، جو آخر کار کلی ارتداد پر منتہی ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اسلامی تعلیمات کا تجزیہ کر کے بعض کو رد اور بعض کو قبول کرتے ہیں۔ آپ معتقدات دین اور عبادات دینی کو قبول کرتے ہیں، مگر اس نظام زندگی کو ترک کر دیتے ہیں جس کی عمارت انہی عبادات کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اول تو یہ تجزیہ ہی اسلام کی رو سے غلط ہے اور کوئی مسلمان جو حقیقت میں اسلام پر ایمان رکھتا ہو، اس کا ارادہ نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ[1] کا مصداق ہے۔ پھر اگر آپ نے یہ تجزیہ کر کے دائرہ اسلام میں رہنے کا عزم کیا بھی تو آپ اس دائرے میں زیادہ مدت تک نہ رہ سکیں گے، کیونکہ نظام زندگی سے بے تعلق ہونے کے بعد معتقدات دین اور عبادات دینی سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ غیر اسلامی اصول حیات پر ایمان لانے کے بعد اس قرآن پر ایمان قائم ہی نہیں رہ سکتا جو قدم قدم پر ان اصولِ حیات کی تکذیب کرتا ہے۔

---

[1] کیا بات ہے کہ تم کتابِ خدا کے بعض احکام کو تو مانتے ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔ (البقرہ : ۸۵)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بخلاف اس کے اگر آپ اس اسکیم کے مطابق اپنی سیاسی و معاشی زندگی کے معاملات کو منظم کرنا چاہتے ہیں جو اسلام نے تجویز کی ہے تو آپ کو الگ پارٹیوں میں منقسم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ہی پارٹی ——— حزب اللہ ——— ان سب کاموں کے لیے کافی ہے، کیونکہ یہاں سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کاشتکار، راعی اور رعیت کے مفاد میں تنازع نہیں ہے، بلکہ ان کے درمیان موافقت اور اشتراکِ عمل پیدا کرنے والے اصول موجود ہیں۔ کیوں نہ آپ ان اصولوں کیمطابق اپنی قوم کے مختلف طبقات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کریں؟ جن کے پاس یہ اصول موجود نہیں ہیں وہ اگر مجبوراً متنازع طبقات lass کی آگ میں کودتے ہیں تو آپ کیوں ان کے پیچھے جائیں؟

اسی طرح اگر آپ مادی ترقی چاہتے ہیں علو اور تمکن فی الارض چاہتے ہیں، تو اسلام خود اس باب میں آپ کی مدد کرتا ہے۔ مگر وہ چاہتا ہے کہ آپ فرعونی و نمرودی علو اور ابراہیمی و موسوی علو میں امتیاز کریں۔ ایک تمکن وہ ہے جو جاپان اور انگلستان کو حاصل ہے۔ دوسرا وہ تھا جو صحابہ کرام اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے حاصل کیا تھا۔ تمکن دونوں ہیں، اور دونوں تسخیر عناصر، استعمالِ اسباب اور قوانینِ طبعی کے علم اور ان سے استفادہ کرنے ہی کے نتائج ہیں، مگر زمین و آسمان کا فرق ہے دونوں گروہوں کے مقاصد اور نقطۂ نظر میں۔ آپ نتائج کے ظاہری اور نہایت سطحی تماثل کو دیکھتے ہیں۔ مگر ان کے درمیان جو روحی و اخلاقی بُعد ——— بُعد المشرقین ——— ہے اس کو نہیں دیکھتے۔ دُنیا پرستوں کی ترقی اور ان کا تمکن محض تسخیر عناصر اور استعمالِ اسباب کا نتیجہ ہے جس کی تہہ میں زندگی کا حیوانی نصب العین کام کر رہا ہے۔ بخلاف اس کے قرآن جس علو اور تمکن فی الارض کا وعدہ کرتا ہے، وہ بھی اگرچہ تسخیر عناصر اور استعمالِ اسباب سے ہی حاصل ہو سکتا ہے، مگر اس کی تہہ میں زندگی کا بلند ترین اخلاقی و روحانی نصب العین ہونا چاہیے جس کا تحقق ہو نہیں سکتا جب تک کہ ایمان باللہ اور اعتقادِ یوم آخر پوری طرح مستحکم نہ ہو اور جب

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

تک کہ زندگی کی ساری جدوجہد اس آہنی فریم کے اندر کسی ہوئی نہ ہو جس کی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ کو آپ پر فرض کیا گیا ہے ـــــ وہی "ارکانِ اسلام" جن کو آپ "مولوی کے غلط مذہب" کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے قومی حقوق کو سمجھنے اور ان کے تحفظ کے صحیح طریقے معلوم کرنے میں جو غلطی کی جا رہی ہے اس کی تہ میں بھی وہی جہل کارفرما ہے جس کے مظاہر آپ اُوپر دیکھ چکے ہیں۔ اجتماعی زندگی کی پوری اسکیم اگر غیر اسلامی بنیادوں پر مرتب ہو جائے، تو جس چیز کو آپ "مذہب" کہتے ہیں اور جسے "پرسنل لا" قرار دیتے ہیں اس کا اپنی اصل پر باقی رہ جانا اور آپ کی زبان کا اپنے رسم الخط کے ساتھ محفوظ رہنا کچھ بھی مفید نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس غیر اسلامی مجموعہ میں یہ بے جوڑ اسلامی اجزاء کسی طرح کھپ نہ سکیں گے اور رفتہ رفتہ اپنی جگہ چھوڑتے چلے جائیں گے۔ پھر ان اجزاء کی حفاظت جن نمائندوں کے ہاتھ میں آپ دینا چاہتے ہیں وہ اگر محض اصطلاحی و قانونی مسلمان ہوں تو وہ ان کی حفاظت بس اتنی ہی کر سکیں گے جتنی کہ غیر مسلم کر سکتے ہیں۔ ایسے مسلمان اگر اسلامی اصولوں کے خلاف ۹۹ نہیں ۱۰۰ فیصدی کی اکثریت سے بھی کوئی فیصلہ کریں تو وہ اسلامی جماعت کے لیے اتنا ہی نقصان دہ ہوگا جتنا غیر مسلموں کا کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

جاہلیت کا یہی تصور ہے جس کے تحت کانگریس نے اپنا بنیادی حقوق [illegible] Rights والا ریزولیوشن مرتب کیا ہے اور اسی تصورِ جاہلیت کے تحت اپنی بمبئی والی تقریر میں پنڈت جواہر لال نہرو نے فرمایا ہے کہ کانگریس کسی مذہبی عقیدے اور مذہبی روایات میں قطعاً دخل نہیں دیتی۔ کانگریس کو مذہب میں مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ وہ ایسا کرے گی۔ کانگریس ہندوستان کے مذاہب کی آزادی، مذہبی لوگوں کی تہذیب کی آزادی، تمدن کی آزادی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زبان کی آزادی کی حامی ہے[1]۔" پھر جاہلیت کا یہی تصور ہے جس کے تحت مسلمانوں کا ایک گروہ اس قسم کے اعلانات کو کافی سمجھتا ہے اور مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہے کہ ایسے اعلانات پر وہ مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔ کانگریسی رہنما تو غیر مسلم ہیں اور مذہب کے صرف اسی تصور سے واقف ہیں جو انہیں وراثت میں ملا ہے، مگر مسلمانوں کے سیاسی رہنما (جن کے ساتھ بدقسمتی سے مذہبی رہنما بھی شریک ہوتے جاتے ہیں) اس سلسلہ میں جس ناواقفیت کا ثبوت دے رہے ہیں وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ یہ حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگر "مذہب" یعنی معتقداتِ دین اور مذہبی اعمال میں مداخلت نہ ہو، اگر مسلمانوں کے "پرسنل لا" یعنی قوانین نکاح و طلاق و وراثت کو، جیسے کہ وہ برٹش گورنمنٹ کے ماتحت ہیں، بدستور محفوظ رہنے دیا جائے، اگر مسلمانوں کی قدیم رسوم و عادات کو جیسی کہ وہ اس وقت پائی جاتی ہیں، ایک اجلِ مسمّیٰ تک پرانے تبرکات (Relics) کی حیثیت سے زندہ رہنے دیا جائے تو بس مسلمانوں کا قومی مسئلہ حل ہو گیا، اور اس کے بعد مسلمانوں کو اپنے قومی مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو جانا چاہیے۔ اگرچہ آزادی اور تحفظ کے یہ اعلانات بھی سراسر منافقانہ ہیں جیسا کہ میں آگے کے ابواب میں خود کانگریس کی تحریروں سے اور کانگریس کے شعبہ اسلامیات کے شائع کردہ مضامین سے ثابت کروں گا، تاہم اگر ان کو خلوص و نیک نیتی پر بھی محمول کیا جائے، تب بھی یہ سمجھنا انتہا درجہ کی کم فہمی پر دلالت کرتا ہے کہ ان اعلانات سے ہمارا قومی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ در حقیقت ایسی چیزوں پر اطمینانِ قلب ظاہر کر کے ہمارے سیاسی و مذہبی رہنماؤں نے یہ راز فاش کیا ہے کہ وہ ابھی یہ سمجھے ہی نہیں کہ مسلمانوں کا اصل قومی مسئلہ ہے کیا۔

مسلمانوں کا اصل قومی مسئلہ

اگرچہ میں گزشتہ صفحات میں اس مسئلہ کی کافی تشریح کر چکا ہوں، لیکن یہاں

---

[1] جمعیت علماء ہند کے واحد ترجمان "الجمعیۃ" مورخہ ۲۲ر شعبان ۱۳۵۵ھ میں یہ تقریر "صدر کانگریس کا اعلانِ حق" کے زیر عنوان شائع ہوئی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک مرتبہ پھر کوشش کروں گا کہ اس کو نہایت واضح صورت میں پیش کروں تاکہ یہ زمانہ کا جادو، جو جہلا اور علما سب کے دماغوں پر مسلط ہوتا جا رہا ہے کسی طرح اُترے اور مسلمانوں کے اربابِ حل و عقد اپنی توجہات کو اس مسئلہ کے حل کی طرف منعطف کریں۔

اوپر میں بتا چکا ہوں کہ اسلام اُس قسم کا کوئی مذہب نہیں ہے جو دُنیا کی زندگی سے الگ چند معتقدات اور چند مذہبی مراسم انسان کو دیتا ہو تاکہ وہ آخرت کی زندگی میں نجات کے لیے سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئیں۔ بلکہ وہ درحقیقت ایک جامع تہذیب و تمدن ہے جو دنیا کو مزرعۃ الآخرۃ (آخرت کی کھیتی) سمجھ کر، اور انسان کو زمین میں خلیفہ الٰہی قرار دے کر زندگی کے جملہ معاملات کی تنظیم کرتا ہے (تاکہ انسان اس دنیا میں صحیح برتاؤ کرے) اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی کامیابی سے ہم کنار ہو۔ اس غرض کے لیے اسلام نے مسلمانوں کو ایک مکمل ضابطۂ زندگی دیا ہے جو دوسرے ضوابطِ زندگی مثلاً کمیونزم، فاشزم، کیپٹلزم اور میٹیریلزم وغیرہ سے بالکل مختلف صورت پران کے نظامِ اجتماعی کی تشکیل کرتا ہے اور ان کو علوم و آداب میں، اخلاق و معاملات میں، عادات و اطوار میں، تمدن و معاشرت میں، معیشت و سیاست میں، غرض زندگی کے ہر شعبے میں بعض طریقوں کو ترک اور بعض کو اختیار کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس ضابطہ کی اساس ایک خاص طریقۂ فکر اور ایک خاص مقصدِ حیات پر رکھی گئی ہے جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے طریقِ فکر و مقصدِ حیات سے بالکل مختلف ہے، جس کی رُو سے اشیاء کی قدریں (Values) دوسروں کی پسند کی ہوئی قدروں سے بالکل مختلف طور پر معین ہوتی ہیں اور جس کے لحاظ سے زندگی میں مسلمان اپنا راستہ دوسروں کے انتخاب کیے ہوئے راستوں سے الگ انتخاب کرتا ہے۔

ہر تہذیب کی طرح اس تہذیب کے بقا اور فروغ کا انحصار بھی دو چیزوں پر ہے۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم ایسا ہو جو ان کے دل و دماغ میں اسلام کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طریقِ فکر اور مقصدِ حیات کو صحیح طور پر پیوست کر دے، اور ان کو اس قابل بنائے کہ وہ مسلمان کی حیثیت سے دیکھیں، مسلمان کی حیثیت سے سوچیں، اور اسلام کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق زندگی کے ہر دوراہے پر ایک راستے کا انتخاب کریں۔

دوسرے یہ کہ یہ نظامِ تہذیب اپنی صحیح صورت میں عملاً قائم ہو، اجتماعی زندگی میں اس کے اصول عملاً نافذ ہوں، اور ایک ایسا اسلامی ماحول بن جائے جس میں مسلمان خود بخود اسلامی اصولوں پر زندگی بسر کریں، اگرچہ ان کے بعض افراد کو علمی حیثیت سے ان اصولوں کا پورا شعور نہ ہو۔ اس غرض کے لیے مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ کوئی سوسائٹی سیاسی طاقت کے بغیر اپنی مخصوص ہیئت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔

انگریزی اقتدار کی غلامی میں ہم کو اصل نقصان جو پہنچا ہے وہ یہی ہے کہ اپنی تہذیب کو ایک زندہ تہذیب کی حیثیت سے باقی رکھنے کے لیے یہ دونوں ذرائع ہم سے چھن گئے۔ ایک طرف ہماری قوم پر ایک ایسا نظامِ تعلیم مسلط کر دیا گیا ہے جو وسیع پیمانہ پر ہمارے افراد کے طریقِ فکر کو بدل رہا ہے، نظریۂ زندگی اور مقصدِ حیات کو بدل رہا ہے، اور اس معیار کو بدل رہا ہے جس سے وہ اشیاء کی قدریں متعین کرتے ہیں۔ دوسری طرف ایک غیر قوم کی سیاسی طاقت نے ہم پر ایک ایسا ماحول مسلط کر دیا ہے جو ہمارے عوام اور خواص کی زندگی کو روز بروز اسلامی مناہج سے ہٹاتا چلا جاتا ہے۔ اس نے ہمارے قوانینِ حیات کو بڑی حد تک معطل کر دیا ہے، اور ہم اس کی بدولت اُس طاقت سے محروم ہو گئے ہیں جس سے ہم اپنی سوسائٹی کو اس مخصوص اسلامی ہیئت پر قائم و برقرار رکھ سکیں۔

پس ہمارا اصل قومی مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جو انقلاب درپیش ہے، اس میں ہم اس نقصان کی تلافی کر سکیں جو انگریزی اقتدار سے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو پہنچا ہے۔ ہمیں اتنی طاقت حاصل ہو کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کو خود اپنی ضروریات کے مطابق بنا سکیں اور ہمیں حکومت میں اتنا اقتدار حاصل ہو کہ ہم اپنے تمدنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معاشرتی اور معاشی مسائل کو خود اپنے اصولوں کے مطابق حل کر سکیں، اور اپنے اجتماعی نظام کو پھر سے اسلامی بنیادوں پر مرتب کریں۔ یہی وہ چیز ہے جس کی تشریح میں نے اپنے "نصب العین" والے مضمون میں کی ہے۔ ہم ایک ایسی آزادی وطن کو صحیح معنوں میں پورے وطن کی آزادی نہیں کہہ سکتے جس میں وطن کی ۴/۱ مسلمان آبادی کو یہ آزادی حاصل نہ ہو۔ نہ ہم کسی ایسی حکومت کو وطنی حکومت سمجھ سکتے ہیں جس میں وطن کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو یہ اقتدار حاصل نہ ہو ۔۔۔ نہ ہمیں کسی ایسی جنگِ آزادی سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنے مشترک وطنی نصب العین (یعنی حریت و استقلالِ وطن) کے ساتھ ساتھ اپنے اِس قومی نصب العین کو بھی حاصل نہ کر سکتے ہوں۔

یہ "قوم پرستی" کی تحریک جس کے تحت اس وقت آزادیٔ وطن کے نام پر جنگ کی جا رہی ہے، درحقیقت ہم کو اپنے اِس قومی مقصد کی تحصیل میں مدد نہیں دیتی، بلکہ اس کے برعکس ان نقصانات کو حدِ کمال پر پہنچانا چاہتی ہے جو ہم کو انگریزی اقتدار سے پہنچے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک ایک غیر قوم کی غلامی میں رہنے کی وجہ سے ہماری قوم میں جہالت، افلاس، اخلاقی انحطاط، اجتماعی بدنظمی، تمدنی بے راہ روی، اور تہذیبِ اسلامی سے انحراف کی جتنی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، انہیں دُور کرنے میں ہماری مدد کرنا تو درکنار، وہ تو ان سے اُلٹا فائدہ اُٹھانا چاہتی ہے، اور ہماری ان اندرونی خرابیوں ہی کو اپنے لیے کامیابی کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ ایک طرف اس تحریک کے علمبردار اپنا پورا زور اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ جمہور مسلمین کے دلوں سے اسلامی قومیت کا تخیل ہی مٹ جائے، اور وہ اپنی قومیت کے رشتہ سے کٹ کر معاشی طبقوں میں منقسم ہو جائیں، اور آپس میں روٹیوں پر لڑنا شروع کر دیں۔ دوسری طرف ان لوگوں کے پاس تہذیب و تمدن اور تنظیم حیات کے متعلق خود اپنے نظریات موجود ہیں جو اسلام کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں، اور وہ مسلمانوں کی اجتماعی مزاحمت سے بے خوف ہو کر یہ چاہتے ہیں کہ تمام ہندوستان کی اجتماعی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زندگی کو انہی نظریات کے تحت مرتب کریں جس کی لپیٹ میں مسلمان بھی آ جائیں۔ اس طرح یہ تحریک ہمارے قومی مقاصد کے بالکل خلاف واقع ہوئی ہے، اور اس کے ساتھ شریک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو نیست و نابود کرنے میں خود حصہ لیں۔ وہ اپنے پروپیگنڈا کی طاقت سے یہ خیال پھیلا رہے ہیں کہ جو لوگ ان کی اس تحریک سے اختلاف کرتے ہیں وہ انگریزی اقتدار کے حامی ہیں، ٹوڈی اور سامراج پرست ہیں۔ لیکن یہ ایک زبردست دجل و فریب ہے جس کو دن کی روشنی میں فروغ دیا جا رہا ہے۔ دراصل سب سے بڑا ٹوڈی اور سامراج پرست تو وہ ہے جو وطن کی نجات کے لیے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن سے وطن کی ۱/۲ آبادی کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتی۔ اپنی اس حماقت سے وہ خود انگریزی اقتدار کے قیام و بقا میں مدد دیتا ہے، اور پھر اس حماقت کا الزام ان لوگوں پر رکھتا ہے جو نجاتِ وطن کے لیے سرفروشی کرنے پر تیار ہیں، مگر اپنی قومیت اور اپنی قومی تہذیب کو فنا کرنے پر فطرۃً تیار نہیں ہو سکتے۔

میں آگے کے ابواب میں اس امر پر تفصیل سے بحث کروں گا کہ یہ تحریک وطن پرستی کن طریقوں پر چلائی جا رہی ہے، اور مسلمانوں کے لیے مسلمان رہتے ہوئے اس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنا کس درجہ مہلک ہے۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب

شبہات اور جوابات

میں نے اپنے گزشتہ مضامین میں حتی الامکان ہر پہلو کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن باوجود اس کے ان مضامین کو دیکھ کر مختلف اصحاب نے متعدد شبہات کا اظہار کیا ہے جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی توضیحِ مقاصد میں بہت کچھ کمی رہ گئی ہے۔ ذیل میں چند اہم شبہات کو خود معترضین کے اپنے الفاظ میں نقل کر کے رفع کرنے کی کوشش کروں گا۔ اُمید ہے کہ میرے جوابات سے بہت سی غلط فہمیاں دُور ہو جائیں گی۔

ناقابلِ عمل

آپ نے سیاسی کام کرنے کے اکثر ان طریقوں کو غلط اور مسلمانوں کے لیے مضر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جن پر مسلمانوں کے مختلف گروہ آج کل عمل پیرا ہیں۔ لیکن نہایت طول طویل مباحث کے بعد اپنے مضمون "راہِ عمل" میں خود جو طریقِ کار مسلمانوں کے لیے تجویز کیا ہے وہ بالکل ہی ناقابلِ عمل اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے۔ بجائے خود مقاصد بہت ارفع و اعلیٰ ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے اندازاً کتنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مدت درکار ہوگی؟ اگر یہ مقاصد ایسے ہیں کہ ان کے حاصل کرنے میں صدیاں لگ جائیں گی تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک ملتوی رہے گی جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو جائیں؟

جواب

فاضل معترض ایک طرف یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی قومی طاقت کو مضبوط کرنے کے لیے جن تدابیر کو میں ضروری اور ناگزیر قرار دیتا ہوں "وہ بہت ارفع و اعلیٰ" ہیں اور ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ دوسری طرف وہ خود اپنے اس مسلّمہ کو محض اس بنیاد پر رد کر دیتے ہیں کہ یہ "تدابیر بالکل ہی ناقابلِ عمل، اور غیر ممکن الوقوع معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان کے حصول کیلیے صدیاں بھی کم ہیں"۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ غالباً انہوں نے نہ تو ان وجوہ کی اہمیت پر کافی غور فرمایا ہے جن کی بنا پر میں ان تدابیر کو ناگزیر قرار دے رہا ہوں، اور نہ اس سوال پر زیادہ فکر صرف کی ہے کہ ان تدابیر کو رُو بکار لانے اور جلد از جلد نتیجہ خیز بنانے کی عملی صورتیں کیا ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو غالباً وہ نہ تو اس طرح سرسری طور پر میری رائے سے اتفاق فرماتے اور نہ اس طرح سرسری نظر میں اسے ناقابلِ عمل سمجھ کر رد کر دیتے۔ چونکہ بحث کا اصلی اور اہم ترین نکتہ یہی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ صرف معترض صاحب ہی نہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو ان کے ہم خیال ہیں، اس کے اصولی اور عملی پہلوؤں پر پوری قوّتِ فکر صرف کریں۔

اس بحث کو اصولی طریق پر طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ میرے خیالات کا تجزیہ کیجیے اور ایک ایک جزء کے متعلق واضح طور پر فیصلہ کیجیے کہ آپ کو اس سے اتفاق ہے یا نہیں۔

(۱) میری نگاہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت اور دوسری ہندوستانی ہونے کی حیثیت۔ ان میں سے پہلی حیثیت دوسری حیثیت پر مقدم ہے، اس معنی میں اگر بالفرض ان دونوں حیثیتوں میں مصالحت

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ممکن نہ ہو، اور ہمارے سامنے یہ سوال پیش ہو جائے کہ ہم کس حیثیت کو دوسری حیثیت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوں گے ، تو ہمارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو برقرار رکھیں اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت کو اس پر قربان کر دیں۔

یہ پہلا اور بنیادی مسئلہ ہے جس کے فیصلے پر دو بالکل مختلف اور متضاد مسلکوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا انحصار ہے۔ جو شخص معنی مذکورالصدر میں دوسری حیثیت کو پہلی حیثیت پر مقدم رکھتا ہے ، اس کا راستہ میرے راستہ سے بالکل الگ ہے۔ اسلیے میں ایک ایسے مسئلہ میں جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے اس کے ساتھ کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ میری بحث صرف ان لوگوں سے ہے جو اس بنیادی امر میں مجھ سے متفق ہیں۔ (آگے چل کر میں لفظ مسلمان جہاں کہیں استعمال کروں گا ، اس سے میری مراد اسی دوسرے گروہ سے ہوگی)

(۲) مسلم ہندوستانیوں کی سیاسی پالیسی کا اصل الاصول میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کی مسلم ہونے کی حیثیت اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت میں کامل توافق ہو۔ اس مُلک کا سیاسی ، معاشی اور تمدنی ارتقا کوئی ایسی راہ اختیار نہ کرنے پائے جس میں ہماری ان دونوں حیثیتوں کا ساتھ ساتھ نبھنا مشکل ہو جائے ——— میں نہیں سمجھتا کہ اس سے کسی مسلمان کو اختلاف ہوگا۔ تاہم اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ اپنے اختلاف کے وجوہ بیان کرے۔

(۳) مذکورۂ بالا پالیسی کو موثر اور کامیاب بنانا صرف ہمارے عمل اور ہماری قوت پر منحصر ہے۔ ہمارے غیر مسلم ہم وطن اور غیر مسلم حکمران اگر ہر قسم کے تعصب سے خالی ہوں اور انتہا درجہ کی نیک نیتی کے ساتھ کام کریں ، تب بھی وہ اُس توازن و توافق کو قائم نہیں کر سکتے جس کے قیام پر ہماری مذکورہ بالا دونوں حیثیتوں کے ساتھ ساتھ نبھنے کا انحصار ہے اس لیے کہ وہ زندگی کا اسلامی نقطۂ نظر کہاں سے لائیں گے ؟ اصولِ اسلام کا فہم انہیں کیسے نصیب ہوگا ؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تہذیبِ اسلامی کی اسپرٹ کو وہ کیونکر سمجھ سکیں گے؟ پس ہر قسم کے گروہی تعصبات سے قطع نظر کر لینے کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامیت اور ہندوستانیت کے جس توازن و توافق پر مسلم ہندوستانی قوم کی زندگی کا مدار ہے وہ اس قوم کی اپنی طاقت اور مؤثر طاقت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا ہے ——— کیا آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو وجوہ ارشاد ہوں۔ اگر تسلیم ہے تو فرمایئے کہ آیا یہ حقیقت آپ کی نگاہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے، یا اسے آپ ایسی چیز سمجھتے ہیں کہ حاصل ہو تو بہت خوب اور حاصل نہ ہو تو کچھ پروا نہیں، اس کے بغیر ہی آگے بڑھے چلو؟

(۴) جس طاقت سے اس پالیسی کو مؤثر اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے، میرے نزدیک وہ مسلمانوں میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس چند ایسی کمزوریاں جڑ پکڑ گئی ہیں جن کی وجہ سے وہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کی رفتار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ تمام دوسرے کاموں سے پہلے ہمیں ان کمزوریوں کو دور کرنا چاہیئے اور اپنے اندر کم سے کم اتنی طاقت پیدا کر لینی چاہیئے کہ ہم اس ملک کے آئندہ نظامِ حکومت کی تشکیل میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کر سکیں۔ اس کے بغیر جنگِ آزادی میں شریک ہونا یا نہ ہونا دونوں ہمارے لیے یکساں مہلک ہیں۔ آپ فرمائیں کہ اس بیان کے کس حصّہ سے آپ کو اختلاف ہے؟ کیا آپ کا یہ خیال ہے کہ مسلمانوں میں وہ کمزوریاں موجود نہیں ہیں جنہیں میں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے؟ یا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کمزوریوں سے وہ نتائجِ بد پیدا نہیں ہو سکتے جن کا خطرہ میں نے ظاہر کیا ہے؟ یا آپ کی رائے یہ ہے کہ ہمیں حبِ وطن یا حبِ نفس کی خاطر ان خطرات کو گوارا کر لینا چاہیئے؟ ان میں سے کون سی شق آپ اختیار فرماتے ہیں؟

(۵) وہ طاقت جس کی ضرورت میں ثابت کر رہا ہوں میرے نزدیک اُن تدابیر کے سوا کسی اور طریقہ سے حاصل نہیں ہو سکتی جنہیں اختصار کے ساتھ میں نے بیان کیا ہے۔ اگر آپ کو سرے سے اس کی ضرورت ہی تسلیم نہیں، تب تو میرے نزدیک

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

 www.iqbalkalmati.blogspot.com

تدابیر کی بحث لاحاصل ہے۔ البتہ اگر آپ کو اس کی ضرورت کا اتنا ہی شدید احساس ہے جتنا کہ مجھ کو ہے، تو آپ ایک مرتبہ پھر ان کا جائزہ لیجئے اور فرمائیے کہ ان کے سوا اور کون سی تدبیریں ہو سکتی ہیں جو ہماری کمزوریوں کو دور کر کے ہم کو مسلم ہونے کی حیثیت سے ایک طاقت ور جماعت بنانے والی ہوں۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ یہ محض چند خوش آئند تجویزیں نہیں ہیں جن کی قدر افزائی کے لیے صرف اتنی سفارش کافی ہو کہ "ہر مسلمان کو ان کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے"۔ بلکہ درحقیقت مسلمانوں کی قومی زندگی کا تحفظ انہی تدابیر پر منحصر ہے اور اب اگر ہم خودکشی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں بہر حال انہی کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ تو تھی اصولی بحث۔ اب میں عملی پہلو کی طرف توجہ کرتا ہوں۔ فاضل معترض نے غالباً یہ سمجھا ہے کہ میں بالکل ایک آئیڈیل حالت کی طرف مسلمانوں کو لے جانا چاہتا ہوں، اور میرے نزدیک علم و عمل، اتحاد و اتفاق اور نظم اجتماعی کے آخری و انتہائی مرتبہ کا حصول سیاسی جنگ میں حصہ لینے سے پہلے ناگزیر ہے، اسی بنا پر انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ کام تو شاید صدیوں میں بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے گا۔ اگرچہ ایسی ایک آئیڈیل حالت بھی اس سے پہلے ایک صدی کے چوتھائی حصہ میں ہندوستان کے موجودہ حالات سے بدرجہا زیادہ خراب، عرب جاہلیت کے حالات میں پیدا کی جا چکی ہے۔ لہذا اس کو ناممکن الوقوع کہنا درست نہیں۔ لیکن اگر اس کو ناممکن الوقوع تسلیم بھی کر لیا جائے تو میں کہتا ہوں کہ جو کم سے کم طاقت اس وقت ہمیں درکار ہے اس کے لیے صدرِ اوّل کے سے مسلمانوں کی سی انتہائی دینداری اور اجتماعی تنظیم تک پہنچ جانا ضروری نہیں ہے صرف اس قدر کافی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے اصولوں پر ایک ایسی رائے عام تیار کر دی جائے جو غیر مسلم تہذیب کے اثرات کو اپنی جماعت میں پھیلنے سے روک سکتی ہو۔ جس کے سامنے ایک قومی نصب العین واضح طور پر موجود ہو جو اپنے نصب العین

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے لیے اجتماعی جدوجہد کر سکتی ہو، جس میں اتنا شعور ہو کہ گمراہ کرنے والے رہبروں کو پہچانے اور ان کا اتباع کرنے سے انکار کر دے اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ منافقت اور غداری اس کے دائرے میں پھل پھول نہ سکے۔ یہ کام نہ غیر ممکن ہے، نہ صدیوں کی مدت چاہتا ہے۔ اگر مسلمان یہ سمجھ لیں کہ اس کے بغیر ہندوستان میں ان کا بحیثیت ایک مسلم قوم کے زندہ رہنا مشکل ہے، اور اگر ان کے نوجوانوں میں سے ایک جماعت سچے جذبے کے ساتھ اس کام کے لیے جانفشانی اور پیہم عمل پر آمادہ ہو جائے تو ایک قلیل مدت ہی میں ایک ایسی رائے عام تیار کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب کہ ہم سہولت پسندی چھوڑ دیں۔ صحیح طریق کار کی دشواریاں دیکھ کر ہمت ہار دینا اور دوسروں کے ہموار کیے ہوئے راستوں کو آسان دیکھ کر ان کی طرف دوڑ جانا، ایک ایسی ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کے ساتھ دنیا کی کوئی قوم بھی اپنی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اگر خدانخواستہ یہی ذہنیت ہماری قوم پر غالب ہو گئی ہے اور ہم اس درجہ تنزل کو پہنچ چکے ہیں کہ اپنے قومی نصب العین کے لیے کوئی اجتماعی جدوجہد کرنا ہمیں غیر ممکن نظر آتا ہے، تب تو ہمیں خود اپنی قبر پر فاتحہ پڑھ لینی چاہیے۔

جنگِ آزادی اور مسلمان

آزادی کی جنگ کا شروع کرنا یا نہ کرنا ہم مسلمانوں کی مرضی پر منحصر نہیں ہے کہ ہم جب چاہیں تب ہی جنگ شروع ہو، اور جب تک ہم نہ چاہیں وہ رکی رہے۔ سیاسی جنگ یا آزادی کی جنگ تو عرصہ ہوا کہ شروع ہو چکی اور برادرانِ وطن بہت سے معرکے سر بھی کر چکے ہیں اور نئے معرکے سر کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم مسلمان یہ کیسے کہہ سکتے ہیں، اور کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ بھائیو! ذرا ٹھہر جاؤ ہمیں بھی تیار ہو لینے دو پھر جنگ شروع کرنا"۔ ہماری ایسی آواز کو کون سن سکتا ہے۔ اور اس پر ایک لمحہ کے لیے بھی کان دھر سکتا ہے؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

جواب

یہ بات میں نے کبھی نہیں کہی کہ ہندوستان کی سیاسی جنگ اس وقت تک کے لیے ملتوی ہو جائے گی یا ہو جانی چاہیئے جب تک مسلمان ان مقاصد کے حصول میں کامیاب نہ ہو لیں۔ پچھلے واقعات اور موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے اس بات کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان کے سیاسی ارتقاء کی رفتار ہمارے شریک نہ ہونے سے رُک جائے گی۔ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ منتشر اور مختلف الخیال افراد کی شکل میں مسلمانوں کا شریکِ جنگ ہونا فائدہ سے زیادہ نقصان کے امکانات رکھتا ہے، اور یہ نقصان اُس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو کچھ مدت تک اس جنگ سے علیحدہ رہنے کی صورت میں پہنچے گا، لہٰذا مسلمانوں کو اپنی تمام تر توجہ اس طرف صرف کرنی چاہیئے کہ کم سے کم مدت میں اپنے اندر وہ طاقت پیدا کر لیں جو شریکِ جنگ ہونے کے لیے ضروری ہے اور اس دوران میں اگر دُوسرے ان سے متعرض نہ ہوں تو انہیں بھی دوسروں سے متعرض نہ ہونا چاہیئے۔

ہر شخص جسے خُدا نے تھوڑی سی عقل بھی دی ہے، خود سمجھ سکتا ہے کہ جہاں ایک طرف اکثریت ہو اور متحد و منظم ہو، اور دوسری طرف اقلیت ہو اور متفرق اور پراگندہ ہو، تو ان دونوں کے مسابقہ کا انجام کیا ہوگا؟ ہمارا حال اس وقت یہ ہے کہ ہمارے درمیان کوئی چیز بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ ایک گروہ کا نصب العین کچھ ہے اور دُوسرے کا کچھ اور ——— ایک گروہ جن امور کو قومی مفاد سے متعلق سمجھتا ہے، دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو قومی مفاد سے کوئی تعلق نہیں، اور تیسرا گروہ "قومی مفاد" کا نام ہی سُن کر "فرقہ پرستی" "ٹوڈیت" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کسنے شروع کر دیتا ہے۔ ایک جماعت کسی مسئلے پر اسلامی حقوق کی حفاظت کے لیے جدّوجہد کرتی ہے اور دوسری جماعت غیر مسلموں کی فوج میں شامل ہو کر سب سے اگلی صفوں میں اس کا مقابلہ کرتی نظر آتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک جماعت کونسلوں کے اجلاس یا کانگریس کے اجتماع سے نماز کے لیے اُٹھتی

ہے، اور اس سے دس گنی جماعت بیٹھی رہتی ہے، اور بیٹھے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس کے بعض افراد غیر مسلموں سے تقرب حاصل کرنے کے لیے علانیہ نماز پڑھنے والوں کی مذہبی دیوانگی پر طنز کرتے ہیں۔ غور کیجیے کہ اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز ہماری قوم کی اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچانے والی، ہماری ہوا اکھاڑ دینے والی، اور ہندوستان کی سیاسی میزان میں ہم کو ہلکا کر دینے والی ہو سکتی ہے؟ اس بیماری کو ساتھ لیے ہوئے آپ جدھر بھی جائیں گے آپ کا کوئی وزن نہ ہوگا اور آپ کسی ایسی چیز کی حفاظت نہ کر سکیں گے، جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کو عزیز ہو۔

مگر اس کا یہ مفہوم لینا درست نہیں کہ ہم جو سیاسی جنگ میں کانگریس کے ساتھ شرکت کرنے سے انکار کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم تعطل چاہتے ہیں۔ درحقیقت معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اپنی قوم کی منتشر طاقتوں کو جمع کرنا خود ایک جنگ ہے۔ یہ جنگ اگر ہم شروع کر دیں تو اس کے دوران میں ایک طرف ہمارے زنگ خوردہ ہتھیاروں پر صیقل بھی ہوگا اور دوسری طرف ہماری منتشر طاقت جتنی جتنی مجتمع ہوتی جائے گی، ملک کی سیاسی میزان میں ہمارا وزن بھی اتنا ہی بڑھتا چلا جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر ہم نے یہ دیکھ کر کہ فلاں جماعت نے اتنے معرکے سر کر لیے ہیں، اور فلاں گروہ اتنا طاقت ور ہو چکا ہے مرعوبانہ ذہنیت کے ساتھ کوئی طریق کار اختیار کیا، تو یہ مسلمانوں کی زندگی کا ثبوت نہ ہوگا بلکہ ان کی شکست خوردہ ذہنیت کا ہوگا۔

سیاسی جنگ اور جدید طبقہ

آپ نے اپنے مضمون "آنے والا انقلاب اور مسلمان" میں جدید تعلیم و تہذیب سے متاثر ہونے والے مسلمانوں پر بہت سخت تنقید کی ہے اور غالباً آپ کا مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کی طرف سے سیاسی جنگ میں حصہ لینے کے اہل نہیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ وقت ایسا نہیں ہے کہ ہم اپنے میں سے کسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گروہ کو اس سیاسی جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں، نہ اس کا موقع ہے کہ پرانے تعلیم یافتہ لوگ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کو اس سیاسی جنگ سے یہ کہہ کر خارج کردیں کہ تم اس کے اہل نہیں ہو، اور نہ اس کا موقع ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ پرانے تعلیم یافتہ بزرگوں کو اس مدافعانہ جنگ سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ بلکہ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ اس وقت سب مسلمان متفق، متحد، یک دل اور یک زبان ہو کر اس مدافعانہ جنگ میں حصّہ لیں اور کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ[1] کا مصداق بن کر دنیا پر ثابت کردیں کہ مسلمان ابھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے اور دنیا کی کوئی طاقت، کوئی قوت، کوئی تدبیر اس نورِ الٰہی کو بجھا نہیں سکتی جس کے مسلمان حامل ہیں۔

جواب

یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کو بنیان مرصوص بننے کی ضرورت ہے لیکن معترض کو میرے کن الفاظ سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ میں مسلمانوں کو بنیان مرصوص دیکھنا نہیں چاہتا بلکہ ان کے درمیان پارٹیوں کا اختلاف پیدا کرنا چاہتا ہوں؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کو ایک ٹھوس جماعت صرف اسی طرح بنایا جا سکتا ہے کہ اس کے افراد ایک نصب العین پر متفق ہوں اور جسم واحد بن کر اس کے لیے ایک طریق کار اختیار کریں۔ اس غرض کے لیے ہم کو نصب العین اور طریق کار دونوں کی توضیح کرنی پڑے گی اور جس طرح ہمارا یہ فرض ہوگا کہ قوم کے ان تمام افراد کو اپنے ساتھ ملا لیں جو اس نصب العین اور اس طریق کار سے متفق ہوں، اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ناگزیر ہوگا کہ ان افراد کے ساتھ غلظت و شدت برتیں جو اپنی خودسری یا منافقت کی بنا پر جماعت کا ساتھ دینے سے انکار کریں، عام اس سے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے تعلیم یافتہ ـــــــ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ

---

[1] گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ (الصف ۴)

مختلف مقاصد کے تحت مختلف اور متضاد راستوں کی طرف جانے والے افراد کو کسی طرح ایک بُنیانِ مرصوص نہیں بنایا جاسکتا۔

ہندو اور مسلمان

آپ نے بلا ضرورت جو ضمنی بحثیں چھیڑی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک گزشتہ ستر سال میں مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو نقصان ہی نقصان پہنچا ہے اور مختصر یہ کہ وہ مسلمان نہیں رہے ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ ہم میں کچھ نہ کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوئیں مگر یہ تسلیم نہیں ہے کہ ہماری موجودہ حالت اب سے ڈیڑھ صدی پہلے کی حالت سے زبوں تر ہے اور ہماری اخلاقی خرابیاں اور کمزوریاں پہلے سے زیادہ ہوگئی ہیں۔ اگر کسی قوم کا سیاسی زوال اور محکومیت اس میں اخلاقی خرابیاں پیدا کرنے کو مستلزم ہے تو ہندوؤں کو تو محکومیت کی حالت میں رہتے ہوئے ایک ہزار برس ہوگئے مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی موجودہ اخلاقی تعلیمی اور اقتصادی حالت بمقابلہ ہزار برس پہلے کے بہت بہتر ہے۔

جواب

مسلمانوں کی حالت کو ہندوؤں پر قیاس کرنا میرے نزدیک قیاس مع الفارق ہے۔ ہندو قوم میں وحدتِ ملی کا کوئی تصوّر نہ تھا۔ ان کا سوشل سسٹم ان کو متفرق کرنے والا تھا نہ کہ مجتمع۔ ان کے اندر ایسی رسمیں رائج تھیں جو گھن کی طرح ان کی قوم کو کھائے جارہی تھیں۔ وہ دُنیا کی دوسری قوموں سے بالکل الگ تھلگ ہندوستان میں پڑے ہوئے تھے اور اسی کو دنیا سمجھتے تھے۔ اس حالت میں جب وہ مسلمانوں کے اور پھر انگریزوں کے زیرِ حکومت آئے تو اگرچہ غلامی کے ناگزیر نتائج سے محفوظ نہ رہ سکے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کو نقصان سے بہت زیادہ فوائد حاصل ہوئے۔ ان میں وحدتِ قومی کا ایک تصوّر پیدا ہوگیا، ان کو اپنے سوشل سسٹم کی بہت سی خرابیوں کا احساس ہوا جس کی بدولت متعدد اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں، اور باہر سے علم و تہذیب کی جو روشنی ان تک پہنچی اس نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان کے خیالات کی دنیا کو بہت کچھ بدل دیا۔ علاوہ بریں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ "ہندویت" کی اساس کسی عقیدے اور کسی اجتماعی عمل اور کسی نظام تہذیب پر قائم نہیں ہے بلکہ نسل اور مرزبوم کی وحدت پر مبنی ہے، اس لیے بیرونی اثرات سے ان کے قدیم عقائد اور طرزِ معاشرت اور افکار و اعمال میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جاتے ان کی "ہندویت" بہرحال برقرار رہتی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ان کے اپنے مذہب و تمدن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ایک ترقی پذیر قومیت کو وجود میں لا سکے۔ لہٰذا مغرب کے عمرانی و سیاسی تصورات، ان کے لیے بجائے مضر ہونے کے درحقیقت مفید ہیں۔ کیونکہ یہی چیز ان کے اندر زندگی اور حرکت پیدا کر سکتی ہے، اور اسی سے ان میں قومیت کا نشوونما ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ قوم اپنی ایک وحدت اور نہایت طاقتور وحدت رکھتی تھی، اس کا سوشل سسٹم غایت درجہ صحیح و سالم تھا، جاہلانہ رسوم سے یہ بالکل پاک تھی، اس میں ایک اعلیٰ درجہ کی حضارت موجود تھی، اور یہ سب کچھ اسے صرف ایک چیز کی بدولت حاصل ہوا تھا جس کا نام "اسلام" ہے۔ ہندوستان میں دوسری قوموں کے ساتھ جب یہ قوم خلط ملط ہوئی، تو اس کی بلندی تو دوسروں کو پستی سے اٹھانے کی موجب ہوئی، مگر دوسروں کی پستی نے خود اس کو بلندی سے گرانا شروع کر دیا۔ اس نے دوسروں سے نسلی و وطنی عصبیت لی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وحدت پارہ پارہ ہونے لگی۔ اس نے دوسروں سے جاہلیت کی رسوم لیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی قومی طاقت کو گھن لگ گیا۔ اس نے اپنے سوشل سسٹم میں دوسروں کے طریقے داخل کر لیے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ توازن اور اعتدال بگڑتا چلا گیا جو اس سسٹم کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس نے دوسروں کے عقائد و افکار کو بغیر سوچے سمجھے قبول کرنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اپنے مذہب سے دور ہٹتی چلی گئی، حالانکہ مذہب ہی اس کی قومیت اور اس کے اخلاق، تہذیب اور تمدن کا قوام تھا۔ یہی چیز آخرکار اس قوم کے سیاسی زوال کی باعث ہوئی، اور اس نے حکومت کے مقام سے گرا کر اسے غلامی کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ غلامی کے دور میں

جو مزید خرابیاں اس قوم میں پیدا ہوئیں، ان کو میں تفصیل کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ اگر آپ انصاف کی نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا، کہ مغربی استیلاء سے مسلمانوں پر جو اثرات مترتب ہوئے وہ ان اثرات کے بالکل برعکس ہیں جو ہندوؤں پر مترتب ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کو اس نے پستی سے اٹھایا اور مسلمانوں کو اور زیادہ پستی میں گرا دیا۔ اس نے ہمارے اخلاق، عقائد، تہذیب و تمدن اور نظام معیشت و معاشرت کو جو نقصان پہنچایا ہے وہ ان جزوی فوائد کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں۔

مسلمانوں پر مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم کے اثرات کا ذکر میرے مضامین میں محض ایک ضمنی بحث کی حیثیت سے نہیں آیا ہے بلکہ میں قومی امراض کی تشخیص اور ان کی شدت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ منجملہ دوسرے اسباب زوال کے ان اثرات کا بھی پوری طرح جائزہ لیا جائے۔

مسلمانوں کی اصل ضرورت

نئی تعلیم اور پرانی تعلیم کی بحث دراصل دور از کار ہے۔ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے، وہ سب مل کر مسلمانوں کی کل آبادی کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ ہمارے سیاسی مستقبل کا دارومدار زیادہ تر کاشت کاروں اور مزدوروں کے اس بے زبان طبقے پر ہے جس نے نہ تو پرانی تعلیم حاصل کی ہے اور نہ نئی۔ یہ لوگ مسلمانوں کی آبادی کا ۹۰ حصہ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔ اس لیے ہم سب کا خواہ پرانے تعلیم یافتہ ہوں یا نئے، یہ فرض ہے کہ اس طبقہ کی اصلاح کریں، اس میں اپنے حقوق سمجھنے کا مادہ پیدا کریں، اور ان میں اس قسم کی استعداد پیدا کریں کہ وہ اپنے حق رائے دہندگی کو مسلمانوں کے مفاد کے لیے استعمال کر سکیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سمجھیے کہ ہم نے سیاسی جنگ جیت لی۔

جواب

درحقیقت یہی کام تو ہمارے پیش نظر ہے۔ ہم کو سب سے بڑا خطرہ یہ ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ ہمارے عوام جن کو اسلام کی تعلیمات سے کسی قسم کی واقفیت نہیں ہے، جو افلاس اور فاقہ کشی میں مبتلا ہیں، جن کو اسلامی تہذیب و تمدن کی گرفت میں رکھنے کے لیے کوئی نظام موجود نہیں ہے، جن میں جاہلیت کی رسوم پھیلی ہوئی ہیں، اور جو اسلامی تعلیم و تمدن کے اثر سے دُور رہنے کی بدولت ہندوستان کی آبادی کے سوادِ اعظم سے ہمرنگ ہو گئے ہیں، کہیں اشتراکیت اور نزاعِ طبقات کی اس تبلیغ کا شکار نہ ہو جائیں جو اس وقت "قوم پرست" جماعت کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ اِن مسلمانوں کے پست طبقات کو یہ تحریک اسلام کا علم اور شعور رکھنے والے طبقات سے جُدا کر دے گی، معاشی کش مکش برپا کر کے ان کے درمیان عداوت ڈال دے گی، اور جب یہ طبقے اپنی قوم کے اہلِ دماغ گروہ کی رہنمائی سے محروم ہو جائیں گے، تو ان کی جہالت اور ان کے افلاس سے فائدہ اُٹھا کر انہیں اقتصادی مساوات کا سبز باغ دکھایا جائے گا، اور اس بہلانے سے ان کو غیر مسلم عوام میں جذب کر لیا جائے گا۔ یہ اندیشہ اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اب تک "قوم پرست" تحریک کے مبلغین اور مسلم عوام کے درمیان جو دیوار حائل تھی، جس کی وجہ سے مسلم عوام ان کی تبلیغ کو سُننے تک کے روادار نہ تھے، اسے ہمارے علمائے کرام اپنی ناعاقبت اندیشی سے منہدم کر رہے ہیں۔ ان کے اس فعل کا نتیجہ یہ ہونا ہے کہ مسلم عوام آہستہ آہستہ ان لوگوں کی باتیں کان دھر کے سُننے لگیں گے، اور چونکہ یہ لوگ علانیہ تبدیلِ مذہب کی تلقین نہیں کرتے، بلکہ ان اشتراکی خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں جو مفلس طبقوں کے دل و دماغ پر بڑی آسانی کے ساتھ چھا جاتے ہیں، اس لیے ہمارے عوام رفتہ رفتہ ان کے جال میں پھنستے چلے جائیں گے اور آخر کار یہ چیز اُمّتِ مسلمہ کو پارہ پارہ کر دینے، اور جمہور مسلمین کو غیر مسلم سوادِ اعظم میں مدغم کر دینے کی موجب ہو گی۔ علمائے کرام آج جس چیز کو سمجھانے سے بھی نہیں سمجھ رہے ہیں، کل وہ چیز حقیقت بن کر ان کے سامنے آئے گی اور ایسی حالت میں آئے گی کہ اس کا علاج ان کی قدرت سے باہر ہو گا۔ اس وقت ان حضرات کی آنکھیں کھُلیں گی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انہیں معلوم ہوگا کہ جو تیر انہوں نے اندھیرے میں چلایا تھا وہ انگریزی سامراج کے بجائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے سینے میں پیوست ہوا ہے۔

ان خطرات کا سدِ باب اگر کسی صورت سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ مسلمانوں میں ایک فعال جماعت ایسی اُٹھ کھڑی ہو جو جمہور قوم میں جا کر ایک طرف تو ان کے اندر اسلام کی جوہری تعلیم پھیلائے، رسومِ جاہلیت کو مٹائے، ان کو اسلامی تہذیب و تمدن کے اصولوں سے باخبر کرے اور دوسری طرف ان کی روٹی کے مسئلہ کو اسلامی اصولوں کے مطابق حل کرے۔ ہم اشتراکی تحریک کی جو مخالفت کرتے ہیں اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم ظالمانہ سرمایہ داری اور ناجائز اغراض رکھنے والے طبقوں کے حامی ہیں۔ بلکہ دراصل اسلام کے متبع ہونے کی حیثیت سے ظالمانہ سرمایہ داری کو مٹانے اور مفلس طبقوں کی مصیبتوں کو حل کرنے کے لیے ہم خود اپنے اصول رکھتے ہیں اور وہ اشتراکیت کے اصولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم اپنی قوم کے معاشی مسائل کو خود اپنے ہی اصولوں کے مطابق حل کرنا چاہتے ہیں اور یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت کے علمبردار ہمارے جمہور پر قابض ہو کر اپنے طریقوں سے امتِ مسلمہ کو پارہ پارہ کر دیں۔ ہمارے سامنے اس وقت صرف معاشی اور سیاسی سوال ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اپنی تہذیب کی حفاظت کا بھی سوال ہے۔ اس لیے ہم کو اپنے جمہور کی تنظیم کرنے میں اسلامی اصول اختیار کرنے چاہئیں۔ ہمارے لیے گاندھی اور جواہر لال کا اسوہ قابلِ اتباع نہیں، بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے جس کی پیروی ہم کو کرنی چاہیے۔ خدا پرستوں کی تنظیم کے جو اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے استعمال کیے گئے تھے، وہ صرف اسی زمانہ کے لیے نہ تھے۔ بلکہ تمام زمانوں اور علاقوں کے لیے تھے۔ ان کو عمل میں لانے کے طریقے اور وسائل زمانی و مکانی حالات کے لحاظ سے بدل سکتے ہیں۔ مگر وہ اصول بجائے خود اٹل ہیں۔ اور آپ جس ملک اور جس زمانہ میں بھی خدا پرست قوم کی تنظیم کرنا چاہیں گے آپ کو انہی اصولوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ باطل کا اقتدار جب پوری طرح چھایا ہوا ہوتا ہے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس وقت لوگوں کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ ان اصولوں پر عملدرآمد غیر ممکن الوقوع ہے یا اگر ممکن بھی ہے تو اس کے لیے صدیاں درکار ہیں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ غیر ممکن چیز ہر وقت ممکن ہو سکتی ہے، اور دیکھتے دیکھتے ہوا کا رخ بدل سکتی ہے البتہ اس کے لیے ایک کڑی شرط یہ ہے کہ اس مشین کو صرف وہی اخلاقی طاقت حرکت میں لاسکتی ہے جو سیرتِ محمدی کے سرچشمہ سے ماخوذ ہو۔ جن لوگوں میں باطل سے مرعوب ہو جانے اور ہر بڑھتی ہوئی طاقت کے آگے سر جھکا دینے کی کمزوری موجود ہو، اور جو لوگ اتنی استقامت نہ رکھتے ہوں کہ سخت سے سخت طوفان میں بھی راہِ راست پر جمے رہ سکیں، ان کے ہاتھوں سے یہ مشین کبھی حرکت نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے لیے تنظیم کے کسی نئے پروگرام کی ضرورت نہیں۔ پروگرام تو بنا بنایا موجود ہے۔ کمی صرف ایک ایسے رہنما اور چند ایسے کارکنوں کی ہے جو اپنے مقصد میں اپنے نفس اور ہوائے نفس کو فنا کر سکتے ہوں، جن کے دل نام و نمود کی بھوک، ذاتی وجاہت کی پیاس، مال و زر کی حرص، اور نفاق و حسد کی آگ سے پاک ہوں، جن میں حق کو سربلند کرنے کا ایسا ارادہ موجود ہو جو کسی حالت میں ٹل نہ سکتا ہو اور جن میں اتنی صلاحیت ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے طریقہ پر نظم کے ساتھ کام کر سکیں۔

سلطنت در سلطنت

آپ اسلامی حقوق کی حفاظت کے لیے آئینی ضمانتوں کو بے فائدہ قرار دیتے ہیں۔ اس بنا پر کہ جب تک کہ ان ضمانتوں کی پُشت پر کوئی (Sanction) نہ ہو اکثریت ان کی پابندی کے لیے مجبور نہیں ہو سکتی۔ اس کے مقابلہ میں آپ چاہتے ہیں کہ مسلمان سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کی کوشش کریں۔ مگر بعینہٖ وہی اعتراض آپ کی اس تجویز پر بھی تو ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کے پاس وہ کونسی طاقت ہو گی جو اس "سلطنت در سلطنت" کے احکام کو اکثریت کی مرضی کے خلاف نافذ کر سکے گی؟ فرض کیجیے کہ اکثریت یہ قانون نافذ کرتی ہے کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی

یک قلم موقوف ہو جائے۔ مسلمانوں کی یہ "سلطنت در سلطنت" اس کو کیسے روک سکے گی؟ فرض کیجیے کہ کوئی مسلمان مرتد ہو جائے۔ آپ اس کو رجم کی سزا کیسے دے سکیں گے؟ فرض کیجیے کہ آپ حدِ زنا جاری کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکر ممکن ہے کہ آپ مرتکبینِ زنا کے ساتھ غیر مسلم زانیوں یا زانیات پر بھی حد جاری کر سکیں؟

جواب

"سلطنت در سلطنت" ایک مبہم اصطلاح ہے، جس کا اطلاق ایک حکومت کے حدودِ اقتدار میں کسی دوسرے نظام کی قوت و اثر کے مختلف مدارج پر ہوتا ہے۔ اس قوت و اثر کے دائرے کا وسیع یا محدود ہونا دراصل منحصر ہے اُس نظام کی مضبوطی اور اس کے حامیوں کی معنوی طاقت کے کم یا زیادہ ہونے پر۔ واقعات کی دنیا میں اقلیت و اکثریت کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اصل چیز نظم اور اجتماعی ارادہ کی طاقت ہے۔ اسی طاقت سے قلیل التعداد انگریز اپنے سے ہزار گُنی اکثریت پر حکمران ہے۔ ایک جمہوری نظامِ حکومت میں بھی "اقتدارِ اکثریت" (Majority- [redacted]) کے فائدہ کو ایک منظم اور قوی الارادہ اقلیت بے اثر یا کم اثر بنا سکتی ہے۔ پس یہ سوال کہ وہ "سلطنت در سلطنت" جو مَیں تجویز کر رہا ہوں کن حدود تک وسیع ہوگی، اس حالت میں طے نہیں ہو سکتا جب کہ ہم سرے سے کوئی نظم اور کوئی اجتماعی ارادہ ہی نہیں رکھتے۔ پہلے ہم کو یہ طاقت فراہم کرنی چاہیے۔ پھر ہم جتنی طاقت فراہم کر لیں گے، اسی کی نسبت سے "سلطنت در سلطنت" کے حدود وسیع یا محدود ہوں گے۔

شبہ دارالاسلام

آپ کہتے ہیں کہ اگر ہم دارالاسلام قائم نہیں کر سکتے تو کم از کم شبہ دارالاسلام ہی قائم کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن مَیں کہتا ہوں کہ جو نظامِ حکومت اس وقت قائم ہے یا جو آئندہ آئینی ضمانتوں کے تحت قائم ہوگا وہ بھی تو شبہ دارالاسلام ہوگا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ موجودہ نظامِ حکومت دارالاسلام نہیں ہے اور دارالحرب

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی نہیں ہے، لہٰذا ان معنوں کے ہیں ہیں جو صورت بھی ہوگی، اس پر شبہ دارالاسلام ہی کا اطلاق ہونا چاہیئے۔

جواب

بے شبہ دارالاسلام سے میری مراد ایک ایسا نظام سیاست ہے جو خالص "دارالکفر" کی بہ نسبت خالص "دارالاسلام" سے زیادہ اقرب ہو۔ ہندوستان کی موجودہ حالت یہ نہیں ہے۔ اس میں مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم کے کسی طرح کی بھی خود اختیاری حاصل نہیں۔ جو برائے نام مذہبی اور تمدنی آزادی ان کو دی گئی ہے وہ غیر مسلم حکمرانوں کی عطا کردہ چیز ہے جس کے حدود کو کم یا زیادہ کرنا ان کے اپنے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہے۔ ہمارے جن مذہبی احکام کو وہ اپنے اصول کے مطابق درست نہیں سمجھتے ان کے نفاذ کو روک دیتے ہیں اور جو مذہبی احکام ان کی مصلحتوں کے خلاف ہیں ان کو بھی نافذ نہیں ہونے دیتے۔ اس کے بعد صرف وہ احکام رہ جاتے ہیں جو ان کی نگاہ میں بے ضرر ہیں ان کے نفاذ کی وہ ہمیں اجازت دے دیتے ہیں۔ لیکن اس آزادی کے دائرے میں بھی ہم ان کے اقتدار کے بلاواسطہ اثر سے محفوظ نہیں ہیں۔ انہوں نے تعلیم کا جو نظام قائم کیا ہے وہ ہمارے مذہب اور تہذیب کے اصولوں کا مخالف ہے اور اس کے اثر سے ہماری نوجوان نسلوں کا ایک بڑا حصہ ان مذہبی احکام سے بھی روگردانی کرنے لگتا ہے جن کی بجاآوری میں ہم آزاد چھوڑے گئے ہیں۔ انہوں نے جو نظام معیشت قائم کیا ہے اس کی گرفت میں ہم اس قدر بے بس ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے اسلامی اصولِ معیشت کی پابندی قریب محال ہو گئی ہے۔ اگرچہ ظاہر میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو ہم کو اپنے اصولوں کی پابندی سے روکتا ہو۔ اسی طرح ان کا نظام عدالت و قانون اور ان کا آئین حکومت ایسا ہے جو ہمارے اخلاق، معاشرت، تمدن، ہر چیز پر بلاواسطہ اثر ڈالتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہم اس درجہ بے اختیار ہیں کہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی کارگر تدبیر عمل میں نہیں لا سکتے۔ ان سب پر مزید یہ کہ غیر مسلم طاقت کا اقتدارِ مطلق فی نفسہٖ ایک زبردست اثر رکھتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو طاقت کم از کم ظاہر کے اعتبار سے رزق کے خزانوں کی مالک اور عزت و ذلت بخشنے کی مختار نظر آتی ہو، محکوم قوم اس سے تقرب حاصل کرنے کے لیے اپنی وہ بہت سی چیزیں بخو شی اس کے قدموں میں لا کر ڈال دیتی ہے جنہیں وہ اس سے بجبر نہیں مانگتی۔ ایسی حالت جس ملک کی ہو وہ اگر خالص دار الکفر نہیں تو اس سے اقرب ضرور ہے۔ اس لیے اسے شبہ دار الکفر کہنا چاہیے نہ کہ شبہ دار الاسلام۔

میں جس چیز کی طرف مسلمانوں کے سیاسی فکر رکھنے والے لوگوں کو توجہ دلا رہا ہوں وہ یہی ہے کہ انہیں اس حالت کو بدلنے کے لیے اپنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہیے۔ اگر اس کو بدلنا ہے تو اس کی تیاری کا یہی وقت ہے۔ انقلابی دور میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال کا عمل جاری ہوتا ہے۔ اس وقت ہم نسبتاً زیادہ آسانی کے ساتھ آنے والی حالت کی شکل معین کرنے میں اپنا اختیار استعمال کر سکتے ہیں۔ جب وہ ایک خاص صورت میں ڈھل جائے گی اور پوری طرح مستحکم ہو جائے گی اس وقت ہمارے لیے اختیار استعمال کرنے کا شاید کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ گزشتہ صدی کے ابتدائی دور میں ہم نے غفلت کی اور اس شبہ دار الکفر کو نہ صرف قائم ہو جانے دیا بلکہ اپنے ہاتھوں سے اس کے قائم ہونے میں مدد دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل بے بس ہو کر اس کی گرفت میں جکڑے گئے۔ اور آج ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ ہمارے لیے اس کی بندشوں میں سے کسی چھوٹی سے چھوٹی بندش کو توڑنا بھی کس قدر مشکل ہے۔ اسی سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ اگر ہم نے ہندوستان کے سیاسی انقلاب کو موجودہ رفتار پر چلنے دیا۔ اور کوئی ایسی منظم طاقت فراہم نہ کی جس سے ہم اس کی سمت متعین کرنے میں خود اپنا اختیار بھی استعمال کر سکیں، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس شبہ دار الکفر کی جگہ ایک دوسرا شبہ دار الکفر لے لے گا، اور اس کے مستحکم ہو جانے کے بعد ہم اس کی گرفت میں بھی اتنے ہی بے بس ہوں گے جتنے اس وقت ہیں۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جس کو سمجھنے کے لیے کسی گہرے تفکر کی ضرورت نہیں، محض عقلِ عام (Common Sense) رکھنے والا ایک عامی بھی اس کو سمجھ سکتا ہے، مگر یہ نامساعد حالات کی طاقت کا کرشمہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ ایسی واضح بات کو سمجھانے کے لیے بھی دلائل کی ضرورت پیش آ رہی ہے اور دلائل کے زور سے بھی اس کو دلوں میں اتارنا مشکل ہو رہا ہے۔ جو لوگ پہلے ہندوستانی اور پھر سب کچھ ہیں وہ اگر اسے ماننے سے انکار کریں تو جائے تعجب نہیں، اس لیے کہ ان کی نگاہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا سوال کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔ ان کا ضمیر تو پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہے کہ شبہ دارالکفر ہو یا خالص دارالکفر، ہمیں صرف آزاد ہندوستان چاہیے جس میں ہمارے رزق کے خزانے خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ لیکن جو لوگ پہلے مسلمان اور پھر سب کچھ ہیں ان پر مجھے سخت حیرت ہے کہ وہ اس کو سمجھنے سے کیوں انکار کرتے ہیں۔

مصالحت کے امکانات

آئینی ضمانتوں پر تو بہرحال برطانوی حکومت اور ہندوستان کی اکثریت کو راضی کیا جا سکتا ہے اور یہ ایک قابلِ عمل چیز نظر آتی ہے، لیکن "سلطنت در سلطنت" کا تخیل تو ہے ہی ایسا جس پر نہ برطانوی حکومت راضی ہو سکتی ہے اور نہ ہندوستان کی اکثریت۔ یہ نام درمیان میں آ جانے کے بعد تو مصالحت کا دروازہ ہی بند ہو جاتا ہے۔

جواب

اس سے پہلے میں جو کچھ بیان کر چکا ہوں اس کو غور سے پڑھنے کے بعد مجھے امید ہے کہ معترض صاحب اپنی اس رائے پر نظر ثانی کریں گے۔ آئینی ضمانتیں اور ان پر اکثریت کی رضامندی ایسی چیز نہیں ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہو۔ اگر ان ضمانتوں کی پشت پر ہماری اپنی طاقت نہ ہو تو ان کا قائم رہنا یا نہ رہنا بہرحال اکثریت کی رضامندی پر موقوف ہوگا، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے آئندہ نظامِ سیاست میں اکثریت کے اقتدار کی وہی حیثیت ہو جو اس وقت انگریزی اقتدار کی ہے، اور اس کے دستِ قدرت میں ہم ویسے ہی بے بس ہوں جیسے اب ہیں۔

اکثریت کے منظور کرنے یا نہ کرنے پر جس "سلطنت در سلطنت" کا مدار ہو وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس نام سے موسوم کیے جانے کے قابل ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو وہ چیز ہے جس کو ایک جماعت کا طاقت ور اجتماعی ارادہ قائم کرتا اور قائم رکھتا ہے، خواہ کوئی اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔

ہندوستان کی سیاسی ترقی

یہ سلطنت در سلطنت کا تخیل ہندوستان کا سیاسی ترقی کے لیے بھی تو مفید نہیں ہے اگر اسی طرح ہندوستان کی ہر قوم سلطنت کے اندر ایک سلطنت بنانے کے لیے اٹھ کھڑی ہو تو فی الواقع ہندوستان میں کوئی سلطنت قائم ہی نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی جگہ فرقہ وارانہ انارکی لے لے گی۔

جواب

میں نصب العین والے مضمون میں ان کم سے کم حقوق اور اختیارات کی توضیح کر چکا ہوں جو ہندوستان میں مسلمانوں کی قومی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ "سلطنت در سلطنت" سے میری مراد مسلمانوں کا ایک ایسا اجتماعی نظام ہے جو انہی حقوق اور اختیارات کو استعمال کرے اور جس میں اتنی طاقت ہو کہ اگر کوئی ان حقوق اور اختیارات میں کمی کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔ آپ اس مضمون کو غور سے دیکھیے۔ اس میں جن حقوق اور اختیارات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کون سی چیز ایسی ہے جو مشترک ہندوستانی مفاد کے لیے ہم کو دوسری ہمسایہ اقوام کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے سے روکتی ہو؟

اگر ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اپنے مخصوص قومی مفاد کے لیے اس قسم کی خود اختیاری (Autonomy) حاصل کر لیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور ان سب کو ایسی خود اختیاری حاصل ہونے کے بعد بھی ہندوستان کا مشترک نظامِ حکومت بخوبی چل سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات نے صرف نظری سیاسیات (Theoretical Politics) کا مطالعہ کیا ہے وہ "سلطنت در سلطنت" کا نام سن کر کان کھڑے کرتے ہیں اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھتے ہیں کہ یہ ایک ناقابلِ عمل چیز ہے، لیکن عملی سیاسیات میں وسیع یا محدود پیمانے پر "سلطنت در سلطنت" کا وجود قریب قریب ہر ترقی یافتہ ملک میں پایا جاتا ہے اور سیاسی انصاف کے لیے اس کا وجود ناگزیر ہے۔ جہاں سلطنت کا غلبہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ ملک کے تمام دوسرے طبقے "سلطنت در سلطنت" سے محروم ہو گئے ہیں، وہاں ظلم اور بے انصافی کا مشاہدہ ہے۔ علاوہ بریں واقعات اس کا ثبوت دیتے ہیں کہ "سلطنت در سلطنت" ناقابلِ عمل چیز نہیں ہے۔ ہندوستان کے آئندہ نظامِ حکومت کی ترقی میں یہ اگر حارج ہو سکتی ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ اس ملک کی مختلف قوموں کے اندرونی "نظامات" ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ طرزِ عمل اختیار کریں، اور اپنی مرضی کو زبردستی دوسروں پر مسلط کرنا چاہیں۔ لیکن ہمیں اس نوعیت کی سلطنت در سلطنت مطلوب نہیں ہے جو انارکی اور خانہ جنگی برپا کرنے والی ہو۔ خالص دارالاسلام سے کم جس چیز کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اولاً ہمیں خود اپنے اصولوں کے مطابق اپنے گھر کی تنظیم و اصلاح کرنے کا اختیار و اقتدار حاصل ہو، ثانیاً ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ہم کو اتنا اثر حاصل ہو کہ اس ملک کا سیاسی و تمدنی ارتقاء ہمارے اصولِ تہذیب اور مصالحِ قومی کے خلاف راستہ اختیار نہ کرنے پائے۔ اور اتفاقاً اگر یہ ارتقاء ایسا کوئی راستہ اختیار کر رہا ہو تو ہم اتنے بے بس نہ ہوں کہ اپنی اجتماعی طاقت سے اس کو روک نہ سکیں۔ یہی تین عنصر ہیں کہ اس مفہوم کی تکمیل کرتے ہیں، جسے میں "سلطنت در سلطنت" سے تعبیر کر رہا ہوں، اور یہ ایسی چیز ہے کہ اگر مسلمانوں کے علاوہ ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی یہ حاصل ہو، تو اس سے کوئی بدنظمی واقع نہیں ہو سکتی۔ اسلامی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر اگر آپ محض عقل کی رو سے انصاف کا تقاضا معلوم کرنا چاہیں تو وہ صرف یہ ہے کہ جب ہندوستان تمام قوموں کا مشترک وطن ہے اور اس کی خوش حالی و ترقی سب کے عمل اور سب کی محنتوں اور قابلیتوں کا نتیجہ ہے تو یہاں کسی قوم کو بھی اتنا با اقتدار نہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کر دے اور نہ کسی قوم کو اتنا بے بس ہونا چاہیے کہ وہ اپنی اُن چیزوں کی حفاظت

بھی ہو کرسکے جنہیں وہ جان و مال سے زیادہ عزیز رکھتی ہو۔

خوف و ہراس

آپ کے انداز تحریر سے خوف و ہراس کی بُو آتی ہے۔ آپ ہندوؤں سے ڈرتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو کھا جائیں گے۔ کیا یہ خوف محض اس وجہ سے ہے کہ وہ کثیر التعداد ہیں اور مسلمان ان کے مقابلہ میں قلیل التعداد ہیں؟ کیا قرآن آپ کو یہی سکھاتا ہے کہ قوت اور غلبہ کا مدار کثرت اور قلت پر ہے؟ کیا اس سے بڑھ کر بھی اور کوئی بزدلی ہو سکتی ہے کہ مسلمان ان مشرکین سے ڈر جائیں جو ۳۳ کروڑ خداؤں کو پوجتے ہیں؟ مسلمان ایک موحد قوم ہے۔ اس کے پاس قرآن جیسی کتاب ہے۔ اس کے اندر ایمان کی حرارت ہے کیونکر ممکن ہے کہ کفار و مشرکین اس پر غالب ہو جائیں؟ مسلمانوں کو اپنی قوت پر اعتماد ہونا چاہیئے، اور اسی اعتماد پر آزادی کی جنگ میں شریک ہونا چاہیئے۔ اگر ان میں عزم اور ہمت ہو تو کسی قوت سے بھی انہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان پر دوسروں کا رنگ کیا چڑھے گا۔ ان کے پاس تو صبغۃ اللہ ہے جو تمام رنگوں پر غالب آنے والا ہے۔

جواب

یہ اعتراض چند در چند غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے، اور زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے پیش کیا گیا ہے جنہیں سوچنے سے پہلے بول دینے کی عادت ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمیں خوف ہندوؤں کی طاقت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی کمزوریوں، اور ان کمزوریوں سے ہے جنہیں قرآن نے قوموں کے اسباب زوال و فنا میں شمار کیا ہے۔

قرآن کسی جگہ بھی یہ نہیں کہتا کہ مسلمان صرف اس بنا پر دنیا میں غالب ہوں گے کہ ان کے نام عبداللہ اور عبدالرحمان ہیں اور کفار صرف اس بنا پر ان سے مغلوب ہو جائیں گے کہ وہ شیام سندر یا ارجن جیسے ناموں سے موسوم ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن اس تیرہ سو برس کی تاریخ میں نعوذ باللہ ہزاروں مرتبہ جھوٹا ثابت ہو چکا ہوتا۔ اگر ایسا ہوتا تو خصوصیت کے ساتھ گزشتہ دو سو برس کی تاریخ کا ایک ایک لمحہ اس کے "جھوٹ" کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زندہ ثبوت ہوتا (معاذ اللہ) یہ قرآن رکھنے والے موحد مسلمان جن کا آپ ذکر فرما رہے ہیں، چین سے لے کر مراکش تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ مگر کیا یہ چین کے بت پرستوں سے، روس کے ملحدوں سے، انگلستان، فرانس، ہالینڈ اور اٹلی کے تثلیث پرستوں سے مغلوب نہیں ہیں؟ یہی قرآن رکھنے والے موحد مسلمان صقلیہ اور اندلس میں بھی تھے۔ مگر کیا یہ وہاں سے حرفِ غلط کی طرح مٹا نہیں دیئے گئے؟ یہی قرآن رکھنے والے موحد فتنۂ تاتار کے زمانہ میں بھی تھے۔ مگر کس چیز نے ان کی تہذیب اور ان کی عظیم الشان سیاسی طاقت کو مشرکین تاتار کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچا لیا؟ یہ دنیا حقائق کی دنیا ہے، خوا(بو)ں کی دنیا نہیں ہے۔ آپ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی منتر آپ کو سکھا دیا گیا ہے جسے پڑھتے ہی طلسم کے پتلے غیب سے پیدا ہوں گے اور کفار کو تہ تیغ کر دیں گے۔ آپ قرآن اپنے گھر میں رکھ کر سمجھتے ہیں کہ کوئی تعویذ آپ کے پاس آیا ہوا ہے جس کا بس گھر میں موجود ہونا ہی اسے تمام آفاتِ ارضی و سماوی سے محفوظ کر دے گا اور خدا اپنے قانونِ فطرت کو آپ کے لیے بدل ڈالے گا۔ وہ تمام اخلاقی عیوب اور وہ تمام قومی امراض اپنے اندر پالتے رہیے جو کفار و مشرکین اور منافقین کے خصائص میں سے ہیں۔ اور پھر یہ پندار بھی اپنے دماغ میں رکھیے کہ ہم وہی مومن ہیں جن سے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اور جب کوئی یاد دلائے کہ ان کمزوریوں کے ساتھ آپ کسی انقلاب کے طوفان میں زندہ نہیں رہ سکتے تو اس کو بزدلی کا طعنہ دیجیے۔ یہ اگر بہادری اور عقلمندی ہے تو ایسی بہادری اور عقل مندی آپ ہی کو مبارک رہے۔ میں تو اسے خام خیالی اور طفل تسلی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ زندگی کے نہیں تباہی کے لچھن ہیں۔ میں اس سپہ سالار کو احمق سمجھتا ہوں جو اپنی فوج کے کمزور پہلوؤں سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، جوشیلے الفاظ سے اس میں طاقت کا جھوٹا پندار پیدا کرتا ہے، اور اسے خطابت کی شراب پلاتا ہے، تاکہ وہ مدہوش ہو کر تباہی کی خندقوں میں کود پڑے۔

بے شک کثرت و قلت پر غلبہ و قوت کا مدار نہیں ہے یقیناً کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ[1] ایک حقیقت ہے۔ مگر کچھ سوچا بھی ہے کہ وہ کون سی اقلیت ہے جو اکثریت پر غالب آتی ہے ؟ وہ اقلیت جس میں نظم ہو، جس میں اطاعت امر ہو، جس میں وحدت ہو، جس میں ایک نصب العین پر کامل اتفاق ہو، جس میں اپنے نصب العین کی خاطر اجتماعی جدوجہد کرنے اور جان و مال کی قربانیاں دینے کا جذبہ ہو، جس کے افراد میں سیرت کی مضبوطی اور اخلاق کی بلندی ہو، جس کے افراد اپنی تہذیب کے اصولوں پر سختی کے ساتھ عامل ہوں، اور جس میں منافقین کا وجود عنقا ہو۔ ایسی اقلیت اگر آپ ہیں تو ۲۲ کروڑ ہندو کیا چیز ہیں، تمام دنیا کے کفار مل کر بھی آپ کو مٹا نہیں سکتے۔ لیکن فی الواقع کیا آپ ایسی ہی اقلیت ہیں ؟ ایسی اقلیت آپ تھے تو یہ تین لاکھ انگریز ۶ ہزار میل کے فاصلے سے آکر آپ کے کروڑوں افراد کو غلام بنانے میں کیسے کامیاب ہو گئے۔ بچوں کی طرح خواب نہ دیکھیے۔ ہوش میں آکر اس دماغ سے بھی کچھ کام لیجیے، جو خدا نے آپ کو سوچنے اور سمجھنے ہی کے لیے دیا ہے۔ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھ کر آپ نے خدا پر کوئی احسان کیا ہے، جس کے معاوضہ میں وہ آپ کے لیے تمام قوانین طبعی کو اُلٹ دے گا؟ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اکثریت متحد ہو رہی ہے، اس میں نظم پیدا ہو رہا ہے، وہ ایک مرکز کی اطاعت پر مجتمع ہو رہی ہے، وہ ایک نصب العین کی خدمت کے لیے قربانیوں پر آمادہ ہے، اس نے اپنے منافقین کا بڑی حد تک استیصال کر دیا ہے، وہ اپنے افراد میں سیرت کی مضبوطی پیدا کر رہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں آپ خود اپنا حال بھی دیکھ سکتے ہیں۔ آپ میں کوئی نظم نہیں، کوئی مرکزیت نہیں، کوئی متفق علیہ نصب العین نہیں، کوئی صاحب امر شخص یا جماعت نہیں جس کی آپ اطاعت کریں۔ آپ کی مختلف پارٹیاں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہو رہی

---

[1] بارہا ایسا ہوا کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔

(البقرہ: ۲۴۹)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ کبھی جھانسی میں، کبھی بجنور میں، کبھی مراد آباد میں، خانہ جنگی کے لیے آپ کے اکھاڑے برپا ہوتے ہیں۔ خم ٹھونک ٹھونک کر بھائی کو بھائی چیلنج دیتا ہے، اور جب ایک بھائی دوسرے بھائی کو مار لیتا ہے، تو اغیار کے سامنے اپنی برادر کشی پر سینہ تان تان کر فخر کا اظہار کرتا ہے۔ آپ کے افراد کیریکٹر کی ایسی کمزوری کا اظہار کرتے ہیں جو ساری قوم کی ہوا اکھاڑ دیتی ہے۔ آج اِس گروہ میں ہیں تو کل دوسرے گروہ میں، آج یہ طاقت غالب ہے تو اس کے ساتھ ہیں، کل دوسری طاقت ابھرتی نظر آئی تو دفعتاً انہوں نے بھی اپنی وفاداریوں کا رُخ بدل دیا۔ افراد تو درکنار آپ کی جمعیتوں تک کا یہ حال ہے کہ ان میں کسی قسم کی استقامت رائے نہیں پائی جاتی۔ غیر مسلم خواہ کوئی طرزِ عمل اختیار کریں، دو چار اسلامی جمعیتیں ان کی مخالف ہوں گی، پھر تو دو چار ان کا ساتھ دینے کے لیے بھی کھڑی ہو جائیں گی، اور یہ حقیقت دنیا پر آشکارا کر دیں گی کہ مسلمانوں میں بہت آسانی سے تفرقہ ڈالا جا سکتا ہے۔ کیا یہی وہ ترکیب ہے جس کو لے کر آپ کے لیے كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً [1] کا معجزہ صادر ہو گا!

قرآن اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ خدا کے قانون میں جانبداری کہیں نہیں ہے۔ جو اس قانون کے خلاف چلے گا، خواہ وہ مومن ہی کیوں نہ ہو، پیس ڈالا جائے گا، اور جو اس کی شرائط پوری کرے گا، خواہ وہ کافر و مشرک ہی کیوں نہ ہو، غالب اور فتح یاب ہو گا۔ صحابہ کرام کی جماعت سے بڑھ کر ایمان کی حرارت اور سیرت اسلامی کا استحکام رکھنے والی جماعت تو کوئی نہیں ہو سکتی۔ مگر ایسی کامل الایمان جماعت بھی مشرکین سے متعدد مرتبہ شکست کھا گئی، اور وہ بھی کس حالت میں؟ جب کہ خود سرکار رسالت مآب

---

[1] بارہا ایسا ہوا کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا۔ (البقرہ۔ ۲۴۹)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود تھے اور بنفسِ نفیس ان کی قیادت فرما رہے تھے۔ جنگِ احد میں صرف اتنا ہی قصور تو ہوا تھا کہ مومنین کے دلوں میں مال کی محبت آگئی اور انہوں نے اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ نتیجہ کیا ہوا؟ پتھر کو پوجنے والے خدائے واحد کی عبادت کرنے والوں پر چیرہ دست ہو گئے اور خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاتھوں زخمی ہوئے۔ حَتّٰٓى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ أَرَاكُمْ مَّا تُحِبُّونَ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلٰٓى أَحَدٍ وَّالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِيٓ أُخْرٰىكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ[۱] (آلِ عمران - ۱۶)۔ جنگِ حنین میں صرف اتنی ہی کوتاہی تو ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کو اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا۔ قانونِ فطرت نے اس کی سزا یہ دی کہ مشرکین کے مقابلہ میں ان کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِينَ[۲] (التوبہ: ۲۵) جو خدا ایسے بے لاگ قانون کے ساتھ اس کائنات پر حکومت کر رہا ہے۔ اگر اس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ اہلِ ایمان کی صفات سے عاری ہونے کے بعد بھی وہ آپ کی حمایت کرے گا۔ اور ان مشرکین

---

[۱] یہاں تک کہ جب تم نے نامردی کی اور کام میں جھگڑا ڈالا اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ تم کو دکھا چکا تمہاری خوشی کی چیز۔ جب تم چڑھے جاتے تھے اور پیچھے پھر کر نہ دیکھتے تھے کسی کو اور رسول پکارتا تھا تم کو تمہارے پیچھے سے پھر پہنچایا تم کو غم عوض میں غم کے۔ (آلِ عمران: ۱۵۲-۱۵۳)

[۲] اور حنین کے روز، اس روز تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرہ تھا۔ مگر وہ تمہارے کام کچھ نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ (التوبہ: ۲۵)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے مقابلہ میں آپ کو ثابت قدمی بخشے گا جو اس وقت قانون طبیعی کی شرائط آپ سے زیادہ بہتر طریقہ پر پوری کر رہے ہیں، تو میں آپ کی خدمت میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ آپ عقلِ سلیم اور علمِ قرآن دونوں سے محروم ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصّہ سوم

کانگریس، متحدہ قومی تحریک

اور

مسلمان

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پچھلے دو حصوں میں جو مضامین دیئے گئے ہیں انہوں نے متحدہ ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ہلچل مچا دی اور مسلمانوں کو ایک نئے طرز پر سوچنے کی دعوت دی۔ اس سے بجا طور پر اس امر کی پیاس پیدا ہوئی کہ رائج الوقت تحریکات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور مسلمانوں کو جو راستہ دکھایا جا رہا تھا اس پر مسلسل تنقید کر کے بتایا جائے کہ متحدہ قومیت کی راہ کتنی غلط اور تباہ کن تھی۔ نیز یہ بھی بتایا جائے کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے مختلف حل کیا ہو سکتے ہیں اور ان میں مسلمانوں کے لیے نفع بخش وہ کون سی ہے۔ یہ مضامین ۱۹۳۸ء میں لکھے گئے اور متحدہ قومیت کی تحریک سے مسلمانوں کو کاٹنے اور حکومت الٰہیہ کی ضرورت کا احساس پیدا کرنے میں غیر معمولی طور پر مفید و مؤثر ہوئے۔ یہ مضامین مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ دوم کی شکل میں بار بار چھپ چکے ہیں ——— مرتب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تقدیم[1]

کسی قوم کے لیے اس وقت سے زیادہ پریشانی و سراسیمگی کا اور کوئی وقت نہیں ہوتا جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کے گرد و پیش سارا ماحول اس کے خلاف بدل گیا ہے، زندگی کے کارخانہ کو چلانے والی تمام طاقتیں، اُن اصول اور ان مناہج کے خلاف چل رہی ہیں جن پر اعتقاداً و عملاً اس کے وجود ہی کی اساس قائم ہے، اور وہ اُس ... جت کی طرح ہو کر رہ گئی ہے جس کے لیے زمین، ہوا، پانی، موسم، سب کے سب ناموافق و ناسازگار ہو گئے ہوں۔ بدقسمتی سے آج ہم ہندوستان کے مسلمان اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ڈیڑھ صدی سے زیادہ مدت ہم پر اسی حالت میں گزر گئی ہے، اور برابر یہ حالت شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہندستان کی کسی دوسری قوم کو یہ پریشانی پیش نہیں آئی۔ اس لیے دوسرے لوگ اُس الجھن کو بآسانی نہیں سمجھ سکتے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ ان کے لیے ہر بدلی ہوئی صورت کے مطابق بدل جانا اور اپنی ہیئت کو ہر سانچے میں ڈھال لینا سہل ہے۔ ان

---

[1] یہ مضمون جمادی الاخریٰ ۱۳۷۵ھ میں لکھا گیا۔ مرتب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے اعتقادات اور اصولِ حیات ان کے وجود سے الگ ایک چیز ہیں جن کے بدل جانے اور سراسر اُلٹ جانے کے بعد بھی ان کا وجود جُوں کا تُوں رہتا ہے لیکن ہمارے اعتقادات اور اصولِ حیات عین ہمارا وجود ہیں اور ان کے بدل جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہم نہ رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے ہندوستان کے حالات نے پلٹا کھایا ہے ہم ایک الجھن میں مبتلا ہیں اور یہ الجھن بڑھتی جا رہی ہے، کیونکہ ہمارے گرد و پیش ایک ایسا ڈھانچہ بن گیا ہے اور بنتا جا رہا ہے جس میں ہم کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتے۔

انگریزی حکومت جب ہندوستان پر مسلط ہوئی تو اس کے ساتھ ہی ہمارے ماحول میں ایک ہمہ گیر تغیر رونما ہونا شروع ہو گیا۔ ہم صرف مقامِ عزت و اقتدار ہی سے گرا نہیں دیئے گئے بلکہ ایک غیر مسلم غلبہ و استیلاء کا یہ نتیجہ روز بروز زیادہ شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آنے لگا کہ ہمارے گرد و پیش افکار، نظریات، اصولِ اخلاق، طرزِ تمدن، معیارِ تہذیب، قوانینِ معاشرت و معیشت، نظامِ حکومت و سیاست، غرض ایک دنیا کی دنیا بدلتی جا رہی ہے اور اس کی ہر چیز ہمارے اجتماعی مزاج اور ہماری قومی طبیعت کے بالکل خلاف ہوتی جاتی ہے۔

اوّل اوّل ہم نے کوشش کی کہ پتھر کی ایک چٹان بن کر تغیر و انقلاب کی اس رَو کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ کرنے کے ہم اہل بھی نہ تھے۔ صدیوں کے جمود نے ہم میں اتنی صلاحیت ہی باقی نہ رہنے دی تھی کہ ہم اس انقلاب کی حقیقت کو سمجھ سکتے، اور نہ اتنی طاقت باقی چھوڑی تھی کہ سوچ سمجھ کر ان تدابیر کو عمل میں لاتے جو کسی انقلاب کے مقابلہ میں اختیار کرنی چاہئیں۔ اتنی صلاحیت اور طاقت ہم میں ہوتی تو یہ انقلاب رونما ہی کیوں ہوتا؟

ایک صدی تک خوب پسنے اور مادّی و اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو جانے کے بعد یہ راز ہم پر کھلا کہ تغیرات زمانہ کے سیلاب کا مقابلہ جامد چٹان بن کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد ہمارے دانشمندوں نے ہمیں ایک اور پالیسی کی تلقین

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی اور وہ یہ تھی کہ :-

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

ہم نے کہا کہ آؤ اسی کو آزما دیکھیں، شاید اپنے آپ کو کچھ بدل کر ہم اس نئے ڈھانچہ میں ٹھیک بیٹھ سکیں۔ چنانچہ ہم نے پہلے مغربی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اپنے آپ کو زمانے کی رَو کے ساتھ بہنے کے لیے تیار کیا۔ پھر غیر مسلم حکومت کی بارگاہ میں درخورِ حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ اپنی کھوئی ہوئی مادی طاقتوں میں سے کم از کم ایک معتد بہ حصّہ بازیافت کر لیں۔ پھر اپنے ملک کے جدید سیاسی تغیرات سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی کہ زمانہ کا یہ سیلاب جس طرف جا رہا ہے اسی طرف سب کے ساتھ ہم بھی جائیں۔

یہ تغیرات جو ہم نے اپنی پوزیشن میں کیے، ان سب میں ہمارے پیش نظر یہ مسلک رہا کہ اپنی خودی کا تحفظ بھی کرو اور زمانے کے ساتھ بھی چلو۔ لیکن ستر برس کے تجربے پر ایک غائر نگاہ ڈال کر دیکھیے، کیا اس زمانہ سازی کے دَور میں ہم اپنی خودی کو محفوظ رکھ سکے ہیں؟ واقعات کی ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ ایسا نہیں ہوا، اور عقل اس کو محال کہتی ہے کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ جو کھونٹے سانچے میں آپ ٹھیک بھی بیٹھیں اور اپنی ہیئت کی گولائی کو تبدیل بھی نہ کریں۔ دریا کے رُخ پر بہیں بھی اور اپنی جگہ پر قائم بھی رہیں۔ یہ دو باتیں بالکل متضاد ہیں اور ان کو جمع کرنا صریح عقل کے خلاف ہے۔

مغربی تعلیم کے تجربے سے کیا ثابت ہوا؟ یہ کہ جو ماحول ہم پر مسلط ہے اس میں سے ایک عنصر یعنی تعلیم کو ہم دوسرے عناصر سے الگ کر کے نہیں لے سکتے۔ دوسرے عناصر جن کے ساتھ اس عنصر کا غیر منفک رابطہ ہے، خود بخود اس کے ساتھ آتے ہیں۔ زندگی کا ایک اور نقطۂ نظر، اخلاق کے کچھ دوسرے اصول، اشیاء کی قدر و قیمت متعین کرنے کا ایک مختلف معیار، متمدن زندگی کے کچھ نرالے ڈھنگ، جو سب کے سب اسلام سے بالکل بیگانہ ہیں، اس ایک چیز کو قبول کرتے ہی خواندہ و ناخواندہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آسنے شروع ہو جاتے ہیں، اور ان سب کے جمع ہو جانے سے مسلمان خود بخود نامسلمان بنتا چلا جاتا ہے۔

سرکارِ فرنگ کے دربار میں پہنچ کر ہمیں کیا سبق ملا؟ یہ کہ دین، ایمان، اخلاق، تہذیب، تمدن سب کچھ ایک روٹی کے عوض دے دو اور روٹی بھی پیٹ بھر نہ ملے۔ اپنی خودی کو قربان کیے بغیر وہاں سے تم کچھ نہیں پا سکتے۔ اور اس قربانی کے بعد بھی تمہاری حیثیت ایک خادم سے بڑھ کر نہیں ہوتی جو ایک تابعِ حقیر کی طرح آقا کے مفاد پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

سیاسیات میں زمانہ سازی کا پھل کیا ملا؟ یہ کہ تمام سیاسی تغیرات جو اب تک ہوئے اور آئندہ ہونے والے ہیں، ہمارے نظریاتِ عمرانی کے بالکل خلاف اور خداوندانِ فرنگ کے نظریاتِ عمرانی کے عین مطابق ہیں۔ ان کا نظریۂ قومیت، ان کے اصولِ جمہوریت، ان کے تصوراتِ حکومت و سلطنت، انہی چیزوں پر تمام جدید تغیرات کی بنا رکھی گئی ہے اور ہمارے لیے ایسے تغیرات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے معنی اپنے وجود کو ایک دوسرے وجود میں بالکل تحلیل کر دینے کے ہیں۔

ان تجربات کے بعد اب ضرورت ہے کہ ہم اپنی دوسری پالیسی پر بھی نظرِ ثانی کریں۔ پہلی پالیسی قریب قریب سو برس کے تجربہ سے غلط ثابت ہوئی اور اسے بدلنا پڑا۔ دوسری پالیسی کو ستر برس کے تجربے نے غلط اور غلط ہی نہیں مہلک ثابت کر دیا۔ اس کو بھی بدلنا اور بہت جلدی بدل ڈالنا چاہیے۔ اب ہمارے لیے صرف تیسری پالیسی باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ:۔

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

جو ڈھانچہ تمہارے گرد و پیش چھا گیا ہے اس سے تم الگ بھی نہیں رہ سکتے، اور اس میں اپنی خودی قربان کیے بغیر ٹھیک بھی نہیں بیٹھ سکتے۔ لہٰذا آؤ اب مردوں کی طرح لڑ کر اس ڈھانچے کو توڑ ڈالو اور اسے مجبور کرو کہ تمہاری ہیئت کے مطابق بنے۔ جس سیلاب میں تم گھر گئے ہو اس کے ساتھ بہنے میں تمہارا وجود نمک کی طرح

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تحلیل ہوا جاتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں جامد چٹان بن کر تم اپنی جگہ جم بھی نہیں سکتے، لہذا آؤ، اب بہادروں کی طرح اٹھ کر اس سیلاب کا رُخ پھیر دو اور اسے اس رُخ پر بہنے کے لیے مجبور کرو جو تمہاری فطرتِ مسلم کے مقتضاء سے مطابقت رکھتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس میں کامیابی نہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہ تم خود ہی اس لڑائی میں ہلاک ہو جاؤ۔ مگر بکری کی زندگی کے سو برس سے شیر کی زندگی کا ایک دن بہرحال زیادہ قیمتی ہے۔

یہی انقلابی ذہنیت ہے جسے میں اب مسلمانوں میں، خصوصاً ان کے نوجوانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ انقلابی ذہنیت یکایک پیدا نہیں ہوتی۔ زمانہ کی سخت ٹھوکریں کھا کھا کر آہستہ آہستہ دماغ درستی پر آتا ہے اور ان ٹھوکروں کے ساتھ آہستہ آہستہ انقلابی ذہنیت اس کے اندر اترتی ہے۔ اس دوران میں آدمی کو بڑے سخت مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ باہر والوں سے پہلے گھر والوں سے لڑائی، اور لڑائی بھی چوطرفی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ قدیم پالیسی جن دماغوں میں گہری جمی ہوئی ہوتی ہے وہ انقلاب کی دعوت سُن کر اوّل تو اس کا مفہوم و مدّعا ہی نہیں سمجھ سکتے۔ پھر کچھ کچھ سمجھتے بھی ہیں تو اسے اپنے عادی تصوّرات کے خلاف پاکر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے کہ یہ کوئی نیا دوکان دار آیا ہے جو ہماری پرانی جمی ہوئی دوکانوں کے مقابلے میں اپنی دوکان چلانے کے لیے یہ باتیں کر رہا ہے۔ کوئی خیال کرتا ہے کہ یہ کوئی گہری سازش ہے جسے دشمنوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ تیار کیا ہے۔ کوئی تیوری بدل کر کہتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے بال قومی خدمت میں سفید کیے ہیں ان کے مقابلہ میں نوخیز طفلِ مکتب ہو کر تمہیں زبان کھولتے شرم نہیں آتی۔ کوئی آوازہ کستا ہے کہ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ[1] اور کوئی نہنگ سال خوردہ سیلاب کے ساتھ بہتے ہوئے

---

[1] یہ شخص بجز اس کے کہ تمہاری طرح کا ایک (معمولی) آدمی ہے اور کچھ نہیں (اس دعوے سے) اس کا مطلب یہ ہے کہ تم سے برتر ہو کر رہے۔ (المومنون - ۲۴)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک سرپرستانہ نگاہ اس رو کے خلاف تیرنے والی مچھلی پر ڈالتا ہے اور بس یہ کہہ کر آگے بڑھ نکلتا ہے کہ اس نے کوئی نئی بات نہیں کہی، ہم بھی پہلے کہہ چکے ہیں۔

پھر پرانے خیالات کی ایک دنیا ہوتی ہے جسے انقلاب کے داعی کو توڑنا پھوڑنا ہوتا ہے اور نئے خیالات کی ایک دنیا ہوتی ہے جو اسے بنانی پڑتی ہے۔ لوگ پرانے خیالات سے ہٹ نہیں سکتے جب تک کہ نہایت مضبوط دلائل کیساتھ تنقید کرکے ان کی بنیادیں ہلا نہ دی جائیں۔ اور نئے خیالات قبول نہیں کرسکتے جب تک کہ تعمیری افکار کو حکمتِ عملی کے ساتھ پیش کرکے انہیں قابلِ قبول نہ بنا دیا جائے اور معقول دلائل کے ساتھ انہیں مطمئن نہ کردیا جائے کہ اس مضبوط ڈھانچے کو جس کی گرفت میں طوعاً یا کرہاً آگئے ہو، یوں توڑا جاسکتا ہے اور اس کی جگہ یہ ڈھانچہ بنانے کی ضرورت ہے جس میں تم ٹھیک بیٹھ سکتے ہو، اور یہ دوسرا ڈھانچہ اس طرح بننا ممکن ہے۔ اس کام میں تخریبی تنقید اور جدید تعمیر دونوں ساتھ ساتھ کرنی پڑتی ہیں۔ جب تک یہ دونوں کام تکمیل کے قریب نہیں پہنچ جاتے، غلط فہمیوں، بدگمانیوں اور پریشان خیالیوں کا ایک گہرا غبار ہر طرف چھایا رہتا ہے جس کی وجہ سے پرانے خیالات کے معتقدین اور جدید وقدیم کے درمیان بھٹکنے والے مذبذبین کے ایک انبوہِ کثیر کو انقلابی نصب العین کا نقطہ صاف نظر نہیں آسکتا کہ وہ اُس پر جمع ہوسکیں، اور جب تک یہ نقطہ واضح ہو کر اس قابل نہیں بن جاتا کہ قوم کی عملی قوتیں اس پر مجتمع ہوں اس وقت تک عملی جدوجہد کی راہ میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا پس یوں سمجھئے کہ ابتداءً سب سے بڑا عمل یہی ہے کہ قدیم خیالات کا طلسم پیہم ضربوں سے توڑا جاتے اور جدید خیالات کے لیے راہ صاف کی جاتے۔

تخریبی تنقید کے مرحلے میں ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ قدیم پالیسی کی غلطیاں اور مضرتیں ثابت کرنے کے لیے اُس پالیسی پر چلنے اور چلانے والوں کو تنقید کا ہدف بنائے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ اور یہ ایسا کام ہے کہ جسے دل پر پتھر رکھ کر انجام

دینا پڑتا ہے۔ اس میں آدمی کو بہت سی دوستیوں، بہت سی محبتوں، بہت سے پرانے تعلقات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اور بہت سے ان بزرگوں کی ناراضی مول لینا ہوتی ہے جن کا وہ تمام عمر احترام کرتا رہا ہے۔ اور جن کی بزرگی کے احترام سے اس کا دل کبھی خالی نہیں ہوتا۔ اس میں آدمی کو اس امر کا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں تنقید کی شدت سے وہ جواب میں ضد نہ پیدا کر دے، اور کہیں جوابی حملے خود اس کے ذہنی توازن کو نہ بگاڑ دیں۔ غرض اس خارزار سے اس کو بہت ہی سنبھل کر گزرنا پڑتا ہے اور ہر وقت اپنے اعصاب کی بندش چست رکھنی ہوتی ہے۔

انقلابی ذہنیت پیدا کرنے کے لیے تدریج کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ لوگوں کی قوتِ تحمل سے زیادہ خوراک دینا بھی مہلک ہے اور جتنی خوراک کی طلب ان میں پیدا ہو چکی ہو اس سے کم دینا بھی بُرے نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر آدمی کی قوتِ فیصلہ کا سخت امتحان ہوتا ہے، اور صرف خدا ہی کی مدد اس کو حالات کا صحیح اندازہ کرنے اور ٹھیک وقت پر ٹھیک قدم اٹھانے کی طاقت بخش سکتی ہے۔

میں اپنی کمزوریوں سے خوب واقف ہوں، اور انہی کمزوریوں کا احساس ہے جو مجھے ہر وقت مجبور کرتا ہے کہ میں خداوندِ عالم سے علمِ صحیح اور عقلِ سلیم کے لیے دعا کروں۔ محض فرض کی پکار نے مجھے مجبور کر کے اس کام پر آمادہ کیا ہے جس کے دشوار گزار مرحلوں کو دیکھ کر ایک طرف اور اپنی کمزوریوں کو دیکھ کر دوسری طرف، میری رُوح لرز اٹھتی ہے۔ بہرحال محض خدا کے بھروسے پر میں نے اس میدان میں قدم رکھ دیا ہے اور ان تمام حکمتوں کو پیشِ نظر رکھ کر جن کی طرف اُوپر اشارہ کر چکا ہوں، اپنے انقلابی مشن کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔

پچھلے دو حصّوں میں جو مضامین پیش کیے گئے ان کو مرتب کرتے وقت میں نے خاص طور پر اس بات کو ملحوظ رکھا تھا کہ ابھی محض لوگوں کو چونکانے اور ان کے دماغوں کو انقلابی تصورات کے لیے تیار کرنے کی ضرورت ہے، اس سے زیادہ کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے میں نے مسلمانوں کی پچھلی تاریخ، ان کے موجودہ حالات اور ان

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

کے گرد و پیش کام کرنے والی قوتوں کے رُجحانات پر ایک سرسری تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتانے پر اکتفا کیا تھا کہ تمہارے اندر کیا کمزوریاں ہیں، اور باہر سے کس قسم کے خطرات تم کو گھیرے ہوئے ہیں اور تمہاری تہذیب کی فطرت سے تمہارے ماحول کی طاقتیں کس طرح متصادم ہو رہی ہیں۔ اس تبصرے کے ساتھ میں نے جدید انقلابی نصب العین کی طرف محض چند اشارات کیے تھے اور انہیں قصداً زیادہ واضح نہیں کیا تھا تاکہ اچانک ایک نرالی آواز سُن کر طبائع آمادۂ بغاوت نہ ہو جائیں۔

اب اس حصہ میں، میں ایک قدم اور بڑھا رہا ہوں۔ اب میں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہندوستان کے موجودہ سیاسی نظام اور اس کی بنیادوں کا تجزیہ کیا ہے اور ایک ایک مقام پر اُنگلی رکھ کر بتایا ہے کہ یہاں مسلمانوں کے لیے ہلاکت ہے، اور یہاں ان کے لیے نقصان ہے، اور یہ چیزیں ان کے مزاجِ قومی کے منافی ہیں — یہ اُن لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ مسلمانوں کو محض خیالی خطرات سے ڈرایا جا رہا ہے — اس کے بعد میں نے مسلمانوں کے ان رہنماؤں کی پالیسی پر تنقید کی ہے جو اب تک "زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ بساز" کے مسلک پر چلے جا رہے ہیں۔ جس قدر دلائل و شواہد میں فراہم کر سکتا تھا اُن سب سے کام لے کر میں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ پورا نظامِ حکومت و سیاست جو ہم پر مسلط ہے اپنے اصول و فروع سمیت ان اصولوں سے متصادم ہو رہا ہے جن پر ہماری قومی زندگی کی بنا قائم ہے، اور اس نظام کو انہی بنیادوں پر قائم رکھ کر اپنے آپ کو جُوں کا تُوں یا کسی قدر تحفظ کے ساتھ اس میں فٹ کرنے کی کوشش کرنا سراسر ایک غیر دانشمندانہ طریقِ کار ہے، اور مسلمان اس طریقِ کار سے ہرگز کسی فلاح کی، اور فلاح کیا معنی، اپنے بقا کی بھی اُمید نہیں کر سکتے۔ اِس بحث سے میرا واضح مقصد یہ ہے کہ خیالات، مقاصد اور پالیسیوں میں جو اشتباہ و التباس اور اُلجھاؤ اس وقت پایا جا رہا ہے اُسے ختم کر دیا جائے، جو مختلف اور متضاد راستے اس وقت خلط ملط اور گڈمڈ ہو گئے ہیں ان کو الگ الگ کر کے دینِ قیّم کی راہ اور طاغوت کی راہ کو بالکل ایک دوسرے

سے ممیز کر دیا جائے اور لوگوں کو مجبور کر دیا جائے کہ دونوں میں سے کسی ایک ہی راستہ کو اپنے لیے منتخب کریں۔ جو وطن پرست ہیں اور ایک ہندوستانی قومیت میں جذب ہونا چاہتے ہیں وہ علیٰ وجہ البصیرت اور علیٰ رؤس الاشہاد اس راستے پر جائیں اور یہ سمجھ کر جائیں کہ یہ راستہ اسلام کے راستہ کے خلاف جا رہا ہے اور جو مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں وہ قوم پرستی اور نیشنلزم کا نام لینا چھوڑ دیں اور اس تحریک سے الگ ہو جائیں جو اسلامی قومیت کو وطنی قومیت میں تحلیل کرنا چاہتی ہے مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ میں اُن لوگوں کے موقف کو ناممکن الوقوف بنا دینا چاہتا ہوں جو بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں رکھنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ مخالف سمتوں میں جانے والی کشتیاں ہیں۔ سب سے آخر میں میں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ ہمارے لیے اب صحیح قومی پالیسی کیا ہے اور اس کو کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے اس میں ان لوگوں کو پورا جواب مل جائے گا جو اس غلط خیال میں خرص و تخمین کے تیر تکے چلا رہے ہیں کہ میرے پاس صرف سلب ہی سلب ہے اثبات و ایجاب نہیں ہے۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۸

مسلمانوں کی غلط نمائندگی اور اُس کے نتائج

یہ سوال کہ ہندوستان کے مسلمان کیوں بے چین اور غیر مطمئن ہیں ، اور کیوں اپنے ملک کی اس سیاسی جدوجہد میں ، جس کو "جنگ آزادی" کہا جاتا ہے ، اپنے شایانِ شان حصّہ نہیں لیتے ، ایک ایسا معمّا بن گیا ہے جسے سمجھنا صرف غیر مسلموں ہی کے لیے نہیں ، بلکہ خود بہت سے مسلمانوں کے لیے بھی دشوار ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت اُس شیر خوار بچے کی سی ہے جو اپنی تکلیف پر روتا اور تڑپتا ہے ، مگر ٹھیک ٹھیک یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کو تکلیف کیا ہے جس پر وہ رو اور تڑپ رہا ہے۔ حتیٰ کہ بسا اوقات غیر تو غیر خود اس کی اپنی ماں کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اسے فی الواقع کوئی شکایت نہیں ، محض ضد چڑھ گئی ہے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ مسلمان قوم کے ذہن کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر اس کی بے چینی اور بے اطمینانی کے حقیقی اسباب دریافت کیے جاتے ، اُس اصل مسئلے کو واضح اور منقّح صورت میں پیش کیا جاتا جو ہندوستانی مسلم قوم کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے اور یہ بتایا جاتا کہ ہندوستان کا مسلمان فی الواقع چاہتا کیا ہے۔ نیز مسلمان کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کے موجودہ حالات اور مستقبل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے رُجحانات کا تجزیہ کر کے صاف صاف بیان کر دیا جاتا کہ کس طرح یہاں ایسا ماحول پیدا ہو رہا ہے اور ہوتا جا رہا ہے جس کو مسلمان اپنی قومی زندگی کے لیے مہلک سمجھتا ہے۔ صرف یہی ایک صورت تھی جس سے مسلمانوں کی اپنی پراگندہ خیالی، اور غیر مسلموں کی حیرانی، بدگمانی اور بدتدبیری کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ بعض غیر مسلموں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اس مسئلے کو سمجھنے اور مسلمانوں کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش بھی کی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہو سکے۔ یہ کام دراصل ایسے لوگوں کے کرنے کا ہے جن کے احساسات جمہور مسلمین کے احساسات سے متحد الاصل ہیں اور اس کے ساتھ جن میں یہ قوت بھی ہے کہ اپنے اندر جو کچھ محسوس کریں اس کی واضح تصویر خارج میں کھینچ کر رکھ دیں۔

مسلمانوں کے صاحبِ علم و صاحبِ فکر لوگوں نے اس باب میں جس غفلت سے کام لیا ہے اس کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ بالکل نااہل اور ناقابلِ اعتماد لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے اور انہوں نے اس کو نہایت غلط طریقوں سے پیش کر کے دوسروں ہی کو نہیں، خود اپنی قوم کو بھی پریشان خیالیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

ان میں سے ایک بڑی جماعت تو اسلام کا صحیح علم ہی نہیں رکھتی، اور نہ اس حقیقت کو سمجھ سکتی ہے کہ مغربی علوم کے فروغ، غیر مسلم حکومت کے اقتدار، اور اب جدید نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلم قوم کے لیے فی الواقع کون سا بنیادی سوال پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ بغیر سمجھے بوجھے محض چند سطحی اور چھچھورے جزئیات کو مسلمانوں کے قومی مسائل بنا کر پیش کرتے ہیں، اور ان پر مناسب حد سے زیادہ زور دے کر اپنی پوزیشن کو اور زیادہ مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ اس سے ہوشیار لوگوں کو یہ خیال پھیلانے کا اچھا موقع مل جاتا ہے کہ مسلمانوں کا قومی مسئلہ چند بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مرکب ہے جن کو محض جہالت، تنگ نظری اور نادانی کی وجہ سے اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک دوسری جماعت جس نے اس مسئلہ کی حمایت میں اپنے آپ کو بہت نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، انگریزی سلطنت کے وفادار غلاموں پر مشتمل ہے، اور ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ اصل مسئلہ کو فروعات میں گم کر دیا جائے تاکہ مسلمان فضول چیزوں پر لڑ کر اپنی قوت ضائع کرتے رہیں اور ان کی جان و مال کے خرچ پر سرکار برطانیہ کا کام بنتا رہے۔ ان حضرات کی مداخلت سے اس مسئلہ کی عزت و وقعت اور بھی زیادہ کم ہو گئی ہے اور مخالف گروہ کے چالاک لوگوں کو یہ مشہور کرنے کا بہت اچھا بہانہ ہاتھ آ گیا ہے کہ درحقیقت مسلمانوں کے قومی مسئلہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، یہ تو محض امپیریلسٹ پالیسی کا ایک شاخسانہ ہے، اور صرف ٹوڈیوں، رجعت پسندوں اور سرکار پرستوں ہی کی اغراض نے اسے پیدا کیا ہے۔

ان دونوں گروہوں کی بدولت جو نقصان ہمارے مقدمہ کو پہنچا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمان بھی اب اس دھوکہ میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ درحقیقت ہمارا کوئی قومی مسئلہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو وہ ایسا اہم نہیں کہ آزادیٔ وطن سے بڑھ کر ہم کو اس کی فکر ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کے اپنے آدمیوں کی زبانوں پر اب وہی باتیں آنے لگی ہیں جو کل تک غیر مسلم اخباروں اور لیڈروں کی زبان و قلم پر تھیں۔ یعنی مسلم مفاد کا نام لینا رجعت پسندی اور ٹوڈیت اور فرقہ پرستی ہے۔ یہ جادو عوام سے گزر کر علماء پر بھی چڑھ رہا ہے اور وہ لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں جن کا اصل فرض یہ تھا کہ جانشینانِ رسول ہونے کی حیثیت سے اس مسئلہ کو سمجھتے اور سمجھاتے اور جانشینانِ رسول ہونے کی حیثیت ہی سے اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ اب اگر ہماری قوم کے وہ چند اصحاب فکر جو حقیقت کو سمجھتے ہیں اور سمجھانے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں، اور جن کا ذہن ابھی تک بیرونی اثرات سے آزاد ہے، اپنی خاموشی نہ توڑیں گے اور صاف صاف حقیقت کو بیان نہ کریں گے تو یقیناً زمانے کی دو تین گردشیں بھی نہ گزرنے پائیں گی کہ مسلمانوں کی پوری قوم فریب میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ اب مسلمانوں کے مفاد کا نام لینا اپنے آپ کو بڑے خطرے میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈالنا ہے۔ کیونکہ اب غیروں ہی سے نہیں، خود اپنے بھائیوں سے بھی ایسے شخص کو گالیاں سُننی پڑیں گی۔ اور انسان کے لیے غیروں کی گالیوں سے بدرجہا زیادہ دل شکن ان لوگوں کی گالیاں ہوتی ہیں جن کی بھلائی کے لیے وہ کام کرتا ہے۔ لیکن خواہ نتائج کیسے ہی تلخ ہوں، جن لوگوں کو اپنی قوم کا مفاد عزیز ہے، انہیں ہر بُرے سے بُرے نتیجہ کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے اور کم از کم تذکیر کا فرض بجالانے سے ہرگز منہ نہ موڑنا چاہیئے۔

اس کو مسلمانوں کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو سب سے بڑھ کر ان کے قومی مزاج کو سمجھنے والے اور ان کے جذبات و داعیات کا صحیح حال جاننے والے اور ان کے قلب و روح کی سچی نمائندگی کرنے والے ہو سکتے تھے، اور جن سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس قوم کی حقیقی مشکلات کو سمجھ کر کوئی کارگر تدبیر اور علاج تجویز کریں گے، آج وہ بھی زمانہ کے غالب اثرات کی رَو میں بہتے جا رہے ہیں، اور نادانستہ ان کی زبانوں سے وہ باتیں نکل رہی ہیں جو کل تک زیادہ کھلے الزامات کی صورت میں غیروں کی زبان سے نکلا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر میں اس تقریر کا اقتباس نقل کرتا ہوں جو ابھی حال میں مولانا سیّد سلیمان ندوی نے مدراس میں ارشاد فرمائی ہے[1]۔ مولانا کے علم و فضل، ان کی صداقت، ان کے تفکّر و تدبر کا جیسا معترف میں ہمیشہ تھا ویسا ہی آج بھی ہوں، اور ان کی تقریر کا اقتباس نقل کرنے سے میرا مدعا ان کی ذاتِ گرامی پر کوئی حرف لانا نہیں ہے۔ بلکہ دراصل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وقت کے غالب خیالات نے ہماری قوم کے اتنے بڑے صاحبِ فکر و بالغ النظر عالم پر بھی کیا اثر کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

---

[1] مولانا نے ترجمان القرآن میں اس اقتباس کے شائع ہونے پر شکایت فرمائی تھی لیکن یہ نہیں فرمایا کہ انہوںؒ نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے یا کم از کم ان کا مفہوم یہی نہ تھا جو "انصاری" کے رپورٹر نے روایت بالمعنیٰ کے طور پر بیان کیا ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"اس وقت تین ہی صورتیں ہیں ۔ یا تو مسلمان اپنے گھروں کے دروازے بند کرکے بیٹھ رہیں اور جب آزادی کی جنگ ختم ہو جائے تو اپنے دروازے کھول کر باہر نکلیں اور گلیوں میں آزادی کی بھیک مانگتے پھریں ۔ یا یہ کہ اپنا کیمپ الگ لگائیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ آزادی کی فوج اپنی قوتِ بازو سے کب میدان جیتتی ہے اور مالِ غنیمت پر قبضہ کرتی ہے ۔ اس وقت وہ آگے بڑھیں اور فاتح فوج سے مالِ غنیمت میں جھگڑا کریں ۔ یا یہ کہ وہ آزادی کی فوج میں شامل ہو کر آزادی کے لیے ان کے دوش بدوش کھڑے ہو کر جنگ کریں اور اپنے لیے اپنی عظیم الشان قومیت کی پوزیشن کے مطابق اپنی کوششوں سے اپنی جگہ حاصل کریں ۔"

("انصاری" مورخہ ۲ رمضان ۱۳۵۶ھ)

غور کیجئے! یہ ارشادِ گرامی کن مفروضات کا نتیجہ ہے ۔ "مسلمان جو کئی سال تک آزادی کی جنگ سے الگ رہے اور اب بھی ٹھٹکے کھڑے ہیں، اس کی وجہ کچھ اور نہیں، محض بزدلی ہے ۔ اور یہ قوم بزدل ہونے کے ساتھ کمینہ بھی ہے ۔ جب آزادی کی فوج کے سورما سپاہی جو ظاہر ہے اکثر و بیشتر غیر مسلم ہی ہیں شیروں کی طرح شکار مار لیں گے ، تو یہ جنگل کے ذلیل جانوروں کی طرح اُس کا حصہ لڑانے کی کوشش کرے گی" ـــــــ یہ ہے مسلمانوں کی وہ تصویر جو ان الفاظ سے ذہن سامع میں بنتی ہے ، اور اس کے ساتھ غیر مسلموں کی عظمت و بزرگی کا کیسا مرعوب کن نقشہ ذہن کے سامنے آتا ہے کہ گویا وہ شیرانِ بیشۂ حریت ہیں جو تمام ہندوستان کے لیے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں ۔ پھر یہ "جنگِ آزادی" کس قدر پاک، کیسی بے عیب اور کتنی بے لوث چیز فرض کی گئی ہے کہ اس میں کسی لوث کا شبہ کرنا تو گویا ممکن ہی نہیں ۔ ایسی پاک جنگ، ایسے مقدس جہاد میں حصہ لینے سے مسلمانوں کا احتراز کرنا کسی معقول وجہ پر تو مبنی ہو ہی نہیں سکتا ۔ اب بس یہ ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے کہ مسلمان بزدل، دون ہمت اور کمینہ ہیں ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک دوسرے بزرگ جن کے علم، تقویٰ، اور دیانت کا احترام میرے دل میں ان کے کسی شاگرد اور مرید سے کم نہیں ہے، اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

"جس طرح آزادی کے لیے جدوجہد کرنا ہندوستان کی دوسری قوموں پر واجب ہے، اسی طرح مسلمانوں پر بھی واجب ہے، بلکہ ان کے لیے اسباب وجوب بہ نسبت دیگر اقوام ہند کے چند در چند زائد ہیں۔ پس مسلمانوں کا دوسری اقوام سے پیچھے رہنا انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے۔"

(مولانا حسین احمدؒ کا مکتوب "آفتاب" لکھنؤ، مورخہ ۱۵ اپریل ۴۰ء)

یہاں بھی وہی نظریہ کام کر رہا ہے۔ حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی جدوجہد فی الواقع خالص آزادیٔ وطن کی جدوجہد ہے اور اس مفروضہ پر یہ حکم لگا دیا گیا کہ اس جدوجہد میں شریک ہونا مسلمانوں پر واجب ہے اور اس سے ان کا علیحدہ رہنا کسی معقول وجہ پر مبنی نہیں بلکہ انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے۔

میرے ایک نہایت محترم بھائی جو علم و فضل کے ساتھ خلوص نیت کی نعمت سے بھی مالا مال ہیں اور عصر حاضر کے مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی جانشینی کا شرف رکھتے ہیں، اپنے ایک تازہ مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یہ ساری تنظیم صرف اکثریت کے خطروں اور اندیشوں پر مبنی ہے۔ یہ اندیشے واقعی ہیں یا غیر واقعی؟ ہم تھوڑی دیر کے لیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ واقعی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں بالکل انہی نعروں اور انہی ہنگاموں کے ساتھ ۵۷ء کے بعد شروع ہو گئی تھی اور ۱۸۰۵ء کے بعد سے تو ہندوستان میں کوئی انگریز حکمران ایسا نہیں آیا۔ جس نے اکثریت کی چیرہ دستیوں سے بچاؤ کے لیے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلمانوں کی تنظیم اپنی حکومت کی مسلمہ پالیسی نہ قرار دی ہو اور یہ تنظیم اُس تھوڑے سے وقفے کے سوا جو تحریک خلافت نے پیدا کر دیا تھا پورے استحکام کے ساتھ باقی رہی ہے۔ اور ہم سے زیادہ ہمارے مہربان حکام نے اس کی رضاعت و تربیت کی ذمہ داریاں محسوس کی ہیں اور جب تک موجودہ سیاسی ضروریات باقی ہیں اور حالات کوئی نئی کروٹ نہیں بدلتے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے اس عظیم الشان انسانی و سیاسی فرض سے جو بحیثیت ہمارے فرمانروا ہونے کے ان پر عائد ہوتا ہے سبکدوش ہو جائیں گے۔ پس جو چیز بنی بنائی موجود اور پورے استحکام و قوت کے ساتھ موجود ہے اس پر مزید چُونے گارے کے اسراف کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اکثریت آپ کے حصن حصین میں سرنگ لگانے کی فکر میں ہے تو نصیب اعدا آپ کیوں اس درجہ مضطرب و سراسیمہ ہوں؟ جو بیدار مغز حکومت ایک لاکھ روپیہ سرحد پر روزانہ خرچ کر کے محض فرضی خطروں کا سدِّباب کرتی ہے کیا وہ اتنی بیہوش اور بے خود ہو گئی ہے کہ وہ اپنے حفظ و بقا کی ریڑھ کی ہڈی کو یونہی اعدا کے حملوں کا ہدف بننے کے لیے چھوڑ دے گی؟"

(مولانا امین احسن اصلاحی، الاصلاح۔ سرائے میر۔ مورخہ جولائی ۳۸ء)

آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں:۔

"اگر آپ سچ مچ مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتے ہیں تو ان کو کسی اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اللہ سے ڈرائیے۔"

پھر ایک طویل بحث کے بعد آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:۔

"تمہارے سامنے بھی ہمت آزمائی اور عمل کا ایک میدان (یعنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہی "آزادی کی جنگ" ہے، جس میں اگر داخل ہو جاؤ تو فتح مندی تمہارے ہی لیے ہے۔ لیکن اکثریت کے خوف اور اس کے سامان اور روپیہ کی کثرت نے تم کو سراسیمہ کر دیا ہے۔ اس لیے عزم و ہمت سے محروم ہو کر تم پست ہمتی کی خاک مذلت پر لوٹ رہے ہو۔" (حوالہ مذکور)

دیکھیے! یہاں خود ہماری قوم کا ایک اہلِ قلم ہمارے مقدمہ کی کس قدر غلط ترجمانی کر رہا ہے۔ جس عینک سے پنڈت جواہر لال نہرو مسلمانوں کے معاملہ کو دیکھتے ہیں، ٹھیک وہی عینک خود ہمارے ایک بھائی نے اپنی آنکھوں پر لگالی ہے، اور لطف یہ ہے کہ یہاں اس عینک پر رُوسی کارخانے کے بجائے قرآنی رصدگاہ کا لیبل لگا ہوا ہے تاکہ مسلمان بے چارا بچاؤ کی کوئی راہ نہ پا سکے۔ دُنیا سے تو گیا ہی تھا، دین کی عدالت سے بھی گمراہی کا فتویٰ سُنے!

جس حکومت کی مہربانیوں کا اس قدر لطیف پیرایہ میں اُوپر ذکر فرمایا گیا ہے، اس کی سب سے بڑی مہربانی ہمارے حالِ زار پر یہ ہے کہ اس نے ڈیموکریسی کے انگریزی اصول ہندوستان میں رائج کیے ہیں، جن کی رُو سے دو مسلمانوں کے مقابلہ میں ۶ غیر مسلموں کی رائے بہرحال صحیح ہے، اور حکومت ہمیشہ اسی رائے کے مطابق چلے گی جو ڈیموکریسی کے اس قاعدے کی بنا پر صحیح قرار پائے۔ مہربان سرکار کی لائی ہوئی اس نعمت کو آگے بڑھ کر وہ غیر مسلم قبول کر لیتے ہیں جو "ہمت آزمائی اور عمل" کے میدان میں دادِ مردانگی دے رہے ہیں کیونکہ اس میں سراسر انہی کی "فتح مندی" ہے۔ مسلمان اس پر ناک بھوں چڑھاتا ہے تو وہی غیر مسلم اپنی "فتح مندانہ" پوزیشن رکھنے کے لیے مسلمان پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ انگریز کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ خود غرضانہ نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کا یہ کہنا بالکل حق بجانب، کیونکہ ان کو اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے ہر ممکن تدبیر کرنی ہی چاہیے۔ مگر یہ مسلمانوں کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ خود ان کے اپنے بہت سے ذی فہم افراد بھی اس معاملہ میں غیر مسلموں کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ سرکار برطانیہ کی لائی ہوئی ڈیموکریسی کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لعنت تو ان کو نعمت نظر آتی ہے۔ مگر اس لعنت سے بچنے کے لیے مسلمان اگر کوئی کوشش کرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ اکثریت و اقلیت کا سوال چھیڑنے کے معنی انگریزی اقتدار کی حفاظت کے ہیں۔

پھر لطف یہ ہے کہ ایک طرف تو ڈیموکریسی کا یہ قاعدہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ دو مسلمان چاہے وہ موسیٰ و ہارون ہی کیوں نہ ہوں، باطل پر ہیں اگر ان کے مقابلہ میں فرعون یا سامری کی اُمت کے چھ آدمی مخالفانہ رائے دیں، اور دوسری طرف یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ "مسلمانوں کو اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں، صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے" اور یہ ہدایت بھی فرمائی جاتی ہے کہ اگر ڈیموکریسی کے اس قاعدے کو قبول کر کے تم "ہمت آزمائی اور عمل کے میدان میں کود پڑوگے تو فتحمند ہوگے، ورنہ یوں ہی "پست ہمتی کی خاک مذلت" پر لوٹتے رہو گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انگریز اور ہندو مل کر جو زہر تم کو کھلا رہے ہیں، ہمت کر کے اسے کھا جاؤ۔ انشاء اللہ تم کو شہادت کا درجہ نصیب ہوگا جو عین "فتح مندی" ہے، ورنہ اس زہر کو کھانے سے اگر تم نے انکار کیا، اور لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ[1] کے قرآنی اصول پر پست ہمتوں کی طرح اصرار کرتے رہے تو "اولوالالباب" تم کو جواہر لال نہرو کے ساتھ مل کر طنز و تعریض کی لطیف زبان میں "سرکار برطانیہ کے ٹوڈی" کا طعنہ دیں گے۔

سب سے آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر ملاحظہ ہو جن کا انقلاب حال میرے نزدیک مسلمانوں کے لیے اس صدی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ پچھلے سال جب کانگریس کے ایوان سے مسلم ماس کانٹیکٹ (Muslim Mass—Contact) کا علم اٹھایا گیا تو اس کے ساتھ ہی مولانا کا ایک سپہ سالارانہ خطبہ بھی اخبارات میں شائع ہوا۔ اس میں یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ "مسلمانوں کو اگر کانگریس

---

[1] ناپاک اور پاک برابر نہیں اگرچہ ناپاک کی کثرت تجھ کو فریفتہ کرنیوالی ہو۔ (المائدہ ۱۰۰)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں شریک ہونا چاہیے تو صرف اس لیے کہ احمق یا نیم خرد کا تقاضا یہی ہے۔ مولانا اپنی تمام تقریر اسی انداز سے فرماتے ہیں کہ یا تو مسلمان اس تحریک میں بلا کسی جھجک کے شریک ہو جائیں جس کی اساس وطنی قومیت اور کانگریس کے مگر جی منشور پر رکھی گئی ہے یا نہیں تو وہ بزدل ہیں، کم ہمت ہیں، اور ذلت کی موت مرجانے والے ہیں۔ پوری تحریر نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں، مگر چند فقرے نقل کیے بغیر چارہ بھی نہیں۔

"ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں نے کانگریس کی شرکت سے اس لیے انکار کر دیا تھا کہ وہ سرے سے سیاسی اصلاح و تغیر کے مخالف تھے۔ انہیں یہ بات سمجھائی گئی تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لیے یہاں جو تبدیلی بھی جمہوری و نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائے گی ہندوؤں کے لیے مفید ہوگی مسلمانوں کے لیے مضر ہوگی۔ چنانچہ ۸۸ء میں لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون نے سرسید احمد خاں مرحوم کو یہی راہ دکھائی تھی اور اسی بنا پر انہوں نے کانگریس کی مخالفت کا اعلان کیا تھا...... اب ملک اصلاحات کے لیے نہیں بلکہ کامل تبدیلی کے لیے لڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تغیرات کے بعد اب کانگریس کی عدم شرکت کے لیے ۸۸ء والی بات سود مند نہیں ہو سکتی۔ ناگزیر ہے کہ کوئی دوسری ہی بات اختیار کی جائے۔ چنانچہ اب بعض حضرات نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب کبھی کانگریس کی تحریک میں شرکت کا سوال چھڑتا ہے یا خود کانگریس کا کوئی رکن مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہے تو فوراً یہ حضرات فرقہ وارانہ حقوق اور تحفظات کا سوال چھیڑ دیتے ہیں۔ انہیں خطرہ ہے کہ اگر برطانوی اقتدار ملک میں باقی نہیں رہے گا یا بالکل کمزور پڑ جائے گا تو ہندو اکثریت ان کے حقوق پامال کر دے گی......"

"خطروں اور تباہ حالیوں کی اس اندیشہ ناکی کا کن لوگوں کو یقین دلایا جا رہا ہے؟ ان لوگوں کو جو بلحاظ تعداد کے ہندوستان کی سب سے بڑی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسری اکثریت اور بلحاظ معنوی قوتی کے سب سے پہلی طاقت و جماعت ہیں؛ اور پھر ان تمام خطروں کا انسداد کیونکر ہو سکتا ہے بجز اس طرح کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک رزولیوشن پاس کر دے، جوں ہی اس نے رزولیوشن پاس کر دیا، خطروں اور تباہ حالیوں کا تمام بادل، جو آٹھ کروڑ انسانوں کے سروں پر چھایا ہوا ہے، دفعتاً چھٹ جائے گا۔"

"انہیں اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیئے تو صرف اس لیے کہ انہیں اپنے اوپر بھروسہ ہے۔ اس لیے نہیں کہ دوسروں نے انہیں بھروسہ دلایا ہے، یا دوسرے انہیں بھروسہ دلا سکتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت ان کی بے بسی اور بے چارگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ خطروں اور تباہ حالیوں میں گھر گئے ہیں اور تحفظ کی راہ اس کے سوا کچھ نہ رہی کہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جیئیں یا کانگریس کے اطمینان دلانے پر، اور خود ان کے اندر خود اعتمادی و ہمت کی ایک چنگاری بھی نہیں رہی جو ان کی ٹھنڈی رگوں کو گرم کر سکے، تو میں کہوں گا ایسی زندہ نعشوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ جہاں پڑی ہیں پڑی رہیں۔۔۔۔۔۔۔"

مسلمانوں کی یہ تصویر وہ شخص کھینچ رہا ہے جو ایک زمانہ میں اسلامی ہند کی نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا لیڈر تھا۔ ان کی مظلومی کا اس سے زیادہ دردناک منظر اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو کبھی "الہلال" اور "البلاغ" کا ایڈیٹر تھا وہ آج ان کی اس قدر غلط ترجمانی کرے۔ مولانا کے مفروضات جن پر اس پورے خطبہ کی بنا رکھی گئی ہے مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ سیاسی اصلاح و تغیر کے معنی محض اس تبدیلی کے ہیں جو انگریزوں کے رائج کیے ہوئے جمہوری و نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائے۔ ایسی تبدیلی کی مخالفت جس مسلمان نے کی اس نے گویا نفس سیاسی اصلاح و تغیر کی مخالفت کی۔ یہ بات اس ہندو کے کہنے کی تھی جو انگریزی اصول جمہوریت و نیابت کو اپنے لیے مفید پا کر قوم

پرستانہ جوش کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ مگر وقت کی جادوگری کا تماشہ دیکھیے کہ اس نظریہ کو مولانا ابوالکلام بیان فرما رہے ہیں اور محسوس تک نہیں کرتے کہ فی نفسہٖ یہ نظریہ کس قدر پوچ اور بے اصل ہے۔

۲۔ مسلمانوں کا یہ خیال غلط تھا کہ ہندوستان میں جو تبدیلی انگلستان کے جمہوری دنیاوی ادارات کے نمونہ پر کی جائے گی وہ بربنائے اکثریت ہندوؤں کے لیے مفید اور بربنائے اقلیت مسلمانوں کے لیے مضر ہوگی —— سیاسیات کا طفلِ مکتب بھی بتا سکتا ہے کہ مولانا کا یہ مفروضہ محض بے اصل ہے اور بلا کسی غور و فکر کے انہوں نے اُس بات کو قبول کر لیا ہے جو ہندوؤں کے سیاسی لیڈر جان بوجھ کر ہمیں بیوقوف بنانے کے لیے کہا کرتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے ملک کے جن جمہوری دنیاوی اداروں کو یہاں ہمارے سر منڈھا ہے ان کی بنا ہی اکثریت کی حکومت (Majority Rule) پر ہے اور ان کو جُوں کا تُوں ایک ایسے ملک میں جہاں دو مختلف قومیں رہتی ہوں، رائج کرنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اکثریت حکمران اور اقلیت محکوم ہو کر رہے۔ لہٰذا سر سید احمد خاں مرحوم کے دَور میں جو رائے قائم کی گئی تھی وہ ہرگز غلط نہ تھی۔ البتہ اگر کسی چیز کو غلط کہا جا سکتا ہے تو وہ ان کی وہ پالیسی ہے جو اس مصیبت سے بچنے کے لیے انہوں نے اختیار کی اور اس کو بھی اس زمانے کے حالات سامنے رکھ کر غلط قرار دیتے ہوئے ایک صاحبِ فکر آدمی کو تامل کرنا چاہیے۔

۳۔ مسلمانوں نے کانگریس سے علیحدگی کا فیصلہ اس بنا پر کیا تھا کہ لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون نے سر سید احمد خاں مرحوم کو یہ راہ دکھائی تھی —— مولانا کو شاید خبر نہیں کہ کانگریس کا قیام اور وہ اصول و مقاصد جن پر آج تک کانگریس چل رہی ہے، سب کچھ اسی لارڈ ڈفرن کی رہنمائی کا نتیجہ ہے، اور اس میں لارڈ رپن اور لارڈ ڈلہوزی اور اس عہد کے متعدد دوسرے انگریز مدبرین کے دماغوں نے بھی کام کیا ہے۔ کم از کم اپنے ورکنگ کمیٹی کے رفیق ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیا ہی کی "تاریخ کانگریس" مولانا نے پڑھ لی ہوتی تو شاید اپنی قوم کے دامن پر دھبہ لگانے کے لیے ہندوؤں کے کارخانہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روشنائی سے یہ سیاہی مستعار لیتے ہوئے، ان کو کچھ نہ کچھ تامل ضرور ہوتا۔

۴۔ اب ملک اصلاحات کے لیے نہیں بلکہ کامل تبدیلی کے لیے لڑ رہا ہے۔

یہ تحریر اس وقت لکھی گئی ہے جب اصلاحات جدید کو قبول کر کے الکشن لڑے جا چکے تھے امپیریلسٹ گورنمنٹ کے تحت صوبوں کی حکومت کا انتظام کرنے کے لیے کانگریس اپنی خدمات پیش کر چکی تھی، اور اس اقدام میں خود جناب مولانا بھی شریک تھے پھر جب اپنے عمل سے آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ کامل تبدیلی کے لیے نہیں بلکہ اصلاحات کے لیے اور ان اصلاحات کے لیے لڑ رہے ہیں جو انگریز اپنے مفاد کے لیے دے رہا ہے اور ہندو اپنے مفاد کے لیے لے رہا ہے، تو "کامل تبدیلی" کے لفظ بے معنی کو محض اس لیے دُہرانا کہ اس کے بغیر مسلمانوں کا مُنہ کالا نہیں کیا جا سکتا، مہاسبھائی ہندوؤں کو تو ضرور زیب دیتا ہے مگر مولانا کو زیب نہیں دیتا۔

۵۔ مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ وہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جینا چاہتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ انگریز کی سنگینیں ان کی حفاظت کے لیے ہندوستان میں موجود رہیں یا پھر یہ چاہتے ہیں کہ کانگریس ان کو تحفظ کا زبانی اطمینان دلا دے۔

یہ بات ایک ہندو امپریلسٹ کے کہنے کی تھی اور کہہ رہے ہیں اسے مولانا ابوالکلام۔ حقیقت میں تو پوزیشن اس وقت یہ ہے کہ دس سال کے بعد کانگریس اور ہندو مہاسبھا پھر اسی نقطہ پر جمع ہو گئی ہیں جس پر یہ نہرو رپورٹ میں جمع ہوئی تھیں۔ "انقلاب" کا ڈراما ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ وہی دستوری ارتقاء کا نصب العین بر سر کار آ گیا ہے جو ابتداء سے ان کے پیش نظر تھا۔ "دستوری ارتقاء" کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ انگریز اپنی سنگین سے مسلمان کو اس وقت تک دبائے رکھے جب تک ہندو اس کی جگہ لینے کے لیے کافی طاقت ور اور کافی قابو یافتہ نہ ہو جائے۔ اب مسلمان جس فکر میں ہے وہ یہ نہیں ہے کہ انگریز کی طرف جائے یا ہندو کی طرف، بلکہ پریشان ہو کر یہ دیکھ رہا ہے کہ گھر کا ساتھی باہر کے غاصب کا اسسٹنٹ بن گیا ہے، باہر کا غاصب اس کو سنگین سے دبائے ہوئے ہے، اور گھر کا ساتھی اپنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رسیاں کھول کھول کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھتا چلا جاتا ہے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ مولانا ابوالکلام جیسے لوگ اٹھ کر مسلمانوں کو ان دونوں بلاؤں کے مشترک عمل سے بچانے کی تدبیر کرتے مگر مولانا ان کو اُلٹا اس بات پر مطعون فرما رہے ہیں کہ تم اس دامِ فریب میں پھنسنے سے دُور کیوں بھاگے جا رہے ہو! ہمت کر کے اپنی گردن اور اپنے ہاتھ پاؤں اس کے پھندوں میں دے کیوں نہیں دیتے!

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پروپیگنڈا کی طاقت کیسی زبردست طاقت ہے، اور جب کوئی قوم نامساعد حالات میں گھر جاتی ہے تو اس پر باہر ہی سے نہیں اندر سے بھی کیسے مصائب نازل ہوتے ہیں۔ جو تصویر اپنی اغراض کے لیے غیروں نے کھینچی تھی، وہ اب خود ہماری اپنی قوم کے دماغوں میں بیٹھتی چلی جا رہی ہے اور اس کو وہ لوگ ہماری اصلی تصویر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جن سے ہم توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے سب سے بہتر نمائندے ہوں گے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام یا مولانا حسین احمد یا مولانا سید سلیمان نے یہ باتیں جان بوجھ کر فرمائی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ فضا ہی خیالات سے بھری ہوئی ہے وہ غیر محسوس طور سے دماغوں میں نفوذ کر رہے ہیں اور غیر ارادی طور سے زبانوں پر آ رہے ہیں۔ یہ ایک جادو ہے جو سروں پر چڑھ کے بول رہا ہے اور کیا تماشا ہے کہ کیسے کیسے بلند مقام سروں پر چڑھ کر کیا کچھ بول رہا ہے۔ فرقہ پرستی کا لفظ جو مغربی تصورِ قومیت کو پیشِ نظر رکھ کر وضع کیا گیا تھا، آج مسلمانوں کے علماء اور بڑے بڑے لیڈر اس لفظ کو خود مسلمانوں پر استعمال کر رہے ہیں۔ نیشنلزم یا قوم پرستی کا لفظ آج بے تکلف افتخار کے انداز میں بولا جا رہا ہے۔ گویا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان ایک قوم ہے اور مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ اس قوم کے فرقے ہیں۔ "رجعت پسندی" اور "ٹوڈیت" کے الزامات اب خود مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں پر عائد کیے جانے لگے ہیں۔ اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ آزادی کے اس جہادِ مقدس میں کود پڑنے سے احتراز بلکہ اس میں ادنیٰ تامل بھی اگر کسی چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے تو وہ بس رجعت پسندی و ٹوڈیت ہے، یا پھر بزدلی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس طرح کے تحریر و جلوس سے دماغ اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ اب ان کو صبر و سکون کے ساتھ یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو مسلمان جیسی بہادر، باعمل و حریت پسند امت جنگ آزادی سے ہٹ کر برابر دس سال سے اس جنگ میں اپنے شایانِ شان حصہ لینے سے ہچکچا رہی ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے اپنوں اور غیروں کے طعنے سننے اور ایسے سخت الزامات آئے دن سنتے رہنے کے باوجود اس قوم کے خون میں جوش نہیں آتا؟ اگر اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید یہ مسلمان کا قصور ہو، تو اس کی ایک دوسری ممکن وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاید اس "جنگِ آزادی" میں کوئی کھوٹ ہو۔ شاید یہ "شیرانِ بیشۂ حریت" اس جنس کے تیز نظر ہوں جس سے "اسد اللہ" میل کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے۔ شاید اس "آزادی کی فوج" میں وہ خصوصیات ہوں جنہیں دیکھ کر مسلمان کا ضمیر یہ فیصلہ کر رہا ہو کہ ان کے ساتھ چل کر میں اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ کم از کم امکان تو دونوں پہلوؤں کا ہے پھر آخر یہ پروپیگنڈا کی طاقت اور نامساعد حالات کی قہرمانی نہیں تو کیا ہے جس کی بدولت رفتہ رفتہ دماغوں پر پہلی شق کا امکان جزم و یقین بن کر مسلط ہوتا جا رہا ہے اور دوسری شق کے متعلق اب طوفان میں بہنے والی کشتی کے مسافروں اور ملاحوں میں سے کسی کو بھی یاد نہیں آتا کہ اس کا بھی کوئی امکان ہے۔

میں آئندہ ابواب میں ناقابلِ تردید واقعات و شواہد سے ثابت کروں گا کہ فی الواقع صورتِ حال یہی دوسری ہے، اور مسلمانوں کو اسی صورتِ حال نے اپنے اہلِ وطن کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں حصہ لینے سے روک رکھا ہے۔ اس بحث سے میرا مقصد ایک طرف تو عام مسلمانوں کے تصورات کو واضح کرنا ہے کیونکہ وہ حالات کو دیکھ دیکھ کر پریشان تو ہو رہے ہیں مگر ابھی تک ان خطرات اور مشکلات کو پوری طرح سمجھے نہیں ہیں جن میں وہ اس وقت گھر گئے ہیں، اور اسی وجہ سے انہیں اپنی نجات کا صحیح راستہ پانے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ دوسری طرف میں انصاف پسند غیر مسلموں کو بھی یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے اصلی احساسات کیا ہیں، ان کا ذہن کس طرح

کام کر رہا ہے اور ہندوستان کی موجودہ سیاسی تحریکات کس طرح مسلمان کے مزاج، اس کے مفاد اور ان اصولوں کے خلاف چل رہی ہیں جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ ان باتوں کو اگر وہ سمجھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ مسلمان کا مقدمہ ایسا مہمل نہیں ہے جیسا کہ اس کے غلط نمائندے پیش کر رہے ہیں، بلکہ درحقیقت وہ بالکل صحیح بنیاد پر لڑ رہا ہے اور لڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ تیسری طرف اس بحث میں میرے پیش نظر یہ مقصد ہے کہ ان حضرات علماء کو ان کی غلطی پر متنبہ کروں جو مذہب کے نام سے مسلمانوں کو پشت بمنزل چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں ان کو اصل حقائق سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ جس جنگِ آزادی کو وہ اتنا مقدس سمجھ رہے ہیں میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ درحقیقت کس نوعیت کی جنگ ہے۔ جس آزادی کی فوج کو وہ سمجھ رہے ہیں کہ راہِ حق پر گامزن ہے۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ دراصل کس راہ پر جا رہی ہے اور مسلمان قوم بحیثیت مسلمان ہونے کے چند قدم سے زیادہ اس راہ پر اس کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ جس طریقِ کار کو وہ بالکل صحیح طریقِ کار سمجھ کر اختیار کر رہے ہیں میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریقِ کار کے بالکل خلاف ہے۔ یہ سب کچھ عرض کرنے کے بعد میں ان سے درخواست کروں گا کہ اس کو ٹھنڈے دل سے پڑھیں۔ انصاف کی نظر سے دیکھیں۔ اور اس نورِ علم و بصیرت سے جو خدا نے ان کو دیا ہے کام لے کر اپنے حال پر غور کریں کہ کیا وہ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر رہے ہیں؟ اگر ان کا ضمیر گواہی دے کہ یہ رہنمائی غلط ہے" تو انہیں بلا لحاظ اس کے کہ غلط راستہ پر کتنی دُور جا چکے ہیں، اُلٹے قدم واپس ہونا چاہیئے۔ اور راہِ راست معلوم کرنے کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور عقلِ سلیم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اور اگر انہیں اس پر اصرار ہو کہ وہی راستہ صحیح ہے جس پر وہ چل رہے ہیں اور مسلمانوں کو چلانا چاہتے ہیں تو میں ان سے مطالبہ کروں گا کہ پہلے وہ دلائل سے اپنا حق بجانب ہونا ثابت کریں محض شخصیتوں کے درمیان تقابل کرنا، یا سیاسی پارٹیوں کی گزشتہ و موجودہ روش کے درمیان موازنہ کرنا یا نرے جذبات سے سپہ سالارانہ انداز

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

 www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں اپیل کرنا کوئی استدلال نہیں ہے اور نہ اس سے احقاقِ حق یا ابطالِ باطل ہوا کرتا ہے۔ براہِ کرم حقائق اور واقعات کی دنیا میں آئیے۔ جو حقائق میں پیش کر رہا ہوں، یا تو یہ ثابت کر دیجیے کہ وہ حقائق نہیں ہیں، یا پھر ان حقائق کو تسلیم کر کے دلیل حجت سے ــــ حجت خواہ عقلی ہو یا نقلی، مگر بہر حال ہو حجت ــــ ثابت کیجیے کہ ان کے باوجود وہی راہ صحیح ہے جو آپ نے اختیار کی ہے۔

یہ کوئی چیلنج نہیں ہے، بلکہ دراصل اس احساسِ ذمہ داری سے ایک اپیل ہے جو ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے، جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو ہر عمل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے۔ پھر اس کا مقصد کسی گروہ کو ملزم بنانا اور قابلِ ملامت ٹھیرانے کی کوشش کرنا بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی والوں کے مقابلے میں کیا کرتے ہیں۔ جو شخص یہ الفاظ لکھ رہا ہے وہ کسی پارٹی میں شامل نہیں اور اُس نے آج تک خدا کی پارٹی کے سوا کسی پارٹی کی طرف بھی مسلمانوں کو دعوت نہیں دی ہے۔ لہٰذا اس اپیل میں خواہ مخواہ پارٹی فیلنگ (Party Feeling) کی بو سونگھنے کی بھی کوشش نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ایک اور بات بھی صاف کہہ دینا چاہتا ہوں۔ میرا یہ خطاب ائمہ سیاست کے مقتدیوں سے نہیں بلکہ خود اماموں سے ہے۔ ان جاہل مقتدیوں سے مَیں کسی بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتا جو محض جواب دینے کی خاطر جواب دیا کرتے ہیں، بات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بس باوّلِ نظر میں یہ دیکھ کر کہ کہنے والا کچھ اُن کی خواہشات کے خلاف کہہ رہا ہے، جوابی بحث اور بحث بھی نہیں بلکہ بازاریوں کی طرح حملے شروع کر دیتے ہیں۔

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۹

آزادی اور قومی تشخص

مسلمانوں کے سامنے "آزادی" کا نام لے کر توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس دلفریب نام کو سن کر بے خود ہو جائیں گے اور حقائق سے آنکھیں بند کر کے ہر اس راستہ پر چل کھڑے ہوں گے جسے "آزادی کا راستہ" کہہ دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان بھی آزادی کے اتنے ہی خواہش مند ہیں جتنے ہندوستان کے دوسرے رنگ بلکہ مسلمانوں میں اس چیز کی تڑپ دوسروں سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ان میں ایک قلیل جماعت ایسی ضرور ہو سکتی ہے جو اپنی اغراض کے لیے ہندوستان میں غیر ملکی اقتدار چاہتی ہو۔ ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور ہندوستان کی دوسری قوموں میں بھی ایسی قلیل التعداد جماعتیں موجود ہیں۔ لیکن جمہور مسلمین میں شاید کوئی ایک شخص بھی آپ کو نہ ملے گا جو ہندوستان کو انگریزوں کا غلام دیکھنا چاہتا ہو۔ بلکہ اوسطاً ایک مسلمان دوسری تمام قوموں کی بہ نسبت انگریزیت اور اس کے اقتدار کو زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا مذہب ہی اسے یہ سکھاتا ہے کہ مادہ پرستی، شہوات کی بندگی اور ظلم و جور پر جس تہذیب اور جس سیاست کی بنا قائم ہو اس سے نفرت کرے۔ پھر اس کے دل میں آج تک یہ زخم تازہ ہے کہ اس ملک کی حکومت اس سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

چھینی گئی ہے اور اسی کو سب سے زیادہ پامال کیا گیا ہے، اس لیے نہ صرف فطرتاً، بلکہ تاریخی لحاظ سے بھی مسلمان سب سے بڑھ کر آزادیٔ وطن کا خواہش مند ہے۔

آزادی کیوں ؟

لیکن سوال یہ ہے کہ آزادیٔ وطن سے مُراد کیا ہے ؟ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی ہے ؟ یہ چیز فی نفسہٖ مطلوب ہے، یا کسی غرض کے لیے ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے ؟ اگر وہ غرض حاصل ہونے کے بجائے اُلٹی فوت ہوتی جاتی ہو تو کیا پھر بھی کسی قوم سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ "آزادی" کے نام پر دیوانہ وار دوڑی چلی آئے گی ؟ کیا ایسی "آزادی" کو وہ قوم بھی اپنے لیے آزادی سمجھ سکتی ہے جس کو حقیقت میں آزادی نہ مل رہی ہو ؟ اور کیا اس قسم کی آزادی کے لیے جنگ اور قربانی کرنا عقل، فطرت، دین کسی چیز کی رُو سے بھی کسی قوم کا فرض ہو سکتا ہے ؟ یہ سوالات ہیں جن پر میدانِ جنگ میں قدم رکھنے سے پہلے ہر ذی عقل انسان غور کرنے پر مجبور ہے، اور مسلمان آخر ذوی العقول سے خارج تو نہیں ہے کہ ان بنیادی سوالات کو نظر انداز کر کے خواہ مخواہ اس بگل کی آواز پر لفٹ رائٹ شروع کر دے جو شیوگاؤں یا سوراج بھون سے پھونکا جائے۔

یہ ظاہر ہے کہ "آزادیٔ وطن" سے مُراد ہمالیہ و گنگا جمنا اور مشرقی و مغربی گھاٹوں کی آزادی نہیں ہے۔ یہ پہاڑ اور یہ دریا دس ہزار برس پہلے جیسے آزاد تھے ویسے ہی آج بھی ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ دراصل غلام یہ پہاڑ اور یہ دریا نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کے باشندے ہیں، اور آزادیٔ وطن سے مراد حقیقت میں وطن کے باشندوں ہی کی آزادی ہو سکتی ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وطن جب ۳۵ [1] کروڑ باشندوں سے آباد ہے تو صحیح معنوں میں آزادیٔ وطن، صرف اسی آزادی کو کہا جاسکتا ہے جو ان پورے ۳۵ کروڑ

---

[1] یہ اعداد و شمار ۱۹۴۱ء کی مردم شماری سے پہلے کے ہیں — مرتب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باشندوں کے لیے آزادی ہو۔ اہلِ وطن میں سے بعض کی آزادی اور بعض کی غلامی کو پورے وطن کی آزادی سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ عموماً لوگ محض سہولت پسندی کی بنا پر بہت سے ایسے ملکوں کو "آزاد" کہہ دیا کرتے ہیں جن کے باشندوں کا ایک حصّہ آزاد اور دوسرا حصّہ خود اہلِ وطن کا غلام ہوتا ہے۔ مثلاً جس دَور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہندوستان آزاد تھا اس میں درحقیقت "ہندوستان" آزاد نہ تھا بلکہ ہندوستان کا آریہ آزاد تھا۔ شودر کی غلامی اُس مُلک کے باشندوں کی غلامی سے بھی ہزار درجہ زیادہ بدتر تھی جسے اصطلاحاً ہم غلام کہتے ہیں۔ آج امریکہ کو آزاد مُلک کہا جاتا ہے۔ حالانکہ امریکہ کی آزادی محض اس کے سفید فام باشندوں کی آزادی ہے، سیاہ فام باشندے کسی آزادی سے متمتع نہیں۔ اسی طرح روس کی آزادی صرف اس کے کمیونسٹ باشندوں تک محدود ہے۔ مسلمان، عیسائی اور تمام غیر اشتراکی بلکہ غیر اسٹالینی باشندوں کے لیے قطعاً کوئی آزادی نہیں، بلکہ ہماری غلامی سے بھی بدتر غلامی ہے۔ جنوبی افریقہ کی آزادی محض اس کے فرنگی باشندوں کے حصّہ میں آئی ہے۔ وہاں کی دیسی آبادی اور ہندوستانی آبادی اس درجہ غلام ہے کہ ہم اپنے آپ کو نسبتاً ان کے مقابلہ میں آزاد کہہ سکتے ہیں۔ جرمنی کی آزادی صرف آرین نسل کے لیے ہے، سامیوں کے لیے نہیں۔ چیکوسلواکیہ کی آزادی چند روز پہلے تک صرف چیک اور سلواک باشندوں کے لیے مخصوص تھی، دوسروں کے لیے نہیں[1]۔ ایسے ممالک کو اگر عرفِ عام میں آزاد کہا جاتا ہے تو اس سے وہ تلخ حقیقت شیرینی نہیں بن جاتی جو ان کے غلام باشندوں کو رات دن زہر کے گھونٹوں کی طرح حلق کے نیچے اتارنی پڑتی ہے۔

یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ محض غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہو جانے کا نام "آزادی" رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ یہ آزادی کی تمام حقیقت نہیں ہے، بلکہ صرف اس کا مقدمہ ہے۔ آزادی کا اصلی جوہر تو حکومتِ خود اختیاری سے متمتع ہونا اور اپنی اجتماعی خواہشات و ضروریات کو پورا کرنے پر آپ قادر ہونا ہے۔ یہ چیز اگر مُلک کے کسی گروہ کو حاصل نہ ہو، اگر اس کی تکمیل اپنے ہی وطن کے کسی دوسرے گروہ کے ہاتھ میں

---

[1] یہ بات چیکوسلواکیہ پر جرمنی کے قبضہ کے بعد لکھی گئی تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہے کہ جس طرح وہ چاہے اسے اُٹھائے اور جس طرف چاہے اسے چلائے اور جو کچھ چاہے اس پر لاد دے تو وہ حقیقت میں غلام ہی ہوگا۔ اس کے لیے ملک کی آزادی محض بے معنی ہوگی۔ غلامی اپنی حقیقت اور فطرت کے لحاظ سے بہرحال ایک ہی چیز ہے۔ اس لحاظ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ وہ غیر ملک والوں کی غلامی ہے یا اہل وطن کی۔ اگرچہ تجربہ سے یہی ثابت ہوا ہے کہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے اہل وطن کی غلامی بہ نسبت غیر ملکیوں کی غلامی کے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ مثلاً جو سلوک امریکہ کا سفید فام اپنے حبشی اہل وطن کے ساتھ کرتا ہے، یا جو برتاؤ روس کا اشالینی اپنے غیر اشالینی یا غیر اشتراکی اہل وطن سے کر رہا ہے، اس کو کوئی نسبت اُس طرزِ عمل سے نہیں جو ہندوستان میں انگریزوں نے ہمارے ساتھ اختیار کیا ہے۔ تاہم دونوں قسم کی غلامیوں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا سوال ہرگز پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ غلامی بہرحال ایسی چیز ہے کہ اسے دفع کرنے کی کوشش ہی کرنی چاہیے۔ پس جو شخص اہل وطن کی غلامی کو غیر ملکیوں کی غلامی پر ترجیح دیتا ہو اور دوسری قسم کی غلامی کو محض پہلی قسم کی غلامی میں بدل لینے کا نام "جنگِ آزادی" رکھے، اور ایسی جنگِ آزادی میں شریک ہونے کو فرض قرار دے، وہ دراصل جنت الحمقاء کا باشندہ ہے۔ کوئی صاحبِ عقل انسان اس کی پیروی نہیں کرسکتا۔ نہ ایک پوری کی پوری قوم اتنی بیوقوف ہوسکتی ہے کہ وہ صرف غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہونے کے لیے میدانِ جنگ میں کود پڑے، اور یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھے کہ آزادی کے اصلی جوہر میں بھی اس کا کوئی حصہ ہے یا نہیں۔

ایک وطن کے باشندوں کو مجرد اس واقعہ کی بنا پر کہ وہ ایک وطن کے باشندے ہیں، تمام حیثیات سے ایک سمجھ لینا، اور اس مفروضہ پر ملک کی آزادی کو ان سب کے لیے یکساں آزادی قرار دینا، یا تو جہالت ہے یا پھر خطرناک قسم کی چالاکی۔ بہت سے لوگ اسی مفروضہ کو سامنے رکھ کر بے تکلف کہہ جاتے ہیں کہ "بھائی! جب ملک آزاد ہوگا تو سب آزاد ہو جائیں گے۔" لیکن یہ مفروضہ ہر حال میں ہر جگہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ جہاں صرف ایک قوم رہتی ہو، مختلف گروہ اور ان گروہوں کے درمیان گروہی امتیازات نہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوں، اور سب باشندے اپنے عقائد، جذبات و احساسات (Sentiments) رسوم و رواج، قوانین معاشرت اور طرز زندگی کے اعتبار سے ایک ہوں یا کم از کم باہم متقارب ہوں، وہاں تو بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ محض ملک کا آزاد ہو جانا ہی تمام باشندگان ملک کا آزاد ہو جانا ہے کیونکہ وہاں باشندگان ملک کے درمیان الگ الگ گروہوں کا وجود ہی نہیں ہے جس کی بنا پر اس امر کا امکان پیدا ہوتا ہو کہ آزادی ایک گروہ کے پاس اٹک کر رہ جائے اور دوسرے گروہ تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن جس ملک کے باشندوں میں ایک سے زیادہ گروہ موجود ہوں اور ان کے درمیان نسل یا رنگ، یا زبان، یا عقائد، جذبات اور طرز زندگی کے بیّن اختلافات موجود ہوں، وہاں اس امر کا امکان ہے کہ آزادی کی دولت کو ایک گروہ اچک لے اور دوسرے گروہ یا گروہوں کو اس سے محروم کر دے۔ ایسی جگہ وہ مفروضہ نہیں چل سکتا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں ہر گروہ کو یہ پوچھنے کا حق ہے، اور اگر وہ اپنے وجود کو عزیز رکھتا ہے تو اسے پوچھنا چاہیے کہ آزادی حاصل کرنے کا کون طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے، اور جس آزادی کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے وہ کس نوع کی آزادی ہے۔ پھر اگر واقعات سے کسی گروہ پر یہ ثابت ہو جائے کہ حصول آزادی کا وہ طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے جو اس کے اجتماعی وجود کو نقصان پہنچانے والا ہے، اور ملک کی آئندہ حکومت ایسے اصولوں پر تعمیر ہو رہی ہے جن کی بدولت حکمرانی کے اختیارات سے وہ لازمی طور پر محروم ہو جاتا ہے تو اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسی جنگ آزادی میں حصہ لے گا۔ ایسی آزادی کو ملک کی آزادی کہنا حقیقت کے خلاف ہے۔ جس گروہ کے لیے یہ آزادی نہیں بلکہ غلامی ہے، اور جس گروہ کے لیے یہ زندگی نہیں بلکہ موت ہے وہ آخر کیوں اس کے حاصل کرنے میں حصہ لے۔

اس مرحلے پر پہنچ کر ہم سے دو مختلف باتیں کہی جاتی ہیں، اور ضرورت ہے کہ ہم ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ کہا جاتا ہے کہ ملک کی آزادی کا لازمی نتیجہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خوشحالی ہے، اور یہ خوشحالی جب آئے گی تو تمام باشندے اس سے متمتع ہوں گے۔ تعلیم عام ہوگی۔ تمدن ترقی کرے گا۔ صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ ہوگا۔ معیارِ زندگی بلند ہوگا۔ اور اقوامِ عالم کے درمیان اہلِ ملک کی عزت بڑھے گی۔ یہ فوائد ظاہر ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کو حاصل ہوں گے، پھر کیوں نہ ملک کے ہر گروہ کو ان فوائد سے یکساں دلچسپی ہو اور کیوں نہ وہ ان کے حصول کے لیے مل کر جد و جہد کریں؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک کی خوش حالی اور ترقی کے لیے آزادی ناگزیر ہے، اور آزادی کے حصول میں مختلف گروہوں کا وجود اور ان کے امتیازات مانع ہیں، لہٰذا کوشش کرنی چاہیے کہ ان گروہوں کو اور ان کے امتیازات کو مٹا کر تمام اہلِ ملک کو ایک کر دیا جائے۔ کیونکہ جب تک یہ باقی رہیں گے ملک آزاد نہ ہو سکے گا اور جب تک ملک آزاد نہ ہوگا، تمام اہلِ ملک خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، یکساں بدحالی، افلاس، جہالت، اخلاقی اور ذہنی پستی میں مبتلا رہیں گے، کیا تم ان حالات کو دائماً برقرار رکھنا چاہتے ہو؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک ملک کے باشندوں میں عقائد، جذبات، طرزِ زندگی، زبان، ادب اور تہذیب و تمدن کے اختلافات غیر حقیقی اور مصنوعی ہیں۔ ان کو زندگی کے اہم تر مسائل سے کوئی علاقہ نہیں۔ زندگی کے اہم تر مسائل یہ ہیں کہ لوگوں کو کھانے کے لیے مل رہا ہے یا نہیں؟ ان کے لیے زندگی کی ضروریات پوری کرنے اور مزید برآں زندگی کی آسائشوں سے متمتع ہونے کے مواقع موجود ہیں یا نہیں؟ ان کے ملک میں دولت آفرینی کے جو وسائل موجود ہیں اُن سے کس قدر فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے؟ اور جو دولت وہ پیدا کر رہے ہیں وہ کس طرح تقسیم ہو رہی ہے؟ ان اہم تر مسائل کا تعلق تمام باشندگانِ ملک سے یکساں ہے اور ان میں ان سطحی اختلافات کا کچھ دخل نہیں جن کا تم ذکر کرتے ہو۔ لہٰذا یہ اختلافات اگر موجود بھی ہیں تو انہیں نظر انداز کر دینا چاہیے اور تمام باشندگانِ ملک کو ایک قوم فرض کر کے زندگی کے ان مسائل کو حل کرنا چاہیے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے بقا و قیام اور عروج و ارتقا کا انحصار بھی معاشی فلاح اور سیاسی آزادی پر ہے۔ یہ چیز اگر حاصل نہ ہو تو کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی، کجا کہ ترقی کر سکے۔ لہٰذا تہذیب و تمدن کا مفاد بھی اس امر کا متقضی ہے کہ ملک کے تمام گروہ مل کر پہلے سیاسی آزادی اور معاشی فلاح کے لیے جدوجہد کریں۔

یہ مختلف باتیں کبھی مختلف زبانوں سے اور کبھی ایک ہی زبان سے سُننے میں آتی ہیں۔ لیکن جب ہم ان پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ ہم کو دھوکا دینے کے لیے نہیں کہی جا رہی ہیں تو ان کے کہنے والے خود دھوکے میں ہیں۔ وہ حقیقت کو طالب علم کی نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ مشنری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو اپنی خواہشِ نفس کے اتباع میں گم ہو جاتا ہے۔

آج انسان اس دور سے آگے نکل چکا ہے جس دور میں وہ محض ایک جانور ہونے کی حیثیت سے بس اپنی جسمانی ضروریات کی تکمیل کا خواہش مند ہوتا تھا، اور یہ امر اس کی نگاہ میں کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا کہ یہ ضروریات کس ڈھنگ پر، کس صورت میں پوری ہوتی ہیں۔ اب اس کے لیے اپنی ہزارہا برس کی طے کی ہوئی مسافت کو اُلٹے پاؤں دوبارہ طے کرنا اور یکایک اسی دورِ وحشت و حیوانیت کی طرف پسپا ہو جانا محال ہے۔ اس طویل مدت میں اس کی عقل، اس کے مذاق، اس کے علم اور اس کی قوتِ اجتہاد و اکتساب کے ارتقا سے انسانیت کے مختلف نمونے (Models) پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک ایک قوم ایک ایک نمونے کو پسند کر کے اس پر اپنی اجتماعی شخصیت تعمیر کر چکی ہے۔ اور اس خاص نمونۂ انسانیت کو اپنی قومی ہیئت (National Type) بنا چکی ہے جو صدیوں کے نشوونما سے اس کے اندر پختہ ہوا ہے۔ اب ایک قوم کی زندگی دراصل اس کے نیشنل ٹائپ کی زندگی ہے اور اس کے نیشنل ٹائپ کا مر جانا خود اس قوم کا مر جانا ہے۔ اگرچہ ضروریاتِ زندگی کا پورا ہونا، دولت حاصل کرنا اور اسے خرچ کرنا آج بھی ایک قوم کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی اہمیت آج سے دس ہزار برس پہلے رکھتا تھا۔ لیکن ان تمام معاملات کا دامن ہر قوم کے مخصوص نظریہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زندگی اس کے ضابطۂ اخلاق، اس کے اصول معاشرت وتمدن، اور اس کے معیار قدر وقیمت کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ ہر قوم اپنی ضروریات کو اپنے نیشنل ٹائپ کے مطابق پورا کرنا چاہتی ہے۔ آپ محض "ضروریات زندگی" کا نام لے کر کسی قوم سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے حصول کے لالچ میں وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو تبدیل کر دے۔ کیونکہ اس کی تبدیلی دراصل قوم کی موت ہے۔ کوئی قوم جس کی قومی سیرت مستحکم ہو چکی ہو وہ محض آسائشوں کے لالچ سے اپنے نیشنل ٹائپ کو بدلنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ اور جو قوم اس پر آمادہ ہو جائے اس کے متعلق یہ یقین کے ساتھ جان لینا چاہیے کہ یا تو اس کا کیرکٹر ابھی بنا نہیں ہے، یا پھر وہ ایک ذلیل اور موقع طلب (Opportunist) قوم ہے جس کی سیرت پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

آزادی اور قومی وجود

اس بنیادی حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد غور کیجیے کہ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی ہے۔ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے۔ اور وہ یہ کہ اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور اس کے نشو وارتقاء کی خواہش ہی دراصل آزادی کی طلب کا مبدا ہے۔ جو قوم غلام ہوتی ہے وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو صرف یہی نہیں کہ ترقی نہیں دے سکتی، بلکہ اس کے برعکس اس کا نیشنل ٹائپ مضمحل ہو جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ عزیز نہ ہو تو اس میں سرے سے آزادی کی خواہش پیدا نہ ہو گی اور جس قوم میں آزادی کے لیے تڑپ پائی جاتی ہے اس کی تڑپ کا کوئی سبب اس کے سوا نہیں کہ وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو عزیز رکھتی ہے، اسے فنا نہیں ہونے دینا چاہتی، اور اس کو ترقی دینے کی خواہش مند ہے۔

جب حقیقت یہ ہے تو وہ صرف ایک جاہل اور بیوقوف آدمی ہو گا جو آزادی حاصل کرنے کی خاطر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ بدل دینے کے لیے کہے گا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ جس چیز کی خاطر آزادی کی خواہش ایک قوم میں پیدا ہوا کرتی ہے اسی چیز کو مٹانے کا خیال ظاہر کیا جائے اور پھر یہ توقع رکھی جائے کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آزادی کی پکار اس قوم کے دل و دماغ کو اپیل کرے گی۔ کیا کوئی شخص نقصان اٹھانے کی نیت سے تجارت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص مرنے کے لیے غذا کھا سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص اس غرض کے لیے پانی کی طرف دوڑ سکتا ہے کہ اس کی پیاس بجھنے کے بجائے اس کا سینہ جل جائے؟ اگر یہ ممکن نہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک قوم اپنے قومی وجود کو ختم کرنے کے لیے آزادی کی خواہش کرے حالانکہ آزادی اس کی مطلوب ہی صرف اس لیے ہو سکتی ہے کہ اپنے قومی وجود کو زندہ رکھے اور ترقی دے۔

بلا شبہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کے لیے کچھ نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ آزاد نہ ہو جائے لیکن اس کے ساتھ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جس ملک میں متعدد قومیں مختلف قومی ہیئتوں کے ساتھ رہتی ہوں وہاں مجرد ملک کی آزادی کو ہر ہر قوم کی آزادی نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں آپ کو صراحت کے ساتھ یہ بتانا پڑے گا کہ آزاد حکومت کی نوعیت کیا ہوگی۔ اگر آزاد حکومت کے لیے آپ کے پاس اس جمہوریت کے اصول ہوں جس کے معنی محض اکثریت کی حکومت کے ہیں تو لامحالہ یہ آنے والی آزادی صرف اس قوم کے لیے آزادی ہوگی جو کثیر التعداد واقع ہوئی ہو۔ قلیل التعداد قوموں کے لیے اس کے معنی بجز اس کے کچھ نہ ہوں گے کہ وہ غیر ملکی اقتدار سے نکل کر خود اپنی ایک ہم وطن قوم کی تابع ہو جائیں۔ ایسی آزادی کو نہ تو قلیل التعداد قومیں اپنے لیے آزادی سمجھ سکتی ہیں اور نہ یہ توقع کر سکتی ہیں کہ اکثریت کی حکومت کے تحت رہ کر انہیں اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کا کوئی موقع مل سکے گا۔ آزادی کی جنگ میں ان کے لیے صرف اسی وقت کشش پیدا ہو سکتی ہے جب کہ آزاد حکومت کا ایک ایسا نقشہ ان کے سامنے پیش کیا جائے جس میں ان کے لیے بھی حکومت خود اختیاری رکھی گئی ہو۔ اس لیے کہ صرف حکومت خود اختیاری ہی وہ چیز ہے جس سے کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی کے لیے کچھ کر سکتی ہے، اور نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی ہی وہ واحد غرض ہے جس کے لیے کوئی قوم آزادی چاہتی اور آزادی کی خاطر لڑ سکتی ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہا یہ قول کہ ملک کی خوش حالی میں تمام باشندگانِ ملک کا یکساں حصّہ ہوگا خواہ ملک کا نظامِ حکومت بالکل اکثریت کے ہاتھوں میں ہی کیوں نہ ہو، تو یہ قطعاً غلط ہے۔ جہاں قومی امتیاز موجود ہو وہاں ترجیح ہم جنس لازماً موجود ہوتی ہے۔ اور جہاں ترجیح ہم جنس پائی جاتی ہو وہاں صرف عقائد، جذبات، طرزِ زندگی، زبان و ادب اور تہذیب و تمدن ہی کے معاملہ میں ایک قوم کا مفاد دوسری قوم سے مختلف نہیں ہوتا بلکہ معاشی، سیاسی اور انتظامی معاملات میں بھی لازماً مختلف ہو جاتا ہے۔ وہاں جس طرح ایک قوم اپنی تعلیم، اپنی معاشرت اور اپنی تہذیب کے سوال کو بے خوف و خطر دوسری قوم کے ہاتھ میں نہیں دے سکتی، اسی طرح وہ اپنی روٹی کے سوال کو بھی اس کے ہاتھ میں دے کر مطمئن نہیں ہو سکتی، اور نہ انتظامی و تشریعی ادارات میں اپنی نمائندگی کے سوال کو اس پر چھوڑ سکتی ہے۔ جس جگہ ایک شخص پانی پینے اور کھانا کھانے کے لیے بھی یہ دیکھتا ہو کہ پانی لانے والا اور کھانا بیچنے والا اس کا ہم قوم ہے یا نہیں، جہاں ایک شخص بازار میں خرید و فروخت کرتے وقت بھی دوکاندار کی قومیت پر نظر رکھتا ہو، جہاں ایک مزدور سے خدمت لیتے ہوئے یا کسی آدمی کو ملازم رکھتے ہوئے بھی دیکھا جاتا ہو کہ اس مزدور یا اس امیدوار کا تعلق کس قوم سے ہے، وہاں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کے سارے باشندوں کا معاشی یا سیاسی مفاد یکساں ہے، اور کسی ایک قوم کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات سمٹ جانے سے دوسری قوم کے پیٹ کو کوئی خطرہ نہیں۔

پھر جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، یہ خیال کرنا بھی بالکل غلط ہے کہ دولت آفرینی اور تقسیم دولت اور معیارِ زندگی کی ترقی اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کے مسائل کا کوئی تعلق تہذیب و تمدن سے نہیں ہے۔ اس باب میں ہر جماعت اپنا ایک الگ مسلک اور الگ نقطۂ نظر رکھتی ہے اور محض آسائشِ جسمانی کے لالچ سے اس بات پر آمادہ نہیں ہو سکتی کہ اپنے نقطۂ نظر کو دوسرے نقطۂ نظر سے بدل لے۔ آپ اشتراکی جماعت سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے نظریاتِ معیشت و اجتماع کو کسی لالچ کی بنا پر سرمایہ دارانہ نظریات سے بدل لے گی۔ اسی طرح آپ کو ایک مسلمان سے بھی یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

توقع نہ کرنی چاہیئے کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو بدل دیگا اور اپنے آپ کو دوسروں کے حوالہ کردے گا کہ وہ جس طرح چاہیں اس کے لیے دولت کی پیدائش اور اس کی تقسیم کے سوال کو حل کر دیں، در آنحالیکہ یہ سوال اس کی تہذیب و تمدن کے نقشے کو بنانے اور بگاڑنے میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو لوگ "آزادی" کا لفظ زبان سے نکال کر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس نام کو سنتے ہی ان کی طرف دوڑے چلے آئیں گے، اور جب ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو مسلمانوں کو بزدلی اور رجعت پسندی اور رسامراج پرستی کے طعنے دیتے ہیں، وہ کس خام خیالی میں مبتلا ہیں۔ ہر قوم میں تھوڑے یا بہت افراد ایسے ضرور نکل آتے ہیں جو اپنے تخیلات و اوہام میں گم ہو کر اپنے قومی مفاد کو بھول جاتے ہوں، اور ایسے افراد بھی ضرور پائے جا سکتے ہیں جو دن کی روشنی میں بھی نمایاں حقائق کو نہ دیکھ سکتے ہوں۔ مگر ایک پوری کی پوری قوم نہ اندھی ہو سکتی ہے اور نہ بیوقوف۔ وہ کسی آواز پر دوڑ پڑنے سے پہلے یہ ضرور دیکھے گی کہ اس کو کس طرف بلایا جا رہا ہے۔ وہ محض آزادی کی پکار پر فریفتہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ عین اس کی عقل اور فطرت کا اقتضاء ہے کہ اس پکار کی حقیقت پر غور کرے اور یہ تحقیق کرے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے اور پکارنے والے جس آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔

آئندہ صفحات میں انہی دو سوالات کی تحقیق کی جائے گی۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۱۰

قوم پرستوں کے نظریات

خوش قسمتی سے ہمارے پاس ایک ایسی کتاب موجود ہے جس میں ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلے اور اس کے حل، اور ہندوستان کی آزاد حکومت کے نقشے اور اس کے طریق حصول کے متعلق "قوم پرست جماعت" کے نظریہ کی پوری تشریح مل جاتی ہے۔ یہ کتاب پنڈت جواہر لال نہرو کی تصنیف ہے، جو نہ صرف کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں، بلکہ گاندھی جی کے متوقع جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ آگے چل کر ہم اس قوم پرستی کے تمام اساطین سے استفادہ کرنے والے ہیں، مگر بحث کی ابتدا بھارت بھوشن پنڈت جواہر لال نہرو کے افادات سے کرنا ہر آئینہ مناسب ہے۔

پنڈت جی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کا ایک نیا حل دریافت کیا ہے جس کی گہرائیوں تک یا تو ان سے پہلے کے ہندستانی سیاستدانوں کی نظر نہ پہنچی تھی، یا ان میں ایسا انقلابی حل پیش کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس حل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اُن نظریات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے جن کو پنڈت جی نے بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کر لیا ہے اور پھر انہی پر اس پالیسی کی بنیاد رکھی ہے جسے وہ اس مسئلہ کا صحیح حل سمجھتے ہیں۔ میں ان نظریات کو ترتیب وار بیان کروں گا تاکہ اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پالیسی کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجاتے۔

اصول موضوعہ

پنڈت جی کے تصور کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کی آبادی کو ایک قوم فرض کرتے ہیں۔ تاریخِ یورپ اور سیاسیاتِ یورپ کے مطالعہ سے ان کے ذہن میں قومیت کا صرف ایک ہی تصور پیدا ہوا ہے، اور وہ یہ کہ ایک جغرافی رقبہ کی تمام آبادی ایک قوم ہے اور اس کو ایک ہی قوم ہونا چاہیئے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ فرانس ایک ملک اور ایک قوم ہے جرمنی ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ اٹلی، انگلستان، ہسپانیہ وغیرہ ایک ایک ملک اور ایک ایک قوم ہیں۔ اس مشاہدے کے دوران میں ان کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ ان میں سے ہر ملک کے باشندے ایک اسپرٹ، ایک قسم کے تمدن اور کم از کم قریبی دَور کی حد تک ایک قسم کی تاریخی روایات کے حامل ہیں، اور وہ تمام عناصر ترکیبی جن سے ایک قومیت وجود میں آتی ہے ان کے درمیان مشترک ہیں یا واقعات کی رفتار نے ان کو مشترک بنا دیا ہے اور اس اشتراک ہی نے ان کے اندر یہ ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کی ہے۔ ان سب حقیقتوں کو نظر انداز کر کے وہ ایک نہایت سطح بیں آدمی کی طرح یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان سب ممالک میں قومیت کی اساس رشتۂ وطنیت کا اشتراک ہے، اور اسی طرح سے ہر خاک وطن کی پیداوار کو ایک ہی قوم ہونا چاہیئے۔ یہی تصویر ہے جس کے تحت ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں:۔

> "ہندوستان میں مسلم اقلیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے۔ منتشر ہے مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دُور از کار ہے اور بد قت قابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے۔ مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دُنیا میں کوئی قوم ہی نہیں بس مذہبی اخوت

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا رشتہ ہی ایک چیز ہے، اس لیے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشوونما نہ پا سکے۔"

(میری کہانی، جلد دوم صفحہ ۳۲۱۔ مکتبہ جامعہ دہلی)

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کے ذہن میں ہندوستانی قومیت کا تصور کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مطالعہ اور فہم کا قصور ہو، یا ہندوستان کو ایک قوم دیکھنے کی آرزو نے ان کے ذہن کو روشن ترین حقائق کے ادراک سے عاجز کر دیا ہو۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ وہ قوم پرستی اور فرقہ پرستی کے الفاظ کو بالکل حقیقی معنوں میں لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں ایک ہی قوم رہتی ہے، اور یہ مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ محض اس قوم کے فرقے ہیں۔ اسی بنا پر وہ ہندوستان کی ان جماعتوں کے اختلافات کو "فرقہ وارانہ" مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ بنیادی حقیقت ان کے ذہن کی گرفت میں آتی ہی نہیں کہ یہ مسئلہ دراصل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے —— آپ چاہیں تو اسے بدقسمتی کہیے اور بہت ہی ناگوار چیز سمجھیے، مگر ہے یہ حقیقت اور اس حقیقت کو نظر انداز کرنے میں پنڈت جی تنہا نہیں ہیں بلکہ تمام "قوم پرست" ان کے شریک حال ہیں۔

تصورِ قومیت کے بعد دوسرا تصور جو صاحب موصوف کے دماغ پر حاوی ہے وہ کارل مارکس کا فلسفۂ تاریخ ہے۔ یہاں اس فلسفہ کی تشریح کا موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ جس طرح کسی بھوکے سے پوچھا گیا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ چار روٹیاں، اسی طرح معاشی مصائب کے مارے ہوئے اس فلسفی نے بھی دنیا کے تمام مسائل کا مرکز و محور صرف روٹی کے مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ تاریخ کے تمام انقلابات میں اس کو معاشی طلب یا بھوک کے سوا کوئی قابلِ توجہ عامل (Factor) نظر نہیں آتا۔ اس کے نزدیک جواہر لال نہرو کے الفاظ میں:۔

"دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔" (صفحہ ۴۰)

اگرچہ پنڈت جی بقولِ خود کسی اذعانی عقیدے (Dogma) کے قائل نہیں ہیں۔ مگر مارکس کی اس تعبیرِ تاریخ کو انہوں نے وحی آسمانی کی طرح قبول کیا ہے اور اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ "اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکس کی تعبیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا۔" (صفحہ ۱۴۱)

اپنے تصورِ قومیت کے ساتھ اس مارکسی فلسفہ کو ملا کر پنڈت جی یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ اول تو ہندوستان کی تمام آبادی ایک قوم ہے۔ پھر اس قوم میں اگر کوئی حقیقی امتیاز و اختلاف ہو سکتا ہے تو وہ صرف معاشی بنیاد ہی پر ہو سکتا ہے۔ یہ ہندو اور مسلم اور عیسائی، یعنی مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات ہیں، یہ کسی طرح معقول نہیں ہیں۔ اختلاف کی فطری اور معقول بنیاد یہ ہے کہ قوم کے اندر جن کے پاس ایک روٹی ہو وہ سب ایک گروہ ہوں، اور جن کے پاس دو روٹیاں ہوں وہ دوسرا گروہ ہوں، وھلم جرًّا۔ پھر اگر ان کو لڑنا ہو تو روٹیوں پر لڑیں۔ بلکہ "اگر" کیا معنی، ان کو اسی چیز پر لڑنا چاہیئے۔

اسی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان جدید کا یہ لیڈر کہتا ہے:۔

"معاشی نقطۂ نظر سے یہ (یعنی مسلم قومیت کا تخیل) بہت دُور از کار ہے اور بدقت قابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے۔" (صفحہ ۴۳۱)

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوستان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد اقتصادی فوائد پر رکھی جاتی ہے۔"

(جواہر لال کا خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب سارے ہندوستان کی آبادی ایک قوم ہے، اور اس قوم کے درمیان فرقے اور گروہ بننے کی وجہ محض معاشی اغراض ہی ہو سکتی ہیں، تو پھر یہ ہندو مسلم اور دوسرے فرقے پیدا کیسے ہو گئے؟ یہ معاملہ کیا ہے کہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غیر معاشی چیزوں نے ہندوؤں کو ایک "فرقہ" اور مسلمانوں کو دوسرا "فرقہ" بنا دیا اور ان کے درمیان غیر معاشی وجوہ نے اختلافات پیدا کر دیے؟ یہاں موقع تھا کہ پنڈت جی خود اس نظریہ ہی پر نظر ثانی کرتے جسے انہوں نے مارکس کی "وحی" سے بے سوچے سمجھے اخذ کیا اور اذعانی عقیدے کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ ان کے سامنے واقعات کی دنیا میں ایک کھلی ہوئی حقیقت موجود تھی جو شہادت دے رہی تھی کہ انسان کے جسم میں صرف معدہ ہی ایک عضوِ رئیس نہیں ہے۔ صرف بھوک ہی وہ چیز نہیں ہے جو اس کی ذہنیت اور اس کے خیالات کی تشکیل کرتی ہو، صرف معاشی عامل (Economic Factor) ہی ایک عامل نہیں ہے جو انسانوں کو قوموں اور گروہوں کی شکل میں مجتمع کرتا اور ان کے درمیان اختلافات پیدا کرتا ہو۔ مگر انہوں نے تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ رائے ——— عقلی و استدلالی نہیں بلکہ روحانی و وجدانی رائے ——— قائم کر لی کہ یہ مذہبی تفریق ایک غیر فطری چیز ہے، اور اس مادۂ فاسد یعنی مذہب نے دخل انداز ہو کر "ہندوستانی قوم" کو ایک صحیح بنیاد (یعنی روٹی کی بنیاد) کے بجائے، ایک غلط بنیاد (یعنی طرزِ خیال اور طریقِ زندگی) کی بنیاد پر متفرق کر دیا ہے۔

اس تصور کے زیرِ اثر، جگہ جگہ وہ مذہب پر یوں غصہ اتارتے ہیں:۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے اکثر مٹا دینے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ قریب قریب ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حامی ہے۔" (صفحہ ۱۶۱)

مذہب کے خلاف نفرت و غضب کا اظہار "ہندوستانی قوم" کے اس لیڈر نے اتنی کثرت کے ساتھ کیا ہے کہ تمام تحریروں کو نقل کرنا ایک طولِ عمل ہے۔ وہ اپنی تقریروں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور تحریروں میں ہر اس موقع پر جہاں ہندو مسلم کا نام آتا ہے، چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں کہ "مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہو؟" اس ارشاد سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ سیاسی، اجتماعی اور معاشی گروہوں میں مذہب کی بنیاد پر تفریق کرنا سرے سے غلط ہے۔ اس غلط بنیاد کو ڈھانا چاہیے، نہ کہ اس کو سامنے لا کر ایک قابلِ لحاظ چیز قرار دینا۔

ہندوستانی "قوم" میں فرقوں کے وجود اور ان کے باہمی اختلاف کی یہی ایک توجیہ ہمارے وطنی لیڈر کے پاس نہیں ہے۔ دوسری توجیہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ اس کو برطانوی امپیریلزم کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ہندوستانی قوم میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت تھی اسی لیے اور صرف اسی لیے یہ اختلافات موجود ہیں۔

دیکھیے، یہاں نظر کا کتنا بڑا پھیر ہو گیا ہے۔ اگر پنڈت جی ذرا سمجھ سے کام لیتے تو یہ بات بآسانی ان پر واضح ہو سکتی تھی کہ ہندوستان میں حقیقی اختلافات موجود تھے، انگریزوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں دو قسم کے لوگوں سے ان کو مدد ملی۔ ایک وہ خود غرض لوگ جو اپنے ذاتی فائدے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاعات کو بھڑکاتے اور پیچیدہ تر بناتے ہیں۔ جنہوں نے نہایت چالاکی سے اپنے آپ کو ان دونوں کا سرپرست اور نمائندہ بنا لیا ہے، نہ اس لیے کہ ان کے اختلافی مسائل کو اطمینان بخش طریقہ پر حل کریں، بلکہ محض اس لیے کہ ان اختلافات کو دائماً برقرار رکھ کر اپنے ذاتی مفاد اور برطانوی سلطنت کے مفاد کی خدمت کرتے رہیں۔ دوسرے وہ بیوقوف لوگ جو ان اختلافات کی حقیقت کو سمجھنے اور انہیں دانشمندی کے ساتھ حل کرنے سے انکار کرتے ہیں اور اس طرح ان کے برقرار رکھنے میں مددگار بنتے ہیں۔ اگر پنڈت جی اس مسئلے کو دیکھتے تو انہیں راستہ صاف نظر آتا۔ لیکن وہ اپنے تخیل کی آنکھ سے اس کو دیکھتے ہیں، اور محض یہ دیکھ کر کہ ملک کے چند خود غرض اور ترقی دشمن لوگ انگریزی حکومت کے ساتھ مل کر ہندو مسلمانوں کے اختلافی مسائل سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ درحقیقت ان اختلافی مسائل کی کوئی اصلیت نہیں ہے،

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بلکہ یہ صرف برطانوی امپیریلزم اور اس کے ہندوستانی ایجنٹوں کی پیدا کردہ چیز ہے۔ اس بنا پر وہ جگہ جگہ "فرقہ وارانہ" مسئلے کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں:۔

"ان کا (انگریزوں کا) ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اسے انہوں نے خوب کھیلا۔" (صفحہ ۲۰)

"فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے۔" (صفحہ ۲۳)

"اور اغراض کے اس ہجوم میں برطانوی ہند کے نمائندوں کی سرداری عموماً آغاخاں کے حصّہ میں آتی تھی۔" (صفحہ ۲۱)

"اصل دقت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی۔ اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کر رہی تھی۔" (صفحہ ۲۴)

"حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پُشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رجعت پسند جماعتوں سے رہتا ہے۔ جُوں جُوں اس کی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب حمایتی ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ آج کل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن لوگ ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہا سبھا بھی ان سے کچھ کم نہیں۔" (صفحہ ۱۷۰)

"فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ کہے جا سکتے ہیں، اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی، اور سیاسی سے بھی زیادہ تمدنی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ ان کے جملہ مطالبات میں سے ایک بھی عوام الناس کے فائدے کے لیے نہیں ہے۔" (صفحہ ۳۱۱)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ اور ایسی ہی بہت سی تحریریں پنڈت جی کے اندازِ فکر پر صاف روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کا اندازِ فکر یہ ہے کہ بیمار کا خود غرض طبیبوں اور عطاروں کے پھندے میں پھنس جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دراصل بیمار ہی نہیں۔ ان کی رائے میں یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آخر کیا چیز ہے جس کی وجہ سے ان مکار طبیبوں اور عطاروں کو اس بیمار پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ سبب پر غور کرنے اور غلط معالجوں کے پھندے سے نکال کر خود صحیح علاج کرنے کی زحمت کون اٹھائے۔ اس کا علاج بس یہی ہے کہ مرض کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔

ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کی یہ دو توجیہیں کرنے کے بعد پنڈت جی ان دونوں کے درمیان رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا نظریہ ترقی کر کے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ مذہب نے ہندوستانی "قوم" کو "فرقوں" میں تقسیم کیا ہے، انگریزی امپیریلزم (سامراج) کے لیے یہ تقسیم مفید ہے، اور سرمایہ دارانہ، زمیندارانہ، اور تمام مستقل اغراض (Vested Interests) رکھنے والے طبقے سامراج کے ساتھ سازش کر کے اس تقسیم کو اپنی اور سامراج کی مشترک اغراض کے لیے استعمال کر رہے ہیں، لہٰذا مذہب، اور سامراج، اور خود غرض طبقے، تینوں باہمی قریبی رشتہ دار ہیں، تینوں قابلِ نفرت ہیں اور تینوں کو مٹا دینا چاہیے۔ اسی نظریہ کے تحت یہ ارشادات جگہ جگہ پنڈت جی کے قلم سے نکلے ہیں:۔

"منظم مذہب (Organized Religion) بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہو جاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بن کر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔ حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اس کا رویہ یہی ہے۔" (صفحہ ۴۰-۱۶۷)

"جیل میں برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مذہبی کتابیں اور ناول۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومتِ برطانیہ مذہب کی بڑی قدردان ہے اور بڑی بے تعصبی کے ساتھ ہر قسم کے مذاہب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی ہمت افزائی کرتی ہے۔" (صفحہ ۱۱۸)

"مذہب امن کا واعظ کہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دارومدار ظلم پر ہے۔" (صفحہ ۲۹۲)

اشتراکیت

ان تینوں دشمنوں کی سازش سے ہندوستان کو نجات دلانے اور اس ملک کو پھر جنت نشاں بنا دینے کی جو صورت پنڈت جی کے پیش نظر ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں۔ یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام، پہلے قومی دائرے میں اور پھر ساری دنیا میں۔ ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طرح ہونا چاہیئے؟ یہ ایک جداگانہ سوال ہے۔ لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں پوری قوم بلکہ کل نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جا سکتی کہ کچھ لوگ موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تغیر کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا تمدنی اداروں سے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیئے۔" (صفحہ ۲۰-۲۱۹)

"جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہو گی، ہمارے لیے قوم پرستی کا تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہے گا۔ یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی جگہ تمدنی و اجتماعی انقلاب (Social Revolution) کا جذبہ پیدا ہو جائے۔"

(صفحہ ۱۴۵)

لے مذہبی اداروں کا نام نہیں لیا گیا۔ مگر پچھلی تصریحات سے واضح ہے کہ فی الذہن وہ بھی مراد ہیں۔

۲ے یہ مقام ذرا تشریح کا محتاج ہے۔ اشتراکی نقطۂ نظر سے قوم پرستی (بقیہ صفحہ ۲۰۸ پر)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں، کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس لیے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے۔ یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچنے والا ہے انہیں بھی راضی کر لینا چاہیئے۔ یہ اُمید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جاسکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبۂ انصاف کو اُبھارنے سے باہمی مخالفت دُور ہو جائے گی، اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ مؤثر دباؤ ڈالے بغیر، یعنی جبر و تشدد سے کام لیے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اُٹھا لے گی، یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دستبردار ہو جائے گا"[۱] (صفحہ ۵۸، ۵۶)

"در اصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۷ سے) (نیشنلزم) ایک غلط چیز ہے۔ اشتراکیوں کا مقصد تمام دنیا میں اشتراکی انقلاب برپا کرنا ہے۔ جس کی تشریح بابو سبھاش چندر بوس نے ہری پورہ کانگریس کے خطبہ صدارت میں کی ہے۔ جب تک ساری دنیا کی قوموں میں اشتراکی نظام قائم نہ ہو جائے، کسی ایک ملک میں اس کا قائم رہنا مشکل ہے۔ مگر پنڈت جی اور ان کے ہم خیال حضرات کی رائے یہ ہے کہ سر دست بین الاقوامی اشتراکیت کو رہنے دو۔ سب سے پہلے اپنے ملک میں ہم کو سیاسی آزادی حاصل کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم بین الاقوامی اشتراکیت کے لیے کچھ نہیں کر سکتے اور اپنے ملک میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ ہم "قوم پرستی" کا مسلک اختیار کریں۔

[۱] مطلب یہ ہے کہ پہلے ملک کی اکثریت کو اشتراکی خیال کا بنا لیا جائے، پھر جو لوگ اشتراکیت کے عقیدہ و مسلک کو قبول نہ کریں، ان کو زبردستی اشتراکی نظام کی اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔" (صفحہ ۴۵۵)

"سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑیگا۔ کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی لیکن اس کے بعد تھوڑے سے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہو گی۔"

(صفحہ ۷۰-۴۶۹)

یہ ہے وہ نقشہ جو ہندوستان کی نجات کے لیے اس کے سب سے بڑے لیڈر کے ذہن میں ہے۔ قومی حکومت (یعنی وہ حکومت جو مذہبی قومیتوں کو مٹا کر "قومی" بنائی جائے) آخری منزل مقصود نہیں ہے، بلکہ پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے بجائے معاشی عقائد کی تبلیغ کر کے ایک عظیم اکثریت کو ہم خیال بنایا جائے۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو اقلیت اس معاشی مذہب کی پیروی قبول نہ کرے اس کو ڈرا کر، دھمکا کر، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کر کے، وسیع پیمانہ پر اجتماعی ڈاکہ زنی کر کے نظام تمدن میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ پھر آخری مرحلہ یہ ہے کہ تھرڈ انٹرنیشنل کے اصول پر تمام دنیا میں کمیونزم کی اشاعت اور اس کے قیام کا بیڑا اٹھایا جائے جس طرح تھوڑی مدت قبل روس نے اٹھا رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان سے جس بین الاقوامی اشتراکیت کا علم بلند کیا جائے گا اس کی ٹکر سب سے پہلے اس بین الاقوامی نظام اجتماعی سے ہو گی جو ہندوستان کے ہمسایہ ممالک میں پھیلا ہوا ہے، یعنی اسلام۔

پنڈت جواہر لال سمجھتے ہیں کہ مسلمان بہادر ہیں، بھوکے ہیں، اور اس کے ساتھ

ڈیموکریسی (جمہوریت) کے اس تصور کو خوب سمجھ لیجیے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان کے اندر اشتراکیت کے عناصر پہلے سے موجود ہیں۔ لہذا ہندوؤں کی بہ نسبت وہ اشتراکی انقلاب کے لیے زیادہ اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ مزید برآں وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہی لوگ زیادہ کامیابی کے ساتھ لڑ سکیں گے جن کے نام اور لباس مسلمانوں کے سے ہوں۔ لہذا وہ اشتراکیت کی لاگ سے مسلمانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ارشاد ہوتا ہے :۔

> "میرے خیال میں عام مسلمان، عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں، اس لیے کہ ان کے نظام اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھائیں گے ۔" (صفحہ ۵۰۶)

ان الفاظ میں پنڈت جی نے اپنے اصل مقصد کو پوری طرح واضح کر دیا ہے لیکن انہیں خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کو قوم پرستی اور پھر بین الاقوامی اشتراکیت کے نظام میں جذب کرنا آسان کام نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو اسلامی قومیت کا تخیل اس راہ میں حائل ہے جس کی وجہ سے مسلمان، غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنانے اور اس میں جذب ہو جانے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔ پھر اسلامی تہذیب گویا تو مسلمانوں کی شیفتگی ایک دوسری رکاوٹ ہے۔ کیونکہ مسلمان اپنی تہذیب کو تمام تہذیبوں سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس کو کسی دوسری تہذیب سے بدل لینے پر آسانی کے ساتھ راضی نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد آخری اور اہم ترین روک یہ ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام (سوشل سسٹم) زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمان کسی دوسرے اجتماعی نظام کو اپنی زندگی کے کسی شعبے میں بھی اس وقت تک جگہ نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ خود اسلام سے منحرف نہ ہو جائیں۔ ان مشکلات کو اچھی طرح سمجھ کر پنڈت جی نے اپنا نقشہ جنگ بنایا ہے۔ ان کا پہلا حملہ اسلامی قومیت پر ہے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سرے سے کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ یہ محض برطانوی سامراج کا ایک داؤں اور چند سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈا ہے جس نے تمہارے دماغ میں یہ ہوا بھر دی ہے کہ تم ایک قوم ہو۔ حالانکہ سیاسی اور معاشی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نقطۂ نظر سے ہندوستان میں صرف " ہندوستانی قوم " ہی پائی جاتی ہے ، اور اس قوم کے اندر ایک دوسری قوم کا موجود ہونا سراسر ایک لغو تخیل ہے :-

" ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے ؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے منتشر ہے ، مبہم ہے اور غیر متعین ہے ۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دُور از کار ہے اور بدقت قابلِ توجہ کہا جاسکتا ہے[1] ۔" (صفحہ ۲۲۱)

---

[1] جب ہم دیکھتے ہیں کہ پنڈت جی اشتراکیت کے قائل ہیں اور مارکس کی تعلیم پر اعتقاد رکھتے ہیں ، اور اس کے باوجود اسلامی قومیت کیخلاف یہ طرزِ استدلال اختیار کر رہے ہیں ، تو ہمیں مجبوراً یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ پنڈت جی نے خود اپنے شخصی اعتقاد کیخلاف محض سیاسی طور پر یہ طرزِ استدلال اختیار فرمایا ہے ۔ مارکس کا نعرہ یہ تھا کہ " تمام دنیا کے مزدور ! ایک ہو جاؤ " اس کی تعلیم یہ تھی کہ اشتراکی خیال کا آدمی جہاں بھی ہے ایک اشتراکی جماعت سے تعلق رکھتا ہے ۔ جرمنی کا اشتراکی اٹلی کے اشتراکی کا کامریڈ (رفیق) ہے اور خود اپنے وطن بلکہ شہر بلکہ محلہ میں رہنے والے بورژوا سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ۔ اسی تخیل پر بین الاقوامی اشتراکیت کی بنا رکھی گئی ہے ۔ اشتراکی ہونے کی حیثیت سے پنڈت جواہرلال بھی اس تخیل پر اعتقاد رکھتے ہیں ۔ مگر اس کے باوجود اسلامی قومیت پر اعتراض کر رہے ہیں ، حالانکہ یہ قومیت بھی اسی اصول پر قائم ہوتی ہے کہ ایک عقیدے اور ایک مقصدِ زندگی اور ایک اصولِ اجتماعی کے قائل جہاں کہیں بھی ہوں ایک جماعت ہیں چاہے ان میں بعد المشرقین ہی کیوں نہ ہو اور اس کیخلاف مسلک رکھنے والا اگر ہم محلہ کیا معنی ـــــ ایک دیوار بیچ بھی رہتا ہو تو وہ بہرحال دوسری ہی جماعت کا آدمی ہے ۔ یہاں سے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ جو شخص اشتراکی جمعیت کو سمجھ سکتا ہے وہ اسلامی جمعیت کو نہیں سمجھ سکتا ۔ لامحالہ ہم یہی سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اسلامی قومیت کا وجود چونکہ پنڈت جی کے مقاصد میں حارج ہے اس لیے وہ قصداً ٹھیک اسی چیز پر اعتراض کر رہے ہیں جس کے اصول کی صداقت پر وہ اعتقاد رکھتے ہیں ۔ اور اعتراض کے لیے اُن دلائل سے کام لے رہے ہیں جن کی صداقت پر وہ دل سے اعتقاد نہیں رکھتے ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے
اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے
واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے
دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔" (صفحہ ۲۳۲)

اسلامی تہذیب کیا ہے؟

اس کے بعد وہ اسلامی تہذیب کی طرف بڑھتے ہیں اور مسلمانوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ حقیقت میں تمہاری کوئی خاص تہذیب ہی نہیں ہے:۔

"لیکن یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ کیا عربوں، ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں؟ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا بھی ذکر کرتا ہو[1]۔" (صفحہ ۲۳۲)

---

[1] تہذیب کے متعلق اس قسم کے خیالات آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیمات صوبہ متحدہ نے بھی اپنی حال کی ایک تقریر میں ظاہر فرمائے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے:۔

"مسلمانوں کی تہذیب کیا ہے؟ تہذیب مذہب میں شامل نہیں ہے۔ اس کا جلوہ شاعری، فن تعمیر، سنگ تراشی، مصوری اور موسیقی میں نظر آتا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کا مجسمہ تہذیب ہے۔ کیا ہندو اور مسلمان کی تہذیب کے درمیان ان چیزوں میں کوئی بین فرق ہے؟ زمانہ ماضی کے چند بہترین لوگوں کو لیجیے۔ وہ سب مسلمان ہیں لیکن راگوں کے نام کیا ہیں؟ یہ راگ اور راگنیاں سب سنسکرت نام ہیں۔ کیا کوئی ہندو ایسا ہے جو یہ کہنے کا حق رکھتا ہو کہ ہندوستانی گانے ہندو گاتے ہیں یا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستانی گانے مسلمان گاتے ہیں؟ ہندوستانی مصوری اور فن تعمیر کے شباب کا زمانہ عہد مغلیہ میں تھا۔ پھر اب کیوں ہم ہندو تہذیب اور مسلمان تہذیب کا ذکر کرتے ہیں؟"

(مدینہ، مورخہ ۲۱ اپریل ۳۸ء) (باقی صفحہ ۲۱۳ پر)

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز، مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان اور انہی کی طرح کے ہندو بھی فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہوئے ہیں۔ جب عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں۔ ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کو مونڈنا یا ترشوانا مگر ڈاڑھی کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دینا۔ اور ایک قسم کا ٹونٹی دار لوٹا۔ بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں، یعنی دھوتی باندھنا، سر پہ چوٹی رکھنا اور مسلمانوں کے لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا۔ یہ امتیازات بھی دراصل زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندو اور مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں مشکل ہی سے فرق کیا جا سکتا ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان شاید ہی ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ علی گڑھ والے البتہ سرخ ٹوپی کے گرویدہ ہیں (اس کا نام ترکی ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۲ سے) "ہم ایران کی مثال لیتے ہیں۔ ایران کا مذہب اسلام ہے اور عرب کا مذہب بھی اسلام ہے لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایران میں عربی تہذیب ہے"

(حوالہ مذکور)

ان خیالات کو جب ہم پڑھتے ہیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ یہ اگر سیاسی فریب کاری نہیں ہے تو سخت جہالت ہے۔ یہ لوگ اسلامی تہذیب ہی کو نہیں بلکہ نفس تہذیب کے مفہوم کو بھی نہیں جانتے اور پھر اس موضوع پر زبان کھولنے کی جرأت کرتے ہیں۔ میں اس سے پہلے اسلامی تہذیب کی کافی تشریح کر چکا ہوں اور آگے چل کر ان صفحات میں دوبارہ اس کی تشریح کروں گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلمان عورتیں ساری پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں[1]۔" (صفحہ ۲۲۵)

یہاں تک تو صرف یہ دعوٰی تھا کہ "اسلامی تہذیب" حقیقت میں کسی چیز کا نام ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد دوسرا پہلو اختیار کیا جاتا ہے اور یوں ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمان جس چیز کو اپنی تہذیب کہہ رہے ہیں وہ اب زندہ نہیں رہ سکتی۔ زمانے کے انقلابات اس کو مٹا دیتے ہیں، مٹا دیں گے اور خود مسلمان قومیں آج اس کو چھوڑ رہی ہیں:۔

"اب تو قومی تہذیبوں کا زمانہ بھی بہت تیزی سے گزر رہا ہے اور پوری دنیا ایک تہذیبی وحدت بنتی جا رہی ہے۔ اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔" (صفحہ ۲۲۱)

"اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہنچے ہیں اور ان کے بہت سے خیالات جن کی پرورش بڑی تمنا سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے مرد غازی اتاترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جس کے لیے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا، بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اس کو دور لیے جا رہے ہیں۔ مصر بھی اسی راستہ پر جا رہا ہے .... یہی حال عربی ممالک کا ہے سوائے ملک عرب کے جو بہت پیچھے ہے۔ ایران کی نظریں اپنے

---

[1] یہاں مسلمانوں کے اور ان قوم پرستوں کے مقاصد کا تضاد بالکل نمایاں ہے۔ ہم ان حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ غلامی کی وجہ سے ہمارا نیشنل ٹائپ مضمحل ہو رہا ہے اور ہمیں آزادی کی ضرورت اسی لیے ہے کہ حکومت خود اختیاری کے وسائل سے کام لے کر اپنے نیشنل ٹائپ کو مستحکم کریں۔ مگر یہ حضرات اسی امر واقعہ کو کہ ہمارا نیشنل ٹائپ اس قدر مضمحل ہو چکا ہے، اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ سرے سے ہمارا کوئی نیشنل ٹائپ ہے ہی نہیں، لہٰذا ہمیں اب اس نمونے کے مطابق ڈھلنے پر راضی ہو جانا چاہیے جو ان کے پیش نظر ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمدنی احیاء کے لیے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظاہر ہو رہی ہے لہ۔" (صفحہ ۳۳۶)

مطلب یہ ہے کہ مسلمانو! یہ تم کس چیز کو لیے بیٹھے ہو؟ جو چیز فنا ہو رہی ہے، جس کا فنا ہونا یقینی ہے جس کو سب مسلمان قومیں چھوڑ رہی ہیں اسے تم کیوں پکڑے ہوئے ہو؟ چھوڑ دو اسے، اور آؤ اس راستہ کی طرف جدھر ہم بلا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد پھر بھی دل میں تردد باقی رہتا ہے کہ یہ کم بخت مذہب پرست مسلمان، اپنی تہذیب اور قومیت پر جان دینے والے متعصب لوگ، اتنا سمجھانے پر بھی نہ مانیں گے لہٰذا ایک آخری حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسلمان کے دل میں انگریز اور اس کی غلامی سے جو نفرت ہے اسے مدد پر بلایا جاتا ہے اور اس سے یوں کام لیا جاتا ہے:۔

"ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تہذیب پر اور ہندو و مسلم تہذیبوں کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے، پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کر سکے۔" (صفحہ ۳۴۰)

"(مسلم قومیت کا ذکر کرنے کا) مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنی چاہیے یا بدیسی حکومت۔" (صفحہ ۳۴۱)

لہ اسلام کو پس پشت ڈالنے بلکہ بزعم خود فنا پذیر دیکھ کر اس قوم پرست لیڈر کے قلب میں جو انشراح و انبساط کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے، اس کو غور سے ملاحظہ کیجیے۔ یہ پنڈت جی اپنی بے تعصبی کا سکہ جمانے کی بہت کوشش کرتے ہیں، مگر دل میں اسلام کے لیے جو عناد اور دشمنی کا جذبہ بھرا ہوا ہے وہ کسی طرح چھپائے نہیں چھپ سکتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"ہاں اب مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا ہوگا ؟ کیا یہ دونوں آئندہ صرف شمالی ہند میں برطانیہ کی شفیق حکومت کے تحت پھلتی پھولتی رہیں گی ؟" (صفحہ ۲۲۷)

یہاں پہنچ کر ہندوستان کے "قومی" لیڈر نے اپنی سیاست دانی کے جوہر پوری طرح نمایاں کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت صرف سرکار برطانیہ ہی کے سہارے جی سکتی ہے۔ لہذا جو لوگ ان دونوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں وہ سب ٹوڈی اور سرکار پرست ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ بدیسی حکومت یہاں ہمیشہ قائم رہے۔ اب اگر اس ملعون سامراج سے نجات چاہتے ہو، اگر آزادی کی خواہش ہے تو اس قومیت اور تہذیب کے تحفظ کا نام لینا چھوڑ دو۔ ورنہ جو کوئی یہ نام لیگا، ٹوڈی قرار دیا جائے گا ——— یہ آخری ضرب بڑی کاری ضرب ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے حریت پسندوں کو یہی ضرب "آزادی کی فوج" میں کھینچ لے گئی ہے اور بہت سے اُن لوگوں کی زبانوں پر اس نے مہر لگا دی ہے جو حریت پسند کہلانا چاہتے ہیں اور ٹوڈیت کے گھناؤنے خطاب سے بچنا چاہتے ہیں۔

نیا حربہ

قومیت اور تہذیب کی خبر لینے کے بعد پنڈت جی اسلام کے نظامِ اجتماعی کی طرف بڑھتے ہیں تاکہ اس کو درہم برہم کر کے جمہور مسلمین کو جدید ہندوستانی قومیت میں جذب کر لیا جائے۔

پنڈت جی کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے ہوش مند لوگ جو اسلام سے واقف ہیں، جن میں اپنی قومیت کا شعور پوری طرح موجود ہے، جو اپنی قومی تہذیب کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، وہ تو قیامت تک اس پوزیشن کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔ ان کے لیے قطعی ناممکن ہے کہ اسلامی قومیت کو چھوڑ کر ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو ضم کر دیں، اور ان کو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ اس تہذیب کو خیر باد کہہ دیں جسے وہ اس گئی گذری حالت میں بھی اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قومیت کو چھوڑنا، تہذیب سے دست بردار ہونا، جدید ہندی قومیت اور اشتراکی تہذیب و تمدن میں جذب ہو جانا یہ تو بہت دُور کی چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کے اس گروہ سے تو اُلٹا یہ خطرہ ہے کہ ہندوستان کے آزاد نظام حکومت میں وہ اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کرے گا، اور اِس غرض کے لیے حکومت کے اقتدار میں برابر کی شرکت حاصل کرنا چاہے گا۔

اِس خطرے کو اچھی طرح محسوس کر کے پنڈت جی نے یہ تدبیر نکالی ہے کہ مسلمانوں کی قومی جمعیتوں سے اب خطاب ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کے افراد تک براہِ راست پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ افراد چونکہ منتشر ہیں، مفلس ہیں، اسلام اور اس کی تہذیب کے اصولوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اسلامی نظام اجتماعی کا شیرازہ درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ان کا شعورِ اسلامیت بڑی حد تک مضمحل ہو چکا ہے، اس لیے ان کو بآسانی توڑ لیا جا سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ مسلمانوں کا "بورژوا" طبقہ ——— اشتراکی زبان میں قوم کے اہل دماغ اور متوسط طبقوں کا یہی نام ہے ——— بیدار ہو کر اپنی قوم کو سنبھالنے کی فکر کرے، قوم کو اس کے قابو سے نکال لیا جائے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کی "شدھی" کر لی جائے۔

یہی حقیقت ہے اس پالیسی کی جس کو مسلم عوام کے ساتھ ربط قائم کرنے (Muslim Mass Contact) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پنڈت جی نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں اس پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی تھی:-

"ہم نے عام لوگوں سے نگاہ ہٹا کر مدتوں فرقہ وارانہ لیڈروں کی باہمی مصالحت اور گفت و شنید میں وقت گنوایا ہے۔ یہ طریقہ نکما ہے اور میں چاہتا ہوں کہ دوبارہ ادھر نگاہ بھی نہ ڈالیں۔ ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جا رہی ہے اور اس لحاظ سے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب ملتوں کا بھلا اسی میں ہے کہ اپنی بے کاری اور غریبی کو سامنے رکھ کر سب مل کر قومی آزادی کے لیے آگے بڑھیں۔ جب کبھی ہم اُوپر کے لوگوں سے مُنہ موڑ کر عام لوگوں کی طرف نگاہ ڈالیں گے تو ہمیں ان معاشی مصیبتوں کا حل تلاش کرنا پڑے گا، جو سوال ایک زمانہ سے فرقہ وارانہ مسئلہ بن گیا ہے اس کا صحیح حل یہی ہے۔"

کیسے معصوم کیسے بے ضرر ہیں یہ الفاظ! مگر کتنے زہریلے ہیں! اس سے پہلے جو تصریحات خود پنڈت جی کی زبان سے میں نقل کر چکا ہوں ان کو سامنے رکھ کر جب آپ اس نئی پالیسی کو دیکھیں گے تو صاف نظر آجائے گا کہ یہ دراصل شدھی کی تحریک ہے ایک دوسری شکل میں۔ یہ مذہبی شدھی نہیں، سیاسی اور معاشی شدھی ہے اور اس کا نتیجہ عملاً وہی ہے جو مذہبی شدھی کا تھا فرق صرف یہ ہے کہ وہ کھلی ہوئی تحریک ارتداد تھی جس پر مسلمانوں کے جاہل اور عالم سب چوکنے ہوگئے تھے اور یہ ایسی خفی تحریک ارتداد ہے کہ بڑے بڑے ثقہ علماء تک اس کی کنہ کو پہنچنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں۔ اُس تحریک کے بانیوں نے پھوہڑ پن سے کام لیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اپنی قومیت اور اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو قومیت اور مذہب میں آجاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں کوئی کودن سے کودن آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اس پر بھڑک نہ اٹھا ہو۔ بخلاف اس کے اس تحریک کا بانی ایک ہوشیار شخص ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تم کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ تمہاری کوئی تہذیب ہی نہیں ہے علیحدہ کسی چیز کے چھوڑنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ دراصل تم ایک قوم یعنی "ہندوستانی قوم" کے فرد ہو مگر سامراج

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ایجنٹوں نے تم کو اس قوم سے جُدا کر رکھا ہے۔ آؤ اپنی قوم میں مِل جاؤ۔ آزادی حاصل کرو۔ اور اشتراکی تہذیب کے قائم کرنے میں حصّہ لو جس میں تم کو خوب بوٹیاں ملیں گی ——— ہے یہ بھی زہر ہی کا گھونٹ، مگر دیکھیے کیسے ہوش گوش کے لوگ اسے شیرِ مادر سمجھ کر نوش فرما رہے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۱۱

آزادی کی فوج کے مسلمان سپاہی

پنڈت جواہر لال کے جو خیالات گزشتہ صفحات میں پیش کیے گئے ہیں ان کو بعض ایک شخص کے ذاتی خیالات سمجھ کر سرسری طور پر نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے۔ اوّل تو یہ اس شخص کے خیالات ہیں جو گاندھی جی کے بعد کانگریس میں سب سے زیادہ با اثر ہے اور دو مرتبہ کانگریس کا صدر رہ چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ جواہر لال کے بعد انہی کے ہم خیال بلکہ ان سے زیادہ سخت خیالات رکھنے والے شخص، سوباش چندر بوس کا صدر منتخب ہونا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ کانگریس پر ان خیالات کا پورا غلبہ ہے۔ ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اب یہ خیالات لیڈروں کے ذاتی خیالات نہیں رہے ہیں بلکہ درحقیقت کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ کانگریس نے مارچ ۳۷ء کے بعد جمہور مسلمین کے ساتھ ربط قائم کرنے کی جو تحریک (Muslim Mass Contact) کے نام سے شروع کی ہے وہ ٹھیک انہی راستوں پر چل رہی ہے جو پنڈت جی نے تجویز کیے ہیں۔ پورا غیر مسلم پریس جو کانگریس کے زیر اثر ہے مسلمانوں میں اسلامی قومیت اور اسلامی تہذیب کے خلاف بغاوت پھیلانے میں لگا ہوا ہے۔ جس گوشے سے اس بغاوت کا کوئی اثر ظاہر ہوتا ہے، اس کا بڑے جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے اور ہر اس آواز کو جو اسلامی شعور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے تحت کسی مسلمان کی زبان سے بلند ہوتی ہے۔ "فرقہ پرستی" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کس کر دبا دیا جاتا ہے۔

اس طرزِ عمل کی توضیح کے لیے میں صرف دو مثالیں پیش کروں گا جن سے اس تحریک کے رجحانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پچھلے سال لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مسلمان نژاد طالب علم نے برملا اعلان کیا تھا کہ میں مسلمان نہیں ہوں۔ مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جو شخص خود اسلام سے منکر ہے وہ کسی انتخاب میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے امیدوار بننے کا حق دار کیسے ہو سکتا ہے۔

اس واقعہ پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے ایک کانگریسی اخبار (ہندوستان ٹائمز) لکھتا ہے:۔

"اگر ووٹروں کی فہرست میں نام درج ہونے اور انتخابات کے لیے بحیثیت امیدوار کھڑے ہونے سے پہلے لوگوں کے عقائد کی تحقیقات شروع ہو گئی تو ہمارا موجودہ انتشار و اختلال اور زیادہ پریشان کن ہو جائے گا۔ اس سے تو یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ ہمارا یہ سارا انتخابی نظام جس کو ہمارے آقاؤں نے اس قدر کامل غور و فکر کے بعد مرتب کیا ہے، اس وقت بے کار ہو کر رہ جائے گا جب کہ لوگ صرف ہندو یا مسلمان نہ رہیں گے بلکہ فرداً فرداً اپنے مخصوص عقائد اور شبہات پیدا کریں گے۔ مسٹر نقوی کو مستقبل کے لیے ایک فالِ نیک سمجھنا چاہیے اور کیا خبر کہ وہ آنے والی صبح صادق کے ایک پیغمبر ہوں۔"

آگے چل کر اس مضمون میں انگلستان کے ان ملاحدہ کو مثالاً پیش کیا گیا ہے، جنھوں نے حریتِ فکر کا علم بلند کیا تھا اور اپنی مذہب پرست قوم کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائی تھیں، مثلاً چارلس بریڈلا، مارلے اور رابرٹ انگرسول پھر اسلام سے بغاوت کرنے والے اس نوجوان کو ان "بہادروں" کی صف میں جگہ دے کر اس کی ہمت و جرأت پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے ہیں۔

ایک دوسرا کانگریسی اخبار (تیج) اپنی ۱۶ اگست ۳۷ء کی اشاعت میں ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلمان عورت کا خط شائع کرتا ہے جس کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں :-

"جب میرٹھ میں پرجیہ پنڈت جواہر لال نہرو تشریف لائے تو میں اپنے خاوند سے چھپ کر جلسہ دیکھنے گئی۔ اس وقت سے میرا دل بے چین رہنے لگا۔ میں نے اپنے مکان پر قومی جھنڈا لگا دیا۔ لیکن جب میرے خاوند نے اسے پھاڑ ڈالا تو میں نے سارا دن نہ کھانا کھایا اور نہ رات کو سوئی بلکہ تمام رات اور دن برابر روتی رہی۔ جب میرے خاوند نے میرے پیارے پنڈت جواہر لال کو گالیاں دینی شروع کیں تو میں نے کہا اگر ان کی شان میں کچھ کہا تو جان کھو دوں گی۔ چنانچہ میں اسی دن سے لڑ کر اپنے باپ کے گھر چلی آئی ہوں۔ اب جب تک میرا خاوند معافی نہ مانگے گا، اپنے مکان پر کانگریس کا جھنڈا نہ لگائے گا، اور کانگریس کا ممبر نہ بنے گا میں اس کی شکل بھی نہ دیکھوں گی۔

ایڈیٹر صاحب! میں نے پچاس مسلمان عورتیں تیار کر رکھی ہیں جو پردے کو چھوڑ کر ہر وقت کانگریس کا کام کرنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارے گھر والے ہم کو تنگ کرتے ہیں۔ اب آپ بتائیں میں کیا کروں؟ اور ہمارے پرجیہ پنڈت جواہر لال سے کہیے کہ ہم مسلمان عورتیں کیا کریں؟"

بہت ممکن ہے کہ یہ خط فی الواقع کسی مسلمان عورت کا لکھا ہوا نہ ہو، اور محض ایک جعل ہو۔ لیکن اگر یہ جعل ہے تو یہ اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ "لشکرِ آزادی" کے ان نقیبوں کے مافی الضمیر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "قوم پرستی" کے یہ علمبردار مسلمان مردوں اور عورتوں کو کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔ "آزادی کی فوج" کے لیے کس قسم کے سپاہی ان کو مسلمانوں میں درکار ہیں۔ اور کم از کم کس حد تک اصولِ اسلام سے منحرف ہو نا ضروری ہے جس کے بعد وہ کسی مسلمان کو "قوم پرست" تسلیم کر سکتے ہیں۔

یہ بغاوت صرف غیر مسلموں ہی کی زبان و قلم کے ذریعہ سے نہیں پھیلائی جا رہی ہے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بلکہ خود مسلمان بھی اس کی اشاعت کے لیے آلۂ کار بناتے جا رہے ہیں۔ مسلمان لیڈر، مسلمان اہلِ قلم اور مسلمان رسائل و جرائد اُنہی تمام خیالات کو مسلمانوں میں پھیلانے کا وسیلہ بن گئے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے آپ سُن چکے ہیں۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو بہکانے کے لیے غیر مسلموں کی بہ نسبت خود مسلمان زیادہ کارگر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو جتنی مثالوں کی ضرورت ہو میں پیش کر سکتا ہوں۔ مگر یہاں صرف اُن حضرات کی تحریروں سے استناد کروں گا، جو کانگریس میں کوئی نہ کوئی "سرکاری" ذمّہ دار حیثیت رکھتے ہیں۔

بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود صاحب، جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری رہ چکے ہیں، اور اس وقت صوبہ بہار کی وزارت میں واحد مسلمان وزیر ہیں، اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:۔

> "مختصر یہ کہ اخلاقی، سیاسی اور دوسرے تمام حکیمانہ تصورات کو قطعیت اور عملیت کا جامہ پہنا کر مسلمانوں کے تخیل کو عمل کا آئینہ بنا دیا۔ بعض نے اپنے ولولہ و جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرینش کے پیشِ نظر ایک ایسے جدید نظامِ مذہبی کی نشو و نما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں (جو اجنبی تھے)، لیکن انہوں نے جلد ہی اپنی قسمتوں کو اہلِ ملک کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وابستہ کر لیا۔"
>
> (جامعہ۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

آپ سمجھے کہ یہ "جدید نظامِ مذہبی" کا اشارہ کس چیز کی طرف ہے؟ یہ اشارہ اکبر کے دینِ الٰہی کی طرف ہے۔ کتنا مختصر اشارہ ہے، مگر "قوم پرست مسلمان" ———— مجموعۂ ضدین ———— کی معراجِ تخیل کو کتنی صاف روشنی میں پیش کرتا ہے۔ اکبر کا دور اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلا دور ہے، جس میں سیاسی اغراض پر مذہب کو قربان کرنے کی ابتدا ہوئی۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے "تذکرہ" میں اس نامبارک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دور کے جو حالات بیان فرماتے ہیں ان کو پڑھیئے تو آپ کو اس کی فتنہ سامانیوں کا اندازہ ہو گا۔ یہ پہلا فتنہ عظیم تھا جس نے پوری طاقت کے ساتھ الحاد و بے دینی پھیلا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو وطنی قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی۔ اس دور کے تمام صلحاء امت اس فتنے پر چیخ اُٹھے تھے حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کیخلاف علم جہاد بلند کیا تھا۔ اسی ناپاک دور کے اثرات تھے جنہوں نے دارا شکوہ کی صورت میں جنم لیا۔ اسی زہر کو دور کرنے کے لیے عالمگیر پچاس برس جدوجہد کرتا رہا۔ اور یہی زہر آخر کار مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو گھن کی طرح کھا گیا۔ مسلمانوں میں قوم پرستی کی جدید تحریک دراصل اسی پرانی تحریک کی نشأۃ ثانیہ ہے۔ لہذا یہ لوگ اس فتنہ عظیم کو فتنے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "خیر القرون" کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور وسوسہ (Inspiration) حاصل کرنے کے لیے اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک متحدہ قومیت کی آفرینش کا یہ پہلا تجربہ ہندوستانی مسلمان کی "خدمات" میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ ان کے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا تصور یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی قسمتوں کو اسی طرح اہل ملک کے ساتھ ہمیشہ کے لیے وابستہ کرلیں۔ پنڈت جواہر لال بھی اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب اپنے اس مضمون میں فرماتے ہیں:۔

"سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں آخر ہمارا نصب العین اور مقصد کیا ہے؟ کیا ہم اس سمت میں قدم اُٹھانے کو آمادہ ہیں کہ ایک مشترک قومیت کی مع تمام لوازم کے تشکیل کریں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان صرف ایک جغرافیائی نام ہے جس میں ایک سے زیادہ "اقوام" بستی ہیں۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر "قوم" علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند (Common Wealth) میں صرف انسانی اور مادی امداد کیا کرے؟ اگر مسئلہ ہند کا یہی حل ہے تو ہماری اس وقت کی کوششیں اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برعکس بالکل ناکام رہی ہیں ......

لیکن اگر ہمارے سوال کا جواب اثبات میں ہے اور ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی راہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور دوسرے از منہ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنا دی تھی تب تو ہمیں عزم و استقلال کے ساتھ ہمیشہ نہ صرف اسی راہ پر چلنا چاہیئے بلکہ ہمارے پیشوں اور رسوم میں بھی یکسانیت ہونی چاہیئے بعض کے نزدیک تو اس حل میں بھی مسلم اقلیت کے لیے ایک مضرت ہے۔ لیکن اس کا کوئی چارۂ کار نہیں۔ اب چونکہ کوئی تیسرا حل موجود نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کو ملک کی خاطر اور اپنی خاطر اسے قبول کرنا چاہیئے۔"

یہاں مافی الضمیر بالکل واضح ہو گیا۔ صوبہ بہار کے چالیس لاکھ مسلمانوں کی قسمتیں جس شخص کے ساتھ وابستہ ہیں، جسے بہار کی وزارت میں ہماری آئندہ نسلوں کی تعلیم کا نگراں بنایا گیا ہے، وہ سرے سے اِس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی کوئی مستقل "قومیت" باقی رہے اور آزاد ہندوستان میں ان کو ایک ممتاز اجتماعی وجود کی حیثیت سے اپنے مسائل خود حل کرنے کا موقع حاصل ہو۔ اس کا نصب العین ہمارے نصب العین سے بالکل مختلف اور جواہر لال نہرو کے نصب العین سے بالکل متحد ہے۔ ہم آزادی اس لیے چاہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو برس کے غیر مسلم اقتدار نے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کر سکیں۔ اور وہ آزادی اس لیے چاہتا ہے کہ اب تک جو نقصان ہمیں پہنچا ہے، آگے چل کر وہ اپنے طبعی نتیجہ کو پہنچ جائے یعنی ہماری مضمحل شدہ قومیت ہندستان کی مشترک قومیت میں جذب ہو جائے، ہماری تہذیب کی کوئی امتیازی شان باقی نہ رہے، ہمارے مختلف پیشوں کے لوگ اپنے اپنے ہم پیشہ غیر مسلموں کے ساتھ گھل مل جائیں اور ان کے درمیان پیشوں کے ساتھ "رسوم میں بھی یکسانیت" پیدا ہو جائے ہندوستان کی مختلف قوموں کے لیے لفظ "اقوام" کا استعمال ہی فاضل ڈاکٹر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ وہ ہندوستان کو ایک جغرافیائی نام نہیں، بلکہ ایک قومی وحدت بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسئلہ ہند کا یہ حل بالکل غلط ہے کہ ہر "قوم علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولتِ ہند میں صرف انسانی اور مادی امداد کرے" برعکس اس کے صحیح حل یہ ہے کہ "مسلمان اُسی راستہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور ازمنۂ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنادی تھی" یعنی ہندوستان کی کان نمک میں نمک بننے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور یہ سب کچھ مسلمانوں کو کیوں کرنا چاہیے؟ خدا اور رسول کی خاطر نہیں، بلکہ ملک کی خاطر اور اپنی خاطر۔ غالباً یہاں "اپنے پیٹ کی خاطر" لکھنے میں ڈاکٹر صاحب کو شرم محسوس ہوتی ہوگی۔ ایں ہم غنیمت است!

کیا جواہر لال نہرو کا تصورِ قومیت اس سے کچھ بھی مختلف ہے!

مسلمانوں کو اپنے نام "مسلم" پر بڑا فخر ہے۔ خدا کا رکھا ہوا نام، اور وہ نام جس سے بڑھ کر عزت و افتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا، مگر ڈاکٹر سیّد محمود صاحب کے نزدیک اس علیحدہ نام سے مسلمانوں کا موسوم ہونا قابلِ اعتراض ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اور اس قسم کے دوسرے تمام اسماء ان کے نزدیک محو ہو جانے چاہئیں اور صرف ایک نام "ہندی" تمام باشندگانِ ہند کے لیے استعمال ہونا چاہیے تاکہ جداگانہ قومیتوں کا احساس باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں:-

"ہندی" کو زبان کے لیے نہیں بلکہ "اہلِ ہند" کے لیے اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ بات ثابت کر دیتا ہے کہ "ہم اس برِاعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں" اسی لیے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترکہ نام اختیار کریں۔"

"ہم علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں" یہ گویا ہمارے دامن پر ایک شرمناک دھبا ہے جسے مٹا دینے کی ضرورت ہے! وہ دماغی کیفیت ہی لائقِ صد شرم و ندامت ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس کے تحت دنیا کے اس اکیلے ملک ہندوستان دوزخ نشان کے باشندے مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں یا یہ ثابت ہو جاتا کہ ہم دَورِ وحشت کی یادگار ہیں اور اس تلخ حقیقت کو شیرینی یا کم از کم فریب شیرینی سے بدل دینے کے لیے اب ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم ان ناموں کو بدل ڈالیں جو علیحدہ مذہبی اقوام ہونے کے احساس کو زندہ رکھتے ہیں۔"

یہ ہیں اس زعیم قوم کے خیالات جس کو مولانا ابوالکلام آزاد نے صوبہ بہار کی وزارت میں ۴۰ لاکھ مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے منتخب فرمایا ہے لے

یہ تو صرف ایک نظیر تھی۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ بس ایک ہی نظیر ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حال ہی میں ایک مستقل شعبہ اسلامیات قائم کیا ہے، جس کے کارکن مسلمان ہیں اور نشر و اشاعت کے آلۂ کار سب کے سب مسلمان اخبارات ہیں۔ مسلمانوں کے لیے کانگریس نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کی فہرست میں اس شعبۂ اسلامیات کے قیام کو بھی ایک نمایاں جگہ دی جاتی ہے۔ چنانچہ جمعیت علمائے ہند کا واحد ترجمان "الجمعیت" اس خدمتِ جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"دَورِ جدید میں مسلمانوں نے شکایت کی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اسلامی جرائد نے اس شکایت کو پیش کیا، پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی معقولیت کو تسلیم کیا۔ اور محض مسلمانوں کی دل دہی اور سہولتِ کار کے لیے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ماتحت اسلامیات کا ایک مستقل شعبہ کھول دیا۔"

(الجمعیت مورخہ ۵ رمضان ۵۶ھ)

لے اس موقع پر مولانا ابوالکلام کے "تذکرہ" میں ان علماء و مشائخ کے حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ جنہوں نے دَورِ اکبری میں سیاسی اغراض پر دین کی قربانی چڑھانے والوں کیساتھ مداہنت برتی تھی۔ ان لوگوں کے متعلق مولانا نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ انشاء اللہ ازدیادِ بصیرت کے موجب ہوں گے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بے چارے ناواقف عوام جب ان الفاظ کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ کیسی مہربان ہے یہ کانگریس۔ اس نے آج تک کوئی شعبہ ہندویات و سکھیات و پارسیات نہیں کھولا۔ مگر ہماری "دلدہی" اس کو یہاں تک منظور رہے کہ خاص ہمارے لیے ایک شعبۂ اسلامیات کھول دیا۔ اب ذرا اس شعبہ کی کارگزاری ملاحظہ ہو۔

ڈاکٹر محمد اشرف صاحب (معتمد شعبۂ اسلامیات) کا ایک مضمون الجمعیت ہی میں ۱۸ رجب ۵۶ھ کی اشاعت میں درج ہوا ہے، اور ادارہ کی جانب سے اس پر کوئی تردیدی نوٹ یا اختلافی اشارہ تک نہیں ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان میں سیاسی یا اقتصادی حالات اس درجہ ترقی کر گئے ہیں اور فضا کا تقاضا اس درجہ شدید انقلاب انگیز ہے کہ رجعت پسندوں اور سامراج پرستوں کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ علانیہ کانگریس یا آزادی کی جدوجہد کی مخالفت کریں اس لیے ملک کو پیچھے لے جانے والی طاقتیں اور سامراج کی حامی جماعتیں کسی تعصب کی آڑ لیتی ہیں۔ گزشتہ سات آٹھ سال میں جب کبھی سیاسی یا سماجی ترقی کے لیے قدم بڑھایا گیا، ہندو مسلم سوال ضرور چھیڑ دیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ابتدائی تعلیم کے متعلق کانگریسیوں نے صوبۂ متحدہ کی کونسل میں ایک زمانہ میں سوال چھیڑا، تو رجعت پسند مسلمانوں نے فوراً مذہبی تعلیم و تربیت کا سوال شروع کر دیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور دوسرے لوگ اس موقع پر کونسل چھوڑ کر چل دیے۔ ساردا ایکٹ کے خلاف ہندو اور مسلمان قدامت پسندوں نے جو ہنگامہ کیا وہ سب کو معلوم ہے۔ ترقی پسندی کی طرح رجعت پسندی بھی ہماری پبلک زندگی کے ہر پہلو پر محاذ قائم کرنا چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بوسیدہ خود فنا نہیں ہوتا۔ بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدوجہد کے بعد اسے معزول کر دیتی ہیں۔"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غور فرمائیے مسلمان بچوں کے لیے تعلیم کی اسکیم میں مذہبی تعلیم و تربیت کا مطالبہ کرنا رجعت پسندی ہے۔ سامراج کی حمایت ہے ۔ ملک کو پیچھے لیجانے والی طاقتوں کا کام ہے۔ فضا کا انقلاب انگیز تقاضا اب یہ ہے کہ اس "بوسیدہ" چیز کو بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جدوجہد کے بعد معزول کر دیں۔

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب یہ بحث شروع کرتے ہیں کہ کانگریس کی شرکت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تہذیب اور روایات کا سوال جو اٹھایا جا رہا ہے، یہ درحاصل ترقی پسند اور انحطاط پذیر قوتوں کی کشمکش کا ایک عکس ہے ——— "ترقی پسند" اور "انحطاط پذیر" ان دو اصطلاحوں کا مفہوم پنڈت جواہر لال اور ان کے "شعبۂ اسلامیات" کی لغت میں جو کچھ ہے اس کی تشریح میں بعد میں عرض کروں گا، یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "ترقی پسند" قوتیں اسلامی تہذیب کے سوال کو کس نظر سے دیکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:-

> "یہ صحیح ہے کہ مسلمان ایک مخصوص تہذیب کے حامل رہے ہیں۔ باوجود اختلافات اور تنوع کے ان میں ایک قسم کی یگانگت اور یکسانیت پائی گئی ہے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مسلمانوں کی زبان ایک تھی یا تمدن کے مظاہر ایک سے تھے، لیکن تاریخی طور پر کسی حد تک یہ صحیح ہے کہ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات ایک سمت کی طرف دکھائی پڑتے ہیں جو لوگ اسلامی تہذیب پر بحث کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس تمدن اور تہذیب نے ایک خاص ماحول میں تربیت پائی تھی اور بہر صورت مسلمانوں کی حکمران حیثیت سے وابستہ تھی۔ جو لوگ بے صبری کے ساتھ اسلامی تہذیب کی خصوصیات گناتے وقت یہ حدیث سناتے ہیں کہ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ، وہ اکثر یہ واقعہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حدیث یا اس قسم کے دوسرے اقوال اس زمانہ کے ... حالات کا عکس ہیں جب انسانوں کی تقسیم حاکم اور محکوم ... راعی اور ... میں ہوتی تھی اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلمان من حیث القوم حکمران تھے ۔۔۔۔۔۔۔۔ البتہ اسلامی تمدّن اور تہذیب کا مفہوم اس درجہ محدود نہ تھا جیسا کہ آج کل ہو گیا ہے۔ آج اسلامی تہذیب کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اگر مسلمان بجائے کلاہ اور عمامہ کے گاندھی ٹوپی پہننے لگتے ہیں یا ہندی رسم الخط کے پرچار کے لیے دو چار ہندو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک خاص قسم کا لباس اگر نہ پہنیے یا اگر فصیح و بلیغ اردو نہ بولیے تو آپ کو تمدنی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی مسلمان رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معیاری اور ٹکسالی مسلمان صرف وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو دہلی اور لکھنؤ کی فضا میں پلے اور بڑھے ہیں۔ (چاہے وہ کائستھ اور کشمیری برہمن ہی کیوں نہ ہوں) یا پھر دیوبند اور فرنگی محل کا لباس پہننے والے علماء کی وضع کے پابند لوگ۔"

دیکھیے "ترقی پسندوں" کے علم و فضل اور ان کی دانش و بینش کا معیار کس قدر بلند ہے۔ ان کے ارشادات جب ہم پڑھتے ہیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی آواز کو ایک ریکارڈ میں بھر دیا ہے اور وہی ریکارڈ جگہ جگہ بجتا پھر رہا ہے۔ اپنے شیخ طریقت پنڈت جواہر لال کی طرح یہ لوگ بھی اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلہ پر اظہار خیال کر کے درحقیقت اپنی بے علمی کا راز فاش کرتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نابلد نہیں ہیں، بلکہ نفس تہذیب و تمدن کے مفہوم سے ناآشنا ہیں ــــــــ یا اگر ناآشنا نہیں ہیں تو عمداً غلط بحث کر کے مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

؎ جہالت ملاحظہ ہو۔ جو حیثیت انسان کی انفرادی ذمہ داری و مسئولیت کا عظیم الشان اخلاقی تصور پیش کر رہی ہے، اس کی معنویت کو کس بری طرح خاک میں ملایا گیا ہے۔ پھر اس علم اور اس فہم پر جسارت کا یہ حال ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق ماہرانہ گفتگو فرمائی جاتی ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ تہذیب نام رکھتے ہیں تمدنی مظاہر کا، حکمران طبقے کے آداب واطوار کا، لباس کی وضعوں اور کھانوں اور مٹھائیوں کا، موسیقی اور سنگتراشی اور مصوری کا، اور اظہار مافی الضمیر کے وسائل کا۔ پھر ان تمدنی مظاہر میں گردش ایام کے ساتھ جو تغیرات رونما ہوتے ہیں ان میں یہ اس حیثیت سے کوئی امتیاز نہیں کرتے کہ کون سے تغیرات ایک تہذیب کے زیر اثر ہوئے اور کون سے دوسری تہذیب کے زیر اثر۔ بس سطح پر چند تغیرات دیکھ کر یہ اپنی تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو تاریخ کے دوران میں تمہارا تمدن بار بار بدل چکا ہے۔ اور جب تمدن بدلا ہے تو گویا تہذیب بدل گئی ہے۔ لہذا اسلامی تہذیب و تمدن کسی متعین حقیقت کا نام نہیں ہے۔ جس طرح پہلے تم بہت سے تغیرات قبول کر چکے ہو اسی طرح اب بھی ان تغیرات کو قبول کرنے کے لیے تیار رہو جو جن کا تقاضا، فضل کے انقلاب انگیز حالات یا بالفاظ دیگر جواہر لال اور ان کی امت کے رجحانات کر رہے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ علانیہ ایسی صریح جاہلانہ باتیں لکھنے اور شائع کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سارا ہندوستان بس جہلا ہی سے آباد ہے اور یہاں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں رہتا؟

اگرچہ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے مگر میں عام ناظرین کی واقفیت کے لیے بطور جملہ معترضہ صرف اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ دراصل تہذیب اس طریق فکر، اس نظریۂ حیات اور اس معیار امتیاز و انتخاب کا نام ہے جو انسانوں کی کسی معتد بہ جماعت کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اس کے زیر اثر وہ جماعت دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقے کو اختیار کرتی ہے۔ اور تمدن اس خاص طرز زندگی کا نام ہے جو اسی تہذیب کے زیر اثر اختیار کیا جائے۔ ہم جس چیز کو اسلامی تہذیب کہتے ہیں وہ لکھنؤ اور دلی کی فصیح و بلیغ اردو اور دیوبند و فرنگی محل کے علماء کا لباس نہیں ہے، بلکہ وہ اس ذہنیت، اس طرز خیال اور ان اصول حیات پر مشتمل ہے جو قرآن اور سیرت رسول سے ماخوذ ہیں۔ جب تک کوئی تمدن اس تہذیب کے حدود کے اندر

ہے، وہ اسلامی تمدن ہے، خواہ اس کی زبان، اس کے لٹریچر، اس کے آداب و اطوار، اس کے کھانوں اور مٹھائیوں، اس کے لباس و طرزِ معاشرت، اس کے فنونِ لطیفہ میں کتنے ہی تغیرات واقع ہو جائیں۔ مظاہر کا تغیر بجائے خود کسی تمدن کو اسلامی تہذیب کے دائرے سے خارج نہیں کر دیتا۔ البتہ جب وہ اس نوعیت کا تغیر ہو کہ اسلامی تہذیب کے اصول و قواعد میں اس کے لیے کوئی سندِ جواز نہ ہو، تو یقیناً وہ تمدن کو غیر اسلامی تمدن بنانے کا موجب ہوگا۔ مثال کے طور پر مسلمان مشرق سے لے کر مغرب تک بیسیوں طرح کے لباس پہنتے ہیں، مگر ان سب میں ستر عورت کے انہی حدود کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اسلامی تہذیب نے مقرر کر دیے ہیں لہٰذا یہ سب اپنے تنوعات کے باوجود اسلامی تمدن ہی کے لباس کہے جائیں گے۔ مگر جب کوئی لباس ان حدود سے قاصر ہوگا تو ہم اسے غیر اسلامی لباس کہیں گے۔ اسی طرح غذا کے متعلق حلال و حرام کے حدود اسلامی تہذیب نے مقرر کیے ہیں، ان کے تحت خواہ کتنی ہی انواع و اقسام کے کھانے مسلمانوں کے گھروں میں پکتے ہوں اور تاریخ کے دوران میں ان کی نوعیتیں کتنی ہی بدل جائیں اور کھانے کے طریقوں میں کتنا ہی تغیر رونما ہو جائے، ان سب کو اسلامی تمدن ہی کے دائرے میں جگہ ملے گی۔ البتہ جب مسلمانوں کی غذا حدودِ حلت سے متجاوز ہوگی تو ہم کہیں گے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اسی پر زندگی کے تمام معاملات کو قیاس کر لیجیے۔ عرب، ہندوستان، ایران، ترکستان اور شمالی افریقہ کے تمدنوں میں بظاہر خواہ کتنا ہی فرق ہو، بہرحال جب تک ان کے اندر اسلامی تہذیب کی روح موجود ہوگی، اور جب تک یہ شریعتِ اسلامی کے ضابطہ میں رہیں گے، ان پر یکساں "اسلامی تمدن" کا اطلاق ہوگا۔ مگر جب یہ کسی دوسری تہذیب کا اثر قبول کریں گے اور ایسی چیزیں اپنے اندر داخل کر لیں گے جو اسلامی تہذیب کی روح یا شریعتِ اسلام کے خلاف ہوں، تو بلا شبہ یہ کہا جائے گا کہ ان ممالک میں اسلامی تمدن مسخ ہو رہا ہے۔

اب آپ خود غور فرمائیں کہ پنڈت جواہر لال اور ان کے یہ مسلمان متبعین اسلامی تہذیب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

تمدن کے مسئلے کو کیسی غلط روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کو اور خود ناواقف مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ:-

"اسلامی تہذیب و تمدن فی نفسہٖ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ صدیوں پہلے مغلوں اور پٹھانوں کے دورِ حکومت میں جو طور طریقے مسلمانوں میں رائج ہو گئے تھے انہی کا نام اسلامی تہذیب و تمدن رکھ دیا گیا ہے۔ آج جو مسلمان اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا شور مچا رہے ہیں، ان کا مقصد محض اُس گزرے ہوئے تاریخی دَور کی میراث کو اِس بدلے ہوئے زمانہ میں جُوں کا تُوں برقرار رکھنا ہے، اِس لیے یہ رجعت پسند اور ترقی دشمن ہیں"

ایک پوری قوم کے نقطۂ نظر کی اس قدر غلط ترجمانی اور اتنی جسارت کے ساتھ شاید یورپ کے سیاسی بازی گروں سے بھی بن نہ آتی۔ یہ ہمارے ہم وطن اہلِ قلم قوم اس معاملہ میں ان سے بھی بازی لے گئے۔

ان کو اگر معلوم نہیں ہے تو ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اُس تمدن کی حفاظت کے لیے نہیں اُٹھے ہیں جو کسی زمانہ میں حکمران طبقہ کے رجحانات سے پیدا ہوا تھا۔ بلکہ اِس لیے اُٹھے ہیں کہ ہماری قوم کا تمدنی ارتقاء قرآنی تہذیب کے راستہ سے منحرف نہ ہونے پائے۔ ہمیں دلّی اور لکھنؤ کی ٹکسالی اردو کو بچانے کی فکر نہیں ہے، بلکہ اُس ذہن کو اسلامی ذہن رکھنے کی فکر ہے جس نے اپنی شخصیت ظاہر کرنے کے لیے اس زبان کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہم دیو بند اور فرنگی محل کے لباس کو محفوظ رکھنے کے لیے نہیں لڑ رہے ہیں، بلکہ اس لیے لڑنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مرد اور ہماری عورتیں اس لباسِ حیا سے خارج نہ ہو جائیں جو اسلامی تہذیب نے انہیں پہنایا ہے اور اس لڑائی کی ضرورت ہمیں اس لیے پیش آئی ہے کہ ہم ہندوستان کی سیاست پر تم جیسے لوگوں کو غالب آتے دیکھ رہے ہیں جن میں ہماری تہذیب کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں جن میں اتنی راست بازی وانصاف پسندی نہیں کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کریں، اور جن میں ان کمزوریوں کے ساتھ ہٹلر اور مسولینی کی فاشستی روح گھس گئی ہے کہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لیے کسی طاقت کے استعمال سے دریغ نہیں کرتے خواہ اس کے استعمال میں صداقت، انسانیت اور اخلاق کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

خیر یہ ایک ضمنی بحث تھی۔ یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ کانگریس کا یہ شعبہ اسلامیات جو ہماری "دلدہی" اور "سہولت کار" کے لیے قائم کیا گیا ہے، دراصل کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کے جو نظریات آپ پڑھ چکے ہیں، ان کو مسلمان مضمون نگاروں اور مسلمان اخباروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں اُتارنا اس کا مقصد ہے، اور آپ نے دیکھ لیا کہ یہ شعبہ جو ہماری "دلدہی" کے لیے قائم کیا گیا ہے اس مقصد کو کس خوبی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ وہ ہمیں سمجھا رہا ہے کہ یہ تہذیب جس کی حفاظت کا تم دعویٰ کر رہے ہو، کوئی چیز بھی تو نہیں ہے۔ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات تھے سو وہ طبقہ ہی ختم ہو گیا۔ ایک خاص ماحول میں اس تہذیب نے تربیت پائی تھی، سو وہ ماحول ہی اب باقی نہیں۔ اب لے دے کے تمہاری تہذیب یہ رہ گئی ہے کہ ایک خاص وضع کا لباس پہن لیتے ہو اور ٹکسالی اُردو بول لیتے ہو، تو وہ بھی دلّی اور لکھنؤ تک محدود ہے اور دلّی و لکھنؤ میں بھی وہ کوئی خاص تمہاری چیز نہیں ہے۔ بلکہ کائستھ اور کشمیری برہمن بھی تمہارے ساتھ شریک ہیں۔ کیا اسی مہمل چیز کو تم فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں اور سیاسی و اقتصادی حالات کی ترقی کے مقابلہ میں بچانا چاہتے ہو؟ یہ تو عین رجعت پسندی ہے کیونکہ وہ دور گزر چکا جس میں یہ تہذیب پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ سامراج پرستی بھی ہے۔ کیونکہ فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں کے مقابلہ میں اس بوسیدہ چیز کی حفاظت صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ تم سامراج کی حمایت کرو اور سامراج تمہاری حمایت کرے! ——— مسلمانوں کو شکایت تھی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اس شکایت کی معقولیت تسلیم کر کے کانگریس نے کیسے معقول طریقہ سے اسے دُور کیا ہے!

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈاکٹر اشرف صاحب کا وعظ ابھی ختم نہیں ہوا۔ آگے سُنیے :۔

"جاگیرداری اور عہد بادشاہت کے زمانہ میں باعتبار زبان، لباس، تمدّن، بلکہ مذہبی عقاید کے لحاظ سے بھی مسلمانوں میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔ عربی، فارسی، ترکی، تاتاری، چینی سب مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ مغربی، مشرقی، ایرانی، رومی، ہندی ہر طرح کے لباس مسلمانوں کے ہر طبقہ میں رائج ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ہمایوں ہندوستان سے جلاوطن ہو کر ایران پہنچا تو شاہِ ایران نے بجائے ایرانی کھانوں کے اپنے مہمان کے لیے خاص طور پر ہندوستانی مٹھائیاں اور کھانے تیار کرائے۔ عقائد کی یکسانیت کا تو مسلمانوں میں سرے سے کوئی سوال ہی نہیں، بہتر فرقے ضرب المثل ہیں"

کچھ غور بھی کیا آپ نے کہ یہ تنوّع کی تمام مثالیں کس مقصد کے لیے پیش کی جا رہی ہیں؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنی زبانیں بول کر، اتنے مختلف لباس پہن کر، ایران میں ہندوستانی مٹھائی کھا کر، بہتّر فرقوں میں بٹ کر، اور عقائد میں یکسانیت سے محروم ہو کر بھی تم مسلمان رہے تو اب اگر تم گاندھی کیپ اور دھوتی پہن لو، تمہاری عورتیں سماجی خدمت (Social Service) کے لیے گھروں سے باہر نکل آئیں، تم نئی "ہندوستانی" زبان بولنی اور لکھنی شروع کر دو، مخلوط تعلیم گاہوں میں تمہارے لڑکے اور تمہاری لڑکیاں "جدید طرز تعلیم" حاصل کرنے لگیں، سیاسی، معاشرتی اور معاشی انقلاب کی جدید تحریکات تم میں پھیلنے لگیں تو اس میں کون سا مضائقہ ہو جائے گا؟ اسی مقصد کو چھپا کر ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے :۔

"اس اعتبار سے آج ہم ایک نئے اور زندہ تمدّن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اس نئے تمدّن کا پیش خیمہ ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اس نئی تاریخی منزل اور اس کے تقاضے سے باخبر ہوں۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ ساری دماغ سوزی اس سماجی انقلاب (Social Revolution) کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنے کی خاطر کی گئی ہے جس کا نقشہ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات میں آپ دیکھ چکے ہیں اور یہ دعوت پھیلائی کس اخبار کے ذریعہ سے جا رہی ہے؟ اس اخبار کے ذریعہ سے جو جمعیت علمائے ہند کا واحد ترجمان ہے۔ کیسے صحیح راستہ پر جا رہی ہے "یہ آزادی کی فوج!" شردھانند کی شدھی پر شورِ قیامت برپا تھا۔ جواہر لال کی شدھی شربت کے گھونٹوں کی طرح اتاری جا رہی ہے۔

"آزادی کی فوج" اپنے مسلمان سپاہیوں سے جو خدمت لے رہی ہے ان میں سے دو صاحبوں کے کارنامے آپ نے ملاحظہ فرما لیے۔ ایک صاحب نے اسلامی قومیت پر تیشہ چلایا۔ دوسرے صاحب نے اسلامی تہذیب پر ضرب لگائی۔ اب تیسرے سپاہی کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔

اسی "شعبۂ اسلامیات" کے ایک ذمہ دار کارکن منظر رضوی[1] صاحب کا ایک طویل مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے اخبار "مدینہ" بجنور نے نومبر ۳۷ء کی کئی اشاعتوں میں درج کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

> "ہمارا دوسرا حربہ حکومت اور اس کے حاشیہ بردار زمینداروں، تعلقداروں، جاگیرداروں کی مال گزاری اور لگان بند کرنا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ان پالیوں کو گراتے وقت ایک بہت بڑی کرانتی (انقلاب) مچے گی، بلوے اور فساد ہوں گے۔ اس میں خونریزیاں بھی ہوں گی، خون کی ندیاں بہیں گی اور سب کچھ ہو گا۔ اس وقت یہ جتنے زمیندار، سرمایہ دار

---

[1] ابھی معلوم ہوا کہ یہ صاحب کانگریس سکریٹریٹ سے الگ کر دیے گئے۔ لیکن ان کی علیحدگی کا سبب یہ مضامین اور پالیسی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ لہٰذا ان مضامین کی ذمہ داری سے کانگریس سکریٹریٹ اب بھی بری الذمہ نہیں ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پونجی اور کارخانوں کے مالک، تعلقوں اور جاگیروں کے آقا یعنی راجہ محمود آباد، نواب چھتاری، سر سکندر حیات، راجہ نریندر ناتھ، گھنشام داس برلا، بھائی پرمانند، سیٹھ ڈالمیا جو مسلم ملت اور ہندو جاتی کے نعرے لگائے جاتے ہیں، اپنی اپنی غریب اور دکھی جنتا اور غریب اور فاقہ مست عوام کو چھوڑ کر برٹش سامراج کے ساتھ ہوں گے اور ان پر گولے اور بم برسائیں گے۔ دوسری طرف غریبوں کی طاقت ہوگی اور ان کی جیون ساتھی کانگریس۔"

ہماری آنے والی لڑائی دراصل امیری اور غریبی کی لڑائی ہوگی۔ اس میں ہندوستان بھر کے امیر چاہے وہ کسی مذہب اور فرقے کے کیوں نہ ہوں بدیسی سامراج کے ساتھ ہوں گے۔ اور وہ ہم غریبوں اور مفلسوں کو توڑنے اور تباہ کرنے کے لیے ہر ہتھیار کو استعمال کریں گے۔ پھر کسانوں اور مزدوروں کی جاگ سے امیروں کو، راجہ محمود آباد، نواب چھتاری اور سر سکندر جیسے لوگوں کو بہت بڑا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ زمانہ پلٹا کھانے کو ہے دولت اور امیری ہاتھ سے نکلنے کو ہے۔ امیروں کو نیچے آنا ہے، غریبوں کو اوپر جانا ہے۔ ان سب باتوں کے ڈر سے ہندو جاتی اور مسلم ملت کے یہ ہندو مسلم نام لیوا اپنے اپنے مذہب کے لوگوں کو سامراج مخالف تحریک سے ہٹا کر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لوگ مل کر آخری لڑائی نہ لڑنے پائیں۔ اس لیے قرآن اور حدیث کی آیتیں اور وید اور شاستر کے اشلوک پڑھے جا رہے ہیں۔"

جنگ آزادی کی نوعیت کو اس طرح واضح کرنے کے بعد فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں:۔

"مسٹر جناح نے پکار کر کہا، "ہندوستان بھر کے مسلمانو مل جاؤ" سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کا مسلمان آپس میں کیوں ملے؟ اس اتحاد کی ضرورت کیا؟ اس کا مقصد کیا؟ جہاں تک توحید رسالت، مذہبی معتقدات، اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مذہبی حرکت وعمل کا تعلق ہے وہ آپس میں ملے ہوتے ہیں۔ بالکل متحد ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض ومفاد کے لیے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے۔ وہ ہرگز متحد نہیں ہوسکتے اور نہ ان کو متحد ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں کے اغراض اور فائدے بالکل ایک سے نہیں ہیں۔"

ہندوستان میں امیر وغریب کے دو طبقے ہیں۔ امیروں کی غرض یہ ہے کہ امیری کے جتنے بھی وسائل ہیں ان پر ان لوگوں کا قبضہ رہے اور غریبوں کی محنت سے وہ فائدہ اٹھاتے رہیں۔ غریبوں کا فائدہ اس میں ہے کہ امیر کے وسیلے ان کے ہاتھ سے چھن جائیں اور ان کا انتظام اس طرح ہو کہ ملک سے غربت دور ہو۔ غربت کے دور کرنے کا سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ دولت کے ان محدود پہلوؤں کو ان کے چنگل سے نکال لیا جائے شخصی ملکیت کو ختم کیا جائے۔ یہ عام اور اصولی بات ہے۔ اب ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کا فائدہ کیا ہے؟ مسلمانوں میں بھی کچھ امیر ہیں اور کچھ غریب۔ سب کی ایک ہی حالت نہیں ہے مسلمانوں کے تھوڑے سے لوگ امیر ہیں جو زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ ہوں گے۔ سات کروڑ مسلمان محنت سے روزی حاصل کرتے ہیں۔ جب تک پونجی شاہی دولت کی پیداوار اور تقسیم کے طریقوں کو ہم متذکرہ بالا انقلابات سے غارت نہیں کرتے ان کے روزگار کا کوئی انتظام نہیں ہوسکتا۔ اس کے خلاف وہ ایک کروڑ مسلمان بھی ہیں جن کے پاس زمین، جائداد، کارخانے اور کانیں ہیں۔ ان کی جیبوں میں بڑی بڑی سرکاری ملازمتیں ہیں۔ وہ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔ اب ان سات کروڑ غریب مسلمانوں کو ایک کروڑ امیر مسلمانوں سے ملنے کے لیے کہا جاتا ہے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"خیر تو عام مسلمانوں کے حقوق اور مفاد عام ہندوؤں سے جدا نہیں ہیں۔ خود مسلم ملت کے حقوق و مفاد باہم دگر متضاد اور مختلف ہیں۔ ان میں کوئی یگانگت نہیں۔ مختصر یہ کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی ہمارے مفاد آپس ہی میں بالکل مختلف ہیں۔"

یہی منظر صاحب اپنے ایک دوسرے مضمون (مدینہ مورخہ ۱۳ دسمبر ۴۷ء) میں فرماتے ہیں:۔

"غریبوں، مفلسوں، اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کپڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑا جس کے لیے وہ چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں .... اس پیٹ کے لیے ایسے انقلاب اور کرانتی کرنی پڑے گی۔"

چند اور فقرے اسی مضمون کے ملاحظہ ہوں:۔

"اس وقت ہندوستان میں دو ہی سوال اس اعتبار سے ہیں۔ سرمایہ داری کا استحصال اور غلامی یا ترقی اشتراکیت اور آزادی۔ بیچ کی کوئی راہ نہیں۔ ہمارا کوئی درمیانی مسلک نہیں ہو سکتا۔"

"اسی ردِ عمل کا نتیجہ روس کی نئی حکومت ہے، جو زمین پر ایک جنت ہے۔ وہاں بے روزگاری، بھوک، جہالت اور تنگ دستی کا نام نہیں۔"

"مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ مذہب تو ہمیشہ اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ، تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے۔ مذہب کی سب سے بڑی فکر ہمارے فقیہوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور محدثوں کو ہو سکتی ہے نہ کہ عیاش رئیسوں کو۔ سو ہمارے فقیہہ اور محدث اور علماء آج ہی نہیں بلکہ اسی وقت سے، جب سے قومی تحریک کی شروعات ہوئی ہے، ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ لیکن آج ہمارا نصب العین مذہبی نہیں ہے، بلکہ محض اقتصادی اور سیاسی ہے۔ ہمیں تو آج کے حالات میں رہ کر، آج کے حالات سے اپنی قیادت قائم کرنی ہے۔ علماء کا ایک طبقہ ایک ہی چیز کو حرام قرار دیتا ہے اور دوسرا حلال۔ آج انہی کا ایک طبقہ تحریک کانگریس کو شجر ممنوعہ سمجھتا ہے اور دوسرا خیر و برکت کا مجموعہ۔ اور پھر اس کا کیا یقین ہے کہ جب ہم ایک ہی سماج اور نئے نظام معاش کی تاسیس کرنے لگیں گے، جب ہم شخصی ملکیت کو خارج اور ختم کر کے ملک کی دولت اور اس کی پیداوار کو نئے طریقوں پر تقسیم کرنے لگیں گے، تو اس وقت بھی یہ طبقہ ہمارے ساتھ ہوگا۔[1]"

۱۲ دسمبر ہی کے "مدینہ" میں پنجاب پراونشل مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی کے سکریٹری منشی احمد دین صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:-

"ہم تو دیانتداری کیساتھ یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب میں جو جنگ آزادی لڑی جائے گی وہ محنت اور سرمایہ، غریب اور امیر، بالفاظ دیگر ظالم اور مظلوم کی جنگ ہوگی، جس میں ہندو اور مسلمان مظلوم ایک طرف ہوں گے۔ گویا اس لڑائی میں ہندو اور مسلمان عوام دونوں برابر ہوں گے۔ لہذا فرقہ وارانہ جنگ، طبقہ وارانہ جنگ میں تبدیل ہوگی۔"

ان طویل اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آزادی کی فوج کے مسلمان

---

[1] خط کشیدہ فقرے علمائے کرام کے لیے خاص طور پر غور کے لائق ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سپاہی کس وفاداری کے ساتھ اس مشن کو مسلمانوں میں پھیلا رہے ہیں جو ان کے غیر مسلم لیڈروں نے ان کے سپرد کیا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۱۲

حصولِ آزادی کا طریقہ

پچھلے دونوں ابواب پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں ناظرین کو اُن تنقیحات کی طرف دوبارہ توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جو میں نے اس سلسلہ کے تمہیدی مباحث میں قائم کی تھیں۔ ان تنقیحات میں سے اوّلین تنقیح یہ تھی کہ:-

"ہمیں جنگِ آزادی میں شریک ہونے سے پہلے یہ دریافت کرنا چاہیے کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے طریقہ کون سا اختیار کیا جا رہا ہے۔ اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ حصولِ آزادی کا وہ طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے جو ہماری تہذیب اور ہمارے نظامِ اجتماعی کے اصولوں سے متصادم ہوتا ہو، تو ہم اس کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے۔"

اس تنقیح کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھیے کہ کانگریس کے مسلم اور غیر مسلم لیڈروں اور کارکنوں کی جو تحریریں پچھلے دو ابواب میں نقل کی گئی ہیں ان سے حصولِ آزادی کے کس راستے کا نشان ملتا ہے۔

اسلامی قومیت اور تہذیب پر حملہ

ان کے نزدیک ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمام قومیتوں اور قومی امتیازات کو مٹا کر پوری آبادی کو ایک قوم بنا دیا جائے۔

اس غرض کے لیے وہ سب سے پہلے اسلامی قومیت پر حملہ کرتے ہیں کیونکہ جب تک مسلمانوں کے ذہن میں یہ خیال موجود ہے کہ پیروانِ اسلام ایک قوم ہیں اور منکرین اسلام دوسری قوم، اس وقت تک آٹھ کروڑ کی اس عظیم الشان آبادی کا ہندوستانی قومیت میں تحلیل ہو جانا محال ہے۔ اسی لیے تمام قوم پرست یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ "مسلمان" کسی قوم کا نام نہیں ہے، اور اسی لیے ان کی تعلیم یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو "مسلم" کہنے کے بجائے "ہندی" کہیں۔

ان کا دوسرا حملہ اسلامی تہذیب و تمدن پر ہے۔ ہندوستان کی آبادی ایک قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ سب ایک تہذیب اور ایک تمدن نہ اختیار کر لیں۔ عقائد، جذبات و احساسات، لباس، طرزِ زندگی، زبان، ادب اور قوانینِ معاشرت و تمدن کے لحاظ سے جب تک مسلمانوں میں یک جہتی باقی ہے اس وقت تک بہر حال وہ اپنے آپ کو ایک قوم ہی سمجھتے رہیں گے اور جب تک ان امور میں وہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے مختلف ہیں، اس وقت تک بہر حال ان کا قومی تشخص دوسروں سے الگ ہی رہے گا۔ اس علیحدگی کو مٹانے کے لیے مسلمانوں میں پورے زور شور کے ساتھ یہ تبلیغ کی جا رہی ہے کہ ان کی نہ کوئی خاص تہذیب ہے اور نہ کوئی مخصوص تمدن۔ "زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے جو تہذیب پیدا ہو رہی ہے، اور ہندوستان کے دوسرے باشندوں میں جو تمدن نشوونما پا رہا ہے، اسے ان کو بے تکلف قبول کرنا چاہیے تاکہ وہ سب کے ساتھ ہم رنگ ہو جائیں۔

اسلام کے نظامِ اجتماعی پر حملہ

ان کا تیسرا حملہ اسلام کے نظامِ اجتماعی پر ہے۔ مسلمانوں میں اشتراکیت کی تبلیغ جو کی جا رہی ہے اس کا مقصد دراصل یہی ہے کہ صرف اسی ذریعہ سے اسلامی سوسائٹی کے نظام کو پارہ پارہ کیا جا سکتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت کے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کر کے فرداً فرداً غیر مسلم آبادی میں جذب کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسری تدبیر نہیں ہے۔ کانگریس کے متعلق یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ اس کا نصب العین اشتراکی نہیں ہے۔ نہ وہ سرمایہ داروں سے بگاڑنا چاہتی ہے نہ سرمایہ داری نظام کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ نہ اُس سماجی (تمدنی) انقلاب کی حامی ہے جس کا ذکر پنڈت جواہر لال اور بابو سوبھاش چندر بوس بار بار کیا کرتے ہیں۔

ہری پورہ کانگریس میں جواہر لال کے سامنے اور سوباش چندر بوس کی صدارت میں سردار دلبھ بھائی پٹیل نے سوشلسٹ جماعت کو بُری طرح ڈانٹا تھا اور یہ الفاظ کہے تھے کہ:-

"تم کانگریس میں دستِ راست اور دست چپ کی جماعتیں پیدا کرنے کے ذمہ دار ہو حالانکہ کانگریس ہمیشہ سے ایک وحدت رہی ہے۔ ہم برابر دو سال سے تمہارے وجود کو برداشت کر رہے ہیں، مگر وقت آ رہا ہے جب ہم تمہیں برداشت نہ کر سکیں گے۔"

(ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۲ فروری ۳۸ء)

اس زجر و توبیخ پر ہندوستانی اشتراکیت کے ان دونوں اُقنوموں[1] میں سے ایک نے بھی دم نہ مارا۔ کانپور، احمد آباد اور دوسرے مقامات پر مزدوروں کا سر خود کانگریسی وزارتیں ہی کچلتی رہی ہیں۔ مدراس اور صوبہ سرحد اور دوسرے صوبوں میں جہاں کہیں اشتراکیوں نے چادر سے پاؤں نکالا، وہاں کانگریسی حکومتوں ہی نے ان کی سرکوبی کی ہے۔ ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں کہ حکومت مدراس نے اشتراکیت کی تبلیغ کے خلاف ایک کمیونکے شائع کیا ہے جس میں وہ لکھتی ہے کہ:-

"چند پمفلٹ جو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے شائع کیے جا رہے ہیں، حال میں حکومت کے ہاتھ آئے ہیں۔ ان

---

[1] "اقنوم" مسیحی دینیات کی ایک اصلاح ہے۔ باپ بیٹے اور روح القدس کو اقانیم ثلاثہ کہتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک "اقنوم" ہے۔ مرتب۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پارٹی حد سے گزرتی جارہی ہے اور اس ملک میں ابتری پھیلانا چاہتی ہے۔ اس لیے حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ پبلک کو اس سے متنبہ کر دے تاکہ عام باشندگان ملک نادانستگی میں ایسی تحریک سے متاثر نہ ہو جائیں جس کا فلسفہ اور طریق کار بالکلیہ اس ملک کی تہذیب اور روایات کے خلاف ہے۔"

اس کے بعد اس کمیونکے میں اشتراکی پمفلٹوں کا خلاصہ دیا گیا ہے جس کے یہ الفاظ خاص طور پر غور طلب ہیں:۔

"محنت کش طبقوں کی انقلابی فوج، یعنی ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اس ملک میں طبقہ وارانہ جنگ برپا کرے گی اور قومی انقلابی ہڑتال کا اعلان کرے گی۔ کاریگر اپنے اوزار رکھ دیں گے۔ دماغی کام کرنے والے دفتروں سے نکل آئیں گے۔ طلبہ مدرسوں سے سڑکوں پر آجائیں گے۔ کسان مال گزاری اور لگان دینے سے انکار کر دیں گے۔ ریلیں کھڑی ہو جائیں گی۔ کارخانے اور ریل اور بجلی گھر بند ہو جائیں گے......"

(ملاحظہ ہو اخبار ہریجن مورخہ ۲۰ / اگست ۳۸ء)

یہ ٹھیک وہی خیالات ہیں جو کانگریس سکریٹریٹ کے دفتر سے منظر رضوی صاحب شائع کر چکے ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب یہ خیالات مسلمانوں میں پھیلائے جاتے ہیں تو ان کو جائز رکھا جاتا ہے، اور جب حقیقت میں ملک کے اندر اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لیے ان کی اشاعت کی جاتی ہے تو کانگریسی حکومت ان کو ہندوستان کی تہذیب اور روایات کے منافی قرار دیتی ہے اور ان کے خلاف تنبیہی کمیونکے نشر کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشتراکیت فی الواقع کانگریس کی سرکاری پالیسی نہیں ہے، بلکہ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں اس مسلک کو صرف اس غرض سے پھیلایا جارہا ہے کہ اسلامی سوسائٹی کو درہم برہم کرنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں۔ حال میں بنگال کے کانگریسی مسلمانوں کا اجتماع بابو سوباش چندر بوس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ زیر بحث یہ سوال تھا کہ عامۂ مسلمین میں کانگریس کے خیالات اور اصول کامیابی کے ساتھ کس طرح پھیلائے جا سکتے ہیں اور جو مشکلات اس راہ میں حائل ہیں ان کا حل کیا ہے۔ طویل بحث و تمحیص کے بعد جو بات باتفاق طے ہوئی وہ یہ تھی کہ :۔

"مسلمانوں میں کانگریس کو مقبول بنانے کے لیے ایک معاشی پروگرام پیش کرنا ناگزیر ہے۔ اور پروگرام ایسا ہونا چاہیے جو محنت پیشہ عوام کو اپیل کر سکے"۔ (ٹریبیون کالم۔ مجریہ ۱۳ اگست ۳۸ء)

"معاشی پروگرام" کے لفظ کو خاص طور پر نوٹ کیجیے۔ اس چھوٹے سے مرکب لفظ میں وہ تمام معانی بھرے ہوئے ہیں جن کی تشریح آپ پنڈت جواہر لال نہرو اور منظور رضوی اور کامریڈ احمد دین صاحبان کی زبانوں سے سن چکے ہیں۔ یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ عام مسلمان خواہ کتنے ہی جاہل ہوں، مگر پھر بھی انہیں اسلام سے گہری محبت و عقیدت ہے، اور کوئی شخص اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر ان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم اسلام چھوڑ دو۔ اس لیے ان میں علانیہ الحاد و بے دینی کی تبلیغ کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ البتہ اگر ان کے سامنے "روٹی" پیش کی جائے اور اس میں بے دینی کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے تو یہ بھوک کے مارے ہوئے غریب لوگ لپک کر اسے لے لیں گے اور بے تکلف حلق کے نیچے اتار جائیں گے۔ ادھر سے مطمئن ہو جانے کے بعد پھر وہ ہر زہر کو خوشی سے ہضم کر سکتے ہیں۔

یہی کچھ سمجھ کر یہ لوگ خستہ حال مسلمانوں کے دلوں پر قبضہ کرنے کے لیے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے کہتے ہیں کہ "آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں جس سے امیری اور غریبی مٹتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے" پھر جب بیچارہ بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی امید پر ان کی طرف دوڑتا ہے تو یہ اسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں کہ "غریب اور مفلس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان اس موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے۔" مذہب اشتراکیت کا یہ ابتدائی سبق جس آن اس بیچارے جاہل مسلمان کو دیا جاتا ہے، اسی آن اسے یہ پٹی بھی پڑھائی جاتی ہے کہ "مذہب اور عقائد کی ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ، اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے۔" اور پھر مزید ضمانت کے طور پر اس سے یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ "بھائی مذہب کی سب سے بڑی فکر تو فقیہوں اور محدثوں ہی کو ہو سکتی ہے، سو دیکھو کہ یہ فقیہ اور محدث اور علماء ہمارے ساتھ ہیں۔"

روٹی کو دین اور روٹی ہی کو ایمان قرار دینے کے بعد یہ آگے بڑھتے ہیں اور ان پڑھ مفلس مسلمان سے کہتے ہیں کہ دیکھو میاں، تمہارے اصلی بھائی وہ غیر مسلم عوام ہیں جو تمہاری ہی طرح بھوک اور افلاس میں مبتلا ہیں۔ تمہیں جو کچھ ملے گا انہی کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے سے ملے گا۔ اور تمہارے اصلی دشمن وہ مسلمان ہیں جو کسی زمین یا مکان یا کارخانے کے مالک ہیں یا جن کے پاس تم سے زیادہ وسائل معیشت موجود ہیں۔ تمہیں جو کچھ مل سکتا ہے، انہی سے لڑ کر مل سکتا ہے۔ پس آؤ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ان مسلمان دشمنوں سے لڑو۔

کانگریس کے طریق کار کے نتائج

اس تبلیغ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ جوں جوں یہ خیالات عام مسلمانوں کے دلوں میں گھر کریں گے، اسلامی سوسائٹی پارہ پارہ ہوتی چلی جائے گی۔ اسلام میں سوسائٹی کا انتظام دین کی وحدت پر قائم ہے۔ تمام وہ لوگ جو توحید اور رسالت محمدیؐ کے قائل ہیں، ایک ہی ہیئت اجتماعی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ خواہ ان میں سے ایک عثمان غنیؓ کی طرح سرمایہ دار ہو اور دوسرا ابوذر غفاریؓ کی طرح قلاش (رضی اللہ عنہما) اسی دینی وحدت کی بنا پر ان میں نماز کی جماعت سے لے کر شادی بیاہ تک ہر قسم کے معاشرتی اور تمدنی تعلقات قائم ہوتے ہیں، اور انہی تعلقات سے یہ سب مل کر ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوسائٹی بناتے ہیں۔ اس کے برعکس اشتراکی تبلیغ ان کو معاشی حیثیت سے الگ الگ طبقوں میں تقسیم کرتی ہے اور ان کو یہ سکھاتی ہے کہ ایک معاشی طبقہ کا مسلمان دوسرے معاشی طبقہ کے مسلمان سے لڑے اور اس کو اپنا دشمن سمجھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد یہ ایک سوسائٹی کے ممبر نہیں رہ سکتے۔ طبقہ وارانہ جنگ ان کے درمیان صرف معاشرتی تعلقات ہی کو منقطع نہ کرے گی بلکہ خالص دینی حرکت وعمل میں بھی ان کا آپس میں ملنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ جن کے درمیان روٹی کی جنگ چھڑ گئی ہو وہ ایک دوسرے کے ساتھ مسجدوں میں جمع ہوں یا وہ مالدار مسلمان اپنے اس غریب مسلمان بھائی کو زکوٰۃ دے جس کے متعلق اسے یقین ہے کہ وہ اس کا گھر لوٹنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ جو لوگ معاشی اغراض کے لیے ایک دوسرے کے دشمن بن چکے ہوں اور جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بغض اور حسد کی آگ بھڑک چکی ہو وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں اور ان کے درمیان انما المومنون اخوۃ کا رشتہ قائم رہ جائے۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے عوام مذہب سے قطعی بیگانہ ہوتے چلے جائیں گے۔ معاشی طبقات کی جنگ عامۂ مسلمین کو صرف بڑے تعلقہ داروں، جاگیرداروں اور مکھ پتیوں ہی سے الگ نہ کرے گی بلکہ متوسط طبقہ کے ان تمام مسلمانوں سے بھی کاٹ دے گی جو نسبتاً خوش حال ہیں۔ منظر رضوی صاحب کے اپنے اندازے کے مطابق متوسط طبقہ کے مسلمان تقریباً ایک کروڑ ہیں اور عام مفلس مسلمان سات کروڑ۔ طبقہ داری جنگ کے معنی ان ایک کروڑ مسلمانوں سے سات کروڑ مسلمانوں کے برسرپیکار ہو جانے کے ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اپنے دین کا علم، اپنی تہذیب کا شعور، احکام شرعیہ کی واقفیت، جو کچھ بھی ہے اسی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ہی میں پائی جاتی ہے۔ یہی طبقہ اس ملک میں اسلامی تہذیب کو کسی نہ کسی حد تک سنبھالے ہوئے ہے۔ عوام انہی سے دین سیکھتے ہیں، انہی سے احکام معلوم کرتے ہیں، اور انہی کے اثر سے تھوڑے سے یا بہت اسلامی نظام تہذیب وتمدن کی گرفت میں رہتے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ جب طبقہ واری جنگ کی بدولت سات کروڑ عام مسلمان ان ایک کروڑ متوسط طبقہ کے مسلمانوں سے کٹ کر الگ ہو جائیں گے تو وہ اسلام سے بالکل بے گانہ ہو کر رہ جائیں گے، خود ان کے پاس کوئی علم نہ ہوگا۔ اور جب متوسط طبقہ کے لوگ ان کو دینی احکام سنائیں گے تو اشتراکیت کا مبلغ فوراً پکار کر کہے گا کہ ہوشیار! پھر وہی مذہب کی افیون تمہیں کھلائی جارہی ہے، اور پھر اسی "منظم مذہب" کے پھندے میں تم کو پھانسا جا رہا ہے جو "اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کا حامی ہے۔"

اس کا آخری اور فیصلہ کن نتیجہ یہ ہوگا کہ عامۂ مسلمین جب "اسلامی قومیت کے تخیل سے خالی الذہن ہو کر فرد فرد بن جائیں گے"، اور جب وہ اسلامی تہذیب و تمدن کو ایک لفظ بے معنی سمجھ کر اس غیر اسلامی تہذیب و تمدن کو قبول کرتے چلے جائیں گے جو "زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے پیدا ہو رہا ہے، اور جب تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے مسلمانوں سے کٹ کر وہ اپنے معاشی طبقہ کے غیر مسلموں میں جا ملیں گے تو خود بخود ان کی شدھی ہو جائے گی اور وہ آہستہ آہستہ غیر اسلامی قومیت میں اس طرح جذب ہو جائیں گے جیسے نمک کی ڈلی پانی میں گھل گھل کر آخر کار غائب ہو جاتی ہے۔ رہے متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان جو اسلام کے خلاف کسی سماجی اور معاشی نظام کو قبول کرنے سے انکار کریں گے تو ان کے حق میں پنڈت جواہر لال نے پہلے ہی فیصلہ کر دیا ہے کہ "جو سیاسی یا تمدنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہوں انہیں مٹا دینا چاہیے" اور یہ کہ "اکثریت نظام تمدن کو بدلنے کی خواہش مند ہو تو ضروری نہیں کہ اقلیت کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ اس پر مؤثر دباؤ ڈالنا چاہیے، اور جبر و تشدد سے کام لینا چاہیے۔" اور یہ کہ "جمہوری حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور جھکا کر اپنے قابو میں رکھے۔"

یہ ہے وہ راستہ جو آزادی حاصل کرنے کے لیے قوم پرستوں نے تجویز کیا ہے اور جس پر وہ عملاً چل رہے ہیں۔ ان کے نزدیک آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم نہ بنا دیا جائے اور ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ مسلمان قوم کا وجود کلیۃً ہندوستانی قومیت میں تحلیل نہ ہو جائے۔ لامحالہ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ حصولِ آزادی کے اس طریقہ کو اختیار کرنے سے مسلمان قوم پہلے ختم ہو گی اور آزادی اس کے بعد حاصل ہو گی۔ اب میں علمائے دین اور مفتیانِ امت سے اور ہر اس مسلمان سے جو اسلام اور قوم پرستی کا بیک وقت دم بھرتا ہے، دریافت کرتا ہوں کہ کیا اسلام اور یہ قوم پرستی صریحاً ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟ اور کیا اس طریقہ سے آزادی حاصل کرنا، قرآن، حدیث، عقل، غرض کسی چیز کی رو سے بھی مسلمانوں کا فرض ہے؟ بلکہ فرض کیا معنی میں پوچھتا ہوں کہ آزادی کے لیے قومی خودکشی کا یہ طریقہ اختیار کرنا کسی مسلمان کے لیے جائز بھی ہے؟ اور کیا اس طریقہ سے آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے ساتھ موالات کرنا صریح تعلیمات قرآنی کے خلاف نہیں ہے؟

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ یہ تحریک قطعی طور پر "شدھی" کی تحریک ہے۔ اس میں اور شردھانند والی شدھی میں حقیقت اور نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ مسلمان جب اسلام سے منحرف اور اسلامی جماعت سے خارج ہو گیا تو خواہ وہ ہندو مت میں جائے یا بے مت ہو جائے، دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ البتہ دونوں شدھیوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ایک کھلی ہوئی شدھی تھی، اور دوسری دامِ ہم رنگِ زمین کا حکم رکھتی ہے۔ اُس کے ساتھ کوئی مسلمان تعاون کا نام بھی نہ لے سکتا تھا، اور اس کی فوج میں فقیہ اور محدث اور مفسر تک سرگرم عمل نظر آ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تحریک اپنی پیش رو تحریک سے ہزار درجہ زیادہ خطرناک ہے۔

پھر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس طریقہ سے جو آزادی حاصل ہو گی وہ ان

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آٹھ کروڑ یا سات کروڑ جسموں کے لیے تو آزادی ہو سکتی ہے جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں۔ مگر اس قوم کے لیے آزادی نہیں ہو سکتی جو "مسلمان" ہے۔ مسلمانوں کے لیے مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ آزادی نہ ہوگی بلکہ ان کی قومیت، ان کی تہذیب اور ان کے نظامِ اجتماعی کی کامل بربادی اور اُس کام کی تکمیل ہوگی جس کو انگریزی امپریلزم نے ڈیڑھ سو برس پہلے شروع کیا تھا۔ حقیقت میں یہ ایک ایسا حربہ ہے جو انگریزی سلطنت سے پہلے اسلام پر حملہ کرتا ہے اور اس سے پہلے اس کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ مَیں تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی صاحبِ عقل مسلمان جو مسلمان رہنا چاہتا ہو اس حربے کو خود اپنے دین اور اپنی قوم پر چلانے میں کس طرح حصّہ لے سکتا ہے۔

طُرفہ ماجرا یہ ہے کہ وہی جواہر لال اور وہی ان کے قوم پرست ساتھی جنہوں نے حصولِ آزادی کے اس طریقہ کو کُھلم کُھلا اختیار کیا ہے، ہم مسلمانوں کو آزادی کی مخالفت اور سامراج پرستی کا طعنہ بھی دے رہے ہیں کیونکہ ہم اپنی قبر کھودنے میں ان کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت آزادی کے دشمن اور سامراج پرستی کے مجرم وہ خود ہیں۔ انہوں نے خود ہی آزادی حاصل کرنے اور سامراج سے لڑنے کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جس کو ہندوستان کی ⅓ آبادی کسی طرح قبول کر ہی نہیں سکتی۔ اس غلط اور احمقانہ طریقہ سے وہ خود مُلک کی آزادی کو دُور پھینک رہے ہیں اور سامراج کی مدد کر رہے ہیں۔ اور پھر طعنہ ہم کو دیتے ہیں کہ تم آزادی کی جنگ سے الگ رہ کر برطانوی سامراج کو مدد دے رہے ہو! اگر ان کے پاس عقل ہے تو انہیں سمجھنا چاہیے کہ کوئی جماعت اپنے جماعتی وجود کو فنا کرنے کے لیے آزادی نہیں چاہا کرتی اور نہیں چاہ سکتی۔ آزادی کی ضرورت قومی زندگی کے لیے ہوتی ہے نہ کہ قومی موت کے لیے۔ لہٰذا آزادی کی خاطر ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے مگر قومی زندگی قربان نہیں کی جا سکتی۔ تم جب کسی قوم کے سامنے آزادی کا وہ راستہ پیش کرتے ہو جس میں اس کی قومیت کی موت ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم خود اس کو مجبور کر رہے ہو کہ وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تمہاری تحریکِ آزادی سے لڑے۔ اس کا یہ لڑنا عین مقتضائے فطرت ہے۔ خواہ دنیا کی کوئی قوم بھی ہو، ایسی حالت میں بہرحال لڑے گی۔ اور اگر اس لڑنے کا یہ نتیجہ ہو کہ بیرونی اقتدار کو اس سے فائدہ پہنچے تو اس کی کچھ پروا نہ کرے گی۔ اِس لیے کہ بیرونی اقتدار کا نقصان بھی زیادہ سے زیادہ وہی ہو سکتا ہے جو اس نام نہاد تحریکِ آزادی کا ہے، یعنی اس کی قومیّت کی موت۔ پھر ایک موت اور دوسری موت میں آخر وجہ ترجیح کیا ہے؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ١٣

جنگِ آزادی کا مطمحِ نظر

اب ہمیں اپنی دوسری تنقیح کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اور وہ یہ کہ جس آزادی کے لیے یہ قوم پرست حضرات لڑ رہے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے، اور کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس نوعیت کی آزادی کسی درجہ میں بھی ہمارے لیے مطلوب یا مفید ہو سکتی ہے؟ اس تنقیح کو ہم دو حصوں میں تقسیم کریں گے۔ ایک یہ کہ اس آزادی کا مطمحِ نظر کیا ہے؟ یعنی موجودہ حکومت کو ہٹا کر یہ کس قسم کی حکومت کن اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خود اس جنگِ آزادی کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی یہ انقلابی ذرائع سے کامل انقلاب چاہتی ہے یا نیم انقلابی نیم دستوری ذرائع سے بتدریج ایک نظامِ حکومت کو گرانا اور دوسرا نظامِ حکومت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ پہلے حصہ کو ہم مقدم رکھیں گے اور دوسرے حصہ سے آخر میں بحث کریں گے۔

جو لوگ اس وقت آزادیِ وطن کے علمبردار بنے ہوئے ہیں ان کے مطمحِ نظر کو سمجھنے کے لیے تمہید کے طور پر ایک مختصر تاریخی بیان ضروری ہے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ ان کے تخیلات کا اصلی ماخذ اور ان کے جذباتِ حریت طلبی کا اصلی محرک کیا ہے۔

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ وطنی تحریک براہِ راست انگریزی تعلیم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے پیدا ہوئی ہے۔ مخالف اور موافق دونوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں نے تعلیم حاصل کی۔ وہاں یہ تاریخ، سیاسیات، اور معاشیات سے روشناس ہوئے۔ انگریزی زبان کے توسط سے مغربی افکار ان تک پہنچے اور ان میں آہستہ آہستہ وہ سیاسی شعور پیدا ہوا جو حکومت خود اختیاری کی خواہش کا مورث ہوا کرتا ہے۔ تقریباً پچاس سال تک ان جدید اثرات کے تحت پرورش پانے کے بعد جب ان کے اندر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کا جذبہ اُبھرنے لگا، تو خود ان کے انگریز مربیوں ہی نے اس جذبہ کے لیے خروج کا راستہ پیدا کیا۔ پہلا شخص جس کے دماغ میں "انڈین نیشنل کانگریس" قائم کرنے کا خیال آیا وہ ایک انگریز مسٹر ہیوم (Hume) تھا۔ ابتداءً اس کے پیش نظر محض ایک ایسی انجمن بنانے کا تصور تھا جس میں ہندوستان کے سیاسی دماغ مجتمع ہو کر تبادلۂ خیالات کیا کریں اور اس طرح حکمرانوں کو اپنے محکوموں کے داعیات سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہے۔ اس غرض کے لیے اس کی تجویز تھی کہ جس صوبہ میں اس انجمن کا اجتماع ہو وہیں کا گورنر اس کی صدارت کرے مگر لارڈ ڈفرن نے، جو اس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا اس کے خیالات کو بدل کر ایک دوسری راہ پر ڈال دیا۔ اس نے یہ رائے دی کہ:۔

"ہندوستان میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جس کی حیثیت یہاں وہی ہو جو انگلستان میں حزب الاختلاف (Opposition) کی ہے تاکہ وہ حکومت پر نکتہ چینی کر کے اس کے نقائص کو دور کرتی رہے۔ نیز اس جماعت کو مستقل بالذات ہونا چاہیے۔ گورنر کی صدارت اس کی آزادیٔ رائے میں خلل انداز ہو گی۔"

انگلستان میں لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی، سر جیمز کیرڈ (Caird)، جان برائٹ، مسٹر ریڈ، مسٹر سلیگ (Slagg)، اور دوسرے سیاسی مبصرین نے بھی لارڈ ڈفرن کی اس رائے کو پسند کیا، اور اس طرح ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی تاسیس[1] ہوئی۔

---

[1] ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیا کی تاریخ کانگریس (انگریزی)، صفحہ ۲۳-۲۴

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیاسی عمل کی یہ ابتداء جس طرح انگریزی افکار اور انگریزی تدبر کی رہنمائی میں ہوئی، اسی طرح مقاصد اور ان کے حصول کی صورت کا تعین بھی آپ سے آپ انگریزی اثرات کے تحت اور انگریزی دستورِ حکومت کے نمونے پر ہوتا رہا۔ کانگریس کو اوّل یوم پیدائش ہی میں "انڈین نیشنل کانگریس" کے نام سے موسوم کیا گیا، گویا کہ "انڈین نیشن" کے نام سے کوئی قوم موجود تھی اور یہ اس کی ایک اجتماعی ہیئت (کانگریس) بنائی جا رہی تھی۔ انگریزی تعلیم کے جو اثرات ان لوگوں کے دماغ پر پڑ رہے تھے، ان کا اثر اتنا گہرا تھا کہ انہوں نے ایک ملک کی آبادی کا ایک قوم ہونا، بطور ایک بدیہی کلیہ کے تسلیم کر لیا تھا، اور اس کے لیے وہ واقعات کی شہادت کو بھی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں جو مقاصد اس جمعیت کے لیے تجویز ہوئے تھے ان میں سے دوسرا مقصد یہ تھا:۔

> "قومی وحدت کے اُن داعیات کا نشوو ارتقاء اور استحکام جو ہمارے محبوب لارڈ رپن کے ہمیشہ یادگار رہنے والے عہدِ حکومت میں پیدا ہوئے ہیں[۱]"

دوسرے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

> "ایک قومی کانگریس کو اُن امور تک اپنے تئیں محدود رکھنا چاہیے جن میں پوری قوم براہِ راست حصہ دار ہو اور اصلاحِ معاشرت اور دوسرے طبقہ وار مسائل کو طبقات کی کانگریسوں کے لیے چھوڑ دینا چاہیے[۲]"

یہ وطنی قومیت اور واحد قومیت کا تخیل اس تحریک کے مایۂ خمیر کا پہلا عنصر ہے۔

---

[۱] ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ کی تاریخ کانگریس (انگریزی) صفحہ ۲۷۔

[۲] *How India Wrought for Freedom by Annie Basant.* *P. 18*

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس طرح ۱۸۸۵ء میں بینرجی اور نوروجی "ہندوستانی قوم" کا ذکر کرتے تھے اسی طرح آج گاندھی جی اور نہرو جی بھی کرتے ہیں، بلکہ وہ محض ذکر کرتے تھے اور یہ اس کو زبردستی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی استفہام انکاری کے لہجہ میں پوچھتے ہیں کہ "ہندوستان ایک ملک اور ایک قوم ہے یا بہت سے ملک اور بہت سی قومیں؟"[1] اور خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں کہ جو لوگ اس کو ایک ملک اور ایک قوم سمجھتے ہیں انہیں اس پر اعتراض نہ ہونا چاہیئے کہ اگر مدراس کا وزیر اعظم ایک قوم کے لیے ایک زبان بنانے میں کرمنیل لا امنڈمنٹ ایکٹ کی جابرانہ طاقت استعمال کرے۔ نہرو جی استفہام کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور قطعی طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے جس کا نام ہندوستانی ہے۔ جدا جدا مستقل قوموں کا یہاں وجود ہی نہیں ہے۔

دوسرا بنیادی تصور جو انگریزی تعلیم اور انگریزی مربیوں کی سیاسی تربیت سے اخذ کیا گیا وہ "قومی جمہوریت" (National Democracy) کا تصور تھا۔ جمہوری ادارات کی مختلف صورتیں جو دنیا میں رائج ہیں اور رائج رہی ہیں، ان میں ایک نہایت ناقص اور قدامت پرستانہ صورت وہ ہے جو انگلستان میں قائم ہے۔ لیکن ہمارا ہندوستانی وطن پرست چونکہ انگریز کا شاگرد ہے، اسی سے جمہوریت کا نام اس نے سنا ہے، اور اسی کے جمہوری نظام کا نقشہ اس نے دیکھا ہے، اس لیے یہ جب "جمہوریت" کا لفظ بولتا ہے تو اس کے سامنے جمہوری دستور کے وہی اصول اور وہی طریقے ہوتے ہیں جو انگلستان میں رائج ہیں۔ نمائندگی، انتخاب، ذمہ دار حکومت اور دستوری سلطنت کی ساری تفصیلات کو یہ جوں کا توں انگلستان سے ہندوستان اٹھا لانا چاہتا ہے۔ یہ اس حقیقت کو نہیں جانتا کہ قوموں اور ملکوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ جس قسم کے

---

[1] *"Congress man Beware" Gandhi in the Harijan dated 10th Sept. 1938.*

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ادارات ایک ملک کے مناسب حال ہوں، لازم نہیں کہ وہ دوسرے ملک کے قامت پر بھی راست آسکیں۔ قوتِ تمیز اور اجتہادِ فکر کے بغیر محض معاصروں کی نقالی کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مشکل، بلکہ مضرت رساں۔ مگر مختلف اسباب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اس حقیقت کے بار بار سامنے لائے جانے پر بھی ہمارے وطن پرستوں کو اس کے ادراک سے روکتے ہیں۔ ایک گروہ غلامانہ ذہنیت اور محدود واقفیت کی بنا پر یہ سمجھتا ہے کہ "جمہوری ادارات" کا اطلاق صرف انگریزی طرز کے ادارات پر ہی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس طرز کی مخالفت گویا نفسِ جمہوری ادارات کی مخالفت کرنا ہے۔ دوسرا گروہ انگریزی نمونہ کی جمہوریت کو غلط سمجھتا ہے، مگر اس پر شکست خوردہ ذہنیت کا غلبہ ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ جمہوری نظام جو ہمارے برطانوی آقا اپنے ملک سے لاتے ہیں اور جس کی پشت پر مشین گن کی طاقت ہے، ہندوستان میں رائج ہونا ہے اور ہو کر رہے گا۔ لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ اس کے آگے سپر رکھ دو۔ تیسرا گروہ جو کانگریس کا اصل کار فرما اور کارکن گروہ ہے، غلامانہ ذہنیت کے ساتھ خود غرضانہ ذہنیت سے بھی ماؤف ہے۔ انگریزی طرزِ جمہوریت کو قبول کرنے میں سراسر اسی کا فائدہ ہے، کیونکہ یہ طرزِ جمہوریت اکثریت کو مالک الملک لاشریک لہا بنا دیتا ہے۔ اور اتفاق سے یہی گروہ یہاں اکثریت میں ہے۔ لہٰذا یہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں واحد قومیت کی بنیاد پر ایک "ڈیموکریٹک اسٹیٹ" قائم ہونا چاہیے۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۳۷ء تک ۵۲ سال کی مدت میں کانگریس کے مطالبات کی صورتیں بہت کچھ بدلی ہیں۔ پہلے سرکار سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ ہمارے لیے ایک ایسا دستورِ حکومت بنا دو جس میں گورنمنٹ اہلِ ملک کے سامنے جوابدہ ہو۔ اب یہ مطالبہ ہے کہ ہم خود اپنا دستور بنائیں گے۔ بظاہر پہلے موقف سے دوسرا موقف بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ مگر اصولی حیثیت سے "ڈیموکریسی" کا جو تصور ۱۸۸۵ء میں تھا، بعینہٖ آج بھی وہی ہے۔ خواہ دستورِ حکومت سرکار بنائے یا خود بنائیں۔

وطن پرستی کی اس تحریک میں انگریزی آقاؤں کا اثر محض علمی و نظری حیثیت ہی سے نہیں ہے بلکہ تقریباً ۵۰ سال سے جو سیاسی تربیت ہندوستانیوں کو ان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے برآقا دے رہے ہیں۔ وہ عملاً بھی انہی اصولوں پر مبنی ہے۔ ۱۸۶۱ء سے ۱۹۳۵ء تک جتنے دستوری تغیرات اس ملک میں ہوتے ہیں، اور نظم و نسق حکومت میں ہندوستانیوں کو شریک کرنے کی جتنی صورتیں اختیار کی گئی ہیں، ان سب میں انگریز کی اس فطری کمزوری کا اثر نمایاں نظر آتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے جمہوری ادارات کو آئیڈیل سمجھتا ہے، اور اس میں اتنی اجتہادی صلاحیت نہیں ہے کہ مختلف حالات کے لیے مختلف اصول وضع کر سکے۔ اگرچہ ابتدا سے اب تک ہر زمانہ میں انگریز مدبرین نے اس بات کو اصولاً تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان انگلستان نہیں ہے اور یہاں آنکھیں بند کر کے انگریزی طرز کے جمہوری ادارات قائم کرنا درست نہیں۔ مگر وہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ ان کے ذہن میں ہر پھر کر جمہوریت کے وہی تصورات اور وہی رنگ ڈھنگ آ جاتے ہیں جن کے ماحول میں خود انہوں نے پرورش پائی ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر اہلِ ہند کو ایک قوم فرض کر لیتے ہیں جس طرح اہلِ انگلستان ایک قوم ہیں۔ وہ جائز سمجھتے ہیں کہ یہاں ڈیموکریسی کے وہی اصول اختیار کیے جائیں جو واحد قومیت ہی کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ حالات کی رعایت زیادہ سے زیادہ ان کو جس چیز کے لیے آمادہ کر سکتی ہے وہ بس جداگانہ انتخاب ہے یعنی یہ کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو —— جنہیں وہ ایک قوم کے مختلف فرقے سمجھتے ہیں —— اپنے ہی منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ سے اپنی خواہشات کے اظہار کا موقع مل جائے۔ مگر کوئی شخص کسی دلیل سے بھی یہ بات ان کے ذہن میں نہیں بٹھا سکتا کہ جداگانہ انتخاب اُس وقت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جب ان مختلف قوموں کے مجموعہ کو ایک قرار دے کر اکثریت کی حکومت کا جمہوری قاعدہ نافذ کر دیا جائے۔ انہوں نے میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے لے کر صوبوں اور مرکز کی قانون ساز مجالس تک جتنے جمہوری ادارے اس ملک میں قائم کیے، ان سب میں کثرت رائے کے غلبہ کا اصول یکساں طور پر رائج کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ ہندوستان میں جو قوم کثیر التعداد واقع ہوئی ہے وہ زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت کی مالک ہوتی چلی گئی، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا بدترین نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ کثیر التعداد قوم اس سیاسی غلبہ کو اپنا فطری اور اخلاقی حق سمجھنے لگی اور قلیل التعداد قومیں اس فریب میں مبتلا ہو گئیں کہ جمہوریت کا مفہوم غلبۂ اکثریت کے سوا اور کچھ نہیں، اُن کو خود بھی اپنی مغلوبیت پر راضی ہونا چاہیے، کیونکہ انگلستان سے جو چیز آئے اس کے مبنی بر حق ہونے میں تو کلام ہی نہیں ہو سکتا۔

جس ملک میں ذہنی غلامی اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ کسی چیز کے بجا و درست ہونے کے لیے محض صاحب بہادر کے قول و فعل کی سند کافی سمجھی جائے، حتیٰ کہ کسی ریلوے اسٹیشن پر صاحب بہادر چائے میں برف ڈال کر پیتے ہوئے دیکھے جائیں تو غلام ہندوستانی گھر پہنچ کر برف زدہ چائے پینے لگے، وہاں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ صاحب نے جمہوریت کا جو مفہوم بتایا ہے اس کے درست ہونے میں شک کیا جائے گا۔ یہاں آزادی کے مدعی ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں، مگر دماغوں کی غلامی ان سب کا مشترک سرمایہ ہے۔ جو لوگ یہاں آزاد خیالوں کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں، ان کی غلام فطرتی بھی یہاں تک بڑھی ہوئی ہے کہ جب تک ایک وزیرِ ہند (لارڈ اولیویر) نے جداگانہ انتخاب کو جمہوریت و قومیت کے منافی نہ قرار دیا تھا اس وقت تک یہ غریب اس حقیقت سے بالکل ناواقف تھے کہ واقعی یہ چیز اس درجہ منافیِ قومیت و جمہوریت ہے، اور جب یہ بات صاحب کی زبان سے سُن لی گئی تو ڈاکٹر مونجے سے لے کر پنڈت جواہر لال نہرو تک ہر ایک اس زعم کے ساتھ اس کا اعلان کرنے لگا کہ جس قول کو سرکارِ ابد الاقتدار کی سند حاصل ہے اس کے برحق ہونے میں کس کو کلام کی جرأت ہو سکتی ہے۔ پھر جو صاحب یہاں آزاد خیالوں کے امام ہیں ان کا حال بھی یہ ہے کہ سرکار کے قائم کیے ہوئے جمہوری ادارات کو جمہوریت کی ایک ہی فطری و برحق صورت سمجھتے ہیں، اور ان ادارات کے اصول سے اختلاف کرنا ان کے نزدیک سیاسی اصلاح و ترقی کی مخالفت کرنا ہے، کیونکہ سیاسی اصلاح و ترقی کی صراطِ مستقیم ایک ہی ہے جس کی طرف غلاموں کے ہادیٔ برحق ——— صاحب بہادر ——— نے ان کی رہنمائی کی ہے، اور وہ بس یہ ہے کہ مختلف قوموں کو ایک مجموعہ قرار دے کر اس میں غلبہ

اکثریت کا جمہوری اصول نافذ کر دیا جائے۔ صاحب کے دیے ہوئے اس علم پر غلام دماغوں کا یقین خواہ عیاں اور انشراح و اطمینان اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ ریاضی کے اصول موضوعہ کی طرح اسے بیان کرتے ہیں اور اپنی ذہنی غلامی کے داغ کو چھپانے کی بھی کوشش نہیں کرتے۔ اس لیے کہ انہیں اپنی ذہنی غلامی کا احساس تک نہیں رہا۔

قومیت اور جمہوریت کے ساتھ ایک تیسرا اساسی تخیل بھی ہے جو انہوں نے صاحب کی تعلیم و تربیت سے حاصل کیا ہے اور وہ یہ کہ اسٹیٹ کو سیکولر (Secular) یعنی غیر دینی ہونا چاہیے۔

غیر دینی کا ایک سادہ مفہوم یہ ہے کہ اسٹیٹ کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو، وہ بجائے خود دنیوی ہو، اس کی اساس کسی مخصوص شریعت پر نہ ہو، وہ کسی خاص مذہب کی نصرت و حمایت نہ کرے گا، اس کے ساتھ ہی وہ مخالفِ دین (Anti Religious) بھی نہ ہو بلکہ اپنے دائرے میں مذہبی نظامات کو تسلیم کرے اور ان کو حکومت کے اختیارات میں سے کم از کم اتنے اختیارات تفویض کر دے جو اندرونی تنظیم کے لیے ضروری ہیں۔ مثلاً اپنے پیروؤں پر ٹیکس عاید کرنا، مذہبی قوانین کو ان پر نافذ کرنا اور ان کی دینی تعلیم کا انتظام کرنا، عام اس سے کہ وہ علیحدہ مدارس کی شکل میں ہو یا مشترک تعلیمی نظام کے ماتحت ہو۔ نازی دور سے پہلے تک جرمنی میں غیر دینی اسٹیٹ کا یہی مفہوم تھا اور اب بھی یوگوسلاویا، پولینڈ، لتھوانیا، فن لینڈ، اور ایستھونیا میں یہی مفہوم ہے غیر دینی اسٹیٹ کا۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ دین کی نفی (Negation) پر قائم ہو، مخالفِ دین ہو، اس میں کسی دینی نظام کو تسلیم نہ کیا جائے۔ باشندوں کی اس حیثیت کو کہ وہ کسی خاص دین کے پیرو ہیں بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور عمومی حاکمیت (Popular Sovereignty) کی تعبیر یہ کی جائے کہ باشندگانِ ملک ہونے کی حیثیت سے تو سب باشندے حاکمیت میں حصہ دار ہیں، مگر ایک مذہب کے پیرو ہونے کی حیثیت سے اس حاکمیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، لہٰذا وہ خود اپنی حکومت سے بھی اپنے دینی نظام کی ترقی و استحکام کے لیے کوئی طاقت حاصل نہیں کر سکتے۔ دینی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے اس مفہوم نے یورپ میں دو مختلف صورتیں اختیار کی ہیں: ایک ظالمانہ (Aggressive)، جس میں حکومت کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی لوگوں کو لامذہب بنایا جائے۔ اس کی مثال روس ہے۔ دوسری صورت معتدل ہے جس میں حکومت کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ مذہبی نظامات کو زندگی کی طاقت پیدا کرنے والے تمام وسائل سے محروم کر دیا جائے تاکہ وہ خود سوکھ کر مر جائیں۔ اس کی مثال چیکوسلواکیا ہے جہاں تعلیم کا نظام کلیۃً حکومت کے ہاتھ میں ہے، اور اس سے دینی عنصر کو قطعاً خارج کر دیا گیا ہے، اور حکومت سرکاری طور پر کسی قوم کے دینی نظام کو تسلیم نہیں کرتی۔

ہندوستان میں ہمارے آقاؤں نے جو طریق کار اختیار کیا ہے وہ ایک عجیب قسم کی معجون مرکب ہے۔ بادشاہ سلامت حامئ دین (Defender of the Faith) بھی ہیں، اور اسٹیٹ کی طرف سے ایک مذہبی محکمہ (Ecclesiastical Department) بھی قائم ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلطنت کا کوئی مذہب نہیں ہے اور اس کا مذہب نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ مذہبی رواداری کے اصول پر قائم ہے۔ دینی لادینی کا پہلا مفہوم، مگر عملاً باشندگانِ ملک کے مذہب سے وہ برتاؤ کیا جاتا ہے جو چیکوسلواکیا کی روش سے ملتا جلتا ہے۔ اس عجیب کھچڑی کی تحلیل اگر سائنٹیفک طریقہ سے کی جائے تو اس کے تین اجزا برآمد ہوں گے۔

۱۔ مذہبی رواداری کا اعلان و اظہار۔

۲۔ ایک خاص عقیدہ و مسلک کی طرف نظرِ عنایت۔

۳۔ دوسرے تمام عقائد و مسلک کے ساتھ سنگدلانہ سردمہری۔

ہندوستان میں "دنیوی" اسٹیٹ کا یہ مرکب تصور فکر و عمل دونوں حیثیتوں میں ڈیڑھ سو برس سے پرورش پا رہا ہے اور ہمارے وطن پرستوں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی تصور کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہماری تحریک غیر دینی ہے اور ہم ایسا دنیوی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جس کی بنا کسی مذہب پر نہ ہوگی مگر اس میں مذہبی رواداری ہوگی۔ یہ آقایانِ نامدار کے بنائے ہوئے کھچڑ کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہلا جزو ہے۔ اور دوسرا جزو یہ ہے کہ ان کا لیڈر ایک "مہاتما" ہے جو صداقت (Truth) اور اہنسا (Non-Violence) کے خالص ہندوانہ تصورات کا علمبردار اور مبلغ بن کر اٹھا ہے جس کے تصورات جنگِ آزادی کی فکری بنیاد ہیں[1] جو صاف کہتا ہے کہ عدم تشدد پالیسی نہیں بلکہ دین و ایمان ہے۔ اس کی رہنمائی میں تمام باشندگانِ ہند کے لیے سرکاری طور پر عمومی تعلیم کے خاکے بنائے جاتے ہیں اور ان سب میں اس کے دین و ایمان کو اساسی حیثیت دی جاتی ہے[2]۔ اب رہ گیا تیسرا جزو تو اس کی بھی پوری مقدار اس مضمون میں شریک کی گئی ہے۔ صاف صاف کہا جا چکا ہے کہ باشندوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا اسٹیٹ کے فرائض سے خارج ہے، اور اس کے برعکس یہ چیز اسٹیٹ کے فرائض میں داخل ہے کہ باشندوں کو جبراً ایسی تعلیم دے جو ان کے ذہن سے اپنے مذہب کی برتری کا خیال نکال دے۔ خود مہاتما گاندھی جنہوں نے اپنے مذہب کو بااصرار وردھا سکیم کا جزو لاینفک بنوایا ہے، اپنے مذہب کے سوا دوسرے تمام مذاہب کو نظامِ تعلیم سے خارج کر دینے کے لیے یہ دلیل ارشاد فرماتے ہیں:۔

"تمام مذاہب کا یکساں لحاظ رکھنے کی تعلیم دینا ایک ایسی ضرورت ہے جس کے حق میں میرے خیالات بہت سخت ہیں۔ جب تک ہم اس خوشگوار حالت (یعنی سب مذاہب کو ایک نظر سے دیکھنے اور سب کو مساوی طور پر برحق سمجھنے کی حالت) کو نہ پہنچ جائیں گے، اس وقت تک مختلف فرقوں میں حقیقی وحدت پیدا ہونے کی مجھے کوئی توقع نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک یہ بات مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بچوں کے درمیان دوستانہ اسپرٹ کے نشوونما کو غارت کرنے والی ہوگی اگر ان کو یہ سکھایا

---

[1] پنڈت جواہر لال کے بقول کانگریس سے عظیم تر" (Greater than Congress itself)"

[2] وردھا اسکیم، ودیا مندر اسکیم اور اصلاح دیہات کی اسکیم (جیسے ڈاکٹر سید محمود نے بہار میں جاری کیا ہے) تینوں میں اہنسائی تعلیم کو اساس کی حیثیت دی گئی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جائے کہ ان کا مذہب دوسرے مذاہب سے بہتر ہے یا یہ کہ وہی ایک سچا مذہب ہے۔ اگر قوم (؟ ہندوستانی قوم) پر یہی اختصاصی جذبہ مستولی رہے تو اس سے لازم آئے گا کہ یا تو ہر مذہب والوں کے الگ الگ مدرسے ہوں جن میں ہر ایک کو دوسرے پر طعن کرنے کی آزادی حاصل رہے، یا پھر مذہب کا نام لینے ہی کو کلیتہً ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس قسم کا طرزِ عمل اختیار کرنے کے نتائج اتنے خوفناک ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق کے بنیادی اصول تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ وہ ضرور بچوں کو سکھائے جانے چاہئیں اور جہاں تک وارد ھا اسکیم کے ماتحت مدارس کا تعلق ہے۔ ان میں بس اتنی ہی مذہبی تعلیم کو کافی سمجھنا چاہیے۔"[1]

اسی خیال کی ترجمانی ایک دوسرے ذمہ دار شخص مسٹر سمپورنانند (یو۔ پی کے وزیر تعلیم) نے اپنی ایک تقریر میں کی ہے جو انہوں نے ۴ر اپریل ۳۸ء کو یو۔ پی کی لیجسلیٹو اسمبلی میں ارشاد فرمائی تھی:۔

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے، وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ ہندوستان میں یہ چیز مفقود ہونی چاہیئے۔ ہم ایک ہندوستانی تہذیب چاہتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسروں کے لیے جو اس ملک میں آئے ہیں اور جنہوں نے اس کو اپنا گھر بنانا چاہا ہے بالکل ایک ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی ملک کی ترقی میں کوشاں رہے تو اس کو ایسی بات پر زور دینا چاہیے جس سے ہم میں تفرقے پیدا نہ ہوں جو سب کے لیے ضرر رساں ہیں، بلکہ ایسے امور ہوں جن سے

---

[1] ہریجن، مورخہ ۱۶ر جولائی ۳۸ء۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہندوستانی تہذیب کی تعمیر و ترکیب ہوتی ہو۔ تمام وہ باتیں جن سے ہم میں تفرقہ اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یقیناً ملک کے ساتھ دشمنی کرتی ہیں۔ اس لیے ملک کا عام مفاد مدنظر رکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ وہ لوگ جو لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس میں ہندو اور مسلم تہذیب قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس بات پر زور نہ دیں گے"۔[1]

اسی تقریر کا ایک فقرہ یہ بھی ہے۔

"جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائیں گی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکے گی"۔[2]

ان تحریروں اور تقریروں سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی وطن پرست جو اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں وہ ایک معنی میں دینی اسٹیٹ ہے اگر دین سے مراد مہاتما گاندھی کا دین لیا جائے، اور ایک معنی میں لادینی بلکہ مخالف دین (Anti Religious) اسٹیٹ ہے اگر دین سے مراد ہندوستان کے ان باشندوں کا دین لیا جائے جو دین گاندھی کے پیرو نہیں ہیں۔ انکے حق میں اس اسٹیٹ کا رویہ غیر جانبدارانہ رواداری کا نہ ہوگا بلکہ چیکوسلواکیہ کی طرح غیر ہمدردانہ اور ایک حد تک مخالفانہ ہوگا۔ اس کا مطمح نظر صریحاً یہ بتایا جا رہا ہے کہ مختلف قوموں کی تہذیبیں کسی نہ کسی طرح فنا ہو جائیں، ان کا مذہبی زاویۂ نظر بدل جائے، اور وہ تمام مذاہب کو برابر سمجھنے لگیں، یعنی کسی مذہب کے پیرو نہ رہیں، کیونکہ ایک مذہب کی پیروی کے لیے اس کو سب سے بہتر اور صحیح تر جاننا فطری طور پر ناگزیر ہے۔ اس کے بعد یہ خیال کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں رہتا کہ ایسا اسٹیٹ کسی مذہبی نظام کو قانوناً تسلیم کرے گا اور اس کو تعلیم اور اندرونی تنظیم کے لیے وہ حقوق اور اختیارات دے گا جن کی مثالیں ہم نے اور یورپ کے متعدد ممالک سے پیش کی

---

[1] مدینہ۔ مورخہ ۲۱ اپریل ۳۸ء

[2] ٹریبیون مورخہ ۵ ر اپریل ۳۸ء

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔

ان تشریحات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے وطن پرست ہندوستانی[1] کے لیے جس قسم کی آزاد حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کی بنیادی خصوصیات تین ہیں:-

۱۔ "نیشنل اسٹیٹ" اس معنی میں کہ باشندگان ہندوستان کی پوری آبادی کو ایک قوم قرار دیا جائے اور جداگانہ قومیتوں کی نفی کر دی جائے۔

۲۔ "جمہوری اسٹیٹ" اس معنی میں کہ باشندگانِ ہند کو ایک مجموعہ قرار دے کر اس میں غلبۂ اکثریت کا اصول نافذ کیا جائے۔

۳۔ "دنیوی اسٹیٹ" اس معنی میں کہ جہاں تک ہندوستان کی مختلف قوموں کے مذہب کا تعلق ہے ان کے لحاظ سے وہ ایک لادینی اسٹیٹ ہو۔

اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس نوعیت کا اسٹیٹ دراصل کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس کو اپنا مطمح نظر بنا سکتے ہیں؟ کیا ایسے اسٹیٹ میں ہمارے مسلمان ہونے کی حیثیت برقرار بھی رہ سکتی ہے؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ ہم اس کو قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیں، یا صبر و سکون کے ساتھ اس کے قیام کو گوارا کریں؟ آئندہ باب میں ہم ان سوالات پر بحث کریں گے۔

---

[1] ۲۹ اگست ۳۸ء کو مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی (سنٹرل اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر) نے شملہ میں ایک تقریر فرمائی تھی جس میں اسٹیٹ کی انہی تین بنیادوں کو پوری طرح تشریح کے ساتھ بیان کیا تھا۔ یہ تقریر یکم ستمبر ۳۸ء کے اخبارات میں شائع ہوئی ہے اور اس کا مطالعہ ہندوستانی وطن پرستوں کے طریق فکر اور نصب العین کو سمجھنے میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۱۰

قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ

کیا مسلمان اس کو قبول کر سکتے ہیں؟

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ عام ناظرین کی سہولت کے لیے چند اصطلاحات کی تشریح کر دی جائے۔

لفظ اسٹیٹ جس کا مترادف ہماری زبان میں "ریاست" کا لفظ ہے۔ علم سیاست کی اصطلاح میں اُس نظام کو کہتے ہیں جو ایک متعین رقبۂ زمین میں رہنے والی آبادی کو قاہرانہ طاقت (Coercive Power) سے ضبط میں رکھتا ہو۔ قوت قاہرہ کا وجود ایک طرف، اور اطاعت کا پایا جانا دوسری طرف، ان دو چیزوں کے بہم ہو جانے سے وہ نظمی ہیئت بن جاتی ہے جسے اسٹیٹ یا ریاست کہا جاتا ہے۔

اسٹیٹ کی اس تعریف کو سمجھنے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ قوتِ قاہرہ جس کی اطاعت ایک آبادی کر رہی ہے خود اس آبادی کے اندر اس کے مجموعہ میں سے اُبھرتی ہے یا کہیں باہر سے آتی ہے؟ اگر اس کے اجتماعی وجود سے الگ کوئی طاقت ایسی ہے جو اس پر حاکمانہ اختیار استعمال کرتی ہے تو وہ غلام ہے۔ اور اگر وہ آبادی خود حاکمیت (Sovereignty) کی مالک ہے اور اپنی رضامندی سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک نظمی ہیئت کو قوت قاہرہ فراہم کر کے دیتی ہے تاکہ وہ اس کے معاملات کی تنظیم کرے تو وہ خود مختار جماعت ہے۔ کسی آبادی کا اس طور پر اپنے اوپر حکمران ہونا یا بالفاظِ دیگر حاکمیت سے متمتع ہونا، جمہوریت کا اصل مفہوم ہے۔ جب ہم کسی اسٹیٹ کو "جمہوری اسٹیٹ" کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اسٹیٹ جن باشندوں سے مرکب ہے وہی اس کی حاکمیت کے مالک ہیں۔ گورنمنٹ جو ان کے اسٹیٹ کا انتظام کرتی ہے، ان کی اجتماعی رضامندی کی تابع ہے، اور اس کا منصب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ان کی خواہشات کو وضعِ قوانین اور تنفیذِ قوانین میں روبعمل لائے۔

مغرب کے جمہوری نظام کا عمل اس کے نظریہ سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ نظری حیثیت سے تو اسٹیٹ کے ہر فرد کو حاکمیت حاصل ہے اور وہ اس کے استعمال کا حق رکھتا ہے۔ لیکن عملاً یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر ہر شخص کی خواہش کے مطابق قوانین بنیں اور حکومت کی جائے۔ لہٰذا عملی اغراض کے لیے جمہوریت کا قاعدہ یہ قرار دیا گیا کہ حکومت ہمیشہ اکثریت کی خواہشات کے مطابق ہوگی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ جمہوری حکومت جن خوشنما نظریات سے شروع ہوتی ہے، عمل کی سرحد میں آکر وہ رخصت ہو جاتے ہیں اور ان سب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ مملکت کے باشندوں کا ایک حصّہ دوسرے حصّہ کو حاکمیت سے عملاً محروم کر کے ان پر اپنی خواہشات مسلط کر دے۔ ہر ملک میں مختلف گروہ مختلف قسم کے مفاد، مذاق، خواہشات اور اغراض رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان سب کے اشتراکِ عمل ہی سے تمدن کی مشین چلتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک مملکت کی اجتماعی خوش حالی اور فلاح و بہبود میں کسی نہ کسی حیثیت سے اپنا حصّہ ادا کرتا ہے۔ ہر ایک کے لیے اس کی اغراض اور خواہشات اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں جتنی دوسرے کے لیے اس کی اغراض و خواہشات۔ لیکن جمہوری نظام میں جب اکثریت کی حکومت کا اصول اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو گروہ کثیر تعداد میں ہے وہ حاکم بن جاتے اور حکومت کے زور سے اپنی اغراض و خواہشات حاصل کرنے اور جر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گروہ قلیل تعداد میں ہے وہ غلام بنا لیا جائے اور اکثریت کی اغراض و خواہشات پر اس کی اغراض و خواہشات اسی طرح قربان کی جائیں جس طرح کسی زار یا کسی قیصر کی انتہائی ظالمانہ حکومت میں کی جا سکتی ہیں۔ یہی چیز ہے جس کو اکثریت کا استبداد (Tyranny of the Majority) کہتے ہیں اور جو اس زمانہ کی جمہوریتوں کے چہرے پر سب سے زیادہ بدنما داغ ہے۔

اکثریت کی حکومت کا اصول صرف اس جگہ صحیح ہو سکتا ہے جہاں کے باشندے اساسی امور (Fundamentals) میں متفق ہوں اور ان کے درمیان اختلاف محض آراء کا ہو، نہ کہ اغراض کا۔ ایسی جگہ تو یہ ممکن ہے کہ آج کی اقلیت کل اکثریت بن جائے، اور آج کی اکثریت کل اقلیت بن جائے۔ رائے عام اگر محض رائے عام ہے تو وہ بدل سکتی ہے اور بدل جا سکتی ہے۔ کل رائے عام لبرل پارٹی کی مؤید تھی تو آج وہ لیبر پارٹی کے حق میں ہموار ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی اکثریت نہ مستقل اور دائمی اکثریت ہوگی نہ کبھی ظلم و جور کا طریقہ اختیار کر سکے گی، اور نہ اقلیت کو اس سے یہ اندیشہ ہوگا کہ وہ اساسی امور پر ضرب لگائے گی ——— لیکن اغراض ——— یا خود غرضی ——— کا اختلاف، اور مذہبی اصولوں کا، یا قومی جذبات کا، یا طرزِ زندگی کا اختلاف وہ چیز نہیں ہے جو دلائل سے دُور کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے جو گروہ اکثریت میں ہے وہ مستقل طور پر اکثریت میں رہے گا۔ ایسی اکثریت کو حکومت کا حق دینے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک زار کی جگہ لاکھوں زار اور ایک قیصر کی جگہ کروڑوں قیصر پیدا ہو جائیں اور محض اس بنا پر کہ ان کے سروں کی تعداد زیادہ ہے، ان کے لیے یہ جائز ہو جائے کہ اپنے ہی ہم وطن لوگوں کی ایک معتدبہ جماعت پر جس طرح چاہیں ظلم و ستم کریں۔ یہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی صریح اور کھلی نفی ہے۔ اس چیز پر لفظ جمہوریت کا اطلاق ہی غلط ہے۔ اسے بڑے پیمانہ پر چنگیزیت کہنا چاہیے۔

جن ممالک میں باشندوں کے درمیان قومی تفریق موجود ہے، یعنی مذہب، نسل، زبان، رنگ وغیرہ امور میں اختلاف پایا جاتا ہے، اور اسی طرح جہاں نظریات

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

اور اصول زندگی کا اساسی اختلاف ہے، یا باشندوں کے مختلف گروہوں کی اغراض باہم متصادم ہیں، وہاں مختلف عناصر کو ملا کر ایک اسٹیٹ بنانے اور اس میں جمہوریت کا اصول نافذ کر دینے کا نتیجہ ظلم کے سوا کچھ نہیں نکلا، اور ہمیں دنیا کی پوری تاریخ میں ایک مثال بھی نہیں ملی جس کو مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہو۔

روس میں مزدوروں کی حکومت قائم ہونے کے بعد متوسط طبقہ کے لوگ، چھوٹے زمیندار، تجارت پیشہ اور دوکاندار، اور ان سب سے زیادہ مذہبی گروہ جس بُری طرح پیسے گئے اور آج بھی جس طرح وہ غلام بنا کر رکھے گئے ہیں، اس حالت کا تقابل اگر زار کی حکومت کے مظالم سے کیا جائے تو شاید زاریت ہی کو اشتراکیت کے آگے سر نیاز جھکا دینا پڑے۔ یہ اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جہاں خود غرضی بنائے اختلاف ہو وہاں ایک قسم کی اغراض رکھنے والوں کا حکمران بن جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دوسرے تمام گروہوں کا خون چوس لیں اور ان کو اپنی خود غرضی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

مغرب میں وطنیت کے تجربات

چیکوسلوواکیہ میں اب سے ۱۸ سال قبل مختلف چھوٹی اور بڑی قوموں کو ملا کر ایک جمہوری اسٹیٹ بنایا گیا تھا۔ اس سیاسی حماقت کا جو انجام ہوا آج اُسے ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ سب سے بڑھ کر جن قوموں سے توقع تھی کہ ان کو مل کر ایک قوم بن جائے گی انہی نے مصنوعی قوم سازی کے نظریہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس نئی ریاست کے اصل اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک چیک (Czech)، دوسرے سلاوک (Slavaks)۔ نسل اور قومی روایات کے لحاظ سے دونوں بالکل مختلف ہیں۔ گزشتہ ہزار برس کی تاریخ میں کہیں ان کے درمیان کسی ربط و ارتباط کا نشان نہیں ملتا۔ صرف ایک چیز ان کے درمیان مشترک تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ دونوں آسٹریا ہنگری کے غلام تھے۔ اور دونوں کو ظالم سلطنت کی نفرت اور آزادی کی خواہش نے ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا تھا۔ سیاسی مدبرین یہ سمجھے کہ مشترک دشمن کی عداوت اور اس کے پنجہ سے آزادی حاصل کرنے کا مشترک جذبہ دو قوموں کو ایک قوم بنا دینے کے لیے کافی بنیاد ہے۔ چنانچہ انہوں نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان دونوں کو ملا کر ایک نئی قوم "چیکوسلاوک" وضع کر دی اور اس کو بالفعل موجود فرض کر کے ان کی ایک قومی جمہوری ریاست بھی بنا دی۔ لیکن اس جدید ریاست کی تشکیل پر کچھ زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ دو قوموں کو ساتھ ملا کر باندھ دینے سے ایک قوم نہیں بن جایا کرتی۔ مصنوعی قومیت آزمائش کی کسوٹی پر رگڑ کھاتے ہی کھوٹی ثابت ہو گئی۔ چیک کثیر التعداد تھے، زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ سرمایہ دار تھے، اور آسٹریا ہنگری کے مظالم نے ان کو سلطنت کے ساتھ مذہب سے بھی متنفر کر دیا تھا۔ ان کے برعکس سلاوک لوگ سخت پابند مذہب، تعلیم میں بہت پیچھے، زیادہ تر زراعت پیشہ اور خستہ حال، اور تعداد میں بھی چیکوں کی بہ نسبت کم۔ اس تفاوت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت نے دستور حکومت میں یہ طے کر دیا کہ قومی اسٹیٹ بالکل ایک غیر مذہبی اسٹیٹ (Secular State) ہوگا۔ اس میں تمام مذاہب کے ساتھ رواداری تو ضرور برتی جائے گی، مگر کسی مذہب یا مذہبی نظام کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا جائے گا۔ تعلیم کا پورا نظام اسٹیٹ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور ایسی تعلیم دی جائے گی جو سائنٹیفک تحقیقات کے نتائج سے متصادم نہ ہوتی ہو۔[1] دستور العمل کی ان دفعات سے فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت کی حکومت نے سلاوک علاقے کے مدارس میں لامذہب اسکول ماسٹر بھیجنے شروع کر دیے اور نظام تعلیم سے مذہبی تعلیم کو قطعی خارج کر دیا۔ سلاوک لوگوں نے اپنی مذہبی تعلیم کے لیے بطور خود کوئی انتظام کرنا چاہا تو اسے سرکاری امداد دینے سے انکار کر دیا گیا۔ حکومت کے نظم و نسق اور خصوصاً بڑے بڑے ذمہ داری کے مناصب کو چیکوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ اور خود سلاوک علاقوں میں چیک افسر حکمران بن کر آنے لگے۔ ان ہی باتوں نے آخر کار سلاوک لوگوں کو اس بات کا قائل کر دیا کہ ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنانا دراصل چھوٹی قوم کو بڑی قوم کی غلامی میں دینا ہے۔ چنانچہ اب وہ کئی سال سے اپنے علاقے کے لیے حکومت خود اختیاری (Autonomous Self Government) کا

---

[1] ملاحظہ ہو ۱۹۲۰ء کا چیکوسلاوک کانسٹی ٹیوشن دفعات ۱۱۹- ۱۲۱ - ۱۲۲ - ۱۲۴ -

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مطالبہ کر رہے ہیں[1]

اسی "قومی جمہوری ریاست" میں تقریباً ۲۵ لاکھ جرمن بھی شامل کر دیے گئے تھے (یعنی کل آبادی کا ۱/۴ حصہ) جن کی قومیت، نسل، زبان، تاریخی روایات چیک اور سلاوک دونوں قوموں سے بالکل مختلف تھیں، بلکہ صدیوں سے چیک اور جرمن نسل میں کھلی عداوت چلی آتی تھی۔ مدارس میں، کارخانوں میں، کلیساؤں میں، جہاں کہیں چیک اور جرمن جمع ہوتے وہاں اکثر ہنگامے ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دوکان میں دونوں سے یکجا کام لینا مشکل تھا۔ حتیٰ کہ ایک اسٹیشن سے ان کا ریل پر سوار ہونا بھی دشوار تھا جس کی وجہ سے اکثر چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی دو اسٹیشن بنائے جاتے تھے۔ تا کہ ایک سے چیک سوار ہوں اور دوسرے سے جرمن[2]۔ اس قدر شدید اختلافات کے باوجود ان دونوں کو ایک قومیت میں شامل کر کے ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا جس میں چیک اپنی اکثریت کی بنا پر حاکم اور جرمن اپنی اقلیت کی بنا پر محکوم تھے، حالانکہ صدیوں تک اسی سرزمین میں جرمن حاکم اور چیک محکوم رہ چکے تھے۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اسے ابھی حال ہی میں ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ ثابت ہو گیا کہ محض ایک قومی اسٹیٹ بنا دینے سے دو مختلف قومیں ایک قوم نہیں بن سکتیں اور نہ ان میں ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دینے سے جمہوریت کی حقیقی روح پیدا ہو سکتی ہے۔ البتہ مصنوعی طور پر دو قوموں کی ایک قومیت اور ایک جمہوریت بنا دینے کا یہ اور صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کثیر التعداد قوم عملاً قلیل التعداد قوم کو غلام اور جمہوری نظام میں اس کو حاکمیت کے فطری حقوق سے محروم کر کے رکھ دے۔ چیک اکثریت نے جرمن اقلیت کے ساتھ یہی کیا۔ تعلیم کے ذریعہ سے جرمنوں کو چیک قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی گئی۔ جرمن زبان و ادب کو مٹانے اور دبانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ سرکاری ملازمتوں میں جرمن اور چیک کا قومی امتیاز کبھی نہ بھولا گیا اور ہمیشہ چیکوں کو

---

[1] *The New Slavakia ; R. W. Seton Watson*

[2] *Europe Since 1815, by C. D. Hazen*

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جرمنوں پر ترجیح دی گئی۔ تجارتی کاروبار اور سرکاری کام کے ٹھیکوں تک میں جرمنوں کو دبانے اور چیکوں کو بڑھانے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا گیا۔ حتیٰ کہ خاص اُن علاقوں میں جہاں ۸۰ اور ۹۰ فی صدی جرمن آبادی تھی، سرکاری ضروریات کے لیے چیکوں کو ٹھیکے دیے جانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سُڈیٹن جرمنوں کی معاشی حالت روز بروز گرنی شروع ہو گئی اور ان کے کاروبار بیٹھنے لگے۔ یہ سب کچھ اُس قومی جمہوری اسٹیٹ میں ہوا جس کی "متحدہ وطنی قومیت" کا ایک جُزو یہ جرمن بھی تھے۔ جس کے جمہوری نظام میں ان کو دستور کی رُو سے پُورے شہری حقوق عطا کیے گئے تھے اور جس کی دولت مشترکہ (Common-Wealth) کی ملکیت میں نظریّے اور دستور یکساں حصہ دار تھے۔ لیکن ۲۰ سال کے تجربے نے بتا دیا کہ "قومی" اور "جمہوری" کے معنی لغت میں کچھ اور ہوتے ہیں اور حقیقت میں کچھ اور۔ آخرکار جرمنوں میں وہ عظیم الشان ہیجان رُونما ہوا جو قریب تھا کہ تمام دنیا کے امن و امان کو پھونک دیتا اگر عین وقت پر عقل مندی سے کام لے کر جرمنوں کو جرمنی کے حوالہ نہ کر دیا جاتا۔

اسی قسم کے حالات ان دوسرے ممالک کے بھی ہیں جہاں مختلف قوموں کو ایک قومیت فرض کر کے ایک جمہوری اسٹیٹ میں ضم کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوگوسلافیا کو لیجیے۔ اُنیسویں صدی کے آخری دور میں آسٹریا ہنگری کے ظالمانہ تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے کروٹ (Croats) اور سلافینی (Slovenes) قوموں میں آزادی کا زبردست جذبہ پیدا ہوا۔ اور انہوں نے اپنے ہمسایہ سربیوں (Serbs) سے اتحاد کر لیا۔ ان مختلف عناصر کے درمیان آسٹریا کی عداوت اور آزادی کی مشترک خواہش کے سوا اور کوئی وجہِ اتحاد نہ تھی۔ نسل میں اختلاف، مذہب میں اختلاف، زبان میں اختلاف، اور طرزِ زندگی میں اختلاف، مگر طلبِ آزادی کے نشے میں ان سب اختلافات کو نظرانداز کر کے یہ سب گھُل مِل گئے، اپنی متحدہ قومیت کا نام انہوں نے "یوگوسلافیا" رکھ لیا اور اپنی الگ زبانوں کے نام ملا کر ایک متحدہ قومی زبان کا عجیب و غریب نام (Serbo-Croation Solovene) رکھا، جس کا مسمّیٰ کہیں دنیا میں موجود

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہ تھا بلکہ تین الگ الگ زبانیں مختلف رسم الخطوں اور مختلف لسانی خصوصیات کے ساتھ موجود تھیں اور "ہندوستانی" کی طرح بس ان کا ایک متحدہ نام رکھ دیا گیا۔ جنگ عظیم کے دوران میں جب یہ تینوں قومیں آسٹریا ہنگری کے خلاف برسرپیکار ہوئیں تو جولائی ۱۹۱۷ء میں سربیا کے وزیر اعظم اور جگوسلاف کمیٹی کے صدر کا ایک مشترک بیان اس مضمون کا شائع ہوا کہ:-

> "سرب کروٹ اور سلافینی ایک قوم ہیں۔ آئندہ کے لیے یہ اپنا ایک قومی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جو جمہوری اسٹیٹ ہوگا۔ اس متحدہ اسٹیٹ کا جھنڈا الگ ہوگا اور تینوں عناصر کے جھنڈے الگ الگ ہوں گے جن کی حیثیت مساویانہ ہوگی۔ اسی طرح سریلک (Cyrillic) اور لیٹن (latin) دونوں رسم الخط سرکاری طور پر مساوی ہوں گے اور مذاہب یعنی آرتھوڈوکس کیتھولک اور اسلام کا درجہ بھی مساویانہ تسلیم کیا جائے گا۔"

مگر جنگ ختم ہونے کے بعد جب آزادی ملی اور نومبر ۱۹۲۰ء میں نئی ریاست کی بنا رکھی گئی تو صورت حال کچھ اور ہی تھی۔ ریاست کی ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی میں پچاس لاکھ کے قریب سرب تھے، تیس لاکھ کیتھولک کروٹس اور دس لاکھ سلافینی۔ ان کے علاوہ جرمن، ہنگیرین، رومانی، بلغاری اور البانوی بھی کئی کئی لاکھ کی تعداد میں شامل ہو گئے تھے۔ اگرچہ ان سب کو ملا کر سربی گروہ اقلیت میں تھا، لیکن الگ الگ ہر گروہ کے مقابلہ میں اس کی بڑی اکثریت تھی، اور ان اقلیتوں کے درمیان کامل اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے اس کی پوزیشن اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر سربیوں نے عملاً حاکم قوم کی حیثیت اختیار کر لی، تمام اقلیتوں کو محکوم بنا لیا، متحدہ قومیت کا تخیل ہوا میں اڑ گیا، اور حکومت کے زور سے سربی قومیت تمام قلیل التعداد جماعتوں پر مسلط کی جانے لگی۔ تاسیس ریاست کے بعد پہلی مرتبہ جب ملک کا دستور بنانے کے لیے نیشنل کونسل منعقد ہوئی تو سربی قوم پرستوں نے یوگوسلافی قومیت کا لبادہ اتار کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھینک دیا اور خود مختار صوبوں کا ایک وفاق بنانے کے بجائے ایک مضبوط مرکزی طاقت رکھنے والی بادشاہی کی بنا رکھ دی جس کا فرمانروا سربیا کا بادشاہ تھا اور جس کا پایۂ تخت سربیا کا پایۂ تخت تھا۔ آج اس "قومی جمہوری حکومت" کا کھلا ہوا مسلک یہ ہے کہ اقلیتوں کی قومیت کے ایک ایک نشان کو مٹا دے، اور تمام اقلیتیں تقریباً ۱۸ سال سے پیہم کوشش کر رہی ہیں کہ اس پھندے سے، جس کو خود انہوں نے خوشی خوشی پہنا تھا کسی طرح نکلیں۔¹

جمہوریت کے بڑے مرکز

ان چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر ان بڑے ممالک کو لیجیے جو آج جمہوریت اور دستوریت کے ابرار آبا سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی جہاں کہیں مختلف مذاہب یا مختلف نسلی قومیتوں کو ملا کر ایک قومیت بنی ہے، جبر اور ظلم ہی سے بنی ہے اور قومی جمہوری اسٹیٹ وہاں اسی طرح بنا ہے کہ آبادی کے ایک کثیر التعداد اور منظم گروہ نے چھوٹے گروہوں پر زبردستی اپنی خواہشات اور اپنے اصولوں کو مسلط کیا اور ان کے امتیازی وجود کو مٹا کر رکھ دیا۔

سوئس قوم اور اس کی جمہوری وفاقی ریاست کس طرح بنی؟ ابتداءً ۲۲ آزاد جمہوری ریاستوں کا محض ایک تحالف (Confederation) تھا۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں مذہبی آزاد خیالی کے اثرات سوئٹزرلینڈ پہنچے اور مذہب کو تعلیم اور سیاست دونوں سے خارج کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ سات کیتھولک ریاستوں نے اس کی مخالفت کی،

---

¹ تفصیلات کے لیے حسب ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں:-

1:- *Europe Since, 1815 by C. D. Hazen*

۲:- *The New Democratic Constitution of Europe by A. H. Morley*

۳:- *Encyclopoedia Britannica, Article Yogoslovia*

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۵ آزاد خیال ریاستوں نے ان پر زبردستی اپنے خیالات کو مسلط کرنا چاہا جس کا انہیں از روئے آئین کوئی حق نہ تھا۔ آخر ۱۸۴۷ء میں ساتوں کیتھولک ریاستیں تحالف سے الگ ہوگئیں اور تحالف کے اصول کی رو سے وہ پوری طرح اس کی مجاز تھیں۔ مگر آزاد خیال ریاستوں نے اپنی غالب اکثریت سے ان کے اس فعل کو ناجائز ٹھیرایا اور ان کے علاقوں پر حملہ کر کے انہیں زبردستی ایک وفاقی اسٹیٹ میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر ۱۸۴۸ء میں جو نیا دستور بنایا گیا اس میں وفاقی ریاستوں کے اختیارات محدود کر کے مرکز کے اختیارات نہایت وسیع کر دیے گئے، تاکہ اکثریت پوری طرح اقلیت پر اپنی مرضی اور اپنے اصولوں کو نافذ کر سکے اور اقلیت مجبور ہو کر اس واحد قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دے جسے آزاد خیال لوگ (Radicals) وجود میں لانا چاہتے تھے۔[1]

برطانیہ میں کیا ہوا؟ انیسویں صدی کے ثلث اوّل تک برطانیہ عظمیٰ میں انتخاب کا قانون اس قسم کا تھا کہ انگلینڈ کو، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور آئرلینڈ، تینوں کی مجموعی طاقت سے قریب قریب تین گنی زیادہ اکثریت پارلیمنٹ میں حاصل ہوتی تھی۔ انگلستان کی صرف ایک کاؤنٹی (کارنوال) کے نمائندے پورے اسکاٹ لینڈ کے نمائندوں کے برابر تھے حالانکہ اسکاٹ لینڈ کی آبادی کارنوال سے آٹھ گنی تھی۔ کوئی یہودی اور کوئی ایسا شخص جو اینگلیکن چرچ کو نہ مانتا ہو، از روئے قانون نہ تو پارلیمنٹ کا ممبر بن سکتا تھا، نہ کسی سرکاری عہدے پر مامور ہو سکتا تھا اور نہ کسی میونسپلٹی میں داخل ہو سکتا تھا۔ ان سب فرقوں کو چرچ آف انگلینڈ کے لیے عُشر دینا پڑتا تھا۔ نکاح کے لیے چرچ آف انگلینڈ کے پادری کے پاس جانا ہوتا تھا۔ اپنی عبادت گاہ کو چرچ آف انگلینڈ میں رجسٹر کرانا پڑتا تھا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں داخلہ کے لیے ایسی مذہبی شرائط رکھی گئی تھیں جنہیں اینگلیکن چرچ کے پیروؤں کے سوا کوئی پورا نہ کر سکتا تھا اس لیے ان دونوں یونیورسٹیوں کے دروازے گویا دوسرے فرقوں کے لیے بند تھے۔ چرچ آف

۱؎ Cambridge Modern Hisosry

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انگلینڈ کو نہ ماننے والے لوگ ووٹ دینے کے حق دار تو تھے مگر وہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو ووٹ نہ دے سکتے تھے کیونکہ انہیں پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہ تھی۔ ۱۸۲۸ء میں ان قیود کو اٹھانے اور نرم کرنے کا میلان پیدا ہوا اور قریب قریب ۹۰ برس کی مسلسل اور تدریجی اصلاح نے بالآخر ان کو بالکلیہ منسوخ کیا۔ اس قسم کی تھی وہ جابرانہ طاقت، اور اس قسم کا تھا وہ مادی و اخلاقی غلبہ جس سے انگلینڈ کے لوگوں نے برطانیہ عظمیٰ کی مختلف قوموں اور مختلف مذہبی جماعتوں کو مغلوب کر کے اپنی تہذیب اور اپنی قومیت میں جذب کیا اور وہ واحد قومیت بنائی جسے آج "ایک ملک اور ایک قوم" کا نعرہ بلند کرنے والے سب سے پہلے مثال میں پیش کرتے ہیں۔ شاید کہ اُن کے پیش نظر بھی ایک قوم بنانے کے ایسے ہی طریقے ہوں گے۔

یہاں مثالوں کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ اگرچہ عہدِ حاضر کی تاریخ اور خود ہمارے موجودہ دور کے واقعات سے ایسی ہی بکثرت مثالیں اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر جو بات میں ثابت کرنا چاہتا ہوں اس کے لیے یہی مثالیں بہت کافی ہیں۔ ان سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف قوموں کو ایک قوم قرار دے کر ایک جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہیں۔ اور یہ بات جو بظاہر نہایت معصوم الفاظ میں بیان کی جاتی ہے اس میں کس قدر غیر معصوم مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔

اب ذرا ہندوستان کے حالات پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ یہاں ایک قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان اور قومی ریاست

جمہوری اسٹیٹ کے معنی یہ ہیں کہ تمام باشندگانِ ہند کو اسٹیٹ میں حاکمیت حاصل ہو مگر عملاً اس حاکمیت کو وہ جماعت استعمال کرے جو اکثریت میں ہو۔

جمہوری کے ساتھ "قومی" کی قید لگانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ یہاں مختلف قومیتوں کے وجود کی نفی کر دی جائے اور تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہندوستان کی حکومت میں کسی شخص کا حصہ اس حیثیت سے نہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

ہوگا کہ وہ ہندو یا مسلمان ہے۔ اسٹیٹ کی رکنیت میں شامل ہونا خود بخود اس امر کو مستلزم ہوگا کہ وہ اپنے ہندو یا مسلمان ہونے کی حیثیت کی خود نفی کر دے۔ اس کی جُداگانہ قومی حیثیت خواہ بالفعل برقرار رہے، اگر وہ اس حیثیت میں اسٹیٹ سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کر سکے گا، بلکہ اسے اُن فیصلوں کو قبول کرنا ہوگا جو مجموعی طور پر ملک کے باشندوں کی اکثریت ملک کی مجالس قانون ساز میں طے کر دے۔

لادینی کی قید اس میں ایک اور چیز کا اضافہ کرتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اور کوئی گروہ کسی مذہب کا پیرو ہونے کی حیثیت سے اسٹیٹ میں حصہ دار نہیں ہے۔ وہ اسٹیٹ کے دائرے میں اپنی اس حیثیت کو لے کر بھی نہیں آ سکتا۔ اس دائرے میں اس کو خود اپنی اس حیثیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت، تعلیم اور زندگی کے دوسرے مسائل کے متعلق اس کے اپنے نظریات خواہ کچھ ہوں، وہ ان سب کو اسی وقت بھلا دینے پر مجبور ہوگا جب باشندوں کی اکثریت ان مسائل میں کوئی دوسرا نظریہ اختیار کرے گی، وہ اس وقت یہ نہ کہہ سکے گا کہ میرے مذہب اور میری تہذیب کا نظریہ دوسرا ہے اور میں اکثریت کے نظریہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کہے گا تو اس کو جواب دیا جائے گا کہ اسٹیٹ میں جناب کا حصہ اس حیثیت سے ہے ہی کہاں کہ آپ فلاں مذہب اور فلاں تہذیب کے پیرو ہیں مجلس قانون ساز میں آپ ایک مذہبی آدمی کی حیثیت سے آئے کب ہیں کہ آپ کو اس قسم کے عذرات پیش کرنے کا حق حاصل ہو۔ یہاں تو آپ کی حیثیت محض ہندوستانی ہونے کی ہے اور جمہوریت کا اصول آپ تسلیم کر چکے ہیں۔ لہذا ہندوستانیوں کی اکثریت جو نظریہ رکھتی ہے اسے طوعاً و کرہاً آپ کو قبول ہی کرنا ہوگا۔ اس پر مزید یہ کہ اگر وہ اپنے گروہ کی حد تک اپنی مذہبی تنظیم کرنے کے لیے حکومت کے وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ مانگے گا تو اس سے کہہ دیا جائے گا کہ جناب یہ کوئی مذہبی اسٹیٹ نہیں ہے، ایک دنیوی لادینی اسٹیٹ ہے۔ اس کی حاکمیت میں جب آپ کا کوئی حصہ مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت سے ہے ہی نہیں تو آپ کو مذہبی تنظیم کے لیے حکومت کے اختیارات اور وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ کیسے مل سکتا ہے۔ آپ کو یہ کام کرنا ہے تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جا سکتے، خود اپنے مذہبی گروہ کے وسائل سے کیجئے۔

یہ نتائج تو محض ان تین اصطلاحوں کے معانی پر غور کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اب عملی حیثیت سے دیکھیے تو یہ تصویر اور زیادہ خوفناک ہو جاتی ہے۔ اوپر میں بیان کر چکا ہوں کہ جمہوری نظام کے صحیح یا غلط ہونے کا تمام تر انحصار اس سوال پر ہے کہ اس میں اکثریت اور اقلیت کس طرح بنتی ہے، اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے بنیادی مسائل (Fundamentals) میں اتفاق ہے، اور صرف وسائل و طریقہ ہائے کار (Means and Methods) میں اختلاف آراء پایا جاتا ہے، تب تو اکثریت اقلیت میں اور اقلیت اکثریت میں تبدیل ہوتی رہے گی۔ نہ کوئی اکثریت مستقل اور دائمی ہوگی نہ اقلیت۔ ایسی حالت میں اس امر کا کوئی خطرہ نہیں کہ اکثریت ظلم و استبداد کا طریقہ اختیار کرے اور اقلیت کو حاکمیت سے محروم کر کے اسے غلام اور محکوم بنا لے۔ لیکن اگر صورت حال برعکس ہو۔ اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے اساسی امور میں اختلاف ہو، اور اس اختلاف نے ان کو الگ الگ ممتاز گروہوں میں تقسیم کر دیا ہو اور ان گروہوں میں ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ پائی جاتی ہو، اور اس گروہ بندی نے ان کی دنیوی اغراض کو بھی بڑی حد تک ایک دوسرے سے متصادم کر دیا ہو، تو ایسی جگہ اکثریت دائمی اکثریت ہو گی اور اقلیت دائمی اقلیت ہو گی۔ وہاں رائے عام کو ہموار کر کے اقلیت کا اکثریت بن جانا غیر ممکن ہے۔ وہاں سب باشندوں کو ایک قوم قرار دینے اور اس بنیاد پر جمہوری لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اکثریت کو اقلیت پر ظلم کرنے اور اس کو غلام بنا کر رکھنے اور تباہ و برباد کرنے کا لائسنس دیا جاتے۔ وہاں قومی اسٹیٹ دراصل اکثریت کی قوم کا اسٹیٹ ہو گا، اور لادینی ہو گا تو اس میں اکثریت کو نہیں بلکہ صرف اقلیت کو اپنی جداگانہ قومی حیثیت اور اپنی مذہبیت کی نفی کرنی ہو گی۔ اکثریت اپنی ان سب حیثیتوں کو برقرار رکھ کر سب کچھ کر سکے گی، مگر اقلیت اپنے مذہب کا یا اپنی تہذیب یا زبان و ادب و فلسفہ کا نام نہ لے سکے گی۔ ایسی جگہ تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دینے کے معنی یہ نہیں کہ وہ فی الواقع ایک قوم ہیں، بلکہ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ جو قوم کثیر التعداد

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے وہ جمہوری اسٹیٹ کی تمام طاقتوں پر قابض ہو کر قلیل التعداد جماعتوں کی قومیتوں کو مٹانا اور اپنی قومیت میں جذب کر کے ایک قوم بنانا چاہتی ہے۔

آنکھیں کھول کر انصاف کی نظر سے دیکھئے۔ کیا ہندوستان میں فی الواقع یہی صورت حال موجود نہیں ہےلے؟

۱۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قومیت کا اختلاف اُس اختلاف سے بھی زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے جو یورپ میں جرمن اور فرنچ اور انگریز اور اطالوی قوموں کے درمیان ہے۔ وہاں کم از کم اخلاقی شعور ایک سا ہے تہذیب کے بنیادی اصول ایک ہیں، اور آداب و اطوار اور طرزِ زندگی میں بھی اساسی اختلافات موجود نہیں ہیں، یا اگر ہیں بھی تو بہت خفیف۔ مگر یہاں آٹھ سو برس تک ایک آب و ہوا اور ایک خطۂ زمین میں پہلو بہ پہلو رہنے کے باوجود قوموں کی زندگی کے دھارے الگ الگ بہ رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو جیسے ہندوؤں اور مسلمانوں کو کچھ ایک جیسے لباس پہنتے دیکھ کر اور معیشت کے میدان میں ایک ساتھ محنت مزدوری کرتے دیکھ کر حکم لگا سکتے ہیں کہ یہ ایک قوم ہیں۔ وہ ہندوستان میں پیدا تو بے شک ہوئے ہیں مگر ان کا دماغ انگلستان میں بنا ہے اور اس پر روسی و انش تازہ تازہ چڑھا ہے، اس لیے وہ رات دن ہندوستانیوں میں رہ کر بھی ان کو صرف اُوپر سے اور باہر سے ہی دیکھ سکتے ہیں جس طرح کوئی امریکن سیاح دیکھ لیتا ہے۔ وہ ان کے دل میں اُتر کر اور ان کی زندگی میں گھس کر نہیں دیکھ سکتے کہ ان کے درمیان کتنا بڑا اور گہرا تفاوت ہے۔ دونوں قوموں کے جذبات و احساسات ایک دوسرے سے

لے آزادی کے بعد سے بھارت میں اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ اس صورتِ حال کا کھلا ثبوت ہے۔ جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کو لال بہادر شاستری وزیر داخلہ ہندنے جو دھمکی دی ہے وہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۸ جون ۶۲ء آخری صفحہ پر ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس قدر مختلف بلکہ باہم متصادم ہیں کہ ہندو جس چیز کو الٰہی تقدیس و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، مسلمان اس کو شوق سے کھاتا ہے۔ اور یہ فرق گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کے جلاہے اور پاسی تک کے درمیان یکساں ہے۔ بلکہ مہاتما اور مولانا تو اس باب میں مدارات سے بھی کام لے سکتے ہیں، لیکن گاؤں والے اس پر لٹھ چلا بیٹھتے ہیں۔ شہری ہندو اور مسلمان تو کبھی کبھار ایک میز پر کھا بھی لیتے ہیں، مگر دیہاتی ہندو تو مسلمانوں کا ہاتھ لگا ہوا پانی تک نہیں پیتا۔ وہ ریل میں بھی اس تختہ پر جہاں مسلمان کھانا کھا چکا ہو بادلِ نخواستہ ہی بیٹھتا ہے، اور دل میں چھی چھی کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی زندگی کے اندر داخل ہونے والے دروازے ایک دوسرے کے لیے بالکل بند ہیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہر رسم، ہر تہوار، ہر خوشی اور ہر غمی میں ہندو ہندو کے ساتھ ہوتا ہے اور مسلمان مسلمان کے ساتھ۔ ان بیّن اختلافات کے ہوتے ہوئے کون انہیں ایک کہہ سکتا ہے؟

۲۔ منڈی اور دفتر اور کارخانے میں یہ دونوں یکجا ضرور ہوتے ہیں، مگر کیا ان کے قومی اختلاف کا اثر ان کے معاشی مفاد اور کاروباری اغراض میں ظاہر نہیں ہوتا؟ تخیل کی بلندیوں پر پہنچ کر کہنے والا جو چاہے کہہ دے اور لکھنے والا جو چاہے لکھ دے، مگر روزمرہ کے کاروبار میں جو کچھ ہو رہا ہے، اسے کاروباری زندگی کے اندر اتر کر دیکھیے اور جو لوگ یہاں کام کر رہے ہیں ان سے پوچھیے کیا آدمی کو ملازم رکھنے میں اور مزدور سے خدمت لینے میں اور دوسرے چھوٹے اور بڑے معاملات میں ہندو اور مسلمان کی تمیز نہیں کی جاتی؟ کیا دیہاتی آبادیوں تک میں مسلمانوں کا تمدنی اور اقتصادی بائیکاٹ نہیں ہو رہا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو پیشے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے ان کے لیے ہندو تیار کیے جاتے ہیں تاکہ مسلمانوں سے کام نہ لینا پڑے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آڑھت کے کاروبار میں مسلمانوں کا گھسنا قریب قریب ناممکن کر دیا گیا ہے، اور اگر کوئی مسلمان آڑھتیہ منڈی میں آتا ہے تو پوری ہندو برادری اس کا دیوالہ نکلوانے کے لیے متحد ہو جاتی ہے؟ پھر کیا ابھی حال ہی میں سارے ہندوستان میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ نہیں دیکھا کہ پنجاب کے جدید زرعی قوانین پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاشی مفاد صریحاً ایک دوسرے کی ضد نکلے ؟ سُود خواروں کے غاصبانہ تسلط سے زمینداروں کا نکلنا مسلمانوں کے نزدیک رحمت تھا تو ہندو کے نزدیک لعنت، اور اس تقسیم میں ہندو اور مسلمان اس طرح ایک دوسرے کے مقابل آکھڑے ہوئے کہ بہت سے کانگریسی خیال کے مسلمان مسلمانوں کے ساتھ تھے اور قریب قریب تمام کانگریسی ہندو ——— بھولا بھائی ڈیسائی تک ——— ہندوؤں کے ساتھ کیا یہ اس امر کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ معاشی معاملات میں بھی دونوں قوموں کی اغراض بڑی حد تک متصادم ہیں ؟

۴۔ پھر کیا کسی سیاسی معاملہ میں یہ لوگ قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کا طریقہ برتنے سے بچے ہوتے ہیں ؟ بیشمار مثالوں کو چھوڑ کر میں صرف کانگریس کے حدودِ عمل سے چند کھلی کھلی مثالیں پیش کرتا ہوں، اس لیے کہ یہی جماعت ہندوستانی قومیت کی مدعی ہے، اور اس لیے بھی کہ اس کے دائرے میں جو قومی امتیاز پایا جاتا ہے اس کا الزام برطانوی سامراج کے سر تھوپنے کی جرأت شاید پنڈت جواہر لال بھی نہیں کر سکتے۔

۱: بہار اسمبلی میں ۲۹ اپریل ۳۸ء کو خود کانگریسی حکومت نے سوال نمبر ۶۶۹ کا جواب دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ صوبہ بہار کی ۴۲ میونسپل کمیٹیوں میں مخلوط انتخاب کے ذریعہ ۲۹۹ نشستوں میں سے ۲۷ نشستیں مسلمانوں کو ملیں اور ۲۵۲ ہندوؤں کو، درآنحالیکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے کم از کم ۶۶ نشستیں مسلمانوں کو ملنی چاہیے تھیں، کیونکہ ان میونسپلٹیوں کے حدود میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۲۲ فی صدی ہے۔ یہ تو انتخابی نشستوں کا حال تھا۔ خود اس کانگریسی حکومت نے نامزدگی سے جو نشستیں پُر کیں ان کے متعلق خود اس کا اپنا اعتراف ہے کہ ۷۵ میں سے ۶۱ غیر مسلموں کو اور صرف ۱۴ مسلمانوں کو دی گئیں، حالانکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے ۱۵ نشستیں مسلمانوں کو ملنی چاہیے تھیں (ملاحظہ ہو سوال نمبر ۲۰۷ کا جواب۔ مورخہ ۲۹ اپریل ۳۸ء)

۲: سی۔ پی کے ضلع بلڈانہ میں تعلقہ بورڈ کے ۲۷ حلقے ہیں اور ان میں سے کسی حلقہ میں بھی مخلوط انتخاب کے ذریعہ سے کوئی مسلمان منتخب نہ ہو سکا (ملاحظہ ہو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قاضی سید محمود علی صاحب ملکاپوری کا خط مہاتما گاندھی کے نام جو ۵ ستمبر ۳۸ء کے اخبار "مدینہ" میں شائع ہوا ہے)

۳ :- سی پی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ارکان کا جو انتخاب ہوا اس میں مخلوط انتخاب کی وجہ سے ایک مسلمان بھی منتخب نہ ہوسکا اور نہ کسی اچھوت پر کانگریسی ہندوؤں کی نظرِ انتخاب پڑسکی۔ (ملاحظہ ہو سی پی کے کانگریسی مسلمانوں کا شکایت نامہ۔ مدینہ ۸ ہر جولائی ۳۸ء)

۴ :- اسی صوبہ متوسط میں ایک درجن سے زیادہ میونسپل کمیٹیاں ایسی ہیں جن میں ایک مسلمان بھی مخلوط انتخاب کی وجہ سے منتخب نہیں ہوا۔ یہی حال اکثر لوکل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کا ہے کہ وہ منتخب شدہ مسلمان نمائندوں سے بالکل خالی ہیں (ملاحظہ ہو مسٹر تاج الدین کا مراسلہ۔ اسٹار آف انڈیا مورخہ ۲۱ جولائی ۳۸ء نیز یہ خیال رہے کہ صاحب مراسلہ صوبہ متوسط کے مشہور نیشنلسٹ مسلمان ہیں)

۵ :- خود کانگریس ہائی کمانڈ انتخاب کے معاملہ میں جو ذہنیت رکھتی ہے اس کا حال کانگریسی صوبوں کی وزارتوں پر ایک نظر ڈالنے ہی سے کھل جاتا ہے۔ جن صوبوں میں ہندو اکثریت ہے وہاں ہندو وزیر اعظم ہیں اور جہاں مسلمان اکثریت ہے وہاں مسلمان کو وزیر انتخاب کیا گیا ہے۔ ہندو اکثریت کے کسی صوبہ میں کوئی کٹّے سے کٹّا وطن پرست بھی اسلامی نام سے موسوم ہونے اور اسلامی سوسائٹی کے تعلق رکھنے سے متہم ہونے کی بدولت وزارتِ عظمیٰ پر بار نہ پاسکا۔ حتیٰ کہ بچارے ڈاکٹر سید محمود بھی اس شرف سے محروم رہے حالانکہ اگر ان کا نام محمود کے بجائے سنہا ہوتا تو یقیناً ان کی وطن پرستانہ خدمات ایسی تھیں کہ وہی وزیر اعظم بنائے جاتے۔ اس کے بعد وزیروں اور پارلیمنٹری سکرٹریوں کی فہرست اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر اسی تناسب آبادی کا لحاظ کیا گیا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ صرف فرقہ پرست ہی اس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض جگہ تناسب آبادی سے بھی کم مسلمان لیے گئے ہیں۔

کیا یہ کھلی ہوئی علامات اس امر کی نہیں ہیں کہ جبلیات کے دائرے میں بھی خود

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

متحدہ قومیت کے علمبرداروں کے ہاں قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ پوری طرح موجود ہے۔ ایسی حالت میں واحد قومیت کے اصول پر جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں وہ ہندوؤں کو اور جہاں ہندو کثیر التعداد ہوں وہاں مسلمانوں کو اسٹیٹ کے کاروبار سے بے دخل کر دیں، اور چونکہ مجموعی طور پر ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لیے وہ قومی اسٹیٹ کو ہندو قوم کا اسٹیٹ بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔

۱۴۔ متحدہ قومیت کے اس سراسر جھوٹے دعوے پر جو قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنایا جاتا ہے وہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مسلمانوں کے لیے تو بلاشبہ غیر مسلم اسٹیٹ ہوگا، مگر ہندوؤں کے لیے لازم نہیں کہ وہ غیر ہندو اسٹیٹ ہو، بلکہ اپنی اکثریت کے بل پر وہ اس کو ایک ہندو اسٹیٹ بنا سکتے ہیں، اور واقعات سے روز بروز عیاں ہوتا جا رہا ہے کہ وہ ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک صوبہ کے چند واقعات بطور نمونہ پیش کروں گا۔

(ا) سی۔ پی کی کانگریسی حکومت کے تعلقہ بورڈ چاندور کا ہیڈ ماسٹر ۲۲ ستمبر ۳۸ء کو تمام مدارس کے نام سرکلر (نمبر ۳۳۶) جاری کرتا ہے جس میں حکم دیا جاتا ہے کہ مہاتما گاندھی کی سالگرہ کے دن بچے اور استاد سب مل کر ان کی پوجا کریں۔ یہ سرکلر بلا امتیاز ہندو مسلم سب مدارس کو سرکاری طور پر بھیجا جاتا ہے اور اس پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔

(ب) اسی صوبہ کی کانگریسی حکومت محکمہ پولیس کے حکام کو (جن میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں) ہدایت نامہ بھیجتی ہے کہ جس جلسہ یا تقریب میں "بندے ماترم" کا گیت گایا جائے اور وہ وہاں موجود ہوں تو انہیں بھی عام حاضرین کے ساتھ قیام تعظیمی کرنا چاہیے۔ اس واقعہ کو خود وزیر اعظم نے اپنے ایک پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے (ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۸ جون ۳۸ء)

(ج) ساگر (صوبہ متوسط) کی میونسپل کمیٹی کا صدر مسلمان طلبہ کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر وہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بندے ماترم گانے میں شریک نہ ہوں گے تو انہیں مدرسے سے نکال دیا جائے گا۔ اس واقعہ کو بھی خود سی۔ پی کے وزیر اعظم نے مذکورہ بالا پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے۔

د:۔ اسی صوبہ کے ایک سرکاری مدرسہ میں انجمن ترقی اردو کے نمائندے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمان بچے ہندو بچوں کے ساتھ سرسوتی کی پوجا کر رہے تھے، اور ان کو سلام کرنے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر "جے رام جی کی" کہنا سکھا دیا گیا تھا (ملاحظہ ہو مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اردو کا خط گاندھی جی کے نام۔ اخبار "پیام" مورخہ یکم ستمبر ۲۸ء)

ہ:۔ خود کانگریس کانسٹی ٹیوشن میں برار کو اس کا مشہور و معروف نام چھوڑ کر "ودربھا" اور صوبہ متوسط کو "مہا کوشل" سے موسوم کیا گیا ہے۔ گویا کہ اب رامائن کا عہد ہندوستان میں واپس آ رہا ہے۔

و:۔ مسٹر شریف، وزیر صوبہ متوسط کا واقعہ ابھی سب کے حافظہ میں موجود ہے۔ انہوں نے ایک مسلمان کو رہا کر دیا تھا جسے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ زنا کرنے کے الزام میں عدالت سے سزا ہوئی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں کانگریس ہائی کمانڈ نے ان کو وزارت سے معزول کر دیا۔ مگر فسادات جبل پور کے سلسلہ میں جو ہندو ملزمین ۴ مسلمانوں کے قتل کے الزام میں ماخوذ تھے، ان کو سی۔ پی کی ہندو وزارت نے حکماً رہا کر دیا اور اس پر ڈسپلن کے ان دیوتاؤں کو جن سے ہائی کمانڈ مرکب ہے کسی باز پرس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ حال ہی میں ہوشنگ آباد کے ایک ہندو بابو سنگھ کو جسے ایک جوان لڑکی کو زہر دے کر مار ڈالنے کی پاداش میں ہائیکورٹ سے سزائے موت کا حکم ہوا تھا سی۔ پی کے ہندو وزیر مسٹر ڈی کے مہتا نے رہا کر دیا، اور اس پر بھی ہائی کمانڈ کو کسی تحقیقات اور کسی تادیبی کارروائی کا خیال نہ آیا۔

ز:۔ اسی صوبہ میں محض اکثریت کے زور پر ودیا مندر اسکیم نافذ کی جا رہی ہے۔ اور مسلمانوں کی مخالفت کا استخفاف کرنے میں گاندھی اور شکلا اور ہائی کمانڈ سب متفق ہیں۔

ان واقعات کے علاوہ بہار، یو۔ پی، مدراس اور سی۔ پی میں قربانی گاؤ کو ممنوع قرار دینے، اور ہندی کو ہندوستانی کے پر فریب نام کی آڑ میں بزور رائج کرنے، اور زبان سے عربی و فارسی زبان زد عام الفاظ کو نکال کر نئے غیر مانوس الفاظ گھڑنے، اور سرکاری ملازمتوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں کھلم کھلا امتیاز برتنے کے واقعات اس قدر کثیر ہیں کہ ان سب کو یہاں نقل کرنا موجب تطویل ہوگا۔ جو کچھ ہمیں ثابت کرنا تھا اس کے لیے مذکورۂ بالا شواہد کافی ہیں۔

اب ہر شخص خود بآسانی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ جس "جنگِ آزادی" کی منزلِ مقصود مسلمانوں کے قومی مفاد بلکہ ان کی قومی ہستی ہی سے منافات کی نسبت رکھتی ہو اس میں کوئی مسلمان کس طرح حصہ لے سکتا ہے۔ مسلمانوں کو آخر اتنا بیوقوف کیوں فرض کیا گیا ہے کہ وہ اس نوعیت کے اسٹیٹ کو خود اپنے سر پر مسلط کرنے کے لیے جنگ کریں گے؟ کہیں وہ لوگ خود ہی تو عقل باختہ و حواس ربودہ نہیں ہو گئے ہیں جو ایک قوم سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ جانتے بوجھتے اپنی قبر آپ کھودنے میں جانفشانی دکھائے گی؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۰

بنیادی حقوق

کہا جاتا ہے کہ اِس قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کے لیے وہ بُنیادی حقوق (Fundamental Rights) بالکل کافی ہوں گے جن کا اعلان کراچی کانگریس میں کیا گیا تھا۔ مگر کیا یہ حقیقت ہے؟

بنیادی حقوق کا ماخذ ۱۶۸۹ء کا اعلانِ اہلِ انگلستان ہے جسے ایک طویل نزاع اور کشمکش کے بعد رعایا کے نمائندوں کی ایک مجلس (Convention) نے وضع کیا تھا تاکہ حکومت کے مستبدانہ افعال کی روک تھام کی جائے، اور حکومت و رعیت کے درمیان کچھ حدود متعین کر دیئے جائیں جنہیں توڑا نہ جا سکے۔ اس کے بعد امریکہ کے "اعلانِ آزادی" اور "اعلانِ حقوقِ انسانی" میں انہیں حقوق کو بطور اصولِ عامہ کے درج کیا گیا۔ پھر ۱۸۳۱ء کے دستور نامہ بلجیم میں ان کو شامل کیا گیا، اور اس کے بعد سے یہ گویا ایک قاعدہ سا بن گیا ہے کہ ہر دستور میں باشندوں کے ان حقوق کی تصریح کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ جدید زمانہ کا کوئی دستور ان سے خالی نہیں ہوتا، بلکہ ہر بعد کے دستور میں چند حقوق کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ:-

"قانون کی نگاہ میں سب باشندے مساوی ہیں کسی شخص کو کسی قسم

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ جب تک کہ وہ قانون کی خلاف ورزی نہ کرے، اور سزا قانون ہی کے مطابق دی جا سکتی ہے۔ حکومت رعایا کی شخصی آزادی اور جائداد میں صرف قانون ہی کے ذریعہ سے مداخلت کر سکتی ہے۔ تقریر اور نشر و اشاعت کی عام آزادی ہوگی بشرطیکہ وہ قانون قذف (Law of Libel) کے خلاف نہ ہو۔ ڈاک اور تار کے پیغامات میں رازداری قائم رکھی جائے گی۔ باشندوں کو اجتماع کا حق حاصل ہوگا، بشرطیکہ غیر مسلح ہوں اور امن عام کو نقصان نہ پہنچائیں۔ انتخابات آزاد ہوں گے۔ پارلیمنٹ کے ارکان بازپرس سے محفوظ رہیں گے۔ ان کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا اِلّا یہ کہ کوئی ممبر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہوا پکڑا جائے۔"

ان کے علاوہ جدید زمانہ کے دستوروں میں جن باتوں کا اضافہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:-

"عورت اور مرد مساوی ہیں"

یہ حقوق دراصل اس لیے وضع کیے گئے تھے کہ جب کبھی حکومت اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگے تو رعایا کے پاس اپنی آزادی اور اپنے ذاتی حدود کی حفاظت کے لیے کوئی قانونی بنیاد رہے جس کی بنا پر وہ حکومت سے اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکے یا اگر حکومت نہ مانے اور رعایا کو لڑنا پڑے تو حکومت کا اخلاقی پہلو کمزور رہے۔ لیکن اول تو زمانہ حال میں سیاسی تصورات کے انقلاب نے حکومت اور رعایا کے درمیان ہر اُس حد بندی کو توڑ دیا ہے جس کا خیال کیا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ اب یہ بتانا قریب قریب محال ہوگیا ہے کہ حکومت کے حدود کہاں جا کر ختم ہوتے ہیں اور افراد رعیت کے حدود کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ ثانیاً یہ اعلانِ حقوق صرف اُس صورت میں کام آ سکتا ہے جب کہ جمہور قوم کی مرضی کے خلاف حکومت کی طرف سے کوئی ناروا مداخلت ہو اور باشندوں کی ایک کثیر تعداد اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے کھڑی ہو جائے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مگر جہاں اکثریت کی حکومت ہو۔ اور وہ اقلیت کے حقوق میں مداخلت کرے وہاں یہ اعلانِ حقوق قطعی بیکار ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً کراچی کے ریزولیشن میں جن بنیادی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تجزیہ کر کے دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ بجائے خود بھی ہمارے کسی مرض کی دوا نہیں۔

ان تینوں نکات کی مختصر تشریح ضروری ہے تاکہ عام ناظرین اس بحث کو بآسانی سمجھ سکیں۔

۱۔ دَورِ جدید میں حکومت کا دائرۂ عمل

حکومت کے حدودِ عمل کیا ہیں؟ اس باب میں دنیا کے نظریات اور عملیات اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جو کچھ تھے، آج ان سے بالکل مختلف ہیں۔ اٹھارویں صدی میں شخصی حکومتوں کا دَور دَورہ تھا، اور لوگ ان کے استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدّوجہد کر رہے تھے۔ اس لیے لوگوں کے ذہن پر حکومت اور رعیّت کے تعلق کا مشینی نظریہ (Mechanical Theory) مستولی تھا، یعنی ان کا تصور یہ تھا کہ افراد کا مجموعہ ایک الگ چیز ہے اور اسٹیٹ ایک دوسری چیز، اور ان دونوں میں باہم کچھ اس طور پر معاملہ ہوتا ہے جیسے بائع اور مشتری یا اجیر اور مستاجر کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ اسی خیال نے اسٹیٹ کے حدودِ عمل کا انفرادی نظریہ (Individualism) پیدا کیا جس کا منشا یہ ہے کہ اصل چیز فرد کی آزادی ہے، اُسی کی حفاظت کے لیے فرد اس معاہدۂ عمرانی (Social Contract) میں شریک ہوتا ہے جس کی بدولت اسٹیٹ وجود میں آیا ہے۔ لہٰذا اسٹیٹ کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ افراد کی شخصی آزادی کی حفاظت کرے اور ایک فرد کی آزادی میں دوسرے کی مداخلت کو روکے۔ جان و مال کی حفاظت، امن قائم کرنا، انصاف کرنا، اور حدودِ مملکت کو بیرونی حملوں سے بچانا، بس یہ اس کے فرائض ہیں۔ ان حدود سے آگے بڑھ کر اشخاص کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنا، خواہ وہ اشخاص کی بھلائی ہی کے لیے ہو اور کیسی ہی نیک نیّتی کے ساتھ ہو، بہرحال ناجائز ہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں یہ عام خیال تھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور اسی بنا پر بعض علمائے سیاست نے ان کاموں کی ایک فہرست بھی بنا دی تھی جو حکومت کے دائرہ عمل میں آسکتے ہیں۔

یہ تخیلات اُس زمانے میں بھی قائم رہے، اور کافی مدت تک چلتے رہے، جب شخصی حکومتوں کی جگہ جمہوری حکومتیں لے رہی تھیں۔ مدتوں تک لوگوں کو محسوس نہ ہو سکا کہ جمہوریت اور دائرہ حکومت کی حد بندی دونوں باہم متضاد ہیں۔ جب سوسائٹی خود اسٹیٹ بناتی ہے تو وہ اپنے اوپر خود کس طرح پابندی عائد کر سکتی ہے؟ اور اس کو اپنے اوپر پابندی عائد کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ وہ اسٹیٹ کو اسی لیے تو وجود میں لاتی ہے کہ جبر و زور اور تنظیم کی طاقت سے اپنی اُن اجتماعی ضروریات کو پورا کرے جن کے لیے تنظیمی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر آخر کون سی معقول وجہ ہے کہ وہ اس تنظیمی طاقت کے استعمال کو اپنی بعض ضروریات کے لیے جائز اور بعض کے لیے ناجائز ٹھیرائے؟ اس حد بندی کی ضرورت تو اس وقت تھی جب حکومت سوسائٹی سے بالکل الگ ایک چیز ہوتی تھی اور کہیں اُوپر سے آکر مسلط ہو جایا کرتی تھی۔ مگر جب خود سوسائٹی ہی سے حکومت پیدا ہو تو ایسی صورت میں اس حد بندی کی کیا حاجت؟

فرد، سوسائٹی اور اسٹیٹ کو ایک زندہ نظام جسمانی کی طرح سمجھنے کا تخیل (Organic Theory of State and Society) جمہوری افکار کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کرتا چلا گیا اور سوشلزم نے آکر اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اب دنیا میں ہر جگہ حکومت کے دائرہ عمل کی حدیں ٹوٹ کر پوری اجتماعی زندگی پر پھیل رہی ہیں۔ تمدن، معاشرت اور معیشت کی جڑوں تک میں اُترتی جا رہی ہیں، اور جزئی سے جزئی معاملات تک کو اپنی لپیٹ میں لیتی چلی جاتی ہیں۔ باشندوں کی روٹی کا بندوبست کرنا، ان کے لیے کام مہیا کرنا، ان کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا، اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ آسائش بہم پہنچانا، یہ ہیں اب حکومت کے فرائض۔ ان فرائض کو انجام دینے کے لیے وہ ملک کے معاشی ذرائع کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ سے استعمال کرنے پر مجبور ہے، اور اس طرح گویا پوری معاشی زندگی اپنے صنعتی اور تجارتی اور مالی شعبوں سمیت حکومت کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دائرے میں آجاتی ہے۔ پھر وہ اپنے ان فرائض کی انجام دہی کے لیے تعلیم کا بھی پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور ہے تاکہ باشندوں کو ان اغراض کے لیے کارآمد بنا سکے۔ مزید برآں ان فرائض کی بجاآوری میں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ افراد یا افراد کے مختلف مجموعوں کی شخصی آزادی یا ان کی انفرادی خواہشات، یا ان کے مخصوص حقوق کا ہر حال میں لحاظ کیا جا سکے۔ ان سب چیزوں کا صرف اسی حد تک خیال رکھا جا سکتا ہے اور اسی شرط کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کے فرائض کی ادائیگی میں حائل نہ ہوں۔ جہاں وہ حائل ہوں گے وہاں ان کی انفرادیت کو پامال کر دیا جائے گا۔ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ اس فیصلہ میں خود مختار ہو کہ اپنے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دلائے۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ اجتماعی فلاح کے نقطۂ نظر سے جس طرح مناسب سمجھے ان کو تیار کرے۔ تمدنی اور معاشرتی معاملات میں بھی اب انفرادی آزادی کا حق مسلّم نہیں ہے۔ حکومت اجتماعی فلاح کے لیے تمدن و معاشرت میں جس قسم کا تغیر ضروری سمجھے کر سکتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ فلاں طرز کا لباس پہنو اور فلاں طرز کا لباس نہ پہنو۔ فلاں رسم الخط استعمال کرو اور فلاں کو چھوڑ دو۔ اس عمر میں شادی کرو اور اس عمر میں نہ کرو، وعلیٰ ہٰذا۔ اسی طرح جب کہ وہ باشندوں کی معاشی فلاح و ترقی کی ذمہ دار ہے تو وہ تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور اموال و املاک کے باب میں بھی لوگوں کے شخصی حقوق کی رعایت ہمیشہ ملحوظ نہیں رکھ سکتی۔ وہ مجبور ہے کہ معیشت کی پوری مشین کو اجتماعی مقصد کے مطابق چلائے اور جو شخصی حقوق اس راہ میں حائل ہوں انہیں پامال کر دے۔ چنانچہ جنگِ عظیم کے بعد جتنے جمہوری دساتیر بنائے گئے ہیں، قریب قریب ان سب میں اس قسم کی دفعات رکھی گئی ہیں جن کی بنا پر حکومت کو شخصی املاک اور شخصی کاروبار میں دخل دینے کے نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً تاجر کے مال کو جبراً فروخت کرا دینا۔ شخصی املاک پر بمعاوضہ یا بلامعاوضہ[1] قبضہ کر لینا۔ باشندوں کی سکونت یا نوآبادکاری یا ترقی زراعت کے لیے اگر ضرورت ہو تو

---

[1] دستورِ جرمنی دفعہ ۱۵۳ باب دوم۔ دستورِ پولینڈ دفعہ ۹۹ و دستورِ چیکوسلوواکیہ دفعہ ۱۰۹۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زمینوں کو بلامعاوضہ ضبط کر لینا[1]۔ موروثی جائداد اگر ایک حدِ خاص سے زیادہ ہو تو اسے چھین کر تقسیم کر دینا[2]۔ وراثت میں اسٹیٹ کا حصہ مقرر کرنا[3]۔ حتیٰ کہ پرائیویٹ کاروبار کی تنظیم اور مراسلت و مخابرت میں بھی مداخلت کرنا اگر اجتماعی مفاد کے لیے اس کی حاجت ہو[4]۔

حکومت کے دائرے کی اس وسعت اور لامحدودیت نے اوّل تو بنیادی حقوق کو محض بے معنی بنا دیا ہے۔ کیونکہ جن حقوق کو انسان کے بنیادی اور پیدائشی حقوق کہا جاتا ہے، ان سب کو آج کی حکومت اجتماعی فلاح کے نام سے سلب کر سکتی ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جمہوری نظام میں حکومت کے قوانین بنانے اور نافذ کرنے والی چیز اکثریت ہوتی ہے، اور یہ فیصلہ کرنا بھی اکثریت کا کام ہوتا ہے کہ اجتماعی فلاح کیا ہے اور اس کا اقتضا کیا ہے۔ لہٰذا اب اکثریت کے ظلم و جبر اور استبداد کی کوئی حد نہیں رہ جاتی۔ اقلیت کی پوری زندگی کے دروازے اس کی قاہرانہ مداخلت کے لیے کھل جاتے ہیں، وہ اس کے تمدن، اس کی معیشت و معاشرت اور اس کے مذہبی قوانین میں اجتماعی مفاد کے نام سے جس طرح اور جتنی چاہے مداخلت کر سکتی ہے، وہ تعلیم کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی قومیت کو بالکل مٹا دینے کی بھی کوشش کر سکتی ہے۔

۲۔ بنیادی حقوق کی افادیت

بنیادی حقوق اگر کسی حد تک کام آ سکتے ہیں تو صرف اس صورت میں جب کہ باشندگانِ ملک کی بڑی اکثریت ان کی حفاظت کا ارادہ رکھتی ہو اور اتفاقاً کوئی ایسی

---

[1] ایضاً دفعہ ۱۵۵۔

[2] دستور یوگوسلیویا دفعہ ۲۴۔ ایسٹونیا۔ لٹویا اور لتھوانیا میں بھی اس مضمون کے قوانین پاس کیے گئے ہیں۔

[3] دستور جرمنی دفعہ ۱۵۴۔ دستور یوگوسلیویا دفعہ ۲۹۔

[4] دستور یوگوسلیویا دفعہ ۲۵۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکومت ملک پر مسلط ہو گئی ہو جو ان حقوق کو سلب کرنا چاہتی ہو۔ رہی یہ صورت کہ خود وہ اکثریت ہی ظلم پر اتر آئے جو حکومت جمہوریہ کو چلا رہی ہو، تو ایسی صورت میں بنیادی حقوق کی کوئی لمبی سے لمبی فہرست بھی تحفظ کے کام نہیں آ سکتی۔

خود برطانیہ عظمیٰ کی مثال لے لیجیے جہاں سے ان بنیادی حقوق کی ابتدا ہوتی ہے۔ ۱۸۲۸ء تک وہاں پارلیمنٹ اور مجالس بلدیہ اور سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے کے لیے چرچ آف انگلینڈ کے طریقہ پر عشائے ربانی (Lord's Supper) لینا لازم تھا۔ ۱۸۲۹ء تک کیتھولکس ہر قسم کی نمائندگی سے محروم تھے۔ ۱۸۷۰ء تک یہودی پارلیمنٹ میں نہ جا سکتے تھے۔ ۱۸۵۲ء تک آکسفورڈ اور کیمبرج کے دروازے ان لوگوں کے لیے بند تھے جو پراٹسٹنٹ مذہب کے ۳۹ اصولوں پر ایمان نہ لاتے ہوں اور ۱۸۷۱ء تک ان دونوں یونیورسٹیوں میں ایسے کسی شخص کو کسی قسم کا عہدہ یا امتیاز یا وظیفہ تعلیمی نہ مل سکتا تھا۔ ۱۸۸۰ء تک چرچ آف انگلینڈ کی پیروی نہ کرنے والوں کے لیے دفن اموات کے بارے میں طرح طرح کی قیود موجود تھیں۔ ۱۸۸۸ء تک عدالت میں شہادت دینے والوں کے لیے حلف کی ناروا قیود پائی جاتی تھیں۔ اور آئرلینڈ کی اقلیت کے ساتھ تو ۱۹۲۰ء تک جو کچھ ہوتا رہا وہ ساری دنیا پر عیاں ہے۔

ممالک متحدہ امریکہ کی مثال اس سے بھی زیادہ سبق آموز ہے۔ وہاں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ حبشی آباد ہیں جن کا تناسب کل آبادی میں ۹ فی صدی سے کچھ زیادہ ہے۔ دستور کی رو سے ان کو سفید فام امریکنوں کے برابر پورے شہری حقوق حاصل ہیں۔ جمہوری دولت مشترکہ میں وہ بھی برابر کے حصہ دار ہیں اور قانون میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی بنا پر سفید فام اور سیاہ فام میں امتیاز کیا جا سکتا ہو۔ مگر عملاً کیا ہو رہا ہے؟ سفید فاموں کی اکثریت ان کے ساتھ کھلم کھلا امتیازی برتاؤ کر رہی ہے۔ شہری حقوق تو درکنار ان کے معمولی انسانی حقوق تک علانیہ سلب کیے جا رہے ہیں اور دستور کے عطا کردہ بنیادی حقوق ان کے کسی کام نہیں آتے۔ سفید فاموں کے کلیساؤں میں وہ گھس نہیں سکتے۔ ان کے ہوٹلوں، ریسٹورانوں اور تھیٹروں میں وہ قدم نہیں رکھ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سکتے۔ ان کی تفریح گاہوں میں کوئی حبشی اگر چلا جاتا ہے تو سخت ذلت کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ موٹر بسوں اور ریل کے ڈبّوں میں بھی سفید فام کے ساتھ حبشی کا بیٹھنا جائز نہیں رکھا جاتا۔ سفید فاموں کے محلوں میں کوئی حبشی مکان نہیں لے سکتا۔ ان کے بچوں کے ساتھ حبشی بچہ ایک مدرسہ میں بیٹھ نہیں سکتا۔ ان کی جان، مال، عزت، آبرو، کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں۔ حتیٰ کہ ان کے ساتھ انتہائی وحشیانہ برتاؤ کرنے سے بھی مہذب گوروں کا ضمیر ایا نہیں کرتا۔ اور بہت ہی کم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی حبشی کی خاطر کسی گورے کے خلاف قانون کی مشین حرکت میں آتی ہو۔

یہاں اس برتاؤ کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں جو امریکہ کی اکثریت حبشی اقلیت کے ساتھ کر رہی ہے۔ مگر میں اختصار کے ساتھ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں اکثریت اور اقلیت کو نسل یا رنگ یا مذہب یا کسی اور چیز نے حقیقتہً ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہو وہاں اکثریت کی حکومت کیا رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہے اور دستور اور اس کے بنیادی حقوق اور قانون اور اس کی کاغذی دفعات کا کیا حشر ہوا کرتا ہے۔

امریکہ میں حبشیوں کے متعلق بغیر کسی سائنٹفک بنیاد کے یہ نظریہ قائم کیا گیا تھا کہ حیاتی نقطۂ نظر سے (Biologically) وہ تعلیم کے لیے نااہل ہیں اور عمرانی نقطۂ نظر سے (Socially) ان کو تعلیم دینا انہیں ناکارہ بنا دیتا ہے، یعنی پھر وہ خدمت گار بننے کے بجائے برابر والے بننے لگیں گے۔ اس بنا پر بعض ریاستوں میں انہیں تعلیم دینا حکماً ممنوع تھا اور بعض ریاستوں میں اسے برا سمجھا جاتا تھا۔ کئی سال تک حبشی خود اپنی کوششوں سے اپنے روپے میں مدارس قائم کرتے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے اپنی دماغی قابلیت دنیا پر ثابت کر دی تب ۱۹۰۵ء سے ان کے مدارس کو سرکاری امداد ملنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

قانون کی نگاہ میں حبشی اور سفید امریکی عملاً برابر نہیں ہیں اگرچہ لفظاً برابر ہیں۔ حبشی کے لیے قید کی مدت ہمیشہ زیادہ رکھی جاتی ہے۔ ۱۹۱۰ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ حبشیوں کو اوسطاً ۱۰ مہینہ اور سفید فاموں کو اوسطاً ۵ مہینہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی سزائیں دی گئیں۔ آبادی میں تو حبشیوں کا تناسب ۹ فی صدی ہے مگر جیل خانوں کی آبادی میں ان کا تناسب ۳۱ فی صدی۔

۱۸۸۰ء	میں	حبشی	قیدی	فی لاکھ آبادی میں	[illegible]	تھے	اور	سفید	فام	۹۶
۱۸۹۰ء	"	"	"	"	۲۹۴	"	"	"	"	۸۴
۱۹۰۴ء	"	"	"	"	۲۷۸	"	"	"	"	۷۷
۱۹۱۰ء	"	"	"	"	۲۸۴	"	"	"	"	۸۹
۱۹۲۲ء	"	"	"	"	۳۲۷	"	"	"	"	۷۷

اسی طرح سفید فاموں کی تعداد تو جیل خانوں کی آبادی میں برابر کم ہوتی جارہی ہے مگر حبشیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حبشی زیادہ جرائم کرتے ہیں۔ شکاگو میں ایک کمیشن نسلی تعلقات کی تحقیق کے لیے مقرر کیا گیا تھا جو (Chicago Commission on Racial Relations) کے نام سے مشہور ہے۔[۲] اس کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا "جس شہادت کو جیوری ایک حبشی کو مجرم قرار دینے کے لیے کافی سمجھتی ہے وہی شہادت ایک سفید فام کو سزا دینے کے لیے ناکافی سمجھی جاتی ہے۔" ایک دوسرے جج نے کہا کہ "ایک ہی طرح کے حالات اور واقعات میں سیاہ فام کو سزا دینا آسان ہے اور سفید فام کو سزا دینا مشکل۔ حبشیوں اور سفید فاموں کے فسادات میں پولیس تمام تر حبشیوں کو پکڑتی ہے اور سفید فام پر شاذ و نادر ہی ہاتھ ڈالا جاتا ہے۔" شکاگو کمیشن اپنی تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

"تمام شہادتیں قریب قریب متفق ہیں کہ حبشی بہ نسبت سفید

۱؎ Encyclopaedia Britannica, Article Negroes in America

۲؎ اس کمیشن کی رپورٹ (Negroes in Chicago) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فاموں سے زیادہ پکڑے جاتے ہیں۔ کیونکہ پولیس کا عام مفروضہ یہ ہے کہ حبشی زیادہ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ اور پولیس یہ بھی جانتی ہے کہ حبشی کو گرفتار کر لینے میں کوئی خطرہ نہیں، رہا سفید فام تو اس پر ذرا احتیاط ہی سے ہاتھ ڈالنا چاہیئے .... ایک ایک جرم میں بہت سے حبشی پکڑ لیے جاتے ہیں۔ لہذا محض قید خانوں میں حبشیوں کی آبادی زیادہ دیکھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ زیادہ جرم کرتے ہیں۔ سفید فاموں کی بہ نسبت حبشی کم ہی گرفتاری سے بچ سکتا ہے۔

یہ تو قانون کا حال ہوا۔ اور وہ اکثریت جو جمہوری نظام کو چلا رہی ہے اس کا کیا حال ہے؟ حق رائے دہی پر عملاً ایسی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں کہ حبشیوں کی ایک بڑی تعداد شہری (Citizens) ہونے کے باوجود خود بخود ووٹ دینے کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لیے گویا بند ہیں۔ آج تک کوئی حبشی کسی ذمہ داری کے منصب پر فائز نہ ہو سکا۔ البتہ جنگ میں توپوں کا ایندھن بننے کے لیے وہ ضرور بھیج دیئے گئے تھے۔ اور اب بھی اس کام کے لیے تیار کیے جا رہے ہیں۔

عامۃ الناس بس ان کو صرف حقیر ہی نہیں سمجھتے بلکہ بات بات پر فساد ہوتے ہیں اور ان کو نہایت بے دردی سے قتل کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے کہ شکاگو میں یکایک افواہ اڑی کہ کسی حبشی نے ایک اٹالین لڑکی کو مار ڈالا ہے۔ اس پر سفید فام لوگوں کا ایک مجمع اکٹھا ہو گیا اور اس نے ایک راہ چلتے حبشی پر حملہ کر دیا۔ کارونر کی عدالت میں جب اس کی لاش پیش ہوئی تو بہا گولیاں اس کے جسم سے نکلیں، کھوپڑی چکنا چور پائی گئی اور پسلیوں کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اٹالین لڑکی کے واقعہ کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ پریذیڈنٹ ولسن جب پیرس میں بیٹھے ہوئے جرمنوں

لے یہی کچھ ان دنوں پنڈت جواہر لال نہرو کے بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ (مرتب)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے مظالم پر محاکمہ فرما رہے تھے اس وقت شکاگو میں ایک حبشی زندہ آگ پر بھونا جا رہا تھا۔ امریکہ میں انصاف کا ایک نرالا طریقہ رائج ہے جسے لنش کرنا (Lynching) کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام جب عدالت کے فیصلے سے مطمئن نہ ہوں یا قانون کی سست رفتار مشین کو آہستہ چلتے دیکھ کر صبر نہ کر سکیں تو قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں اور جس شخص کو وہ مجرم سمجھتے ہوں اسے اپنے نزدیک جو منصفانہ سزا چاہیں دے دیں۔ اس طریق انصاف کا وار عموماً حبشیوں پر ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ نیویارک ورلڈ نے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۶ء تک کے جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۱ سال کی مدت میں ۴۲۰۵ حبشی بر سرِ عام لنش کیے گئے۔ لنشنگ عموماً اس قصور میں ہوتا ہے کہ کسی گوری عورت سے کسی حبشی کا تعلق پایا جاتا ہے یا ایسے تعلق کا شبہ کیا جاتا ہے۔ لیکن سفید فام امریکن کا ضمیر صرف اسی وقت آمادۂ شورش ہوتا ہے جب کالا مرد گوری عورت کے پاس پایا جائے۔ رہی کالی عورت تو اس پر گوروں کے پیدائشی حقوق ہیں۔ حبشی کے متعلق عام رائے گورے صاحبان کی یہ ہے کہ وہ وحشی جانور (Brute) ہوتا ہے۔ اس کا معیار اخلاق بہت پست ہوتا ہے بلکہ اس میں اخلاقی احساس ہوتا ہی نہیں۔ عورتوں اور بچوں پر حملہ آور ہونا اور بدمعاشی کرنا اس کی سرشت میں داخل ہے گویا ہمارے ملک کے ہندو اخبارات کی زبان میں وہ ایک پیدائشی "غنڈا" ہوتا ہے لیکن شکاگو کمیشن نے باقاعدہ تحقیقات کر کے ثابت کیا ہے کہ حبشی کا معیار اخلاق صاحب لوگوں سے بہت بلند ہوتا ہے اور صاحب لوگ خود اپنی قوم کی عورتوں پر حملہ کرنے میں جس قدر بیباک ہیں۔ حبشی غریب اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ البتہ حبشی سے جب یہ قصور ہو جاتا ہے (اور وہ بھی زیادہ تر میم صاحبات ہی کی دعوت اور اشتعال کا نتیجہ ہوتا ہے) تو صاحب لوگوں میں اس پر شور برپا ہو جایا کرتا ہے۔ اور یہی حبشی کے بدنام ہونے کی اصل وجہ ہے۔ کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ نابالغ لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر کرنے والا حبشی تو میری عدالت میں کبھی آیا ہی نہیں۔ البتہ سفید فام بہت سے آتے۔ ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرے جج نے بیان کیا کہ میری کل مدتِ ملازمت میں صرف ایک حبشی اس جرم میں ماخوذ ہوکر آیا ہے، حالانکہ سفید فام اکثر پکڑے ہوتے آتے ہیں۔

۱۸۶۵ء سے امریکہ میں ایک خفیہ جماعت کام کر رہی ہے جس کا نام کو کلکس کلان (Ku Klux Klan) ہے۔ اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ سیاہ فاموں پر سفید فاموں کے تفوق کی حفاظت کی جائے اور امریکہ میں کالی نسل کے مسئلہ (Negroes Problem) کو اس طرح حل کیا جائے کہ ریڈ انڈین قوم کی طرح یہ قوم بھی رفتہ رفتہ فنا ہو جائے۔ یہ امریکہ کی سب سے زیادہ طاقت ور سنگٹھن ہے جس کے ارکان کی تعداد ۱۹۲۳ء میں پندرہ لاکھ تھی۔ ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، اونچی سوسائٹی والے، اور حکومت کے حلقوں سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ اس میں شریک ہیں۔ صوبوں کے گورنر، پولیس اور جیل اور عدالت کے حکام تک ان سے ساز باز رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بڑے بڑے ہولناک جرائم کر جاتے ہیں اور کبھی نہیں پکڑے جاتے۔ جیل کی کوٹھڑیوں تک سے قیدیوں کو نکال لے جاتے ہیں اور قانون کی مشین ساکت وصامت کھڑی رہتی ہے۔ امریکہ کمز آف ایج (America Comes of age) کا مصنف لکھتا ہے کہ وہ مہذب و شائستہ جنٹلمین جس سے آپ گفتگو کر رہے ہیں، ہوسکتا ہے کہ رات کو وہ جنگل میں کسی آدمی کو قتل کر کے آیا ہو اور اس کے ساتھ اس جرم میں بہت سے وہ لوگ شریک ہوں جنہیں آپ دن کے وقت نہایت عزت و افتخار سے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ چند ہولناک جرائم کے سلسلہ میں ریاست ٹکساس (Texas) کے گورنر نے تحقیقات کرائی تو پتہ چلا کہ

لے ۱۷۹۰ء سے اب تک امریکہ کی گوری نسل میں ۱۲ سو فی صدی اضافہ ہوا ہے، اور ریڈ انڈین نسل کی آبادی میں ۵۰ فی صدی کمی ہوتی ہے۔ اور توقع کی جاتی ہے کہ اس صدی کے خاتمہ تک ایک بھی ریڈ انڈین باقی نہ رہے گا۔ یہ وہ قوم ہے جو سفید فاموں سے پہلے اس ملک میں آباد تھی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجرموں میں ایک زیادہ پادری صاحب تھے اور متعدد ایسے لوگ تھے جو خود گورنر صاحب کے احباب سے تعلق رکھتے تھے۔

یہ مہذب لوگ حبشیوں کے مسئلہ کو کس طرح حل کر رہے ہیں ؟ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

" ایک حبشی کو مارتے مارتے بیہوش کر دیا اور ننگا کر کے جنگل میں چھوڑ آئے تاکہ سردی سے مر جائے۔ ایک حبشی کی ہنٹروں سے کھال ادھیڑ دی، یہاں تک کہ مجبور ہو کر اس نے اپنی زمین کم قیمت پر ایک سفید فام شخص کے ہاتھ بیچ دی۔ ایک حبشی کو پکڑ کر جنگل لے گئے۔ رسیوں اور خار دار تاروں سے اسے باندھا۔ ہنٹر مار مار کر اس کی کھال ادھیڑی۔ پھر اس کے زخموں پر کریا زوٹ چھڑک کر چل دیے۔ اور وہ گھنٹوں تڑپ تڑپ کر مرا۔ ایک حبشن اور اس کے لڑکے کو پکڑ لے گئے اور دونوں کو ایک ریل کے پل سے باندھ دیا۔ ایک غریب کو ہسپتال سے اُٹھا لے گئے اور اس کو زندہ آگ پر بھون ڈالا۔ ایک بیچارے کو ٹیلیفون کے کھمبے سے باندھا اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی [1]"

حبشی کا سب سے بڑا قصور جسے معاف نہیں کیا جاسکتا، یہ ہے کہ وہ سفید فام آبادی میں یا اس کے قریب جائداد رکھتا ہو، یا سکونت اختیار کرے۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان صرف شہر شکاگو میں ۵۸ مرتبہ ایسے مکانات کو بم سے اُڑایا گیا جو حبشیوں نے خریدے تھے یا جو کسی سفید فام نے حبشی کو کرایہ پر دیئے تھے۔ ایک حبشی بینکر (Binga) کے مکان اور دفتر پر ایک سال کے اندر ۶ مرتبہ بم پھینکا گیا صرف اس قصور میں کہ وہ حبشیوں کے لیے مالی تقویت کا موجب بن گیا ہے۔ اس کے بینک سے حبشیوں کو اچھی شرائط پر روپیہ مل جاتا ہے۔ اور اس کی بدولت حبشی لوگ جائدادیں خریدنے لگے ہیں۔ یہ واقعات ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ جو حبشی ۱۹۰۷ء میں ممالک متحدہ امریکہ

---

[1] یہ واقعات رسالہ "نیو ایج" میں شائع ہوئے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی آبادی کا ۱۹ فی صدی حصّہ تھے وہ آج ۹ فی صدی رہ گئے ہیں[1]۔ اور لُطف یہ ہے کہ امریکہ کے کانسٹی ٹیوشن میں حبشی اقلیت کے بُنیادی حقوق بالکل محفوظ ہیں۔

جرمنی کی ایک اور مثال آپ کے سامنے ہے۔ جرمن کانسٹی ٹیوشن کی رُو سے تمام باشندگانِ مُلک کے بُنیادی حقوق مسلّم ہیں۔ مگر آج وہاں کی غیر آریہ نسل کیساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے[2] وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ ان کے لیے جرمنی کی حدود میں عزّت کی روٹی کمانا قریب قریب محال ہو گیا ہے اور وہاں سے نکل جانا بھی اتنا ہی محال ہے۔ سرکاری اور خانگی دونوں قسم کی ملازمتوں کے دروازے ان کے لیے بند ہیں۔ تجارت بھی وہ آزادی سے نہیں کر سکتے۔ دوسرے آزاد پیشوں سے بھی ان کو نکالا جا رہا ہے۔ عدالتوں میں ان کے ساتھ کُھلم کُھلا نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ ان کے لیے انصاف کا نظریہ یہ قائم کیا گیا ہے کہ ہر غیر آریہ ناپاک اور پیدائشی مجرم ہے تاوقتیکہ وہ اپنے آپ کو غیر مجرم نہ ثابت کر دے۔ عام باشندے اگر ان سے لین دین یا کسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں تو ان پر حکومت کا عتاب ہوتا ہے۔ مُلک کے مدارس میں ان کے بچّوں پر ناقابلِ برداشت پابندیاں ہیں اور اگر وہ مُلک سے باہر تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو صرف ہجرت کا پاسپورٹ دیا جاتا ہے تاکہ واپس نہ آسکیں۔ ان کے والدین اگر ان سے ملنے کے لیے باہر جانا چاہتے

---

[1] تفصیلات کے لیے کُتب ذیل ملاحظہ ہوں۔

۱۔ *Lynch Lawby J. E. Cutter*

۲۔ *The Negroes in our History by C. G. Woods*

۳۔ *The American Race Problem by E. B. Reuter*

۴۔ *The American Negro by M. T. Hersko*

[2] خصوصیت سے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۵ء تک ــــ مرتب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں تو انہیں بھی مہاجر کی حیثیت سے جانے کی اجازت دی جاتی ہے اور مہاجر کے لیے یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کا صرف دس فی صدی حصّہ جرمنی سے باہر لے جا سکتا ہے، باقی سب ضبط۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی کون سا ملک ایسا ہے جس کے دستور اساسی میں بنیادی حقوق موجود نہیں ہیں؟ اور کون سا ملک ایسا ہے جہاں دستور کے بُنیادی حقوق نے اقلیت کو اکثریت کے ظلم سے بچایا ہو، ہر جگہ ملک کی پُوری آبادی کو ایک قوم فرض کر کے ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا اور دستور اساسی میں بُنیادی حقوق مقرر کر دیئے گئے۔ مگر جہاں بھی اکثریت اور اقلیت کے درمیان مذہب یا نسل یا زبان کی بُنیاد پر قومی امتیاز موجود ہے، وہاں اکثریت کی یہی کوشش ہے کہ یا تو اقلیت اپنے قومی وجود کو اکثریت کی قومیت میں گم کر دے یا پھر اسے شُودر بنا کر رکھا جائے یا مختلف طریقوں سے اس کو فنا کر دیا جائے۔ یوگوسلیویا میں جب کروٹس نے مطالبہ کیا کہ ان کی قوم کا ایک الگ صوبہ بنایا جائے اور اسے اٹانومی (حکومت خود اختیاری) دے دی جائے، تو آپ کو معلوم ہے کہ سربیوں نے ان کو کیا جواب دیا؟ اس جواب کو لفظ بلفظ سُن لیجیے۔

"سرب، کروٹ اور سلانینی در حقیقت ایک قوم ہیں۔ غیر ملکی سامراج نے ان کو زبردستی الگ کر رکھا تھا۔ اب جب کہ بیرونی جُوا ہمارے کندھوں پر سے اتر گیا ہے تو قومی وحدت کا احساس فتحیاب ہو کر اُبھر آیا ہے اور اس نے ان تمام حد بندیوں کو توڑ دیا ہے جو سیاسی ادارات اور زبان اور مذہب نے پیدا کر دی تھیں۔ وحدت کے اس احساس کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ قدیم جغرافی تقسیم، جس کے ذریعہ سے غیر ملکی حکمرانوں نے قوم کو تقسیم کر دیا تھا، منسوخ کر دی جائے۔ مقامی نظم و نسق کے لیے صُوبوں کی بالکل نئی تقسیم ہونی چاہیئے تاکہ پُرانے صوبوں کی حد بندیاں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

نسلی حلقے (Racial Groups) نہ بنا سکیں گے۔"

بالکل یہ معلوم ہوتا ہے یا نہیں کہ آزاد ہندوستان میں جواہر لال نہرو تقریر فرما رہے ہیں؟ یہ گویا ایک قاعدۂ کلیہ سا بن گیا ہے کہ واحد قومیت کا جوشیلا وعظ وہی قوم کیا کرتی ہے جس کا سو فی صدی فائدہ اسی وعظ میں ہوتا ہے، اور وہ بے وقوف لوگ بعد میں پچھتاتے ہیں جو آزادی کے جوش میں آ کر "ایک قوم ایک ملک" کی صدائیں بلند کیا کرتے ہیں مگر جب آزادی کے بعد واحد قومیت اژدہے کی طرح ان کو نگلنا شروع کرتی ہے تو غیظ و غضب کے مارے بل کھاتے ہیں اور قدرت کا بے لاگ قانون ان احمقوں سے پکار کر کہتا ہے کہ موتوا بغیظکم۔ جس وقت یوگوسلیویا کی نیشنل اسمبلی میں کروٹس کے اعتراضات کا مذکورۂ بالا جواب دیا گیا تو سنا ہے کہ کروٹ نمائندے احتجاجاً اسمبلی سے اٹھ گئے اور جانے کے بعد سرب اکثریت نے اور زیادہ آسانی کے ساتھ وہ سب کچھ پاس کر لیا جو پاس کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت بنیادی حقوق دور کھڑے ہنستے رہے اور کہتے رہے کہ "کہو! کیسا بیوقوف بنایا!"

۴ - کراچی ریزولیوشن کا تجزیہ

اب ذرا ان بنیادی حقوق کا بھی تجزیہ کر دیکھیے جو کراچی ریزولیوشن میں تجویز کیے گئے ہیں اور جن کی بنا پر ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی ملک بھر میں مسلمانوں کو سمجھاتے پھرتے ہیں کہ بھائیو! کانگریس تو پہلے ہی تمہارے حقوق کی حفاظت کا ذمہ لے چکی ہے تو اب تم کیوں متحدہ قومیت کی بنیاد پر ایک آزاد جمہوری اسٹیٹ کی تعمیر میں حصہ نہیں لیتے؟

پہلی دفعہ میں ہندوستان کے ہر باشندے کو اظہار رائے اور اجتماع کی آزادی

ملے The New Democratic Constitution of Europe by H. Morley

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دی گئی ہے بشرطیکہ وہ ایسے مقاصد کے لیے جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہ ہوں۔ قانون اور اخلاق کی شرط اس آزادی کو باطل کر سکتی ہے اصولِ جمہوریت کی بنا پر قانون بنانا اور اخلاق کا معیار مقرر کرنا مطلقاً اکثریت کے اختیار میں ہوگا، اور اکثریت ہی کی حکومت اس کو نافذ کرے گی۔ لہٰذا اقلیت کی آزادی کے حدود گھٹانا یا بڑھانا محض ان کے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہوگا۔

دوسری دفعہ میں ہر باشندۂ ہند کو ضمیر کی آزادی، اور اپنے مذہب پر اعتقاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی عطا کی گئی ہے، بشرطیکہ وہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو ——— یہاں پھر وہی شرط ہے اور یہ شرط اس آزادی کو ہر وقت سلب کر سکتی ہے۔ تاہم اگر اکثریت نے بڑی فیاضی سے کام لیا اور یہ آزادی ہم کو پوری طرح بخش بھی دی، تو اس سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی آزادی تو انگریزی حکومت نے بھی ہم کو دے رکھی ہے، مگر اس کے باوجود ڈیڑھ سو برس کے اندر ہماری مذہبیت مضمحل اور ہماری تہذیب نیم مردہ ہو کر رہ گئی۔ جب کہ حکومت کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں نہ ہوں، اور ایک ایسی جماعت ان اختیارات کو استعمال کرے جو ہمارے اصولِ تہذیب سے قطعاً ناآشنا اور بالکل مختلف قسم کے نظریاتِ تہذیب و اخلاق و تمدن کی گرویدہ ہو، تو اس حکومت کے ماتحت ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہونے کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہمیں زبردستی نماز پڑھنے سے نہیں روکا جائے گا بلکہ ہمارے اندر وہ ارتداد آہستہ آہستہ اُتارا جائے گا جس سے ہم خود نماز پڑھنا چھوڑ دیں۔ ہماری مسجدیں توڑی نہیں جائیں گی بلکہ ہمارے دل و دماغ کو اندر سے بدلا جائے گا تاکہ یہ مسجدیں ویران ہو کر خود بخود آثارِ قدیمہ میں تبدیل ہو جائیں۔ ہماری عورتوں کے چہروں سے پولیس کے سپاہی زبردستی نقاب نہ نوچیں گے بلکہ مدرسہ کے معلم نہایت شفقت و رحمت کے ساتھ ان کے ذہن میں وہ معیارِ اخلاق پیوست کریں گے جس کی بنا پر وہ گھر کی ملکہ بننے کے بجائے اسٹیج کی رقاصہ بننا زیادہ پسند کریں گی یہ آزادی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

محض ایک افیون ہے تاکہ اس کی پینک میں ہم پڑے سوتے رہیں، اور ہمارے گرد و پیش زمین و آسمان بدلتے چلے جائیں۔ اس آزادی کے پروانے کو لے کر جو حضرات یہ سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ کے قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ میں ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کا پورا تحفظ ہوگا، انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ تحفظ اسی نوعیت کا تحفظ ہے جیسا کہ پرانی تاریخی عمارتوں کا ہوا کرتا ہے۔ یہ محض اس امر کی ضمانت ہے کہ موجودہ نسل کے جو لوگ اپنی مذہبیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں ان کی گردن پر چھری رکھ کر زبردستی کلمہ کفر نہیں کہلوایا جائے گا۔ مگر یہ اس امر کی ضمانت نہیں ہے کہ ان کی آئندہ نسل کو غیر مسلم بنانے والی تعلیم و تربیت نہ دی جائے گی۔ اس تحفظ کے معنی صرف یہ ہیں کہ آپ اگر چاہیں تو قال اللہ و قال الرسول میں مشغول رہیں۔ آپ کی داڑھی زبردستی نہیں مونڈی جائے گی۔ نہ آپ کی عبا ضبط کی جائے گی، نہ آپ کی تسبیح چھینی جائے گی۔ نہ آپ کی زبان درس حدیث و قرآن سے روکی جائے گی، مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آئندہ نسل کو بھی اس "غلط فہمی" میں مبتلا رہنے دیا جائے گا کہ اسلام ہی سچا دین ہے اور تمام مذاہب سے برتر و بر اصلح ہے۔ مذہبی آزادی کا یہ پروانہ لے کر جو صاحب خوش ہونا چاہتے ہیں، وہ خوش ہو لیں۔ ہمیں تو اس پروانہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب کی فطرت تو مفعولانہ نہیں بلکہ فاعلانہ آزادی مانگتی ہے۔ ہم تو استقلال وطن اس لیے اور صرف اسی لیے چاہتے ہیں۔ کہ ہماری حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو، اپنا نظام تعلیم ہم خود بنائیں، اپنی تہذیب و تمدن کے مسخ شدہ نظام کو ہم خود اپنی طاقت سے درست کر سکیں۔ اگر یہ نہیں تو ہمارے لیے یکساں ہے، چاہے حکومت باہر کے کفار کی ہو یا گھر کے کفار کی۔

تیسری دفعہ اس امر کا اطمینان دلاتی ہے کہ قلیل التعداد جماعتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی کلچر، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی ———

حکومت کے روپے اور اس کی طاقت سے ہندی کو ہندوستان کی "قومی" زبان بنانا اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دفعہ کے خلاف نہیں ہے۔ اگر نظامِ تعلیم ایسا بنایا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب کا رنگ اس سے بالکلیہ خارج کر دیا گیا ہو، بلکہ اگر نظامِ تعلیم کو اس قصد کے ساتھ ایسے نقشہ پر مرتب کیا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب اپنی موت آپ مر جائے، تو ایسا کرنا بھی اس دفعہ کے خلاف نہیں۔ درحقیقت اس دفعہ کا یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ اقلیتوں کی زبان اور ان کی کلچر کو حکومت کے رسد خانے سے زندگی کی غذا دی جائے گی، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کو زبردستی قتل نہ کیا جائے گا۔ باقی رہی یہ بات کہ کمی غذا سے وہ خود سوکھ سوکھ کر مر جائیں تو حکومت پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں؛ بلکہ یو۔ پی کے وزیرِ اعظم کی زبان سے ہم کو بتایا جاتا ہے کہ ان کا سوکھ سوکھ کر مر جانا ہی مطلوب ہے تاکہ ان کی راکھ سے "ہندوستانی تہذیب" کا ققنس پیدا ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا بنیادی حق بھی ہم کو انگریزی حکومت میں حاصل ہے۔ اس نے بھی ہم کو اُردو بولنے اور لکھنے سے نہیں روکا (بلکہ ورنا کیولر اسکول قائم کیے) اور کوئی ایسا آرڈی ننس پاس نہیں کیا کہ ہم اپنی کلچر کے مطابق زندگی بسر نہ کریں۔ لیکن اس بنیادی حق نے ہماری زبان اور ہماری کلچر کو زندگی کی طاقت نہیں بخشی۔ اگر یہی اس حکومت میں بھی ہو جس کو "قومی حکومت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے تو ہمارے لیے ایسی "قومی حکومت" بعینہٖ غیر قومی حکومت ہو گی۔ ہمیں قومی حکومت کی ضرورت تو اس لیے ہے کہ ہم حکومت کے وسیع ذرائع سے اپنی زبان اور اپنی کلچر کو اس طرح غذا دے سکیں جس طرح آزاد قومیں دیا کرتی ہیں۔ ورنہ بطور خود اپنی ضروریات کا انتظام کر لینے کی آزادی تو ہمیں اب بھی حاصل ہے۔ اِس کے لیے ہمیں کسی جنگِ آزادی کی کیا ضرورت ہے۔

چوتھی دفعہ کہتی ہے کہ قانون کی نظر میں تمام شہری مساوی ہیں۔ جات پات، مذہب اور صنف کا کوئی امتیاز ان کے درمیان نہ ہو گا ——— یہ نہایت عمدہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دفعہ ہے لیکن مساوات کا تصوّر ہر تہذیب میں مختلف ہوتا ہے۔ اگر جمہوری اصول پر کل کوئی اکثریت میراث میں عورت اور مرد کا حصّہ برابر کرنے کا قانون پاس کر دے اور اس کی مخالفت کرنے والی اقلیت کا اسی طرح مذاق اُڑائے جس طرح مسٹر داس کے بل کی مخالفت کرنے والوں کا مذاق سنٹرل اسمبلی میں اُڑایا جا چکا ہے، تو یہ دفعہ ہمارے کس کام آئے گی۔

پانچویں دفعہ اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ کسی باشندۂ ملک پر اس کے مذہب یا جات پات یا عقیدہ و مسلک، یا کسی جنس کی وجہ سے ایسی پابندی عائد نہ کی جائے گی کہ وہ سرکاری ملازمت یا عزت و اقتدار کے کسی منصب یا کسی پیشے اور کاروبار میں داخل نہ ہو سکے۔ اس دفعہ کے اچھے اور بُرے دونوں پہلو ہیں۔ اگر نظامِ حکومت کسی ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو ہماری تہذیب سے کوئی ہمدردی نہ رکھتی ہو تو اس دفعہ کے عطا کردہ حقوق شریف مسلمان بہو بیٹیوں کو فلم ایکٹرس کے مرتبہ عالی تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔

چھٹی دفعہ تمام باشندوں کو سڑکوں اور تالابوں اور کنوؤں اور مدرسوں وغیرہ سے استفادہ کا مساوی حق دیتی ہے۔ یہاں "بشرطیکہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو" کی قید نہیں لگائی گئی جس طرح پہلی اور دوسری دفعہ میں لگائی گئی ہے۔ دوسری دفعہ کی رُو سے گائے کی قربانی بند کی جا سکتی ہے۔ مگر چھٹی دفعہ سڑکوں کے استعمال پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کرتی کہ نماز کے وقت باجا بجا کر مسلمانوں کو پریشان نہ کیا جائے۔

یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جن کے اعلان کو ایک نعمتِ عظمیٰ قرار دیا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس اعلان کے معاوضہ میں ایک ایسی حکومت کو خود اپنے اُوپر مسلط کرنے کے لیے جنگ کریں جس کی پالیسی کی تشکیل، جس کے قوانین کی تشریح اور جس کے احکام کی تنفیذ میں ہم واحد قومیّت اور اصولِ جمہوریت کی بنیاد پر کسی طرح

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنا اثر استعمال نہیں کر سکتے ۔ دوسرے الفاظ میں ہماری خدمات اس لیے حاصل کی جا رہی ہیں کہ بس فرعون کی جگہ اس کے بیٹے کو تخت نشین کرا دیں ۔ رہا ہمارا اپنا حال تو جو بنی اسرائیل کی سی پوزیشن ہمیں فرعون کے عہد میں حاصل ہے ۔ ابن فرعون اطمینان دلاتا ہے کہ وہ میرے عہد میں بھی حاصل رہے گی ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۱۹

"متحدہ قومیّت اور اسلام"

اِس عنوان سے جناب مولانا حسین احمد صاحب صدر دارالعلوم دیوبند کا ایک رسالہ حال میں شائع ہوا ہے[1] ایک نامور عالم دین اور ہندوستان کی سب سے بڑی دینی درس گاہ کے صدر ہونے کی حیثیت سے مصنّف کا جو مرتبہ ہے، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمیں توقع تھی کہ اِس رسالہ میں "قومیت" کے اہم اور نہایت پیچیدہ مسئلہ کی تنقیح و تحقیق خالص علمی طریقہ پر کی گئی ہوگی، اور اِس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر پُوری طرح واضح کر دیا گیا ہوگا۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اس رسالہ کو اپنی توقعات سے اور مصنّف کی ذمّہ دارانہ حیثیت سے بہت فروتر پایا۔ یہ ایسا زمانہ ہے جس میں جاہلی تصوّرات نے ہر طرف سے اسلامی حقائق پر نرغہ کر رکھا ہے اور اسلام اپنے گھر ہی میں غریب ہو رہا ہے۔ خود مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ خالص اسلامی نگاہ سے مسائل کو نہیں دیکھتے اور قلتِ علم کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ پھر قومیّت کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس

---

[1] واضح رہے یہ مضمون فروری ۳۹ء میں لکھا گیا تھا اور مسئلہ قومیت نامی کتاب میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں اسے موضوع کی مناسبت سے شامل کیا جا رہا ہے ـــــ مرتب

کے صاف اور واضح فہم وادراک ہی پر ایک قوم کی زندگی کا مدار ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی قومیت کے اساسیات ہی کو اجنبی اصول و مبادی میں غلط ملط کر دے تو وہ قوم سرے سے قوم ہی نہیں رہ سکتی۔ ایسے نازک مسئلہ پر قلم اٹھاتے ہوئے مولانا حسین احمد صاحب جیسے شخص کو اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہونا چاہیئے تھا۔ اس لیے کہ وہ امانتِ انبیاء کے امین ہیں اور جب اسلامی حقائق جاہلیت کے گرد و غبار میں چھپ رہے ہوں، تو ان ہی جیسے لوگوں کا کام ہے کہ انہیں صاف اور منقح کر کے روشنی میں لائیں۔ ان کو یہ سمجھنا چاہیئے تھا کہ اس فتنہ کے دَور میں ان کی ذمہ داری عام مسلمانوں کی ذمہ داری سے زیادہ سخت ہے اور اگر مسلمان کسی گمراہی میں مبتلا ہوں تو سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر وہی ماخوذ ہونے والے ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا کا یہ سارا رسالہ اس ذمہ داری کے احساس سے بالکل خالی ہے۔

غیر علمی زاویۂ نظر

ایک مصنّف کی تصنیف میں سب سے پہلے جس چیز کو تلاش کرنا چاہیئے وہ اس کا زاویۂ نظر ہے۔ اس لیے کہ اپنے موضوع کے ساتھ مصنّف کا برتاؤ، اور اس کا صحیح یا غلط نتائج پر پہنچنا، تمام تر اس کے زاویۂ نظر ہی پر منحصر ہوتا ہے۔ سیدھا اور صحیح زاویۂ نظر یہ ہے کہ آدمی محض امرِ حق کا طالب ہو اور مسئلہ کو، جیسا کہ وہ فطرۃً وحقیقۃً ہے، اس کے اصلی رنگ میں دیکھے، اور حقیقت کا یہ مشاہدہ جس نتیجہ پر پہنچاتا ہو اس پر پہنچ جائے بلا اس لحاظ کے کہ وہ کس کے خلاف پڑتا ہے اور کس کے موافق۔ یہ بحث و تحقیق کا فطری اور علمی زاویۂ نظر ہے اور اسلامی زاویۂ نظر بھی اس کے سوا کوئی نہیں کہ اسلام کی رُوح ہی الحب فی اللہ والبغض فی اللہ ہے۔ اس سیدھے زاویۂ نظر کے علاوہ بہت سے ٹیڑھے زاویہ ہائے نظر بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ آپ کسی کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اس لیے صرف اسی نتیجہ پر جانا چاہتے ہیں جو اس کے موافق ہو۔ اور دوسرا یہ کہ آپ کو کسی سے بغض و عداوت ہے اس لیے آپ کو تلاش صرف اُن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہی چیزوں کی ہے جو آپ کے مبغوض کی مخالف ہوں۔ اس قسم کے ٹیڑھے زاویے جتنے بھی ہیں سب کے سب خلافِ حق ہیں۔ انہیں اختیار کر کے کوئی بحث کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔ کسی عالم اور حق پسند انسان کے لیے زیبا نہیں کہ ایسے کسی زاویہ سے کسی مسئلہ پر نگاہ ڈالے، اس لیے کہ یہ اسلامی نہیں بلکہ جاہلی زاویۂ نظر ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ مولانا نے اس رسالہ میں کون سا زاویۂ نظر اختیار فرمایا ہے۔ اپنی بحث کے آغاز میں وہ فرماتے ہیں:۔

"ضروری معلوم ہوا کہ ان غلطیوں کا ازالہ کر دوں جو اس قسم کی قومیتِ متحدہ سے مخالفت اور اس کو خلافِ دیانت قرار دینے کے متعلق شائع ہوئی ہیں یا شائع کی جا رہی ہیں، کانگریس ۱۸۸۵ء سے اہلِ ہندوستان سے بنا بر وطنیت اسی اتحادِ قومی کا مطالبہ کرتی ہوئی بیش از بیش جدوجہد عمل میں لا رہی ہے۔ اور اس کی مقابل و مخالف قوتیں اس کے غیر قابلِ قبول ہونے بلکہ ناجائز اور حرام ہونے کی انتہائی کوششیں عمل میں لا رہی ہیں۔ یقیناً برٹش شہنشاہیت کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ یہ چیز میدان میں آج سے نہیں بلکہ تقریباً ۱۸۸۸ء یا اس سے پہلے سے لائی گئی ہے اور مختلف عنوانوں سے اس کی وقعت ہندوستانیوں کے دل و دماغ پر عمل میں لائی جاتی ہے۔" (ص ۵-۶)

پھر چند سطروں کے بعد فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ بہت سے ان لوگوں سے جن کو برطانیہ سے گہرا تعلق ہے یا جن کے دماغ اور قلب برطانوی مدبرین کے سحر سے ماؤف ہو چکے ہیں امید نہیں ہے کہ وہ اس کو قبول کریں گے۔"

اسی سلسلہ میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں کہ "ان کی ہستی کوئی معمولی ہستی نہ تھی۔ وہ ایسے اور ایسے تھے مگر باوجود کمالاتِ گوناگوں کے ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو گئے تھے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر ایک طویل بحث کے بعد اپنے زاویۂ نظر کا صاف صاف اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"ہندوستانیوں کا وطنیت کی بنا پر متحدہ قومیت بنا لینا انگلستان کے لیے جس قدر خطرناک ہے وہ ہماری اس شہادت سے ظاہر ہے جو ہم نے پروفیسر سیلے کے مقالہ سے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ضعیف سے ضعیف بھی اگر ہندوستانیوں میں پیدا ہو جائے تو اگرچہ ان میں انگریزوں کے نکالنے کی طاقت موجود نہ بھی ہو مگر فقط اس وجہ سے کہ ان میں یہ خیال جاگزیں ہو جائے گا کہ اجنبی قوم کے ساتھ ان کے لیے اشتراک عمل شرمناک امر ہے ۔ انگریزی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا ۔" (ص ۴۸)

آگے چل کر ایک حیرت انگیز رائے کا اظہار فرماتے ہیں جسے پڑھ کر آدمی ششدر رہ جاتا ہے کہ کیا یہ کسی حقیقی عالم کی تحریر ہو سکتی ہے :-

"اگر قومیت ایسی ہی ملعون اور بدترین چیز ہے تو چونکہ یورپ نے اس کو استعمال کر کے اسلامی پادشاہوں اور عثمانی خلافت کی جڑ کھود دی ہے ، مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ اسی ملعون ہتھیار کو برطانیہ کی جڑ کھودنے کے لیے استعمال کرتے ۔" (ص ۴۸)

اسی بحث کے دوران میں مولانا پہلے تو اس امر کا اعتراف فرماتے ہیں کہ پچھلی دو صدیوں میں مسلمان سلطنتوں کو جس قدر بھی نقصان پہنچا ہے اسی وجہ سے پہنچا ہے کہ یورپ نے اسلامی وحدت کے خلاف سخت پراپیگنڈا کیا " اور مسلمانوں میں نسلی ، وطنی ، لسانی امتیاز و افتراق پیدا کر دیا " اور ان میں یہ اسپرٹ پیدا کی کہ " جہاد مذہبی و روحانی نہ ہو بلکہ نسلوں اور اوطان کے لیے کیا جائے اور مذہبیت کی اسپرٹ درمیان سے نکال دی جائے " (صفحہ ۲۵ - ۲۶) لیکن امر حق کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے بعد پھر وہی برطانیہ کا ہوّا مولانا کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے اور وہ فرماتے ہیں :-

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"افسوس مسلمانوں میں اُس وقت کوئی شخص مسلمانوں کی متحدہ قومیت اور التماسِ وطنیت، نسل ولسان وغیرہ کا واسطہ کھڑا نہ ہوا۔ اور نہ یورپ کے اخبار ورسائل اور لکچراروں کی بے حد وبے شمار آندھیوں کا مقابلہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پان اسلام ازم ایک قصۂ پارینہ ہو کر فنا کے گھاٹ اُتر گیا اور ممالکِ اسلامیہ یورپین اقوام کے لیے لقمۂ تر بن کر رہ گئے۔ اب جب کہ مسلمانوں کو افریقہ، یورپ، ایشیا وغیرہ میں پارہ پارہ کر کے فنا کی گود میں ڈال دیا گیا ہے تو ہم کو کہا جاتا ہے کہ اسلام صرف ملّی اتحاد کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کسی غیر مسلم جماعت سے متحد نہیں ہو سکتا اور نہ کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ متحدہ قومیت بنا سکتا ہے" (ص ۳۶-۳۷)

مندرجہ بالا عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی نگاہ میں حق اور باطل کا معیار صرف برطانیہ بن کر رہ گیا۔ وہ مسئلہ کو نہ تو علمی زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں کہ حقائق اپنے اصلی رنگ میں نظر آسکیں، نہ وہ مسلمانوں کی خیرخواہی کے زاویۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ جو کچھ مسلمانوں کے لیے زہر ہے وہ انہیں زہر دکھائی دے سکے۔ اِن دونوں زاویوں کے بجائے اُن پر فقط برطانیہ کی عداوت کا زاویۂ نظر مستولی ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ہر وہ چیز ان کو تریاق نظر آتی ہے جس کے متعلق کسی طرح ان کو معلوم ہو جائے کہ وہ برطانیہ کے لیے زہر ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسی چیز کو مسلمانوں کے لیے زہر سمجھتا ہو اور اس بنا پر اس کی مخالفت کرے تو وہ ان کے نزدیک برطانیہ پرست کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ان کو مسلمانوں کی زندگی سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی برطانیہ کی موت سے ہے، اور جب یہ بات ان کے دل میں بیٹھ چکی ہے کہ "متحدہ قومیت" برطانیہ کے لیے مہلک ہے تو جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے وہ "برطانیہ پرست" کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے ———— خیریت یہ ہو گئی کہ کسی نے مولانا کو برطانیہ کی ہلاکت کا ایک دوسرا نسخہ نہ بتا دیا جو متحدہ قومیت سے بھی زیادہ کارگر ہے، یعنی یہ کہ ہندوستان کی ۳۵ کروڑ آبادی یک بارگی خودکشی کر لے جس سے برطانوی سلطنت آن کی آن میں ختم کی جا

سکتی ہے۔ یہ تیر بہدف تدبیر اگر مولانا کے دل میں بیٹھ جاتی تو وہ بے تکلف فرماتے کہ جو شخص ہندوستان کے باشندوں کو خودکشی سے روکتا ہے وہ برطانیہ پرست ہے۔ خودکشی اگرچہ "ملعون" اور "بدترین" فعل ہی مگر جب کہ اس سے برطانیہ کی جڑ کھودی جاسکتی ہے تو فرض ہو جاتا ہے کہ اس فعلِ قبیح کا ارتکاب کیا جائے!

ایسی ہی باتوں سے یہ راز سمجھ میں آتا ہے کہ دین میں الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کو معیارِ حق کیوں قرار دیا گیا ہے۔ اگر خدا کا واسطہ درمیان سے ہٹ جائے اور بجائے خود کوئی شے محبوب یا مبغوض بن جائے تو عصبیتِ جاہلیہ کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، جس میں وہ تمام ذرائع و وسائل جائز کر لیے جاتے ہیں جن سے انسان کے جذبات محبت و عداوت کی تشفی ہو سکے، بقطع نظر اس سے کہ وہ قانونِ الٰہی کے مطابق ہوں یا اس کے خلاف۔ اسی لیے کہنے والے نے کہا کہ ذاتی عداوت تو شیطان سے بھی نہ ہونی چاہیے۔ اس میں بھی خدا کا واسطہ بیچ میں رہنا ضروری ہے، ورنہ وہ خود ایک قانون بن جائے گی اور تم شیطان کی دشمنی میں خدا کے حدود توڑو گے، یعنی اپنے دشمن شیطان ہی کا کام کرو گے۔

اثباتِ مدعا کے لیے حقائق سے چشم پوشی

اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ مولانا اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے مشہور اور بیّن واقعات کو بھی صاف نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یورپ جب مسلمانوں میں نسلی، وطنی اور لسانی قومیتوں کی تبلیغ کر رہا تھا تو کیا مسلمانوں میں کوئی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا؟ کیا ٹیپو سلطان، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہٗ، مصطفیٰ کامل مصری، امیر شکیب ارسلان، انور پاشا، جلال نوری بے، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، محمود الحسن، محمد علی، شوکت علی، اقبال، ابوالکلام مرحوم کسی کا نام بھی مولانا نے نہیں سنا؟ کسی کے کارنامے ان تک نہیں پہنچے؟ کیا ان میں سے کسی نے بھی مسلمانوں کو متنبہ نہیں کیا کہ یہ جاہلیت کی تفریق تم کو تباہ کرنے کے لیے برپا کرائی جا رہی ہے؟ شاید مولانا ان سوالات کا جواب نفی میں نہ دیں گے مگر

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہاں سب واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے فرماتے ہیں کہ "افسوس مسلمانوں میں اُس وقت کوئی مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا واعظ نہ ہوا" ــــــ ایسا غلط دعوٰی کرنے کی آخر ضرورت کیا تھی؟ مقصود صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ پہلے مسلمانوں کی قومی وحدت برطانوی مفاد کے خلاف تھی اس لیے سب مسلمان نسلی، وطنی اور لسانی امتیازات پھیلانے میں لگے ہوئے تھے، اور اب اسلامی وحدت برطانوی اغراض کے لیے مفید ہو گئی ہے، اس لیے اُس کا وعظ ابھی ابھی شروع ہوا ہے، لہذا ثابت ہوا کہ وطن پرستی کے مخالف سب کے سب برطانیہ پرست ہیں اور محض ساحرِ برطانیہ ... اندر بول رہا ہے! ــــــ یہ ہے نتیجہ عصبیتِ جاہلیہ کا۔ چونکہ حق و باطل کا معیار "برطانیہ" ہو گیا ہے اس لیے خلافِ واقعہ باتوں کی تصنیف بھی جائز ہو گئی، اگر ان سے برطانیہ کے خلاف کوئی کام لیا جا سکے۔

یہی ذہنیت ہے جو ہمیں پورے رسالہ میں کارفرما نظر آتی ہے۔ لُغت کو، آیاتِ قرآنی کو، اخبار و احادیث کو، تاریخی واقعات کو، غرض ہر چیز کو توڑ مروڑ کر اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ہر اُس چیز کو بلا تکلف نظر انداز کر دیا گیا ہے جو مدعا کے خلاف ہو، چاہے وہ کیسی ہی ظاہر و باہر حقیقت کیوں نہ ہو۔ حد یہ ہے کہ لفظی مغالطے دینے اور قیاس مع الفارق اور بناء فاسد علی الفاسد کا ارتکاب کرنے میں بھی تامل نہیں فرمایا گیا۔ ایک عالم اور متقی عالم کا یہ کارنامہ دیکھ کر آدمی انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ اسے کیا کہیے۔

قومیں اوطان سے کہاں بنتی ہیں؟

مولانا فرماتے ہیں کہ "فی زماننا قومیں اوطان سے بنتی ہیں" لیکن یہ ایک قطعی غلط اور سراسر بے بُنیاد دعوٰی ہے۔ پوری انسانی تاریخ سے ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی کہ کوئی قوم محض وطن سے بنی ہو۔ آج اس زمانہ میں بھی دُنیا کی تمام قومیں مولانا کے سامنے موجود ہیں۔ وہ فرمائیں کہ ان میں سے کون سی قوم وطن سے بنی ہے؟ کیا امریکہ کے حبشی اور ریڈ انڈین اور سفید فام ایک قوم ہیں؟ کیا جرمنی کے یہودی اور جرمن ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قوم ہیں؟ کیا پولینڈ، روس، ٹرکی، بلغاریہ، یونان، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ، لتھوانیا، فن لینڈ، کسی جگہ بھی خاکِ وطن کے اشتراک نے ایک قوم بنائی؟ کیا انگلستان، فرانس، اٹلی اور جاپان میں وحدت کا رنگ محض خاکِ وطن نے پیدا کیا ہے؟ کیا ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ یہودی جو رُوئے زمین کے اطراف و اکناف میں منتشر ہیں، کسی جگہ بھی وطنی قومیت میں جذب ہو گئے ہیں؟ کیا یورپ کے مختلف ممالک میں جرمن، گیار اسلافی، موراوین وغیرہ مختلف قومی اقلیتیں کسی جگہ بھی وطنی رشتۂ اشتراک میں گم ہو گئیں؟

واقعات تو بہرحال واقعات ہیں۔ آپ ان کو اپنی خواہشات کا تابع نہیں بنا سکتے۔ آپ کو یہ کہنے کا حق ہے، اگر آپ ایسا کہنا چاہیں کہ اب قوموں کو اوطان سے بننا چاہیئے۔ لیکن آپ کو ثبوت اور شہادت سے بے نیاز ہو کر دنیا کو یہ غلط خبر دینے کا کیا حق ہے کہ اب قومیں اوطان سے بننے لگی ہیں؟

هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ (البقرہ - ۱۱۱)

اگر (اپنے دعوٰی میں) سچے ہو تو اس کی دلیل لاؤ۔

اس میں شک نہیں کہ ایک مُلک کے باشندوں کو باہر والے ان کے ملک کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مثلاً امریکن، خواہ حبشی ہو یا فرنگی، باہر والے اس کو امریکن ہی کہیں گے۔ مگر کیا اس سے یہ حقیقت بدل جاتی ہے کہ امریکہ میں یہ دو الگ الگ قومیں ہیں نہ کہ ایک قوم؟ یہ بھی صحیح ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں ایک شخص اصطلاحاً اس سلطنت کا "نیشنل" کہلاتا ہے جس کی وہ رعایا ہو۔ مثلاً اگر مولانا حسین احمد صاحب بیرونِ ہند تشریف لے جائیں تو ان کو "برٹش نیشنلٹی" (برطانوی قومیت) سے منسوب کیا جائے گا۔ لیکن کیا یہ اصطلاحی قومیت حقیقت میں بھی مولانا کی قومیت بدل دے گی؟ پھر بھلا علمی حیثیت سے اس استدلال کی کیا وقعت ہو سکتی ہے کہ "اس وطن کے رہنے والے کی حیثیت سے سب (یعنی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ) ایک ہی قوم شمار ہوتے ہیں"؟ شمار ہونے اور فی الواقع ہونے میں بڑا فرق ہے۔ ایک کو دوسرے کے لیے نہ تو دلیل بنایا جا سکتا ہے، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو فی الواقع وہی ہونا چاہیئے جیسے وہ شمار

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیے جاتے ہیں۔

لغت اور قرآن سے غلط استدلال

اس کے بعد مولانا لغتِ عربی کی طرف رجوع فرماتے ہیں اور شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ عربی زبان میں قوم کے معنی ہیں "مردوں کی جماعت" یا "مردوں اور عورتوں کا مجموعہ" یا "ایک شخص کے اقربا" یا "دشمنوں کی جماعت"۔ اس کا ثبوت انہوں نے آیاتِ قرآنی سے بھی پیش فرمایا ہے۔ مثلاً وہ آیات جن میں کفار کو نبی کی یا مسلمانوں کی قوم" قرار دیا گیا ہے جو صریحاً تیسرے اور چوتھے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ یا وہ آیات بھی جن میں لفظ "قوم" پہلے یا دوسرے معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ لیکن اس پوری بحث میں مولانا کو ایک مرتبہ بھی یہ خیال نہ آیا کہ اس وقت جو بحث درپیش ہے وہ لفظ قوم کے لغوی معنی یا قدیم معنی سے متعلق نہیں ہے بلکہ موجودہ زمانہ کی اصطلاح سے تعلق رکھتی ہے۔ جواہر لال اور سید محمود لغتِ عرب اور قرآنی زبان میں کلام نہیں کرتے۔ نہ کانگریس کی کارروائیوں میں یہ پرانی زبان استعمال ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ کا تو وہی مفہوم ہے اور وہی ہو سکتا ہے جو آج کل ان سے مراد لیا جاتا ہے۔ آج کل اردو زبان میں "قوم" اور "قومیت" کے الفاظ انگریزی زبان کے الفاظ (Nation) اور (Nationality) کے مقابلہ میں بولے جاتے ہیں جن کی تشریح لارڈ برائس نے اپنی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" (International Relations) میں بدیں الفاظ کی ہے:

> "ایک قومیت سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جن کو چند مخصوص جذبات (Sentiments) نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو۔ ان میں سے بڑے اور طاقت ور جذبے تو دو ہیں۔ ایک جاذبۂ نسل، دوسرا جاذبۂ دین۔ لیکن ایک مشترک زبان کے استعمال اور مشترک لٹریچر سے دلچسپی اور زمانۂ ماضی کے مشترک قومی کارناموں اور مشترک مصائب کی یاد اور مشترک رسوم و عوائد، مشترک تخیلات و افکار اور مشترک مقاصد اور حوصلوں کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی اِس احساس جمعیت کی پیدائش میں بہت کچھ دخل ہوتا ہے کبھی یہ سب رابطے یک جا موجود ہوتے ہیں اور مجموعۂ افراد کو بستہ و پیوستہ رکھتے ہیں۔ اور کبھی ان میں سے بعض رابطے موجود نہیں ہوتے لیکن قومیت پھر بھی موجود ہوتی ہے۔" (صفحہ ۱۱)

اسی کی تشریح اخلاق وادیان کی دائرۃ المعارف (Encyclopaedia of Religion and Ethics) میں یوں کی گئی ہے:-

"قومیت وہ وصفِ عام یا متعدد اوصاف کا ایسا مرکب ہے جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو اور ان کو جوڑ کر ایک قوم بنا دے۔ ہر ایسی جماعت ان افراد پر مشتمل ہوتی ہے جو نسل، مشترک روایات، مشترک مفاد، مشترک عادات و رسوم اور مشترک زبان کے رابطوں سے باہم مربوط ہوتے ہیں، اور ان سب سے اہم رابطہ ان کے درمیان یہ ہوتا ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، بلا ارادہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، اور ان کے درمیان مختلف حیثیات سے الفت و موانست ہوتی ہے۔ غیر قوم کا آدمی ان کو غیر اور اجنبی محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی دلچسپیاں اور اس کی عادات انہیں نرالی معلوم ہوتی ہیں اور ان کے لیے اس کے اندازِ طبیعت اور اس کے خیالات و جذبات کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قدیم زمانہ کے لوگ غیر قوم والوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، اور اسی وجہ سے آج کا مہذب آدمی بھی غیر قوم والے کی عادات اور طرزِ زندگی کو اپنے مذاق کے خلاف پا کر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔"

کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید نے اس معنی میں کفار و مشرکین اور مسلمانوں کا ایک قومیت میں جمع ہونا جائز رکھا ہے؟ یا کوئی نبی دنیا میں کبھی اِس غرض کے لیے بھی بھیجا گیا ہے کہ مومن اور غیر مومن سب کو اس معنی میں ایک قوم بناتے؟ اور اگر نہیں تو یہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فضول لفظی بحث آخر کیوں چھیڑی جاتی ہے؟ لفظ اپنے معنی تاریخ کے دوران میں بار بار بدلتا ہے۔ کل ایک لفظ کسی معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ آج کسی اور معنی میں ہوتا ہے۔ اب یہ لفظی مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ معنوی تغیرات کو نظر انداز کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائیں کہ قرآن کی رو سے قومیت میں اشتراک مسلم اور کافر کا ہو سکتا ہے؟ دراں حالیکہ قومیت کا جو مفہوم قرآن کی زبان میں تھا اس کو آج کے مفہوم سے ذرہ برابر کوئی علاقہ نہیں۔ متقدمین نے "مکروہ" اور "حرام" میں اصطلاحی فرق نہیں کیا تھا اس لیے اکثر مقامات پر ان کی عبارتوں میں مکروہ بمعنی حرام مستعمل ہوا ہے۔ لیکن اب کہ متوسطین کے ان دونوں مدارج کے لیے الگ اصطلاحیں بن چکی ہیں اگر کوئی شخص کسی حرام کو محض مکروہ بمعنی اصطلاحی ٹھیرائے اور حجت کے طور پر سلف کی کوئی عبارت پیش کرے تو کیا یہ مغالطہ کے سوا کچھ اور ہوگا؟ اسی طرح لفظ قومیت بھی اب اصطلاح بن چکا ہے۔ اب مسلم و کافر کے لیے مشترک قومیت کا لفظ استعمال کرنا، اور معترض کا منہ بند کرنے کے لیے اس لفظ کے پرانے استعمالات کو حجت میں پیش کرنا بھی محض ایک مغالطہ ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

ایک اور لفظی مغالطہ

آگے چل کر مولانا دعویٰ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں یہود اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت بنائی تھی۔ اور اس کے ثبوت میں وہ معاہدہ پیش کرتے ہیں جو ہجرت کے بعد حضور اکرم اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس معاہدہ میں کہیں یہ فقرہ مولانا کے ہاتھ آگیا کہ:

وان یھود بنی عوف امۃ مع المومنین۔

"و بنی عوف کے یہودی مسلمانوں کیساتھ ایک امت ہوں گے۔"

بس یہ فقرہ کہ "یہودی اور مسلمان ایک امت ہوں گے" یہ دعویٰ کرنے کے لیے کافی سمجھ لیا گیا کہ آج بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت بن سکتی ہے لیکن یہ پھر لفظی مغالطہ ہے۔ لغتِ عرب میں امت سے مراد وہ جماعت ہے جس کو کوئی چیز جمع کرتی ہو، عام اس سے کہ وہ زمانہ ہو، مقام ہو، دین ہو یا کوئی اور چیز ــــــ اس لحاظ سے اگر دو مختلف قومیں

کسی ایک مشترک مقصد کے لیے عارضی طور پر متفق ہو جائیں تو ان کو بھی ایک اُمت کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ صاحب لسان العرب لکھتے ہیں:

وقوله فی الحدیث ان یهود بنی عوف امة من المؤمنین یرید انهم بالصلح الذی وقع بینهم وبین المؤمنین کجماعة منهم کلمتهم و ایدیهم واحدة۔

حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ان یهود بنی عوف امة من المؤمنین اس سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جو صلح واقع ہوئی ہے اسی کی وجہ سے وہ گویا مسلمانوں ہی کی ایک جماعت ہو گئے ہیں اور ان کا معاملہ واحد ہے۔

اس لغوی "امت" کو آج کی اصطلاحی "متحدہ قومیت" سے کیا واسطہ؟ زیادہ سے زیادہ اس کو آج کل کی سیاسی زبان میں فوجی اتحاد (Military Alliance) کہہ سکتے ہیں یہ محض ایک تحالف تھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ یہود اپنے دین پر رہیں گے، دونوں کی تمدنی و سیاسی حیثیتیں الگ الگ رہیں گی، البتہ ایک فریق پر جب کوئی حملہ کرے گا تو دونوں فریق مل کر لڑیں گے، اور دونوں اس جنگ میں اپنا اپنا مال خرچ کریں گے۔ دو تین سال کے اندر ہی اس تحالف کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں نے کچھ یہودیوں کو جلا وطن کیا اور کچھ کو ہلاک کر دیا۔ کیا اسی کا نام "متحدہ قومیت" ہے؟ کیا کسی معنی میں بھی یہ چیز اس "متحدہ قومیت" سے مماثلت رکھتی ہے جو اس وقت معرضِ بحث میں ہے؟ کیا وہاں کوئی مشترک اسٹیٹ بنایا گیا تھا؟ کیا وہاں کوئی مشترک مجلسِ قانون ساز بنائی گئی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ یہودی اور مسلمان ایک مجموعہ ہوں گے اور اس مجموعہ میں سے جس کی اکثریت ہوگی وہی مدینہ پر حکومت کرے گا اور اسی کے منظور کیے ہوئے قوانین مدینہ میں نافذ ہوں گے؟ کیا وہاں مشترک عدالتیں قائم ہوتی تھیں جن میں یہودیوں اور مسلمانوں کے قضایا کا یکجا اور ایک ہی ملکی قانون کے تحت فیصلہ ہوتا ہو؟ کیا وہاں کوئی وطنی کانگریس بنائی گئی تھی جس میں یہودی اکثریت کا منتخب کیا ہوا ہائی کمانڈ اپنی انگلیوں پر یہودی اور مسلمان سب کو رقص کراتا ہو؟ کیا وہاں رسول اللہ سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

معاہدہ کرنے کے بجائے کعب بن اشرف اور عبد اللہ بن اُبی براہِ راست افرادِ مسلمین سے ماس کانٹیکٹ (Muslim Mass Contact) کرتے گشت تھے؟ کیا وہاں بھی وردھا اسکیم کے طرز کی کوئی تعلیمی اسکیم تصنیف کی گئی تھی تاکہ مسلمان اور یہودی بچے ایک مشترک سوسائٹی بنانے کے لیے تیار کیے جائیں اور ان کو یہودیت اور اسلام کی صرف مشترک سچائیاں ہی پڑھائی جائیں؟ کیا وہاں بھی کسی ابو رافع نے کوئی مخصوص اسکیم "تعلیم اہلِ مدینہ" کے لیے بنائی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تعلیمی صومعوں میں مسلمان بچوں کا بھیجا جانا قبول فرمایا تھا؟ مولانا آخر فرمائیں تو کہ جس "متحدہ قومیت" کو وہ رسولِ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس میں آج کل کی "متحدہ قومیت" کے عناصرِ ترکیبی میں سے کون سا عنصر پایا جاتا تھا؟ اگر وہ کسی ایک عنصر کا بھی پتہ نہیں دے سکتے، اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز نہیں دے سکتے، تو کیا مولانا کو خدا کی بازپرس کا خوف نہیں کہ محض امۃ المومنین یا امۃ مع المومنین کے الفاظ معاہدۂ نبوی میں دیکھ کر وہ مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ جیسی متحدہ قومیت آج کانگریس بنا رہی ہے، وہی متحدہ قومیت کل نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنا چکے ہیں، لہٰذا آؤ اور اطمینان سے اس میں جذب ہو جاؤ۔ الفاظ کا سہارا لے کر مولانا نے اپنا مدعا ثابت کرنے کی کوشش تو بہت خوبی کے ساتھ کر دی، مگر انہیں یہ خیال نہ آیا کہ حدیث کے الفاظ کو مفہومِ نبوی کے خلاف کسی دوسرے مفہوم پر چسپاں کرنا، اور اس مفہوم کو نبی کی طرف منسوب کر دینا من کذب علیّ متعمداً کی زد میں آجاتا ہے۔ مولانا خود ایک جلیل القدر عالم اور محدث ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص حدیثِ عائشہؓ کان النبی یقبل ویباشر وھو صائم کے لفظ مباشرت کو اردو کے معروف معنوں میں لے لے اور اس سے یہ استدلال کرے کہ روزے میں مباشرت کرنا نعوذ باللہ سنت سے ثابت ہے، لہٰذا سب مسلمانوں کو روزے میں مباشرت کرنی چاہیے، تو آپ اس پر کیا حکم لگائیں گے؟ دونوں استدلالوں کی نوعیت ایک ہے لہٰذا ان کا حکم بھی ایک ہی ہونا چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ مستدل کی شخصیت کو دیکھ کر اس باب میں رعایت کی جائے۔ بلکہ اگر مستدل ان لوگوں میں سے ہے جن کی طرف مسلمان اعتماد اور بھروسے کے ساتھ اپنے دین کا علم حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں، تو معاملہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور زیادہ اشد ہو جاتا ہے۔ جب شفاخانہ ہی سے زہر تقسیم ہونے لگے تو امرت کہاں تلاش کیا جائے؟

بناء فاسد علی الفاسد

پھر مولانا اس متحدہ قومیت کے جواز میں ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے:۔

"ہم روزانہ مفادِ ہائے مشترکہ کے لیے ہیئات اجتماعیہ بناتے ہیں اور ان میں نہ صرف شریک ہوتے ہیں بلکہ ان کی ممبری اور شرکت کے لیے انتہائی جدوجہد کرتے ہیں...... ٹاؤن ایریا، نوٹیفائڈ ایریا، میونسپل بورڈ، ڈسٹرکٹ بورڈ، کونسلات، اسمبلیاں، ایجوکیشنل ایسوسی ایشن اور اس قسم کی سینکڑوں ایسوسی ایشنیں اور انجمنیں ہیں جو کہ انہی اصولوں اور قواعد سے عبارت ہیں جو کہ خاص مقصد کے ماتحت ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے بنائے گئے ہیں۔ تعجب ہے کہ ان میں حصہ لینا اور مکمل یا غیر مکمل جدوجہد کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جاتا۔ مگر اسی قسم کی کوئی انجمن آزادیٔ ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف قائم ہو تو وہ حرام، خلافِ دیانت، خلافِ تعلیماتِ اسلامیہ اور خلافِ عقل و دانش وغیرہ ہو جاتی ہے۔" (صفحہ ۱۶)

یہ بناء فاسد علی الفاسد ہے۔ ایک گناہ کو جائز فرض کر کے اس کی حجت پر مولانا اسی قسم کے دوسرے گناہ کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ دونوں میں ایک ہی علتِ حرمت پائی جاتی ہے اور مقیس و مقیس علیہ دونوں ناجائز ہیں تاوقتیکہ یہ علت اُن سے دُور نہ ہو۔ علماء کرام مجھے معاف فرمائیں، میں صاف کہتا ہوں کہ ان کے نزدیک کونسلوں اور اسمبلیوں کی شرکت کو ایک دن حرام اور دوسرے دن حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے، اس لیے کہ ان کی تحلیل و تحریم حقیقت نفس الامری کے ادراک پر تو مبنی ہے نہیں، محض گاندھی جی کی جنبشِ لب کے ساتھ ان کا فتویٰ گردش کیا کرتا ہے۔ لیکن میں اسلام کے غیر تغیر پذیر اصولوں کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ ہر اس اجتماعی ہیئت کو تسلیم کرنا مسلمانوں کے لیے ہمیشہ گناہ تھا، آج

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

بھی گناہ ہے اور ہمیشہ گناہ رہے گا جس کا دستور انسانوں کو اس امر کا اختیار دیتا ہو کہ وہ ان مسائل کے متعلق قانون بنائیں یا ان مسائل کا تصفیہ کریں، جن پر خدا اور اس کا رسول پہلے اپنا ناطق فیصلہ دے چکا ہے۔ اور یہ گناہ اِس صورت میں اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے جبکہ ایسے اختیارات رکھنے والی اجتماعی ہیئت میں اکثریت غیر مسلموں کی ہو اور فیصلہ کا مدار کثرتِ رائے پر ہو۔ ان اجتماعی ہیئتوں کے حدودِ اختیار و عمل کو خدا کی شریعت کے حدود سے الگ کر دینا مسلمانوں کا اوّلین فرض ہے اور اصلی جنگِ آزادی ان کے لیے یہی ہے۔ اگر یہ حدود الگ ہو جائیں تو البتہ کسی ایسی جماعت سے دوستی یا معاہدہ اور تعاون کرنا مسلمانوں کے لیے جائز ہو گا جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترک اغراض کے لیے بنائی جائے، عام اس سے کہ وہ کسی مشترک دشمن کے مقابلہ میں مدافعت کے لیے ہو، یا کسی معاشی یا صنعتی کاروبار کے لیے۔ لیکن جب تک حدود ایک دوسرے سے گڈمڈ ہیں، اشتراک و تعاون تو درکنار، ایسے دستور کے تحت زندگی بسر کرنا بھی مسلمانوں کے لیے گناہ ہے۔ اور یہ اجتماعی گناہ ہے جس میں ہم دونوں کی تمیز نہیں، ہماری قوم اس وقت تک گناہگار رہے گی جب تک کہ وہ اس دستور کو پارہ پارہ نہ کر دے۔ اور اس میں ان لوگوں کا گناہ شدید تر ہو گا جو اس دستور پر راضی ہوں گے اور اسے چلانے میں حصہ لیں گے۔ اور اس شخص کا گناہ شدید ترین ہو گا جو خدا کی شریعت اور اس کے رسول کی سنت کو اس کے لیے دلیلِ جواز بنائے گا۔ کائناً من کان۔

میرے نزدیک یہ نہ تفقہ ہے اور نہ تقویٰ کہ جس چیز میں ایک علتِ حرمت کی اور دوسری علتِ جواز کی بیک وقت پائی جاتی ہو اس میں سے محض علتِ جواز کو الگ نکال کر حکم لگایا جائے اور علتِ حرمت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ آپ آزادی ملک اور برطانوی اقتدار کے خلاف جدوجہد کا نام تو جھٹ لے دیتے ہیں کہ اسے کون ناجائز کہہ سکے گا۔ لیکن یہ نام لیتے وقت آپ کو یہ یاد نہیں آتا کہ جو انجمن اس نظم کے مطابق آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہے، وہی انجمن اس دستور کو قبول کرتی ہے، اسے چلاتی ہے اور اسی کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے لڑ رہی ہے جو انسانی مجلسِ قانون ساز کو خدا کے قانون میں ترمیم کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ جس کی رو سے خدا کا قانون اگر نافذ ہو بھی سکتا ہے تو صرف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس وقت جب کہ اسے لیجس لیچر (Legislature) کی منظوری حاصل ہو جاتی ہے۔ جس کے تحت غیر مسلم اکثریت کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بنانے اور بگاڑنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ اُن کے اخلاق، ان کی معاشرت، اور اُن کی آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت پر ہر قسم کے اثرات ڈال سکتی ہے۔ ایسے دستور کے ساتھ جو آزادی ملک حاصل ہوتی ہو آپ اس کے پیچھے دوڑ سکتے ہیں، کیونکہ آپ کو صرف برطانوی اقتدار کا زوال مطلوب ہے، عام اس سے کہ وہ کسی صورت میں ہو۔ اسی لیے آپ ایسی انجمن کے معاملہ میں صرف علتِ جواز ہی ڈھونڈتے ہیں اور علتِ حرمت جو سامنے منہ کھولے کھڑی ہے، آپ کو کسی طرح نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم مجبور ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ دیکھیں اور علتِ حرمت کو دفع کیے بغیر علتِ جواز کو قبول نہ کریں۔ اس لیے کہ ہم کو برطانوی اقتدار کا زوال اور اسلام کا بقا، دونوں ساتھ ساتھ مطلوب ہیں۔ اس کا نام اگر کوئی برطانیہ پرستی رکھتا ہے تو رکھے، ہمیں اس کے طعن کی ذرہ برابر پرواہ نہیں۔

افسوسناک بے خبری

مولانا ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"(متحدہ وطنی قومیت) کی مخالفت کا فتویٰ صرف اس بنا پر کہ وطنیت کا مفہوم مغرب کی اصطلاح میں کچھ ایسے اصولوں پر اطلاق کیا جاتا ہے جو کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ یکسر مخالف مذہب ہیں، اسی مفہوم مصطلح سے مخصوص ہوگا۔ مگر یہ مفہوم نہ عام طور پر لوگوں کے ذہن نشین ہے اور نہ اس کا کوئی مسلمان دیانت دار قائل ہو سکتا ہے اور نہ ایسے مفہوم کی اس وقت تحریک ہے۔ کانگریس اور اس کے ارکان اس کے محرک نہیں ہیں اور نہ اس کو ہم ملک کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔" (صفحہ ۴۱)

اس دعوے کے ثبوت میں وہی پامال چیز پھر سامنے لائی گئی ہے جس کی حقیقت ایک سے زیادہ مرتبہ کھولی جا چکی ہے، یعنی "بنیادی حقوق کا اعلان" اور اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ:-

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"خود کانگریس بھی جس متحدہ قومیت کو ہندوستان میں پیدا کرنا چاہتی ہے اس میں کوئی ایسی بات نہیں چاہتی جس سے اہلِ ہند کے مذاہب یا ان کے کلچر و تہذیب اور پرسنل لا پر کسی قسم کا مضر رساں اثر پڑے۔ وہ فقط انہی امور کو درست کرنا اور سلجھانا چاہتی ہے جو کہ مشترکہ مفاد اور ضروریاتِ ملکیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو پردیسی حکومت نے اپنے قبضہ میں لے کر عام باشندگانِ ہند کو فنا کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ عموماً یہ امور وہی ہیں جو کہ وظیفاً مڈ ایریا، میونسپل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، کونسلوں، اسمبلیوں وغیرہ میں داخلی اور خارجی حیثیات سے طے کیے جاتے ہیں۔ ان میں کسی قوم یا مذہب میں جذب ہو جانا ملحوظِ نظر نہیں ہے" (صفحہ ۵)

یہ تحریر ایک روشن نمونہ ہے اس امر کا کہ اس نازک وقت میں کیسی سطح بینی اور سہل انگاری کے ساتھ مسلمانوں کی پیشوائی کی جا رہی ہے۔ جن مسائل پر آٹھ کروڑ مسلمانوں کے صلاح و فساد کا انحصار ہے، جن میں ایک ذرا سی چوک بھی اُن کی آئندہ صورتِ اجتماعی و اخلاقی کو بگاڑ کر کچھ سے کچھ کر سکتی ہے، ان کے تصفیہ کو ایسا ہلکا اور آسان کام سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے لیے اتنے مطالعہ اور غور و خوض اور تدبر کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی جس کا اہتمام ایک فردِ واحد کو طلاق اور وراثت کا کوئی جزئی مسئلہ بتانے میں کیا جاتا ہے۔ عبارت کا ایک ایک لفظ شہادت دے رہا ہے کہ مولانا نہ تو قومیت کے اصطلاحی مفہوم کو جانتے ہیں، نہ کانگریس کے مقصد و مدعا کو سمجھتے ہیں، نہ بنیادی حقوق کے معنی پر انہوں نے غور کیا ہے، نہ ان کو خبر ہے کہ جن اجتماعی مجلسوں کا وہ بار بار اس قدر سادگی کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں ان کے حدودِ اختیار و عمل موجودہ دستور کے تحت کن کن راہوں سے اُس دائرے میں نفوذ کرتے ہیں جس کو تہذیب و تمدن اور عقائد و اخلاق کا دائرہ کہا جاتا ہے۔ حد یہ ہے ——— اور یہ بات میں خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں ——— کہ مولانا با ایں ہمہ علم و فضل کلچر، تہذیب، پرسنل لا وغیرہ الفاظ کو بھی جس طرح استعمال کر رہے ہیں اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ میری یہ صاف گوئی ان حضرات کو یقیناً بُری معلوم ہوگی جو رجال کو حق

سے پہچاننے کے بجائے حق کو رجال سے پہچاننے کے خوگر ہیں، اور اس کے جواب میں چند اور گالیاں سننے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے ہی تیار کر لیا ہے۔ مگر میں جب دیکھتا ہوں کہ مذہبی پیشوائی کی مسندِ مقدس سے مسلمانوں کی غلط رہنمائی کی جا رہی ہے، ان کو حقائق کے بجائے اوہام کے پیچھے چلایا جا رہا ہے، اور خندقوں سے بھری ہوئی راہ کو شاہراہِ مستقیم بنا کر انہیں اس کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، تو میں کسی طرح اس پر صبر نہیں کر سکتا، کوشش بھی کروں تو میرے اندر اس پر صبر کی طاقت نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے اس پر راضی ہو جانا چاہیے کہ جو کوئی میری صاف گوئی پر ناراض ہوتا ہو تو ہو جائے وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ۔ میں اپنا کام اللہ کو سونپتا ہوں۔

وطنی قومیت کا حقیقی مدعا

وطنی قومیت کی تشریح کے لیے ان عبارات پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے جو اسی مضمون میں لارڈ برائس کی کتاب "بین الاقوامی تعلقات" اور "اخلاق و ادیان کی دائرۃ المعارف" سے نقل کی گئی ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے افراد کو قوم بنانے والی چیز اصلاً اور ابتداءً ایک ہی ہے اور وہ کوئی ایسا جاذبہ ہے جو ان سب میں رُوح بن کر پھیل جائے اور ان کو ایک مشترک سے مرتبط کر دے۔ لیکن محض اس جاذبہ کا موجود ہونا قوم بنانے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ اس کو اتنا طاقت ور ہونا چاہیے کہ وہ تمام ان داعیات کو دبا دے جو افراد کو یا افراد کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے والے ہوں۔ اس لیے کہ علیحدہ کرنے والی چیزیں اگر جوڑنے والے جاذبہ کی مزاحمت کرنے کے لیے کافی مضبوط ہوں تو وہ جوڑنے کے عمل میں کامیاب نہیں ہو سکتا، یا بالفاظ دیگر "قوم" نہیں بنا سکتا۔ علاوہ بریں تشکیل قومیت کے لیے زبان، ادب، تاریخی روایات، رسوم و عادات، معاشرت اور طرزِ زندگی، افکار و تخیلات، معاشی مفاد اور مادی اغراض کی مدد بھی درکار ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں ایسی ہونی چاہئیں جو اس جوڑنے والے جاذبے کی فطرت سے مناسبت رکھتی ہوں، یعنی ان کے اندر کوئی عنصر ایسا نہ ہو جو علیحدگی کے احساس کو زندہ رکھنے والا ہو۔ اس لیے کہ یہ سب کی سب ایسی طاقتیں ہیں جو افراد کو جمع کرنے میں اثر رکھتی ہیں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور یہ جوڑنے کے عمل میں اُس کلمۂ جامعہ کی مددگار صرف اسی طرح ہو سکتی ہیں کہ ان سب کا میلان اسی مقصود کی طرف ہو جو اس کلمۂ جامعہ کا مقصود ہے، ورنہ بصورت دیگر یہ دوسرے ڈھنگ پر جماعت سازی کریں گی اور قوم بنانے کا عمل ناقص رہے گا۔

اب غور کیجیے کہ جس ملک میں اِس معنی کے لحاظ سے مختلف قومیں رہتی ہوں ان کو متفق کرنے کی کیا صورتیں ممکن ہیں۔ آپ جتنا بھی غور کریں گے، آپ کو صرف دو ہی ممکن العمل صورتیں نظر آئیں گی:۔

ایک یہ کہ ان قوموں کو ان کی قومیتوں کے ساتھ برقرار رکھ کر ان کے درمیان واضح اور متعین شرائط کے ساتھ ایک ایسا وفاقی معاہدہ ہو جاتے جس کی رو سے وہ صرف مشترک اغراض و مقاصد کے لیے مل کر عمل کریں اور باقی امور میں بالفعل مختار ہوں ___ کیا کانگریس نے فی الواقع یہ طریقہ اختیار کیا ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ان قوموں کو "ایک قوم" بنا دیا جاتے۔ یہی دوسری صورت کانگریس چاہتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ قومیں ایک قوم کس طرح بن سکتی ہیں؟ لامحالہ ان کے لیے سب سے پہلے تو ایک مشترک جاذبہ، ایک کلمۂ جامعہ درکار ہے، اور وہ جاذبہ یا کلمہ صرف تین چیزوں ہی سے مرکب ہو سکتا ہے:۔

وطن پرستی، بیرونی دشمن سے نفرت، اور معاشی مفاد سے دلچسپی۔ پھر جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، قوم بنانے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ یہ جاذبہ اتنا قوی ہو کہ دوسرے تمام جاذبے جنہوں نے ان قوموں کو الگ الگ اقوام بنا رکھا ہے اس کے سامنے دب جائیں۔ کیونکہ اگر مسلمان کو اسلام سے، ہندو کو ہندویت سے، سکھ کو سکھیت سے اتنی دلچسپی ہو کہ جب مذہب یا قومیت کا معاملہ سامنے آئے تو مسلمان، مسلمان کے ساتھ اور ہندو ہندو کے ساتھ اور سکھ سکھ کے ساتھ جُڑ جاتے اور اس قومی (یا وطن پرستوں کی زبان میں فرقہ وارانہ) معاملہ کی حمایت کے لیے ایک جماعت بن کر اُٹھ کھڑا ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جاذبۂ وطنی نے ان کو ایک قوم نہیں بنایا۔ یہ امر دیگر ہے کہ مسلمان اسلام کا قائل رہے اور نماز بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پڑھ لیا کرے، اور ہندو ہندویت کا معتقد رہے اور مندر ہی چلا جایا کرے، لیکن ایک قوم بننے کے لیے شرط اول یہ ہے کہ اس کی نگاہ میں وطنیت کی کم از کم اتنی اہمیت ضرور ہو کہ اسلام کو اور ہندویت یا سکھیت کو وہ اس پر قربان کر سکتا ہو۔ اس کے بغیر "وطنی قومیت" قطعاً بے معنی ہے۔

یہ تو وطنی قومیت کا تخم ہے۔ مگر یہ تخم بار آور نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے لیے مناسب آب و ہوا اور مناسب موسم نہ ہو۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ جاذبۂ قومی کی مدد کے لیے ضروری ہے کہ زبان، ادب، تاریخی روایات، رسوم و عادات، معاشرت اور طرز زندگی، افکار اور تخیلات، معاشی اغراض اور مادی مفاد، غرض تمام وہ چیزیں جو انسانی جماعتوں کی تالیف و ترکیب میں فی الجملہ اثر رکھتی ہیں، اسی ایک جاذبۂ قومی کی فطرت میں ڈھلی ہوئی ہوں۔ اس لیے کہ افراد کو جوڑنے والی ان مختلف طاقتوں کا میلان اگر علیحدگی کی جانب ہو تو یہ جذب اور تالیف اور اجتماع کے عمل میں اس جاذبہ کی الٹی مزاحمت کریں گی اور متحد قوم نہ بننے دیں گی۔ لہٰذا ایک وطنی قوم بنانے کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ان سب چیزوں میں سے ان عناصر کو نکالا جائے جو مختلف قوموں کے اندر جداگانہ قومیت کی روح پیدا کرتے اور زندہ رکھتے ہیں اور ان کے بجائے اپنے رنگ میں ان کو ڈھالا جائے کہ وہ آہستہ آہستہ تمام افراد اور طبقوں اور گروہوں کو ہم رنگ کر دیں، ان کو ایک سوسائٹی بنا دیں، ان کے اندر ایک مشترک اجتماعی مزاج اور مشترک اخلاقی روح پیدا کر دیں، ان کے اندر ایک طرح کے جذبات و احساسات پھونک دیں، اور ان کو ایسا بنا دیں کہ ان کی معاشرت ایک ہو، طرز زندگی ایک ہو، ذہنیت اور انداز فکر ایک ہو، ایک ہی تاریخ کے سرچشمے سے وہ افتخار کے جذبات اور روح کو حرکت میں لانے والے محرکات حاصل کریں اور ان کے درمیان ایک دوسرے کے لیے کسی چیز میں بھی کوئی نرالا پن باقی نہ رہے۔

اسی مقصد کے لیے وردھا تعلیم بنائی گئی ہے اور یہی مقصد ودیا مندر اسکیم کا ہے، جیسا کہ دونوں اسکیموں میں صاف صاف کہہ بھی دیا گیا ہے۔ مگر مولانا نے ان

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسکیموں اور ان کے نصاب کو نہیں دیکھا۔ اس قومیت کا صور برسوں سے پنڈت جواہر لال پھونک رہے ہیں مگر ان کی بھی کوئی تحریر و تقریر مولانا کی سماعت و بصارت تک پہنچنے کا موقع نہ پاسکی۔ یہی چیز کانگریس کا ایک ایک ذمہ دار آدمی کہہ رہا ہے، لکھ رہا ہے، اور اس کے لیے ان حاکمانہ طاقتوں سے کام لے رہا ہے جو نئے دستور نے عطا کی ہیں، مگر نہ مولانا کے کان ان باتوں کو سنتے ہیں اور نہ ان کی آنکھیں ان چیزوں کو دیکھتی ہیں۔ اسی چیز کے لیے ان تمام اجتماعی ہیئتوں اور مجلسوں سے کام لیا جا رہا ہے جن کی فہرست مولانا بار بار گنایا کرتے ہیں، اور یہ مجالس بعض اس وجہ سے اس کام میں ان کی مددگار بن گئی ہیں کہ ان کا دائرہ عمل ان تمام معاملات پر چھایا ہوا ہے جن کو آپ تہذیب، کلچر، پرسنل لاء وغیرہ ناموں سے یاد فرماتے ہیں۔ مگر یہ عمل جو ہر آن ہندوستان کے ہر حصہ میں ہو رہا ہے، اس کی بھی کسی جنبش کو مولانا کے حواس خمسہ تک رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ اس پورے مواد میں سے صرف ایک ہی دستاویز ان تک پہنچی ہے جس کا نام "بنیادی حقوق"[1] ہے اور بس اسی کے اعتماد پر مولانا اس "متحدہ قومیت" کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے تشبیہ دینے کی جرأت فرما رہے ہیں، حالانکہ ان بنیادی حقوق کی حیثیت طرۂ دکمونیہ کے مشہور اعلان سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے اور مغربی ڈیموکریسی کی ایسی چالوں کا رشتہ رسول پاک کے عمل سے جوڑنے کی جسارت ہم جیسے گناہگاروں کے بس کی تو بات نہیں۔ ہاں جن کے پاس تقویٰ کا زادِ راہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایسی جسارتیں کرنے پر بھی بخشے جانے کی امید رکھتے ہیں، انہیں اختیار ہے کہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں لکھیں۔

اشتراکِ لفظی کا فتنہ

مولانا نے اپنے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا ایک خاص مفہوم متعین کر رکھا ہے جس کے حدود انہوں نے تمام شرعی خرابیوں کو خارج رکھ کر اور تمام امکانی اعتراضات سے پہلو بچا کر خود مقرر فرمائے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ایسی پر احتیاط مفتیانہ زبان میں بیان فرماتے ہیں کہ قواعد

---

[1] بنیادی حقوق پر مفصل بحث اس سے پہلے کے باب میں گزر چکی ہے ـــــ مرتب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تفریق کے لحاظ سے کوئی اس پر حرف نہ لاسکے گا لیکن اس میں خرابی بس اتنی ہی تھی کہ اپنے مفہوم ذہنی کو مولانا کانگریس کا مفہوم و مدعا قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ کانگریس اس سے بالکل مختلف ہے۔ اگر مولانا صرف اتنا کہنے پر اکتفا فرماتے کہ "متحدہ قومیت" سے میری مراد یہ ہے تو ہمیں ان سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہ تھی لیکن وہ آگے قدم بڑھا کر فرماتے ہیں کہ یہی کانگریس کی مراد بھی یہی ہے اور کانگریس بالکل نبی صلعم کے اسوہ پر چل رہی ہے۔ اور مسلمانوں کو مامون و مطمئن ہو کر اپنے آپ کو اس متحدہ قومیت کے حوالے کر دینا چاہیے جسے کانگریس بنانا چاہتی ہے۔ یہیں سے ہمارے اور ان کے درمیان نزاع کا آغاز ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ "پانی ڈالنے" سے آپ کا مفہوم ذہنی "پانی ڈالنا" ہی ہو لیکن دوسرے نے "آگ لگانے" کا نام "پانی ڈالنا" رکھ چھوڑا ہو، تو آپ کتنا ظلم کریں گے اگر اختلاف معنی کو نظر انداز کر کے لوگوں کو مشورہ دینے لگیں کہ اپنا گھر اس شخص کے حوالے کر دو جو "پانی ڈالنے" کے لیے کہتا ہے۔ ایسے ہی موقع کے لیے تو قرآن مجید میں ہدایت کی گئی تھی کہ جب ایک لفظ ایک صحیح معنی اور ایک غلط معنی میں مشترک ہو جائے اور تم دیکھو کہ اعدائے دین اس اشتراک لفظی سے فائدہ اٹھا کر فتنہ برپا کر رہے ہیں تو ایسے لفظ ہی کو چھوڑ دو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا
وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ (بقرہ - ۱۰۴)

"اے ایمان لانے والو! "راعنا" نہ کہا کرو بلکہ "انظرنا" کہا کرو اور توجہ سے بات سنو، کافر تو عذاب الیم کے مستحق ہیں۔"

لہٰذا مولانا کو اپنے مفہوم ذہنی کے لیے تحالف یا وفاق یا اسی قسم کا کوئی مناسب لفظ اختیار کرنا چاہیے تھا، اور اس وفاق یا تحالف کو بھی اپنی تجویز کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے تھا، نہ اس حیثیت سے کہ یہ کانگریس کا عمل ہے۔ کم از کم اب وہ امت پر رحم فرما کر اپنی غلطی محسوس فرمالیں ورنہ اندیشہ ہے کہ ان کی تحریریں ایک فتنہ بن کر رہ جائیں گی اور اس پرانی سنت کا اعادہ کریں گی کہ ظالم امرا اور فاسق اہل سیاست نے جو کچھ کیا اس کو علما کے ایک گروہ نے قرآن و حدیث سے درست ثابت کر کے ظلم و طغیان کے لیے مذہبی ڈھال

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فراہم کردی۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ۔ (یونس۔ ۸۵)

"اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا۔"

مولانا کے اس رسالہ کی اشاعت کے بعد یہ ضروری ہو گیا ہے کہ خالص علمی حیثیت سے "قومیت" کے مسئلہ کی تحقیق کی جائے اور اس باب میں اسلامی نظریات اور غیر اسلامی یا جاہلی نظریات کے درمیان جو اصولی فرق ہے اسے پوری طرح نمایاں کر دیا جائے، تاکہ جو لوگ غلط فہمی کی بنا پر دونوں کو خلط ملط کرتے ہیں ان کے ذہن کا الجھاؤ دور ہو اور وہ دونوں راستوں میں سے جس راستے کو بھی اختیار کریں علیٰ وجہ البصیرت کریں۔ اگرچہ یہ کام علمائے کرام کے کرنے کا تھا۔ مگر جب ان کے سرخیل تک "متحدہ قومیت اور اسلام" لکھنے میں مصروف ہوں اور ان میں سے کوئی بھی اپنے اصلی فرض کو انجام دینے کے لیے آگے نہ بڑھے، تو مجبوراً ہم جیسے عامیوں ہی کو یہ خدمت اپنے ذمہ لینی پڑے گی۔

(ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ (فروری ۱۹۳۹ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۴

کیا ہندوستان کی نجات نیشلزم میں ہے؟[1]

جناب مولانا عبید اللہ سندھی ایک طویل مدت کی جلاوطنی کے بعد جب ہندوستان واپس تشریف لائے تو جمعیت علمائے بنگال نے ان کو اپنے کلکتہ کے اجلاس میں خطبہ صدارت ارشاد فرمانے کی دعوت دی، اور اس خطبہ کے ذریعہ سے ہندوستان میں پہلی مرتبہ لوگ ان کے مخصوص نظریات سے رُوشناس ہوئے۔ خصوصیت کے ساتھ ان کے جن فقروں پر مسلمانوں میں عموماً ناراضی پھیلی وہ حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ "اگر میرا وطن اُس انقلاب کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے جو اس وقت دنیا پر چھا گیا ہے اور روز بروز چھاتا جا رہا ہے تو اسے یورپین اصول پر نیشلزم کو ترقی دینا چاہیے۔ پچھلے زمانہ میں ہمارا ملک جس قدر نامور رہا ہے اسے دُنیا جانتی ہے مگر اس سے ہم کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے جب تک ہم آج کی قوموں میں اپنا وقار ثابت نہ کر سکیں۔"

---

[1] یہ مضمون ترجمان القرآن میں ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ موضوع کی مناسبت سے اسے یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔ (مرتب)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۲۷- میں سفارش کرتا ہوں کہ ہمارے اکابر مذہب و وقتی برٹش گورنمنٹ کے دو صد سالہ عہد سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی کوشش کریں۔ جس طرح ہم نے یورپ سے متنفر ہو کر اپنی ترقی کو محدود کر لیا تھا اسے اب خیر باد کہیں اس معاملہ میں میں نے ترکی قوم کے اس انقلاب کا پوری طرح مطالعہ کیا ہے جو سلطان محمود سے شروع ہو کر مصطفیٰ کمال کی جمہوریت پر ختم ہوتا ہے ...... میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے انٹرنیشنل اجتماعات میں ہمارا وطن ایک معزز ممبر بنایا جائے۔ اس کے لیے ہمیں اپنی معاشرت میں انقلاب کی ضرورت محسوس ہوگی۔"

اس معاشرتی انقلاب کی تشریح آگے چل کر مولانا نے اپنے اس انقلابی پروگرام میں کی ہے، جو انہوں نے صوبہ سندھ کے لیے تجویز کیا ہے۔ چنانچہ اس میں فرماتے ہیں :-

"سندھی اپنے وطن کا بنا ہوا کپڑا پہنے گا مگر وہ کوٹ پتلون کی شکل میں ہوگا یا کالر دار قمیض اور نکر کی صورت میں۔ مسلمان اپنا نکر گھٹنے سے نیچے تک استعمال کر سکتے ہیں۔ ہیٹ دونوں صورتوں میں بے تکلف استعمال کیا جائے گا۔ جب مسلمان مسجد میں آئے گا ہیٹ اتار کر ننگے سر نماز پڑھ لیگا۔"

مولانا سندھی ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ عالم دین ہیں۔ انہوں نے جو قربانیاں اپنے اصول اور مشن کی خاطر سالہا سال تک کی ہیں وہ ان کے خلوص کو ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ثابت کرتی ہیں۔ لہذا اگر ان جیسا ایک مخلص اور جہاں دیدہ عالم ہمارے سامنے بعض اجتماعی مسائل پر اپنے کچھ نظریات ـــــ جو ظاہر ہے کہ اس کے طویل تجربات اور برسوں کے غور و فکر پر مبنی ہیں ـــــ پیش کرتا ہے، تو ہمارے لیے مناسب تر بات یہ ہے کہ اپنے ذہن کو شکوہ و شکایت یا شبہات میں الجھانے کے بجائے اس کے نظریات کو علمی حیثیت سے جانچ کر دیکھیں، اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر تنقید کریں۔ ایک ذی علم اور فہیم آدمی جو نیک نیت بھی ہو، اس سے ہم بجا طور پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ جب اس کی غلطی اس پر واضح ہو جائے گی تو وہ اس سے رجوع کرلے گا۔ اور بالفرض اگر وہ اپنی غلطی کا معترف نہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی ہو، تب بھی اس کے غلط نظریے کو ذہن میں جڑ پکڑنے سے صرف سنجیدہ علمی تنقید ہی روک سکتی ہے۔ شکوہ و شکایت اور طنز و تعریض سے اس کا سدِ باب نہیں کیا جا سکتا۔

نیشنلزم بر بنائے مصلحت

یورپین اصول پر نیشنلزم کو ترقی دینے کا مشورہ مولانا نے جن وجوہ و دلائل کی بنا پر دیا ہے وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہیں:

۱۔ "اگر میرا وطن اس انقلاب کے نقصان سے بچنا چاہتا ہے جو اس وقت دنیا پر چھا گیا ہے اور چھاتا چلا جا رہا ہے تو ....؟ اسے ایسا کرنا چاہیے۔

۲۔ پچھلے زمانہ میں ہمارا ملک جس قدر نامور رہا ہے اسے دنیا جانتی ہے مگر اس سے ہم کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے جب تک ہم آج کی قوموں میں اپنا وقار ثابت نہ کر سکیں......

اور وقار اسی طرح قائم ہو سکتا ہے جس طرح آج کل کی مغربی اقوام نے قائم کیا ہے۔

۳۔ ہماری ہندوستانی تہذیب کا عہد قدیم جو ہندو تہذیب کہلاتا ہے اور عہد جدید جسے اسلامی تہذیب سمجھا جاتا ہے، دونوں مذہبی اسکول ہیں۔ لیکن آج کل کا یورپین اسکول مذہب سے قطعی نابلد ہے۔ اس کا مدار صرف سائنس اور فلسفہ پر ہے۔ اس لیے ہمارے وطن میں اگر اس انقلاب کو سمجھنے (۹) کی استعداد پیدا نہ ہوئی تو سر بسر نقصان ہمارے حصہ میں آئیگا..."

سمجھنے سے مراد غالباً صرف سمجھنا نہیں بلکہ سمجھ کر اختیار کر لینا بھی ہے۔ کیونکہ مولانا کے سابق مقدمات اسی نتیجہ کی طرف لے جاتے ہیں۔

ان تینوں وجوہ پر غور کیجیے۔ ایک چیز کو اختیار کرنے کا مشورہ اس بنا پر نہیں دیا جا رہا ہے کہ وہ حق اور صداقت ہے یا اخلاقاً بجا اور درست ہے، بلکہ محض مصلحت اور ضرورت (Expediency) کی بنا پر دیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد ایک مسلمان کی نگاہ میں، بلکہ کسی با اصول شخص کی نگاہ میں بھی مولانا کے مشورے کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟ کسی مسلک کو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کسی اصول کو اس دلیل سے قبول کرنا کہ فلاں نقصان سے بچنا ہے، اور فلاں فائدہ حاصل کرنا ہے، اور فلاں چیز اب دنیا میں نہیں چل رہی ہے بلکہ اس کی جگہ یہ چیز چل پڑی ہے، کسی ایسے شخص کا کام نہیں ہو سکتا جو خود اپنا کوئی اخلاقی اور عقلی نظریہ رکھتا ہو اور اپنے ضمیر کے تقاضے سے اپنے آپ کو اس کے پھیلانے اور قائم کرنے پر مامور سمجھتا ہو۔ یہ تو زری مصلحت پرستی اور ابن الوقتی (Opportunism) ہے۔ اس کو عقلیت اور اخلاقیت سے کیا واسطہ؟ عقلیت اور اخلاقیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ تحقیق سے جس اصول کو ہم نے حق پایا ہے اور اخلاقاً جس کے برحق ہونے کا ہم یقین رکھتے ہیں اس پر پختگی کے ساتھ قائم رہیں۔ اگر دنیا میں اس کے خلاف کوئی غلط اصول چل پڑا ہے تو ہمارا کام دنیا کے پیچھے دوڑنا نہیں ہے بلکہ دنیا کو کھینچ کر اپنے اصول کی طرف لانا ہے۔ اپنے اعتقاد میں ہماری راستی کا امتحان اسی میں ہے کہ دنیا کے پیچھے نہ چلنے سے جو نقصان ہمیں پہنچتا ہو اسے صبر و ثبات کے ساتھ برداشت کریں۔ اگر دنیا ہماری وقعت اس لیے نہیں کرتی کہ ہم اس کے پیچھے نہیں چلتے تو ایسی دنیا کو ہمیں ٹھوکر مارنی چاہیے۔ دنیا ہمارا معبود نہیں ہے کہ اس کی خوشامد کرتے ہوئے ہم ہر اس راستے پر دوڑتے پھریں جس پر اس کی جھلک نظر آئے۔ اگر اس چیز کا زمانہ گزر گیا ہے جو ہمارے اعتقاد میں حق ہے تو ہم میں اتنا بل بوتا ہونا چاہیے کہ زمانہ کا کان پکڑ کر اسے پھر سے حق کی طرف کھینچ لائیں۔ یہ سوچنا پست ہمت، شکست خوردہ لوگوں کا کام ہے کہ اب زمانہ میں فلاں چیز کا چلن ہے تو چلو، اس کو سمجھیں اور بے سمجھے حلق سے نیچے ہی اتار لیں۔

اس باب میں مسلمان کو اتنی استقامت تو دکھانی چاہیے جتنی مارکس کے پیروؤں نے جنگِ عظیم کے موقع پر دکھائی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں جب جنگ چھڑی تھی تو سیکنڈ انٹرنیشنل کے ارکان میں اسی نیشنلزم کے سوال پر زبردست اختلاف برپا ہوا تھا۔ بہت سے وہ سوشلسٹ جو اشتراکیوں کے بین الاقوامی محاذ پر مجتمع تھے، اپنی اپنی قوموں کو میدانِ جنگ میں کودتے دیکھ کر قوم پرستی کے جذبہ سے مغلوب ہو گئے اور انہوں نے جنگ میں اپنی قوم کا ساتھ دینا چاہا۔ مگر مارکس کے پیروؤں نے کہا کہ ہم ایک ایسے اصول کے لیے جنگ کرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُٹھے ہیں جس کے لحاظ سے تمام قوموں کے سرمایہ دار ہمارے دشمن اور تمام قوموں کے مزدور ہمارے دوست ہیں۔ پھر ہم کس طرح اس نیشنلزم کو قبول کر سکتے ہیں جو مزدوروں کو تقسیم کرتا ہے اور انہیں سرمایہ دار کے ساتھ ملا کر ایک دوسرے کے مقابلہ میں لڑاتا ہے۔ اس بنا پر مارکسیوں نے اپنے سالہا سال کے پرانے رفیقوں سے تعلقات منقطع کر لیے۔ انہوں نے سیکنڈ انٹرنیشنل کا ٹوٹ جانا گوارا کر لیا مگر اپنے اصول سے دستبردار ہونا گوارا نہ کیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو سچے کمیونسٹ تھے انہوں نے عملاً خود اپنے ہاتھوں سے قوم پرستی کے بُت کو توڑا۔ جرمن کمیونسٹ نے اپنے اصول کی خاطر جرمنی کے خلاف اور روسی کمیونسٹ نے اپنے اعتقاد کی خاطر روس کے خلاف اور اسی طرح ہر ملک کے کمیونسٹ نے اپنے مسلک کی خاطر اپنے ملک کی حکومت کے خلاف کام کیا۔

جس طرح کمیونسٹ اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے، اسی طرح مسلمان بھی اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے۔ پھر وہ کیوں اتنا ادنیٰ اور پست ہو جائے کہ کسی نقصان سے بچنے یا کسی کی نگاہ میں وقار قائم کرنے کے لیے اپنے مقام سے ہٹ جائے؟ اور اگر وہ اپنے مقام سے ہٹتا ہے تو اس میں کم از کم اس بات کا شعور تو ہونا چاہیے کہ وہ کس چیز سے ہٹ رہا ہے اور کس چیز کی طرف جا رہا ہے۔ کیونکہ اپنی جگہ چھوڑنا تو محض کمزوری ہے۔ مگر ایک جگہ سے ہٹ جانے کے باوجود اپنے آپ کو اسی جگہ سمجھنا کمزوری کے ساتھ بے شعوری بھی ہے۔ میں تو مسلمان صرف اُس وقت ہوں جب تک میں زندگی کے ہر معاملہ میں اسلامی نظریہ رکھتا ہوں۔ جب میں اس نظریہ سے ہٹ گیا اور کسی دوسرے نظریہ کی طرف چلا گیا تو میری جانب سے یہ سراسر بے شعوری ہوگی اگر میں یہی سمجھتا رہوں کہ اس نئے مقام پر بھی مسلمان ہونے کی حیثیت میرے ساتھ لگی چلی آئی ہے۔ مسلمان ہوتے ہوئے غیر اسلامی نظریہ اختیار کرنا صریح بے معنی بات ہے۔ "مسلمان نیشنلسٹ" اور "مسلمان کمیونسٹ" ایسی ہی متناقض اصطلاحیں ہیں جیسے "کمیونسٹ فاشسٹ" یا "جینی قصائی" یا "اشتراکی مہاجن" یا "موحّد بُت پرست"۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیشنلزم اور اسلام

سرسری نظر میں جو شخص نیشنلزم کے معنی اور اس کی حقیقت پر غور کرے گا اس سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ اسلام اور نیشنلزم، دونوں اسپرٹ اور اپنے مقصد کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اسلام کا خطاب انسان من حیث الانسان سے ہے۔ وہ سارے انسانوں کے لیے ایک اعتقادی و اخلاقی بنیاد پر عدل اور تقویٰ کا ایک اجتماعی نظام پیش کرتا ہے اور سب کو اس کی طرف بلاتا ہے۔ پھر جو اس نظام کو قبول کرلے اسے مساویانہ حقوق کے ساتھ اپنے دائرہ میں لے لیتا ہے۔ اس کی عبادات میں، اس کی معیشت میں، اس کی سیاست میں، اس کی معاشرت میں، اس کے قانونی حقوق اور فرائض میں، غرض اس کی کسی چیز میں بھی ان لوگوں کے درمیان کسی قسم کی قومی یا نسلی یا جغرافی یا طبقاتی تفریقات کی گنجائش نہیں ہے جو اسلام کے مسلک کی پیروی اختیار کرلیں۔ اس کا منتہائے نظر ایک ایسا جہانی معاشرہ اور ریاست (World State) ہے جس میں نسلی اور قومی تعصبات کی زنجیریں توڑ کر تمام انسانوں کو مساوی حقوق اور مساوی مواقع ترقی کے ساتھ ایک تمدنی و سیاسی نظام میں حصہ دار بنایا جائے اور مخاصمانہ مقابلہ کی جگہ دوستانہ تعاون پیدا کیا جائے تاکہ لوگ ایک دوسرے کی مادی خوشحالی اور روحانی ترقی میں مددگار ہوں۔ اسلام انسانی فلاح کے لیے جو اصول اور نظامِ حیات پیش کرتا ہے وہ عام انسانوں کو اپیل ہی اُس وقت کر سکے گا جب کہ ان کے اندر جاہلیت کے تعصبات نہ ہوں، اور وہ اپنی قومی روایات کی وابستگی سے، نسلی تفاخر کے جذبات سے، خونی اور خاکی رشتوں کی محبت سے پاک ہو کر محض انسان ہونے کی حیثیت سے یہ جانچنے کے لیے تیار ہوں کہ حق کیا ہے، عدل و انصاف اور راستی کس چیز میں ہے، ایک طبقہ یا ایک قوم یا ایک ملک کی نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے انسانیت کی فلاح کا راستہ کون سا ہے۔

برعکس اس کے نیشنلزم انسان اور انسان کے درمیان اس کی قومیت کے لحاظ سے تمیز کرتا ہے۔ نیشنلزم کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہر قوم کا نیشنلسٹ اپنی قومیت کو دوسری تمام قومیتوں پر ترجیح دے۔ اگر وہ جفاکار قوم پرست (Aggressive Nationalist)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہ بھی ہو تب بھی قوم پرستی کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ تمدنی، سیاسی اور قانونی حیثیت سے "قومی" اور غیر قومی میں فرق کرے، اپنی قوم والوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد محفوظ کرے، قومی مفاد کے لیے معاشی امتیازات کی دیواریں کھڑی کرے، جن تاریخی روایات اور روایتی تعصبات پر اس کی قومیت قائم ہے ان کی سختی کے ساتھ حفاظت کرے اور اپنے اندر قومی تفاخر کے جذبات پرورش کرے۔ وہ دوسری قومیت کے لوگوں کو مساوات کے اصول پر زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اپنے ساتھ شریک نہ کرے گا۔ جہاں اس کی قوم دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ فوائد و منافع سے متمتع ہو رہی ہو یا ہو سکتی ہو وہاں عدل و انصاف کے لیے اس کا دل اندھا ہو جائے گا۔ اس کا منتہائے نظر جہانی ریاست کے بجائے قومی ریاست (National State) ہو گا۔ اور اگر وہ کوئی جہانی نظریہ اختیار کرے گا بھی تو اس کی صورت لازماً امپیریلزم یا قیصریت کی صورت ہو گی، کیونکہ اس کے اسٹیٹ میں دوسری قومیتوں کے لوگ کسی طرح برابر کے حصہ دار کی حیثیت سے داخل نہیں ہو سکتے، بلکہ صرف غلام کی حیثیت ہی سے داخل ہو سکتے ہیں۔

ان دونوں مسلکوں کے اصول، مقاصد اور روح کا یہ محض ایک سرسری سا خاکہ ہے جس کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں مسلک ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جہاں نیشنلزم ہے وہاں اسلام کبھی پھل پھول نہیں سکتا، اور جہاں اسلام ہے وہاں نیشنلزم کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ نیشنلزم کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے لیے پھیلنے کا راستہ بند ہو جائے، اور اسلام کی ترقی کے معنی یہ ہیں کہ نیشنلزم جڑ بنیاد سے اکھاڑ دیا جائے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ایک شخص ایک وقت میں ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کی ترقی کا حامی ہو سکتا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ بیک وقت دونوں کشتیوں پر سوار رہ سکے۔ ایک مسلک کی پیروی کا دعویٰ کرنا اور پھر ساتھ ہی اس کے بالکل مخالف مسلک کی حمایت و وکالت کرنا صاف طور پر نظر کے انحراف اور ذہن کی پراگندگی کا پتہ دیتا ہے، اور جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں ان کے متعلق مجبوراً ہمیں یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ وہ یا تو اسلام کو نہیں سمجھتے یا نیشنلزم کے بنیادی پہلوؤں سے ناواقف ہیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یورپین نیشنلزم کی حقیقت

یہ تو وہ بات تھی جو نیشنلزم کے بالکل ابتدائی مفہوم پر غور کرنے سے نکلتی ہے۔ اب ہمیں ذرا آگے بڑھ کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ "یورپین نیشنلزم" کیا چیز ہے جس کے اصول پر مولانا سندھی ہندوستان میں نیشنلزم کی ترقی چاہتے ہیں۔

قدیم جاہلیت میں قومیت کا تصور اچھی طرح پختگی کو نہیں پہنچا تھا۔ قوم کی جگہ انسان کے جذبات زیادہ تر نسل یا قبیلہ کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے۔ اس لیے اُس زمانہ میں قوم پرستی کے بجائے نسل پرستی کا زور تھا، اور اس نسلی عصبیت میں بڑے بڑے عالی دماغ فلسفی اور حکیم تک اندھے ہو جاتے تھے۔ ارسطو جیسا بلند پایہ مفکر اپنی کتاب "السیاست" میں یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ "فطرت نے وحشی قوموں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ غلام بن کر رہیں۔"[1] اس کے نزدیک دولت حاصل کرنے کے فطری اور جائز ذرائع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "نوعِ انسانی کے ایسے طبقات کو غلام بنانے کے لیے جنگ کی جائے جنہیں فطرت نے اسی غرض کے لیے پیدا کیا ہے"[2]۔ یہ نظریہ اور زیادہ بھیانک ہو جاتا ہے جب ہم اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ یونانیوں کے نزدیک وحشی (Barbarians) کے معنی محض "غیر یونانی" کے تھے اور ان کا بنیادی تصور یہ تھا کہ یونانی لوگوں کے اخلاق اور حقوق دوسرے انسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔

یہ اُسی نیشنلزم کا ابتدائی جرثومہ تھا جس نے بعد کو یورپ میں ترقی کی۔ مگر اس جرثومہ کے نشوونما کو جو طاقت ایک مدت تک روکے رہی وہ مسیحیت کی طاقت تھی۔ ایک نبی کی تعلیم اگرچہ کیسی ہی بگڑی ہوئی صورت میں موجود ہو، بہرحال نسل پرستی اور قوم پرستی کی جگہ ایک وسیع انسانی نقطۂ نظر ہی لیے ہوئے ہو سکتی تھی۔ اس کے ساتھ رومن ایمپائر (Roman Empire) کے عالمگیر سیاسی نظام نے بھی کم از کم اتنا کام کیا کہ بہت سی چھوٹی

---

[1] کتاب اوّل - باب دوم و ششم

[2] کتاب اوّل - باب ہشتم۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قوموں کو ایک مشترک اقتدار کا مطیع و فرمانبردار بنا کر قومی اور نسلی تعصبات کی شدت کو کم کر دیا۔ اس طرح صدیوں تک پوپ کا روحانی اور شہنشاہ کا سیاسی اقتدار، دونوں مل جل کر عالمِ مسیحی کو ایک رشتے میں باندھے رہے۔ مگر بعد میں [illegible] ظلم و ستم میں اور علمی و عقلی ترقی کی مخالفت میں ایک دوسرے کی مددگار رہیں، اور دنیوی اقتدار اور مادی فوائد کی تقسیم میں باہم حریف و معاند رہیں۔ ایک طرف ان کی آپس کی کشمکش نے، دوسری طرف ان کی بداعمالیوں اور ظلم و ستم نے اور تیسری طرف جدید علمی بیداری نے سولھویں صدی میں وہ سیاسی اور مذہبی تحریک پیدا کی جسے تحریک اصلاح (Reformation) کہتے ہیں۔

اس تحریک کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ پوپ اور شہنشاہ کے اس اقتدار کا خاتمہ ہو گیا جو ترقی اور اصلاح کا دشمن تھا۔ لیکن اس سے یہ نقصان بھی ہوا کہ جو قومیں ایک رشتہ میں بندھی ہوئی تھیں وہ بکھر گئیں۔ ریفارمیشن اس روحانی رابطہ کا بدل فراہم نہ کر سکا جو مختلف مسیحی اقوام کے درمیان قائم تھا۔ مذہبی اور سیاسی وحدت کا تعلق ٹوٹنے کے بعد جب قومیں ایک دوسرے سے الگ ہوئیں تو ان کی جدا جدا خود مختار قومی ریاستیں وجود میں آنے لگیں۔ ہر قوم کی زبان اور لٹریچر نے الگ الگ ترقی کرنی شروع کی۔ اور ہر قوم کے معاشی مفاد دوسری ہمسایہ قوموں سے مختلف ہوتے گئے۔ اس طرح نسلی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی بنیادوں پر قومیت کا ایک نیا تصور پیدا ہوا جس نے نسلی عصبیت کے قدیم جاہلی تصور کی جگہ لے لی۔ پھر مختلف قوموں [illegible] جنگ اور مسابقت (Competition) کا سلسلہ شروع ہوا، بڑی لڑائیاں ہوئیں۔ ایک قوم نے دوسری قوموں کے حقوق پر ڈاکے ڈالے۔ ظلم اور شقاوت کے بدترین مظاہرے کیے گئے جن کی وجہ سے قومیت کے جذبات میں روز بروز تلخی پیدا ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ قومیت کا احساس رفتہ رفتہ ترقی کر کے قوم پرستی (نیشنلزم) میں تبدیل ہو گیا۔

یہ قوم پرستی جس کا نشوونما اس طور پر یورپ میں ہوا ہے، چونکہ ہمسایہ قوموں کے ساتھ مسابقت اور تصادم سے پیدا ہوئی ہے، اس لیے اس میں لازماً چار عناصر پائے جاتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

(۱) قومی افتخار کا جذبہ جو اپنی قومی روایات اور خصوصیات کی محبت کو پرستش کی حد تک بڑھا لے جاتا ہے، اور تمام قوموں کے مقابلہ میں اپنی قوم کو ہر لحاظ سے بالا و برتر قرار دیتا ہے اور ہر طرح کے اصلی اور جعلی مفاخر اپنی قوم کے لیے مخصوص کرتا ہے؎

(۲) قومی عصبیت کا جذبہ جو حق اور انصاف کے سوال کو نظر انداز کر کے آدمی کو ہر حال میں اپنی قوم کا ساتھ دینے پر آمادہ کرتا ہے خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر۔

(۳) قومی تحفظ کا جذبہ جو قوم کے واقعی اور خیالی مفادات کی حفاظت کے لیے ہر قوم کو ایسی تدابیر اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو مدافعت سے شروع ہو کر حملہ پر ختم ہوتی ہیں۔ مثلاً معاشی مفاد کی حفاظت کے لیے محصولات درآمد و برآمد کو گھٹانا بڑھانا، غیر قوموں کی مہاجرت پر پابندیاں عائد کرنا، اپنے حدود میں دوسروں کے لیے کسبِ معاش اور شہری حقوق کے دروازے بند کرنا، منافعِ ملکی کے لیے دوسروں سے بڑھ چڑھ کر فوجی طاقت فراہم کرنا، اور دوسروں کے ملک میں اپنی قوم والوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے دوڑ جانا۔

(۴) استیلاء و استکبار (National Aggrendisment) کا جذبہ جو ہر ترقی یافتہ اور طاقت ور قوم کے اندر یہ داعیہ پیدا کرتا ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں پر غالب اور برتر ہو، دوسروں کے خرچ پر اپنی خوش حالی بڑھائے، اپنے آپ کو پسماندہ قوموں میں تہذیب پھیلانے کی خدمت پر خود بخود مامور سمجھے اور دوسرے ممالک کی قدرتی دولت سے استفادہ کرنے کو اپنا پیدائشی حق قرار دے۔

یہی ہے وہ یورپ کا نیشنلزم جس کے نشہ میں سرشار ہو کر کوئی پکارتا ہے "جرمنی سب سے اوپر" کوئی نعرہ بلند کرتا ہے "امریکہ خدا کا اپنا ملک ہے" کوئی اعلان کرتا ہے "اٹلی ہی مذہب ہے" کسی کی زبان سے دنیا کو یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ "حکومت

؎ اس کی ایک دلچسپ مثال ہم کو مصطفےٰ کمال کے دور کے ٹرکی میں ملتی ہے۔ وہاں ابتدائی تعلیم کے نصاب میں بچوں کو یہ سکھایا جانے لگا کہ حضرت آدم ترک تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنا برطانیہ کا حق ہے۔" اور ہر قوم پرست اسی مذہبی عقیدے پر ایمان رکھتا ہے کہ میرا ملک بالخواہ حق پر ہو یا ناحق پر۔ یہ قوم پرستی کا اخلاق آج دنیا میں انسانیت کے لیے سب سے بڑی لعنت ہے۔ انسانی تہذیب کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ یہ انسان کو اپنی قوم کے سوا ہر دوسری قوم کے لیے درندہ بنا دیتا ہے۔

اس نیشنلزم کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ کوئی اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے اور اس کو آزاد، خوش حال اور برسر ترقی دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ ایک شریف جذبہ ہوتا۔ لیکن درحقیقت محبت سے زیادہ عداوت، نفرت اور انتقام کے جذبات اس کو جنم دیتے اور پرورش کرتے ہیں۔ اس کا مادۂ حیات دراصل وہ آگ ہے جو قومیت کے مجروح جذبات اور کچلے ہوئے قومی حوصلوں سے دل میں بھڑک اٹھتی ہے۔ اور یہ آگ بہ حیثیت جاہلیہ، قومی محبت کے شریفانہ جذبہ کو بھی حد سے بڑھا کر ایک ناپاک چیز بنا دیتی ہے۔ بظاہر اس کا آغاز ان بے انصافیوں کی تلافی کرنے کی غرض سے ہوتا ہے جو کسی قوم کے ساتھ کسی دوسری قوم یا قوموں نے، واقعی یا خیالی طور پر کی ہوں۔ لیکن چونکہ کوئی اخلاقی ہدایت، کوئی روحانی تعلیم، کوئی الٰہی شریعت اس کی رہنمائی کرنے والی اور اس کو ضابطہ میں رکھنے والی نہیں ہوتی اس لیے یہ اپنی حد سے گزر کر قیصریت (Imperialism)، معاشی قوم پرستی (Economic Nationalism)، نسلی منافرت، جنگ اور بین الاقوامی بدامنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ زمانۂ حال کا ایک مصنف فرانسس کوکر (Francis, W. Coker) لکھتا ہے:۔

> "بعض قوم پرست اہل قلم دعویٰ کرتے ہیں کہ آزادانہ زندگی بسر کرنے کا حق دنیا کی صرف ترقی یافتہ قوموں کو ہے ــــــ اُن قوموں کو جو ایسا اعلیٰ درجہ کا تہذیبی اور روحانی سرمایہ رکھتی ہیں جو اس کا مستحق ہے کہ دنیا میں باقی رکھا جائے اور پھیلایا جائے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کی تہذیب قوم کا حق اور فریضہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اپنی آزادی کی حفاظت کرے اور اپنے اندرونی معاملات کو دوسروں کی مداخلت کے بغیر سرانجام دے،

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بلکہ اس کا حق اور فرض یہ بھی ہے کہ اپنے دائرۂ اثر کو اُن قوموں پر پھیلائے جو نسبتاً پس ماندہ ہیں، خواہ اس کے لیے قوت ہی کیوں نہ استعمال کرنی پڑے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک اونچے درجے کی قوم اپنا ایک عالمگیر منصب رکھتی ہے، اسے اپنی قابلیتوں کو صرف اپنی ہی سرزمین میں مدفون کر دینے یا خود غرضی کے ساتھ صرف اپنی ہی ترقی کے لیے استعمال کرنے کا حق نہیں ہے ____

یہی نظریہ اور یہی استدلال تھا جسے عموماً انیسویں صدی کے آخری دَور میں ملک گیری کی تائید کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسی حجت کو پیش کر کے افریقہ اور بحرالکاہل کی "نیم مہذب" قوموں کو یورپ اور امریکہ کی سلطنتوں کا تابع فرمان بنایا گیا تھا ......"

آگے چل کر وہ لکھتا ہے:

"یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک بڑی قوم صرف یہی حق نہیں رکھتی کہ براہ راست جو حملہ اس پر کیا جائے اس کی مدافعت کرے، بلکہ یہ بھی اس کا حق ہے کہ ہر اس چیز کی مزاحمت کرے جس سے اس کے ایسے مفاد پر زد پڑتی ہو جو اس کی خود مختارانہ زندگی اور خوشحالی کے لیے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کی زندگی کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ بس اپنی سرحدوں کی حفاظت کرے، اور اپنے مادی وسائل پر خود قابو یافتہ رہے، اور اپنی عزت کو پامال نہ ہونے دے۔ نہیں، اگر اسے زندہ رہنا ہے تو اس سے زیادہ بھی کچھ کرنا پڑے گا۔ اس کو بڑھنا چاہیے، پھیلنا چاہیے، اپنی فوجی طاقت بڑھانی چاہیے، اپنا قومی دبدبہ قائم کرنا چاہیے، ورنہ وہ رفتہ رفتہ گھٹتی چلی جائے گی اور بالآخر قوموں کی مسابقت میں اس کا وجود ختم ہو کر رہ جائے گا۔ جو قومیں اپنے مفاد کی حفاظت کرنے اور اپنے سیاسی و معاشی نفوذ و اثر کا دائرہ بڑھانے میں زیادہ کامیاب ہوتی ہیں وہی زندہ رہنے کی زیادہ حق دار ہیں۔ جنگ قومی ترقی کا فطری ذریعہ ہے، اور جنگ میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فتح یاب ہونا قوم کے اصلح (Fittest) ہونے کی دلیل ہے۔ ڈاکٹر ریچ ہاٹ کے بقول وہ جنگ ہی ہے جو قوموں کو بناتی ہے؟

اس کے بعد وہ لکھتا ہے:۔

"ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو بھی ان خیالات کی تائید میں غلط طور پر استعمال کیا گیا ہے) ارنسٹ ہیکل (Ernest Haeckel) جو جرمنی میں ڈارونیت کا پہلا اور سب سے زیادہ بااثر پیغمبر گزرا ہے، اور جس نے اپنے علم الحیات کے (Biological) نظریات کو نہایت ہوشیاری کے ساتھ فلسفہ اور اجتماعیات (Socialogy) میں استعمال کیا ہے، خود غرضی و خود پرستی کو عالمگیر قانونِ حیات قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ قانون انسانی سوسائٹی کے اندر ایک طرح کی نسلی مردم خوری کی صورت میں جاری ہوتا ہے۔ اس کی رائے میں زمین اُن تمام نسلی گروہوں کے لیے کافی سامانِ زندگی نہیں رکھتی جو اس کی آغوش میں جنم لیتے ہیں۔ لہذا کمزور گروہ فنا ہو جاتے ہیں، نہ صرف اس وجہ سے کہ زمین کے محدود وسائلِ زندگی سے فائدہ اُٹھانے کے لیے جو عام تنازع برپا ہوتا ہے اس میں وہ دوسرے گروہوں کا کامیاب مقابلہ نہیں کر سکتے، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ زیادہ طاقت ور گروہوں کے فاتحانہ اقدامات کی مدافعت کا کس بل ان میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح کارل پیرسن (Karl Pearson) بین الاقوامی کش مکش کو نوعِ انسانی کی فطری تاریخ کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ زندگی کے علمی تصور (Scientific View of Life) کی رُو سے انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء دراصل اُس نزاع و جدال کی وجہ سے ہوتا ہے جو صرف افراد ہی کے درمیان نہیں بلکہ قوموں کے درمیان بھی دائماً برپا رہتی ہے۔ جب ایک اعلیٰ درجہ کی قوم اپنی کمزور نسلوں کو مٹانے اور صرف طاقتور نسلیں پیدا کرنے کا انتظام کر کے اندرونی

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حیثیت سے اپنی صلاحیت بڑھا لیتی ہے، تب وہ دوسری قوموں سے مقابلہ کرکے بیرونی حیثیت سے اپنی صلاحیت (Fitness) کو ترقی دینا شروع کرتی ہے۔ اس نزاع میں کمزور (غیر صالح) قومیں ... (صالح) قومیں باقی رہتی ہیں۔ اور اس طرح مجموعی حیثیت سے پوری نوعِ انسانی کا قدم ترقی کی طرف بڑھتا ہے۔ ایک قوم دوسری عالی مقام قوموں کے ساتھ اپنی برابری کا ثبوت اسی طرح دے سکتی ہے کہ وہ ان سے تجارتی راستوں اور خام پیداوار کے وسائل اور سامان غذا کے ذخائر کے لیے پیہم مجاہدہ کرتی ہے۔ فروتر درجہ کی قومیں (کمزور قوموں) سے واسطہ پڑنے کی صورت میں اگر وہ ان کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کرتی اور ان سے گھلتی ملتی ہے تو گویا خود ہی اپنے دعوائے بالاتری سے دست بردار ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ انہیں زمین سے نکال کر خود قبضہ کر لیتی ہے، یا انہیں زمین میں باقی رکھ کر اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتی ہے تو اپنی بالاتری ثابت و قائم کر دیتی ہے۔"[1]

ایک دوسرا مصنف جوزف لیٹن (Joseph Lighten) لکھتا ہے:۔

"پندرھویں صدی سے دنیا کی تاریخ زیادہ تر قومی ریاستوں کے درمیان معاشی رقابتوں کی داستان ہے۔ معاشی قوم پرستی روز بروز قوموں کے درمیان تصادم کا سبب بنتی چلی گئی ہے۔ پہلے تجارت کے میدان میں مزاحمت کا سلسلہ چلتا ہے، پھر جنگ ہوتی ہے۔ امریکہ، افریقہ، سات سمندروں کے جزائر، اور ایشیا کے ایک بڑے حصے پر تسلط، نوآبادیوں کا قیام اور ان ممالک کے معاشی وسائل سے استفادہ (Exploitation)، یہ سب کچھ اسی داستانِ قوم پرستی کے مختلف ابواب ہیں۔ اگرچہ یہی سب نورا

[1] *Recent Political thought, Newyork-1943, P. 433-48*

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھوٹے پیمانہ پر اس وقت بھی ہوا تھا جب زوالِ روما کے بعد وحشی قومیں تاخت و تاراج کرتی ہوئی پھیل گئی تھیں۔ مگر فرق یہ ہے کہ ازمنِ ایبار کے باقیات سے تو مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی پہلوؤں پر ایک بین الاقوامی نظام تعمیر ہو گیا تھا، لیکن دنیائے جدید میں یہ نہ ہو سکا تھا۔

"جب ایک ایسی قوم جو تہذیبی وحدت رکھتی ہو، سیاسی حیثیت سے خود مختار، اور معاشی حیثیت سے متحد الاغراض ہوتی ہے، اور اس میں تہذیبی و سیاسی اور معاشی قومیت میں اپنی عظمت اور برتری کے احساسات اُبھر آتے ہیں، تب معاشی قوم پرستی اپنی شدید ترصورت میں رُونما ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ کیونکہ دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان مسابقت و مزاحمت کا جو سسٹم اس وقت قائم ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی قوم پرستی ہے۔ اور یہ قوم پرستی بہت جلدی معاشی امپیریلزم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ قومیں تجارتی فوائد کے لیے ایک دوسرے کے خلاف جدّوجہد کرتی ہیں اور بیرونی ممالک کی منڈیوں اور پس ماندہ ممالک کی معاشی دولت پر قبضہ کرنے کے لیے ان کے درمیان کش مکش ہوتی ہے......"

"سیاسی اور معاشی نیشنلزم کی گتھی (جس کو سُلجھانے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی) یہ ہے کہ ایک طرف قومی ریاست کا وجود ایک قوم کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے، اور اس کی محض معاشی خوشحالی ہی نہیں بلکہ اس کی تہذیبی ترقی، اس کی تعلیم، اس کے سائنس، اس کے فنون، غرض اس کی ہر چیز کے نشوونما کا انحصار قومی ریاست کے پھلنے پھولنے ہی پر ہے۔ لیکن دوسری طرف موجودہ مسابقت کے ماحول میں خودبخود معاشی نیشنلزم پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر قوم دوسری قوموں کے نقصان پر پھلنے پھولنے کی کوشش

ل Social Philosophies in Conflict New York, 1937, P. 439

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرتی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوموں کے درمیان رقابت، شبہات، خوف، اور نفرت کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔ معیشت کے میدان میں بین الاقوامی مسابقت سے لے کر جنگ کے میدان میں فوجی تصادم تک سیدھا راستہ جاتا ہے۔ اور یہ بہت قریب کا راستہ ہے[1]۔

مغربی نیشنلزم اور خدائی تعلیم کا بنیادی اختلاف

میں نے مغربی نیشنلزم اور اس کے انداز فکر اور طریق کار کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے خود اہل مغرب کے الفاظ میں نقل کرنا زیادہ پسند کیا ہے تاکہ اس کی پوری تصویر خود گھر والوں کے موقلم سے کھنچی ہوئی آپ کے سامنے آجائے۔ اُوپر کے اقتباسات اس امر کی بیّن شہادت پیش کرتے ہیں کہ یورپ میں جن تخیلات اور جن اصولوں پر نیشنلزم کا نشوونما ہوا ہے وہ انسانیت کی عین ضد ہیں۔ انہوں نے انسان کو حیوانیت بلکہ درندگی کے مقام تک گرا دیا ہے۔ وہ خدا کی زمین کو فساد، ظلم، اور خونریزی سے بھرنے والے اور انسانی تہذیب کے پُرامن نشوونما ارتقاء کو روکنے والے اصول ہیں۔ ابتدا سے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر دنیا میں جن پاک مقاصد کے لیے سعی کرتے رہے ہیں، یہ اصول ان سب پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ الٰہی شریعتیں جن اغراض کے لیے دنیا میں آئی ہیں، اور آسمانی کتابیں جن اخلاقی و روحانی تعلیمات کو لے کر نازل ہوئی ہیں، یہ شیطانی اصول ان کے مدِمقابل، ان کے مزاحم، اور معاند واقع ہوئے ہیں۔ یہ انسان کو تنگ دل، تنگ نظر[2] اور متعصب بناتے ہیں۔ یہ قوموں اور نسلوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا کر حق اور انصاف اور انسانیت کی طرف سے اندھا کر دیتے ہیں۔ یہ مادی طاقت اور حیوانی زور کو اخلاق حق کا قائم مقام قرار دے کر شرائع الٰہیہ کی عین بنیاد پر ضرب لگاتے ہیں۔

---

[1] حوالۂ مذکور صفحہ ۴-۵۔

[2] قوم پرستانہ تنگ نظری کی انتہا یہ ہے کہ جاپان میں ہندوستان کے آم کا داخلہ بند ہے۔ گویا ایک نعمت جو اللہ نے زمین پر پیدا کی ہے، ایک قوم کے لوگ اپنے اوپر اس کو صرف اس لیے حرام کر لیتے ہیں کہ وہ دوسری قوم کے ملک میں کیوں پیدا ہوئی۔

الٰہی شریعتوں کا مقصد ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ انسانوں کے درمیان اخلاقی و روحانی رشتے قائم کر کے انہیں وسیع پیمانے پر ایک دوسرے کا معاون بنایا جائے۔ مگر نیشنلزم نسلی اور وطنی امتیاز کی قینچی سے کر ان رشتوں کو کاٹ دیتا ہے اور قومی منافرت پیدا کر کے انسانوں کو ایک دوسرے کا معاون بنانے کے بجائے مزاحم اور دشمن بنا دیتا ہے۔

الٰہی شریعتیں چاہتی ہیں کہ انسان اور انسان کے درمیان آزادانہ ربط کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں کیونکہ انہی پر انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کا انحصار ہے۔ مگر نیشنلزم اس ترقی کی راہ میں ہر قسم کی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، حتیٰ کہ ایک قوم کے حلقۂ اثر میں دوسری قوم والوں کے لیے سانس لینا تک مشکل کر دیتا ہے۔

الٰہی شریعتوں کا منشا یہ ہے کہ ہر فرد، ہر قوم اور ہر نسل کو اپنی طبعی خصوصیات اور پیدائشی قابلیتوں کے نشوونما کا پورا موقع ملے تاکہ وہ مجموعی حیثیت سے انسانیت کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ مگر نیشنلزم ہر قوم اور ہر نسل میں یہ داعیہ پیدا کرتا ہے کہ وہ طاقت حاصل کر کے دوسری قوموں اور نسلوں کو ادنیٰ اور ذلیل اور بے قدر و قیمت قرار دے، اور انہیں غلام بنا کر ان کی پیدائشی قابلیتوں کو بڑھنے اور کام کرنے کا موقع ہی نہ دے۔ بلکہ ان سے زندگی کا حق ہی سلب کر کے چھوڑے۔

؎ ابھی پچھلے ہی سال نیشنلزم کا یہ کرشمہ ساری دنیا نے دیکھا کہ برما کے ہولناک فسادات میں (جن کا محرک برمی نیشنلزم کا جذبہ تھا) برمی بودھوں نے عام ہندوستانیوں کی طرح ہندوستانی بودھوں کو بھی نہایت بیدردی کے ساتھ قتل و غارت کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نیشنلزم کی مقراض نے اس روحانی و اخلاقی رشتہ کو قطع کر کے رکھ دیا جسے بودھ مت نے ایک ہندوستانی اور ایک برمی کے درمیان قائم کیا تھا۔ یہ نیشنلزم کا فطری خاصہ ہے۔ اس نے مسیحی اقوام کے درمیان بھی رشتہ اخوت کو اسی طرح کاٹا تھا، اور اب مسلمان قوموں کے درمیان بھی کاٹ رہا ہے۔ چنانچہ شام کی سرحد پر ترکوں اور عربوں کے درمیان جو صورت حال اس وقت رونما ہے وہ اسی نیشنلزم کا نتیجہ ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

الٰہی شریعتوں کا اساسی اصول یہ ہے کہ طاقت کے بجائے اخلاق پر انسانی حقوق کی بنیاد قائم ہو۔ حتیٰ کہ ایک طاقت ور شخص یا گروہ کمزور شخص یا گروہ کے حق کو بھی ادا کرے جبکہ قانونِ اخلاق اس کی تائید میں ہو۔ لیکن نیشنلزم اس کے مقابلہ میں یہ اصول قائم کرتا ہے کہ طاقت ہی حق ہے اور کمزور کا کوئی حق نہیں، اس لیے کہ وہ اُسے حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

شرائع الٰہیہ جس طرح اخلاقی حدود کے اندر نفس پروری کی مخالف نہیں ہیں اسی طرح وہ قوم پروری کی بھی مخالف نہیں ہیں۔ در حقیقت وہ اس کی تائید کرتی ہیں، کیونکہ ایک ایک قوم کے اپنی اپنی جگہ ترقی کرنے ہی پر مجموعی حیثیت سے انسانیت کی ترقی کا مدار ہے۔ لیکن آسمانی شریعتیں ایسی قوم پروری چاہتی ہیں جو انسانیت عامہ (Humanity at Large) کی طرف ہمدردی، معاونت اور خیرخواہی لیے ہوئے بڑھے اور وہ خدمت انجام دے جو سمندر کے لیے زمین کے دریا انجام دیتے ہیں۔ برعکس اس کے نیشنلزم انسان کے اندر یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام قوتیں اور قابلیتیں صرف اپنی قوم کی بڑائی کے لیے مخصوص کرے اور انسانیت عامہ کا نہ صرف یہ کہ مددگار نہ ہو بلکہ اپنی قوم کے مفاد پر انسانیت کے عمومی مفاد کی قربانی چڑھا دے۔ انفرادی زندگی میں جو حیثیت "خود غرضی" کی ہے اجتماعی زندگی میں وہی حیثیت "قوم پرستی" کی ہے۔ ایک قوم پرست فطرۃً تنگ دل ہوتا ہے۔ وہ دنیا کی ساری خوبیاں صرف اپنی قوم یا اپنی نسل ہی میں دیکھتا ہے۔ دوسری قوموں یا نسلوں میں اسے کوئی چیز ایسی قابلِ قدر نظر نہیں آتی جو زندگی اور بقا کی مستحق ہو۔ اس ذہنیت کا مکمل نمونہ ہم کو جرمنی کے نیشنل سوشلزم میں نظر آتا ہے۔ ہٹلر کی زبان میں نیشنل سوشلسٹ کی تعریف یہ ہے کہ:

> "ہر وہ شخص جو قومی نصب العین کو اس حد تک اپنانے کے لیے تیار ہو کہ اس کے نزدیک اپنی قوم کی فلاح سے بالاتر کوئی نصب العین نہ ہو، اور جس نے ہمارے قومی ترانے "جرمنی سب سے اوپر" کے معنی و مقصود کو اچھی طرح سمجھ لیا ہو، یعنی اس وسیع دنیا میں جرمن قوم اور جرمنی سے بڑھ کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کوئی چیز اس کی نگاہ میں عزیز اور محترم نہ ہو۔ ایسا شخص نیشنل سوشلسٹ ہے۔ ۱؎ اپنی کتاب "میری جدوجہد" میں ہٹلر لکھتا ہے:۔

"اس زمین میں جو کچھ قابلِ قدر ہے ـــــــ سائنس، آرٹ، فنی کمالات اور ایجادات ـــــــ وہ سب کا سب چند گنی چنی قوموں کی تخلیقی قابلیتوں کا نتیجہ ہے۔ اور یہ قومیں اصل میں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں...... اگر ہم نوعِ انسانی کو تین قسموں میں تقسیم کریں ـــــــ کلچر بنانے والے، اس کی حفاظت کرنے والے، اس کو غارت کرنے والے ـــــــ تو صرف آریہ نسل ہی کا شمار پہلی قسم میں کیا جا سکے گا۔" ۲؎

اس نسلی تفاخر کی بنیاد پر جرمنی میں غیر آریہ لوگوں کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ہے اور اسی بنیاد پر جرمنی کی جہانگیری کا نظریہ قائم ہے۔ ایک نیشنل سوشلسٹ کے نزدیک دنیا میں جرمن قوم کا مشن یہ ہے کہ وہ "ادنیٰ درجہ" کی قوموں کو غلام بنا کر "تہذیب" پھیلانے میں آلے کے طور پر استعمال کرے۔ اور یہ محض جرمنی ہی کی خصوصیت نہیں ہے۔ جمہوریت پسند امریکہ میں بھی رنگ کا امتیاز اسی بنیاد پر ہے ـــــــ سفید فام امریکن سیاہ فام حبشی کو انسان سمجھنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں ـــــــ اور یہی مسلک یورپ کی ہر قوم کا ہے، خواہ وہ برطانیہ ہو یا فرانس یا اٹلی یا ہالینڈ۔

پھر اس قوم پرستی کی ایک لازمی خصوصیت یہ ہے کہ یہ انسان کو مطلب پرست بناتی ہے۔ شرائع الٰہیہ تو دنیا میں اس لیے آئی ہیں کہ آدمی کو اصول پرست بنائیں اور اس کے طرزِ عمل کو ایسے مستقل اصولوں کا پابند بنا دیں جو اغراض اور خواہشات کے ساتھ بدلنے والے نہ ہوں۔ لیکن قوم پرستی اس کے برعکس آدمی کو بے اصولا بنا دیتی ہے۔ قوم پرست کے لیے دنیا میں کوئی اصول اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنی قوم کا فائدہ چاہتا ہے۔ اگر اخلاق کے

۱؎ *History of National Socialism by Konrad Helden, P. 85*

۲؎ *"My Struggle" London, PP 120-121*

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اصول، مذہب کے احکام اور تہذیب کے نظریات اس مقصد میں اس کے مددگار ہوں تو وہ ان پر ایمان لانے کا خوشی سے دعویٰ کرتا رہے گا۔ اور اگر وہ اس کے راستے میں حائل ہوں تو ان سب کو بالائے طاق رکھ کر کچھ دوسرے اصول و نظریات اختیار کرے گا۔ مسولینی کی سیرت میں ہم کو ایک قوم پرست کے کیرکٹر کا پورا نمونہ ملتا ہے۔ جنگِ عظیم سے پہلے وہ اشتراکی تھا۔ جنگِ عظیم میں اس لیے اشتراکیوں سے الگ ہو گیا کہ اٹلی کے شریکِ جنگ ہونے میں اس کو قومی فائدہ نظر آتا تھا۔ پھر جب غنائمِ جنگ میں اٹلی کو مطلوبہ فوائد حاصل نہ ہوئے تو اس نے جدید فاشستی تحریک کا علم بلند کیا۔ اس نئی تحریک میں بھی وہ برابر اپنے اصول بدلتا چلا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں وہ لبرل سوشلسٹ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں انارکسٹ بنا۔ ۱۹۲۱ء میں چند مہینے تک سوشلسٹ اور جمہوری طبقوں کا مخالف رہا۔ چند مہینے ان کے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتا رہا۔ اور بالآخر ان سے کٹ کر اس نے ایک نئی پالیسی وضع کر لی۔ یہ تلوّن، یہ بے اصولی اور یہ ابن الوقتی مسولینی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ نیشنلزم کی فطرت کا طبعی خاصہ ہے۔ انفرادی زندگی میں جو کچھ ایک خود غرض آدمی کرتا ہے وہی قومی زندگی میں قوم پرست کرتا ہے۔ کسی اصول اور نظریہ پر مستقل ایمان رکھنا اس کے لیے ناممکن ہے۔

مگر نیشنلزم اور الٰہی شریعتوں میں سب سے زیادہ کھلا ہوا تصادم ایک اور صورت سے ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے جو نبی بھی آئے گا وہ بہرحال کسی ایک قوم اور کسی ایک سرزمین ہی میں پیدا ہو گا۔ اسی طرح جو کتاب اس نبی کو دی جائے گی وہ بھی لامحالہ اسی ملک کی زبان میں ہو گی جس میں وہ مبعوث ہوا ہے۔ پھر اس نبوت کے مشن سے تعلق رکھنے والے جن مقامات کو عزت و احترام اور تقدیس کی حیثیت حاصل ہو گی وہ بھی زیادہ تر اُسی ملک میں واقع ہوں گے۔ مگر ان سب محدودیتوں کے باوجود وہ صداقت اور تعلیم ہدایت جو ایک نبی خدا کی طرف سے لے کر آتا ہے، کسی قوم اور ملک کے لیے محدود نہیں ہوتی بلکہ تمام انسانوں کے لیے عام ہوتی ہے۔ پوری نوعِ انسانی کو اس نبی پر اور اس کی لائی ہوئی صداقت پر ایمان لانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ خواہ کسی نبی کا مشن محدود ہو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جیسا کہ ہود اور صالح علیہما السلام اور بہت سے پیغمبروں کا تھا، یا اس کا مشن عام ہو جیسا کہ حضرت ابراہیم اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، بہر صورت ہر نبی پر ایمان لانے اور اس کا احترام کرنے کے لیے تمام انسان مامور ہیں۔ اور جب کہ کسی نبی کا مشن عالمگیر ہو تو یہ قدرتی بات ہے کہ اس کی لائی ہوئی کتاب کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کی زبان کا تہذیبی اثر بین الاقوامی ہوگا۔ اس کے مقدس مقامات ایک ملک میں واقع ہونے کے باوجود بین الاقوامی مرکزیت حاصل کریں گے۔ اور نہ صرف وہ نبی بلکہ اس کے حواری اور اس کے مشن کی اشاعت میں نمایاں حصہ لینے والے ابتدائی لوگ بھی ایک قوم سے تعلق رکھنے کے باوجود تمام قوموں کے ہیرو قرار پائیں گے ——— یہ سب کچھ ایک نیشنلسٹ کے مذاق، اُس کی افتادِ طبع، اس کے جذبات اور اس کے نظریات کے خلاف ہے۔ نیشنلسٹ کی غیرتِ قومی اس کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتی کہ وہ ایسے لوگوں کو ہیرو بنائے جو اس کی اپنی قوم کے نہیں ہیں، ایسے مقامات کی مرکزیت اور تقدیس و احترام قبول کرے جو اس کے اپنے وطن کے نہیں ہیں، ایسی زبان کا تہذیبی اثر قبول کرے جو اس کی اپنی زبان نہیں ہے، اُن روایات سے روحانی تحریک (Inspiration) حاصل کرے جو باہر سے آئی ہوں۔ وہ ان سب چیزوں کو نہ صرف اجنبی (Foreign) قرار دے گا بلکہ انہیں اُس نفرت اور ناگواری کی نگاہ سے دیکھے گا جس سے بیرونی حملہ آوروں کی ہر چیز دیکھی جاتی ہے، اور ان تمام خارجی اثرات کو اپنی قوم کی زندگی سے نکال دینے کی کوشش کرے گا۔ اس کے جذبۂ قومیت کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ اپنے جذبات تقدیس و احترام کو اپنے ہی وطن کی سرزمین سے وابستہ کرے، اپنے ہی وطن کے دریاؤں اور پہاڑوں کی حمد میں گیت گائے، اپنی ہی قوم کی پرانی تاریخی روایات کو (انہی روایات کو جنہیں یہ باہر سے آنے والا مذہب "عہدِ جاہلیت" سے تعبیر کرتا ہے) زندہ کرے اور ان پر فخر کرے، اپنے حال کا رشتہ اپنے ہی ماضی سے جوڑے اور اپنی ثقافت کا تسلسل اپنے اسلاف ہی کی ثقافت کے ساتھ قائم کرے، اپنی ہی قوم کے تاریخی یا افسانوی بزرگوں کو اپنا ہیرو بنائے اور انہی کے خیالی یا واقعی کارناموں سے روحانی تحریک حاصل کرے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غرض یہ بات نیشنلزم کی عین طبیعت میں شامل ہے کہ وہ ہر اُس چیز سے جو باہر کی ہو، منہ موڑ کر اُن چیزوں کی طرف رُخ کرے جو اس کے اپنے گھر کی ہوں۔ یہ راستہ جس آخری منزل پر پہنچتا ہے وہ یہ ہے کہ باہر سے آئے ہوئے مذہب کو بھی کلی طور پر چھوڑ دیا جائے اور ان مذہبی روایات کو زندہ کیا جائے جو خود اپنی قوم کے عہد جاہلیت سے کسی نیشنلسٹ کو پہنچی ہوں۔ ممکن ہے کہ بہت سے نیشنلسٹ اِس آخری منزل تک نہ پہنچے ہوں، اور ابھی بیچ ہی کی کسی منزل میں ہوں، مگر جس راستے پر وہ گامزن ہیں وہ جاتا اسی طرف ہے۔

آج[1] جرمنی میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نیشنلزم کے اِس فطری خاصہ کی مکمل توضیح و تبیین ہے۔ نازیوں میں سے ایک گروہ تو علانیہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بیزاری کا اظہار کر رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ یہودی النسل تھے اور کسی شخص کا یہودی ہونا اِس بات کے لیے کافی وجہ ہے کہ ایک آریہ نسل پرست اِس کی تمام تہذیبی، اخلاقی اور روحانی قدر و قیمت سے انکار کر دے۔ چنانچہ اس گروہ کے لوگ بلا تکلف کہتے ہیں کہ "مسیح ایک پرولتاری یہودی تھا، مارکس کا پیشرو، اِسی لیے تو اس نے کہا کہ جو مسکین ہیں وہی زمین کے وارث ہوں گے"۔ اس کے برعکس جن نازیوں کے دل میں ابھی تک مسیح کے لیے جگہ باقی ہے وہ ان کو نارڈک نسل کا ثابت کرتے ہیں۔ گویا ایک جرمن قوم پرست یا تو مسیح کو مانے گا نہیں، کیونکہ وہ یہودی تھے، یا اگر مانے گا تو اسرائیلی مسیح کو نہیں بلکہ نارڈک نسل کے مسیح کو مانے گا۔ بہرصورت اس کا مذہب اس کی نسل پرستی کے تابع ہے۔ کسی غیر آریہ کو رُوحانی و اخلاقی تہذیب کا پیشوا ماننے کے لیے کوئی جرمن قوم پرست تیار نہیں[2]۔ حد یہ ہے کہ جرمن قوم پرستوں کے لیے وہ خدا بھی قابلِ قبول نہیں جس کا تصور باہر سے درآمد ہوا ہے۔ بعض نازی حلقوں میں کوشش ہو رہی ہے کہ ان دیوتاؤں کو پھر زندہ کیا جائے جنہیں پُرانے ٹیوٹن قبائل پُوجا کرتے تھے۔

---

[1] یہ مضمون ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا۔ مرتب

[2] ٹھیک یہی ذہنیت عرب کے ان یہودیوں کی تھی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے سے صرف اس لیے انکار کر دیا تھا کہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہیں ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چنانچہ تاریخ قدیم کی چھان بین کر کے پوری دیومالا تیار کر لی گئی ہے اور ووٹان (Wotan) نامی دیوتا کو، جسے عہد جاہلیت کے ٹیوٹن لوگ "طوفان کا خدا" کہتے تھے، مہادیو قرار دیا گیا ہے۔ یہ مذہبی تحریک تو ابھی نئی نئی شروع ہوئی ہے۔ لیکن سرکاری طور پر نازی نوجوانوں کو آج کل جس عقیدہ کی تعلیم دی جا رہی ہے اس میں بھی خدا کو رب العالمین کی حیثیت سے نہیں بلکہ محض رب الالمانیین کی حیثیت سے خدا تسلیم کیا گیا ہے۔ اس عقیدے کے الفاظ یہ ہیں:-

"ہم خدا پر اس حیثیت سے ایمان رکھتے ہیں کہ وہ قوت و حیات کا ازلی مظہر ہے، زمین میں اور کائنات میں خدا کا خیال جرمن انسان کے لیے فطری ہے۔ خدا اور ازلیت کے متعلق ہمارا تصور کسی دوسرے مذہب یا عقیدے کے تصورات سے کسی قسم کی مماثلت نہیں رکھتا۔ ہم جرمن قوم اور جرمنی کی ازلیت پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ قوت و حیات کی ازلیت پر ہمارا ایمان ہے۔ ہم زندگی کے نیشنل سوشلسٹ تصور پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم اپنے قومی مقاصد کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم اپنے قائد اڈولف ہٹلر پر ایمان رکھتے ہیں"

یعنی خدا اس قوت و حیات کا نام ہے جو جرمن قوم میں حلول کر گئی ہے۔ جرمن قوم اس خدا کا ارضی ظہور ہے۔ ہٹلر اس کا رسول ہے اور "قومی مقاصد" اس رسول کا لایا ہوا مذہب ہے۔ ایک قوم پرست کی ذہنیت سے اگر کوئی مذہبی تصور مناسبت رکھتا ہے تو وہ بس یہی ہے۔

مغربی نیشنلزم کا انجام

یورپین اصول پر جب نیشنلزم کو ترقی دی جائے گی تو وہ بالآخر اسی مقام پر پہنچ کر دم لے گی۔ جو لوگ ابھی بیچ کی منزلوں میں ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچے ہیں، ان کے نہ پہنچنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ابھی تک ان کے جذبات قومیت کو ویسی سخت ٹھیس نہیں لگی ہے جیسی جرمنی کو گزشتہ جنگ عظیم میں لگی تھی۔ لیکن یقین رکھیے کہ جب وہ نیشنلزم کے راستہ پر گامزن ہوئے ہیں تو ان کی آخری منزل مقصود بہرحال وہی کمال درجہ کی جاہلی عصبیت ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو خدا اور مذہب تک کو قومی بنائے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتی۔ یہ نیشنلزم کی فطرت کا تقاضا ہے۔ نیشنلزم اختیار کر کے اس کے فطری تقاضے سے کون بچ سکتا ہے؟ غور کیجیے، آخر وہ کیا چیز ہے جو نرم پرستانہ طرز فکر اختیار کرتے ہی ایک مصری نیشنلسٹ کا رُخ خود بخود عہد فراعنہ کی طرف پھیر دیتی ہے؟ جو ایرانی کو شاہنامے کی افسانوی شخصیتوں کا گرویدہ بنا دیتی ہے؟ جو ہندوستانی کو "پراچین سمے" کی طرف کھینچ لی جاتی ہے اور گنگ وجمن کی تقدیس کے ترانے اس کی زبان پر لاتی ہے؟ جو ترک کو مجبور کرتی ہے کہ اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی تمدنی زندگی کے ایک ایک شعبے سے عربی اثرات کو خارج کرے اور ہر معاملہ میں عہد جاہلیت کی ترکی روایات کی طرف رجوع کرے؟ اس کی نفسیاتی توجیہ بجز اس کے آپ اور کیا کر سکتے ہیں کہ نیشنلزم جس دل و دماغ میں پیدا ہوتا ہے اس کی تمام دلچسپیاں قومیت کے دائرے میں محدود ہو جاتی ہیں اور اس دائرے سے باہر کی ہر چیز سے اُس کا رُخ پھر جاتا ہے۔

میرے سامنے اس وقت انقرہ کے ڈائرکٹر جنرل آف پریس کا ایک مضمون رکھا ہے جس کا عنوان ہے "ترکی عورت تاریخ میں"۔ اس کے ابتدائی فقرے حسب ذیل ہیں:-

"قبل اس کے کہ ہم اس بلند اور معزز رتبے سے بحث کریں جو ہماری زرخیز جمہوریت نے ترکی عورتوں کو دینا پسند کیا ہے، ہمیں ایک نظر یہ دیکھ لینا چاہیے کہ تاریخ کے مسلسل ادوار میں ترکی عورت کی زندگی کیسی رہی ہے۔ اس مختصر تبصرے سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ آج ترکی مردوں اور عورتوں میں جو مساوات پائی جاتی ہے وہ ہماری قومی تاریخ میں نئی چیز نہیں ہے۔ اِس سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ جب ترکی خاندان اور ترکی نظام تمدن بیرونی اثرات سے آزاد تھا، ترکی عورت ہمیشہ ہر تمدنی تحریک میں حصہ لیتی تھی۔ ہمارے مشہور ماہر اجتماعیات ضیا گوک الپ نے اس مضمون کی خوب تحقیق کی ہے، اور اس کی تحقیقات سے ان بہت سے حقوق کا پتہ چلا ہے جو ترکی عورت کو پُرانی ترکی تہذیب (یعنی ترکی کے عہد جاہلیت) میں حاصل تھے۔ اِن شہادتوں سے یہ بات صاف ہو جاتی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ قدیم ترکی عورت اور آج کی ترکی عورت کے درمیان تمدنی اور سیاسی اٹھان (Emancipation) کے اعتبار سے گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔"

اِن فقروں کو دیکھیے۔ قوم پرست ترک کس طرح اپنی تاریخ کے اُس دور سے منہ موڑتا ہے جس میں اس کی قوم اِس "بیرونی اثر" میں آگئی تھی، اور کس طرح اپنے حال کے لیے اپنے اُس ماضی کو "اُسوۂ حسنہ" بناتا ہے جب کہ اس کی قوم اِس بیرونی اثر سے آزاد تھی۔ یُوں یہ نیشنلزم آدمی کے دماغ کو اسلام سے جاہلیت کی طرف پھیر دیتا ہے۔ گوک الپ ضیاء جو در اصل تمدنی اور تہذیبی اعتبار سے ترکی جدید کا بانی ہے، اور جس کے بنائے ہوئے راستے پر آج ترکی قوم چل رہی ہے، وہ خالدہ ادیب کے الفاظ میں:-

"ایک نئی ترکی بنانا چاہتا تھا جو عثمانی ترکوں اور ان کے تورانی اسلاف کے درمیان کی خلیج کو پُر کر سکے .... وہ اُس مواد کی بنا پر تمدنی اصلاح کرنا چاہتا تھا جو اس نے ترکوں کے زمانۂ قبل اسلام کی سیاسی و تمدنی تنظیمات کے متعلق فراہم کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ عربوں کا قائم کیا ہوا اسلام ہمارے مناسب حال نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اپنے "عہدِ جاہلیت" کی طرف رجعت نہ کریں تو پھر ہمیں ایک مذہبی اصلاح (Reformation) کی ضرورت ہے جو ہماری طبائع سے مناسبت رکھتی ہو۔"

یہ الفاظ کسی مغربی پروپیگنڈسٹ کے نہیں ہیں جو ترکوں کو بدنام کرنا چاہتا ہو، بلکہ خود ایک قوم پرست ترک عورت کے ہیں۔ ان میں آپ صاف طور پر یہ منظر دیکھ سکتے ہیں کہ مسلمان کے دل و دماغ میں جب ایک راستہ سے قوم پرستی گھسنی شروع ہوتی ہے تو کس طرح دوسرے راستے سے اسلام نکلنے لگتا ہے۔ اور یہ چیز کچھ بیچارے ترکوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جس مسلمان نے بھی نیشنلزم کے شیطان سے بیعت کی ہے، اسلام کے فرشتوں سے اُس کا رخصتی معانقہ ہو گیا ہے۔ ابھی حال میں ہندوستان کے ایک "مسلمان" شاعر نے ترانۂ وطن کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے، جس میں وہ اپنی بھارت ماتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

جس کا پانی ہے امرت وہ مخزن ہے تو　　جس کے دانے ہیں بجلی وہ خرمن ہے تو
جس کے کنکر ہیں ہیرے وہ معدن ہے تو　　جس سے جنت ہے دُنیا وہ گلشن ہے تو
دیویوں دیوتاؤں کا مسکن ہے تو
تجھ کو سجدوں سے کعبہ بنا دیں گے ہم

آخری بیت کو پڑھ کر اس امر میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ نیشنلزم اور اسلام، دو بالکل الگ اور قطعی متضاد ذہنیتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان دونوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا محالات سے ہے۔ درحقیقت نیشنلزم خود ایک مذہب ہے جو شرائع الٰہیہ کا مخالف ہے۔ بلکہ عملی حیثیت سے بھی وہ انسان کی زندگی کے اُن تمام پہلوؤں پر ملکیت کا دعوےٰ کرتا ہے جنہیں شرائع الٰہیہ اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہیں[1]۔ اب ایک مرد عاقل کے لیے صرف یہی ایک صورت باقی ہے کہ دل و دماغ اور جسم و جان کا مطالبہ کرنے والے اِن دونوں مدعیوں میں سے کسی ایک کو پسند کرکے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے، اور جب ایک کی آغوش میں چلا جائے تو دوسرے کا نام تک نہ لے۔

دنیا نیشنلزم کی لعنت میں کیوں مبتلا ہے؟

اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں آزادی اور ترقی اور رفعت و شرف حاصل کرنے کا ایک ہی مجرب نسخہ دنیا کی قوموں کو معلوم ہے، اور وہ یہی نیشنلزم کا نسخہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر وہ قوم جو اُبھرنا چاہتی ہے، اس نسخہ کی طرف دوڑنے لگتی ہے۔ مگر قبل اس

---

[1] پروفیسر لیسٹن کہتا ہے "نیشنلزم نے مذہب اور عقل و ضمیر دونوں کی جگہ چھین لی ہے۔ وہ انسان کی زندگی کے تمام شعبوں پر اسی طرح حاوی ہونا چاہتا ہے جس طرح کہ مذہب۔ آج جو شخص اُس خدا کے سامنے، جس کا نام قومی اسٹیٹ ہے، جھکنے اور اپنے ضمیر کو قربان کرکے اس کی عبادت بجا لانے سے انکار کرتا ہے، وہ شخصی آزادی اور حقوق شہریت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

Social Philosophies in Conflict, P. 450

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے کہ دوسروں کو اس کی طرف دوڑتے دیکھ کر ہم بھی اسی کی طرف دوڑ جائیں، ہمیں سوچنا چاہیئے کہ دنیا کی یہ حالت کیوں ہے ——— دنیا اس حالت میں صرف اِس لیے مبتلا ہے کہ انفرادی اور اجتماعی خواہشات کو ضابطہ میں لانے والی، حوصلوں اور تمناؤں کو جائز حدود میں رکھنے والی، سعی و عمل کی قوتوں کو سیدھا راستہ دکھانے والی، اور آزادی، ترقی اور عزت و وقار کے حصول کا صحیح طریقہ بتانے والی کوئی تعلیم حکمت و اخلاق دنیا کے پاس نہیں ہے۔ اسی چیز نے قوموں کو بھٹکا دیا ہے۔ یہی محرومی اور یہی نقدان ہے جس نے قوموں کو جاہلیت اور ظلم و عدوان کی طرف دھکیل دیا ہے۔ خود ہمارے اپنے ملک کے ہندو اور سکھ اور پارسی وغیرہ بھی جس وجہ سے مغرب کے قوم پرستانہ خیالات قبول کر رہے ہیں، وہ یہی ہے کہ یہ بیچارے اِس ہدایت و رہنمائی سے محروم ہیں۔ اِس مصیبت، علاج اور گمراہی کی اصلاح اگر کہیں ہے تو وہ شرائع الٰہیہ میں ہے، اور دنیا میں صرف مسلمان ہی وہ جماعت ہے جو شرائع الٰہیہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ دراصل یہ مسلمان کا کام تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اُس عصبیت جاہلیہ کی جڑیں کاٹتا جو اکاس بیل کی طرح دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے، اور دنیا کی ہر قوم کو بتاتا کہ تمہارے لیے نہ صرف آزادی، ترقی اور وقار و شرف کا بلکہ اس کے ساتھ سلامتی، امن اور حقیقی خوشحالی کا راستہ بھی وہی ہے جو خدا کی طرف سے اس کے رسول لائے ہیں، نہ کہ وہ جو شیطان کی طرف سے فتنہ و شر کے امام تمہیں دکھا رہے ہیں۔ لیکن یہ دورِ حاضر کا سب سے زیادہ دردناک المیہ ہے کہ دنیا کو تباہی اور گمراہی سے بچانے والی وہ ایک ہی جماعت، مسلمان، جس کو اللہ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کا مشن قائم کرنے اور پھیلانے پر مامور کیا تھا، اپنے فرائضِ منصبی کو فراموش کر بیٹھی ہے، اور اب بجائے اس کے کہ وہ ہدایت کی شمع لے کر تاریکیوں میں بھٹکنے والی دنیا کو روشنی دکھائے، وہ خود ان بھٹکنے والوں ہی کے پیچھے چلنے پر آمادہ ہو رہی ہے۔ افسوس اس بیمارستان میں ایک ہی ڈاکٹر تھا اور وہ بھی بیماروں میں شامل ہوا جاتا ہے۔

مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نیشنلزم ہندوستان میں

پچھلے صفحات میں یہ بات اصولی حیثیت سے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ اجتماعیات میں نیشنلزم کا نقطۂ نظر اسلام کے نقطۂ نظر سے کلی طور پر متناقض ہے۔ لہذا مسلمان اگر اس شخص کا نام ہے جو زندگی کے ہر معاملہ میں اسلامی نقطۂ نظر رکھتا ہو، اور اگر اس کے سوا لفظ مسلمان کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہے، تو یہ بات آپ سے آپ لازم ہو جاتی ہے کہ مسلمان جہاں اور جس حال میں بھی ہو، اسے بہر حال نیشنلزم کی مخالفت کرنی چاہیے۔ یہ اصول طے ہو جانے کے بعد درحقیقت اس سوال میں کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہتی کہ کسی خاص ملک کی تحریک قوم پرستی میں مسلمان کا رویہ کیا ہو۔ لیکن جب ہم سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں نیشنلزم کو فروغ دینا چاہیے، اور یہ کہ اسی چیز کے فروغ پانے پر اس ملک کی نجات منحصر ہے، تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ خصوصی طور پر ہندوستان کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ دیکھیں کہ یہاں نیشنلزم کے فروغ پانے کا نتیجہ کیا ہے، یا کیا ہو سکتا ہے اور یہ کہ آیا فی الواقع ہندوستان کی نجات اسی طریقہ میں ہے ؟

نیشنلزم کے لوازم

کسی ملک میں نیشنلزم پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہاں پہلے سے ایک قومیت موجود ہو اور اگر وہ پہلے سے موجود نہیں ہے تو اب وجود میں آئے۔ کیونکہ جہاں قومیت ہی سرے سے موجود نہ ہو وہاں قوم پرستی کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتی۔ قوم پرستی تو قومیت کے اشتعال ہی کا دوسرا نام ہے۔ جب شعلہ ہی موجود نہ ہوگا تو اشتعال کیسے ہوگا۔

اب دیکھنا چاہیے کہ قوم پرستی کا شعلہ بھڑکنے کے لیے کس قسم کی قومیت درکار ہے۔

قومیت کی ایک قسم وہ ہے جسے سیاسی قومیت (Political Nationality) کہتے ہیں، یعنی جو لوگ ایک سیاسی نظام سے وابستہ ہوں وہ محض اس وحدت سیاسی کے لحاظ سے ایک قوم سمجھے جاتے ہیں۔ اس نوع کی قومیت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ جو لوگ اس میں شریک ہوں ان کے جذبات و حسیات، ان کے خیالات و نظریات، ان کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اخلاقی خصائص، ان کی روایات، ان کی زبان اور لٹریچر اور ان کے طرزِ زندگی میں کسی قسم کی یکسانی پائی جائے۔ ان تمام حیثیات سے بالکل مختلف ہونے کے باوجود ان کی ایک سیاسی قومیت ہوتی ہے اور اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ وہ ایک سیاسی نظام سے وابستہ رہیں۔ اگر ان کے مختلف گروہ آپس میں مختلف ہی نہیں بلکہ مخالف بھی ہوں، حتیٰ کہ اگر ان کے مقاصد اور قومی حوصلے باہم متضاد ہوں اور وہ ایک دوسرے کے خلاف عملاً جدوجہد کر رہے ہوں، تب بھی ان کی سیاسی قومیت ایک ہی رہتی ہے ـــــ قومیت کا لفظ ایسی وحدت کے لیے بولا ضرور جاتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ قومیت نہیں ہے جس کی بنیاد پر کہیں قوم پرستی پیدا ہو سکتی ہو۔

دوسری قسم کی قومیت وہ ہے جسے تہذیبی قومیت (Cultural Nationality) کہا جاتا ہے۔ یہ قومیت صرف اُن لوگوں میں پائی جاتی ہے جن کا مذہب ایک ہو۔ جن کے خیالات و نظریات اور جذبات وحسیات یکساں ہوں۔ جن میں ایک ہی طرح کے اخلاق اوصاف پائے جاتے ہوں۔ جو زندگی کے تمام اہم معاملات میں ایک مشترک زاویۂ نگاہ رکھتے ہوں اور اسی زاویۂ نگاہ کے اثر سے ان کی زندگی کے تہذیبی و تمدنی مظاہر میں بھی یک رنگی پیدا ہو گئی ہو۔ جو پسندیدگی و ناپسندیدگی اور حرمت و حلت اور تقدیس و استکراہ کے مشترک معیار رکھتے ہوں۔ جو ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھتے ہوں۔ جو ایک دوسرے کی عادات و خصائل اور دلچسپیوں سے مانوس ہوں۔ جن میں آپس کی شادی بیاہ اور مشترک معاشرت کی وجہ سے خونی اور قلبی رشتے پیدا ہو گئے ہوں۔ جنہیں ایک ہی قسم کی تاریخی روایات حرکت میں لا سکتی ہوں۔ مختصر یہ کہ جو ذہنی، روحانی، اخلاقی اور تمدنی و معاشرتی حیثیت سے ایک گروہ، ایک جماعت، ایک وحدت بن گئے ہوں ـــــ قوم پرستی اگر پیدا ہو سکتی ہے تو صرف اسی قومیت کی بنیاد پر ہو سکتی ہے ـــــ جن لوگوں میں یہ قومیت پائی جاتی ہے صرف انہی کے درمیان ایک مشترک نیشنل ٹائپ (Joint National Type) اور ایک مشترک نیشنل آئیڈیا (Joint National Idea) کا نشوونما ہوتا ہے۔ اسی نیشنل ٹائپ کے عشق اور نیشنل آئیڈیا کے استحکام سے نیشنلزم کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی چیز آگے بڑھ کر وہ قومی

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خودی (National Self) پیدا کردیتی ہے جس میں فرد اپنی انفرادی خودی کو جذب کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ پھر جب قومی خودی کے ارتقاء میں کوئی واقعی یا خیالی چیز مانع ہوتی ہے تو اس کو دفع کرنے کے لیے وہ جذبہ مشتعل ہوتا ہے جس کا نام نیشنلزم ہے۔

کیا ہندوستان کی نجات نیشنلزم میں ہے؟

اس تجزیہ کو سامنے رکھ کر ہندوستان کے حالات پر نظر ڈالیے۔ کیا فی الواقع یہاں نیشنلزم کی بنیاد موجود ہے؟ بلاشبہ سیاسی قومیت یہاں ضرور پائی جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں کے باشندے ایک سیاسی نظام کے تابع ہیں، ایک قسم کے قوانین ان کی تمدنی و معاشی زندگی پر حکمران ہیں، اور ایک فولادی ڈھانچہ ان سب کو اپنی گرفت میں لیے ہوتے ہے۔ مگر جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں محض سیاسی قومیت، قوم پرستی پیدا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ قومیت آسٹریا ہنگری، برطانیہ و آئرلینڈ، سلطنت روس، سلطنتِ عثمانیہ، چیکوسلاکیا، یوگوسلاویا، اور بہت سی دوسری سلطنتوں میں بھی پائی جاتی تھی، اور اب بھی بکثرت ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ مگر کہیں بھی اس نے نیشنلزم پیدا نہیں کیا۔ آزادی کے جذبہ میں مشترک ہونا، یا مصائب و خطرات میں مشترک ہونا بھی نیشنلزم کی پیدائش کے لیے ناکافی ہے۔ نیشنلزم اگر پیدا ہو سکتا ہے تو صرف تہذیبی قومیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے، اور ہر وہ شخص جو آنکھیں رکھتا ہو اس حقیقت کو دیکھ سکتا ہے کہ ہندوستان کے باشندوں میں تہذیبی قومیت موجود نہیں ہے۔

پھر جب امرِ واقعی یہ ہے تو یہاں نیشنلزم کا ذکر کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ جہاں سرے سے ماں ہی نہیں ہے وہاں بچے کا ذکر کرنا ظاہر ہے کہ نادانی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس ملک میں نیشنلزم کو فروغ دینے کا خیال ظاہر کرتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ بچہ تہذیبی قومیت ہی کے بطن سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس کے پیدا ہونے سے پہلے اس کی ماں کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس حقیقت کو جب وہ اچھی طرح جان لیں گے تو انہیں اپنے دعوے میں ترمیم کرنی پڑے گی۔ قبل اس کے کہ وہ ہندوستان میں نیشنلزم کو فروغ دینے کا نام لیں، انہیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہاں ہم ایک تہذیبی قومیت پیدا کرنا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاہتے ہیں تاکہ ہندوستانی نیشنلزم فروغ پاسکے۔

ہندوستانی نیشنلزم کس طرح پیدا ہو سکتا ہے ؟

اچھا اب اس سوال پر غور کیجئے کہ یہاں ایک تہذیبی قومیت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے اور اس کے امکانی نتائج کیا ہوں گے ؟

جس ملک میں مختلف تہذیبی قومیتیں پائی جاتی ہوں، وہاں ایک قومیت کی پیدائش دو ہی صورتوں سے ممکن ہے:۔

(۱) ایک قوم کی تہذیب باقی سب قوموں کو فنا کر دے۔ یا

(۲) سب کے اختلاط اور امتزاج سے ایک مشترک تہذیب پیدا ہو جائے۔

پہلی صورت یہاں خارج از بحث ہے، کیونکہ ہندوستانی نیشنلزم کے حامی اس کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتے۔ یہ چیز اگر نصب العین بن سکتی ہے تو "ہندو نیشنلزم" یا "مسلم نیشنلزم[1]" کے حامیوں کی بن سکتی ہے۔ رہے ہندوستانی نیشنلسٹ تو ان کے درمیان

---

[1] بظاہر یہ لفظ "مسلم" اور "نیشنلزم" کا اجتماع نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس عجائب کی دنیا میں ایسی عجیب چیزیں بھی پیدا ہو ہی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس وقت دو قسم کے نیشنلسٹ پائے جاتے ہیں۔ ایک "نیشنلسٹ مسلم" یعنی وہ لوگ جو مسلمان ہونے کے باوجود ہندوستان کی مشترک قومیت کے قائل اور اس کے پرستار ہیں۔ دوسرے "مسلم نیشنلسٹ" یعنی وہ لوگ جنہیں اسلام کے اصول و مقاصد سے تو کوئی دلچسپی نہیں، مگر "مسلمان" کے نام سے جو ایک قوم یہاں بن گئی ہے اس کے سیاسی و معاشی مفاد اور اس کی انفرادیت (Individuality) سے محض اس بنا پر ان کو دلچسپی ہے کہ وہ اس قوم میں پیدا ہوئے ہیں۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ دونوں قوم پرست یکساں گمراہ ہیں۔ کیونکہ اسلام صرف حق پرستی کا قائل ہے اور کسی قسم کی قوم پرستی کو جائز نہیں رکھتا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ دونوں قوم پرست اپنی اس غیر اسلامی حیثیت کے شعور سے محروم ہیں۔ خصوصاً دوسری قسم کے لوگ تو اپنے آپ کو اس وقت ہندوستان میں اسلام کا علمبردار سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی پوزیشن ہندو نیشنلسٹ کی پوزیشن سے کچھ بھی مختلف نہیں۔ ہندو نیشنلسٹ چونکہ ہندو قوم میں پیدا ہوا ہے اس لیے وہ

(باقی صفحہ ۳۶۶ پر)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اتفاق صرف دوسری صورت پر ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان کے حلقوں میں اکثر اس مسئلہ پر بحث بھی ہوتی ہے کہ اس مُلک کی مختلف قوموں کے امتزاج سے کسی طرح ایک قومیت پیدا کی جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں وہ ایسی طفلانہ باتیں کرتے ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ تہذیبی قومیت کے حقیقی مفہوم کو سمجھتے ہیں، نہ انہیں یہ خبر ہے کہ اس قسم کی قومیتوں کا امتزاج کس طرح کن قوانین کے تحت ہوتا ہے، اور نہ انہوں نے کبھی اس پہلو پر غور کیا ہے کہ ایسے امتزاج سے کس شان کی قومیت بنتی ہے۔ وہ اسے بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں اور بچوں ہی کی طرح اس کھیل کو کھیلنا چاہتے ہیں۔

تہذیبی قومیت دراصل نام ہے ایک قوم کے مزاج عقلی اور نظام اخلاقی کا۔ اور یہ چیز مصنوعی طور پر ایک دو دن میں نہیں بن جاتی، بلکہ صدیوں میں اس کا نشوونما فطری تدریج کے ساتھ ہوتا ہے۔ صدہا برس تک جب کچھ لوگ نسلاً بعد نسلٍ ایک قوم کے عقائد اور رسوم و عادات کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں، تب کہیں جا کر ان میں ایک مشترک روح پیدا ہوتی ہے، مشترک اخلاقی اوصاف مستحکم ہوتے ہیں، ایک مخصوص مزاج عقلی بنتا ہے، وہ روایات جڑ پکڑتی ہیں جن سے ان کے جذبات وحسیات (Sentiments) وابستہ ہوتے ہیں، وہ لٹریچر پیدا ہوتا ہے جو ان کے دل و دماغ کا ترجمان ہوتا ہے، اور وہ ذہنی و روحانی یک رنگی رونما ہوتی ہے جس سے ان میں باہمی اُنس اور تفاہم (Mutual —— Intelligibility) —— پیدا ہوتا ہے۔ پھر جب ان گہرے اور مضبوط اثرات کے تحت کسی گروہ کی مستقل قومیت بن جاتی ہے، یا دوسرے الفاظ میں جب اس کا اخلاقی اور

(بقیہ ص ۳۶۵ سے) ان لوگوں کا بول بالا کرنا چاہتا ہے جو ہندو ہوں۔ اور یہ مسلم نیشنلسٹ چونکہ مسلمان نامی قوم میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے یہ ان لوگوں کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں جو اس قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔ کسی اخلاقی مقصد اور کسی اصولی مسلک کو نہ وہ سے کر اُٹھتا ہے نہ یہ۔ اُس کی طرح ان کو بھی یہ بات مطمئن کر دے گی کہ اقتدار کی مسند پر "مسلمان" متمکن ہوں، خواہ ان کی حکومت سراسر غیر اسلامی اصولوں پر ہی کیوں نہ قائم ہو اور ان کا طرزِ عمل غیر مسلموں کے طرزِ عمل سے کچھ بھی مختلف نہ ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عقلی مزاج مستحکم ہو جاتا ہے، تو اس کے لیے کسی دوسرے گروہ کے ساتھ خلط ملط ہو کر کسی دوسری قومیت میں تبدیل ہو جانا تقریباً محال ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسے گروہ سینکڑوں برس تک ایک ہی آب و ہوا اور ایک ہی سر زمین میں پہلو بہ پہلو رہتے ہیں، مگر کسی قسم کا امتزاج واقع نہیں ہوتا۔ یورپ میں جرمن، امگیار، پول، چیک، یہودی، سلافی اور ایسی دوسری قومیں مدتوں سے ایک جگہ زندگی بسر کر رہی ہیں مگر آج تک ان کے درمیان امتزاج پیدا نہیں ہوا۔ انگریز اور آئرش صدیوں ایک ساتھ رہے مگر کسی طرح مل کر ایک نہ ہو سکے۔ کہیں کہیں ایسے گروہوں کی زبانیں بھی مشترک ہوتی ہیں۔ مگر زبان کے اشتراک سے دل و دماغ کا اشتراک رونما نہیں ہوتا۔ الفاظ مشترک ہوتے ہیں مگر وہ ہر قوم کے دل میں جو جذبات و خیالات پیدا کرتے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

یکجا بود و باش اور طویل مدت تک باہمی اختلاط سے مختلف تہذیبی گروہوں کا مل کر ایک صحیح قسم کی مکمل اور متحدہ قومیت پیدا کرنا اس صورت میں ممکن ہے، اور صرف اسی صورت میں وہ اعلیٰ درجہ کے تمدنی نتائج پیدا کر سکتا ہے، جب کہ ایسے گروہوں کے نظام اخلاقی اور مزاجِ عقلی میں کوئی بڑا اور اہم تفاوت نہ ہو، بلکہ وہ بڑی حد تک متشابہ الاخلاق ہوں۔ اس صورت میں ان کی الگ الگ خصوصیات اور ان کے جداگانہ قومی تشخصات مٹ جاتے ہیں اور ایک متحد نظامِ اخلاق بن جاتا ہے۔ مگر یہ عمل بھی اس طرح نہیں ہوتا جیسے ہتھیلی پر سرسوں جمائی جاتی ہے، بلکہ مدت ہائے دراز تک کسر و انکسار ہوتا رہتا ہے۔ تب کہیں مختلف اجزاء میں گھل مل کر ایک مزاج پیدا ہوتا ہے۔ انگلستان میں برٹن، سیکسن اور نارمنڈی قوموں نے ایک قوم بنتے بنتے سینکڑوں برس لیے ہیں۔ فرانس میں دس صدیوں سے یہ عمل جاری ہے اور اب تک قومیت کا خمیر پوری طرح تیار نہیں ہو سکا ہے۔ اٹلی میں اس وقت تک کوئی قومی رُوح پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ حالانکہ وہ مختلف عناصر جن سے اطالوی قومیت کی ترکیب ہوئی ہے اخلاقی حیثیت سے باہم کوئی بیّن تفاوت نہیں رکھتے۔ ممالکِ متحدہ امریکہ میں ایک قومیت صرف اُن عناصر کے امتزاج سے بن سکی ہے جو بہت کچھ متشابہ الاخلاق تھے اور جن کو مشترک اغراض نے مجبور کر دیا تھا کہ اپنے خفیف

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے اختلاف و تفاوت کو جلدی سے دفن کر کے یک جان ہو جائیں۔ تاہم اس عمل نے بھی پایۂ تکمیل کو پہنچتے پہنچتے ڈھائی تین سو برس لیے ہیں۔

متشابہ الاخلاق قوموں کے امتزاج سے ایک صحیح اور عمدہ قسم کی قومیت بننا صرف اس لیے ممکن ہوتا ہے کہ انہیں اس عمل امتزاج کے دوران میں اپنے عقائد و نظریات اور اپنے اخلاقی معیاروں کو طلاق دینے اور اپنے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی اوصاف کو جڑ سے اکھاڑنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ یہ چیزیں ان کے درمیان پہلے ہی سے مشترک ہوتی ہیں۔ صرف روایات کے رد و بدل اور جذبات وحسیات اور مقاصد و اغراض کی جدید تنصیب (Readjustment) سے ہی ان کی نئی قومیت بن جاتی ہے۔ بخلاف اس کے جہاں مختلف الاخلاق قوموں میں کسی مصنوعی دباؤ، کسی جعلی کوشش اور بعض ادنیٰ درجہ کے محرکات سے امتزاج واقع ہوتا ہے وہاں ایک نہایت ذلیل قسم کی قومیت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں ان کے عقائد کی جڑیں ہل جاتی ہیں، ان کے اعلیٰ درجہ کے اخلاقی خصائص (جو ان کے امتیازی اوصاف تھے اور جن کی موجودگی میں امتزاج ممکن نہ تھا) مٹ جاتے ہیں، ان کے حسیاتِ ملی (جن پر ان کی قومیت کی اساس قائم تھی) فنا ہو جاتے ہیں، ان میں سے ہر قوم کو اپنے اپنے معیاراتِ فضل و شرف بدلنے پڑتے ہیں، اور ان کی نئی قومیت ان میں سے ہر ایک کے رذائلِ اخلاق کا مجموعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس نوعیت کا امتزاج قوموں کے نظامِ اخلاق کو درہم برہم کر دیتا ہے اور نیا نظامِ اخلاق بننے کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ اپنی اپنی سابق روایات سے ان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، اور نئی روایات بننے میں بہت دیر لگتی ہے۔ اپنے اپنے نیشنل ٹائپ کو وہ خود مسمار کر دیتے ہیں اور نیا ٹائپ ڈھلنے کے لیے بڑا وقت لیتا ہے۔ اس خطرناک حالت میں جو لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں ان کی سیرت میں کوئی مضبوطی نہیں ہوتی۔ وہ دنیٔ الاخلاق، کم ظرف، تنگ حوصلہ، چھچھورے، متلون اور بے اصول ہوتے ہیں۔ ان کی حالت اُس پتے کی سی ہوتی ہے جو درخت سے ٹوٹ کر میدان میں جا پڑا ہو اور ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اُڑتا پھرتا ہو، کہیں اس کو قرار نہ ہو۔ برازیل (جنوبی امریکہ) میں مختلف الاخلاق قوموں کے اختلاط و امتزاج کا حال جن لوگوں نے دیکھا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے وہ گواہی دیتے ہیں کہ یہ بلا تمام ان قوموں کے محاسن کو یکساں طور پر برباد کر رہی ہے جو اس کے زیر اثر آگئی ہیں، اور اس کی بدولت وہاں عقلی اور جسمانی حیثیت سے نہایت گھٹیا درجہ کی نسل پیدا ہو رہی ہے۔

ہندوستان میں جو تہذیبی قومیتیں پائی جاتی ہیں انہیں کوئی ایسا شخص متشابہ الاخلاق نہیں کہہ سکتا جو اجتماعیات میں کچھ بھی بصیرت رکھتا ہو، اور جو سیاسی خواہشات سے قطع نظر کرکے محض حقائق نفس الامری کی بنا پر رائے قائم کرتا ہو۔ ان قوموں کے درمیان اُس سے زیادہ گہرے اختلافات پائے جاتے ہیں جتنے یورپ کی مختلف تہذیبی قومیتوں کے درمیان موجود ہیں۔ یہاں عقائد میں بعد المشرقین ہے۔ اصول تہذیب ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ نظامِ اخلاق میں بیّن تفاوت ہے۔ روایات کے سرچشمے قطعی طور پر الگ الگ ہیں۔ جذبات و حسیات باہم متناقض ہیں۔ اور ایک کا نیشنل ٹائپ اپنے خط و خال میں دوسرے کے نیشنل ٹائپ سے کوئی مماثلت نہیں رکھتا۔ یہاں محض سیاسی و معاشی اغراض کی خاطر ان مختلف قومیتوں کو مٹا کر ایک ممزوج و مخلوط قومیت پیدا کرنے کی کوشش لامحالہ وہی نتیجہ پیدا کرے گی جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے۔ بدقسمتی سے ڈیڑھ سو سال کے انگریزی اقتدار نے ان قوموں کو پہلے ہی اخلاقی انحطاط میں مبتلا کر دیا ہے۔ غلامی کا گھن ان کے جوہرِ شرافت کو پہلے ہی کھا چکا ہے۔ ان کی سیرتیں کمزور ہو چکی ہیں۔ ان کے عقائد جڑوں سے ہل چکے ہیں۔ ان کا تعلق اپنی روایات سے بہت کچھ ٹوٹ گیا ہے۔ ان کے نیشنل ٹائپ مضمحل ہو گئے ہیں۔ ان کا معیارِ اخلاق پست ہو گیا ہے۔ ان کے اخلاقی خصائص میں استحکام باقی نہیں رہا ہے۔ اور نئی نسلوں میں اس تنزل و انحطاط کے نہایت مکروہ نتائج دیکھے جا رہے ہیں۔ اس حالت میں قوم سازی کا عمل جاری کرنے کے لیے جب ان کی رہی سہی تہذیبی بنیادوں پر ضرب لگائی جائے گی تو یقین رکھیے کہ پورے ملک کا نظامِ اخلاق درہم برہم ہو جائے گا اور اس کے نتائج نہایت ہولناک ہوں گے۔

کیا ہندوستان کا کوئی بہی خواہ یہاں نیشنلزم کا خواہشمند ہو سکتا ہے؟

وہ محض طفلانہ خام خیالی ہے جس کی بنا پر اس ملک کے سیاسی لیڈر بغیر سوچے سمجھے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رائے قائم کر لیتے ہیں کہ اجنبی طاقت کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہاں نیشنلزم پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اور نیشنلزم پیدا کرنے کے لیے ایک قومیت بنانے کی حاجت ہے، لہٰذا تمام موجودہ قومیتوں کو مٹا دو اور سب کی ایک قومیت بنا ڈالو۔ حالانکہ اگر ان لوگوں میں صحیح بصیرت موجود ہو اور یہ مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر خود سوچنے سمجھنے کی کوشش کریں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ یہ راستہ ہندوستان کی نجات کا نہیں، اس کی تباہی کا ہے۔

اوّلاً اس راستے سے آزادی حاصل کرنا درحقیقت نہایت دیر طلب کام ہے۔ سینکڑوں ہزاروں برس کی روایات پر جو تہذیبی قومیتیں قائم ہیں ان کا مٹنا، ان کی جگہ ایک نئی قومیت کا وجود میں آنا، اور پھر اس قومیت کا مستحکم اور مشتعل ہو کر نیشنلزم کی حد تک پہنچنا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بہرحال ایک طویل مدت درکار ہے، اور اگر آزادی کا حصول اسی پر موقوف ہے تو ہندوستان کو کم از کم ابھی دو تین نسلوں تک اس کا انتظار کرنا پڑے گا۔

ثانیاً اگر اس راستے سے آزادی حاصل ہو بھی جائے تو جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، اس میں خطرہ یہ ہے کہ آخرکار تمام ملک اخلاقی انحطاط کے ہاویہ میں گر جائے گا۔

ثالثاً یہ ایک یقینی امر ہے کہ جن قوموں کو اپنی انفرادیت سے کچھ بھی لگاؤ باقی ہے وہ اس نوعیت کی قوم سازی کے خلاف پوری جدوجہد کریں گی، اور اس کش مکش میں آزادیٔ وطن کے لیے کوئی متحدہ کوشش نہ کی جا سکے گی۔ لہٰذا اجنبی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے شاید یہ دُور کا راستہ بھی نہیں ہے، کجا کہ قریب کا راستہ ہو۔ اگر اس راستہ کو اختیار کرنے پر یُوں ہی اصرار کیا جاتا رہا تو کچھ بعید نہیں کہ سیاسی آزادی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہ سکے۔

ان وجوہ سے میرے نزدیک وہ لوگ سخت نادان ہیں جو محض مغربی قوموں کی تقلید میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ملکی آزادی کے لیے بس نیشنلزم ہی ایک کارگر آلہ ہے۔ میں پہلے بھی بارہا کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان کی آزادی اور سیاسی و معاشی ترقی کے لیے سرے سے قومی وحدت اور نیشنلزم کی حاجت ہی نہیں ہے۔ جہاں مختلف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تہذیبی قومیتیں موجود ہوں وہاں قومی وحدت قائم کرنے کی کوشش کرنا نہ صرف یہ کہ غیر ضروری ہے، نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے، بلکہ نتائج کے اعتبار سے بھی مفید ہونے کے بجائے اُلٹا نقصان دہ ہے۔ ایسی جگہ وحدت نہیں بلکہ صرف وفاق کے اصول (Federal principles) ہی چل سکتے ہیں۔ ہر قوم کی مستقل حیثیت تسلیم کی جائے، اور صرف مشترک وطنی اغراض کی حد تک تمام قوموں کے درمیان اشتراکِ عمل (Joint Action) کا معاہدہ ہو جائے۔ بس یہی ایک صورت ہے جس سے ملک کی تمام جماعتوں میں اپنی انفرادیت کے بقاء و تحفظ کا اطمینان پیدا ہو سکتا ہے، اور یہی چیز ملک کی تمام قوتوں کو سیاسی ترقی کی جدوجہد میں ایک محاذِ جنگ پر مجتمع کر سکتی ہے۔

فرنگی لباس

اب مجھے چند الفاظ مولانا سندھی کے اس آخری نقطے کے متعلق بھی عرض کرنے ہیں جس میں انہوں نے نکٹائی اور پتلون اور ہیٹ کے استعمال کا مشورہ دیا ہے۔

یہ مشرقی قوم پرست بھی کچھ عجیب قسم کی مخلوق ہیں۔ ایک طرف یہ بڑے زور شور کے ساتھ قوم پرستی کا پرچار کرتے ہیں، دوسری طرف انہیں غیر قوم اور غیر ملک کا لباس اور تمدن اختیار کرنے میں کوئی باک نہیں ہوتا۔ اور اس پر بھی بس نہیں، یہ اس اجنبی لباس و تمدن کو اپنی قوم میں رواج دینے کی اس طرح کوشش کرتے ہیں کہ گویا یہ بھی قوم پرستی کے پروگرام کا کوئی حصّہ ہے، حتیٰ کہ جہاں ان کا بس چلتا ہے وہاں یہ زبردستی اُس کو لوگوں کے سر منڈھنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ہندوستان، ایران، مصر، ٹرکی ہر جگہ ان حضرات کی یہی روش ہے۔ حالانکہ قوم پرستی ——— اگر اس لفظ کے مفہوم میں قومی غیرت کا بھی کچھ حصّہ ہو ——— اِس بات کی فطری طور پر متقاضی ہے کہ آدمی خود اپنی قوم کے لباس اور طرزِ تمدن پر قائم رہے، اسی میں عزت اور شرف محسوس کرے، اور اسی پر فخر کرنا سیکھے۔ جہاں سرے سے یہ چیز بالکل ہی مفقود ہے وہاں قوم پرستی خدا جانے کہاں سے آجاتی ہے؟ غیرتِ اسلامی کا فقدان اور قوم پرستی، دونوں صریح طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مگر ہمارے مشرقی قوم پرست اضداد کو جمع کرنے میں کمال رکھتے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خیالات اور اعمال میں تناقض سے محفوظ رہنے کے لیے ذہنِ سلیم اور نظرِ سدید درکار ہے، اور یہ چیز اگر حاصل ہو تو آدمی فطرت کی سیدھی صاف راہ چھوڑ کر قوم پرستی ہی کیوں اختیار کرلے؟

اسلام اس معاملہ میں بھی ان حضرات کا ساتھ دینے سے انکار کرتا ہے۔ زندگی کے ہر معاملہ میں سیدھا صاف، معقول اور فطری راستہ جو ہو سکتا ہے اسی کا نام اسلام ہے، اور وہ جس طرح قومیت کے مبالغے اور اس کی افراط (یعنی قوم پرستی) کا ساتھ نہیں دیتا اسی طرح کسی ایسی چیز کا ساتھ بھی نہیں دیتا جو قومیت کی جائز فطری حدبندیوں کو توڑنے والی، اور قوموں کی انفرادیت (Individuality) یا ان کے امتیازی خصائص کو مٹانے اور ان کے اندر نزاعِ اخلاق پیدا کرنے والی ہو۔

قرآن مجید ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان اگرچہ سب ایک ہی اصل سے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان دو قسم کے امتیاز رکھے ہیں۔ ایک عورت اور مرد کا امتیاز، دوسرا نسب اور قبیلہ اور قومیت کا امتیاز۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا۔ (الحجرات۔ ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ۔ (النجم ۴۵)

اور اللہ نے مرد اور عورت دو صنفیں پیدا کیں۔

یہ دونوں قسم کے امتیازات انسانی تمدّن اور اجتماعی زندگی کی بنیاد ہیں۔ اور فطرت الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو صحیح حدود کے ساتھ باقی رکھا جائے۔ عورت اور مرد کا امتیاز اس لیے ہے کہ ان کے درمیان نفسیاتی کشش ہو، لہٰذا ضروری ہوا کہ تمدّن و معاشرت میں دونوں کے اوصافِ امتیازی پوری طرح محفوظ رکھے جائیں۔ اور قوموں کا امتیاز اس لیے ہے کہ تمدّنی اغراض کے لیے انسانوں کے ایسے اجتماعی دائرے اور حلقے بن سکیں

جن کے درمیان آسانی کے ساتھ باہمی تعاون ہو سکے۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ ہر گروہ یا ہر تمدنی و اجتماعی حلقے کے کچھ امتیازی اوصاف ہوں جن کے ذریعہ سے ایک حلقہ کے آدمی ایک دوسرے کو پہچان سکیں، باہم مانوس ہوں، ایک دوسرے کو سمجھ سکیں، اور دوسرے حلقوں کے آدمیوں میں فرق کر سکیں۔ اس قسم کے امتیازی اوصاف ظاہر ہے کہ زبان، لباس، طرز زندگی، اور شانِ تمدن ہی ہو سکتے ہیں۔ پس یہ عین فطرت کا تقاضا ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے۔

اسی بنا پر اسلام میں تشبّہ کی ممانعت کی گئی ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اس عورت پر جو مرد کا سا لباس پہنے اور اس مرد پر جو عورت کا سا لباس پہنے[1]۔ دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ملعون قرار دیا ان مردوں کو جو عورتوں کے مشابہ بنیں اور ان عورتوں کو جو مردوں کے مشابہ بنیں[2]۔ یہ اس لیے کہ عورت اور مرد کے درمیان جو نفسیاتی کشش اللہ نے رکھی ہے، یہ تشبّہ اس کو دباتا اور گھٹاتا ہے، اور اسلام اس کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اسی طرح قوموں کے لباس و تمدن اور شعائر کو بھی مٹانا اور انہیں خلط ملط کرنا، اجتماعی مفاد و مصالح کے خلاف ہے، لہٰذا اسلام اس کی بھی مخالفت کرتا ہے۔ تو جی امتیاز کو ——— جب فطری حدود سے بڑھا کر قوم پرستی بنایا جائے گا تو اسلام اس کے خلاف جہاد کرے گا، کیونکہ اس مادے سے جاہلانہ حمیّت، ظالمانہ تعصّب، اور قیصریت کی تخلیق ہوتی ہے۔ لیکن اسلام کی دشمنی قوم پرستی سے ہے نہ کہ قومیت سے، قوم پرستی کے برعکس قومیت کو وہ برقرار رکھنا چاہتا ہے، اور اسے مٹانے کا بھی وہ ویسا ہی مخالف ہے جیسا کہ اس کو حد سے بڑھانے کا مخالف ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جو متوسط اور متوازن رویہ اسلام نے اختیار کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل آثار بغور ملاحظہ فرمایئے:-

(۱) ایک صحابی نے پوچھا کہ عصبیت کیا چیز ہے؟ کیا آدمی کا اپنی قوم سے محبت کرنا

---

[1] المستدرک۔ جلد ۴۔ صفحہ ۱۹۴۔

[2] بخاری۔ کتاب اللباس۔

عصبیت ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "نہیں، عصبیت یہ ہے کہ کوئی ظلم میں اپنی قوم کا ساتھ دے۔" (ابن ماجہ)

(۲) فرمایا: "جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے گا وہ اسی قوم میں شمار ہوگا۔"

(ابو داؤد)

(۳) حضرت عمرؓ نے آذربائجان کے گورنر عتبہ بن فرقد کو لکھا، کہ "خبردار اہل شرک (یعنی باشندگان آذربائجان) کے لباس اختیار نہ کرنا۔" (کتاب اللباس والزینۃ)

(۴) حضرت عمرؓ نے اپنے تمام گورنروں کو عام احکام دیئے تھے کہ غیر مسلم باشندوں کو اہل عرب کے لباس اور وضع و ہیئت اختیار کرنے سے روکیں۔ حتیٰ کہ بعض علاقوں کے باشندوں سے صلح کرتے وقت باقاعدہ معاہدہ میں ایک مستقل دفعہ اس مضمون کی داخل کر دی گئی تھی کہ تم ہمارے جیسے لباس نہ پہننا۔ (کتاب الخراج۔ امام ابو یوسف)

(۵) جو اہل عرب فوجی یا ملکی خدمات کے سلسلہ میں عراق و ایران وغیرہ ممالک میں مامور تھے، ان کو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ بار بار تاکید کرتے تھے کہ اپنی زبان اور لہجہ کی حفاظت کریں اور عجمی بولیاں نہ بولنے لگیں۔ (بیہقی)

ان روایات سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام جس بین الاقوامیت کا علمبردار ہے اس کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ قوموں کی امتیازی خصوصیات کو مٹا کر انہیں خلط ملط کر دیا جائے۔ بلکہ وہ قوموں کو ان کی قومیت اور خصوصیات کے ساتھ برقرار رکھ کر ان کے درمیان تہذیب و اخلاق اور عقائد و افکار کا ایک ایسا رشتہ پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے بین الاقوامی کشیدگیاں، رکاوٹیں، ظلم اور تعصبات دور ہو جائیں اور ان کے درمیان تعاون و برادری کے تعلقات قائم ہوں۔

تشبّہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کی بنا پر اسلام اس کا سخت مخالف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ایک قوم کے لوگ اپنی قومی خصوصیات کو صرف اسی وقت چھوڑتے ہیں جب ان کے اندر کوئی نفسی کمزوری اور اخلاق ذلیل پیدا ہو جاتی ہے۔ جو شخص دوسروں کا اثر قبول کر کے اپنا رنگ چھوڑ دے اور ان کے رنگ میں رنگ جائے، لامحالہ اس کے اندر تلوّن،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھچھورپن، سرعتِ انفعال اور خفیفت الحرکتی کا مرض ضرور ہوگا۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے گی تو یہ مرض ترقی کرے گا۔ اگر بکثرت لوگوں میں یہ پھیل گیا تو ساری قوم نفسیاتی ضعف میں مبتلا ہو جائے گی۔ اُس کے اخلاق میں کوئی پختگی باقی نہ رہے گی۔ اس کے ذہن کی چولیں ایسی ڈھیلی ہو جائیں گی کہ ان پر اخلاق اور خصائص کی مستحکم بنیادیں قائم ہی نہ ہو سکیں گی۔ لہٰذا اسلام کسی قوم کو بھی یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ اپنے اندر اس نفسی بیماری کو پرورش کرے۔ مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ جہاں اس کا بس چلتا ہے، وہ غیر مسلموں کو بھی اس سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، کیونکہ وہ کسی انسان میں بھی اخلاقی کمزوری دیکھنا نہیں چاہتا۔

خصوصیت کے ساتھ مفتوح و مغلوب لوگوں میں یہ مرض زیادہ پھیلتا ہے۔ ان کے اندر محض اخلاقی ضعف ہی نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت وہ اپنی نگاہوں میں آپ ذلیل ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو خود حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے حکمرانوں کی نقل اُتار کر عزت اور فخر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ عزت، شرافت، بزرگی، تہذیب، شائستگی، غرض جس چیز کا بھی وہ تصور کرتے ہیں اس کا مثالی نمونہ انہیں اپنے آقاؤں کی صورت ہی میں نظر آتا ہے۔ غلامی اُن کے جوہرِ آدمیت کو اس طرح کھا جاتی ہے کہ وہ عَلانیہ اپنی ذلت اور پستی کا مجسم اشتہار بننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس میں شرم محسوس کرنے کے بجائے فخر محسوس کرتے ہیں[1]۔ اسلام جو انسان کو پستیوں سے اُٹھا کر بلندی کی طرف لے جانے آیا ہے، ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو

---

[1] ہمارے اس بیان کی صداقت میں اگر کسی صاحب کو شک ہو تو وہ ہندوستان ہی میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے فرق کو دیکھ لیں۔ مٹھی بھر انگریز متفرق و پراگندہ، ڈھائی سو برس سے کروڑوں ہندوستانیوں کے درمیان رہتے ہیں مگر ایک انگریز بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جس نے ہندوستانی لباس اختیار کر لیا ہو۔ بخلاف اس کے ان ہندوستانیوں کا شمار کرنا بھی اب مشکل ہے جو سر سے پاؤں تک انگریز نما بنے پھرتے ہیں اور لباس ہی میں نہیں بلکہ اپنی بول چال، انداز و اطوار، حرکات و سکنات ہر چیز میں انگریز کا چربہ اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر اس کی کیا توجیہ کی جائے گی؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

جائز نہیں رکھتا کہ کوئی انسانی گروہ ذلتِ نفس کے اس اسفل السافلین میں گر جائے جس سے نیچے پستی کا کوئی اور درجہ ہے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عجمی قومیں اسلامی حکومت کے زیرِ نگیں آئیں تو آپ نے ان کو سختی کے ساتھ اہلِ عرب کی نقالی سے روکا۔ اسلامی جہاد کا مقصد ہی باطل ہو جاتا اگر ان قوموں میں غلامانہ خصائل پیدا ہونے دیئے جاتے۔ رسول اللہؐ نے عربوں کو اسلام کا پرچم اس لیے نہیں دیا تھا کہ وہ قوموں کے آقا بنیں اور قومیں ان کے ماتحت غلامی کی مشق بہم پہنچائیں۔

ان وجوہ سے اسلام اس بات کا مخالف ہے کہ کوئی قوم دوسری قوم کا ہو بہو چربہ بننے کی کوشش کرے اور اس کے لباس وطرزِ معاشرت کی نقالی کرنے لگے۔ رہا تہذیب و تمدن کا وہ لین دین جو ایک دوسرے سے میل جول رکھنے والی قوموں میں فطری طور پر واقع ہوتا ہے تو اسلام اس کو نہ صرف جائز رکھتا ہے بلکہ فروغ دینا چاہتا ہے۔ وہ قوموں کے درمیان تعصبات کی ایسی دیواریں کھڑی کرنا نہیں چاہتا کہ اپنے تمدن میں ایک دوسرے کی کوئی چیز سرے سے لیں ہی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شامی جبّہ پہنا ہے جو یہودیوں کے لباس کا جزو تھا، چنانچہ حدیث میں ہے فتوضأ وعلیہ جبۃ شامیۃ۔ آپؐ نے تنگ آستینوں والا رومی جبّہ بھی پہنا ہے جسے رومن کیتھولک عیسائی پہنتے تھے۔ نوشیروانی قبا بھی آپؐ کے استعمال میں رہی ہے جسے حدیث میں جبۃ طیالسۃ کسروانیۃ کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بُرنُس پہنی ہے جو ایک قسم کی اونچی ٹوپی ہوتی تھی اور عیسائی درویشوں کے لباس کا جزو تھی۔ اس قسم کی متفرق چیزوں کا استعمال تشبہ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ تشبہ یہ ہے کہ آدمی کی پوری وضع قطع کسی دوسری قوم کے مانند ہو اور اس کو دیکھ کر یہ تمیز کرنا مشکل ہو جائے کہ وہ کس قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ بخلاف اس کے جسے ہم "لین دین" کے لفظ سے تعبیر کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کی کوئی اچھی یا مناسبِ حال چیز لے کر اُسے اپنی وضع قطع کا جزو بنا لے، اور اس جزو کے شامل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہونے پر بھی اس کی قومی وضع بحیثیت مجموعی قائم رہے۔[1]

(ترجمان القرآن ۵۸ھ - ۳۹ء)

---

[1] اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کے لیے، مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - لاہور

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

باب ۱۸

اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم [1]

زمانۂ حال میں مسلمانوں کی جماعت کے لیے لفظ "قوم" کا استعمال کثرت کے ساتھ کیا گیا ہے اور عموماً یہی اصطلاح ہماری اجتماعی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے رائج ہو چکی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور بعض حلقوں کی طرف سے اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن اور حدیث میں مسلمانوں کے لیے لفظ "قوم" (یا نیشن کے معنی میں کسی دوسرے لفظ کو) اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ میں مختصراً یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان الفاظ میں اصلی قباحت کیا ہے جس کی وجہ سے اسلام میں ان سے پرہیز کیا گیا، اور وہ دوسرے الفاظ کون سے ہیں جن کو قرآن و حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ محض ایک علمی بحث نہیں ہے، بلکہ اس سے ہمارے اُن بہت سے تصورات کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جن کی بدولت زندگی میں ہمارا رویّہ بنیادی طور پر غلط ہو کر رہ گیا ہے۔

لفظ "قوم" اور اس کا ہم معنی انگریزی لفظ (Nation)، یہ دونوں دراصل

---

[1] یہ مضمون ترجمان القرآن بابت جون ۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ موضوع کی مناسبت سے یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔ مرتب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاہلیت کی اصطلاحیں ہیں۔ اہلِ جاہلیت نے "قومیت" (Nationality) کو کبھی خالص تہذیبی بنیاد (Cultural Basis) پر قائم نہیں کیا، نہ قدیم جاہلیت کے دور میں، اور نہ جدید جاہلیت کے دور میں۔ اُن کے دل و دماغ کے ریشوں میں نسلی اور ذاتی علائق کی محبت کچھ اس طرح پلادی گئی ہے کہ وہ نسلی روابط اور تاریخی روایات کی وابستگی سے قومیت کے تصور کو کبھی پاک نہ کرسکے۔ جس طرح قدیم عرب میں قوم کا لفظ عموماً ایک نسل یا ایک قبیلہ کے لوگوں پر بولا جاتا تھا اُسی طرح آج بھی لفظ "نیشن" کے مفہوم میں مشترک جنسیت (Common Descent) کا تصور لازمی طور پر شامل ہے۔ اور یہ چیز چونکہ بنیادی طور پر اسلامی تصورِ اجتماع کے خلاف ہے، اس وجہ سے قرآن میں لفظ قوم اور اس کے ہم معنی دوسرے عربی الفاظ مثلاً شَعب وغیرہ کو مسلمانوں کی جماعت کے لیے اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصطلاح اُس جماعت کے لیے کیونکر استعمال کی جاسکتی تھی جس کے اجتماع کی اساس میں خون اور خاک اور رنگ اور اس نوع کی دوسری چیزوں کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا، جس کی تالیف و ترکیب محض اصول اور مسلک کی بنیاد پر کی گئی تھی، اور جس کا آغاز ہی ہجرت اور قطعِ نسب اور ترکِ علائقِ مادی سے ہوا تھا۔

قرآن نے جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کے لیے استعمال کیا ہے وہ "حزب" ہے جس کے معنی پارٹی کے ہیں۔ قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اٹھتی ہیں، اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔ کیونکہ ان کو تمام دنیا سے الگ، اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اصول اور مسلک کے معتقد اور پیرو ہیں۔ اور جن سے ان کا اصول و مسلک میں اشتراک نہیں وہ خواہ ان سے قریب ترین مادی رشتے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں، ان کے ساتھ ان کا کوئی میل نہیں ہے۔ قرآن روئے زمین کی اس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں دیکھتا ہے۔ ایک اللہ کی پارٹی (حزب اللہ)، دوسرے شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان)۔ شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اصول و مسلک کے اعتبار سے کتنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہی اختلاف ہوں، قرآن ان سب کو ایک سمجھتا ہے۔ کیونکہ ان کا طریقِ فکر اور طریقِ عمل بہرحال اسلام نہیں ہے اور جزئی اختلافات کے باوجود بہرحال وہ سب شیطان کے اتباع پر متفق ہیں۔ قرآن کہتا ہے :-

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ، اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ

شیطان اُن پر غالب آگیا اور اُس نے خدا سے اُنہیں غافل کر دیا۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ شیطان کی پارٹی آخر کار نامراد ہی رہنے والی ہے۔

برعکس اس کے اللہ کی پارٹی والے خواہ نسل اور وطن اور زبان اور تاریخی روایات کے اعتبار سے باہم کتنے ہی مختلف ہوں، بلکہ چاہے ان کے آباؤ اجداد میں باہم خونی عداوتیں ہی کیوں نہ رہ چکی ہوں، جب وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقِ فکر اور مسلکِ حیات میں متفق ہو گئے تو گویا الٰہی رشتے (حبل اللہ) سے باہم جڑ گئے اور اس نئی پارٹی میں داخل ہوتے ہی ان کے تمام تعلقات حزب الشیطان والوں سے کٹ گئے۔

پارٹی کا یہ اختلاف باپ اور بیٹے تک کا تعلق توڑ دیتا ہے، حتیٰ کہ بیٹا باپ کی وراثت تک نہیں پا سکتا۔ حدیث کے الفاظ ہیں لَا يَتَوَارَثُ اهل ملتين۔ دو ملتوں کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

پارٹی کا یہ اختلاف بیوی کو شوہر سے جدا کر دیتا ہے حتیٰ کہ اختلاف رونما ہوتے ہی دونوں پر ایک دوسرے کی مواصلت حرام ہو جاتی ہے، محض اس لیے کہ دونوں کی زندگی کے راستے جدا ہو چکے۔ قرآن میں ہے۔ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ۔ نہ وہ ان کے لیے حلال، نہ یہ ان کے لیے حلال۔

پارٹی کا یہ اختلاف ایک برادری، ایک خاندان کے آدمیوں میں پورا معاشرتی مقاطعہ کرا دیتا ہے حتیٰ کہ حزب اللہ والے کے لیے خود اپنی نسلی برادری کے اُن لوگوں میں شادی بیاہ کرنا حرام ہو جاتا ہے جو حزب الشیطان سے تعلق رکھتے ہوں۔ قرآن کہتا ہے "مشرک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مومن لونڈی مشرک بیگم سے بہتر ہے، خواہ وہ تمہیں کتنی ہی پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ مومن غلام مشرک آزاد شخص سے بہتر ہے چاہے وہ تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔" (البقرہ۔ ۲۲۱)

پارٹی کا اختلاف نسلی و وطنی قومیت کا تعلق صرف کاٹ ہی نہیں دیتا بلکہ دونوں میں ایک مستقل نزاع قائم کر دیتا ہے جو دائماً قائم رہتی ہے تاوقتیکہ وہ اللہ کی پارٹی کے اصول تسلیم نہ کر لیں۔ قرآن کہتا ہے:۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ إِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ إِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيْمَ لِأَبِيْهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ ۔ (الممتحنہ۔ ۴)

"تمہارے لیے بہترین نمونہ ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے۔ ان لوگوں نے اپنی (نسلی) قوم والوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ ہمارا تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر بندگی کرتے ہو، کوئی واسطہ نہیں۔ ہم تم سے بے تعلق ہو چکے اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت پڑ گئی تاوقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ۔ مگر تمہارے لیے ابراہیم کے اس قول میں نمونہ نہیں ہے کہ اس نے اپنے کافر باپ سے کہا کہ میں تیرے لیے بخشش کی دعا کروں گا۔"

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيْمَ لِأَبِيْهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ إِيَّاهُ ۔ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ أَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ

(توبہ۔ ۱۱۴)

"ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا محض اس وعدے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی بنا پر تھا جو وہ اس سے کر چکا تھا مگر جب اُس پر کھل گیا کہ اس کا باپ خدا کا دشمن ہے تو وہ اس سے دستبردار ہو گیا۔"

پارٹی کا یہ اختلاف ایک خاندان والوں اور قریب ترین رشتہ داروں کے درمیان بھی محبت کا تعلق حرام کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اگر باپ اور بھائی اور بیٹے بھی حزب الشیطان میں شامل ہوں تو حزب اللہ والا اپنی پارٹی سے غداری کرے گا اگر ان سے محبت رکھے۔ قرآن میں ارشاد ہے :-

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ...... اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (المجادلہ ۲۲)

"تم ایسا ہرگز نہ پاؤ گے کہ کوئی جماعت اللہ اور یوم آخر پر ایمان بھی رکھتی ہو اور پھر اللہ اور رسول کے دشمنوں سے دوستی بھی رکھے خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں اور جان رکھو کہ آخرکار اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں۔"

دوسرا لفظ جو پارٹی ہی کے معنی میں قرآن نے مسلمانوں کے لیے استعمال کیا ہے وہ لفظ "امت" ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مستعمل ہوا ہے۔ امت اُس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امر جامع نے مجتمع کیا ہو۔ جن افراد کے درمیان کوئی اصل مشترک ہو ان کو اسی اصل کے لحاظ سے "امت" کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک زمانہ کے لوگ بھی "امت" کہے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو جس اصلِ مشترک کی بنا پر امت کہا گیا ہے وہ نسل یا وطن یا معاشی اغراض نہیں ہیں بلکہ وہ ان کی زندگی کا مشن اور ان کی پارٹی کا اصول اور مسلک ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے :-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔

(آل عمران - ۱۱۰)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تم وہ بہترین امت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

(البقرہ ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی پر نگران رہو اور رسول تم پر نگران ہو۔"

ان آیات پر غور کیجیے "بیچ کی امت" سے مراد یہ ہے کہ "مسلمان" ایک بین الاقوامی جماعت (International Party) کا نام ہے۔ دنیا کی ساری قوموں میں سے ان اشخاص کو چھانٹ کر نکال لایا گیا ہے جو ایک خاص اصول کو ماننے، ایک خاص پروگرام کو عمل میں لانے اور ایک خاص مشن کو انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ لوگ چونکہ ہر قوم میں سے نکلے ہیں اور ایک پارٹی بن جانے کے بعد کسی قوم سے ان کا تعلق نہیں رہا ہے اس لیے یہ بیچ کی امت ہیں۔ لیکن ہر ہر قوم سے تعلق توڑنے کے بعد سب قوموں سے ان کا ایک دوسرا تعلق قائم کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں خدائی فوجدار کے فرائض انجام دیں۔ "تم نوعِ انسانی پر نگران ہو" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ مسلمان خدا کی طرف سے دنیا میں فوجدار مقرر کیا گیا ہے۔ اور "نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے" کا فقرہ صاف کہہ رہا ہے کہ مسلمان کا مشن ایک عالمگیر مشن ہے۔ اس مشن کا خلاصہ یہ ہے کہ "حزب اللہ" کے رہبر سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر و عمل کا جو ضابطہ خدا نے دیا تھا اس کو تمام ذہنی، اخلاقی اور مادی طاقتوں سے کام لے کر دنیا میں نافذ کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں ہر دوسرے طریقہ کو مغلوب کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی بنیاد پر مسلمان ایک امت بنائے گئے ہیں۔

تیسرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت استعمال کیا ہے وہ لفظ "جماعت" ہے۔ اور یہ لفظ بھی "حزب"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی طرح پارٹی کا ہم معنی ہے۔ علیکم بالجماعۃ اور ید اللہ علی الجماعۃ اور ایسی ہی بکثرت احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "قوم" یا "شعب" یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے قصداً احتراز فرمایا اور ان کے بجائے "جماعت" ہی کی اصطلاح استعمال کی۔ آپ نے کبھی یہ نہ فرمایا کہ "ہمیشہ قوم کے ساتھ رہو" یا "قوم پر خدا کا ہاتھ ہے" بلکہ ایسے تمام مواقع پر آپ جماعت ہی کا لفظ استعمال فرماتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے اور یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماع کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے "قوم" کے بجائے جماعت، حزب اور پارٹی ہی کے الفاظ ہی زیادہ مناسب ہیں۔ قوم کا لفظ جن معنوں میں عموماً مستعمل ہوتا ہے ان کے لحاظ سے ایک شخص خواہ وہ کسی مسلک اور کسی اصول کا پیرو ہو، ایک قوم میں شامل رہ سکتا ہے جب کہ وہ اس قوم میں پیدا ہوا ہو اور اپنے نام، طرز زندگی اور معاشرتی تعلقات کے اعتبار سے اس قوم کے ساتھ منسلک ہو۔ لیکن پارٹی، جماعت اور حزب کے الفاظ جن معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں، ان کے لحاظ سے اصول اور مسلک ہی پر پارٹی میں شامل ہونے یا اس سے خارج ہونے کا مدار ہوتا ہے۔ آپ ایک پارٹی کے اصول و مسلک سے ہٹ جانے کے بعد ہرگز اس میں شامل نہیں رہ سکتے، نہ اس کا نام استعمال کر سکتے ہیں، نہ اس کے نمائندے بن سکتے ہیں، نہ اس کے مفاد کے محافظ بن کر نمودار ہو سکتے ہیں اور نہ پارٹی والوں سے آپ کا کسی طور پر تعاون ہو سکتا ہے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ میں پارٹی کے اصول و مسلک سے تو متفق نہیں ہوں۔ لیکن میرے والدین اس پارٹی کے ممبر رہ چکے ہیں، اور میرا نام اس کے ممبروں سے ملتا جلتا ہے، اس لیے مجھ کو بھی ممبروں کے سے حقوق ملنے چاہئیں تو آپ کا یہ استدلال اتنا مضحکہ انگیز ہوگا کہ شاید سننے والوں کو آپ کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگے گا۔ لیکن پارٹی کے تصور کو قوم کے تصور سے بدل ڈالیے۔ اس کے بعد یہ سب حرکات کرنے کی گنجائش نکل آتی ہے۔

اسلام نے اپنی بین الاقوامی پارٹی کے ارکان میں یک جہتی اور ان کی معاشرت میں یکسانی پیدا کرنے کے لیے اور ان کو ایک سوسائٹی بنا دینے کے لیے حکم دیا تھا کہ آپس ہی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں بیاہ شادی کرو۔ اس کے ساتھ ہی ان کی اولاد کے لیے تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام تجویز کیا گیا تھا کہ وہ خود بخود پارٹی کے اصول و مسلک کے پیرو بن کر اُٹھیں اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ افزائشِ نسل سے بھی پارٹی کی قوت بڑھتی رہے۔ یہیں سے اِس پارٹی کے قوم بننے کی ابتدا ہوتی ہے۔ بعد میں مشترک معاشرت، نسلی تعلقات اور تاریخی روایات نے اس قومیت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔

اس حد تک جو کچھ ہوا درست ہوا۔ لیکن رفتہ رفتہ مسلمان اِس حقیقت کو بھولتے چلے گئے کہ وہ دراصل ایک پارٹی ہیں، اور پارٹی ہونے کی حیثیت ہی پر ان کی قومیت کی اساس رکھی گئی ہے۔ یہ بھلاوا بڑھتے بڑھتے اب یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ پارٹی کا تصور قومیت کے تصور میں بالکل ہی گم ہو گیا۔ مسلمان اب صرف ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں۔ اُسی طرح کی قوم جیسی کہ جرمن ایک قوم ہے یا جاپانی ایک قوم ہے یا انگریز ایک قوم ہے۔ وہ بھول گئے ہیں کہ اصل چیز وہ اصول اور مسلک ہے جس پر اسلام نے اُن کو ایک اُمت بنایا تھا، وہ مشن ہے جس کو پورا کرنے کے لیے اس نے اپنے پیرووں کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کیا تھا۔ اِس حقیقت کو فراموش کر کے انہوں نے غیر مسلم قوموں سے "قومیت" کا جاہلی تصور لے لیا ہے۔ یہ ایسی بنیادی غلطی ہے اور اس کے قبیح اثرات اتنے پھیل گئے ہیں کہ احیائے اسلام کے لیے کوئی قدم نہیں اُٹھ سکتا جب تک کہ اِس غلطی کو دُور نہ کر دیا جائے۔

ایک پارٹی کے ارکان میں باہمی محبت، رفاقت اور معاونت جو کچھ بھی ہوتی ہے شخصی یا خاندانی حیثیت سے نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف اس بنا پر ہوتی ہے کہ وہ سب ایک اصول کے معتقد اور ایک مسلک کے پیرو ہوتے ہیں۔ پارٹی کا ایک رُکن اگر جماعتی اصول اور مسلک سے ہٹ کر کوئی کام کرے تو صرف یہی نہیں کہ اس کی مدد کرنا پارٹی والوں کا فرض نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس پارٹی والوں کا فرض یہ ہوتا ہے کہ اس کو ایسے غدارانہ اور باغیانہ طرزِ عمل سے روکیں، نہ مانے تو اس کے خلاف جماعتی ضوابط کے تحت سخت کارروائی کریں، پھر بھی نہ مانے تو جماعت سے نکال باہر کریں۔ ایسی مثالیں بھی دنیا میں ناپید نہیں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں کہ جو شخص پارٹی کے مسلک سے شدید انحراف کرتا ہے اُسے قتل کر دیا جاتا ہے[1]۔ لیکن ذرا مسلمانوں کا حال دیکھیے کہ اپنے آپ کو پارٹی کے بجائے قوم سمجھنے کی وجہ سے یہ کیسی شدید غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ ان میں سے جب کوئی شخص اپنے فائدے کے لیے غیر اسلامی اصولوں پر کوئی کام کرتا ہے تو دوسرے مسلمانوں سے توقع رکھتا ہے کہ اس کی مدد کریں گے۔ اگر مدد نہیں کی جاتی تو شکایت کرتا ہے کہ دیکھو، مسلمان مسلمان کے کام نہیں آتے۔ سفارش کرنے والے ان کی سفارش ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ایک مسلمان بھائی کا بھلا ہوتا ہے، اس کی مدد کرو۔ مدد کرنے والے بھی اگر اس کی مدد کرتے ہیں تو اس فعل کو اسلامی ہمدردی سے موسوم کرتے ہیں۔ اِس سارے معاملہ میں ہر ایک کی زبان پر اسلامی ہمدردی، اسلامی برادری، اسلام کے رشتۂ دینی کا نام بار بار آتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلام کے خلاف عمل کرنے میں خود اسلام ہی کا حوالہ دینا اور اس کے نام سے ہمدردی چاہنا یا ہمدردی کرنا صریح لغو بات ہے۔ جس اسلام کا یہ لوگ نام لیتے ہیں اگر حقیقت میں وہ ان کے اندر زندہ ہو تو جوں ہی ان کے علم میں یہ بات آئے کہ اسلامی جماعت کا کوئی شخص کوئی کام اِسلامی نظریہ کے خلاف کر رہا ہے، یہ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں اور اس سے توبہ کرا کے چھوڑیں۔ کسی کا مدد چاہنا تو درکنار، ایک زندہ اسلامی سوسائٹی میں تو کوئی شخص اصولِ اسلام کی خلاف ورزی کا نام تک نہیں لے سکتا۔ لیکن آپ کی اِس سوسائٹی میں رات دن یہی معاملہ ہو رہا ہے اور اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ آپ کے اندر جاہلی قومیت آ گئی ہے۔ جس چیز کو آپ اسلامی اخوت کہہ رہے ہیں یہ دراصل جاہلی قومیت کا رشتہ ہے جو آپ نے غیر مسلموں سے لیا ہے۔

اسی جاہلیت کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ آپ کے اندر "قومی مفاد" کا ایک عجیب تصور پیدا ہو گیا ہے اور آپ اس کو بے تکلف "اسلامی مفاد" بھی کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ نام نہاد اسلامی مفاد کیا چیز ہے؟ یہ کہ جو لوگ "مسلمان" کہلاتے ہیں ان کا بھلا ہو، ان کے پاس

---

[1] اسلام میں قتل مرتد کی یہی بنا ہے۔ روسی اشتراکی بھی اشتراکیت سے مرتد ہونے کی یہی سزا دیتے ہیں۔ جس چیز کو بھی دنیا کا کوئی گروہ اپنے نقطۂ نظر سے فی الواقع ارتداد سمجھتا ہے اسکی یہی سزا دیتا ہے۔

دولت آئے، ان کی عزت بڑھے، ان کو اقتدار نصیب ہو، اور کسی نہ کسی طرح اُن کی دُنیا بن جائے بلا اس لحاظ کے یہ سب فائدے اسلامی نظریہ اور اسلامی اصول کی پیروی کرتے ہوئے حاصل ہوں یا خلاف ورزی کرتے ہوئے۔ پیدائشی مسلمان یا خاندانی مسلمان کو آپ "مسلمان" کہتے ہیں، چاہے اس کے خیالات اور اس کے طرزِ عمل میں اسلام کی صفت کہیں ڈھونڈے نہ ملتی ہو۔ گویا آپ کے نزدیک مسلمان روح کا نہیں بلکہ جسم کا نام ہے اور صفتِ اسلام سے قطع نظر کر کے بھی ایک شخص کو مسلمان کہا جا سکتا ہے۔ اس غلط تصور کے ساتھ جن جسموں کا اسمِ ذات آپ نے مسلمان رکھ چھوڑا ہے ان کی حکومت کو آپ اسلامی حکومت، ان کی ترقی کو آپ اسلامی ترقی، ان کے فائدے کو آپ اسلامی مفاد قرار دیتے ہیں، خواہ یہ حکومت اور یہ ترقی اور یہ مفاد سراسر اصولِ اسلام کے منافی ہو۔ جس طرح جرمنیت کسی اصول کا نام نہیں، محض ایک قومیت کا نام ہے، اور جس طرح ایک جرمن قوم پرست صرف جرمنوں کی سربلندی چاہتا ہے خواہ کسی طریقے سے ہو، اسی طرح آپ نے بھی "مسلمانیت" کو محض ایک قومیت بنا لیا ہے اور آپ کے مسلمان قوم پرست محض اپنی قوم کی سربلندی چاہتے ہیں خواہ یہ سربلندی اصولاً اور عملاً اسلام کے بالکل برعکس طریقوں کی پیروی کا نتیجہ ہو۔ کیا یہ جاہلیت نہیں ہے؟ کیا درحقیقت آپ اس بات کو بھول نہیں گئے ہیں کہ مسلمان صرف اس بین الاقوامی پارٹی کا نام تھا جو دنیا میں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ایک خاص نظریہ اور ایک عملی پروگرام لے کر اٹھی تھی؟ اس نظریہ اور پروگرام کو الگ کرنے کے بعد محض اپنی شخصی یا اجتماعی حیثیت سے جو لوگ کسی دوسرے نظریہ اور پروگرام پر کام کرتے ہیں ان کے کاموں کو آپ "اسلامی" کیسے کہہ سکتے ہیں؟ کیا آپ نے کبھی سُنا ہے کہ جو شخص سرمایہ داری کے اصول پر کام کرتا ہو اسے اشتراکی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے؟ کیا سرمایہ دار حکومت کو کبھی آپ اشتراکی حکومت کہتے ہیں؟ کیا فاشستی طرزِ ادارہ کو آپ جمہوری طرزِ ادارہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں؟ اگر کوئی شخص اس طرح اصطلاحوں کو بے جا استعمال کرے تو آپ شاید اسے جاہل اور بیوقوف کہنے میں ذرا تامل نہیں کریں گے۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان کی اصطلاح کو بالکل بیجا استعمال کیا جا

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہا ہے اور اس میں کسی کو جاہلیت کی بُو تک محسوس نہیں ہوتی۔

مسلمان کا لفظ خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ "اسم ذات" نہیں بلکہ "اسم صفت" ہی ہو سکتا ہے، اور "پیرو اسلام" کے سوا اس کا کوئی دوسرا مفہوم سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ انسان کی اُس خاص ذہنی، اخلاقی اور عملی صفت کو ظاہر کرتا ہے جس کا نام "اسلام" ہے۔ لہٰذا آپ اس لفظ کو شخصِ مسلمان کے لیے اُس طرح استعمال نہیں کر سکتے جس طرح آپ ہندو یا جاپانی یا چینی کے الفاظ شخص ہندو، شخص جاپانی یا شخص چینی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا سا نام رکھنے والا جو نہی اصولِ اسلام سے ہٹا، اس سے مسلمان ہونے کی حیثیت خود بخود سلب ہو جاتی ہے۔ اب وہ جو کچھ کرتا ہے اپنی شخصی حیثیت میں کرتا ہے۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔ اسی طرح "مسلمان کا مفاد"، "مسلمان کی ترقی"، "مسلمان کی حکومت و ریاست"، "مسلمان کی وزارت"، "مسلمان کی تنظیم" اور ایسے ہی دوسرے الفاظ آپ صرف اُن مواقع پر بول سکتے ہیں جب کہ یہ چیزیں اسلامی نظریہ اور اصول کے مطابق ہوں اور اس مشن کو پورا کرنے سے متعلق ہوں جو اسلام لے کر آیا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ بھی لفظ مسلمان کا استعمال درست نہیں۔ آپ ان کو جس دوسرے نام سے چاہیں موسوم کریں، بہرحال مسلمان کے نام سے موسوم نہیں کر سکتے کیونکہ صفتِ اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان سرے سے کوئی شے ہی نہیں ہے۔ آپ کبھی اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ اشتراکیت سے قطع نظر کر کے کسی شخص یا قوم کا نام اشتراکی ہے اور اس معنی میں کسی مفاد کو اشتراکی مفاد، یا کسی حکومت یا کسی تنظیم کو اشتراکیوں کی حکومت یا تنظیم، یا کسی ترقی کو اشتراکیوں کی ترقی کہا جا سکتا ہے۔ پھر آخر مسلمان کے معاملہ میں آپ نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ اسلام سے قطع نظر کر کے مسلمان کسی شخص یا قوم کا ذاتی نام ہے اور اس کی ہر چیز کو اسلامی کہہ دیا جا سکتا ہے۔

اس غلط فہمی نے بنیادی طور پر اپنی تہذیب، اپنے تمدن اور اپنی تاریخ کے متعلق آپ کے رویّہ کو غلط کر دیا ہے۔ جو بادشاہتیں اور حکومتیں غیر اسلامی اصولوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر قائم ہوئی تھیں آپ اُن کو "اسلامی حکومتیں" کہتے ہیں محض اِس لیے کہ ان کے تخت نشین مسلمان تھے۔ جو تمدّن قرطبہ و بغداد اور دہلی و قاہرہ کے عیش پرست درباروں میں پرورش پایا تھا، آپ اسے "اسلامی تمدّن" کہتے ہیں۔ حالانکہ اِسلام سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ آپ سے جب اسلامی تہذیب کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو آپ جھٹ سے آگرہ کے تاج محل کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں گویا یہ ہے اس تہذیب کا سب سے زیادہ نمایاں نمونہ۔ حالانکہ اسلامی تہذیب سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ میّت کو سپردِ خاک کرنے کے لیے ایکڑوں زمین مستقل طور پر گھیر لی جائے اور اس پر لاکھوں روپے کی عمارت تیار کی جائے۔ آپ جب اسلامی تاریخ کے مفاخر بیان کرنے پر آتے ہیں تو عباسیوں، سلجوقیوں اور مغلوں کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی اِسلامی تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان کارناموں کا بڑا حصّہ آبِ زر سے نہیں بلکہ سیاہ روشنائی سے جرائم کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کا نام "اسلامی تاریخ" رکھ چھوڑا ہے۔ بلکہ آپ اسے "تاریخِ اسلام" بھی کہہ دیتے ہیں، گویا ان بادشاہوں کا نام اسلام ہے۔ آپ بجائے اس کے کہ اسلام کے مشن اور اس کے اصول و نظریات کو سامنے رکھ کر گزشتہ تاریخ کا احتساب کریں، اور پورے انصاف کے ساتھ اسلامی حرکات کو غیر اسلامی حرکات سے ممتاز کر کے دیکھیں اور دکھائیں، اسلامی تاریخ کی خدمت آپ اِس کو سمجھتے ہیں کہ مسلمان حکمرانوں کی حمایت و مدافعت کریں۔ آپ کے زاویۂ نظر میں یہ کجی صرف اس لیے پیدا ہوئی کہ آپ مسلمان کی ہر چیز کو "اسلامی" سمجھتے ہیں اور آپ کا گمان یہ ہے کہ جو شخص مسلمان کہلاتا ہے وہ اگر غیر مسلمانہ طریق پر بھی کام کرے تو اس کے کام کو مسلمان کا کام کہا جا سکتا ہے۔

یہی ٹیڑھا زاویۂ نظر آپ نے اپنی ملّی سیاست میں بھی اختیار کر رکھا ہے۔ اسلام کے اصول و نظریات اور اس کے مشن سے قطع نظر کر کے آپ ایک قوم کو "مسلم قوم" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس قوم کی طرف سے، یا اس کے نام سے، یا اس کے لیے ہر شخص اور ہر گروہ من مانی کارروائیاں کر سکتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر وہ شخص مسلمانوں کا نمائندہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بلکہ ان کا لیڈر بھی بن سکتا ہے جو "مسلمانوں کی قوم" سے تعلق رکھتا ہو۔ خواہ اس غریب کو اسلام کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو۔ آپ ہر اس پارٹی کے ساتھ مل چلنے کو تیار ہو جاتے ہیں جس کی پیروی میں آپ کو کسی نوعیت کا فائدہ نظر آئے، خواہ اس کا مشن اسلام کے مشن سے کتنا ہی مختلف ہو۔ آپ خوش ہو جاتے ہیں جب مسلمانوں کو چار روٹیاں ملنے کا کوئی انتظام ہو جائے خواہ اسلام کی نگاہ میں وہ حرام کی روٹیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ آپ پھولے نہیں سماتے جب کسی جگہ مسلمان آپ کو اقتدار کی کرسی پر بیٹھا نظر آتا ہے، خواہ وہ اس اقتدار کو بالکل اُسی طرح غیر اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہو جس طرح ایک غیر مسلم کر سکتا ہے۔ آپ اکثر اُن چیزوں کا نام اسلامی مفاد رکھتے ہیں جو حقیقتاً غیر اسلامی ہیں، ان اداروں کی حمایت و حفاظت پر اپنا زور صرف کرتے ہیں جو اصولِ اسلام کے بالکل خلاف قائم ہوتے ہیں، اور ان مقاصد کے پیچھے اپنا روپیہ اور اپنی قومی طاقت ضائع کرتے ہیں جو ہرگز اسلامی نہیں ہیں۔ یہ سب نتائج اسی ایک بنیادی غلطی کے ہیں کہ آپ نے اپنے آپ کو محض ایک "قوم" سمجھ لیا ہے اور اس حقیقت کو آپ بھول گئے ہیں کہ دراصل آپ ایک "بین الاقوامی پارٹی" ہیں جس کا کوئی مفاد اور کوئی مقصد اپنی پارٹی کے اصولوں کو دنیا میں حکمراں بنانے کے سوا نہیں ہے۔ جب تک آپ اپنے اندر قوم کے بجائے پارٹی کا تصور پیدا نہ کریں گے اور اس کو ایک زندہ تصور نہ بنائیں گے، زندگی کے کسی معاملہ میں بھی آپ کا رویہ درست نہ ہو گا۔

(ترجمان القرآن۔ صفر ۵۸ھ (اپریل ۳۹ء)

اِستدراک

اس مضمون کی اشاعت کے بعد متعدد اصحاب نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ "اسلامی جماعت" کو "قوم" کے بجائے "پارٹی" کہنے سے اس امر کی گنجائش نکلتی ہے کہ وہ کسی وطنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قومیت کی جزبن کر رہے ۔ جس طرح ایک قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں اور اپنا الگ الگ مسلک رکھنے کے باوجود سب کی سب اُس بڑے مجموعہ میں شامل رہتی ہیں جس کو" قوم " کہا جاتا ہے ، اسی طرح اگر مسلمان ایک پارٹی ہیں تو وہ بھی اپنے وطن کی قوم کا جزبن کر رہ سکتے ہیں ۔

چونکہ جماعت یا پارٹی کے لفظ کو عام طور پر لوگ سیاسی یا پولیٹیکل پارٹی کے معنی میں لیتے ہیں اس وجہ سے وہ غلط فہمی پیدا ہوئی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ۔ لیکن یہ اس لفظ کا اصلی مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک خاص معنی میں بکثرت استعمال ہونے سے پیدا ہو گیا ہے ۔ اصلی مفہوم اس لفظ کا یہ ہے کہ جو لوگ ایک مخصوص عقیدے ، نظریے ، مسلک اور مقصد پر مجتمع ہوں وہ ایک جماعت ہیں ۔ اسی معنی میں قرآن نے " حزب " اور " امت " کے الفاظ استعمال کیے ہیں ، اور اسی معنی میں " جماعت " کا لفظ احادیث اور آثار میں مستعمل ہوا ہے اور یہی مفہوم " پارٹی " کا بھی ہے ۔

اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے جس کے پیشِ نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کا ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے ۔ اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے ، اس لیے وہ اُس قوم کا جزبن کر کام کرسکتی ہے اور کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہو ۔

دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کُلی نظریہ اور جہانی تصوّر (World Idea) لے کر اُٹھتی ہے ۔ جس کے سامنے تمام نوعِ انسانی کے لیے (بلا لحاظ قوم و وطن) ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے ۔ جو پوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک نئے ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے ۔ جس کا نظریہ و مسلک ، عقائد و افکار اور اصولِ اخلاق سے لے کر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے ۔ جو ایک مستقل تہذیب اور ایک مخصوص تمدّن (Civilization) کو وجود میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے ۔ یہ جماعت بھی اگرچہ حقیقت میں ایک جماعت ہی ہوتی ہے ، لیکن یہ اُس قسم کی جماعت نہیں ہوتی جو کسی قوم کا جزبن کر کام کرسکتی ہو ۔ یہ محدود قومیتوں سے بالاتر ہوتی ہے ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کا تو مشن ہی یہ ہوتا ہے کہ اُن نسلی و روایتی تعصبات کو توڑ دے جن پر دنیا میں مختلف قومیتیں بنتی ہیں۔ پھر یہ خود اپنے آپ کو کس طرح ان قومیتوں کے ساتھ وابستہ کر سکتی ہے؟ یہ نسلی و تاریخی قومیتوں کے بجائے ایک عقلی قومیت (Rational Nationality) بناتی ہے۔ جامد قومیتوں کی جگہ ایک نامی قومیت (Expanding Nationality) بناتی ہے۔ یہ خود ایک ایسی قومیت بنتی ہے جو عقلی و تہذیبی وحدت کی بنیاد پر روئے زمین کی پوری آبادی کو اپنے دائرے میں لینے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ لیکن ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے۔ کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار پیدائش پر نہیں ہوتا بلکہ اس نظریہ و مسلک کی پیروی پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ جماعت بنی ہے۔

مسلمان دراصل اسی دوسری قسم کی جماعت کا نام ہے۔ یہ اُس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں ایک قوم میں بنا کرتی ہیں۔ بلکہ یہ اس قسم کی پارٹی ہے جو ایک مستقل نظام تہذیب و تمدن (Civilization) بنانے کے لیے اٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیادوں پر ایک بڑی جہانی قومیت (World Nationality) بنانا چاہتی ہے۔ اس کو "قوم" کہنا اس لحاظ سے یقیناً درست ہوگا کہ یہ اپنے آپ کو دنیا کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ بھی باعتبار جذبات وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی بلکہ اپنے نظریۂ حیات اور فلسفۂ اجتماعی (Social Philosophy) کے مطابق خود اپنی تہذیب و مدنیت کی عمارت الگ بناتی ہے۔ لیکن اس معنی کے لحاظ سے "قوم" ہونے کے باوجود حقیقت میں "جماعت" ہی رہتی ہے۔ کیونکہ محض اتفاقی پیدائش (Mere accident — of birth) کسی شخص کو اس قوم کا ممبر نہیں بنا سکتی جب تک کہ وہ اس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو۔ اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا ہونا اس کے لیے اس امر میں مانع بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اس قوم میں داخل ہو جائے جب کہ وہ اس کے مسلک پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو۔ پس جو کچھ میں نے کہا ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلم قوم کی قومیت اس کے ایک جماعت یا پارٹی ہونے ہی کی بنا پر قائم ہے۔ جماعتی حیثیت جزء اعظم رکھتی ہے اور قومی حیثیت اس کی فرع ہے۔ اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر دیا جائے اور یہ مجرد ایک قوم بن کر رہ جائے تو یہ اس کا تنزل (Degeneration) ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی اجتماعات کی تاریخ میں اسلامی جماعت کی حیثیت بالکل نرالی اور انوکھی واقع ہوئی ہے۔ اسلام سے پہلے بودھ مت اور مسیحیت نے قومیتوں کے حدود کو توڑ کر تمام عالم انسانی کو خطاب کیا اور ایک نظریہ و مسلک کی بنیاد پر عالم گیر برادری بنانے کی کوشش کی۔ مگر ان دونوں مسلکوں کے پاس چند اخلاقی اصولوں کے سوا کوئی ایسا اجتماعی فلسفہ نہ تھا جس کی بنیاد پر یہ تہذیب و تمدن کا کوئی کلی نظام بنا سکتے۔ اس لیے یہ دونوں مسلک کوئی عالمگیر قومیت نہ بنا سکے بلکہ ایک طرح کی برادری (Brotherhood) بنا کر رہ گئے۔ اسلام کے بعد مغرب کی سائنٹفک تہذیب اٹھی، جس نے اپنے خطاب کو بین الاقوامی بنانا چاہا، مگر اوّل یوم پیدائش سے اس پر نیشنلزم کا بھوت سوار ہو گیا لہٰذا یہ بھی عالمگیر قومیت بنانے میں ناکام ہوئی۔ اب مارکسی اشتراکیت آگے بڑھی ہے اور قومیتوں کی حدوں کو توڑ کر جہانی تصور کی بنیاد پر ایک ایسی تہذیب وجود میں لانا چاہتی ہے جو عالمگیر ہو۔ لیکن چونکہ ابھی تک وہ نئی تہذیب پوری طرح وجود میں نہیں آئی ہے جو اس کے پیش نظر ہے، اس لیے ابھی تک مارکسیت بھی ایک عالمگیر قومیت میں تبدیل نہیں ہو سکی ہے[1]۔ اس وقت تک میدان میں تنہا اسلام

---

[1] بلکہ اب خود مارکسیت کے اندر بھی نیشنلزم کے جراثیم پہنچ گئے ہیں۔ اسٹالین اور اس کی جماعت کے طرز عمل میں روسی قوم پرستی کا جذبہ روز بروز نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ روسی اشتراکیت کے لٹریچر میں حتیٰ کہ ۳۶ء کے جدید دستور حکومت میں بھی جگہ جگہ "فادر لینڈ" (وطن آبائی) کا ذکر ملتا ہے۔ مگر اسلام کو دیکھیے یہ ہر جگہ "دارالاسلام" کا لفظ استعمال کرتا ہے نہ کہ فادر یا مادر لینڈ کا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہی ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جو نسلی اور تاریخی قومیتوں کو توڑ کر تہذیبی بنیادوں پر ایک عالمگیر قومیت بناتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ اسلام کی اسپرٹ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک ہی اجتماعی ہیئت کس طرح بیک وقت قوم بھی اور پارٹی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ دنیا کی جتنی قوموں کو جانتے ہیں اُن میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس کے ارکان پیدا نہ ہوتے ہوں بلکہ بنتے ہوں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جو شخص اٹالین پیدا ہوا ہے وہ اٹالین قومیت کا رکن ہے۔ اور جو اٹالین پیدا نہیں ہوا وہ کسی طرح اٹالین نہیں بن سکتا۔ ایسی کسی قومیت سے وہ واقف نہیں ہیں جس کے اندر آدمی اعتقاد اور مسلک کی بنا پر داخل ہوتا ہو، اور اعتقاد و مسلک کے بدل جانے پر اُس سے خارج ہو جاتا ہو۔ ان کے نزدیک یہ صفت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک پارٹی کی ہی ہو سکتی ہے۔ مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہ نرالی پارٹی اپنی الگ تہذیب بناتی ہے، اپنی مستقل قومیت کا ادعا کرتی ہے اور کسی جگہ بھی مقامی قومیت کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے پر راضی نہیں ہوتی تو ان کے لیے یہ معاملہ ایک چیستان بن کر رہ جاتا ہے۔

یہی نافہمی غیر مسلموں کی طرح مسلمانوں کو بھی پیش آ رہی ہے۔ مدتوں سے غیر اسلامی تعلیم و تربیت پاتے رہنے اور غیر اسلامی ماحول میں زندگی گزارنے کی وجہ سے ان کے اندر "تاریخی قومیت" کا جاہلی تصور پیدا ہو گیا ہے۔ یہ اس بات کو بھول گئے ہیں کہ ہماری اصل حیثیت ایک ایسی جماعت کی تھی جو دنیا میں ایک عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے لیے وجود میں آئی تھی، جس کی زندگی کا مقصد اپنے نظریہ کو دنیا میں پھیلانا تھا، جس کا کام دنیا کے غلط اجتماعی نظامات کو توڑ پھوڑ کر اپنے فلسفۂ اجتماعی کی بنیاد پر ایک اجتماعی نظام مرتب کرنا تھا۔ یہ سب کچھ بھول بھال کر انہوں نے اپنے آپ کو بس اسی قسم کی ایک قوم سمجھ لیا ہے جیسی اور بہت سی قومیں موجود ہیں۔ اب ان کی مجلسوں اور انجمنوں میں، ان کی کانفرنسوں اور جمعیتوں میں، ان کے اخباروں اور رسالوں میں، کہیں بھی ان کی اجتماعی زندگی کے اُس مشن کا ذکر نہیں آتا جس کے لیے ان کو دنیا بھر کی قوموں میں سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نکال کر ایک امت بنایا گیا تھا۔ اس مشن کے بجائے اب جو چیز ان کی تمام توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے وہ "مسلمانوں کا مفاد" ہے۔ مسلمانوں سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو مسلمان ماں باپ کی نسل سے پیدا ہوتے ہیں، اور مفاد سے مراد ان نسلی مسلمانوں کا مادّی و سیاسی مفاد ہے یا بدرجۂ آخر اُس کلچر کا تحفظ ہے جو ان کو آبائی ورثہ میں ملی ہے۔ اس مفاد کی حفاظت و ترقی کے لیے جو تدبیر بھی کارگر ہو اس کی طرف یہ دوڑ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح مسولینی ہر اُس طریقہ کو اختیار کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جو اطالویوں کے مفاد کے لیے مناسب ہو۔ کسی اصول اور نظریہ کا نہ وہ پابند ہے نہ یہ۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ اطالویوں کے لیے مفید ہو وہ حق ہے، یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ "مسلمانوں" کے لیے مفید ہو وہ حق ہے۔ یہی چیز ہے جس کو میں مسلمانوں کا تنزل کہتا ہوں۔ اور اسی تنزل کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے مجھے یہ یاد دلانے کی ضرورت پیش آئی ہے کہ تم نسلی اور تاریخی قوموں کی طرح ایک قوم نہیں ہو بلکہ حقیقت میں ایک جماعت ہو، اور تمہاری نجات صرف اس چیز میں ہے کہ اپنے اندر جماعتی احساس (Party Sense) پیدا کرو۔

اس جماعتی احساس کے فقدان یا خود فراموشی کے بُرے نتائج اتنے زیادہ ہیں کہ اُن کا شمار کرنا مشکل ہے۔ یہ اسی بے حسی و خود فراموشی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر رہرو کے پیچھے چلنے اور ہر نظریے اور مسلک کی پیروی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، خواہ وہ اسلام کے نظریے اور اس کے مقاصد اور اس کے اصولوں سے کتنا ہی ہٹا ہوا ہو۔ وہ نیشنلسٹ بھی بنتا ہے۔ کمیونسٹ بھی بن جاتا ہے۔ فاشستی اصول تسلیم کرنے میں بھی اسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ مغرب کے مختلف اجتماعی فلسفوں اور ما بعد الطبیعی افکار اور علمی نظریات میں سے قریب قریب ہر ایک کے پیرو آپ کو مسلمانوں میں مل جائیں گے۔ دنیا کی کوئی سیاسی، اجتماعی یا تمدنی تحریک ایسی نہیں جس کے ساتھ کچھ نہ کچھ مسلمان شریک نہ ہوں۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ سب اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، سمجھتے ہیں اور سمجھے جاتے ہیں۔ ان مختلف راہوں پر بھٹکنے اور دوڑنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"مسلمان" کوئی پیدائشی لقب نہیں ہے بلکہ اسلام کی راہ پر چلنے والے کا اسم صفت ہے۔ جو شخص اسلام کی راہ سے ہٹ کر کسی دوسری راہ پر چلے اس کو مسلمان کہنا اس لفظ کا بالکل غلط استعمال ہے۔ مسلم نیشنلسٹ اور مسلم کمیونسٹ اور اسی قسم کی دوسری اصطلاحیں بالکل اسی طرح کی متناقض اصطلاحیں ہیں جس طرح "کمیونسٹ مہاجن" اور "بدھسٹ قصائی" کی اصطلاحیں متناقض ہیں۔

(ترجمان القرآن۔ ربیع الثانی ۷۵ھ دجون ۴۹ء)

باب ۹

جنگِ آزادی کی نوعیت

اب ہم اپنی آخری تنقیح کی طرف توجہ کرتے ہیں، یعنی یہ کہ وطن پرستوں کی یہ جنگ جس کو "جنگِ آزادی" کہا جا رہا ہے، دراصل ہے کس نوعیت کی جنگ؟ آیا یہ خالص انقلابی جنگ ہے یا نیم انقلابی اور نیم دستوری؟ عام طور پر سیاسی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان اس سوال کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں، حالانکہ یہ سوال فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

انقلابی جنگ کے معنی یہ ہیں کہ حکومت متسلطہ کو بالکلیہ ختم کر دینے کے لیے جنگ کی جائے اور جب تک اس کا تختہ اُلٹ نہ دیا جائے، اس وقت تک ملک کے نظم و نسق سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی عمارت کو بالکل ناپسند کرتے ہوں اور اس میں رہ کر آہستہ آہستہ ترمیم کرنے کے قائل نہ ہوں، بلکہ اس کو قطعی طور پر منہدم کر کے دوسری عمارت بنانا چاہیں۔

نیم انقلابی نیم دستوری جنگ کے معنی یہ ہیں کہ پہلے انقلابی شورش سے حکومت متسلطہ پر دباؤ ڈال کر نظامِ حکومت میں ترمیم و اصلاح کرائی جائے، پھر اصلاح شدہ نظام کو چلا کر اتنی طاقت حاصل کی جائے کہ دوبارہ انقلابی شورش برپا کر کے کچھ مزید اختیارات

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حاصل کیے جاسکیں، اور اس طرح بتدریج پُرانے نظامِ حکومت کو ہٹا کر نیا نظامِ حکومت اس کی جگہ لیتا چلا جائے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ ایک عمارت کو رفتہ رفتہ توڑتے جائیں، اور ساتھ ساتھ دوسری عمارت بناتے بھی جائیں، یہاں تک کہ پُرانی عمارت کا انہدام اور نئی عمارت کی تکمیل دونوں ساتھ ساتھ انجام کو پہنچیں۔

دونوں طرح کی لڑائیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلی قسم کی لڑائی میں دو ایسے فریق بھی مِل کر لڑ سکتے ہیں جو موجودہ نظامِ حکومت کی مخالفت میں تو متفق ہوں مگر اس امر میں اختلاف رکھتے ہوں کہ آئندہ نظامِ حکومت کس نقشہ پر بنایا جائے۔ ان کے لیے یہ ممکن ہے کہ تعمیرِ نو کے سوال کو جنگ کے خاتمہ پر اُٹھا رکھیں۔ وہ اس امر پر اتفاق کر سکتے ہیں کہ آؤ ہم متحدہ قوت کے ساتھ پہلے اس نظامِ حکومت کو ختم کر دیں، اس کے بعد یا تو ہم باہمی مفاہمت سے کوئی بیچ کی راہ نکال لیں گے، یا پھر بدرجۂ آخر قوت آزمائی کر دیکھیں گے، اور ہم میں سے جو فریق بھی زیادہ طاقت ور ہوگا اس کی مرضی کے مطابق نیا نظامِ حکومت بن جائے گا۔ لیکن دوسری قسم کی لڑائی میں آئندہ کے سوال کو بعد پر اُٹھا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ اس میں فریقین کے درمیان پہلے ہی مرحلہ پر یہ تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ تدریجی تخریب کے ساتھ تدریجی تعمیر کس نقشہ پر ہو، اِس لیے کہ یہاں تخریب اور تعمیر دونوں ساتھ ساتھ ہو رہی ہیں اور ساتھ ساتھ تکمیل کو پہنچنے والی ہیں۔ اگر ایک فریق اپنے نقشہ پر تعمیر کرتا رہے، اور دوسرا فریق نقشہ کے سوال کو بعد پر چھوڑ کر اس کا ساتھ دیتا چلا جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک غلامی کے بند کھولنے کے ساتھ دوسری غلامی کے بند میں اپنے آپ کو خود جکڑواتا رہے، اور اپنی آزادی کے سوال کو اس وقت تک کے لیے اُٹھا رکھے جب یہ دوسری غلامی اس پر پُوری طرح مستلط ہو چکی ہو۔ اس قسم کی جنگ اُس عقلمند فریق کے لیے تو ضرور جنگِ آزادی ہی کہی جا سکتی ہے جو آہستہ آہستہ پُرانے آقا کی جگہ لے رہا ہو، مگر اُس بیوقوف فریق کے لیے یہ دراصل جنگِ غلامی ہو گی جو ایک آقا کی جگہ محض دوسرا آقا لانے کے لیے لڑ رہا ہو۔

اگر ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد فی الواقع خالص انقلابی نوعیت کی ہوتی تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم اس کی کوئی پرواہ نہ کرتے کہ مستقبل کا نقشہ جواہر لال اور سوبھاش چندر بوس کیا پیش کرتے ہیں، اور بھولا بھائی اور ستیا مورتی کیا فرماتے ہیں۔ ہم بزدل ہوتے اگر ان باتوں سے ڈر کر جنگ سے منہ موڑ جاتے۔ ہم بہادروں کی طرح ان سے کہتے کہ جو کچھ آپ حضرات کے ارادے ہیں آپ انہی پر قائم رہیں، مگر آیئے، پہلے ہم اور آپ مل کر اس بد اصل عمارت کو توڑ سے اکھاڑ پھینکیں جسے باہر والوں نے ہمارے سروں پر تعمیر کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہم دیکھ لیں گے کہ یہاں ایک قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنتا ہے یا کچھ اور۔ اس صورت میں جو فریق بھی آزادی کامل (بیرون سایہ سلطنت برطانیہ) کے لیے انقلابی لڑائی سے منہ پھیرتا وہی بزدل قرار پاتا۔

مگر یہاں صورتِ حال کچھ دوسری ہے۔ نام آزادی کامل کا لیا جاتا ہے اور منزلِ مقصود ٹھیرائی جاتی ہے کینیڈا اور آسٹریلیا کی سی آزادی (یعنی برٹش کامن ویلتھ کے اندر نہ کہ باہر)۔ کہا جاتا ہے کہ ہماری جنگ انقلابی ہے اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہی نیم انقلابی نیم دستوری جس کا مفہوم اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ہم دوسرے کے بنائے ہوئے دستور کو قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں اور ان کے مسلط کیے ہوئے نظام کو توڑ کر ایسا دستور چاہتے ہیں جو ہندوستان کے باشندے خود اپنے لیے بنائیں، مگر دوسروں نے جو دستور بنا دیا ہے اس کو عملاً قبول کر کے حکومت کے نظم و نسق کا چارج لے لیا جاتا ہے، اور خوب دل لگا کر اسے چلایا جاتا ہے۔ اس طرح ایک عجیب پُر فریب طلسمی جال تیار کر لیا گیا ہے جس کے پھندے دن کی روشنی میں بھی ہمارے بہت سے بھائیوں کو نظر نہیں آتے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس جال کے ایک ایک پھندے کو پوری طرح نمایاں کیا جائے تاکہ مادر زاد اندھوں کے سوا ہر ایک اس کو دیکھ سکے۔

۱۔ سوراج

آزادی کامل، پورن سوراج (Complete Independence) کے الفاظ سن کر ہر ذی ہوش آدمی یہی سمجھے گا کہ اس سے مراد وہ آزادی ہے اور ویسی ہی آزادی ہونی چاہیے جو فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان، روس اور ایسے ہی دوسرے آزاد ملکوں کو حاصل ہے لیکن

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہندوستان میں ان الفاظ کا یہ مفہوم نہیں ہے ۔ یہاں اصرار تو انہی الفاظ کے استعمال پر کیا جاتا ہے لیکن اگر ان کی تعبیر بیرون سایۂ سلطنت برطانیہ کے ساتھ کر دی جائے تو بہاتما گاندھی پران دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ۔ یہاں آج بھی اس سے مراد وہی ہے جس کو آج سے دس سال پہلے نہرو رپورٹ میں مطلوب و مقصود ٹھیرایا گیا تھا یعنی برطانوی دولت مشترکہ میں خود مختار نوآبادیات کی سی حیثیت ۔ مگر اس کو نہرو رپورٹ کی طرح صاف الفاظ میں بیان نہیں کیا جاتا بلکہ زیادہ تر کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اس کی تشریح و تفسیر کی نوبت ہی نہ آنے پائے اور اگر کبھی مجبوراً کچھ کہنا پڑ جاتا ہے تو پھر یونانی زبان میں کلام کیا جاتا ہے تاکہ کوئی نہ سمجھ سکے۔ تاہم انتہائی سعی اخفاء کے باوجود اصل مقاصد کسی نہ کسی طرح زبان پر آ ہی جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی سال ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں مسٹر سوبھاش چندر بوس نے فرمایا :-

"برطانوی سلطنت اس وقت تاریخ کے دوراہوں میں سے ایک دوراہے پر کھڑی ہے ۔ یا تو وہ اسی انجام سے دوچار ہوگی جو دوسری سلطنتوں کا ہو چکا ہے یا اسے اپنے آپ کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرنا ہوگا ...... برطانیہ عظمیٰ کے لیے اپنے نظام سلطنت کے اندرونی تضاد و تباین کو ختم کرنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ سلطنت کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرے ۔"

ابھی حال میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک مضمون یورپ کی صورت حال پر شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں :-

"اگر برطانیہ جمہوریت کا اب بھی معتقد ہے تو اس کے لیے ایک ہی ممکن العمل صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ قیصریت کو جلدی سے جلدی اور بالکلیہ ترک کر کے ہندوستان اور فلسطین وغیرہ میں آزاد جمہوری ادارے قائم کر دے ۔ اس سے برطانیہ کمزور نہ ہوگا بلکہ یہ ممالک اس کے طاقت ور رہن جائیں گے ۔" (نیشنل ہیرالڈ بحوالہ انقلاب مورخہ ۲۸ نومبر ۳۸ء)

اور اسی سال اگست میں جب پنڈت جی پراگ (Prague) تشریف لے گئے تھے تو انہوں نے ایک بیان میں فرمایا کہ :-

" انگلستان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں۔"

(ٹریبیون مورخہ ۱۷ر اگست ۳۸ء)

ٹریبیون ہی کا بیان ہے کہ اس پر انڈیا آفس کی طرف سے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

یہ کانگریس کے ان دو لیڈروں کے اقوال ہیں جو انتہا پسند کانگریسیوں کے صنم سمجھے جاتے ہیں۔ جن میں سے ایک اس وقت کانگریس کا صدر ہے اور دوسرا بھی مسلسل دو سال تک صدر رہ چکا ہے۔ ان کا مطمح نظر بھی اس سے زیادہ اونچا نہیں ہے کہ ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ کے اندر آزاد قوموں کے اس دائرے میں جگہ پا لے جس کا مرکز و محور تاج برطانیہ ہو، جس کا مفاد مرکزی سلطنت کے مفاد سے متحد ہو جائے، جس کی دفاعی، اور لازمی نتیجہ کے طور پر خارجی پالیسی بھی انگلستان کے دامن سے بندھی ہوئی ہو۔ یہی رائے قریب قریب تمام بڑے بڑے کانگریسی رہنماؤں کی ہے اور ان میں کوئی ایک شخص بھی آپ کو ایسا نہیں مل سکتا جو آزادی کامل بول کر آزادی کامل مراد لیتا ہو۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دنیا کی آزاد قوموں کے ساتھ ہمسری و مساوات حاصل کرنے کی خواہش، جو فطرتاً ہر خوددار ہندوستانی میں ہونی چاہیئے، ان کے اندر مفقود ہے۔ بلکہ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایک کھلی اور بے لاگ مسابقت (Open & Fair Competition) کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ یہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ کھلے میدان میں گھوڑا کھڑا ہو، مقابلہ آزادانہ ہو، اور ان کا اس گھوڑے کی پیٹھ پر متمکن ہونا محض ان کی قوت و شہسواری پر موقوف ہو۔ ان کی خواہش تو یہ ہے کہ سرکار سہارا دے کر انہیں گھوڑے پر چڑھا دیں اور جب تک یہ دوسرے امکانی مدعیوں کا خاتمہ نہ کر دیں، یا جب تک وہ ان کی سائیسی قبول کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اس وقت تک سرکار ان کی پشتیبانی کے لیے کھڑے رہیں۔ یہ اور صرف یہی ایک وجہ ہے اس امر کی کہ ان کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بڑے سے بڑے مدعی حریت کو بھی جب اوپر سے کھرچا جاتا ہے تو اندر سے وہ درجۂ نوآبادیات کا پرستار ہی نکلتا ہے۔

پھر جب ان کا اصلی مدعا یہ ہے تو یہ آزادی کامل کا نام کیوں لیتے ہیں؟ لبرل پارٹی کی طرح صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم درجۂ نوآبادیات چاہتے ہیں؟ آخر اس منافقت کی ضرورت کیا ہے کہ زبان پر وہ بات لائی جائے جو دل میں نہیں ہے اور دل میں وہ بات رکھی جائے جو زبان پر لانی مناسب نہیں؟ خصوصاً وہ لوگ جن کے ایمان میں اہنسا سے بھی پہلے ستیہ (صداقت) کا مرتبہ ہے وہ اس جھوٹ کو کیوں جائز رکھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب جو گزشتہ دس سال کی تاریخ پر غور کرنے سے مجھے ملا ہے اسے میں بغیر کسی لگ لپیٹ کے ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ اس منافقت کی وجہ صرف یہ ہے کہ درجۂ نوآبادیات یا اس سے فروتر درجہ کی اصلاحات کا نام لیتے ہی فوراً ملک کی دوسری قوموں کے حقوق کا سوال پیدا ہو جاتا ہے اور اس صورت میں دوہری مشکل پیش آتی ہے۔ اگر ان حقوق کے مسائل کو انصاف کے ساتھ ابتدائی مراحل میں طے کر دیا جائے تو ہندوستان کو "ایک قوم" کا ملک بنا دینے کا خواب پریشان ہو جاتا ہے۔ اور اگر اپنے اصلی ارادے بے نقاب کر دیے جاتے ہیں تو پھر اس دامِ فریب کے سارے بند کھل جاتے ہیں جس میں ہندوستان کی دوسری قوموں کو پھانسنا مقصود ہے، اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ حقیقی "بندگانِ وطن" کی قلیل تعداد کے سوا کوئی ایسا "بندۂ خدا" بھی اس کام میں تعاون کا ہاتھ بڑھائے گا جو اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنا ضروری سمجھتا ہو۔ اس دوگونہ اشکال کا عملی تجربہ ان حضرات کو نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد اچھی طرح ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ دانشمندانہ پالیسی اختیار کی کہ نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کر کے آزادی کامل کا اعلان کر دیا اور اس جھوٹ کے پردے میں اپنے اصل مقصد یعنی تدریجی حصول اقتدار کی کوشش برابر جاری رکھی۔

اگرچہ جاننے والوں کے لیے یہ راز اس وقت بھی راز نہ تھا، اور جن کے پاس کچھ عقل تھی ان کے لیے اس کے بعد بھی بہت سے مواقع آئے جب اس کے چہرے سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نقاب اُٹھا رہا، مثلاً جب سول نافرمانی کے بعد گاندھی جی دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن تشریف لے گئے تھے تو کامل آزادی لینے کے لیے نہ گئے تھے، نہ کامل آزادی دینے کے لیے ان کو بلایا گیا تھا۔ اور جب ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کر دیا گیا تو جدید اسمبلیوں میں داخلہ کامل آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ مگر باوجود اس کے یہ راز ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائیوں کے لیے راز ہی رہا اور آج بھی، جب کہ برطانوی پارلیمنٹ کے دستور کو علانیہ چلایا جا رہا ہے، ان کے لیے یہ بدستور راز ہے۔ چنانچہ وہ متحدہ قومیت کے راگ یہی سمجھ کر الاپ رہے ہیں اور ماس کانٹیکٹ کے جال میں مسلمانوں کو یہی سمجھ کر پھنسوا رہے ہیں کہ کانگریس کی جنگ کامل آزادی کے لیے ہے ــــــ یہ فائدہ ہے اس منافقت کا جو ستیہ اور اہنسا کے معتقدین نے آٹھ نو سال سے اختیار کر رکھی ہے۔

۲۔ "کامل آزادی" کی اصل حقیقت

جب آزادیٔ کامل کا اعلان کیا گیا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا تھا کہ ہماری جنگ انقلابی جنگ ہے، یعنی ہم اس ظالمانہ نظامِ حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں، اور جب تک یہ جڑ سے اکھڑ نہ جائے ہم اس سے کوئی ربط و تعلق رکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بات بظاہر نہایت معقول تھی۔ کیونکہ آزادیٔ کامل صرف انقلابی جنگ ہی سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو یقین آ گیا کہ جب یہ انقلابی جنگ کا علم بلند کر رہے ہیں تو ضرور ان کا مقصد آزادیٔ کامل ہی کا حصول ہوگا۔

اس کے بعد جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہو گیا اور جدید اسمبلیوں کے لیے انتخابات شروع ہوئے تو کہا گیا کہ ہم اسمبلیوں میں جائیں گے مگر اس لیے کہ اس دستور کو اندر سے توڑیں۔

پھر جب اسمبلیوں میں پہنچ گئے تو وزارتیں قبول کرنے یا نہ کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ کچھ مدت تک محبوبانہ ادا کے ساتھ ہاں اور نہیں کا سلسلہ جاری رہا اور آخر کار وزارت کے قلمدان بھی سنبھال لیے گئے۔ اور جب وزارتیں بھی قبول کر لی گئیں تو کہا گیا کہ اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے مقصود ہز میجسٹی کی حکومت کو چلانا نہیں ہے بلکہ دستور جدید کے نفاذ کو عملاً ناممکن بنا دینا ہے۔ چنانچہ عہدے قبول کرتے وقت کانگریس نے جس پالیسی کا اعلان کیا تھا وہ یہ تھی کہ:۔

"دستورِ جدید کا مقابلہ کر کے (یا اس کی مزاحمت کر کے) اسے ختم کر دیا جائے۔ ووٹروں کی بڑی اکثریت کانگریس کی اس پالیسی اور اس کے پروگرام کی توثیق کر چکی ہے۔ عوام الناس خود برطانوی حکومت ہی کے مقرر کیے ہوئے طریقہ پر آئینِ جدید کو نامنظور کرنے کا اعلان کر چکے ہیں، (یعنی انہوں نے کانگریس کے نمائندوں کو بھاری اکثریت سے نمائندہ منتخب کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس دستور کو قبول نہیں کرتے)۔ وہ صاف طور پر اس امر کا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم اپنا دستورِ حکومت خود بنانا چاہتے ہیں...... لہٰذا باشندگانِ ہند کی جانب سے کانگریس اس دستور کو از اوّل تا آخر مسترد کرتی ہے......

کانگریس اپنے تمام ارکان پر واضح کر دینا چاہتی ہے کہ مجالسِ قانون ساز میں ان کا کام اس دستور کا مقابلہ کرنے اور اسے ختم کر دینے کی پالیسی پر مبنی ہونا چاہیے...... اس پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت برطانیہ کے لیے اس دستور کو نافذ کرنا غیر ممکن ہو جائے گا...... اسی پالیسی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی اپنے نمائندوں کو ان صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کی اجازت دیتی ہے جن کی مجالس قانون ساز میں ان کو اکثریت حاصل ہے۔"

لیکن آج عملاً کیا ہو رہا ہے؟ اور عملاً کو بھی چھوڑیئے، وہی زبانیں جو پچھلے سال کے وسط تک دستور کو توڑنے کا اعلان کر رہی تھیں، آج بلا کسی شرم و لحاظ کے کیا کہہ رہی ہیں؟ اس کا جواب ہم سے نہیں خود انہی کی زبانوں سے سن لیجیے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل ہری پورہ کانگریس کے بھرے اجلاس میں فرماتے ہیں:۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"چند مہینہ کی مختصر مدت میں کانگریسی وزارتوں نے اس سے زیادہ کام کیا ہے جتنا برطانوی حکومت ڈیڑھ سو برس میں نہ کر سکی تھی"

(ٹائمز آف انڈیا۔ مورخہ ۲۲ فروری ۳۸ء)

یعنی وہی دستور جو بالکل ناکارہ تھا اس قدر کارآمد بن گیا! اور سنیئے۔ کانگریس کے صدر مسٹر سوباش چندر بوس فرماتے ہیں:۔

"کانگریس محض تخریبی طریق کار پر اعتماد نہیں رکھتی بلکہ اندر رہ کر تعمیری طریق کار کو انسب سمجھتی ہے"

(ٹریبیون مورخہ ۱۵ جون ۳۸ء)

اس سے بھی زیادہ کھل کر مسٹر بوس نے ابھی حال میں آسام کے قضیہ وزارت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس امر کی شکایت کی تھی کہ جب یورپین گروپ ملک معظم کی حکومت چلانے کے لیے ہے تو کانگریس پارٹی کی مخالفت پر کیوں کمربستہ ہو گیا؟ درآنحالیکہ کانگریس پارٹی بھی اس حکومت کو چلانے ہی کے لیے وزارت سنبھال رہی ہے۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اب دستور کو توڑنے کے بجائے اس کو چلانے کی پالیسی علانیہ اختیار کی جا چکی ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ آج ڈیڑھ سال سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی حدود کا پورا پورا لحاظ رکھ کر ہز میجسٹی کی حکومت چلائی جا رہی ہے۔ کانگریسی وزارتیں اگر حقیقت میں دستور کو توڑنا چاہتیں تو ان کے لیے بہت آسان تھا کہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے ایسی تدابیر اختیار کرتیں جن کی اجازت دینے سے گورنر انکار کر دیتے، اور اس پر استعفیٰ دے کر آئینی انقباض (Deadlock) پیدا کر دیتیں۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پوری وفاداری کے ساتھ اس دستور کو اسی طرح چلا رہی ہیں جس طرح کوئی لبرل جماعت چلاتی۔ وہ پوری کوشش کر رہی ہیں کہ گورنروں سے تصادم نہ ہونے پائے خواہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کے وہ بہت سے کام رہ جائیں جن کا انہوں نے وعدہ کر کے عوام سے ووٹ حاصل کیے تھے۔

انہوں نے عوام سے کہا تھا کہ ہم شرح مالگذاری میں ۵۰ فی صدی کمی کر دیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گے۔ مگر کس صوبہ میں تخفیف کی گئی؟ یو پی میں جب اس وعدہ کو یاد دلایا گیا تو وزارت نے صاف جواب دے دیا کہ سابقہ حکومت جتنی تخفیف کر چکی ہے اس سے زیادہ نہیں کی جا سکتی۔[1] اور یہ صرف اس لیے کہ مالگذاری کم کرنے سے بجٹ کا توازن بگڑ جاتا ہے، اور بجٹ کا توازن بگڑنا اُس سامراج کے مفاد کے خلاف ہے جس کی وفادارانہ خدمت انجام دینے کے لیے یہ حضرات ایوانِ وزارت میں تشریف لے گئے ہیں۔

انہوں نے عوام کو سبز باغ دکھایا تھا کہ ہم تمہاری غریبی کا علاج کریں گے۔ مگر کون صداقت پسند آدمی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ احمد آباد، شولاپور، کانپور، بمبئی وغیرہ مقامات پر کانگریسی حکومتوں نے مزدوروں کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ سابقہ حکومت کے ظالمانہ برتاؤ سے کچھ بھی مختلف ہے؟ اور اس پر طرفہ ماجرا یہ ہے کہ غریب مزدور اپنے حقوق تسلیم کرانے کے لیے ہڑتال یا پکٹنگ کرتے ہیں تو وہی گاندھی جی جو ان سب ہتھیاروں کو برٹش گورنمنٹ کے خلاف استعمال کر چکے ہیں، ان پر تشدد کا الزام عائد کرتے ہیں اور بے تکلف فرماتے ہیں کہ "کارخانہ داروں کے خلاف پولیس کی امداد طلب کرنے میں اور کانگریسی حکومت ایسی امداد بہم پہنچانے میں بالکل حق بجانب ہیں"[2] انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم اُن ظالمانہ قوانین کو منسوخ کرائیں گے جو انگریزی حکومت نے نافذ کر رکھے ہیں اور باشندگانِ ہند کو ان کی کھوئی ہوئی مدنی آزادیاں (Civil Liberties) واپس دلائیں گے۔ مگر واقعات کیا ہیں؟ کیا وہ اکثر و بیشتر قوانین بدستور موجود نہیں ہیں جو انگریزی حکومت نے نافذ کیے تھے؟ کیا خود کانگریسی حکومتیں ان قوانین کو استعمال نہیں کر رہی ہیں؟ اور کیا انہیں استعمال کرنے میں ٹھیک انہی دلائل سے کام نہیں لیا جا رہا ہے جو کسی زمانے میں انگریزی حکام پیش کیا کرتے تھے؟ وہی کانگریسی حکام جو کہتے تھے کہ بغاوت ہمارا مذہب ہے، مدراس میں مسٹر باٹلی والا پر بغاوت کا مقدمہ

---

[1] ملاحظہ ہو نیشنل کال مورخہ ۳۱ جولائی ۳۸ء

[2] ہریجن مورخہ ۱۳ اگست ۳۸ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چلاتے ہیں اور بمبئی اور سی پی میں مسٹر باپٹ اور مسٹر جگناتھ پرشاد ورما پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ شولاپور میں "یوم استقلال" کے موقع پر بہت سے آدمیوں کو گرفتار کیا جاتا ہے اور ایک شخص کو سزائے تازیانہ بھی دی جاتی ہے۔ حالانکہ اس سزا کے خلاف کسی زمانہ میں شور قیامت برپا کر دیا جاتا تھا۔ سیاسی ایجی ٹیشن کو روکنے کے لیے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ، گولیاں چلانا اور لاٹھی چارج کرنا آج بھی اسی طرح جاری ہے جس طرح پہلے تھا۔ کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ، جس کے خلاف کانگریس نے سب سے زیادہ شور مچایا تھا، آج کانگریسی حکومتیں بے تکلف اس کو استعمال کر رہی ہیں۔ احمد آباد میں مزدوروں کا سر کچلنے کے لیے اُسے استعمال کیا گیا ہے، اور مدراس میں ہندی کی اشاعت کے خلاف احتجاج کرنے والوں پر آج پوری آزادی کے ساتھ اس سے کام لیا جا رہا ہے۔ وہی سی آئی ڈی جس کی زیادتیوں پر کسی زمانہ میں ماتم کیا جاتا تھا، آج کانگریسی حکومتیں اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف اس کی خدمات سے پورا فائدہ اُٹھا رہی ہیں اور مدراس کا وزیر اعظم صاف کہتا ہے کہ جب ہم نے حکومت کا انتظام ہاتھ میں لیا ہے، (یعنی جب ہم اس حکومت کو توڑنے کے لیے نہیں بلکہ چلانے کے لیے نکلے ہیں)، تو سی آئی ڈی سے کام لیے بغیر چارہ نہیں۔ وہی پریس کی آزادی جس کو باشندوں کے مدنی حقوق کی فہرست میں نمایاں جگہ دی جاتی تھی، آج اس کو خود پامال کیا جا رہا ہے۔ اخبارات کی ضمانتیں بھی ضبط ہوتی ہیں، نئی ضمانتیں بھی مانگی جاتی ہیں اور ایڈیٹروں پر مقدمے بھی چلائے جاتے ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ حکومت بمبئی نے حال ہی میں پولیس کمشنر کو پورے اختیارات عطا کیے ہیں کہ جس شخص کو چاہے بغیر مقدمہ چلائے شہر بدر کر دے۔[1]

---

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ کی رپورٹ مندرجہ ٹائمز آف انڈیا یکم نومبر ۳۷ء نیز ٹریبیون کا مقالہ افتتاحیہ ۷ راگست ۳۸ء اور اخبار سرونٹ آف انڈیا ۱۴ رجولائی ۳۸ء۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

اس پورے کارنامہ کا خلاصہ خود ایک صاف گو کانگریسی مسٹر ایم۔ این۔ رائے کی زبان میں یہ ہے کہ:-

"اسمبلیوں میں جانے کا پروگرام اختیار کرنے کے بعد خصوصاً وزارتیں قبول کرنے کے بعد کانگریسی سیاست تیزی کے ساتھ دستوریت (Constitutionalism) کی طرف ترقی معکوس کر رہی ہے اور برطانوی امپریلزم سے لڑنے کی انقلابی ذہنیت کافور ہو گئی ہے"۔[1]

"کانگریسی وزیروں نے امپریلسٹ اسٹیٹ کی مشین کو اندر سے توڑنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ جو جنگی مورچے (Strategic Positions) ان کے قابو میں آئے ان کو بھی غنیم پر حملہ کرنے کے لیے انہوں نے استعمال نہیں کیا۔ وہ تو کانگریس ہائی کمانڈ کی اجازت سے، بلکہ اس کی ہدایت کے تحت، اسی امپریلسٹ اسٹیٹ کے انتظام کو چلا رہے ہیں جسے توڑنے کا ارادہ ظاہر کر کے وہ گئے تھے"۔

"ایمانداری کا تقاضا یہ ہے کہ اس امر کا صاف صاف اعتراف کر لیا جائے کہ کانگریسی وزارتیں عوام کی معاشی حالت کو درست کرنے کے لیے کچھ بھی نہ کر سکیں اور نہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر وہ آئندہ کچھ کر سکیں گی"۔[2]

کانگریس کے اصل عزائم

اب یہ بات بالکل عیاں ہو چکی ہے کہ کانگریس کی "جنگ آزادی" کوئی انقلابی جنگ نہیں ہے، بلکہ جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں، نیم انقلابی نیم دستوری ہے۔ اس کا نقشۂ جنگ یہ نہیں ہے کہ مسلسل لڑ کر انگریزی سلطنت کے نظام کو توڑ ڈالا

---

[1] ٹریبیون مورخہ یکم مئی ۳۸ء

[2] نیشنل کال مورخہ ۲۱ جولائی ۳۸ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاتے۔ بلکہ نقشۂ جنگ دراصل یہ ہے کہ اسی نظامِ سلطنت کے اندر رہ کر حکمران جماعت پر دباؤ ڈالا جائے اور اس سے بتدریج اختیارات حاصل کر کے اپنا اقتدار جمایا جائے۔ پہلے انہوں نے سول نافرمانی کی تاکہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا دائرہ وسیع ہو اور زیادہ سے زیادہ اختیارات مِل سکیں۔ اس کے نتیجہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء حاصل ہو گیا۔ اب یہ اس ایکٹ کے مطابق صوبوں کی حکومتیں چلا رہے ہیں اور اپنے پروگرام کے مطابق ــــــ جس کی تشریح میں آگے کروں گا ــــــ ملک میں اپنا اقتدار حاصل کر لینا چاہتے ہیں کہ دوبارہ آئینی یا نیم انقلابی ذرائع سے برطانوی سلطنت پر دباؤ ڈال کر مرکزی حکومت میں زیادہ سے زیادہ اختیار حاصل کریں۔ چنانچہ آج کل اسی غرض کے لیے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ جواہر لال یورپ کا چکر لگا رہے ہیں۔ گاندھی جی وائسرائے اور نائب وزیر ہند سے راز کی ملاقاتیں فرما رہے ہیں۔ ستیہ مورتی وفاقی دستور کو قبول کرنے کی شرائط پیش کر رہے ہیں۔ اور سوباش چندر بوس دھمکیوں پر دھمکیاں دیئے چلے جاتے ہیں۔ ایک ہی ٹیم ہے جس کا ہر کھلاڑی اپنا اپنا کام خوبی کے ساتھ کر رہا ہے اور سب کی منزلِ مقصود ایک ہے، یعنی ہندو راج زیر سایہ برطانیہ۔

۴۔ کانگریس اور ہندو مہاسبھا

یہاں پہنچ کر ہندو مہاسبھا اور کانگریس دونوں نظری اور عملی حیثیت سے ایک ہو جاتی ہیں۔ گو ان کے نام اور کام مصلحتاً جُدا ہیں۔

نظری حیثیت سے دونوں میں نہ پہلے فرق تھا نہ آج ہے۔ دونوں وطنی قومیت کی علمبردار ہیں۔ دونوں اس ملک میں "فرقوں" "قوموں" کے امتیازی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ دونوں علیحدگی کے رجحان (Separatist Tendency) کی دشمن ہیں۔ حتیٰ کہ کسی معاملہ میں بھی وہ مسلمانوں کے جُداگانہ مفاد کا نام تک سُننے کی روادار نہیں۔ دونوں کا آخری نصب العین یہ ہے کہ یہاں ایک قومیت پیدا ہو جائے جو تہذیب، تمدن، اخلاق، معاشرت، زبان، ادب، جذبات و حسیات،

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

غرض ہر لحاظ سے بالکل یک رنگ ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کانگریس جہاں "ہندوستانی" کا لفظ بولتی ہے وہاں مہا سبھا "ہندو" کا لفظ استعمال کرتی ہے۔ مگر معنی دونوں کے ایک ہیں۔

عملی حیثیت سے بظاہر چند سال تک دونوں میں فرق رہا۔ مگر اب اس حیثیت سے بھی کوئی فرق باقی نہیں۔ کانگریس یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اس کا نصب العین کامل آزادی ہے اور وہ انقلابی جدوجہد سے اُسے حاصل کرے گی۔ بخلاف اس کے ہندو مہا سبھا کہتی تھی کہ انگریزی سلطنت سے آزاد ہو جانے کے بعد "ایک قوم" بنانے کا عمل دشوار بلکہ محال ہو جائے گا۔ یہ عمل صرف اسی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے کہ انگریزی سلطنت کے زیرِ سایہ رفتہ رفتہ حکومت کے اختیارات پر قبضہ کرو۔ انگریز اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ یہاں جمہوریّت کے انہی تصورات کو درآمد کرے گا جو اس کے اپنے ملک میں صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ وہ چاہے لڑاؤ حکومت کرنے کی پالیسی پر کتنا ہی عمل کرے اور اس غرض کے لیے یہاں مختلف قومیتوں کے وجود سے فائدہ اُٹھانے کی کتنی ہی کوشش کرے، مگر جب کبھی وہ جمہوری ادارات قائم کرنے کا ارادہ کرے گا تو اس کا ذہن کوئی ایسی صورت نہ سوچ سکے گا جو اس کے اپنے ملک کے جمہوری ادارات سے اصولاً مختلف ہو۔ لہٰذا اس پر دباؤ ڈال کر جتنی بھی آئینی اصلاحات ملیں گی وہ سب ہندوؤں ہی کو بوجہ ان کی عددی اکثریت کے سیاسی قوّت و اقتدار کا مالک بنائیں گی۔ اور اس قوّت و اقتدار کو اگر ہوشیاری کے ساتھ استعمال کیا جائے تو معاشی دباؤ، تعلیمی انقلاب اور حاکمانہ نفوذ و اثر سے رفتہ رفتہ ہندوستان کی مختلف قومیتوں کو "ایک قومیت" میں تحلیل کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور صرف یہی ایک صورت ہے جس سے یہاں "ایک قوم" بنائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا جب تک یہ عمل پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے آزادیٔ کامل کا نام بھی نہ لینا چاہیے۔ اِس سے پہلے انگریزی اقتدار کو مٹانے کی کوشش کرنا بھارت ورش کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔

پالیسی کا یہ اختلاف چند سال تک محض ظاہری طور پر کانگریس اور مہا سبھا میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہا۔ مگر آج ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ کانگریس ٹھیک اسی مقام پر آ گئی ہے جہاں ہندو مہاسبھا تھی اور دونوں مل کر سامراج کے تحت ناظم (Administrator) کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ بہار میں، سی پی میں، یو پی میں اور دوسرے صوبوں میں کھلے ہوئے بدنام مہاسبھائی کانگریس کے ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں۔ سی پی کی سابق کانگریسی وزارت میں ایک صاحب مسٹر ویسکھ بھی شامل تھے اور یہ وہ صاحب ہیں جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر ہندو مہاسبھا کی طرف سے ایک وفد لے کر لندن پہنچے تھے۔ سی۔ پی کے موجودہ وزیراعظم مسٹر شکلا وہ صاحب ہیں جنہوں نے سوراج پارٹی کے داخلہ کونسل کے زمانہ میں مالوی جی کے زیر قیادت کانگریس سے الگ انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی تھی اور جنہوں نے بعد میں کمیونل اوارڈ کے متعلق کانگریس کی پالیسی سے اختلاف کر کے اس کو انتخابات کا نزاعی مسئلہ بنایا۔ سی۔ پی اسمبلی کا صدر بھی کھلا ہوا مہاسبھائی ہے۔ کانگریس کی طرف سے اسمبلی کی صدارت بھی کرتا ہے اور مسٹر ساورکر سے مل کر حیدرآباد میں ریاست کے خلاف شورش برپا کرنے کی تدبیریں بھی کرتا ہے۔ بہار میں بھاگلپور اور دوسرے مقامات پر جو فساد ہوئے ان میں کانگریس کے ذمہ دار کارکنوں نے پورا پورا مہاسبھائی پارٹ ادا کیا۔ یو۔ پی میں دوری اور ٹانڈہ وغیرہ کے فسادات اُن مہاسبھائیوں نے برپا کرائے جو کانگریس کے عہدوں پر فائز تھے۔ اس قسم کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "قومیت متحدہ" کی خدمت کرنے والے حضرات کس آسانی کے ساتھ کانگریس سے مہاسبھا میں اور مہاسبھا سے کانگریس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

ان دونوں جماعتوں میں اب اگر کوئی فرق باقی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک ہندو مہاسبھا ہے اور دوسری انڈین نیشنل کانگریس۔ مہاسبھا صریح طور پر ہندوؤں کی جماعت ہے۔ کوئی مسلمان اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دے سکتی ہے۔ نہ مسلمانوں میں جا کر پاس کا ٹکٹ کر سکتی ہے۔ نہ کسی صوبہ کی حکومت پارٹی سسٹم کی بنیاد پر قائم کر سکتی ہے۔ نہ کہیں خالص ہندو

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں :

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وزارت قائم کرکے یہ دعوٰے کر سکتی ہے کہ "یہ قومی وزارت" ہے۔ نہ مسلمانوں سے یہ کہہ سکتی ہے کہ ہمارے عہد نامہ (Pledge) پر دستخط کرو تب تمہیں وزارت میں شریک کیا جائے گا۔ نہ اس کو مولانا ابوالکلام کی خدمات حاصل ہو سکتی ہیں کہ مسلمانوں کی جماعت میں سے کمزور کیرکٹر کے آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائیں اور اس کے آستانہ پر جھکا دیں۔ نہ اسے ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات میسر آ سکتی ہیں کہ واردھا اسکیم تیار کریں۔ نہ وہ خان عبدالغفار خاں سے کام لے سکتی ہے کہ ۹۵ فی صدی اکثریت رکھنے والے سرحدی صوبہ کو فیڈریشن کے قیام سے پہلے ہی اس وحدانی طرز حکومت (Unitary form of Government) کا تابع بنا دیں جس کے مرکز پر ہندوؤں کا کامل اقتدار ہو۔ نہ وہ بہت سے علماء کرام کی خدمات حاصل کر سکتی ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی اقتدار کے زور سے اس کے دائرے میں کھینچ کھینچ کر لائیں اور فتوی دیں کہ اس جماعت میں شریک ہونا وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ نہ اس کے لیے یہ دعوی کرنا ممکن ہے کہ اس کے لیڈر مسلمانوں کے بھی ویسے ہی نمائندے ہیں جیسے ہندوؤں کے ہیں اور جو کچھ وہ بولتے ہیں "پوری قوم" کی طرف سے بولتے ہیں۔ نہ وہ اسلامی اکثریت رکھنے والے صوبوں میں وزارتوں کی توڑ پھوڑ اس خوبی کے ساتھ کرا سکتی ہے کہ وزارت مسلمانوں ہی پر مشتمل رہے مگر اشاروں پر ہائی کمانڈ کے رقص کیا کرے۔ نہ اقلیت ہی کے صوبوں میں اس کو مسلمانوں پر یہ اقتدار حاصل ہو سکتا ہے کہ ان کے منتخب کردہ نمائندوں میں سے جسے چاہے وزارت پر سرفراز کرے اور جس کو چاہے کان سے پکڑ کر نکال دے۔ یہ سب کام کانگریس ہی سے بن آ سکتے ہیں کیونکہ وہ ہندو مہاسبھا نہیں، انڈین نیشنل کانگریس ہے۔

اس فرق کے ساتھ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ جو کام کانگریس کر سکتی ہے وہ مہاسبھا نہیں کر سکتی۔ اور جو کام مہاسبھا کر سکتی ہے وہ کانگریس نہیں کر سکتی۔ کانگریس پیش قدمی کرنے والی فوج ہے جو آگے بڑھ کر غنیم کے علاقہ پر قبضہ کرتی ہے اور مہاسبھا وہ محافظ دستہ ہے جو عقب میں رہتا ہے تاکہ آگے کی فوج

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو حسبِ ضرورت مدد پہنچاتا رہے۔ کانگریس پر جب کبھی مشترک وطنی جماعت ہونے کی حیثیت سے دباؤ پڑتا ہے، ہندو مہاسبھا فوراً آگے بڑھ کر پشت کو سہارا دیتی ہے، اور مسٹر ساورکر، ڈاکٹر مونجے، بھائی پرمانند وغیرہ شور مچانے لگتے ہیں کہ ہندوؤں کے نمائندے ہم ہیں، گاندھی اور جواہر لال نہیں ہیں۔ ایسے نازک موقع پر اگر عقب میں محفوظ فوج موجود نہ ہو تو مقدمۃ الجیش کو اپنی "قوم پرستی" کا دعویٰ نباہنا مشکل ہو جائے۔ اس فوج کی مدد کام بھی نکال دیتی ہے اور بات بھی بنی رہتی ہے۔

۴۔ کانگریس اور انگریزی حکومت

ہندو مہاسبھا کے ساتھ برٹش گورنمنٹ سے بھی کانگریس کا مفاد اسی نقطہ پر متحد ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں شخصی اغراض رکھنے والی ایک قلیل جماعت کے سوا کوئی آپ کو ایسا نہ ملے گا جو برطانوی اقتدار سے کسی قسم کی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو۔ مسلمان نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام مشرقی ممالک میں اس قیصریت کا فوری، کلی اور قطعی زوال چاہتا ہے۔ برعکس اس کے ہندوؤں کی قومی پالیسی یہ ہے کہ انگریزی حکومت سے اچھی شرائط پر مصالحت کی جائے۔ یعنی ہندو لڑتا ہے نفع پر سودا کرنے کے لیے اور مسلمان لڑتا ہے معاملہ ختم کرنے کے لیے۔ مزید برآں مسلمان انگریزوں کے کسی کام کا نہیں کہ اس کی جیب خالی ہے۔ اور ہندو ایک سرمایہ دار قوم ہے جس کے ساتھ تجارتی معاملہ بھی کیا جا سکتا ہے اور آڑے وقت میں مالی مدد بھی اس سے مل سکتی ہے۔ لہٰذا جس طرح فلسطین میں ایک سرمایہ دار قوم کا تعاون حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو بھینٹ چڑھانا مفید تھا، اسی طرح ہندوستان میں بھی ایک دوسری قوم کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ان کو بھینٹ چڑھانا فائدے سے خالی نہیں۔ اسی بنا پر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان سوداگرانہ معاملہ ہو رہا ہے۔ صوبوں کی حکومت میں تو سودا پٹ چکا ہے، اور اب جو کچھ کھینچ تان ہو رہی ہے صرف مرکزی اقتدار کے معاملہ میں ہے۔ یہ کچھ زیادہ مانگتے ہیں اور وہ کچھ کم پر راضی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی چونکہ معاملہ نیا نیا ہے، اس لیے کچھ بدگمانیاں بھی ہیں۔ وہ ابھی پوری طرح اعتماد بھی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تحفظات کی رسی انہوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے ان کے گلے میں باندھ رکھی ہے۔ جب یہ سلطنت برطانیہ کی محفوظ چراگاہ کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ پوری طاقت کے ساتھ رسی کھینچ لیتے ہیں اور جب یہ کھلے میدان میں اقلیتوں کی کھیتی چرنے کے لیے بڑھتے ہیں، تو وہ اطمینان کے ساتھ رسی ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں۔ دستور میں اقلیتوں کی حفاظت کے لیے گورنروں کو جو مخصوص اختیارات دیے گئے ہیں ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اگر کبھی خدانخواستہ کانگریسیوں نے اس سازش، گاندھی جی کے بقول "شریف آدمیوں کی سی قرارداد" (Gentlement's AGREEMENT) سے جو ان کے اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان ہو چکی ہے، انحراف کیا اور تاج کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اس وقت تاج کے بجائے اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت کا بہانہ کر کے ان کی گوشمالی کی جا سکے۔

۵۔ کانگریس کا اصل مقصد

اس ملی بھگت میں برطانیہ کا مفاد پوری طرح محفوظ ہے۔ سول سروس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ یورپین باشندوں کے حقوق سے بھی تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ سرکار کے مالی مفاد کو بھی نہیں چھیڑا جا سکتا۔ مختصر یہ ہے کہ جن جن چیزوں سے انگریزی سلطنت کی اغراض کا تعلق ہے دستورِ حکومت میں ان سب کی حفاظت اچھی طرح کر لی گئی ہے، اور کانگریسی وزارتیں جو اس دستور کو عملاً قبول کر کے حکومت کا نظم و نسق چلا رہی ہیں، ان حدود میں نہ قدم رکھ سکتی ہیں اور نہ قدم رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر کسی ایسے پروگرام پر تو عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے جس پر حقیقت میں "جنگِ آزادی" کا اطلاق ہو سکے۔ کیونکہ "جنگِ آزادی" کو خواہ آپ کتنا ہی نیچے گرا لائیں، بہر حال اس کا منشا یہ تو ہونا چاہیے کہ جہاں باشندگان ہند کا مفاد سرکار برطانیہ کے مفاد سے متصادم ہوتا ہو وہاں سرکار کے مفاد کو گرایا جائے اور ہندوستان کی "جنتا" کے مفاد کو ابھارا جائے۔ مگر جس دستور میں سرکار کا مفاد محفوظ ہے اس کی پابندی قبول کرنے کے بعد ایسا کرنا غیر ممکن ہے۔ پھر یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ جنگ آزادی کا دعویٰ لے کر اٹھنے والی جماعت اس دستور کو کس لیے قبول کر رہی ہے اور کیوں اسے چلانے پر مُصر ہے؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس سوال کی تحقیق اگر آپ واقعات کی روشنی میں کریں گے تو یہ حقیقت آفتاب کی طرح نمایاں ہو جائے گی کہ اس وقت کانگریس کے سامنے کوئی پروگرام اس کے سوا نہیں ہے کہ پراونشل اٹانومی سے جو اختیارات بھی حاصل ہو سکیں، انہیں اسے کر جدید ہندوستانی قومیت کی تخلیق میں استعمال کیا جائے، اور اس ملک کی مختلف قلیل التعداد قوموں میں اپنے امتیازی وجود کو برقرار رکھنے کی جس قدر طاقت باقی ہے اسے حکومت کے زور سے ختم کر دیا جائے۔ نئے دستور کی بنیادی کمزوریوں کے باوجود اس کے پراونشل اٹانومی والے حصہ کو اسی بنا پر قبول کیا گیا ہے کہ اس کا یہی ایک پہلو روشن ہے اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے فیڈریشن والے حصہ کو بھی بازاماں عشوہ وناز آخرکار اسی روشن پہلو کی خاطر قبول کیا جائے گا تاکہ مسلم اکثریت والے صوبوں کو مرکزی اقتدار کے واسطہ سے قابو میں لایا جائے۔

اس پروگرام کی ایک ایک دفعہ کو میں الگ الگ بیان کروں گا اور تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا کہ اس پر کس طرح عمل ہو رہا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

۴۔ پارٹی سسٹم اور اس کے اثرات

دستورِ جدید کے مطابق حکومت کے نظام کو چلانے کے لیے کانگریس نے پارٹی سسٹم اختیار کیا ہے۔ پارٹی سسٹم کی مختصر تشریح یہ ہے کہ جس مجلسِ قانون ساز میں کسی پارٹی کی اکثریت ہو وہاں خالصتہً اسی کی حکومت قائم ہو جائے اور وہ دوسری جماعتوں کو من حیث الجماعت حکومت میں شریک نہ کرے۔ یہ حکمران جماعت اپنی اکثریت کے زور پر جو قانون چاہے گی بنائے گی اور جس تجویز یا مسودہ قانون کو چاہے گی مسترد کر دے گی۔ پھر اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کرنا بھی اسی پارٹی کے اختیار میں ہو گا۔ کیونکہ حکومت کا نظم ونسق کلیتہً اسی کی وزارت کے ہاتھ میں رہے گا۔ جو لوگ اس کے اندر داخل ہوں وہ صرف اسی صورت سے داخل ہو سکتے ہیں کہ پارٹی کے عہد نامہ پر دستخط کریں اور اس کے ڈسپلن میں جکڑ دیئے جائیں۔ پھر جب وہ اس طرح پارٹی ڈسپلن کے تابع فرمان ہو جائیں گے تو ان کے لیے یہ ناممکن ہو گا کہ کسی ایسی تجویز یا مسودہ قانون کی مخالفت کریں جو پارٹی کی طرف سے پیش ہو، یا خود اپنی طرف سے کوئی ایسی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چیز پیش کریں جس کی اجازت پارٹی نے نہ دی ہو، یا حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کریں۔ ان کو ہر حال میں پارٹی کی فرمانبرداری کرنی ہوگی اور اگر آزادیٔ رائے استعمال کرنا چاہیں گے تو انہیں پارٹی سے باہر نکل جانا ہوگا۔ نیز وہ پارٹی کے اندر رہ کر بھی اس کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کرا سکتے جب تک کہ وہ پارٹی میں اکثریت کو اپنا حامی نہ بنا لیں۔

حکومت کا یہ سسٹم کانگریس نے ان تمام صوبوں میں اختیار کیا ہے جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عملاً قانون سازی اور تنفیذ قانون، دونوں سے بیدخل کر دیا گیا ہے۔ اگر مسلمان کانگریس پارٹی سے الگ رہیں تو وہ اپنی اقلیت کی وجہ سے نہ اپنے مفاد کے لیے کوئی قانون بنوا سکتے ہیں، نہ اپنے مفاد کے خلاف کسی قانون کی منظوری کو روک سکتے ہیں اور نہ قوانین کو نافذ کرنے والی مشین یعنی وزارت میں ان کا کوئی پُرزہ شریک ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ اس پارٹی میں شامل ہو جائیں تو انہیں پارٹی ڈسپلن کے طوق و سلاسل پہننے پڑتے ہیں اور اس کا کوئی فائدہ اس کے سوا حاصل نہیں ہوتا کہ باہر رہتے ہوئے زبان کی جو آزادی وہ استعمال کر سکتے تھے وہ بھی چھن جاتی ہے۔ رہا اندر سے پارٹی کی پالیسی پر اثر ڈالنا، تو اقلیت ہونے کی وجہ سے یہاں بھی اس کا کوئی موقع نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اڑیسہ اور سی پی میں تو علانیہ وہ حکومت کے نظم و نسق سے بے دخل ہیں، اور جن صوبوں میں ایک یا دو مسلمان وزیر بنائے گئے ہیں وہاں دراصل مسلمانوں کی جماعت کو بحیثیت جماعت کے حکومت میں حصّہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ ان کے ایک فرد یا دو افراد کو انفرادی حیثیت سے نوکر رکھا گیا ہے تاکہ محض اس بات کی نمائش کی جا سکے کہ وزارت میں مسلمان بھی شریک ہیں۔

آئینی حیثیت سے دیکھیے تو ان ملازموں کی حیثیت ذمّہ دار وزراء کی نہیں ہے، کیونکہ ذمہ دار وزیر وہ ہوتا ہے جس کو اپنی جماعت کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو، اور انہیں اپنی ذات کے سوا کسی کا اعتماد حاصل نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں ان مسلمان ووٹروں کا اعتماد حاصل ہے جنہوں نے ان کو منتخب کیا۔ مگر کل مسلمان ووٹروں میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان کے ووٹروں کا تناسب شاید پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ وزارت میں، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اکثریت کی نہیں بلکہ اقلیت کی حکومت ہے، اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، ان کی اکثریت حکمران ہے کیونکہ ہندو وزیر ہندو ووٹروں کی اکثریت کا اعتماد رکھتے ہیں۔

عملی حیثیت سے دیکھئے تو یہ بالکل بے زور ہیں۔ ان کی پشت پر کوئی طاقت نہیں جس کے بل بوتہ پر یہ کوئی بات زور کے ساتھ کہہ سکیں، بخلاف اس کے ہندو وزراء کی پشت پر مجلس قانون ساز کی اکثریت کا زور ہے۔ یہ بچارے بعض صوبوں میں تو کانگریس پارٹی کے اندر بالکل اکیلے ہیں، اور بعض جگہ صرف دو چار مسلمان ان کی مدد پر موجود ہیں بھی تو وہ غریب خود پارٹی ڈسپلن میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اس طرح ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان وزراء کی حیثیت ایک نوکر سے زیادہ نہیں ہے اور اس حیثیت کا کھلا ہوا مظاہرہ سی پی کے سابق مسلمان وزیر مسٹر شریف کے معاملہ میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے جب ایک مسلمان قیدی کو اپنے اختیارات سے کام لے کر رہا کیا اور اس پر مہاسبھائی ہندوؤں نے شور مچایا تو کانگریس ہائی کمانڈ نے کان پکڑ کر ان کو ایوانِ وزارت سے باہر کر دیا، درآنحالیکہ باقاعدہ تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ انہوں نے نہ تو اس معاملہ میں مذہبی عصبیت سے کام لیا، نہ کسی قسم کی بدنیاتی کی اور نہ جائز قانونی حدود سے تجاوز کیا[1]۔ اس کے برعکس ابھی حال میں مسٹر شریف کے جانشین ہندو وزیر نے اسی قسم کے ایک مجرم کو جسے ہائی کورٹ سے سزا ہو چکی تھی، اپنے اختیارات سے کام لے کر رہا کر دیا اور اس سے کوئی باز پرس نہ ہوئی۔ مسٹر شکلا نے وزارت کا قلمدان سنبھالتے ہی فسادات جبل پور کے ملزموں کو جنہیں سشن سپرد کیا جا چکا تھا، بلا کسی قانونی وجہ کے رہا کر دیا اور اس پر بھی کسی تحقیقات کی ضرورت نہ سمجھی گئی[2]۔ پنڈت شکلا سے پہلے ڈاکٹر

---

[1] ملاحظہ ہو مدینہ ۲۵ جون ۳۸ء

[2] ٹریبیون مورخہ ۱۹ جون ۳۸ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کھرے کی وزارت پر خود کانگریسیوں نے رشوت، خیانت، غبن اور اپنے متعلقین کو ملازمتوں میں بھرنے کے سخت الزامات عائد کیے تھے، مگر ان کے معاملہ کو گاندھی جی نے یہ کہہ کر رفع دفع کر دیا تھا کہ:۔

"کانگریس بہرحال انسانوں پر مشتمل ہے اور وہ خوبیوں اور برائیوں دونوں میں اس قوم کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں جس کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں"[1]

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر کھرے کے ساتھ بعد میں بہت سخت معاملہ کیا گیا، مگر کس وقت؟ جب کہ انہوں نے کھلم کھلا خدایانِ کانگریس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ مسٹر شریف کی طرح اگر وہ گھٹنے ٹیک کر ناک رگڑتے تو انہیں کبھی وزارت سے نہ نکالا جاتا۔

۷۔ جُداگانہ انتخاب

پارٹی گورنمنٹ اور پارٹی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ جُداگانہ انتخاب ہے، کیونکہ اس کی بدولت مسلمانوں کی آواز نمایاں طور پر بلند ہو سکتی ہے، اور اگر مسلمان نمائندوں کی بڑی اکثریت کانگریس پارٹی سے الگ رہے تو پارٹی گورنمنٹ قائم کرنے کی صورت میں کانگریس کی مہاسبھائیت بالکل بے پردہ ہونے لگتی ہے۔

مخلوط انتخاب کا مطالبہ اسی بدنمائی کو دُور کرنے کے لیے بار بار پیش کیا جاتا تھا۔ مگر انگریز ابھی اس "شریف آدمیوں کی سی قرارداد" پر پوری طرح اعتماد کرنے کے لیے تیار نہ تھا جو اس کے اور کانگریس کے درمیان زیر تجویز تھی۔ اس لیے مسلمانوں کے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ اپنے مفاد کی خاطر اس نے جُداگانہ انتخاب کو برقرار رکھا۔

اس میں ناکام ہونے کے بعد دوسری تدبیر یہ نکالی گئی کہ جُداگانہ انتخاب میں اندر سے نقب لگائی جائے۔ یعنی کانگریس براہِ راست مسلمان حلقہ ہائے انتخاب میں

---

[1] ملاحظہ ہو مدینہ ۱۳ر اگست ۳۸ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جاکر مسلمان ووٹروں کو ہموار کرے، اور ایسے مسلمانوں کو خود مسلمان رائے دہندگان ہی سے منتخب کرالائے جو پارٹی ڈسپلن اور ڈکٹیٹرشپ کو بخوشی قبول کرنے والے ہوں، اپنے صوبہ کی کانگریس پارٹی کے اور پھر اس پر ہائی کمانڈ کے غلام بن کر رہیں، جس طرح یہ آقا انہیں بٹھائیں اسی طرح بیٹھیں اور جس طرح اُٹھائیں اسی طرح اُٹھ جائیں، جس قسم کے قوانین ہندو اکثریت پاس کرنا چاہے انہیں مسلمانوں کی طرف سے بے چون وچرا منظور کریں، اور مسلمانوں کی قومیت کو فنا کرنے کے لیے جو تدبیریں کوئی مہاتما یا کوئی پنڈت سوچے ان کو مسلمانوں میں نافذ کرنے کی زحمت خود مہاتما یا پنڈت صاحب کو نہ اٹھانی پڑے بلکہ یہ خدمت کوئی خاں صاحب یا کوئی سید صاحب انجام دیں۔ اس کا نہایت پاکیزہ نام مسلم ماس کانٹیکٹ رکھا گیا ہے۔

اگر یہ چیز کامیاب ہو جائے اور مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب اس حد تک کانگریس پارٹی کے زیر اثر آجائیں کہ وہ اپنے مطلب کے جس مسلمان کو چاہے ان سے منتخب کرالے، اور جو مسلمان اس کے مقابلہ پر کھڑا ہو وہ ناکام ہو جائے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کبھی کسی موقع پر مسلمانوں کے مفاد کی شدید پامالی دیکھ کر کانگریس پارٹی کے کسی مسلمان رکن کو غیرت بھی آگئی اور وہ رکنیت سے مستعفی بھی ہو گیا تو کانگریس پارٹی خود اس کے حلقہ انتخاب میں اس کو شکست دے گی اور اُس سے کم تر غیرت رکھنے والے کسی مسلمان کو مسلمان ووٹروں سے منتخب کرالائے گی تاکہ وہ اس سے زیادہ بے پروائی کے ساتھ اپنی قوم کے مفاد کو پامال کرائے۔ ماس کانٹیکٹ اس انتہائی نتیجہ تک پہنچ کر رہے گا، اگر اس کی تائید میں ہمارے علمائے کرام چند سال اسی سرگرمی کے ساتھ کوشش کرتے رہے۔ پھر جب تیر ہاتھ سے نکل چکے گا، تو اس کو واپس لانے کے لیے بخاری شریف کا ختم پڑھا یا جائے گا۔

۸۔ مسلمانوں کی حالت

اس کے بعد مسلم اکثریت کے صوبوں کا سوال باقی رہ جاتا ہے، سو اُن کے لیے اجتماعی ماہی گیری (Mass Contact) اور انفرادی صید افگنی (Individual Contact)

مزید کتب پڑھنے کے لیے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دونوں سے آج کل کام لیا جا رہا ہے۔

مسلمان دس پندرہ برس سے جس خوابِ غفلت میں مبتلا تھے اس کے بدترین نتائج آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ جدید آئین کے نافذ ہونے پر جب اسمبلیوں کے لیے انتخابات ہوئے تو یہاں کوئی ایسی منظم پارٹی نہ تھی جو قوم کے مفاد کو سامنے رکھ کر کام کرتی اور مسلمان رائے دہندوں کو صحیح سیاسی تعلیم دے کر ایسے نمائندے منتخب کراتی جو بے غرض، مخلص اور ایک مرکزی نظام کے مطیع ہوتے۔ جگہ جگہ مختلف جماعتوں نے محض شخصی اغراض اور طائفہ بندی کی بنیاد پر الیکشن لڑے۔ جس شخص کو کسی قسم کا اثر حاصل تھا وہ ایک پارٹی بنا کر کھڑا ہو گیا اور دوسری پارٹی کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوا۔ قومی پروگرام اور قومی پالیسی نہ اِس کے پاس نہ اُس کے پاس۔ ہر ایک کے سامنے وزارتیں، مناصب اور عزت و جاہ۔ اس طرح یہ لوگ اسمبلیوں میں پہنچے اور ان کی بدولت مسلمانوں کی اکثریت ایک بندھے ہوئے جتھے کا زور رکھنے کے بجائے بہت سی ٹکڑیوں میں بٹ کر بے زور ہو گئی۔ ان چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ ایک اچھی خاصی تعداد میں انڈی پنڈنٹ ارکان بھی منتخب ہو کر پہنچے۔ انڈی پنڈنٹ کے معنی عام فہم زبان میں مرغِ بادنما کے ہیں جو کوئی قومی مقصد یا قومی پروگرام لے کر نہیں جاتا بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ شخصی حیثیت سے قسمت آزمائی کرے اور جدھر کامیابی کا موقع دیکھے ادھر چلا جائے۔ عام مسلمان ووٹر ایسے جاہل کندۂ ناتراش تھے کہ انہوں نے نہ ان مرغانِ بادنما سے پوچھا اور نہ ان جتھے بند لیڈروں سے کہ آپ حضرات کے پاس پروگرام کیا ہے؟ آپ کس لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ آپ کس کیرکٹر کے لوگ ہیں؟ آپ نے پہلے ہماری قوم کے لیے کیا کیا اور اب کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ یہاں کسی کے ذہن میں یہ تھا ہی نہیں کہ اسمبلی کیا بلا ہوتی ہے، جدید دستور کیا ہے، اور ان اسمبلیوں میں جو کچھ ہوگا اس کے کیا اثرات ہماری زندگی پر پڑیں گے۔ یہاں تو دیکھنے والوں نے بس یہ دیکھا کہ اسمبلی کی کرسی عزت کی کرسی ہے تو کیوں نہ ہمارے قبیلہ کا آدمی اس کرسی پر پہنچے، چاہے وہ خرِ نا منتفس ہی کیوں نہ ہو۔ غرض اس قومی حماقت کا، جو نہایت وسیع پیمانہ پر ملک کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کئی صوبوں میں کی گئی، یہ انجام ہوا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں کوئی منظم جماعت ایسی پیدا ہی نہ ہو سکی جو ہندو اکثریت کے صوبوں کی طرح مضبوط ہاتھوں سے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کرتی اور ایک بنیان مرصوص بن کر جم جاتی۔

ادھر کانگریس جب ہندو اکثریت کے صوبوں میں ٹھوس بنیاد پر وزارتیں قائم کر چکی تو اس نے مسلم اکثریت والے صوبوں کی طرف دیکھا اور ان کی کمزوری کو بھانپ لیا۔ ان کے لیے اس نے جو پروگرام مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ان صوبوں میں جو پارٹیاں برسرِ پیکار ہیں ان کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا جائے، ان کے افراد کی نفسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جائے، ان میں جو ضعیف ترین کیرکٹر کے لوگ ہوں انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور چھانٹ چھانٹ کر آلۂ کار بنایا جائے، اور اس طرح مسلمانوں کی جمعیت میں سے جتنے آدمی توڑے جا سکیں انہیں کانگریسی اقلیت کے چھوٹے مگر منظم بلاک کے ساتھ ملا کر ایسی وزارتیں قائم کرادی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابعِ فرمان ہوں، یا اگر اس میں کامیابی نہ ہو سکے تو کم از کم وہاں وزارت کو اس قدر کمزور اور اس قدر بے اثر بنا دیا جائے کہ وہ ادھ موئی ہو کر رہ جائے۔ ماتم کا مقام ہے کہ کانگریس کی طرف سے اس جلیل القدر خدمت کا بیڑا ہماری ہی قوم کے ایک شخص نے اٹھایا، اور اس سے بھی بڑھ کر ماتم کا مقام یہ ہے کہ یہ شخص وہ تھا جس سے ہم شیخ احمد مجدد سرہندی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی جانشینی کے متوقع تھے۔ جو کبھی اسلامی نظامِ جماعت کا سب سے بڑا داعی تھا، جس نے برسوں مسلمانوں کو وحدت و مرکزیت کی دعوت دی، جس کی زبان سے ہم کبھی ایاکم والتفرقۃ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب[1] پر درسِ موعظت سنا کرتے تھے، جو کسی زمانہ میں ہم کو تلقین کیا کرتا تھا کہ جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظامِ جماعت

---

[1] اثر سیدنا علی رضی اللہ عنہ:۔ تفرقہ سے بچو کیونکہ بچھڑا ہوا آدمی شیطان کا حصّہ ہے جس طرح بچھڑی ہوئی بکری بھیڑیئے کا حصّہ ہوتی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے۔" مسلمانوں کی بدقسمتی کہ یاد آخر وہ امت کے پراگندہ سروں سے چوسر کھیلنے نکلا اور اس نے تمام ہندوستان کو اپنی قوم کا یہ تماشا دکھایا کہ اس قوم کے چیدہ اور سر برآوردہ لوگ بھی کتنے ذلیل، کتنے بودے کیرکٹر کے لوگ ہیں، کس آسانی کے ساتھ ان کو آپس میں لڑایا جا سکتا ہے، اور کس بے شرمی کے ساتھ یہ لیڈر وزارت کے پیچھے اس پارٹی سے اُس پارٹی میں اور اُس سے اِس میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو شدتِ الم سے بے اختیارانہ قلم سے نکل گیا۔ میں بتانا یہ چاہتا تھا کہ اس وقت مسلم اکثریت کے صوبوں میں کانگریس کی پالیسی کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں بھی ان کو خود مختارانہ حکومت نہ کرنے دی جائے بلکہ ان کے مناقشات سے فائدہ اٹھا کر یا پاس کا ٹیکٹ کے ذریعہ سے ان کے بڑے حصہ کو شدھ کر کے وہاں ایسی وزارتیں قائم کرائی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابع فرمان ہوں۔ اگر اس مقصد میں کانگریس کامیاب ہو گئی (اور کیوں نہ ہو گی جب کہ آج ہماری قوم اٹھارھویں صدی سے بھی زیادہ فیاضی کے ساتھ اپنے فاتح خود مہیا کر رہی ہے) تو یوں سمجھیے کہ یہ فیڈریشن سے بھی پہلے ایک ایسے فیڈریشن کا قیام ہو گا جس میں مرکزی اقتدار تمام تر ہندو اکثریت کے ہاتھ میں رہے گا۔ اور یہ مرکز برطانوی حکومت کے تجویز کردہ وفاقی مرکز سے بدرجہا زیادہ سخت و ہمہ گیر ہو گا۔ اس میں بات بات پر وزراء کے کان کھینچے جائیں گے، ذرا ذرا سے قصور پر ان کو پکڑ بلایا جائے گا، ان پر تحقیقاتی کمیشن بٹھا دیے جائیں گے، اور اگر انہوں نے کچھ مقابلہ کی ہمت کی تو لات مار کر ان کو ایوانِ وزارت سے باہر کر دیا جائے گا۔ جب وزارتیں مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں اس درجہ بے بس ہوں اور پھر اقتدار ہندو اکثریت کے ہاتھ میں ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں پراونشل اٹانومی حرفِ غلط کی طرح مٹ گئی اور ہندو اس جگہ بھی مسلمانوں پر حکمران ہو گئے جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔

صوبہ سرحد کی مثال اس نتیجہ کی توضیح کے لیے بالکل کافی ہے۔ ہم دیکھ چکے

ہیں کہ جہاں ۵۰ فی صدی مسلم اکثریت ہے وہاں بھی حکومت کی پالیسی اور وزارت کی گردن کانگریس ہائی کمانڈ کے ہاتھ میں ہے۔ وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کو بھی اور صوبہ سرحد میں نافذ کرنے کے لیے پشاور سے ماہرین تعلیم دہلی اور وردھا بھیجے جاتے ہیں۔[1] سرحد کا وزیر اعظم ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے وعدہ کرتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام کی ریڈریں مسلمان بچوں کو بھی نہ پڑھائی جائیں گی، اور ایک ہندو کے معاوضہ میں قبائل کے دس مسلمانوں کو پکڑا جائے گا۔ اس نیاز مندی پر بھی یہ حال ہے کہ وزیر اعظم صاحب اگر ایک مسلمان ملزم کو الزام سے بری پا کر ملازمت پر بحال کر دیتے ہیں تو ہندو مہا سبھا ان کے خلاف شور محشر برپا کر دیتی ہے اور کانگرس ہائی کمان اس کی باز پرس کے لیے وزیر صاحب کو بمبئی کھینچ بلاتی ہے۔ اس کے بعد بھی جو شخص نہ دیکھ سکے کہ یہ سڑک سیدھی ہندو راج کو جا رہی ہے، اس کے حق میں بس یہی دعا کرنی چاہیے کہ خدا اسے آنکھیں دے دے۔

یہ تمام تفصیلات جو نمبر ۹، ۱۰ اور ۱۱ میں بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید دستوری اصلاحات سے فائدہ اٹھانے کا جو طریقہ کانگریس نے اختیار کیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس دستور کی بدولت جس قدر سیاسی طاقت برطانوی قیصریت سے ہندوستان کی طرف منتقل ہو وہ کلی طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں آجائے۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں تو وہ براہ راست ہندو اکثریت کے محکوم ہوں گے، اور جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں ان کی حکومت کو کانگریس ہائی کمانڈ کا مطیع بنا لیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ کوشش برابر جاری رکھی جائے گی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا علیحدہ سیاسی وجود ختم ہو جائے، نہ ان کی اپنی کوئی علیحدہ سیاسی پالیسی رہے اور نہ مستقل سیاسی قیادت، بلکہ وہ اس بڑے سیاسی مجموعہ (Body Politics) میں گم ہو کر رہ جائیں جس میں اصولی

---

[1] نیشنل کال مورخہ ۲۸ جون ۱۹۳۸ء و ٹریبیون مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۳۸ء

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جمہوریت کی بنا پر ہندو عنصر کی حیثیت بہر حال غالب اور فیصلہ کُن رہے گی۔ اس مجموعہ میں گم ہو جانے کے بعد جو مجموعہ کے لیڈر ہوں گے وہی مسلمانوں کے بھی لیڈر ہوں گے، اور ظاہر ہے کہ اکثریت کی طاقت ہندوؤں ہی کو لیڈر بنائے گی۔ اسی طرح مسلمانوں کی سیاسی پالیسی بھی وہی ہو گی جو مجموعہ کی ہو گی، اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جہاں سر شماری پر ہر بات کا فیصلہ ہو وہاں ہر پالیسی کا ہندو پالیسی ہونا لازم ہے۔

ہندوستان کے آئندہ سیاسی ارتقاء کو ہندو لیڈر جس راستہ پر لے جانا اور جس منزل تک پہنچانا چاہتے ہیں اس کا پہلا اور ضروری مرحلہ یہی ہے۔ اگر اس مرحلہ پر وہ سیاسی ارتقاء کا رُخ اپنی منزل کی طرف پھیرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر لازماً آئندہ جو قدم بھی اُٹھے گا اسی منزل کی طرف اُٹھے گا، کیونکہ اس مرحلہ پر اُن کی کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ گھوڑے کی باگیں پوری طرح اُن کے ہاتھ میں آ جائیں۔ اسی لیے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۳۵ء کو نامنظور کرنے کا بار بار اعلان کرنے پر بھی انہوں نے اسے منظور کر لیا۔

اب ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی بار بار پلٹ کر ہم سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ اس ڈیڑھ سال کی حکومت میں کانگریسی وزارتوں نے کہاں اور کیا مسلمانوں پر ظلم کیا؟ ایک صاحب نے تو اخبارات میں چیلنج بھی چھپوایا تھا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ بالفرض انہوں نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ مان لیجیے کہ بڑی ہی اچھی حکومت کی۔ مگر یہ کون سی عقلمندی ہے کہ اپنی باگیں بالکل دوسروں کے ہاتھوں میں دے دی جائیں؟ سوال اُن اشخاص کا نہیں ہے جو آج بر سرِ اقتدار ہیں، بلکہ سوال ادارہ کی نوعیت کا ہے۔ جس ادارہ کی نوعیت یہ ہو کہ ایک قوم دوسری قوم پر حکمران بن جائے اور ایک قوم دوسری قوم کے قبضۂ تصرف و اختیار میں چلی جائے، ظلم ایسے ادارہ کی عین فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ آج بالقوہ ہے تو کل بالفعل ہو گا اور بالفعل ہوئے بغیر نہ رہے گا۔

۹۔ وردھا اسکیم

مختلف قوموں اور تہذیبوں کے مُلک میں اگر سیاسی اقتدار کسی ایک قوم کے ہاتھ میں مرتکز ہو جائے اور پھر وہ تمام ملک کے لیے ایک قومیت اور ایک تہذیب و تمدن کی

تشکیل کرنا چاہے تو یہ فطری اور لازمی بات ہے کہ اس قومیت اور اس تہذیب وتمدن کی شکل اُسی برسرِ اقتدار قوم کے منشا کے مطابق ہو گی۔ دوسری قوموں کی تہذیب اور قومیت کا رنگ اس میں پھیکا ہوگا اور پھیکا ہوتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ بالکل تحلیل ہو جائے گا۔ نامساوی آمیزش میں انصاف ممکن ہی نہیں، خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ انصاف کی کوشش کی جائے۔ کانگریس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد مستقبل کے ہندوستان کی تشکیل جس ڈھنگ پر شروع کی ہے، اس کو آنکھیں کھول کر دیکھیے۔ آپ کو خود نظر آجائے گا کہ اس نقشہ میں مسلمانوں کی قومیت اور تہذیب کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

سب سے پہلے وردھا اسکیم کو لیجیے[1]۔ یہ اسکیم مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بنائی گئی ہے[2]۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکیم کے مطابق عام باشندگانِ ہند کے بچوں کو سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لازمی جبری تعلیم دی جائے گی[3]۔ لازمی اور جبری تعلیم کا مفہوم خوب ذہن نشین کر لیجیے۔ جس علاقے میں حکومت کے زور سے یہ اسکیم نافذ ہو گی وہاں کا کوئی باشندہ نہ تو اپنی اولاد کو اس نظامِ تعلیم میں شریک ہونے سے روک سکے گا اور نہ کوئی دوسرا نظامِ تعلیمی ایسا موجود ہو گا جس میں وہ انہیں داخل کر سکے۔ آدمی کا کیرکٹر جس عمر میں بنتا ہے یا یوں کہیے کہ جس عمر میں آدمیت کی تشکیل ہوتی ہے وہ بیشتر بلکہ تمام تر اس اسکیم کے قبض و تصرف میں آجاتی ہے۔ انگریزوں کا بنایا ہوا نظامِ تعلیم لازمی و جبری نہ تھا۔ اس میں جبر کا عنصر صرف اس حیثیت سے تھا کہ جو اس کے دائرے سے باہر رہے گا وہ مادی کامیابی کے مواقع سے محروم رہے گا۔ تاہم اس میں آدمی کے لیے یہ اختیار باقی تھا کہ

---

[1] میرے پیشِ نظر وہ اردو رپورٹ بھی ہے جو رسالہ جامعہ مورخہ جنوری ۳۸ء میں شائع ہوئی ہے اور وہ انگریزی پمفلٹ بھی ہے جو (Basic National Education) کے نام سے ہندستانی تعلیمی سنگھ نے شائع کیا ہے۔ مگر میں زیادہ تر اردو رپورٹ ہی کا حوالہ دوں گا۔

[2] جامعہ جنوری ۳۸ء صفحہ ۱۱۱

[3] جامعہ جنوری ۳۸ء صفحہ ۱۳۱

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اگر اس محرومی کو قبول کرلے تو اس نظامِ تعلیمی سے آزاد رہ کر جس نظام کو پسند کرے اس میں شریک ہو جائے۔ لیکن وردھا اسکیم میں سرے سے یہ اختیار باقی نہیں رہتا۔ یہاں آدمی مجبور ہے کہ اپنی آئندہ نسل کو اسی نوعیت کا آدمی بنانے کے لیے سپرد کردے جس نوعیت کے آدمی یہ اسکیم بنانا چاہتی ہے۔

اچھا اب دیکھیے کہ یہ اسکیم کس نوعیت کے آدمی بنانا چاہتی ہے؟ وہ بنیادی تصورات جن پر یہ پوری اسکیم تیار کی گئی ہے حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ ہندوستان کی پوری آبادی کو "ایک قوم" فرض کیا گیا ہے۔ اسکیم میں جگہ جگہ ہم کو اس قسم کے فقرے ملتے ہیں:۔

"مہاتما گاندھی نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے کہ تعلیم کی ایک ایسی راہ نکالیں گے جو ہندوستانیوں کی طبیعت کے مناسب ہو اور جس سے ساری قوم کی تعلیم کا کام کم سے کم وقت میں چل نکلے۔ (صفحہ ۱۱)

"اسے تعلیم کی اچھی پالیسی اور قوم کی ترقی کی ضروری تدبیر سمجھ کر قبول کرلینا چاہیے۔" (صفحہ ۱۴)

"اور قوم کے بچوں کو اس تعلیمی اسکیم کا مقصد اور اس کی قیمت سمجھا سکے۔" (صفحہ ۱۲۰)

اسکیم کا نام ہی "بنیادی قومی تعلیم" کی اسکیم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نظامِ تعلیم کی بنیاد ہی قومیتوں کی نفی پر رکھی گئی ہے۔ اس میں کسی کی جداگانہ قومیت کا رنگ نہیں آسکتا۔ یہ بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ ہماری آئندہ نسل کے ذہن سے اس تخیل کو نکال دے کہ "ہندوستانی" کے سوا ان کی اور قومیت بھی ہے۔

۲۔ شدھ ہندوستانی بن جانے کے بعد سب سے پہلی اور سب سے اہم صفت جس سے بچہ کو متصف ہونا چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ ایک اچھا کاروباری آدمی ہو۔ ہر علم اس کو اس لیے سکھایا جائے اور وہ اسی لیے اس کو سیکھے کہ روٹی پیدا کرنے میں اس سے مدد ملے۔ اسکیم کے واضعین کی نگاہ میں آدمیت اور کمانے کی قابلیت دونوں مترادف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

المعنی الفاظ ہیں۔ پوری اسکیم پر تعلیم کا مادی نقطۂ نظر اس قدر غالب ہے کہ اس کے زیرِ اثر جو نسل پرورش پائے گی وہ مادہ پرست بن کر اٹھے گی اور خوردن برائے زیستن کے بجائے زیستن برائے خوردن کی معتقد ہوگی۔ ایک طرف تعلیم دینے والی حکومت رعایا کے بچوں کی تعلیم کا انتظام اس ذہنیت کے ساتھ کرے گی کہ اس پر تعلیمی مصارف کا کم سے کم بار پڑے اور بچے کسی ایسی دستکاری کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کریں جس کی آمدنی سے اُستادوں کی تنخواہیں اور مدرسے کا خرچ نکل آئے۔ دوسری طرف پورا نظامِ تعلیم بچے میں یہ ذہنیت پیدا کرے گا کہ کمانا کھانا اس کی زندگی کا اوّلین بلکہ شاید ایک ہی مقصد ہے۔ تعلیم کا مرکز و محور کسی نہ کسی بنیادی دستکاری، مثلاً زراعت یا پارچہ بافی یا لکڑی یا دھات کے کام کو رکھا گیا ہے اور پورے تعلیمی کورس کو اسی محور کے گرد گھمایا گیا ہے۔ اس میں دو بنیادی مقصد واضعین کے پیشِ نظر ہیں۔ ایک یہ کہ:-

"ہر سمجھدار شہری کو سماج کا کام کرنے والا رکن ہونا چاہیے"

(صفحہ ۱۱۴)

"یہ اسکیم اس لیے بنائی گئی ہے کہ ملک میں کام کرنے والے پیدا ہوں جو ہر مفید کام کو چاہے وہ میلا اٹھانے ہی کا کام ہو عزت کے قابل سمجھیں، جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہوں" (صفحہ ۱۱۴)

"ہمارا مقصد عالم فاضل پیدا کرنا نہیں بلکہ ہوشیار سمجھدار پڑھے لکھے دستکار پیدا کرنا ہے جو صحیح خیالات اور سماج کی خدمت کا شوق رکھتے ہوں" (صفحہ ۱۲۰)

دوسرا مقصد یہ ہے کہ:-

"مہاتما جی نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ حکومت کو اس کا ذمہ لینا

ے صفحہ ۱۱۲

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاہیئے کہ اپنے ہونے والے شہریوں کے کام کی پیداوار کو اس بھاؤ (بازار کے بھاؤ) پر خریدلے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم اس رائے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں۔ اس آمدنی سے جو مالی فائدہ ہوگا اسے چھوڑ کر یوں بھی ہمارا خیال ہے کہ سکھانے والوں اور سیکھنے والوں کے کام کی اچھائی کو جانچنے اور ناپنے کا کوئی پیمانہ ہونا چاہیئے۔" (صفحہ ۱۱۵)

یعنی تعلیم کی کامیابی کو جانچنے اور ناپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ طلبہ نے کتنا کمایا اور استادوں نے ان کو کتنا کمانے کے قابل بنایا۔ اسی مادی نقطۂ نظر کی بنا پر ساڑھے پانچ گھنٹہ کے اوقات تعلیمی میں سے ۳ گھنٹہ ۲۰ منٹ دستکاری کے لیے وقف کیے گئے ہیں، اور باقی اوقات میں جو دوسرے علوم پڑھائے جائیں گے ان میں بھی بنیادی مقصد یہ رکھا گیا ہے کہ وہ کاروباری زندگی میں مددگار ہوں۔ اس پوری اسکیم پر نظر ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کے پیشِ نظر ایک صنعتی سماج **(Industrial Society)** پیدا کرنا ہے جس کے افراد زیادہ تر مادی قدروں ہی سے واقف ہوں، مادی پیمانے ہی سے زندگی کی ہر چیز کو ناپیں، اور بلند تر اخلاقی و روحانی چیزوں کی قدر کرنے کا ذوق ہی ان میں پرورش نہ پا سکے۔ ایسی سماج کے ماحول میں ہر روحانی تہذیب خود ٹھٹھر کر رہ جائے گی[1]۔

۳- اس مادہ پرست سوسائٹی میں "شہریت" **(Citizenship)** کا جو

---

[1] کوئی شخص ہماری تنقید سے یہ نہ سمجھے کہ ہم کسب رزق کو غیر اہم اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس کی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں۔ مگر ہمارے اور وردھا اسکیم کے نقطۂ نظر میں وہی فرق ہے جو خوردن برائے زیستن اور زیستن برائے خوردن میں ہے۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ روٹی مقصود بالذات ہو اور دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقصد حیات اس سے بلند تر ہو اور روٹی اس مقصد کی خاطر زندہ رہنے کے لیے ہو۔ پہلا نقطۂ نظر اگر کسی سوسائٹی پر چھا جائے تو اسلام اس میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مطمحِ نظر (Ideal) اختیار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:۔

"یہ ہونے والی بات ہے کہ ہندوستان کی سماجی زندگی، سیاست، معیشت اور تہذیب میں جمہوریت کا رنگ دن بدن بڑھتا جائے گا۔" (صفحہ ۱۱۳)

جمہوریت کے رنگ کا مفہوم شاید عام لوگ نہ سمجھ سکیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے اپنی معاشرت اور تہذیب میں آئندہ یک رنگ ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ دراصل اسکیم کے واضعین کا نصب العین ہے جس کو انہوں نے شدتِ یقین کی بنا پر پیشین گوئی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نصب العین کو سامنے رکھ کر وہ آئندہ نسل کو ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس سے:۔

"بچے کو عام طور پر انسانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے لوگوں کی ترقی سے دلچسپی ہو جائے۔"

"اس کے دل میں وطن کی محبت ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت کرے اور آنے والے زمانے کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ یہ ایک ایسی سماج کا گھر ہوگا جس کی نیو مل کر کام کرنے اور محبت، سچائی اور نیاؤ پر رکھی جائے گی۔"

"سب کے دل میں ایک دوسرے کے مذہب کی اور دنیا کے سب مذہبوں کی عزت پیدا ہو جائے...... دنیا کے مذہبوں کے اصول بتا کر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں۔"

"قومی تہواروں اور قومی ہفتے کا منانا ہر اسکول کی زندگی میں ایک خاص چیز ہونا چاہیے۔" (صفحہ ۱۱۰/۱۱۹)

ان سب بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکیم بنانے والوں کے پیشِ نظر مختلف مذاہب کے پیروؤں کو ملا کر ایک سماج، یعنی ایک ہیئتِ اجتماعی، یا ایک سوسائٹی بنانا ہے۔ اس لیے وہ ہر مذہب کی ایسی تعلیمات کو بچوں کے ذہن سے خارج رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان میں مذہبی انفرادیت پیدا کرتی ہوں۔ تمام مذاہب کے متعلق یہ نظریہ ان کے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ ان میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے سوطن پرستی ان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ مذہبیت کی بنیاد پر الگ الگ رہنے کے بجائے وطنیت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں۔ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت ان کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان سب میں قومی افتخار کے جذبات ایک ہی سرچشمے یعنی ہندوستان کے زمانہ ماضی سے پیدا ہوں اور بیرونِ ہند کی تاریخ سے ان کے جذبات کا تعلق منقطع ہو جائے۔

وطنی قومیت بنانے کے لیے یہ چار عنصر ضروری ہیں، اور ہر وہ تعلیمی اسکیم جس کا بنیادی مقصد وطنی قومیت بنانا ہو اس پر مجبور ہے کہ مذاہب کے ایسے علم کو آئندہ نسل کے دل و دماغ سے دُور رکھے جو ان کے فرق اور اختلافات کو نمایاں کرنے والا ہو۔ اگر وہ شرک اور توحید، خدا پرستی اور بُت پرستی، پیغمبر اور اوتار، عقیدۂ آخرت اور عقیدۂ تناسخ کے فرق کو بچوں کے ذہن میں اُتر جانے دے گی تو اپنے عین مقصد کو نقصان پہنچائے گی۔ اس کے لیے تو ناگزیر ہے کہ بچوں کے مذہبی علم کو صرف اس قسم کی باتوں تک محدود رکھے کہ دیکھو جھوٹ بولنا سب مذہبوں میں گناہ ہے، چوری سب میں حرام ہے، زنا کو سب منع کرتے ہیں، وغیر ذلک۔ اسی طرح وہ اس پر بھی مجبور ہے کہ جن قوموں کو افتخار کے جذبات بیرونِ ہند کی تاریخ سے ملتے ہیں ان کے اس سرچشمے کو بند کرے، اور پراچین سمے کے ہندوستان سے ان کا تعلق جوڑے۔ اگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عمرؓ اور علیؓ، اور خالد رضی اللہ عنہم سے وابستگی کو یُوں ہی قائم رہنے دے گی تو اپنے اساسی مقصد پر خود ضرب لگائے گی۔ اس چیز کو مہاتما گاندھی نے صاف طور پر بیان کر دیا ہے۔

"ہم نے وَردھا کی تعلیمی اسکیم سے مذاہب کی تعلیم کو باہر رکھا ہے۔ اس لیے کہ آج مذاہب جس طرح پڑھائے جاتے ہیں اور جس طرح ان پر عمل کیا جاتا ہے وہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے اختلافات پیدا کرنے کا موجب ہے۔ مگر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ جو سچائیاں تمام مذاہب میں مشترک ہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ سکھائی جا سکتی ہیں اور سکھائی جانی چاہئیں لہ۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد کی تعلیم دینا اس پالیسی اور اس مقصد ہی کے خلاف ہے جس کے لیے یہ ساری اسکیم بنائی گئی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ "وردھا اسکیم میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ مذہبی تعلیم نہ ہونی چاہیئے۔ اس وقت جو طریقہ جاری ہے ہم نے اسی کو برقرار رکھا ہے یعنی مدرسہ کے اوقات کے ماسوا جو گروہ چاہے اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرے لہ" لیکن مہاتما گاندھی کا بیان اور خود ڈاکٹر ذاکر حسین کی اپنی اسکیم ان کے اس قول کی تکذیب کے لیے کافی ہے۔ جس قسم کی شہریت پیدا کرنے کو انہوں نے اپنی تعلیمی اسکیم کا مقصود ٹھیرایا ہے، اس کو یہ چیز بھی نقصان پہنچائے گی کہ مسلمان یا دوسرے مذاہب کے پیرو اپنے بچوں کو مذہبی عقائد کی تعلیم خارج از اوقات مدرسہ دیں۔ اگر وہ متضاد باتیں نہیں کرنا چاہتے تو انہیں یوں کہنا چاہیے کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ کوئی گروہ اپنے بچوں کو ایسے عقائد کی تعلیم نہ دے جو ہمارے نصابِ تعلیم کے برعکس انہیں یہ سکھاتے ہوں کہ سب مذاہب کے اصول ایک نہیں ہیں۔ لیکن اگر کوئی گروہ اوقاتِ مدرسہ کے ماسوا ایسی تعلیم دینا چاہے تو ہم مجبوراً برداشت کریں گے کیونکہ جبراً ہم اسے روک بھی نہیں سکتے۔ ڈاکٹر صاحب ایک معقول اور تعلیمیافتہ آدمی ہیں۔ وہ کم از کم اضداد میں تمیز تو کر سکتے ہیں۔ ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ایک نظام تعلیم کی پالیسی یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کیا جائے یا یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں ہندوستانی قومیت کا (ہندوستانیت کا نہیں ——— بلکہ ہندوستانی قومیت کا) شعور پیدا کیا جائے۔ اگر ان کے تجویز کردہ نظام کی پالیسی پہلی ہے تو وہ بتائیں کہ ان کے نصاب میں کون سی چیز ہے جو کسی مسلمان بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کرتی ہو۔ یا پیدا کرنا تو درکنار اس کو کم از کم

لہ نیشنل کال مورخہ ۸ جولائی ۳۸ء

لہ ٹربیون مورخہ ۷ جولائی ۳۸ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باقی ہی رکھتی ہو؟ اور اگر ان کی پالیسی دوسری ہے تو وہ صاحب صاف اس بات کا اقرار کیوں نہیں کرتے کہ ہم اسلامی قومیت کا شعور مٹا کر ہندوستانی قومیت کا شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیا ہے کہ وہ مرشد دوسری پالیسی اختیار بھی کرتے ہیں اور پھر مسلمانوں کو یہ بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم تمہارے بچوں میں سے اسلامی قومیت کا شعور مٹانا نہیں چاہتے۔ اگر وہ شمال کی طرف چل کر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ جو جنوب کی طرف جانا چاہتے ہیں ان کا مقصود بھی فوت نہ ہوگا، تو وہ ہمیں صاف فرمائیں، ہمیں ان کے ذی عقل ہونے میں بھی شبہ ہے۔ اور اگر وہ ارادہ یہی رکھتے ہیں کہ جنوب کی طرف پہنچنے کی خواہش رکھنے والوں کا مقصد فوت ہو جائے، مگر انہیں یقین یہ دلانا چاہتے ہیں کہ ان کا مقصد فوت نہ ہوگا، تو پھر منافقت کا شدید تر الزام ان پر عائد ہوتا ہے اور بہتر ہے کہ وہ اس سے بچنے کی کوشش فرمائیں۔

وردھا سکیم کے انگریزی ایڈیشن میں جو تفصیلی نصاب درج کیا گیا ہے افسوس کہ اس کا ترجمہ اردو میں شائع نہیں کیا گیا، ورنہ اسے دیکھنے کے بعد ہر شخص اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نصاب میں مسلمان بچوں کے شعور اسلامی کو فنا کرنے کا کس قدر مکمل انتظام کیا گیا ہے۔

مادری زبان کے شعبہ میں تیسرے درجہ والوں کو پیغمبر عیسیٰؑ اور محمدؐ کی اور چوتھے درجہ والوں کو بڑے بڑے آدمیوں، مثلاً زرتشت، سقراط، حسینؓ، ابراہام لنکن، ٹالسٹائے، سن یات سین اور گاندھی کی کہانیاں پڑھائی جائیں گی۔

سماج کے علم میں ویدک عہد کی کہانیوں کے ساتھ موسیٰؑ، ابراہیمؑ اور مارکس اریلیس کے حالات اور درجہ چہارم میں قدیم ہندوستان، بودھ مت، چین اور عیسائیوں کے حالات بتائے جائیں گے۔

درجہ پنجم میں خاص طور پر اسلامی دور کو رکھا گیا ہے اور اس کے خاص خاص مضامین یہ ہیں:-

۱۔ محمدؐ، عمرؓ، حسینؓ، عمرؒ ابن عبد العزیز کے حالات۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۲۔ ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق کی ابتداء۔ محمد بن قاسم، خواجہ معین الدین چشتی۔

۳۔ ہندی اسلامی تہذیب کے ارتقاء کی کہانی۔

۴۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔ اس کی توضیح۔ امیر خسرو، کبیر، گرونانک، اکبر اور دارا شکوہ کے حالات سے۔

۵۔ مشترک تمدنی زندگی کا ارتقاء۔ غذا، لباس، تفریحات، مشترک تہوار، معاشرتی رسوم اور آداب و اطوار۔

۶۔ مشترک سیاسی زندگی اور ملکی نظم و نسق۔ شیر شاہ، اکبر اور ٹوڈرمل۔

۷۔ زبان و ادب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اور "ہندوستانی" کا ارتقاء بحیثیت مشترک زبان کے۔

۸۔ فنونِ لطیفہ اور موسیقی۔ امیر خسرو، تان سین، ہندو مسلم فنِ تعمیر اور اس کے نمونے۔

۹۔ حسب ذیل شخصیتوں کے حالات زندگی:۔ البیرونی، ابن بطوطہ، فیروز شاہ تغلق، بابر، چاند بی بی، نور جہاں اور چند صوفی بزرگ مثلاً داؤد، کبیر، نانک، بابا فرید۔

۱۰۔ دنیا کو اسلامی تہذیب نے کیا دیا؟ علیؓ بحیثیت انسان اور عالم۔ بلالؓ بحیثیت نمائندہ حبشی جمہوریت۔ ہارون الرشید کی علمی سرپرستی۔ صلاح الدین بحیثیت نمائندہ شجاعت مسلمین۔ عبدالرحمان الناصر اور اندلس کی اسلامی تہذیب۔ اسلامی سلطنت کی وسعت جغرافی تعلق کے ساتھ۔

اس پورے نقشہ میں دیکھیے، مسلمانوں کے پیغمبر اور مذہبی پیشوا امام وغیرہ کس صف میں بیٹھے ہیں، بلکہ کہیں کہیں ان لوگوں کو گویا ان کے ساتھ بٹھایا گیا ہے۔ مسلمان بچے ان کو اس حیثیت سے نہ جانیں گے کہ وہ انکے دین کے ستون ہیں، بلکہ اس حیثیت سے جانیں گے کہ دنیا کے دوسرے بڑے بڑے آدمیوں میں سے وہ بھی ہیں۔ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی تاریخ اس طرح انکے دماغوں میں اتاری جائے گی کہ ہندو اور مسلمانوں کے مذہب اور تہذیب کے میل جول سے جو چیز اکبر اور دارا شکوہ اور کبیر اور نانک نے پیدا کی اس کی خوبی اور معقولیت ان پر نقش ہو جائے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس سے ان میں کبیر پنتھی اور برہمو سماجی شعور تو پیدا ہو سکتا ہے مگر اسلامی شعور ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس تعلیم کے ساتھ اگر ہمارے علماء نے لے دے کر کچھ مذہبی تعلیم کا پیوند لگوا بھی دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ سارا نظام تعلیمی جس بنیاد پر اٹھایا گیا ہے، جو مقصد اس کی اساس میں رکھ دیا گیا ہے اور جس تعلیمی پالیسی پر یہ تعمیر شروع سے آخر تک ہوئی ہے اس میں دینیات کی تعلیم کا جوڑ قطعاً بے نتیجہ ہوگا۔ اسلامی ہائی اسکولوں میں دینیات کی تعلیم سے جو کچھ نتائج حاصل کیے گئے ہیں بس ویسے ہی کچھ نتائج اس وردھا اسکیم میں بھی دینیات کی قلم لگانے سے حاصل ہو جائیں گے۔

۴۔ واحد قومیت، مادہ پرست سوسائٹی اور مخلوط سماج کی اس تشکیل میں اخلاقی رنگ بھی ضروری تھا، اس لیے کہ اخلاق کے بغیر نئی ہندی تہذیب نامکمل رہی جاتی ہے۔ مذاہب ادیان کی شریعتوں کو تو تعلیم سے خارج کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ان شہریوں کی اخلاقی تربیت کس بنیاد پر ہو؟ وردھا اسکیم نے اس سوال کو اس طرح حل کیا کہ ہند جدید کے "پیغمبر" مہاتما گاندھی کی روحانی تعلیم پر ہندوستانی قوم کے اخلاق کی بنیاد رکھ دی۔

"ہندوستان کی زندگی کا راستہ الگ ہے۔ اس نے ہر طرح کی آزادی حاصل کرنے کے لیے اہنسا کا طریقہ لیا ہے۔ ہمارے بچوں کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اہنسا کا طریقہ ہنسا سے اچھا ہے۔" (جامعہ صفحہ ۱۱۱)

"جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے اور امن کے ذریعہ سے صلح حاصل کی ہے ان کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہئیں۔ انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہئیں جن سے اہنسا اور اس کے ساتھ کی خوبیوں کا ہنسا اور دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو۔"

(صفحہ ۱۱۹)

اس طرح تمام مذاہب کی تعلیم خارج کر کے مہاتما گاندھی کے مذہب کی تعلیم داخل کر دی گئی۔ اب جو نسل ہندوستان کی درس گاہوں سے پرورش پا کر نکلے گی اس کے اخلاق

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تصورات دینِ گاندھی پر مبنی ہوں گے۔ ہندوستان کی زندگی کا راستہ ——— اور مذہب کا مفہوم اس کے سوا نہیں کہ وہ زندگی کا راستہ ہی ہے ——— یہ ہوگا کہ وہ جہاد بالسیف کو دھوکے اور دغا کا قریبی رشتہ دار سمجھے گا اور اہنسا کو عقیدۃً اس پر ترجیح دیگا۔

سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم لازماً اور جبراً دی جائے گی۔ اس عمر میں بچے اس نظامِ تعلیم کے سوا کسی دوسرے نظامِ تعلیم میں شامل نہ ہو سکیں گے اور جو والدین خود غیر تعلیم یافتہ ہیں یا جن کے پاس مالی ذرائع مفقود ہیں وہ بطورِ خود بھی ان کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ کر سکیں گے۔ زیادہ سے زیادہ پانچ فی صدی آدمیوں نے اگر اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام کر بھی لیا تو وہ بس موجودہ نسل تک ہے۔ دوسری نسل جو وردھا اسکیم کے مدرسوں سے تعلیم پا کر اٹھے گی اس پر مادی نقطۂ نظر اور جدید ہندی قومیت کے تصورات کا اتنا غلبہ ضرور ہوگا کہ اُسے اپنی اولاد کو مذہبی تعلیم دینے کی زیادہ پروا نہ ہوگی۔ لہٰذا یقین رکھنا چاہیے کہ تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان "ایک قوم" بن جائے گا۔ انگریزوں نے کامل سیاسی اقتدار حاصل کر کے میکالے کی تعلیمی اسکیم نافذ کی تھی جو نہ آدھے ہندوستانیوں کو پورا انگریز بنا سکی نہ پورے ہندوستانیوں کو آدھا انگریز۔ ہندوؤں نے ابھی سیاسی اقتدار کی پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا ہے اور اسی مرحلہ پر وردھا اسکیم ہماری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ سے بنوالی ہے جو ان شاء اللہ سارے ہندوستانیوں کو پورا "ہندوستانی" بنا کر چھوڑے گی۔ اس کے بعد کسے شک ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا مرتبہ میکالے سے بلند تر نہیں ہے اور یہ مہاتما گاندھی کی مہربانی ہے کہ انہوں نے یہ عزت خود حاصل کرنے کے بجائے ڈاکٹر صاحب کی طرف منتقل کر دیا۔

۱۰۔ ودیا مندر تعلیمی اسکیم

سی پی میں ایک دوسری تعلیمی اسکیم بنائی گئی ہے جو "ودیا مندر اسکیم" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مصنف صوبے کے وزیر اعظم پنڈت شکلا ہیں جو جماوری جی کے مخلص چیلوں میں سے ہیں۔ انہوں نے یہ نام الہ آباد کے ودیا مندر ہائی اسکول سے لیا ہے جو جماوری خاندان کا قائم کیا ہوا ہے۔ تخیل اور نقشہ گروکل سسٹم سے ماخوذ ہے[1]۔

---

[1] نیشنل کال مورخہ ۲۲ر جون ۳۸ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کانگریس پارٹی نے ۳۰ جولائی ۱۹۳۸ء کو ان کی ضرورت میں ایک سکیم جاری کی تھی جس کا مقصد
دیہات میں ہمہ گیر لازمی تعلیم کے لیے ایک اسکیم وضع کرنا تھا۔ ۱۴ اگست کو یہ کام مکمل ہو گیا۔ وزیر
حکومت سی پی نے تسلیم کر لیا تعلیمی ضروریات کی خاطر یہ نئے اسکول اور ۱۰۰ مدرس بورڈ محکمہ تعلیم کے
افسروں کی مجلس نے ۱۹ دسمبر کو سی پی اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے اسے منظور کیا۔ مگر
بار بار مسلم لیگ اس کی ہدایت پر مسلم تعلیمی ضروریات کی خاطر مسلمانوں کی ایسی ریفرنس کی نمائندگی سی پی
کے مسلمان ممبروں کو نصیب ہوئی۔ مسلمانوں کے سامنے یہ سکیم جب ۱۴ جنوری کے اجلاس اسمبلی میں
پیش ہوئی اس وقت پیش کی جب حکومت کے بجٹ میں اس کے لیے دو لاکھ روپیہ سالانہ کی
امداد منظور کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ اسمبلی کے ۱۴ مسلمان ممبروں میں سے ۱۲ نے سختی کے
ساتھ اس کی مخالفت کی۔ باقی دو میں ایک مسلمان ممبر شریف تھے جنہیں اس وقت وزارت کا
شرف حاصل تھا مگر انہوں نے بھی اس کی حکومت کی طرف سے پیش کردہ تجویز کی حمایت سے احتراز
کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانان صوبہ متوسط کے بعض طبقے اس میں وہ
اسباب اتفاق منظور کر چکے ہیں اور اس کے بعد سے مسلمانوں کی تمام انجمنیں جماعتیں،
حتیٰ کہ صوبہ متوسط کی مسلم قوم پرست جماعت اور مسلم اخبارات نے بالاتفاق اسکیم کی
مخالفت کی ہے بلکہ دوسرے صوبوں کا کانگریسی حکومت کی جانب سے جو بیان کیونکہ شائع
کیا گیا ہے اس میں یہ کہ "چند مسلمان افراد اور بعض مسلمان جماعتوں کی مخالفت" کہہ کر اس متحدہ
قومی مخالفت کو ہلکا کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ بالکل اسی انداز میں ہے جس میں ان کے
انگریز استاد اب سے دو سال پہلے تک ہندوستان کی ہر تحریک کو ہلکا قرار دیا کرتے تھے۔

اسکیم کو منظور کرنے کے لیے جو مجلس تعلیم بنائی گئی ہے اس میں سی پی کا ایک
مسلمان بھی نہ لیا گیا بلکہ باہر سے ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کی خدمات حاصل
کی گئیں تاکہ نئی سرکار کے منشاء کے مطابق کام کر سکیں۔ مسلمانوں سے کہہ دیا گیا ہے "یہ بھی

نے دیا تھا اسکیم شائع کر دی حکومت صوبہ متوسط نے اس میں سی پی کی زبان کی طرف سے
انگریزی میں شائع کی گئی ہے مسلمانوں کی ضرورت کے لیے اسمبلی میں اس کا اعلان ہوا تھا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

روح نصاب کے بجائے [illegible] کی حد تک باہر نکال رکھے گئے۔ اصل کام تو نصاب کے امور کا [illegible] نصاب مقرر کرنا ہے جس کے لیے ایک کمیٹی کر دی گئی ہے اور اس کمیٹی میں بدقسمتی سے کوئی مسلمان شامل نہ کیا گیا۔ یہ بالکل اس کمیٹی کے اختیار میں ہے کہ امور کو جس شکل میں چاہے ڈھال دے۔ اور یہ اختیار بالکل ناقابل استرداد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سی پی کے مسلمان طبقات اپنی دینی تعلیم کے معاملہ میں کچھ نہیں بول سکتے۔ ان کے بچے گھروں پر جو کچھ ان کے حق میں فیصلہ کریں اس کے آگے انہیں سر جھکا دینا چاہیے۔ یہ ہے اس اسکیم کی اصل تصویر جس کے لیے کانگریس ہندو مہا سبھا کی [illegible] اور اس تصویر کی [illegible] کا شرف جناب مولانا ابوالکلام نے عطا فرمایا ہے کہ ۲۵ جون ۳۹ء کو آپ بنفس نفیس ودیا مندر ٹریننگ اسکول وردھا میں تشریف لے گئے اور "قومی تہذیب" کو ترقی دینے والے اس ادارہ کی سرپرستی فرمائی۔[1]

یہ اسکیم خاص طور پر دیہی علاقوں کے لیے بنائی گئی ہے[2] یعنی اس کا اثر سی پی کے ان بالکل مسلمانوں پر پڑے گا جو ۹۶۰۰ دیہات میں ۹۰ فی صدی ہندو اکثریت میں گویا آٹے میں نمک کی حیثیت سے پھیلے ہوئے ہیں۔ تنہا کانگریسی حکومت ان کی تعلیم کا انتظام کرنے کا ذمہ نہیں لینا چاہتی بلکہ یہ چاہتی ہے کہ یہ لوگ ۹۰ فی صدی ہندو اکثریت کے سامنے بالکل اس تعلیمی انتظام کو قبول کریں جو کچھ ان کی طرف سے کیا جائے۔ اسی غرض کے لیے یہ اسکیم بنائی گئی ہے۔ خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ جو مدارس اس اسکیم کے تحت قائم کیے جائیں گے ان کا نام "ودیا مندر" تجویز کیا

---

[1] خلیل [illegible] مورخہ ۲۷ جون ۳۰ء "قومی تہذیب" کا لفظ خود حضرت مولانا کی زبان [illegible] سے نقل کیا ہے۔

[2] سی پی گورنمنٹ کا پریس کمیونک مورخہ ۱۷ ستمبر ۳۹ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گیا ہے[1] لفظ مندر سے صاف مذہبیت کی بو آتی ہے۔ ایک عام ہندوستانی "مندر" کے معنی ہندوؤں کی عبادت گاہ ہی کے سمجھتا ہے۔ کانگرسی سی پی کی حکومت اور مہاتما گاندھی، دونوں کو اصرار ہے کہ یہ نام قابلِ اعتراض نہیں ہے[2]۔ گویا اس امر کا فیصلہ کہ مسلمانوں کے نزدیک کیا چیز قابلِ اعتراض ہونی چاہیئے اور کیا نہ ہونی چاہیئے، خود مسلمانوں کے کرنے کا نہیں بلکہ ان کے حکمرانوں کے کرنے کا ہے۔ اس پر مزید فریب کاری ملاحظہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے خرچ سے جو مدرسے قائم کریں ان کا نام ودیا مندر نہیں، بیت العلم رکھ لیں[3]۔ مگر اسکیم کے تحت مدرسہ صرف اس جگہ قائم کیا جا سکتا ہے جہاں کم از کم چالیس لڑکے پڑھنے والے ہوں اور جس کے لیے کم از کم دو سو روپے سالانہ آمدنی کی جائداد وقف کی جائے[4]۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں مسلمان اتنی اقلیت میں ہیں کہ ان کی آبادی سے ۴۰ لڑکے فراہم نہیں ہو سکتے، یا جہاں وہ اس قدر غریب ہیں کہ مطلوبہ زمین وقف نہیں کر سکتے وہاں ان کے بچوں کو صبح اٹھ کر مندر جانے کی تیاری کرنی ہو گی۔ اس کا نفسیاتی اثر جو کچھ آئندہ نسل پر ہو گا اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

۲۔ اسکیم سردست اختیاری ہے، مگر آگے چل کر اس کو جبری بنا دیا جائے گا۔ یعنی ہر اس گاؤں یا مجموعۂ دیہات کو جس سے چالیس لڑکے لڑکیاں فراہم ہوں ایک ودیا مندر لازماً قائم کرنا ہو گا۔ وہاں لوگوں کو مجبور کیا جائے گا کہ دو سو روپے ماہانہ آمدنی کی جائداد وقف کریں اور اس علاقہ کی تمام خیرات بھی ودیا مندر کی طرف منتقل ہو گی[5]۔ اسکیم کے آخر میں ارشاد ہوا ہے:-

---

[1] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۶۔

[2] ہریجن سیوک مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء اور سی پی گورنمنٹ کا پریس کمیونک مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۷ء

[3] سی پی گورنمنٹ کا کمیونک مورخہ ۱۸ ستمبر۔

[4] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۶-۸

[5] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۶-۸-۹-۱۵

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"چھوٹے بڑے مٹھوں اور دیگر مذہبی خیراتی اداروں، مندروں،
مسجدوں وغیرہ کے مالکوں کو احساس ہونا چاہیے کہ ہندوستان کی تاریخ میں
اب وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ از خود پیش قدمی کریں قبل اس سے پہلے کہ وقت
ہاتھ سے نکل جائے اپنی خدمات پیش کر کے تعاون حاصل کریں۔"

(اسکیم، صفحہ ۱۵)

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک جبری و لازمی اسکیم ہے اور مسلمانوں کے مذہبی اوقاف اور مساجد کے اوقاف بھی اس میں حصہ لینے پر مجبور کیے جائیں گے۔

۳۔ ہر مدرسہ کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے گی جس کے ارکان کا بیشتر حصہ حق رائے دہندگی بالغان کے اصول پر مخلوط انتخاب سے منتخب ہوگا، اور مدرسہ کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ دیہاتی پنچایت یا ڈسٹرکٹ کونسل یا حکومت صوبہ کی ملک تصور ہوگی[1]۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان انتظام سے بھی بے دخل اور ملکیت سے بھی بے دخل۔ ان کا کام صرف اپنا مال اور اپنے بچے حوالہ کر دینا ہے۔

۴۔ مدرسہ میں عموماً ایک ہی مدرس ہوا کرے گا جسے پانچ سال کے لیے امتحاناً مقرر کیا جائے گا۔ پھر بیس سال کے لیے مستقل کر دیا جائے گا۔ اگر کمیٹی کی رائے میں اس کا رویہ نامناسب ہو تو وہ اسے نکال دے گی۔ اس کے فرائض یہ ہوں گے کہ مقررہ نصاب کے مطابق تعلیم دے اور اس گاؤں کے تمام معاملات کو قومی رنگ (National Outlook) میں رنگنے کی کوشش کرے[2]۔ قومی رنگ کا مطلب صاف ہے۔ بچوں میں اور اپنے زیر اثر آبادی میں واحد قومیت کی روح پھونکنا اور ملی امتیاز کو مٹا دینا۔ یہ کام قریب قریب کلیتہً ہندو مدرسین ہی سے لیا جائے گا۔ مسلمان کا اول تو انتخاب میں آنا مشکل۔ اور اگر کوئی قسمت کا مارا آ گیا تو کمیٹی یہ کہہ کر بآسانی اسے نکال دے گی کہ یہ قومی رنگ نہیں دیتا یا مقررہ نصاب

---

[1] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۱۰-۱۱

[2] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۱۳-۱۴

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے خلاف ہی کچھ دیر پا کر دینا نتائج خیز ہو سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حافظہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو اس لئے کہ تعلیم مخلوط ہوگی ایک ہندو استاد کے زیر اثر اور کثیر التعداد ہندو بچوں میں گھرے رہنا پڑے گا جہاں طرز زندگی ہر لحاظ سے مختلف ہوگا اور خدا اور رسول کا نام تک ان کے کانوں میں نہیں پڑے گا بلکہ اسلامی زندگی کا کوئی نشان وہ دیکھ سکیں۔

۵۔ مقاصد وردھا میں تصریح کی گئی ہے کہ گاؤں کے بچوں میں قومی شعور یا نظریہ پیدا کیا جائے گا۔ وردھا مشن ایک اہم مرکزی حیثیت کا مالک ہے گا جہاں استاد بچوں کے اندر رشتے اور لڑکیاں حسب ہر گاؤں کے مسائل کو حل کرنے اور ان کا سامنا کرنے پر بحث مباحثہ کر کے حل کرنے کی کوشش کریں گے خواہ وہ مسائل قومی ہوں یا مذہبی یا تعلیمی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان وردھا مشنوں کے ذریعے دیہات کی منتشر اور پراگندہ مسلمان آبادی کو کثیر التعداد ہندو آبادی میں بحیثیت ایک منظم گروہ شامل کیا جائے گا۔ اور تربیت یافتہ اساتذہ تمام دیہی علاقوں میں پھیلا دیئے جائیں گے تاکہ وہ تمام گاؤں کی پوری زندگی کا اپنے گرد مرکز کر لیں اور صرف تعلیم کے ذریعے ہی نہیں بلکہ مشغلی اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے بھی سب کو ایک اجتماعی وحدت بنا دیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ دیہات کی مسلمان آبادی خود بخود نابید ہو جائے گی اور چند سال بعد جو مسلمان آنکھیں پھیلا کر دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ صرف شہروں میں رہ گئے ہیں۔ اصل ہندوستان یعنی دیہی ہندوستان میں ان کا کہیں پتہ نہیں۔

۶۔ ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہوگی اور مادری زبان کی تفسیر جو مسٹر گاندھی نے کی ہے یہ کی گئی ہے کہ اس صوبہ کے علاقہ کی زبان ہے۔ یعنی وہ زبان نہیں جو بچے کی مادری زبان ہو۔

۱؎ ایضاً صفحہ ۔

۲؎ ایضاً صفحہ ۵ ۔

۳؎ سی پی گورنمنٹ کا کمیونک مورخہ ۱۷ ستمبر ۳۹ء ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہلے جگہ مدرسہ یا پاس جو علاقے کی مادری زبان ہو۔ جب ہر جگہ تعلیم دی جائے گی تو اس کے بعد کہیں ساٹھ ستر
بچے جن کی مادری زبان اردو ہو تو ان کے لئے وہاں مکتب الگ کئے جائیں لیکن مسلمانوں کی اکثریت تو صوبے کی سب جگہ بعض
اردو بولنے والے ہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی ہندوستانی مدرسے قائم ہوں گے جن میں یا تو مراٹھی بولنے اور لکھنے
والے یا ہندی یا ناگری رسم الخط کے ساتھ ... واسطے۔ لہٰذا اس زبان کی
تعلیم علاقے کی زبان ہے کہ مذکور کا مطلب یہ ہوا کہ اردو زبان بحیثیت خارج از بحث ہو گئی مسلمان
اگر چاہیں تو اردو مدرسے قائم کر سکتے ہیں مگر صرف اسی جگہ جہاں وہ چالیس بچے اردو پڑھنے والے
فراہم کریں اور مدرسے پیسے سے ملاوٹ کی امداد دے سکیں۔ یہ جہاں اقلیت یا غربت کی وجہ سے
وہ ایسا نہ کر سکیں اور شاید سی پی میں بہت ہی کم مقامات پر وہ ایسا کر سکیں۔ وہاں ان کے
بچوں کو مراٹھی یا ہندی ہی میں سب کچھ پڑھنا ہوگا۔ اس کے بعد متحدہ قومیت خود بخود
پیدا ہوگی۔

یہ حکومت کی پوری طاقت اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں صرف ہوگی۔ ہر شہر، قصبہ
اور تحصیل میں حکومت اپنے خرچ پر چند ودیا مندر قائم کرے گی۔ مدرسوں کی تنخواہیں حکومت
کے خزانے سے ملیں گی۔ ودیا مندر تعمیر کرنے کے لیے مزید سامان بھی حکومت دے گی۔
تمام سرکاری محکمے ودیا مندر کی پشت پر مدد کے لیے موجود رہیں گے۔ محکمہ زراعت، محکمہ
طبابت و حفظان صحت، محکمہ انہار بھی، محکمہ حیوانات، محکمہ تعلیم غرض سب اپنے
دائروں میں ودیا مندر کی اعانت کریں گے۔ جس میں ذہنی اور اخلاقی و تمدنی امداد دیں گے۔ یہ بھی ذہن
قومی جمہوری حکومت ہے۔ اور مسلمان اس جمہوریت کا ایک جزو ہیں۔ جو ایک مالیہ
مشترکہ کی پیداوار میں ان کا حصہ بھی ہوگا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ... آمدنی
اور طاقت کے فراہم کرنے میں ان کا حصہ ہے اس کا مصرف متعین کرنے میں ان کا حصہ نہیں
ہے۔ اس کو اکثریت اپنے منشا کے مطابق استعمال کرے گی۔ اور ایسے کاموں میں استعمال
کرے گی جو ان بے زور حصہ داروں کی ہستی ہی کو ختم کر دیں۔

لہ ودیا مندر اسکیم صفحہ ۱۱

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

۸۔ سی پی میں ابتدائی تعلیم لوکل بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں کے حدودِ عمل سے تعلق رکھتی ہے، اور چونکہ ہر جگہ اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لیے یہ جماعتیں اردو مدرسوں کو بند کر رہی ہیں اور ان کی جگہ ودیا مندر قائم کرنے پر تُلی ہوئی ہیں۔ مسلمان اپنی اقلیت کے باعث کسی طرح اس ظلم کو روک نہیں سکتے۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ان مجلسوں کی پوری طاقت ودیا مندر قائم کرنے میں صرف ہوگی۔ جو ٹیکس مسلمانوں سے لیا جائے گا وہ ان کی مرضی اور ان کے مفاد کے خلاف صرف کیا جائے گا۔ اور مسلمانوں کے احتجاج کو استحقار کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے گا۔ حال میں ضلع امراؤتی کی ورود میونسپل کمیٹی نے اردو اسکول کو اردو ودیا مندر بنا دیا۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا مگر پرکاہ کے برابر بھی اس کی پروا نہ کی گئی۔[1] سچ فرمایا پنڈت نہرو نے، جمہوریت کے معنی یہی ہیں کہ اکثریت اقلیت کو دبا کر رکھے۔

۹۔ وردھا میں ودیا مندروں کے لیے اساتذہ تیار کرنے کا انتظام کیا گیا ہے اور ایک ٹریننگ اسکول قائم کر دیا گیا ہے۔ اس میں ۱۴۲ ہندو اور ۸ مسلمان تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں اور حکومت صوبہ متوسط نے اپنے احسانات کی جو فہرست گنائی ہے اس میں ہمیں یہ بھی بتلایا ہے کہ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ وہ ودیا مندروں میں جا کر بچوں کو اردو اور ہندی دونوں سکھا سکیں۔[2] مگر اصل حالات کیا ہیں؟ اسی صوبہ کے قوم پرست مسلمانوں تک نے اپنی کانفرنس میں شکایت کی ہے کہ سارا زور صرف ہندی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اور اُردو کی محض شُدبُد پیدا کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ یہ ودیا مندروں میں اردو تعلیم کے انچارج ہوں۔ جن بے چاروں کا املا و تلفظ تک درست نہیں، جو اُردو کی معمولی عبارت تک صحیح نہیں پڑھ سکتے وہ ہمارے بچوں کو اس زبان کی تعلیم دینے جائیں گے۔[3]

---

[1] سی پی اسمبلی میں سوال نمبر ۱۹۶ کا جواب مورخہ ۸ مارچ ۴۰ء

[2] حکومت سی پی کا پریس کمیونک مورخہ ۱۲ ستمبر ۴۰ء

[3] مدینہ بجنور مورخہ ۲۸ جولائی ۴۰ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۰- سی پی اسمبلی کے ممبر مولوی عبدالرحمان خاں صاحب جب اس ٹریننگ اسکول کا معائنہ کرنے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ہندو مسلمان سب کے سب دھوتیاں باندھے ہوئے تھے۔ یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ ان میں مسلمان کون ہے۔ تمام مضامین ہندی اور مرہٹی میں پڑھائے جاتے ہیں بعض اردو رسم الخط سکھانے کے لیے ایک مسلمان استاد نوکر رکھا گیا ہے۔ مسلمان طلبہ اچھوتوں کی طرح رہتے ہیں مالگ کھاتے ہیں۔ پانی پینے کے برتنوں تک کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ روزانہ بندے ماترم سے مدرسہ شروع ہوتا ہے اور مسلمان طلبہ کو مجبور کیا جاتا ہے (یا اگر مجبور نہیں تو تربیت سے ایسا بنایا جاتا ہے) کہ پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر کھڑے ہوں[۱]۔ یہ ہے وہ مدرسہ جس میں "قومی تہذیب" کے نشوونما پر جناب مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ نے اظہارِ مسرت فرمایا ہے اور جس کا افتتاح مہاتما گاندھی کی برکتوں کے ساتھ ہوا ہے؟[۲]

---

[۱] مولوی عبدالرحمان خاں صاحب کا مضمون مندرجہ انقلاب ۲۲ ر اگست ۳۸ء

[۲] وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم پر مسلمانوں کی طرف سے جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کے جواب میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی بار بار دہرائی جا رہی ہے کہ جس ملک میں بہت سے مذاہب کے پیرو رہتے ہیں وہاں سب کی مذہبی تعلیم کا انتظام حکومت کیسے کر سکتی ہے۔ ایسی جگہ تو حکومت کی طرف سے عام دنیوی تعلیم ہی کا انتظام کیا جا سکتا ہے، اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ وسیع پیمانہ پر لازمی جبری اور غیر مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ لیکن عام ناظرین کی معلومات کے لیے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یورپ کے سخت "مہذب" ممالک میں بھی جہاں مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہے فرانس، چیکوسلواکیا، روس اور دو چار دوسرے ملکوں کے سوا کسی ملک نے وہ پوزیشن اختیار نہیں کی جو یہاں ہندوستان میں اختیار کی جا رہی ہے۔ جرمنی میں باشندوں کی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے اور یہ نظریہ اختیار کیا گیا ہے کہ سب کی تعلیم کا نظام ایک ہونا چاہیے۔ اس بنا پر وہاں پرائیویٹ مدارس قائم کرنے کی اجازت بھی کم دی جاتی ہے۔ لیکن دستورِ سلطنت میں ہر شخص کو یہ مطالبہ کرنے کا حق دیا گیا ہے کہ اس کے بچے کو اس کے عقیدہ کے مطابق مذہبی تعلیم دی جائے اور (باقی حاشیہ صفحہ ۴۴۶ پر)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۱۔ زبان کا مسئلہ

بالا تفصیلات سے اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "جنگ آزادی" کے نام سے علاقائی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۵ سے) حکومت کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اوقات مدرسہ میں اس تعلیم کا انتظام کرے۔ نیز اگر ایک مذہبی عقیدہ کے لوگ کسی جگہ کافی تعداد میں ہوں اور مطالبہ کریں کہ ان کے لیے الگ مدرسہ قائم کیا جائے جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام ان کی خواہش کے مطابق ہو تو حکومت کا فرض ہے کہ اس کا انتظام کر دے۔ انگلستان میں مذہبی تنظیمات کو خود اپنے مدارس قائم کرنے اور چلانے کا حق ہے اور حکومت کا محکمہ تعلیم صرف ان کی نگرانی کرتا ہے۔ ایسے مدارس کو حکومت امداد بھی دیتی ہے۔ یوگوسلیویا میں ہر تسلیم شدہ مذہب کی تعلیم کا انتظام سرکاری مدارس میں کیا جاتا ہے اور ہر بچے کے والدین پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس کے لیے کس نوعیت کی مذہبی تعلیم چاہتے ہیں۔ نیز وہاں تسلیم شدہ مذاہب کو اپنے تعلیمی نظام خود بنانے کا بھی حق ہے اور حکومت ملک کے خزانہ سے ان کی اعانت کی جاتی ہے۔ لتھوانیا کے سرکاری مدارس میں بچوں کے لیے مذہبی تعلیم لازمی رکھی گئی ہے اور صرف وہ بچے اس سے مستثنیٰ کیے گئے ہیں جن کے والدین مذہبی تعلیم نہ دلوانا چاہتے ہوں۔ اس کے علاوہ وہاں بھی مذہبی تنظیمات کو اپنے مدارس خود قائم کرنے کا حق ہے اور حکومت ان کو اس شرط کے ساتھ امداد دیتی ہے کہ ان میں دنیوی تعلیم کا انتظام سرکاری تعلیمی پالیسی کے مطابق کیا جائے گا۔ پولینڈ کے تمام سرکاری اور امدادی مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور یہ کام مختلف مذاہب کی تسلیم شدہ انجمنوں کے سپرد کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے پیرووں کے لیے خود نصاب تجویز کریں اور مدارس میں ان کی مذہبی تعلیم کی نگرانی کریں۔ اسٹونیا میں بچے کے والدین کی درخواست پر سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے لیے لازم ہے۔ ملاحظہ ہو:

The New Democratic Constitutions of Europe, by A. H. Morley, P. 53-57.

بلجیم میں جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور تسلیم شدہ مذہب کے کلیساؤں کو حق دیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کی نگرانی کے لیے اپنے انسپکٹر مقرر کریں۔ ناروے میں ابتدائی تعلیم تمام تر مذہبی تنظیمات کے ہاتھ میں دی گئی ہے۔ اٹلی میں مذہبی تعلیم لازمی

(باقی صفحہ ۴۲۷ پر)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکومت کے زیرِ سایہ تہذیب یا سیاسی طاقت سے متصل کرنے کی جو پالیسی اختیار کی گئی ہے وہ کس طرح مسلمانوں کی تربیت اور ان کی ملیت کو فنا کرنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے اور کس طرح چلائے ہوئے سیاسی و قومی نظریہ کے مقابلے [illegible] تجدید کرتے جا رہے ہیں جن کا انہوں نے اپنے انگریز استادوں سے سیکھی تبلیغ ہو۔ لیکن یہ بیان نامکمل رہ جائے گا اگر اسی سلسلہ میں ان کارروائیوں کا بھی ذکر نہ کر دیا جائے جو زبان و رسم الخط کے باب میں کی جا رہی ہیں۔

ایک قوم کی زبان اور اس کا رسم الخط اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کے بقا و فنا میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کو اگر آپ دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اس کی زبان اور رسم الخط کو بدل دیجئے۔ رفتہ رفتہ وہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی۔ اس کی آنے والی نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائے گا اور وہ بالکل نئی ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورت قومی لے کر اٹھیں گی۔ جن جن بڑے لوگوں نے قومیتوں کے بنانے اور بگاڑنے کا کھیل کھیلا ہے ان سب نے یہ ہتھیار ضرور استعمال کیا ہے۔ زار روس کی حکومت نے اپنی امپیریلزم کی بنا پر مستحکم کرنے کے لیے روسی زبان اور رسم الخط کو تمام غیر روسی قوموں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی تا کہ یہ سب قومیں روسی ہو جائیں اور

(بقیہ حاشیہ ۴۴۶ سے) ہے اور کوئی بچہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے والدین استثناء کا مطالبہ نہ کریں۔ ہالینڈ میں مذہبی تنظیمات اپنے اپنے پیروؤں کی تعلیم کا انتظام خود کرتی ہیں اور حکومت اس کا خرچ ادا کرتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں سرکاری طور پر ہر اس مذہب کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے جس کے پیروؤں کی تعداد مدرسہ میں زیادہ ہو۔ لیکن جن اقلیتوں کی کافی تعداد موجود ہو ان کے لیے علیحدہ انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا چودھواں ایڈیشن مضمون ایجوکیشن)

اس کے بعد یہ کہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ پبلک مدارس میں مذہبی تعلیم کا انتظام ممکن نہیں ہے۔ صاف کیوں نہیں کہا جاتا کہ قومیتوں کو فنا کرنے اور قوموں کے احساس خودی کو مٹانے کے لیے ہم اس چیز کو قصداً نہیں رکھنا چاہتے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں :

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی مملکت میں کوئی قوم ایسی نہ رہ جائے جو اپنی زبان بولنے والی اور اپنے مذہب کا اتباع کرنے والی اور اپنے صوم پر چلنے والی ہو۔ اصطلاح میں اس کو (Russification) یعنی روسی بنا دینے کی پالیسی کہا جاتا ہے۔ بعد میں اسی پالیسی کی پیروی اشتراکی جماعت نے بھی کی۔ لینن نے انقلاب کے بعد ہی مشرقی قوموں کو ترکی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ان کے رسم الخط کو لاطینی رسم الخط سے بدل دیا اور اب تازہ اطلاع ہے کہ روس کی ۲۹ قوموں کا رسم الخط لاطینی کے بجائے روسی کر دیا گیا ہے تاکہ اس علیحدگی کے احساس کو بالکل مٹا دیا جائے جو ان کے روسی بن جانے میں مزاحم ہوتا ہے۔ ازبک، ترکمان، تاجیک، کرغیز اور داغستانی مسلمان، جن کو عربی رسم الخط نے اسلامی روایات سے وابستہ کر رکھا تھا، اس ضرب کے اثرات کو ابھی سے محسوس کر رہے ہیں۔ ابھی ایک چوتھائی صدی بھی اس انقلاب پر نہیں گذری ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی قومیت تحلیل ہو کر اشتراکی سوسائٹی میں تبدیل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہی پالیسی فرانس نے شمالی افریقہ میں اختیار کی ہے۔ وہاں عربوں اور بربریوں کو فرانسیسی قومیت میں ڈھالنے کے لیے ساری طاقت اس پر صرف کی جا رہی ہے کہ عربی زبان اور رسم الخط کو مٹا دیا جائے۔ اسی پالیسی کا تختہ مشق ہندوستان میں ہم کو بنایا جا رہا ہے۔

پنڈت جواہر لال کے بقول ہندوستان میں "نیشنلسٹ" جماعت کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ یہاں "ایک متحدہ قوم پیدا ہو"[1]۔ اس غرض کے لیے زبان کی وحدت ناگزیر ہے۔ زبانیں الگ ہوں گی تو الگ قومیں بھی رہیں گی۔ الگ قوموں کو فنا کر کے ایک قوم میں تبدیل کرنا ہو تو الگ زبانوں کو مٹا کر دولت، تنظیم اور حکومت کی طاقت سے ایک زبان تمام ملک میں پھیلانی ہی پڑے گی۔ یہاں تک تو بات کھلم کھلا ہے۔ اس کے بعد کام تقسیم ہو جاتا ہے۔ کچھ باتیں دکھانے کے لیے ہیں، اور کچھ کرنے کے لیے۔ دکھانے کے لیے تو یہ ہے کہ "قومی" زبان "ہندوستانی" ہے جس کا اطلاق اردو، ہندی دونوں پر ہوتا ہے۔ فارسی اور

---

[1] - اسٹار، اکتوبر ۳۶ء

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیوناگری دونوں رسم الخط مسلّم ہیں اور دونوں کو نشو و نما کا پورا موقع ملنا چاہیئے لیکن فی الواقع کیا کیا جارہا ہے ؟ اس کے لیے ذیل کی تفصیلات ملاحظہ ہوں:

۱۔ فارسی اور عربی کے وہ عام فہم الفاظ بھی جو "ہندوستانی" کے مشترک سرمایہ میں مدتوں سے داخل ہو چکے ہیں، جن کو ہر ہندو اور مسلمان بولتا اور سمجھتا ہے، قصداً ترک کیے جا رہے ہیں، اور ان کی جگہ ٹھیٹھ سنسکرت اصل کے، یا بالکل نامانوس ہندی زبان کے الفاظ پھیلائے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر

سمے	بجائے	وقت	انتی	بجائے	ترقی
پرسدھ	"	مشہور	اتتھ	"	حاکم
جگت پرانت	"	صوبہ متحدہ	پرتی	"	مسل
سنگھ	"	شیر	لاگو	"	نافذ
اُتسک	"	ضروری	پرستاؤ	"	تجویز
سبھاپتی	"	صدر	سدھانت	"	اصول
متر تا	"	دوستی	اگوا	"	لیڈر یا رہنما
پرانت	"	صوبہ	گرہن	"	منظور
شکشا	"	تعلیم	پرانت کوشل	"	صوبہ متوسط
منش یا پرش	"	آدمی	مت بھید	"	اختلاف
نگر	"	شہر	جھگڑا پیھڑو	"	مدعی
مقدما	"	مقدمہ	ودّیا	"	برابر
وانر	"	بندر	سنشودھن	"	ترمیم
سوتنترتا	"	آزادی	گھوشن	"	اعلان
بھارت ورش	"	ہندستان	جھگڑا ودجے	"	مدعا علیہ

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ اس فہرست کو بہت زیادہ طویل کیا جا سکتا ہے۔ مگر اتنی ہی مثالیں یہ اندازہ کر لینے کے لیے کافی ہیں کہ یہاں "ہندوستانی" کے پردے میں دراصل

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہندی زبان کو قومی زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "ہندستانی قوم" کے بجائے دراصل "ہندو قوم" میں اس مُلک کی قوموں کو جذب کرنا مقصود ہے۔ ہندوستانی زبان و ادب میں سے ہمارے حصّہ کو اس طرح نکال پھینکنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس طرح کوئی قوم کسی ظالم قوم کی حکومت سے آزاد ہونے کے بعد جوشِ انتقام میں اس کے باقی ماندہ آثار کو مٹایا کرتی ہے۔

۲۔ متحدہ قومیت کے علمبردار جو زبان اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال کر رہے ہیں اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ گاندھی جی بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس ناگپور میں فرماتے ہیں:

"اس سبھا پتیتو مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کا رنہ ہونا اور اس لیے کم سے کم ودیش کا کارن ہونا۔ تتھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائیں گے یدی ہم سری نگر سے لے کر کنیا کماری تک اور کراچی سے لے کر ڈبروگڑھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں، تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا شاستری اپنا دری آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں ودارا ہندوستان کی ہتیا پر کیہ سیوا کیوں نہ کریں"[1]

آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیرِ تعلیم صوبۂ متحدہ کی ایک تقریر کا اقتباس یوپی کے محکمۂ اطلاعات کی رپورٹ سے:

"آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک شبستا ہے کہ تسکشن ڈشمیا کے پرت لوگوں کا آگرشٹ بہت وشد اور بیاپک ہو گیا

---

[1] "جامعہ" مئی ۳۶ء۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے۔ یہ بات ادھکانش سبھئے سنسار پر گوٹت ہوتی ہے اور نرن سار ہم اپنے دیش میں بھی اس بشیو بیانی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا ان بھو کر رہے ہیں۔ آج کل ہم اپنے کو جس مانسک اور پدھار تک پرستھت میں پاتے ہیں، اور ہماری اس استھت کا جو سماجک راج نیتک اور آرتھک آدھار ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجوں سے جو سنسکرت پائی ہے، اس سے اس وشیو ویاپی پرگت کو ہمارے سنگھٹن سند یہ ایک بشیس روپ میں استھت کیا ہے اور ایک وشیس بھارتیہ سمسیہ بنا دیا ہے۔[1]

بابو موہن لال سکسینہ صدر صوبہ کانگرس کمیٹی کے خیر مقدم میں پہلی بھیت کی کانگریس کمیٹی حسب ذیل اعلان شائع کرتی ہے:

"بھارت صوبہ کے پرسد نیتا شری یت موہن لال سکسینہ ایم۔ ایل۔ اے (سینٹرل) جو پرانتی کانگریس کمیٹی کے پردھان ہیں۔ ۲۷ مئی ۱۹۳۸ء کو پرات کال ۵ بجے کی گاڑی سے پدھار رہے ہیں۔ جنتا کو چاہیئے کہ اس سنہرے اوسر سے لابھ اٹھانے کے لیے پورب دیش کے پرت اپنے سچے کرتو کو جاننے کے لیے ۲۶ تاریخ کی شام کو ادھکادھک سنکھیا میں راشٹر ساکاؤں کے ساتھ میں آجانا چاہیئے اور ۲۷ مئی ۳۸ء کی صبح کو ۵ بجے ان کے سواگت کے جلوس کی رونق بڑھائیے۔

پروگرام ۲۷ مئی کا

پرت کال	۷ بجے سے ۹ بجے تک جلوس
	۹ ؍ ؍ ۱۰ ؍ ؍ جل پان

---

[1] مدینہ ۱۳ ستمبر ۳۸ء۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مدھنان   ۹ بجے سے ۲ بجے تک بھوجن وشرام

۲ ، ۵ ، ، کاریہ کارتاؤں کی بیٹھک

نویدک

دستخط   پریذیڈنٹ   دستخط   ادیپ منتری

شہر منڈل کانگریس کمیٹی۔ "پیلی بھیت"

اس حمام میں سوشلسٹ ہندو بھی بے تکلف کپڑے اُتار دیتے ہیں۔ حال میں آگرہ کی سوشلسٹ جماعت کی طرف سے ایک جلسہ کا اعلان بدیں الفاظ ہوا ہے :

"آگرہ میں سماج وادی بھاشن ترنگا تار چھ دن تک۔ اکیل بھارتیہ سماج وادی نیتاؤں کے دوارا۔" ہمیں جنتا کو یہ سوچنا دیتے ہوئے پرسنتا ہوتی ہے کہ تاریخ ۱۱ اکتوبر سے برابر چھ دن تک اکیل بھارتیہ سوشلسٹ نیتا راج نیتی کے انیک وشئوں پر اپنے سناگر بہت اور دو تا پورن بھاشن تر دیں گے۔ آگرہ کی جنتا کے لیے یہ اپوروا وسر ہے کی وہ دیش کے وگے سوشلسٹوں کے سمپرک میں آکر یہ سمجھ لیں کہ برٹش سامراج واد کو کس پرکار اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ بھاشنتروں کے وشئے کمیونزم، سوشلزم، پونجی واد، ورگ بندھ، سامراجیہ واد، فیسزم، نرم وگرم دل فیڈریشن، کسان، کرانتی، وشو شانتی کی سمیا، ودیارتھی اندولن۔ کسان مزدور اندولن، روس کی کرانتی، سماج وادی روس، امترا شٹریہ۔ شمر سبتقت آدی۔ آدی بھاشن میں پرویش چار آنہ کے ٹکٹ سے ہوگا۔ آپ کو ٹکٹ ہر پڑھکہ کانگریس ودیارتھی کاریہ کرتا۔ تھا وارڈ شہر کانگریس کمیٹی کے دفتر دوارا مل سکتا ہے۔ جن نیتاؤں کے آنے کی آشا ہے ان کے نام اس پرکار ہیں :

ڈاکٹر اشرف۔ کے ایم اے بھا گا کانگریس کمیٹی کے راج نیتا و بھاگ کے پردھان۔ اچاریہ نریندر دیو اکیل بھارتیہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی کارکارنی کے پڑھکہ سد سے تھا کانگریس کارشمتی کے بھوت پوروسد سے۔

 www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈاکٹر زیڈ۔ اے احمد اکھل بھارتیہ کانگریسی سوشلسٹ پارٹی کی کاریکارنی کے سدستے تتھا آبھاگا کانگریس کمیٹی کے ارتھک ویاگ کے بھوت پورو۔

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اکھل بھارتیہ کانگریس کمیٹی کے ویدیشک وبھاگ کے منتری تتھا ابھاگا سوشلسٹ پارٹی کے کاریکارنی کے سدستے کامریڈ سجاد ظہیر بارایٹ لا آبھاگا سوشلسٹ پارٹی کی کاریکارنی کے سدستے۔ کامریڈ لیشی دیو مالوی یوپی کسان سبھا کی کارکارنی کے پرمکھ سدستے ہیں۔

دھیان رہے یہ بھاشنڑ ۱۱ اکتوبر سے شام کو ۷ بجے سے ۸ بجے تک ہوں گے۔ استھان کی سوچنا شکروی جائے گی۔ یہ بھاشنڑ شہر کانگریس کمیٹی سوشلسٹ پارٹی اور آگرہ ودیارتھی سنگھ کے سنیکٹ پلیٹ فارم پر ہوں گے۔

مہادیو نرائن ٹنڈن

پردھان منتری کانگریس سوشلسٹ پارٹی، آگرہ"

یہ محض چند نمونے ہیں۔ ورنہ یہ زبان جس طرح ذمّہ دار لیڈروں اور ذمّہ دار "قومی مجلسوں" سے لے کر اخبارات، رسائل اور سینماؤں تک ہر آلۂ نشر و اشاعت کے ذریعہ سے پھیلائی جارہی ہے، اس کا مشاہدہ ہر آنکھوں والا کر رہا ہے اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر حکومت کی باگیں ان لوگوں کے ہاتھ میں پوری طرح آگئیں تو یہ کیسی "ہندستانی" زبان بنائیں گے۔

۳۔ اگرچہ ابھی سیاسی اقتدار پوری طرح ان کے ہاتھ میں نہیں آیا ہے، لیکن جس قدر بھی اقتدار انہیں مل چکا ہے اس کو انہوں نے عملاً اس کام میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اقتدار تو حاصل کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ ہم مشترک وطنی اغراض کے لیے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر اقتدار کو استعمال کیا جاتا ہے اس کام میں کہ وطن کی ایک جماعت پر دوسری جماعت کی زبان کو بزور مسلط کر دیا جائے۔ صوبۂ بہار میں ۲۵ ہزار سے زیادہ مسلمان بچے ہندی مدرسوں (پاٹھ شالاؤں) میں جانے پر مجبور ہیں کیونکہ ان کے لیے تعلیم کا کوئی دوسرا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

انتظام ہی نہیں۔ پٹنہ ڈویژن میں ۵۰ فی صدی، چھوٹا ناگپور ڈویژن میں ۸۰ فی صدی، بھاگلپور ڈویژن میں ۷۱ فیصدی اور ترہت ڈویژن میں ۵۵ فی صدی مسلمان طلبہ ہندی زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر جو مسلمان بچے صرف ایک صوبہ میں ہندی اللسان بنائے جا رہے ہیں ان کی تعداد ۲۵ ہزار کے قریب ہے، یعنی کل مسلمان طلبہ کا ۷۰ فی صدی حصہ۔ اور ان کو پڑھایا کیا جاتا ہے؟ متعدد کتب نصاب میں یہ چیز آپ کو ملے گی کہ "نبی" کے معنی "رام اوتار" کے ہیں۔[1] ایک چاول سے اندازہ کر لیجئے کہ پوری دیگ میں کیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اُردو نے رسالہ "اُردو" کی ایک قریبی اشاعت میں اپنے ایک دوست کا خط نقل کیا ہے جو یو۔ پی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس سال مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ کے بہت سے مدرسوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان میں عموماً میں نے دیکھا کہ اُردو پڑھانے والے مدرسوں کی بہت کمی ہے۔ مسلمان بچوں کو مجبوراً ہندی پڑھنی پڑتی ہے، اور وہاں زبان کے واسطہ سے ان پر ہندو دیت کا گہرا رنگ چڑھ رہا ہے۔ مثلاً ایک ابتدائی مدرسہ میں بچے کو پکاریئے تو وہ "حاضر جناب" کہنے کے بجائے "اپستھت شریمان" کہے گا۔ یہ اس صوبہ کا حال ہے جو صدیوں سے ہماری قومی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ ان سب سے زیادہ بدتر حالت صوبہ متوسط کی ہے۔ ضلع بیتول کی ڈسٹرکٹ کونسل نے پورے ضلع میں جبری تعلیم نافذ کرنے کی جو سکیم بنائی ہے اس میں تعلیم کی زبان لازمی ہندی رکھی گئی ہے۔ اور حکومت نے اس شرط کے ساتھ اس کو مالی امداد دی ہے کہ تمام تعلیم ہندی میں ہو۔ اس جدید اسکیم کے ماتحت ۷۰ ہندی اسکول قائم کیے گئے اور پورے ضلع میں اُردو کا صرف ایک اسکول تھا سو وہ بھی بند کر دیا گیا۔[2] یہ صرف ابتدا ہے۔

---

[1] عبدالغنی صاحب ایم اے سنٹرل کا مراسلہ مندرجہ اسٹار آف انڈیا یکم مارچ ۳۸ء۔

[2] "ہندوا" مورخہ ۲۵ فروری ۳۸ء۔ خود سی پی کے وزیر اعظم نے اپنے سرکاری کمیونک میں اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے کہ ضلع کا واحد اُردو اسکول بند کر دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو اسٹار آف انڈیا مورخہ ۲ جون ۳۸ء۔)

ودیا مندر اسکیم جب نافذ ہوگی تو آپ دیکھیں گے کہ دیہات کی مسلمان آبادی کو ۲۵ سال کے اندر قریب قریب کلیتہً ہندی اللسان بنا دیا جائے گا۔ ابتدائی تعلیم تمامتر لوکل بورڈوں کے قبضہ میں ہے اور وہاں حال یہ ہے کہ ۱۵۰ انتخابی حلقوں سے نصف درجن مسلمان بھی منتخب نہ ہو سکے۔ یہ عصبیت جہاں کام کر رہی ہو، وہاں کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ پبلک کے خزانہ سے کہیں اُردو ودیا مندر، یا "بیت العلم" بھی قائم کیا جائے گا۔ لوکل بورڈوں میں تو پھر بھی محدود نظر اور پست ذہنیت کے لوگ جاتے ہیں۔ صوبہ کی حکومت جن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذمہ دار کانگریسی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے خود وہی کانگریس کے اس زبانی دعوے کو جھوٹا اور منافقانہ دعوے ثابت کر رہے ہیں کہ "ہندوستانی" زبان اُردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں کے ساتھ تسلیم شدہ سرکاری زبان ہے۔ سی پی اسمبلی میں خود صدر مجلس کے زیرِ ہدایت رولز کمیٹی نے جو قواعد بنائے ہیں ان میں ۷۰ لاکھ مسلمانوں کی زبان کا نام تسلیم شدہ زبانوں کی فہرست میں کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ عبدالرحمان خاں صاحب ایم۔ ایل۔ اے نے جب اپنے سوالات اردو زبان میں لکھ کر بھیجے تو اسمبلی کے سکرٹری نے انہیں واپس کر دیا اور ہدایت کی کہ انگریزی زبان میں سوالات بھیجے[1] اسمبلی کی کاروائی قلم بند کرنے کے لیے ہندی رپورٹر تو رکھا جا سکتا ہے مگر اُردو رپورٹر رکھنے اور اردو میں کاروائی شائع کرنے کے لیے بجٹ میں گنجائش نہیں نکلتی۔ اسمبلی میں کانگریس کے کراچی ریزولیوشن کا حوالہ دے کر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ کاروائی ہندی اور اردو دونوں میں لکھی جائے تو کانگریسی حکومت کا وزیرِ عدل و انصاف جواب دیتا ہے کہ:

> "جو لوگ کانگریس کو ایک قومی جماعت تسلیم نہیں کرتے، انہیں کانگریس کی کراچی والی تجویز پر ہماری توجہ مبذول کرانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انہیں کیا حق ہے کہ اس تجویز کا حوالہ دے کر وہ ہم پر نکتہ چینی کریں۔ ہم اقلیتوں کے معقول مطالبے ماننے کو تیار ہو سکتے ہیں لیکن اس زمیمہ میں مسلمانوں

---

[1] عبدالرحمان خاں کا مراسلہ (اسٹار آف انڈیا مورخہ ۲۰ ستمبر ۳۸ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں :

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی طرف سے جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ نہ تو معقول ہے اور نہ قابلِ عمل۔ کسی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ ایوان کی اکثریت سے نامعقول مطالبے منوانے کی کوشش کرے۔ مسلمان ممبروں کو اس وقت بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ چاہیں تو اردو میں تقریر کریں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اُردو خطِ صوبہ کی سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں رائج نہیں۔ اسمبلی میں بھی اسے رائج نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بے انتہا مصارف بڑھ جائیں گے[1]۔

۴۔ عمل کے ساتھ زبانوں پر بھی علانیہ یہ بات آگئی ہے کہ "قومی" زبان حقیقت میں "ہندی" ہے نہ کہ وہ "ہندوستانی" جو یوگوسلیویا کی "سرب کروٹ سلافینی" زبان کی طرح محض ایک دھوکے کی ٹٹی بنائی گئی ہے۔ اس تخیلی زبان کے متعلق تو ابھی حال میں گاندھی جی نے خود فرمایا ہے کہ خارج میں اس کا وجود کہیں نہیں ہے، بلکہ وہ آئندہ پیدا کی جانے والی ہے[2]۔ اب مقابلہ رہ جاتا ہے اُردو اور ہندی میں، تو اس کے متعلق "متحدہ ہندوستانی قوم" کے لیڈر کا فیصلہ یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیے[3]۔ ہری پورہ کانگریس کے موقع پر "راشٹر بھاشا سمیلن" (قومی زبان کی کانفرنس) کا ساتواں اجلاس مسٹر جمنالال بزاز کے زیرِ صدارت ہوتا ہے اور کانگریس کا صدر اس کو پیغام بھیجتا ہے کہ:-

"صوبوں کے باہمی تعلقات کی ترقی کے لیے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے اور وہ زبان ہندی ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں

---

[1] "مدینہ" مورخہ ۱۳ اکتوبر ۳۸ء۔

[2] Hindustani of the Congress conception has yet to be crystallised into shape (Harijon, 29, Oct., 1938).

[3] ہریجن بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ جولائی ۳۷ء۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے ابھی تک ہندی نہیں سیکھی انہیں سیکھنی چاہیئے کہ یہ ہندوستانی قوم کی تعمیر میں مددگار ہوگی[1]۔

یوپی کا وزیر تعلیم ۱۰ اگست ۳۸ء کو ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:-

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے، ہمارے جنوبی ہند کے ہموطن آسانی سے سیکھ لیں تو لازم ہے کہ ہم ہندوستانی زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں"

اسی صوبہ کی اسمبلی کا صدر اسی وزیر تعلیم کے پاس وفد لے جاتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے پہلے اس کو سرکاری زبان قرار دیا جائے اور محکموں اور خصوصاً عدالتوں میں سارا کام ہندی کے ذریعہ سے ہو۔ (مدینہ یکم ستمبر ۱۹۳۸ء)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے متحدہ ہندوستان کے نام سے سیاسی طاقت حاصل کی ہے، اور اب یہ اس طاقت کو ہندوستان کی ایک قوم کی زبان سارے ملک پر مسلط کر دینے میں استعمال کر رہے ہیں۔

خلاصۂ مباحث

یہ ساری رُوداد آپ کے سامنے ہے۔ اسے آنکھیں کھول کر پڑھئے اور اندازہ کیجئے کہ اس "جنگ آزادی" کی حقیقی نوعیت کیا ہے۔ اس کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ میرا قید خانہ کا رفیق مجھ سے کہتا ہو کہ آؤ میں اور تم دونوں مل کر لڑیں اور ہم دونوں اپنی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں کاٹ پھینکیں۔ اگر معاملہ یہی ہوتا تو مجھ سے بڑھ کر کون احمق ہوتا کہ ایسے کارِ خیر میں اس کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتا؟ لیکن یہاں صورت معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ میرا رفیق زنداں اس تدبیر میں ہے کہ جیلر کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لے اور اپنے ہاتھ پاؤں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی میرے ہاتھ پاؤں میں ڈال کر مجھے اپنا قیدی بنا لے۔ وہ

---

[1] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۲ فروری ۳۸ء۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجھ سے تو کہتا ہے کہ آؤ اس قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جیلر سے لڑیں۔ مگر جیلر کے ساتھ یہ معاملہ طے کرتا ہے کہ حضور مجھے برقنداز بنا دیں، جیل کا انتظام حضور کے حسب منشا ہو گا اور قیدیوں کو میں قابو میں رکھوں گا۔ اس طرح جو کچھ اختیارات اسے جیلر سے ملتے جاتے ہیں ان سے کام لے کر وہ اپنی قید کے طوق و سلاسل اتار کر مجھے کستا چلا جاتا ہے، اور مزید غضب یہ ہے کہ جیلر صاحب تو نرے جیلر تھے، مگر یہ ہمارے رفیق صاحب جواب برقنداز بنے ہیں، ان کو مردم خوری کا لپکا بھی ہے۔ یہ مجھے فقط اپنا قیدی ہی نہیں بنانا چاہتے بلکہ میرے گوشت اور خون کو آہستہ آہستہ اپنا جزو بدن بھی بنا لینے کی فکر میں ہیں۔ اب میری عقل ماری گئی ہے تو میں ان کے ساتھ ضرور تعاون کروں گا، تاکہ یہ میری مدد سے جیلر پر دباؤ ڈال کر اور زیادہ اختیارات حاصل کریں اور زیادہ آسانی سے مجھے نوش جان فرما سکیں۔ اور اگر میری جیسے کی آنکھیں پھوٹ چکی ہیں تو میں جیل کی کوٹھڑی میں بے فکر بیٹھا ان برقنداز صاحب کی ترقی کو دیکھتا رہوں گا۔ اور اگر جیل کی زندگی نے مجھے پست ہمت اور ذلیل بنا دیا ہے تو میں بوڑھے جیلر کی خدمت میں دوڑا ہوا جاؤں گا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کروں گا کہ حضور کا دم سلامت رہے، جب تک آپ جیتے ہیں اس وقت تک تو آپ ہی جیل کا انتظام فرمائیں، جب خدانخواستہ آپ کا وقت آن پورا ہو گا، اس وقت دیکھی جائے گی جس کی قید بھی قسمت میں لکھی ہو گی بھگت لیں گے۔ لیکن اگر میں عقل و خرد سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہوں اور میری رگوں میں ابھی شرافت کا بھی کچھ خون باقی ہے تو میں ہمت کر کے اٹھوں گا اور جیل کی دیواریں اپنے ہاتھ سے توڑنے کی کوشش کروں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں جیلر یا برقنداز کی گولی کا نشانہ بن جاؤں گا۔ تو بہت اچھا مجھے اس کو گوارا کر لینا چاہیے۔ قید کی زندگی سے اور برقنداز کی غذا بننے سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ لڑ کر مر جاؤں۔ اس مردانہ کام میں گو دہری کا ہی مگر یہ امکان بھی ہے کہ مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نصیب ہو جائے اور میں اپنے مکار رفیق زنداں سے کہہ سکوں کہ برادرم! جیل کی ہوا بھول جاؤ اور سیدھی طرح شریف ہمسایہ بن کر رہو۔

استدراک

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک چیز قابلِ ذکر ہے۔ ۱۹ نومبر ۳۸ء کے "زمزم" میں جناب مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں مولانا نے سی پی کے متعلق بعض شکایات کی تردید فرمائی ہے اور بعض کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ جب وہ ان کے علم میں آئیں تو انہوں نے کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کو توجہ دلائی اور اس نے اس کی تحقیقات یا تلافی کرنے کی کوشش کی۔ یہاں اس بیان پر تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ مگر مختصراً میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن باتوں سے مولانا خود اطمینان حاصل فرما رہے ہیں اور جن پر مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں وہ درحقیقت قابلِ اطمینان نہیں ہیں۔ خود ان کے اپنے بیان سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ اس سراسر غلط جمہوری نظام میں طاقت تو سمٹ سمٹا کر اکثریت کے ہاتھ میں آگئی ہے اور ہماری اصلی حیثیت اب یہ ہے کہ اگر وہ ہم پر ظلم کریں تو ہمارا کوئی نمائندہ جا کر سردار پٹیل کی خدمت میں یا کسی اور سرکار کی خدمت میں عرض معروض کر دے، اور اس ظلم کی تلافی صرف اس وقت ہو سکے جب کہ وہ بربنائے عنایت و مہربانی یا بربنائے مصلحتِ وقت تلافی کرنا چاہیں۔ یہ پوزیشن کسی طرح بھی اس غلامی کی پوزیشن سے مختلف نہیں جو اب تک انگریزی سلطنت میں ہمیں حاصل رہی ہے۔ یہاں بھی کوئی مصیبت مسلمانوں پر پیش آتی ہے تو کوئی فضل حسین یا کوئی شفیع خود اس کا تدارک نہیں کر سکتا بلکہ جا کر وائسرائے بہادر سے عرض کرتا ہے یا کسی صوبہ کے گورنر صاحب کو توجہ دلاتا ہے۔ اور اگر وہ مہربان ہوں یا مصلحتاً اس کی ضرورت سمجھیں تو تدارک ہو جاتا ہے، ورنہ اگزیکٹو کونسل کے ممبر صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں اور بدستور اس امید میں رکنیت کی کرسی سے چپکے رہتے ہیں کہ شاید کسی دوسرے موقع پر یہ منصب کام آجائے۔ ہمارا اصلی اعتراض دراصل اسی پوزیشن پر ہے۔ مان لیا کہ کانگریسی صوبوں میں اس وقت بڑی حق پسندی اور غایت درجہ کے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت ہو رہی ہے، اور یہ بھی تسلیم کر لیا کہ جتنی شکایات اب تک مسلمان اخبارات میں شائع ہوئی ہیں سب کی سب جھوٹی ہیں۔ مگر سوال یہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ دستوری نوعیت کیا ہے اور آئندہ کی لڑائی کس نوعیت کے دستوری انعقاد کے لیے ہو رہی ہے؟ اگر اس کی نوعیت یہی ہے کہ ہم اس جھوٹے جمہوری نظام میں محض اپنے سروں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے محکوم ہوں اور ہندو صرف اس لیے ہم پر حاکم ہوں کہ ان کے سر ہم سے زیادہ ہیں، تو ظلم اس نظام کی عین فطرت میں پوشیدہ ہے۔ آج اگر مولانا ابوالکلام کی اس لیے سُن لی جاتی ہے کہ ان سے کچھ زیادہ بڑا کام لینا ہے تو کل کسی ابوالکلام کی نہ سُنی جائے گی، اور کسی ابوالکلام میں یہ طاقت نہ ہوگی کہ جب اس کی نہ سُنی جائے تو وہ کچھ کر سکے۔ ہمارا اصل جھگڑا اسی باطل اصول سے ہے اور مولانا یہ سمجھ رہے ہیں کہ بس تمام شکایت بنیتول کے مدرسے اور وِدیا مندر کے نام اور ایسی چند چھوٹی چھوٹی چیزوں کے متعلق ہے۔ جو لوگ مولانا کے علم اور ان کی دانائی کے معترف ہیں وہ اس سے کچھ زیادہ دانش مندی و بصیرت کی توقع ان سے رکھتے تھے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۲

کانگریس اور مُسلمان

گذشتہ صفحات میں نیشنلزم اور آزادیٔ ہند کی وطن پرستانہ تحریک کا جو علمی اور واقعاتی تجزیہ کیا گیا ہے اس سے یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ہمارے اور اس تحریک کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ ہماری موت اس کی زندگی ہے اور اس کی موت ہماری زندگی۔ ہمارے اور اس کے درمیان اصول میں، مقاصد میں اور طریق کار میں نہ صرف یہ کہ کسی قسم کا اتحاد نہیں ہے، بلکہ درحقیقت کلی اختلاف ہے۔ ایسا شدید اختلاف، کہ کہیں کسی ایک نقطہ پر بھی ہم اور وہ جمع نہیں ہوتے۔ ہمارا اور اس کا تباین اس نوعیت کا ہے جیسے مشرق اور مغرب کا تباین ہے کہ جو شخص مغرب کی طرف جانا چاہتا ہو اس کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ مشرق سے منہ موڑ لے۔

اب جو شخص اس تحریک کے ساتھ چلتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہے وہ لامحالہ دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں مبتلا ہے۔ یا تو وہ اس تحریک کی حقیقت اور اس کے منطقی اور واقعی نتائج کا پورا شعور رکھتا ہے اور اس شعور کے ساتھ اس نے اپنے لیے یہ راستہ منتخب کیا ہے۔ یا پھر وہ کسی غلطی کا شکار ہے۔

پہلے شخص سے ہمارا کوئی جھگڑا اس کے سوا نہیں ہے کہ ہمیں اس کی منافقت پسند

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہیں۔ ہم اس سے صاف کہتے ہیں کہ جب تم اسلامی قومیت کی نفی کرنے کے لیے بالارادہ تیار ہو اور اس جمہوری نظام میں صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتے ہو جس کو واحد وطنی قومیت کی بنیاد پر تعمیر کیا جا رہا ہے تو تمہیں آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ اپنے آپ کو نام چارے کے لیے مسلم سوسائٹی سے بھی وابستہ رکھو؟ یہ نہ صرف منافقانہ حرکت ہے بلکہ اس میں تمہارا اپنا سراسر نقصان ہے۔ "مسلمان" کا ٹھپہ جب تک تمہارے اوپر لگا رہے گا اس وقت تک اکثریت کی حکومت میں تمہارے ساتھ امتیازی برتاؤ بہر حال ہوگا۔ خواہ تم ایک سو ایک فی صدی نیشنلسٹ بن جاؤ، تمہارا نام ہر جگہ تمہاری راہ میں حائل ہوگا۔ ہر ذمہ داری کا منصب تمہیں دیتے ہوئے اکثریت جھجکے گی۔ صدارت کی کرسی، وزارت عظمیٰ، پارٹی لیڈرشپ، مالی اعانت، غرض ہر اہم چیز کو دینے میں فطری طور پر بخل سے کام لیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اگر تم ایثار کے لیے تیار ہو تب بھی تو تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ”ایک علیحدگی پسند“ قوم سے ظاہری وابستگی برقرار رکھ کر تم اپنے مقصد —— واحد قومیت کی تعمیر —— کو نقصان پہنچا رہے ہو۔ جب کہ ایک قوم اپنی جداگانہ ہستی قائم رکھنے پر اصرار کر رہی ہے تو تمہارے اوپر یہ فرض عاید ہو جاتا ہے کہ اس سے علیحدگی اختیار کرو بشرطیکہ تم اپنے مقصد کے سچے وفادار ہو۔

اب رہ جاتا ہے وہ شخص جو اپنی قومیت کی نفی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ دل سے اس کے بقا اور نشوونما کا آرزومند ہے، اور اس امر کی حقیقی خواہش رکھتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں اس کی قومیت کو آزادی، خود اختیاری اور ترقی کا پورا موقع ملے، مگر اس کے باوجود کسی غلطی یا غلط فہمی کی وجہ سے اس تحریک میں شامل ہو گیا ہے جو اس کے قومی نصب العین سے اصولی، مقصدی، اور فعلی مخالفت رکھتی ہے۔ ایسے شخص کی حالت کا ہمیں تجزیہ کر کے دیکھنا ہوگا کہ وہ کس نوعیت کی غلطی یا غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

اس کے مرض کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس تحریک کی حقیقت سے واقف نہ ہو، بلکہ چند سطحی باتیں اپنے حسب منشا پا کر اس کے ساتھ لگ گیا ہو۔ گذشتہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صفحات اس بیماری کا علاج کرنے کے لیے کافی ہیں۔ آنکھیں کھول کر انہیں پڑھے گا تو انشاءاللہ شفا یاب ہو جائے گا۔

دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس تحریک کی حقیقت اور اس کے نتائج کو سمجھتا ہو، مگر علم و واقفیت کی کمی نے اسے اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہو کہ ہندوستان میں آزاد حکومت کا نشوونما اُن جمہوری اُصولوں کے سوا کسی دوسری صورت سے ممکن ہی نہیں ہے جن کو یہاں رواج دیا جا رہا ہے، لہٰذا وطنی آزادی کی خواہش رکھنے والے کو چار و ناچار انہیں قبول کرنا ہی پڑے گا، ورنہ پھر دوسرا راستہ اور ایک ہی راستہ انگریز کی غلامی کا ہے۔ جو لوگ اس غلطی کے شکار ہوتے ہیں انہیں اس کتاب کا آخری باب کھلے دل سے پڑھنا چاہیے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان کی پوری تشفی ہو جائے گی۔

تیسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ علمی و نظری حیثیت سے تو ایک شخص کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہے، مگر یاس، بزدلی اور کم ہمتی نے اس کے دل پر قابو پا لیا ہے۔ وہ اس بات سے تو بے خبر نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کی دوسری صحیح تدبیریں بھی موجود ہیں، مگر وہ ایک طرف اپنی قوم کی بیچارگی کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتا ہے کہ وطنی قومیت اور جمہوریت کی پُشت پر زبردست طاقتیں ہیں جن کا مقابلہ یا تو کیا ہی نہیں جا سکتا، یا اگر کیا جا سکتا ہے تو اپنے آپ کو بربادی و ہلاکت کے خطرے میں ڈالنا پڑے گا اور پھر بھی کامیابی کی اُمید کم ہی ہے۔ ایسے شخص کے لیے ہم خدا سے دُعا کریں گے کہ اس کے دل میں ایمان کی طاقت پیدا ہو۔ اور خود اس شخص کو بھی مشورہ دیں گے کہ بندۂ خدا، اگر تجھ میں تائیدِ حق کا بل بوتا نہیں ہے تو باطل کی تائید کر کے اپنی قبر میں آگ کیوں بھرتا ہے؟ جا، اور گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کر۔ یہ فتنہ کا وقت ہے۔ جو مردِ میدان بن کر نہیں نکل سکتا۔ اس کے لیے سلامتی ایمان کی راہ صرف یہی ہے کہ اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے۔

چوتھا سبب یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی پر جذبۂ انتقام مستولی ہو گیا ہو۔ اسے انگریز کے ہاتھوں سے اتنی تکلیفیں پہنچی ہوں کہ وہ جوشِ غضب میں اندھا ہو گیا ہو اور کہتا ہو کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اگر حق کی تلوار نہیں ملتی تو پروا نہیں، مَیں باطل ہی کی تلوار سے اس دشمن کا سر اُڑاؤں گا، چاہے ساتھ ہی ساتھ میری اپنی ملّت کی بھی رگ جان کٹ کے رہ جائے۔ ایسے شخص کی بیماریٔ دل کا علاج خداوند عالم کے سوا اور کسی کے پاس نہیں۔ اللہ اس کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے، ورنہ ڈر ہے کہ جس راہ پر وہ اس جذبہ کے ساتھ چل رہا ہے اس میں اپنی عمر بھر کی کمائی ضائع کر دے گا اور قیامت کے روز اس حال میں خدا کے سامنے حاضر ہوگا کہ ساری عبادتیں اور نیکیاں اس کے نامۂ اعمال سے غائب ہوں گی اور ایک قوم کی قوم کو گمراہی و ارتداد میں مبتلا کرنے کا مظلمۂ عظیم اس کی گردن پر ہوگا۔ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ وَأَوْزَارَ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ ایک شخص اس فعل کو کارِ ثواب سمجھ کر کر رہا ہو۔ وہ اس خیال میں مبتلا ہو کہ دنیائے اسلام کو انگریزی امپریلزم کے پنجے سے چھڑانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ آزادیٔ ہند کی اس تحریک کا ساتھ دیا جائے۔ اب اگر اس میں ہندوستان کی مسلمان قوم ختم ہو جائے تو پروا نہیں۔ ہندوستان سے باہر کے مسلمان تو اس بلا سے نجات پا جائیں گے۔ اس خیالِ خام نے جس شخص پر قابو پا لیا ہے اس سے ہم تین باتیں عرض کریں گے۔

۱۔ انگریزی امپیریلزم کو اگر کوئی چیز ختم کر سکتی ہے تو وہ آزادیٔ کامل کی خالص انقلابی تحریک ہی ہے۔ اس کے بغیر نہ یہ بلا دور ہوگی نہ آپ کا مقصد حاصل ہوگا۔ لیکن یہ تحریک جس کا ساتھ آپ دے رہے ہیں نہ آزادیٔ کامل کی تحریک ہے اور نہ خالص انقلابی تحریک۔ اس کی جو حقیقت ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں اس کی تردید میں اگر آپ کے پاس کانگریسی لیڈروں کے بعض دعووں کے سوا کوئی ثبوت ہو تو بسم اللہ، اسے سامنے لے آیئے۔ ورنہ صریح واقعات کے خلاف آپ کا اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھنا کہ اس تحریک کی حمایت آپ دنیائے اسلام کو آزاد کرا لیں گے محض بے معنی ہے اور بلادتِ ذہن کے سوا کسی دوسری چیز پر دلالت نہیں کرتا۔

۲۔ پھر اگر بالفرض اس وطنی قومیت کی تحریک سے آپ کو فی الواقع دنیائے اسلام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی آزادی حاصل بھی ہو سکتی ہو تو ہم کہیں گے کہ اس پاک مقصد کے لیے یہ ناپاک ذریعہ اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اس تحریک کی کامیابی اور ہندوستان کی مسلمان قوم کا ارتداد دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اس کا مآل یہ ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی عظیم الشان قوم رفتہ رفتہ مرتد ہو جائے اور اس کی آئندہ نسل سے مادہ پرست دہریئے پیدا ہوں، جن کے عقائد، اخلاق اور عمل میں اسلامیت کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ کیا اس نتیجہ کو سامنے رکھ کر کوئی شخص جو علم دین سے ذرہ برابر بھی بہرہ رکھتا ہو، یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ دُنیائے اسلام کی آزادی کے لیے یہ قربانی دینا بھی جائز ہے؟ اگر محض جان اور مال کی قربانی کا سوال ہوتا تو پروا نہ تھی، ہم کھلے دل کے ساتھ کہتے کہ اس سرزمین کا ایک ایک مسلمان اس مقصد کے لیے کٹ مرے، حتیٰ کہ ایک بچہ بھی زندہ نہ رہے۔ لیکن یہاں سوال دین و اخلاق کی قربانی کا ہے۔ یہاں یہ قربانی دینی پڑتی ہے کہ ہماری نسلیں باقی رہیں مگر مسلمان نہ رہیں، تو یہ قربانی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی اور مقدس سے مقدس چیز حتیٰ کہ بیت اللہ اور گنبدِ خضرا کے لیے بھی نہیں دی جا سکتی۔

۳۔ وطن پرستی کی یہ تحریک اگر کامیاب ہو جائے تو دنیائے اسلام کے لیے انگریزی امپیریلزم کے بجائے ہندوستانی امپیریلزم کا خطرہ پیدا کر دے گی۔ نیشنلزم تاریخ کے دوران میں اکثر امپیریلزم کی شکل اختیار کرتا رہا ہے اور آج بھی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا لینے سے کچھ حاصل نہیں۔ آپ کو اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ نیشنلزم کا نشہ جب کامیابی سے ہمکنار ہو گا تو امپیریلزم کا جنون بن جائے گا اور اس وقت دنیائے اسلام کے قلب میں ایک دوسرا جاپان پیدا ہو گا۔ آپ کی نسل نے تو محض پیٹ کی خاطر ارضِ حرب میں دادِ مردانگی دی ہے[۱] لیکن آپ کی آئندہ نسل جو وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم سے تیار ہو گی، وہ اعتقاد کی

---

[۱] اشارہ ہے ان مسلمان فوجیوں کی طرف جنہوں نے عراق، فلسطین اور سرزمین عرب کے دوسرے حصوں، حتیٰ کہ حجاز تک میں انگریز کے جھنڈے تلے جنگ کی تھی۔ مرتب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قوت کیساتھ یہ خدمت انجام دے گی۔ اس کا ضمیر اس فعل پر ملامت نہ کرے گا بلکہ الٹا فخر کرے گا کہ اس نے ہندوستان کا نام اونچا کیا اور اپنی "قوم" کے آگے دور و نزدیک کی قوموں کے سر جھکا دیئے۔ پس درحقیقت ہندوستان کے مسلمان پر نیشنلزم کے شیطان کو مسلط کرنا دنیائے اسلام کی کوئی بڑی خدمت نہیں ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

اب ایک غلط فہمی اور رہ جاتی ہے جسے دور کر دینا ضروری ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس ملک میں کانگریس ایک طاقت بن چکی ہے اور ایسی طاقت بن گئی ہے جس نے سیاسی قوت و اقتدار کے تمام سرچشموں پر قابو پا لیا ہے۔ اس سے الگ رہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم ان سرچشموں سے خود دستبردار ہو گئے اور دوسرے لوگوں کو آپ سے آپ ان کا قبضہ دے دیا۔ زیادہ صحیح تدبیر یہ ہے کہ اس جماعت کے اندر گھس جاؤ اور وہاں طاقت پیدا کرو۔ اس کا کم سے کم فائدہ یہ ہے کہ ہندو راج کے حامیوں کا زور ٹوٹ جائے گا اور مسلمان سیاسی طاقت میں حصہ دار بن جائیں گے اور اس میں زیادہ سے زیادہ فائدوں کے بھی امکانات ہیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان سوشلسٹ گروہ کے ساتھ مل کر مہا سبھائی عنصر کو شکست دے دیں، اور یہ کہ مسلمان اپنی بالاتر تہذیب سے ہندوؤں کو متاثر کریں اور آگ کی طرح ان کی تہذیب ہندوؤں میں پھیلتی چلی جائے۔

یہ بڑی دل خوش کن باتیں ہیں۔ مگر ہمیں تنقید کر کے دیکھنا چاہیئے کہ اس میں حقیقت کتنی ہے اور جنت الحمقا کی ہوائیں کس قدر شامل ہو گئی ہیں۔

بلاشبہ کانگریس کا نظام جمہوری ہے اور اس کے آئین میں اتنی گنجائش موجود ہے کہ جو گروہ چاہے اس میں شریک ہو کر اقتدار کے مرکز پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کر سکتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح انگلستان کے آئین میں اس امر کی گنجائش موجود ہے کہ لبرل، کنزرویٹو، سوشلسٹ، کمیونسٹ، جو چاہے پارلیمنٹ میں جانے اور وزارت پر قبضہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ نظری حیثیت سے یہ بھی ممکن ہے کہ دو یا تین چھوٹی جماعتیں مل کر ہر دوسری جماعت سے زیادہ طاقت ور ہو جائیں اور مرکزی اقتدار حاصل کر لیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیکن یہاں سوال آئین اور اس کی نظری گنجائشوں کا نہیں بلکہ امورِ واقعیہ کا ہے۔ جو جماعت خالص جمہوری اصولوں پر مبنی ہو اس میں کسی ایسی پارٹی کے برسرِ اقتدار ہونے کا ہرگز کوئی امکان نہیں جس کی حیثیت دراصل قومی اقلیت (National Minority) کی ہو، اور کثیر التعداد قوم کی تمام پارٹیوں میں جس کے خلاف قومی امتیاز اور قومی امپیریلزم کا جذبہ بطور ایک قدرِ مشترک کے پایا جاتا ہو۔ ایسی اقلیت نہ تو کبھی اکثریت بن سکتی ہے اور نہ یہ اُمید کر سکتی ہے کہ کثیر التعداد قوم کی کوئی پارٹی اس کو برسرِ اقتدار آنے میں مدد دے گی۔

ہمارے سامنے آئرلینڈ کی مثال موجود ہے۔ ۱۸۰۰ء میں انگلینڈ اور آئرلینڈ کی یونین (وحدت) عمل میں آئی اور دونوں قوموں کو ایک قوم قرار دے کر ایک جمہوری نظام میں شریک کر دیا گیا۔ دونوں کی ایک ہی پارلیمنٹ تھی۔ ایک ہی طریقِ انتخاب سے دونوں اپنے اپنے نمائندے منتخب کر کے اس جمہوری ادارہ میں بھیجتے تھے۔ اور جہاں تک نظریہ کا تعلق ہے، آئین میں کوئی ایسی رکاوٹ موجود نہ تھی کہ آئرش کے نمائندے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کر کے گورنمنٹ پر قابض نہ ہو سکیں یا کسی دوسری پارٹی کے ساتھ مل کر وزارت نہ بنا سکیں۔ لیکن فی الواقع ہوا کیا؟ اوکانل (O' Connel) جیسے آتش بیان خطیب اور ہوشیار قانون دان کی تدبیریں اور پارنل (Parnal) جیسے قابل پارلیمنٹری لیڈر کی چالیں بھی کچھ نہ کر سکیں۔ ایک سو بیس سال کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ ایک دن کے لیے بھی آئرش نمائندوں کو برطانوی پارلیمنٹ میں اقتدار نصیب نہ ہوا۔ اور اقتدار تو درکنار وہ غریب کسی آئینی تدبیر سے ان مصائب کو بھی دور نہ کر سکے جو انگریزی حکومت کے ہاتھوں ان پر نازل ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ آخر کار ان کو باہر سے لڑنا پڑا۔ اور آج کی آئرستانی حکومت کسی آئینی جدوجہد، کسی اندرونی تعاون کا نہیں بلکہ بیرونی جنگ کا نتیجہ ہے۔ یہی سبق ہم کو چیکوسلواکیا کے جمہوری نظام سے ملتا ہے جہاں جرمن اور سلاوک اقلیتیں چیک اکثریت کے مقابلہ میں پارلیمنٹری طریقوں سے کچھ نہ کر سکیں۔ یہی سبق ہمیں یوگوسلیویا سے ملتا ہے جہاں کروٹس اور سلافینی آج تک کبھی کسی آئینی چال سے حکومت

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے نظام پر قابض نہ ہو سکے ۔ یہی سبق ہمیں امریکہ سے ملتا ہے جہاں ہر پارٹی حکومت پر قبضہ کر سکتی ہے مگر حبشی قوم کے لیے اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں ۔ لہٰذا جو لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ دراصل ہندوستان میں ہماری حیثیت محض ایک سیاسی پارٹی کی نہیں بلکہ ایک قومی اقلیت کی ہے ، وہ کانگریس پر قبضہ کرنے کے خواب جس قدر چاہیں دیکھتے رہیں ، اگر عقل سے نہیں سمجھتے تو تجربہ ہمیں بتا دے گا کہ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے ۔

بھول نہ جانا چاہیے کہ کانگریس کا اور ہمارا اختلاف محض ذرائع اور طریقوں (Means & Methods) کے اختلاف کی حیثیت نہیں رکھتا ۔ یہ اصول و مقاصد اور پالیسی کا بنیادی اختلاف ہے ۔ اس کے اصولِ قومیت و جمہوریت کو ہم بالکل بدل ڈالنا چاہتے ہیں ۔ اس کے مقصد یعنی ایک قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ کے قیام کو بھی ہم قبول نہیں کر سکتے ۔ اس کی پالیسی یعنی بتدریج سیاسی اختیارات حاصل کرنے اور ان کی مدد سے ہندوؤں کی بالادستی عملاً قائم کر دینے کو بھی ہم گوارا نہیں کر سکتے ۔ یہ تینوں بنیادی چیزیں جب تک بدل نہ جائیں ، کانگریس کے ساتھ ہمارا تعاون اسلامی اغراض کے لیے ذرّہ برابر مفید نہیں ۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا کانگریس کے اندر جا کر ہم انہیں بدل سکتے ہیں ؟

داخلی مقاومت یا تعاون سے کسی جمہوری تنظیم کے اصول ، مقاصد اور پالیسی میں تغیر پیدا کرنے کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں :۔

یا تو تغیر چاہنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ وہ اس جماعت پر چھا جائیں ۔ اس صورت میں کلی تغیر بھی ہو سکتا ہے ۔

یا اس جماعت کے اندر ان کا نظام اتنا زبردست ہو کہ وہ اپنی منظم مقاومت سے اس جماعت کو پریشان کر دیں ۔ اس صورت میں کلی تغیر تو نہیں ، البتہ کسی حد تک تغیر ضرور ممکن ہے ۔

یا پھر تغیر چاہنے والے اپنے اخلاقی اثر اور اپنے دلائل کی قوت سے اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جماعت کی رائے کو متاثر کریں، اور اس طرح وہ جماعت خود ہی حق اور عدل کی طرف مائل ہو جائے۔ اس طریقہ کی کامیابی تمام تر اس جماعت کی انصاف پسندی و حق آگاہی پر منحصر ہے۔

ان میں سے پہلی صورت تو یہاں ناقابلِ عمل ہے۔ کسی حسابی معجزے کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کے ووٹ ہندوؤں کے ووٹوں سے زیادہ ہو جائیں۔ لہٰذا جو لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ کثرت سے کانگریس میں داخل ہو اور اس پر قابض ہو جاؤ ان کی بات اتنی ہی قابلِ التفات ہے جتنی اس شیرخوار بچے کی بات قابلِ التفات ہو سکتی ہے جو بیچارا ایک اور چار کی نسبت سے بھی واقف نہیں۔

رہی دوسری صورت تو داخل میں منظم جدوجہد اور مقاومت صرف اس طرح ممکن ہے کہ کانگریس میں جتنے مسلمان شریک ہیں، اور آئندہ شریک ہوں، وہ سب کے سب، یا ان کی ایک بہت بڑی اکثریت ایک پارٹی، بلکہ ایک ٹیم بن کر رہیں، ان کی قیادت ایک ایسے دیندار گروہ کے ہاتھ میں ہو جو اسلامی مفاد کا صحیح احساس و شعور رکھتا ہو، اور وہ اس گروہ کی ایسی کامل اطاعت کریں کہ ان کا کانگریس میں رہنا بالکل اُنا اس کے حکم پر موقوف ہو۔ مگر کیا بحالتِ موجودہ کانگریس میں ایک مسلم پارٹی کی تنظیم اس طرز پر ہو سکتی ہے؟ واقعات سے اس کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ وہاں جو مسلمان شریک ہیں بظاہر ان سب پر لفظ مسلمان کا اطلاق ہوتا ہے، اور آزادیٔ ہند کے مسئلے میں وہ ہم آہنگ بھی ہیں، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے خیالات اس قدر متضاد ہیں کہ ان کو ایک پارٹی میں منسلک کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک گروہ تو قطعی طور پر اسلام سے منحرف ہو چکا ہے اور حتماً یہ رائے رکھتا ہے کہ ہندوستان کے آئندہ نظام اجتماعی میں مذہب کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ دوسرا گروہ نہ منحرف ہے اور نہ معتقد۔ اس گروہ میں اتنی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں جتنی سانپوں کی اقسام ہیں۔ ان میں سے بعض اسلام کے متعلق خود اپنے کچھ تصورات رکھتے ہیں جن کے لیے کتاب و سنت کی سند غیر ضروری ہے۔ بعض کو مسلمانوں کے سیاسی و معاشی مفاد سے تو فرد

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں :

دلچسپی ہے مگر اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض ایسے ہیں جو مسلمان کے مفاد کو کسی حد تک اہمیت ضرور دیتے ہیں، مگر اتنی نہیں کہ "ملک" کے مفاد کا جو تصور ان کے دماغ میں ہے اس پر مسلمانوں کے مفاد کو قربان کرنے میں انہیں کوئی تامل ہو۔ تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دیندار، اہلِ علم اور نیک نیت ہیں۔ کانگریس میں جب کبھی ہندوستان کے مشترک مفاد کا کوئی مسئلہ اُٹھے گا یہ تینوں گروہ ایک آواز بلند کریں گے۔ مگر جب اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا سوال آئے گا تو یہ اس قدر بھانت بھانت کی بولیاں بولیں گے کہ اسلام اور مسلمان، دونوں غیر مسلموں کے لیے مضحکہ بن کر رہ جائیں گے، اور یہ متعین کرنا بھی مشکل ہو جائے گا کہ حقیقت میں اسلام کیا چیز ہے اور مسلمانوں کا مفاد کس چڑیا کا نام ہے۔

اس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ تینوں گروہ مسلمانوں کو کانگریس میں بھرتی کر رہے ہیں اور اب علمائے کرام کے صدقے میں کانگریس کے ہندو کارکن بھی بھرتی کا کام کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اس طرح جو مسلمان کانگریس میں جا رہے ہیں وہ تینوں گروہوں اور ان کی بے شمار شاخوں میں تقسیم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کانگریس کے ہندو ارکان کی ہمدردیاں تمام تر پہلے گروہ سے وابستہ ہیں۔ خواہ وہ گاندھی جی ہوں یا جواہر لال یا کوئی سخت مہا سبھائی، بہر حال فطرتاً ان سب کا میلان اُن نام نہاد مسلمانوں کی طرف ہے جو اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہو چکے ہیں اور اس وقت ہندوستان میں اسلام اور مسلم قومیت کی جڑیں کاٹنے کے لیے بدترین منافقوں کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ کانگریس کے ذمہ دار عہدے اور کانگریسی حکومتوں کے تحت عزت اور منفعت اور اثر و اقتدار کے مناصب تمام تر انہی منافقین کے لیے وقف ہیں اور رہیں گے۔ ان کے بعد کانگریسی لیڈروں کے نزدیک اگر کوئی گروہ قابلِ ترجیح ہے تو وہ دوسرا گروہ ہے، اور اس گروہ میں سے خصوصیت کے ساتھ وہ طبقہ جو منافقین کے مقام سے اقرب ہے۔ باقی رہا تیسرا گروہ، اور اس سے قریب تر تعلق رکھنے والے طبقے تو ان کو محض آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے جب تک یہ وفادار

خدام کی حیثیت سے صرف رنگروٹ بھرتی کرتے رہیں گے، ان سے مداہنت برتی جائے گی۔ جہاں انہوں نے کچھ زور پکڑا اور اسلامی مفاد کا نام لیا، ان پر منافقین کی اُمت فوج کو ہشکار دیا جائے گا جو اسی دن کے لیے پرورش کی جا رہی ہے۔ ایسے موقع پر ہندو لیڈروں کو خود سامنے آنے کی تکلیف بھی نہ اُٹھانی پڑے گی۔ ہماری اپنی قوم کے منافقین ہی ہمارے دین داروں کو جھنبوڑ کھائیں گے۔ کیا ایسی حالت میں کانگریس کے اندر رہ کر اسلامی مفاد کے لیے کوئی منظم جدوجہد کی جا سکتی ہے؟

اس کے بعد تیسری صورت باقی رہ جاتی ہے۔ جہاں تک اخلاقی اثر اور دلیل و حجت کا تعلق ہے اس کے لیے کثرتِ تعداد کی کوئی حاجت نہیں۔ اگر کوئی جماعت واقعی حق پسند اور انصاف شعار ہے، تو اس کو ایک تنہا شخص بھی حق کا اعتراف کرنے اور انصاف سے کام لینے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ گذشتہ چند مہینوں میں کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو صریح اور ناقابلِ انکار بے انصافیاں کی ہیں، ان میں سے کس کی تلافی ہمارے دیندار کانگریسی بھائیوں نے اپنے اخلاقی اثر اور زورِ استدلال سے کرائی؟ کیا وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم میں ایک شوشے کا بھی تغیر کرا لیا؟ کیا گائے کی قربانی کو دفعہ ۱۴۴ کی زد سے بچا لیا؟ کیا اُس صریح بے انصافی کا کوئی تدارک کرا لیا جو بہار اور سی پی کے ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی گئی؟ جگہ جگہ مدرسوں اور پبلک جلسوں میں مسلمانوں کو بندے ماترم کے لیے قیامِ تعظیمی پر جو مجبور کیا جا رہا ہے۔ کیا اس کا کوئی تدارک کرا لیا؟ اور اگر یہ نہیں تو یہی ارشاد ہو کہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے ہی کے لیے قیامِ تعظیمی ممنوع ہے، اور صرف اسی پر رسالے تصنیف کرنے اور فتوے شائع کرنے کی بھی ضرورت ہے؟ باقی رہا بندے ماترم تو وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے لیے قیامِ تعظیمی کرنے یا نہ کرنے کا سوال معرضِ بحث میں لایا جا سکے؟ سی۔ پی کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہندو وزراء اور ایک مسلمان وزیر کے ساتھ جو مختلف قسم کے طرزِ عمل اختیار کیے، کیا اس پر کوئی نتیجہ خیز بازپرس کرلی؟ حکومت کی طاقت سے اُردو کو دبانے اور ہندی کو اُبھارنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، کیا اُن کو رکوا دیا؟ کانگریسی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکومتوں میں نہایت متعصب اور بدنام ہما سبھائیوں کو جو ذمہ دار عہدے دیے گئے ہیں، کیا ان پر کوئی مؤثر احتجاج کر لیا؟ اگر کوئی کانگریسی مسلمان حق پروری کے ساتھ نہیں بلکہ دیانت اور صداقت کیساتھ ان امور کے متعلق اپنا کوئی کارنامہ پیش کر سکتا ہے تو سامنے آئے اور ضرور آئے۔ اور اگر اس کے پاس ہمارے ان سوالات کا کوئی جواب اس کے سوا نہیں ہے کہ "ہماری پشت پر دین دار مسلمانوں کی اتنی طاقت ہی نہیں جس سے ہم ان بے انصافیوں کا تدارک کر سکیں" تو ہمارا مدعا خود اس کے اپنے اعتراف سے ثابت ہو گیا۔ ہم بھی اس سے یہی اعتراف کرانا چاہتے ہیں کہ وہ ایک ایسی جماعت سے تعاون کر رہا ہے جو حق کو حق اور انصاف کو انصاف کی حیثیت سے قبول کرنے والی نہیں، بلکہ صرف زور اور طاقت کے آگے سر جھکانے والی ہے، لہٰذا اس کے ساتھ تعاون کر کے محض اخلاقی طاقت سے وہ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصّہ چہارم

ہندوستان کے سیاسی مسئلہ

کے

حل کی راہیں

تین تجاویز

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

کانگریس اور قومی تحریک پر شدید تنقید اور متحدہ قومیت کی کلی نفی کے بعد فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ مسلمانوں کے لیے صحیح لائحہ عمل کیا ہے؟ مولانا مودودی صاحب نے اصولی طور پر سب سے پہلے یہ بات واضح کی کہ مسلمان کسی ایسی تحریک سے وابستہ نہیں ہو سکتے جو ہندوستانی قومیت کی داعی ہو۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنی جداگانہ قومیت کے تصور کو ایک سیاسی حقیقت کے طور پر منوائیں اور اسی نقطہ پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دیں۔ پھر آپ نے ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کے لیے تین تجاویز پیش کیں یعنی:

۱۔ تہذیبی بنیادوں پر بین الاقوامی وفاق کا قیام

۲۔ تہذیبی منطقوں کا تعین اور تبدیلی آبادی ـــــ اور

۳۔ تقسیم ملک۔

یہ تجاویز ترجمان القرآن کی اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھیں ـــــ (مرتب)

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باب ۲

مسلمان کیا کریں؟

تین تجاویز

یہ تمام بحث جو اس تفصیل کے ساتھ پچھلے صفحات میں کی گئی ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو ان کے غیر مسلم ہمسایوں سے لڑانا چاہتے ہیں، یا یہ بات ان کے دل میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ان کے اشتراکِ عمل کی کوئی صورت نہیں ہے، یا یہ کہ ہم ان کو نفسِ آزادیٔ ہند کا مخالف بنانے کی فکر میں ہیں محض اس خوف سے کہ ہندو یہاں کثیر التعداد ہیں اور وہ ہم کو کھا جائیں گے۔ کچھ لوگ سمجھ بوجھ کی کمی کے سبب سے، اور کچھ دوسرے لوگ ہوشیاری کی زیادتی کے باعث ہمارے دلائل سن کر بے صبری کے ساتھ اسی نوعیت کے شبہات پیش کرنے لگتے ہیں۔ لیکن ہمارا مدعا دراصل کچھ اور ہے جس کی طرف اپنے مقدمہ میں ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں اور اب ذرا زیادہ تفصیلی صورت میں اسے پیش کرتے ہیں۔

اصل مسئلہ

اس وقت ہندوستان میں ہمارے سامنے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ ہمیں اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنا چاہیے یا نہیں۔ ہم آزادیٔ وطن کے لیے جدوجہد کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یا معطل ہو کر بیٹھے رہیں۔ ہمسایہ قوموں کے ساتھ مل کر چلیں یا لڑ کر گزر کریں۔ اس باب میں ظاہر ہے کہ دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ کم از کم کوئی ذی ہوش آدمی تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمان یہاں تمام دوسری قوموں سے قطع تعلق کر کے بھی رہ سکتے ہیں، یا یہ کہ انہیں آزادی کی ضرورت نہیں ہے، یا یہ کہ ہمسایوں کے درمیان تعلقات کی تلخی اور آئے دن کی سر پھٹول اور اجنبی حکمرانوں کا اس سے فائدہ اٹھانا کوئی مرغوب چیز ہے۔ اسی طرح ہمارے سامنے اصل سوال یہ بھی نہیں ہے کہ اس ملک کے نظامِ حکومت کا ارتقاء جمہوریت کے راستہ پر ہو یا کسی دوسرے راستہ پر۔ کوئی خردمند نفس جمہوریت کی مخالفت نہیں کر سکتا اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں بادشاہی، یا امراء گروہی، ڈکٹیٹرشپ) یا اور کسی طرز کی حکومت ہونی چاہیے۔ درحقیقت جو سوال ہمارے لیے ایک مدت سے پریشان کن بنا ہوا ہے اور روز بروز زیادہ پریشان کن بنتا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ گزشتہ ستر اسی سال سے ہندوستان میں انگریزوں کی غلط رہنمائی و فرمانروائی اور ہندو لیڈروں کی خوش نصیبی و خود غرضی کے سبب سے نظامِ حکومت کا نشوو ارتقاء واحد قومیت کے مفروضے پر جمہوری طرز ادارہ کی صورت میں ہو رہا ہے —— نفس جمہوریت کو اور اس جمہوری طرز ادارہ کو جو واحد قومیت کے مفروضہ پر مبنی ہو، ایک دوسرے سے خلط ملط نہ کرنا چاہیے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا بل ہے اور ایک سے اختلاف کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم دوسرے سے اختلاف کر رہے ہیں۔ اب حقیقت نفس الامری تو یہ ہے کہ یہاں واحد قومیت موجود نہیں ہے اور واحد قومیت جن بنیادوں پر تعمیر ہو سکتی ہے وہ بھی موجود نہیں ہیں۔ لیکن یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہم ہندو، مسلمان، اچھوت، سکھ، عیسائی وغیرہ، سب ایک جغرافی نام اور ایک سیاسی نظام رکھنے والے ملک میں پیدا ہونے اور رہنے بسنے کی وجہ سے ایک قوم ہیں لہٰذا ہمارے درمیان جمہوریت کا یہ قاعدہ جاری ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے کہ ہم میں سے جو جماعت کثیر التعداد ہو اسی کی مرضی کے مطابق حکومت چلے۔ اسی نظریہ کی بنا پر دستورِ حکومت بنایا گیا ہے اور آئندہ جو دستوری ارتقاء ہونے والا ہے اس کے لیے یہی راستہ متعین کر دیا گیا ہے۔ انگریز اپنے زیرک،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کو صحیح سمجھتا ہے اور اس کے پاس طاقت ہے جس کے بل پر وہ ہندوستان کو اسی راستہ پر لیے جا رہا ہے۔ ہندو اپنے لیے اس کو سراسر مفید پاتا ہے اور وہ قوم پرستانہ جوش کے ساتھ اس پر جانے کے لیے آمادہ ہے۔ اس صورتِ حال نے اس کے لیے ہندو قوم پرستی اور ہندوستانی وطن پرستی، دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وطن کی سچی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو آزادی اور خود مختاری ایسے ہی جمہوری نظام کی شکل میں حاصل ہو۔ ہندو قوم پرستی کے جتنے حوصلے اس کے سینے میں فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں وہ بھی سب کے سب اسی ایک چیز میں پورے ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس میں نہ تو کوئی قباحت محسوس کرتا ہے، نہ اس امر کی کوئی وجہ ہے کہ وہ کوئی قباحت محسوس کرے، اور نہ اس کے لیے یا اس کے سرپرست کے لیے اُن لوگوں کے احساسات کو سمجھنا آسان ہے جو اس میں قباحت پاتے ہیں۔ اپنے سرپرست کے ساتھ اس کی کشاکش جو کچھ بھی ہے صرف اس امر میں ہے کہ یہ اس راستہ پر جلدی بڑھنا چاہتا ہے اور دُور تک پہنچ جانا چاہتا ہے، اور وہ اس کی خواہش کو پورا کر دینے میں تامل کر رہا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لیے اس نظام میں قباحت ہے اور اس کی مزید ترقی میں مضرت ہے اور اس کی تکمیل میں ہلاکت ہے۔ ہندو کے برخلاف ہمارا حال یہ ہے کہ اس نظام میں ہمارے قومی حوصلے پورے نہیں ہوتے بلکہ ان کا گلا گھٹ جاتا ہے، ان کی جڑ کٹ جاتی ہے، اس لیے کہ ہم شمار میں کم ہیں اور یہ نظام جو کچھ دیتا ہے اُن کو دیتا ہے جو شمار میں زیادہ ہوں۔ جو کچھ یہ دیتا ہے اگر ہم اسے لینا چاہیں تو لازم آتا ہے کہ اپنی قومی خودی کو خود مٹا دیں، اور اگر ہم اپنی خودی کو باقی رکھنا چاہیں تو یہ ہمیں کچھ نہیں دیتا، جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دستوری ارتقاء کے ساتھ ساتھ تمام طاقت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائے اور وہ بزور ہماری خودی کو مٹائیں۔ اس صورتِ حال نے ہم کو ایسی جگہ لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں ہمیں صرف یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ خودکشی اور سزائے موت میں سے کسی چیز کو منتخب کر لیں۔ ہمارے سامنے زندگی اور آزادی پیش ہی نہیں کی جاتی بلکہ صرف یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ یا تو اپنے وجود کی خود نفی کر دو، یا پھر اپنے آپ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو سپرد کر دو تاکہ نقل کرنے کی یہ خدمت دوسرے انجام دیں۔ پس جو سوال ہم کو حل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ چکر جس میں لا کر ہم پھنسا دیئے گئے ہیں، اس سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

مسلمان ایک قوم

دوسری قلیل التعداد قوموں کی پوزیشن کیا ہے؟ اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ یہ ان کا اپنا کام ہے کہ اس کو سمجھیں اور رائے قائم کریں کہ واحد قومیت پر جمہوری نظام کی تعمیر کے منطقی اور واقعی نتائج انہیں قبول ہیں یا نہیں۔ ہم صرف اپنی پوزیشن کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں اور اسی کے متعلق ٹھیک طور پر کہہ سکتے ہیں۔ ہم ایک مستقل قوم ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک مخصوص اخلاقی و تمدنی قانون پر مبنی ہے۔ اکثریت کی قوم میں اور ہم میں اساسی اور اصولی اختلافات ہیں۔ اس کے اخلاقی و تمدنی اصول ہمارے اصولوں سے مختلف ہیں۔ جب تک یہ اختلاف باقی ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم اور وہ من کل الوجوہ ایک ہو جائیں۔ جن امور کو مشترک کہا جاتا ہے ان میں بھی تفصیلات پر پہنچ کر ہمارے اور ان کے درمیان نقطۂ نظر کا، مقاصد اور ضروریات کا، اصولوں اور طریقوں کا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً تعلیم کو لیجئے۔ جہالت کو دور کرنا اور تعلیم کو عام کرنا اور کار آمد تعلیم دینا ہم بھی چاہتے ہیں اور وہ بھی۔ اس حد تک ہمارے اور ان کے درمیان اشتراک ہے اور ہم بڑی خوشی کے ساتھ اس کارِ خیر میں ان کے ساتھ مل کر جدّوجہد کر سکتے ہیں۔ مگر تعلیم کا مسئلہ تخلیقِ مقصدِ حیات، تعمیرِ ذہنیت، تشکیلِ اخلاق، تصویرِ عادات اور فی الجملہ اس نیشنل ٹائپ کی پرورش کے ساتھ لازمی طور پر جڑا ہوا ہے جسے ایک قوم اپنے اسلاف سے پاتی ہے اور اپنی آئندہ نسلوں میں ترقی کے ساتھ برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ تعلیم کی اس تفصیلی صورت میں ہمارے اور اُن کے درمیان اتفاق نہیں ہے۔ ہم یہ ضرور چاہیں گے کہ ہماری اور اُن کی آئندہ نسلوں میں حُسنِ سلوک ہو، شریفانہ ہمسائیگی کے تعلقات ہوں اور یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ہندوستان کی بھلائی کے لیے کام کریں۔ مگر یہ سب کچھ ہم اپنے نیشنل ٹائپ کا تسلسل

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"قائم رکھنے کے ساتھ چاہیں گے، نہ یہ کہ ہمارا نیشنل ٹائپ ان کے ٹائپ میں گم ہو جائے، یا دونوں گڈمڈ ہو کر کسی بے ہودہ مجموعے یا کثیر منتخبی وضع کے ٹائپ میں تبدیل ہو جائیں۔ لہٰذا تعلیم عمومی کے مسئلہ میں ہمارے اور ان کے درمیان کوئی اشتراکِ عمل ممکن نہیں، نہ یہ ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک اپنی آئندہ نسل کو اطمینان کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دے اور اُسے اختیار دے دے کہ ان کچی لکڑیوں کو جس صورت کا چاہے بنا ڈالے۔ ایسا ہی حال زندگی کے دوسرے اہم مسائل کا بھی ہے۔ خوش حالی ہم بھی چاہتے ہیں، مگر ہمارے اور ان کے معاشی اصول، مناہج، مسائل بالکل یکساں نہیں ہیں۔ اصلاحِ معاشرت کے ہم بھی خواہاں ہیں، مگر اصلاح کے مفہوم و معیار اور معاشرت کے اصول و قوانین میں ہم اور وہ بالکل متفق نہیں ہیں۔ تمدنی ترقی ہمیں بھی مطلوب ہے۔ مگر تمدن کے قالب میں جو روح کام کرتی ہے، اور جو روح اس کی ترقی کا راستہ متعین کرتی ہے، وہ ہمارے اور ان کے درمیان بالکل ایک نہیں ہے۔ پنڈت جواہر لال اور ان کی طرح کے سطح بین لوگوں کے لیے یہ کہہ دینا آسان ہے کہ اب سائنٹفک تمدن کے دور میں ریل، ہوائی جہاز، ریڈیو اور کثیر پیداآوری (Mass Production) نے قوموں کے حدود و امتیاز کو توڑ دیا ہے اور اب قومی تمدن کا زمانہ ختم ہو گیا۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ اس وقت جو تمدن پھیل رہا ہے اس کی یہ خاص صورت مغربی تہذیب نے بنائی ہے اور اس تہذیب کو دنیا پر چھا جانے کا موقع اس لیے مل گیا ہے کہ یہ سائنس کے طاقتور وسائل سے کام لے رہی ہے۔ یہی وسائل ہماری تہذیب کے ہاتھ آجائیں تو وہ اس سے زیادہ صالح اور زیادہ درخشاں تمدن پیدا کرے گی اور وہ بھی اسی طرح قوموں کی حدود امتیاز کو توڑ کر ان کے گھروں تک گھستا چلا جائے گا۔ لہٰذا پنڈت جی جیسے حضرات کی زبان سے بس یہ خبر سن کر کہ اب قومی تمدنوں کا زمانہ لد گیا ہے، ہم ہتھیار نہ ڈال دیں گے اور نہ اس بات کے لیے راضی ہوں گے کہ جو تمدن پھیل رہا ہے اسی میں اپنے آپ کو گم کر دیں۔

خلاصہ یہ کہ ہماری اور ان کی راہیں متوازی (Parallel) تو چل سکتی ہیں اور کہیں کہیں مل بھی سکتی ہیں، لیکن از اول تا آخر ایک ہو جائیں، یہ کسی طرح ممکن نہیں۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو ہمیں اور ان کو ملا کر ایک ایسا نظامِ حکومت کیونکر بنایا جا سکتا

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے جس میں جمہوریت کا قاعدہ نافذ ہو؟ ہم اس بات پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں کہ زندگی کے کسی معاملہ کا جو فیصلہ چار ہندو کر دیں اسے ایک مسلمان بھی مان لے اور صرف اس لیے مان لے کہ یہ ایک ہے اور وہ چار ہیں۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ حکومت کا دائرہ غیر محدود ہے اور پرانے نظریہ سیاست نے جتنے حرم بنائے تھے ان سب کو توڑ کر وہ شخصی زندگی تک گھس گیا ہے، ہم اس اصول کو کس طرح مان سکتے ہیں؟ اس کو مان لینے کے بعد تو لامحالہ دو ہی صورتیں پیش آسکتی ہیں۔

۱۔ اگر ہم حکومت میں عملاً حصہ دار بننا چاہیں تو اپنے امتیازی وجود کو مٹا دیں۔

۲۔ اور اگر اپنے امتیازی وجود کو قائم رکھنا چاہیں تو حکومت سے عملاً بے دخل ہو جائیں۔

یہ ممکن ہے کہ اکثریت فیاضی سے کام لے کر ہمیں ان دونوں مشکلوں سے بچا لے۔ لیکن یہ تو اس کے رحم و کرم کی بات ہے اور کوئی قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی دوسری قوم کے رحم و کرم پر زندہ رہی ہے نہ رہ سکتی ہے۔ یہاں سوال فیاضی کا نہیں ہے بلکہ اس امر کا ہے کہ اس قسم کے جمہوری نظام کی فطرت کیا ہے۔ ایسا جمہوری نظام جب ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر بنایا جائے گا تو عملاً وہ چھوٹی قوم کو بڑی قوم کا محکوم بنا دے گا۔ اس میں بڑی قوم کو خود اختیاری مل جائے گی اور چھوٹی قوم کو بے اختیاری۔ اس میں عمومی حاکمیت کا جمہوری نظریہ قطعی باطل ہو جائے گا۔ بڑی قوم کو بہرحال حاکمیت حاصل ہو گی چاہے وہ اپنی جداگانہ قومیت پر اصرار کرے یا نہ کرے۔ مگر چھوٹی قوم حاکمیت میں حصہ دار نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی قومیت سے دست بردار نہ ہو جائے۔ بڑی قوم اپنے تمام اصولوں پر قائم رہ سکتی ہے اور ان کو نہ صرف اپنے اوپر بلکہ دوسروں پر بھی نافذ کر سکتی ہے۔ مگر چھوٹی قوم کے لیے رفتہ رفتہ اپنے تمام اصولوں کو قربان کر دینا لازم آجاتا ہے۔ وہ دوسروں پر نافذ کرنا تو در کنار خود اپنے اوپر بھی ان کو نافذ نہیں کر سکتی۔ اس کو اپنے اصولِ تہذیب پر رہ کر ترقی کرنے، بلکہ زندہ رہنے کا بھی موقع نہیں مل سکتا۔ اس کے اپنے ہاتھ میں کوئی ایسی طاقت ہی نہیں آتی جس سے وہ اپنی خودی کو آپ برقرار رکھ سکے۔ اس کی خودی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے کہ چاہیں اسے برقرار رہنے دیں یا اپنی خودی میں جذب کر لیں۔ کیا اس کا نام آزادی ہے؟ کیا اسے جمہوریت کہتے ہیں؟ کیا یہ عمومی حاکمیت ہے؟ کیا اس کے لیے ہم لڑیں اور جانفشانی دکھائیں؟ ہمیں آزادی کے لیے لڑنے سے انکار نہیں، مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اس نوعیت کے نظام میں ہمارے لیے آزادی ہے کہاں؟ ہم جمہوریت کے مخالف نہیں۔ مگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جس عمومی حاکمیت کو جمہوریت کہتے ہیں، اس کے اندر ہمارا حصہ کہاں ہے؟ ہم اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے سے انکار نہیں کرتے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اشتراکِ عمل کی صورت کیا ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ مشترک زندگی کے لیے تو اشتراکِ عمل کرنے سے ہمیں انکار نہیں۔ مگر یہاں ہم سے کہا جاتا ہے کہ اپنی قبر کھودنے کے کام میں گورکنوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرو۔ ہمارا جھگڑا اس پر ہے کہ اشتراکِ عمل کی یہ کون سی بنیاد ہے؟ ہم نے تو یہ کبھی نہیں کہا کہ ہم اپنی ہمسایہ قوم سے ملنا نہیں چاہتے، لڑ کر گزر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ملنے کی صورت کیا ہے؟ ہم اس کے ساتھ اس صورت میں مل کر چلنے کے لیے راضی ہیں کہ ہم بھی زندہ رہیں اور وہ بھی۔ مگر یہاں قومی استعلاء و استکبار (National Imperialism) کا بھوت سوار ہے اور مردم خوری کا چسکا لگ گیا ہے۔ کیا ہمیں اس بھوت سے ملنے کے لیے کہا جا رہا ہے؟ کیا اس سے بھی صلح اور دوستی ہو سکتی ہے؟

یہ باتیں ہیں جن پر ہمارے اُن بھائیوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے جو ہمارے خیالات کو سنتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ تم آزادی کے مخالف ہو، اور متحدہ جدوجہد کا دروازہ بند کرتے ہو، اور انگریزی امپیریلزم کو تقویت پہنچاتے ہو۔ ہم ان سے عرض کرتے ہیں کہ بات کی پچ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ معاملہ کسی شخصی جائداد یا کسی پارٹی کے گرنے یا اُٹھنے کا نہیں، بلکہ اُس قوم کی زندگی کا ہے جس کی فلاح و بہبود کے لیے ہم اور آپ سب خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ضد اور ہٹ دھرمی شاید دنیا میں بات بنا دے مگر آخرت میں تو نہ بنا سکے گی۔ لہٰذا لاطائل بلند آہنگی اور بے اصل سخن پروری کو چھوڑیے اور ایمان و احتساب نفس کے ساتھ سوچیے کہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو کچھ ان صفحات میں عرض کیا جا رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ فی الواقع یہ سوال ہندوستان میں امتِ مسلمہ کی زندگی و موت کا ہے اور اس کو حل کرنے کا یہی وقت ہے، اور اس کو آزادیٔ ہند کا مسئلہ حل ہونے تک اٹھا کر رکھنا موجودہ سیاسی حالات میں صحیح نہیں ہے، تو بات آسان ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس چکر سے مسلمانوں کو نکالنے کی معقول صورت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا ہمارا فرض ہے اور ہم اس فرض کو کما حقہٗ ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہیے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہو گی کہ اس مقصد تک پہنچنے کا صحیح راستہ کون سا ہے۔

ا۔ ہمارے پچھلے بیان سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ واحد قومیت کا مفروضہ اور اس پر جمہوریت کی تعمیر ہی دراصل خرابی کی جڑ اور بس کی گانٹھ ہے۔ اب تک ہماری سیاسی پالیسی یہ رہی ہے کہ وطنی قومیت کے اصول کو ہم نے جوں کا توں رہنے دیا، اُن جمہوری ادارات کو بھی قبول کر لیا جو اس غلط قاعدے پر بنائے جاتے رہے، اور اپنا تمام زور صرف اس بات پر صرف کیا کہ اس بد اصل دستور کے اندر کسی طرح اپنے تحفظ کا سامان کریں۔ یہ بُنیادی غلطی تھی اور اب اس کے تلخ نتائج واضح طور پر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ہم سرے سے اپنی اس پوری سیاست پر نظرِ ثانی کریں۔ ہمیں جان لینا چاہیے کہ جس دستورِ حکومت کی بنیاد اِن اصولوں پر ہو اس میں کسی قلیل التعداد قوم کا تحفظ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جداگانہ انتخاب، پاسنگ (Weightage)، نشستوں کا تعین، عہدوں اور مناصب میں حصّہ کی تخصیص، یہ سب قطعی بیکار ہیں جب کہ قلیل و کثیر کو ایک مجموعہ فرض کر کے کثیر کی رائے کو قوتِ نافذہ عطا کر دی جائے۔ خرابی کی اس جڑ کو پا لینے کے بعد ہمیں شاخوں کو چھوڑ کر اپنا پورا زور اسی کے استیصال پر صرف کرنا چاہیے۔ ہماری قومی سیاست کا اوّلین نصب العین اب یہ ہونا چاہیے کہ اس واحد قومیت کے مفروضہ کی دھجیاں بکھیر دیں اور اپنی مستقل قومیت تسلیم کرائے بغیر ایک قدم آگے نہ چلنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیں۔

۲۔ واحد قومیت کا مفروضہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی جمہوریت کا وہ غلط نظریہ بھی آپ سے آپ پاش پاش ہو جاتا ہے جس پر ہندوستان کے موجودہ دستور کی بنا رکھی گئی ہے اور جس کو انہی خطوط پر آگے بڑھانے کے لیے کانگریس اور ہندو سبھا کوشش کر رہی ہیں۔ اگر ہندوستان ایک قوم کا نہیں بلکہ کم از کم دو یا اس سے زائد قوموں کا ملک ہے تو یہاں خالص جمہوریت کے وہ اصول ہرگز نہیں چل سکتے جو صرف ایک قوم کے لیے موزوں ہیں۔ دو الگ قوموں کی ایک ڈیموکریسی اصولاً غلط ہے، عین اصولِ جمہوریت کی نفی ہے، عملاً دنیا کے کسی ملک میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے، اور یہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی جمہوریت دراصل ایک قوم پر دوسری قوم کی قیصریت مسلط کرنے کا مجرب نسخہ ہے۔ ہم اس کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ اس نسخہ کو یہاں آزمایا جائے۔

۳۔ دو یا زاید قوموں کے ملک میں عمومی حاکمیت کی یہ تفسیر بھی قطعاً غلط ہے کہ ہر باشندۂ ملک کو محض باشندۂ ملک ہونے کی حیثیت سے حاکمیت حاصل ہو۔ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے دولتِ مشترکہ میں حصہ دار ہونا اور حاکمیت سے متمتع ہونا ہمارے لیے بالکل بے معنی اور بیکار ہو گا۔ ہماری ہندوستانیت ہماری مسلمانیت سے نہ تو منفک ہو سکتی ہے اور نہ ان دونوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان کسی حال اور کسی حیثیت میں بھی غیر مسلم نہیں ہے۔ وہ اپنے بچے کا باپ، اپنی بیوی کا شوہر، اپنے باپ کا بیٹا اور اپنے بھائی کا بھائی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہے، اور اسلام ہی کا قانون اسے بتاتا ہے کہ ان سب کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے۔ وہ اپنے اہلِ محلہ کا ہمسایہ، اپنے شہر والوں کا رفیق، اپنے وطن والوں کا معاون اور اپنے بنی نوع کا بھائی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت ہی سے ہے، اور اسلام ہی اسے ہمسائگی، رفاقت، تعاون اور برادری کے اصول و حدود بتاتا ہے۔ انسانی تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور نظمِ اجتماعی کے جملہ معاملات میں وہ جیسا اور جس قدر حصہ لے گا، مسلمان ہی کی حیثیت سے لے گا، اس لیے کہ اس کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عین مسلمان ہونے ہی کا اقتضاء یہ ہے کہ ان سب معاملات میں وہ اسلام کا نقطۂ نظر اختیار کرے اور اسلام کے اصول پر چلے۔ اس سے یہ کہنا کہ تو ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں اپنی مسلمان ہونے کی حیثیت کو الگ کر کے ہی حصّہ لے سکتا ہے، در اصل اس سے یہ کہنا ہے کہ تو ہندوستان میں مسلمان بن کر نہیں رہ سکتا۔ دوسری قوموں کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کا منصب نہیں۔ مگر مسلمانوں کے متعلق ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لیے یہ پوزیشن کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔ علاوہ بریں اگر جمہوری حاکمیت کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ ملک کی حکومت میں ہمارا حصّہ صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی دو الگ الگ خانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک خانہ ہندوستانیت کا ہے جس میں ہم حکومت کے حصّہ دار ہیں، اور دوسرا خانہ مسلمان ہونے کی حیثیت کا ہے جس میں ہم حکومت کی طاقت اور اس کے اختیارات سے محروم ہیں۔ بالفرض یہ تقسیم صحیح بھی ہو تو سوال یہ ہے کہ اپنی زندگی کے اس دوسرے خانے کو درست کرنے اور درست رکھنے کے لیے جن وسائل و ذرائع، جن اختیارات و اقتدارات کی ہمیں ضرورت ہے وہ ہم کہاں سے لائیں گے؟ وطنی حکومت میں سے تو یہ چیزیں ہم کو نہیں مل سکتیں کیونکہ اس میں ہمارا حصّہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں ہے۔ کہیں باہر سے بھی ہم اسے نہیں لا سکتے، اور خود اپنے اندر سے بھی اسے پیدا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں وطنی حکومت سے تصادم ہوتا ہے۔ پس لامحالہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کو آزادئ وطن کے بعد بھی آزادی میسّر نہ ہو، اور ہماری تہذیب کا نظام جس طرح انگریز کی غلامی میں زندگی کے اسباب اور ترقی کے وسائل نہ پانے کے سبب سے مضمحل ہو رہا ہے اسی طرح آزادیٔ ہند کے دَور میں بھی مضمحل ہوتا چلا جائے ——— کوئی شخص جو دستوری مسائل کا ذرہ برابر بھی فہم رکھتا ہو اس نتیجہ کا انکار نہیں کر سکتا۔ اور کوئی شخص جس کے دل میں اسلام کی ذرہ برابر بھی وقعت اور مسلمان رہنے کی کچھ بھی خواہش موجود ہو، اس نتیجہ کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہمارے لیے اس امر پر اصرار کرنا قطعاً ناگزیر ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ آزاد ہندوستان کے جمہوری نظام میں ہمارا حصّہ "مسلم ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے ہونا چاہیئے نہ کہ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے۔

یہ تین اہم ترین نکات ہیں جنہیں آئندہ کے لیے مسلمانوں کی قومی پالیسی اور ان کے سیاسی نصب العین کا سنگِ بنیاد قرار دینا چاہیئے ——— ان میں یک سرِ مو بھی کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان نکات سے ہٹنا دراصل موت کے گڑھے میں جانا ہے ——— اب یہ ظاہر بات ہے کہ برٹش گورنمنٹ کا بنایا ہوا دستورِ حکومت اور کانگریس اور مہاسبھا دونوں کا نصب العین ہمارے اِن نکات سے اصولاً متصادم ہوتا ہے اور ہمارے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ اس کو بالکلیہ رد کریں۔ لیکن محض رد کر دینا کافی نہیں ہے۔ یہ محض سلبی چیز ہے جس پر کسی عمارت کی تاسیس نہیں ہوتی۔ ہمیں ایجابی طور پر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتانا چاہیئے کہ ہمارے نکات کی بنیاد پر کون سا دستورِ حکومت بنایا جا سکتا ہے جو ممکن العمل بھی ہو، ملک کی دوسری قوموں کے لیے قابلِ قبول بھی ہو اور جس میں ہمارے قومی حوصلے بھی ٹھیک ٹھیک پورے ہو سکتے ہوں۔

اِس سلسلہ میں ہمارے سامنے مستقبل ہند کی تعمیر کے لیے تین خاکے آتے ہیں جنہیں ہم الگ الگ پیش کریں گے۔

پہلا خاکہ

دو یا زائد قوموں کے ملک میں ایک جمہوری ریاست بنانے کی صحیح اور منصفانہ صورت یہ ہے :-

اوّلاً وہ بین الاقوامی وفاق (International Federation) کے اصول پر مبنی ہو، یا دوسرے الفاظ میں وہ ایک قوم کی ریاست نہیں بلکہ متوافق قوموں کی ایک ریاست (A State of Federated Nations) ہو۔

ثانیاً اس وفاق میں شریک ہونے والی ہر قوم کو تہذیبی خود اختیاری (Cultural Autonomy) حاصل ہو۔ یعنی ہر قوم اپنے مخصوص دائرۂ زندگی میں

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

اپنے گھر کی تنظیم و اصلاح کے لیے حکومت کے اختیارات استعمال کر سکے۔
ثالثاً مشترک وطنی معاملات کے لیے اس کا نظامِ عمل مساویانہ حصّہ داری (Equal Partnership) پر تعمیر کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے حالات کو سیاسی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور حل کرنے کی جن لوگوں نے کوشش کی ہے انہوں نے یہ بات تو تسلیم کر لی ہے کہ اس ملک کے لیے وحدانی (Unitary) طرز کی حکومت موزوں نہیں ہے، بلکہ یہاں ایک اسٹیٹ اگر بن سکتا ہے تو وہ صرف وفاقی اصول پر بن سکتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ وہ حالات کے صرف ایک پہلو کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، دوسرا پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے۔ انہوں نے صرف اس حد تک واقعات کو دیکھا اور سمجھا کہ یہاں دیسی ریاستیں اور برٹش انڈیا کے صوبے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور خود صوبوں کی زبان، روایات، معاشرت اور عمرانی مسائل میں کافی تفاوت ہے۔ اس لیے وہ صرف اس نتیجہ تک پہنچ سکے کہ ان سب کو ایک مرکزی اقتدار کا بالکلیہ تابع بنا دینا درست نہیں ہے بلکہ ان کی اندرونی خودمختاری کو برقرار رکھ کر ان کے درمیان وفاقی تعلق قائم کرنا چاہیے۔ لیکن واقعات کے اس پہلو پر ان کی نگاہ نہیں پہنچی کہ یہاں ریاستوں اور صوبوں کی طرح قوموں کے درمیان بھی اصول، تہذیب، طرزِ زندگی، روایاتِ قومی اور ضروریاتِ اجتماعی میں کافی تفاوت ہے۔ اس حقیقت کو نظرانداز کر دینے کی وجہ سے انہوں نے مختلف قوموں کو ایک وحدانی طرز کی حکومت میں باندھ کر رکھ دیا۔ درانحالیکہ جو وجوہ ریاستوں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی ہوتے ہیں، ان سے زیادہ قوی وجوہ قوموں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی ہیں۔

وفاق کی روح کیا ہے؟ مختصراً اس کو یوں سمجھیے کہ جو جماعتیں کچھ ایسے مشترک اغراض و مفاد رکھتی ہوں کہ ایک دوسرے سے علیحدہ زندگی بسر کرنا ان کے لیے ممکن نہ ہو، اور اس کے ساتھ ان کے کچھ مخصوص حالات بھی ہوں جن کی بنا پر وہ بالکل ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا بھی گوارا نہ کر سکتی ہوں، وہ آپس میں مل کر ایک طرح کی مصالحت (Compromise) کر لیتی ہیں کہ اپنے مخصوص معاملات میں ان کی خودمختاری بھی برقرار

رہے اور مشترک معاملات میں اشتراکِ عمل بھی ہو سکے۔ اِس قسم کے وفاق میں مرکز اور وفاقی اجزاء کے درمیان حاکمیت منقسم ہو جاتی ہے۔ مرکز اور ہر ایک وفاقی جزو اپنے اپنے دائرۂ عمل میں مختار رہتا ہے، نہ ایک کو دوسرے کے دائرے میں گھس آنے کا اختیار رہتا ہے اور نہ آئینی حیثیت سے کسی ایک کو یہ اقتدار حاصل ہوتا ہے کہ دوسرے کو مٹا دے۔ اس طرح کی مصالحت یہ موقع بہم پہنچا دیتی ہے کہ مختلف النوع جماعتیں مشترک ضروریات کے لیے مل کر ایک اسٹیٹ بنا سکیں۔

وفاق کی اِس رُوح کو سمجھ لینے کے بعد کسی سیاسی فہم و بصیرت رکھنے والے شخص کے لیے اس حقیقت کا ادراک کر لینا مشکل نہیں ہے کہ اِس نوعیت کا وفاق جس طرح ریاستوں (یعنی الگ الگ جغرافی خطے رکھنے والی جماعتوں) کے درمیان ہو سکتا ہے، اسی طرح قوموں (یعنی ایک ہی جغرافی خطہ میں رہنے والی مختلف المذہب یا مختلف التمدن جماعتوں) کے درمیان بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ اصولِ وفاق کا انطباق (Application) دونوں صورتوں میں مختلف طرز پر ہوگا۔ متوافق ریاستوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم جس طرح پر کی جاتی ہے، متوافق قوموں کے درمیان وہ اس سے مختلف طریقہ پر ہوگی۔ پہلی چیز کو ہندوستان میں صوبائی خود اختیاری سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسری چیز کو ہم تہذیبی خود اختیاری (Cultural Autonomy) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے بنیادی اصول حسبِ ذیل ہونے چاہئیں:-

۱۔ وفاقی اسٹیٹ بنانے والی ہر قوم صاحبِ حاکمیت قوم (Sovereign Nation) ہو۔ یعنی وہ اپنے دائرۂ عمل میں خود حکومت کے اختیارات استعمال کرے۔

۲۔ تعلیم، مذہبی معاملات (مثلاً عبادت گاہوں اور اوقاف کا نظم و نسق اور مذہبی احکام کو اپنے افرادِ قوم پر نافذ کرنا اور ان احکام کے خلاف اُن کی سرکشی کو روکنا) اور مخصوص تمدنی و معاشرتی مسائل (مثلاً نکاح، طلاق، وراثت) اور قومی طرزِ معاشرت (National Social System) میں ہر قوم کو پُوری حکومتِ خود اختیاری حاصل ہو اور مرکز کو اس میں دخل دینے کا حق نہ ہو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں:

۳- ان اغراض کے لیے ہر قوم کی الگ الگ ضلع وار اور صوبہ وار کونسلیں ہوں اور ان پر ایک سپریم کونسل ہو، مذکورۂ بالا معاملات انہی کونسلوں میں پیش ہوں اور وہیں سے ان کے لیے قوانین منظور کیے جائیں۔ ان قوانین کا مرتبہ عام ملکی قوانین سے کسی طرح کم نہ ہو۔ ان کو نافذ کرنے کے لیے ایک مستقل ہیئت انتظامیہ (Executive) ہو اور وہ قومی کونسل کے سامنے جواب دہ ہو۔ مصارف نظم ونسق کے لیے ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنے کے پورے اختیارات اس قومی نظام کو حاصل ہوں اور ملکی خزانہ میں سے ایک مخصوص حصہ ہر قوم کے لیے مقرر کر دیا جائے، جس طرح وفاقی ریاستوں اور وفاقی مرکز کے درمیان مالیات کی تقسیم ہوا کرتی ہے۔

۴- متوافق قوموں کے درمیان، یا کسی وفاقی جز اور مرکز کے درمیان جو آئینی اختلافات پیدا ہوں ان کا تصفیہ وفاقی عدالت (Federal Court) کرے۔

۵- اپنے مخصوص قوانین کے مطابق فصل خصومات کرنے کے لیے ہر قوم کا مستقل عدالتی نظام بھی ہو جسے عام ملکی عدالتوں کی طرح پورے عدالتی اختیارات حاصل ہوں۔

اس مرحلہ پر تہذیبی خود اختیاری کے صرف اصول بیان کیے جاسکتے ہیں، اگر ان پر اتفاق ہو جائے تو ان کا تفصیلی نقشہ ایک بین الاقوامی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس یا آئین ساز مجلس (Constituent Assembly) میں بنایا جاسکتا ہے[1]۔

---

[1] بعض لوگ اس موقع پر فوراً یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اسلام میں زانی اور سارق اور قاذف کے لیے جو حدیں مقرر ہیں، یا ہندو شاستر میں جو مخصوص قوانین ہیں، کیا ان کو بھی قانون نافذ کیا جائے گا؟ یہ سوال سراسر ناواقفیت پر مبنی ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں بین الاقوامی تعلقات کا تناسب قائم کرنے کے لیے ہم صرف ان قوانین کے نفاذ پر زور دیں گے جو عام ملکی قوانین سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اس کے بعد ہر قوم اپنی تہذیب کے اصولوں کا مظاہرہ کرکے اور ان کے حق میں علمی وعقلی دلائل پیش کرکے رائے عام کو ہموار کرنے کی کوشش کرتی رہے گی اور جس کی تہذیب کے اصول زیادہ طاقتور ہوں گے وہ عام ملکی قوانین کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اس کے بعد مرکزی حکومت کا سوال سامنے آتا ہے۔ مرکزی حکومت سے یہاں ہماری مراد ریاستوں کے وفاق کا مرکز نہیں ہے، بلکہ قوموں کے وفاق کا مرکز ہے، یعنی وہ نظامِ حکومت جسے متوافق قومیں اپنی مشترک اغراض کے لیے بنائیں۔ اس معنی میں صوبوں اور ریاستوں کی حکومت بھی اُسی طرح مرکزی ہے جس طرح وفاقی مرکز (Federal CENTRE)۔ یہ مشترک نظامِ حکومت لامحالہ "مساویانہ حصہ داری" کے اصول پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ صاحبِ حاکمیت قوموں کا وفاق ہے نہ کہ ایک قوم کا وحدانی نظامِ حکومت۔ یہاں پوری احتیاط کے ساتھ اس امر کا انتظام کرنا پڑے گا کہ اصولِ جمہوریت کے لحاظ سے ایک وفاقی جزو کو جو حاکمیت حاصل ہے دوسرا وفاقی جزو اسے سلب نہ کر لے۔ تہذیبی خود اختیاری کی طرح اس کا بھی ایک ڈھانچہ بنا کر ہم یہاں پیش کرتے ہیں جس کی تفصیلی صورت بعد میں ایک آئین ساز مجلس بنا سکتی ہے۔

۱۔ اسٹیٹ کے تشریعی، انتظامی، عدلی اور دفاعی، چاروں شعبوں میں ہر قوم کا حصہ اس کی آبادی کے تناسب سے مقرر کر دیا جائے جو تناسب کے تغیرات کے ساتھ ساتھ متغیر ہو سکتا ہو۔[1] پاسنگ (Weightage) کا طریقہ بالکل اُڑا دیا جائے۔

۲۔ موجودہ طریقِ انتخاب کو بھی بالکل بدل دیا جائے۔ چھوٹے چھوٹے حلقہ ہائے انتخاب بنانے کے بجائے ایک ریاست کے پورے حدودِ ارضی کو ایک حلقۂ انتخاب قرار دیا جائے جس میں ایک ایک نشست کے لیے الگ الگ امیدوار کھڑے نہ ہوں، بلکہ تسلیم شدہ

---

[1] خود غرض لوگ یہاں یہ اعتراض پیدا کر دیتے ہیں کہ اس طرح حصے کرنے سے مناصبِ حکومت کی اہلیت (Efficiency) متاثر ہو جاتی ہے۔ مگر یہ محض ایک فریب ہے اور اس کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ اپنے حق سے زیادہ جو لوگ لے چکے ہیں وہ اس کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ورنہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی قوم میں اہل آدمیوں کی اتنی کمی نہیں ہے کہ نظامِ حکومت کو چلانے کے لیے اپنے تناسب آبادی کے مطابق کام کے آدمی وہ نہ دے سکتی ہو۔ حصے کے سوال کو یہ معنی پہنانا کہ ہم اہلیت کے بجائے محض قومیت کو مدارِ انتخاب قرار دینا چاہتے ہیں؟ ایک ذلیل قسم کی چالاکی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

سیاسی جماعتیں (Recognised Political Parties) اپنے اپنے اُمیدواروں کی فہرستیں پیش کریں اور ان کو کامیاب کرنے کے لیے جدوجہد کریں۔ اِس صورت میں (اور یاد رکھیے کہ صرف اِسی صورت میں) جُداگانہ انتخاب کے طریقہ کو موقوف کر دینا چاہیئے۔ اِس لیے کہ پھر بند قلعوں میں رہنا ہر قوم کے لیے مضر ہو گا۔ جُداگانہ طریقِ انتخاب کی ضرورت صرف اُسی وقت تک ہے جب تک یہاں انگلستان کی بوسیدہ ڈیمو کریسی کے نمونہ پر چھوٹے چھوٹے یک نشستی حلقہائے انتخاب بنائے جاتے ہیں۔ یورپ کی جدید جمہوریتوں میں متناسب نمائندگی (Proportional Representation) کے جو تجربات کیے گئے ہیں اگر ان سے استفادہ کر کے ایک صحیح جمہوری طریقِ انتخاب کر لیا جائے تو پھر جُداگانہ انتخاب کو اُڑا دینا ہو گا تاکہ اوّلاً آبادی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی نمائندگی سے محروم نہ رہ سکے، ثانیاً مقابلہ اشخاص سے اشخاص کا نہ ہو بلکہ پارٹیوں کے اصول اور پروگرام ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئیں، اور ثالثاً ہر پارٹی اپنے اصول اور پروگرام کو لے کر سب قوموں کے پاس جا سکے۔ بہت ممکن ہے کہ ابتداءً ہم اپنے نظم کی کمزوری کے باعث کسی زیادہ منظم جماعت کے مقابلہ میں شکست کھا جائیں، لیکن تہذیبی خود اختیاری کے بعد یہ شکست ہمارے لیے کچھ زیادہ مضر نہ ہو گی، اور مزید برآں کھُلے مقابلہ ہی میں زور آزمائی کرنے سے ہم سیاسی تنظیم کا سبق سیکھ سکیں گے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مقابلہ آزادانہ اور مساویانہ ہو۔ اس کے بعد اگر ہم اپنے نظم کی کمزوری یا اپنے اصول اور پروگرام کی کمزوری کے باعث شکست کھائیں گے تو اس شکست کے مستحق ہوں گے۔

۴۔ جمہوریت کو مؤثر بنانے کے لیے استصوابِ عام (Referendum) کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ نیز رائے دہندوں کو یہ حق بھی دیا جائے کہ جن نمائندوں پر ان کو اعتماد نہ رہا ہو ان کو واپس بُلا لیں۔ یہ بھی انگلستان کی رقیانوسی جمہوریت کا سراسر غیر جمہوری طریقہ ہے کہ نمائندوں کو منتخب کرنے کے بعد رائے دہندے ایک معین مدت تک اپنے ہاتھ کٹوا بیٹھتے ہیں۔ روسو کے بقول انگریز صرف اس وقت آزاد ہوتے ہیں جب وہ پارلیمنٹ کے ارکان کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور جب وہ انہیں منتخب کر لیتے ہیں تو پھر اپنے ہی منتخب کردہ

نمائندوں کے غلام بن جاتے ہیں۔

۴۔ استصواب عام کے ساتھ یہ اصول مقرر کر دیا جاتے کہ جس چیز کی مخالفت ایک قوم کے ووٹر بالاتفاق یا عظیم اکثریت کے ساتھ کریں وہ مجلس قانون ساز میں پاس نہ ہوسکے۔ کیونکہ یہ مخالفت اس بات کی دلیل ہوگی کہ جمہوری نظام کے حصہ داروں میں سے ایک حصہ دار اُس کو اپنے لیے مضر پاتا ہے اور دُوسرا حصہ دار صرف اِس لیے اس کا مؤید ہے کہ وہ اُس کے لیے مفید ہے۔ اس قسم کے کسی قانون یا ریزولیوشن کا پاس ہونا عین اصولِ جمہوریت کی نفی ہوگا۔

۵۔ استصواب عام کے لیے یہ اصول بھی مقرر کرنا پڑے گا کہ اگر کسی قوم کے ووٹروں کی کم از کم اِس قدر فی صدی تعداد استصواب کا مطالبہ کرے تو اس کا انعقاد ضروری ہوگا۔

۶۔ دستور کی ترمیم پر بھی سخت پابندیاں عائد کرنی ہوں گی جن کے لیے امریکہ، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، اور دوسرے جمہوری ممالک کے دساتیر سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

دُوسرا خاکہ

اگر بین الاقوامی وفاق کی یہ صورت قبول نہ کی جاتے تو دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ مختلف قوموں کے الگ الگ حدودِ ارضی مقرر کر دیتے جائیں جہاں وہ اپنے جمہوری اسٹیٹ بنا سکیں۔ پچیس سال یا اس سے کچھ کم و بیش مدت تبادلۂ آبادی کے لیے مقرر کر دی جاتے۔ ہر اسٹیٹ کو زیادہ سے زیادہ اندرونی خود مختاری دی جاتے، اور وفاقی مرکز کے اختیارات کم از کم رکھے جائیں۔ اس صورت میں ہم غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ مل کر ایک وفاقی اسٹیٹ بنانے پر نہ صرف راضی ہو جائیں گے، بلکہ اس کو ترجیح دیں گے۔

میرے دوست ڈاکٹر عبد اللطیف صاحب نے حال میں ہندوستان کے تہذیبی مستقبل (Cultural Future of India) پر جو مقالہ حیدرآباد سے شائع کیا ہے وہ ہندوستان کی مستقل قوموں کے درمیان ارضی حدود کی تقسیم کا بہترین نقشہ پیش کرتا ہے، یہ ایک منصفانہ تقسیم ہے جس کی رُو سے مشرقی بنگال، حیدرآباد، بھوپال، جوناگڑھ،

جاورہ، ٹونک، اجمیر، دہلی وارد ھ، شمالی و مغربی پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے حلقے مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ پچیس سال کی مدت میں ہندوستان کے دوسرے خطوں سے ہجرت کر کے مسلمان ان حلقوں کے اندر سمٹ جائیں اور ہندو قریب کے علاقوں میں چلے جائیں۔ بقیہ ہندوستان میں اگر اچھوت اپنی الگ قومیت بنانا چاہیں تو ان کے لیے بلحاظ ان کی آبادی کے مستقل رقبے مخصوص کیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ گاندھی جی خودکشی کی دھمکی دے کر ان کی آزادیٔ رائے کو پھر نہ سلب فرمالیں۔ اسی طرح سکھوں کو بھی ان کی آبادی کے لحاظ سے ایک رقبہ دیا جا سکتا ہے۔

تیسرا خاکہ

اگر یہ صورت بھی منظور نہ ہو تو پھر بطور آخر ہم یہ مطالبہ کریں گے کہ ہماری قومی ریاستیں الگ بنائی جائیں اور ان کا علیحدہ وفاق ہو۔ اسی طرح ہندو ریاستوں کا بھی ایک جداگانہ وفاق ہو، اور پھر ان دو یا زائد وفاقی مملکتوں کے درمیان ایک طرح کا تحالف (Confederacy) ہو جائے جس میں مخصوص اغراض، مثلاً دفاع اور مواصلات (Communications) اور تجارتی تعلقات کے لیے مقررہ شرائط پر تعاون ہو سکے۔

یہ تین خاکے جو ہم نے تجویز کیے ہیں، ان میں سے جس کو بھی قبول کر لیا جائے اس پر ہم مفاہمت کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی چوتھی یا پانچویں صورت پیش کی جائے تو اس پر بھی غور کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ہندو ہمسایوں اور ان کے انگریز سرپرستوں کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ موجودہ کانسٹی ٹیوشن اور ہر وہ نظام حکومت جو واحد قومیت کی بنا پر جمہوری ادارات قائم کرتا ہو، کسی حال میں ہمارے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس بنیادی غلطی سے پاک کر کے جو دستور بھی پیش کیا جائے اس کو اور صرف اسی کو زیرِ غور لایا جا سکتا ہے۔

آخری سوال

اپنے قومی نصب العین کی اس تشریح کے بعد ہمارے لیے آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ یہاں اس سوال کی تفصیلات پر بحث کرنے

 www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا موقع نہیں۔ مختصراً ایک بات میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ حالات جس حد تک پہنچ گئے ہیں ان میں ہمارے لیے انقلابی ذرائع اختیار کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے قومی رہنماؤں اور سیاسی اداروں نے گزشتہ دس پندرہ سال کی مدت میں انتہا درجہ کی بے بصیرتی اور ناعاقبت اندیشی سے کام لیا ہے اور اس کے برعکس ہماری ہمسایہ قوم کو اعلیٰ درجہ کے دانش مند اور مدبر رہنما میسر آ گئے ہیں۔ اس نامساوی مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج ہم اس ملک کے سیاسی ترازو میں بہت بے وزن ہیں اور ان کا پلڑا بہت جھک چکا ہے۔ اب وہ اپنی کامیابی کی منزل سے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور متعدد اسباب سے جن کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، انگریز بھی دانستہ یا نادانستہ وہی طریق دستور سازی اختیار کرنے پر اصرار کر رہا ہے جو سراسر انہی کے لیے مفید ہے۔ ایسی حالت میں یہ توقع کرنا انتہا درجہ کی خام خیالی ہوگی کہ محض زورِ استدلال یا افہام و تفہیم یا آئینی چالوں سے ہم ہندوؤں اور انگریزوں کو ان کے وہ اصول اور مقاصد یکسر بدل ڈالنے پر آمادہ کر سکیں گے جو نہ صرف ان کے عقیدے میں درست ہیں بلکہ ان کی اغراض کے لیے مفید بھی ہیں۔ اب آئینی تدبیروں کے لیے کامیابی کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے۔ اب کوئی پارٹی اور کوئی اوکاٹل ہماری لڑائی نہیں جیت سکتا۔ اب صرف جان و مال کی قربانیوں ہی سے واقعات کی رفتار بدلی جا سکتی ہے۔ جب تک ہم ثابت نہ کر دیں گے کہ یہ کانسٹی ٹیوشن ہمارے زندہ سروں پر نہیں بلکہ قبروں پر ہی نافذ کیا جا سکتا ہے، اور جب تک ہم اپنے عمل سے یہ نہ بتا دیں گے کہ مسلمان اپنی قومی زندگی کے لیے مرنے کی طاقت رکھتا ہے اس وقت تک اس کانسٹی ٹیوشن کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے نہ ٹلے گا، اور نہ قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ ہم پر مسلط ہونے سے باز رہے گا جس کے لانے پر انگریز، ہندو اور ہمارے منافقین اور بہت سے صم بکم عمی فھم لا یعقلون مل جل کر کوشش کر رہے ہیں۔ مسلمان انتہا درجہ کے نادان ہوں گے اگر وہ اب بھی حالات کی نزاکت کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھیں گے۔ وہ ابھی تک اس دھوکے میں پڑے ہوتے ہیں کہ ان کو یہ نمائشی جلسے اور جلوس اور کھوکھلے مظاہرے قومی ہلاکت سے بچا لیں گے۔ وہ ان لوگوں کی لیڈری پر اعتماد کر رہے ہیں جن کے سامنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنی وزارت اور وجاہت کے سوا کوئی چیز نہیں، جو اپنی قوم کے لیے اپنا بال تک بیکا ہونا گوارا نہیں کر سکتے، جو مسلمانوں کے مفاد کا نام صرف اس لیے بلند آہنگیوں کے ساتھ لیتے ہیں کہ ایوانِ وزارت پر ان کا قبضہ رہے، جن کی بزدلی پر دشمنوں تک کو پورا پورا اعتماد ہے، جنہیں چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ جیل میں جانے اور لاٹھیاں کھانے کو تیار ہو تو ہم تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہیں اور وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کے بجائے کنی کاٹ جاتے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ یورپ میں سرکارِ برطانیہ کو جنگ کا خطرہ پیش آتا ہے تو یہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کرتے ہیں۔ ایسے لیڈروں سے اگر مسلمان یہ توقع باندھے بیٹھے ہیں کہ یہ ان کی کشتی کو بھنور سے نکال لیں گے تو میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ان کی کشتی ڈوب کر رہے گی۔ یہ تقریروں کا نہیں بلکہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اگر مسلمان جینا چاہتے ہیں تو ان کو اور خصوصاً ان کے نوجوانوں کو اپنا گرم خون زندگی کے لیے بھینٹ چڑھانے پر تیار ہونا چاہیئے۔

پوچھا جاتا ہے کہ انقلابی ذرائع سے تمہاری مراد کیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس کا کیا جواب دوں۔ جب تک کہ قوم کی ایک بڑی تعداد ایک نصب العین پر متحد نہ ہو جائے اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کا عزمِ صمیم اس میں پیدا نہ ہو جائے، انقلابی ذرائع کی ایک فہرست پیش کر دینا کسی یاوہ گو ہی کا کام ہو سکتا ہے، اور میں یاوہ گوئی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com
www.KitaboSunnat.com

تحریکِ آزادیٔ ہند

اور

مُسلمان

حصّہ دوم

"مُسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سومؔ اور اضافوں پر مشتمل ہے"

سیّد ابوُالاعلیٰ مودُودیؒ

اِسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۱۳۔ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور (پاکستان)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر واشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشر واشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com
www.KitaboSunnat.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فہرست مضامین

مقدمۂ طبع اوّل (فروری ۱۹۴۱ء)	۹
تعارفِ مقصد (جولائی ۱۹۳۹ء)	۱۷
تحریکِ اسلامی کا تنزل (نومبر ۱۹۳۹ء)	۲۹
نسلی مسلمانوں کے لیے دوراہیں (مئی ۱۹۳۹ء)	۴۹
اقلیت و اکثریت (جون ۱۹۳۹ء)	۶۳
شکایات (دسمبر ۱۹۳۹ء)	۶۹
راہ رو پشت بمنزل (جنوری ۱۹۴۰ء)	۸۱
اسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین (مئی و جون ۱۹۴۰ء)	۹۳
اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہ عمل (جولائی ۱۹۴۰ء)	۱۰۹
اسلام کی راہِ راست اور اس سے انحراف کی راہیں (محرم ۶۰ھ - جنوری ۱۹۴۱ء)	۱۲۱
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟ (ستمبر ۱۹۴۰ء)	۱۶۱
ایک صالح جماعت کی ضرورت (اپریل ۱۹۴۱ء)	۲۰۱
اضافے	۲۱۵
مطالبۂ پاکستان کو یہود کے قومی وطن سے تشبیہ دینا غلط ہے (ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۴ء)	۲۱۷
مسلم لیگ سے اختلافات کی نوعیت (ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۴ء)	

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وقت کے سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی کا مسلک (ستمبر و اکتوبر ۴۵ء) ۲۲۵

نظامِ کفر کی قانون ساز مجالس میں مسلمانوں کی شرکت کا مسئلہ (محرم ۶۵- دسمبر ۴۵ء) ۲۲۹

مجالس قانون ساز کی رکنیت شرعی نقطۂ نظر سے (محرم ۶۵- دسمبر ۴۵ء) ۲۳۳

پُرامن انقلاب کا راستہ (محرم ۶۵- دسمبر ۴۵ء) ۲۳۷

۱۹۴۶ء کے انتخابات اور جماعت اسلامی (فروری ۴۶ء) ۲۴۱

تقسیم سے قبل ہندوستان کے مسلمانوں کو آخری مشورہ (اپریل ۴۷ء) ۲۶۱

صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں جماعت اسلامی کا مسلک (جولائی ۴۷ء) ۲۸۷

تقسیم ہند کے حالات پر تبصرہ (جون ۴۸ء) ۲۸۹

تقسیم کے وقت مسلمانوں کی حالت کا جائزہ (جولائی ۴۸ء) ۳۰۱

تقسیم کے بعد سامنے آنے والے اہم مسائل (اگست ۴۸ء) ۳۱۴

کیا پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیے (مئی ۴۸ء) ۳۲۷

پاکستان میں اسلامی قانون کیوں نہیں نافذ ہو سکتا؟ (جنوری ۴۸ء) ۳۳۵

پاکستان میں اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے؟ (فروری ۴۸ء) ۳۶۵

مطالبۂ نظام اسلامی (اپریل و مئی ۴۸ء) ۳۸۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

میری اس کتاب کا حصۂ اوّل اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے جو دراصل تین اجزاء پر مشتمل تھا۔

۱۔ میرے وہ مضامین جو ۱۹۳۷ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصۂ اول" کے نام سے ابتداءً شائع ہوتے تھے اور پھر ایک مدت تک اِسی نام سے کتابی صورت میں شائع ہوتے رہے۔

۲۔ وہ مضامین جو میں نے ۱۹۳۸ء میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصۂ دوم" کے نام سے شائع کیے تھے اور وہ بھی ایک مدت تک اِسی نام سے شائع ہوتے رہے۔

۳۔ میری کتاب "مسئلۂ قومیت" کے بعض حصے جو ۱۹۳۹ء میں لکھے گئے تھے۔ ان سب کا موضوع ہندوستان کے مسلمانوں کو اُن خطرات سے آگاہ کرنا تھا جو ملک کے تمام باشندوں کو ایک قوم فرض کر کے ایک لادینی جمہوری قومی ریاست میں ضم کر دینے سے ان کے دین، ان کی تہذیب اور ان کی انفرادیت کو لاحق ہو سکتے تھے۔ اگرچہ اب وہ زمانہ گزر چکا ہے اور حالات بدل گئے ہیں، لیکن بہر حال ان مضامین کی ایک تاریخی اہمیت تھی، اس لیے ان کو "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" حصۂ اول کے نام سے از سرِ نو شائع کیا گیا۔

اب اسی کتاب کا یہ دوسرا حصہ شائع کیا جا رہا ہے جو دو اجزاء پر مشتمل ہے:

۱۔ میرے وہ مضامین جو مئی ۱۹۳۹ء سے اپریل ۱۹۴۱ء تک لکھے گئے تھے اور مسلمان اور موجودہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیاسی کشمکش حصہ سوم کے نام سے اُسی زمانے میں شائع ہو چکے تھے۔ ان میں سے ہر مضمون کی تاریخ اشاعت درج کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کیا بات کن حالات میں کہی گئی تھی۔

۲۔ وہ مضامین جو سیاسی کشمکش حصہ سوم کی اشاعت کے بعد اسی موضوع سے تعلق رکھنے والے مسائل پر ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک لکھے گئے۔ یہ سب مضامین اگرچہ رسالہ ترجمان القرآن میں اپنے اپنے وقت پر شائع ہوتے رہے تھے لیکن ان کو کہیں یکجا مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ اب پہلی مرتبہ ان کو مرتب کر کے اس کتاب میں اُن کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اور ان میں سے بھی ہر مضمون کی تاریخ اشاعت درج کر دی گئی ہے تاکہ ہر بات کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا اور سمجھا جا سکے۔

چونکہ یہ مضامین ——— خصوصاً اس کتاب کے جزو اول کے مضامین ——— برسوں سے میرے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کے لیے خوب خوب استعمال ہوتے ہیں اور ان کی عبارتوں کو سیاق و سباق سے الگ کر کے عجیب عجیب معنی پہنائے جاتے رہے ہیں، اس لیے میں نے ترتیب و نظر ثانی کے وقت ان کی عبارات میں کوئی تغیر نہیں کیا ہے۔ اگر کسی چیز کی تشریح کرنے یا کسی چیز کا اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے تو اسے حاشیہ کی صورت میں درج کیا ہے، اور قدیم و جدید حواشی کے درمیان فرق کرنے کے لیے قوسین میں قدیم، یا جدید کے الفاظ لکھ دیئے ہیں، تاکہ کوئی غلط فہمی بھی پیدا نہ ہو، اور کوئی یہ بھی نہ کہہ سکے کہ معترضین کے اعتراضات سے بچنے کے لیے عبارتوں میں ردوبدل کر دیا گیا ہے۔

یہ بھی ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ میں ۱۹۲۹ء سے تقسیم ہند کے وقت تک ہندوستان کے مسلمانوں سے کیا کہتا رہا ہوں، اور تقسیم کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کو میں نے اسلام کے اصل نصب العین کی طرف توجہ دلانے کے لیے ۱۹۴۸ء میں کس طرح اپنی کوششوں کا آغاز کیا، تقسیم کے بعد گزشتہ ۲۵ سال کے دوران میں پیش آنے والے حالات کو نگاہ میں رکھ کر ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ جو کچھ میں نے اُس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وقت لکھا تھا وہ حق تھا یا نہیں۔ معترضین کے پیش کردہ اقتباسات، جو زیادہ تر سیاق و سباق سے الگ نکال کر اور تاریخی سیاق کو بھی نظر انداز کر کے پیش کیے گئے ہیں، کسی شخص کو صحیح اور منصفانہ رائے قائم کرنے میں مدد نہیں دے سکتے۔ میری اصل عبارتیں پوری تاریخی ترتیب کے ساتھ بے کم و کاست اس کتاب میں ناظرین کے سامنے موجود ہیں۔ انہیں پڑھیں اور جو رائے قائم کرنا چاہیں کریں۔

لاہور

یکم نومبر ۱۹۷۲ء

ابو الاعلیٰ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ طبع اوّل

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کے دو مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں[1]۔ اب اُسی سلسلہ کا یہ تیسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ بظاہر پہلے دونوں مجموعوں سے اِس تیسرے مجموعہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں یوں محسوس کرے گا کہ مَیں نے حصّہ دوم کے بعد سے یکایک اپنی پوزیشن بدل دی ہے اور خود اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگا ہوں۔ لیکن دراصل اِن تینوں مجموعوں میں ایک نصب العین کی طرف تدریجی ارتقاء ہے جس کی توضیح یہاں کر دینا چاہتا ہوں تاکہ ناظرین کو کسی قسم کا خلجان پیش نہ آئے۔

یہ بات تھوڑے سے غور و تامل سے ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک پُرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کا کام کسی نئی تحریک کی ابتداء کرنے کی بہ نسبت زیادہ دشوار اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ نئی تحریک پیش کرنے والے کا راستہ تو بالکل صاف ہوتا ہے۔ اُسے صرف اُن لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے جو

---

[1] اب یہ دونوں مجموعے "تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان" حصّہ اوّل کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ "مسئلہ قومیت" مستقل کتاب کی صورت میں بھی مل سکتی ہے (جدید)

اُس تحریک سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ اُس کو محض اپنے اصول و مقاصد کی تبلیغ کرنی ہوتی ہے۔ پھر یا تو لوگ اُس کی دعوت کو رد کر دیتے ہیں یا قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن جو کسی پرانی تحریک کو زوال و انحطاط کے بعد دوبارہ زندہ کرنا چاہے اُس کے لیے صرف یہی ایک کام نہیں ہوتا کہ بیگانوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرے، بلکہ اسے یگانوں پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ وہ اُن لوگوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا جو پہلے سے اُس تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں اور بہرحال بیگانوں کی بہ نسبت اس سے قریب تر ہیں۔ اُس کو سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ انحطاط کا عمل اُن کے اندر کہاں تک ہو چکا ہے اور اصل تحریک کا اثر کس حد تک اُن میں باقی ہے۔ پھر اُسے یہ فکر کرنی پڑتی ہے کہ جس حد تک بھی وہ دُور نکل گئے ہیں اس سے آگے نہ جانے پائیں، اور جو کچھ اثر اُن کے اندر باقی ہے وہ محفوظ رہے۔ اُن کی حیثیت اُس تحریک کے حق میں بالکل اُس سرمایہ کی سی ہوتی ہے جو کسی شخص کے پاس بچا کھچا باقی رہ گیا ہو، اور ظاہر ہے کہ ایک عقلمند آدمی کسی طرح یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ جو کچھ اس کا ہے وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہے۔ لہٰذا اس کے لیے ناگزیر ہوتا ہے کہ اس تحریک کے ساتھ لوگوں کی وابستگی جیسی کچھ بھی برسرِ دست ہے اُس کو کم از کم اُسی حد پر برقرار رکھنے کی کوشش کرے اور اس کو مزید اضمحلال سے روکے۔ تحفظ کی اس تدبیر میں کسی حد تک کامیاب ہو جانے کے بعد اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ انہیں موجودہ حالت پر نہ ٹھیرنے دے بلکہ اصل تحریک کی طرف ان کو کھینچنے کی کوشش کرے اور کسی دوسری چیز کو ان کا نصب العین اور ان کی کوششوں کا مرکز و محور نہ بننے دے۔ اتنے مرحلوں سے گزر کر پھر کہیں اس کے لیے دعوتِ عام کا موقع آتا ہے اور وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے ایک نئی تحریک پیش کرنے والے کا کام شروع ہوتا ہے۔

چونکہ میرے پیشِ نظر تحریکِ اسلامی کا احیاء ہے اس لیے مجھے بھی اُسی تدریج کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنی پڑی ہے جس کی طرف اُوپر

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

اشارہ کیا گیا ہے۔ "ترجمان القرآن" کی زندگی کے ابتدائی چار سال اس کوشش میں صرف ہوتے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں گمراہی کی جو جو شکلیں پیدا ہو گئی ہیں ان پر گرفت کی جائے اور اسلام سے جو روز افزوں بُعد ان میں پیدا ہو رہا ہے اُسے روکا جائے[۱]۔ ابھی یہ کوشش جاری تھی کہ ۳۷ء میں یکایک یہ خطرہ سامنے آگیا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اُس وطنی قومیت کی تحریک کے شکار نہ ہو جائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم موجودہ ظالمانہ نظامِ حکومت[۲] کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں، اور ہمارے دل میں اس کے پنجے سے نکلنے کی خواہش چاہے کانگریسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اِس وقت تک تھوڑے سے یا بہت اسلام کے حلقۂ اثر میں ہیں اُن کو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی ربطِ عوام (Mass Contact) کی تدبیروں سے، اور اپنی وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کے ذریعہ سے، اور اپنے سیاسی و معاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کر لے، اور ان کے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کر دے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندوستان کی آبادی میں اسلام اتنا ہی اجنبی ہو کر رہ جائے جتنا جاپان یا امریکہ میں ہے[۳]۔ اس خطرہ کو جس چیز نے اور زیادہ پریشان کن بنا دیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ با اثر طبقہ وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اِس چیز کی طرف سے

---

[۱] میری کتاب "تنقیحات" اسی کوشش کا آئینہ ہے۔ (قدیم)

[۲] مراد ہے انگریزی حکومت جو اس وقت برِ صغیر ہند و پاکستان پر مسلط تھی۔ (جدید)

[۳] اس کا پس منظر سمجھنے کے لیے میری کتاب "تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان" حصہ اول ملاحظہ فرمائیں۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بالکل آنکھیں بند کر لیں کہ اس تحریک کا فروغ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہو گا[1]۔ لہٰذا اس خطرے کا سدِ باب کرنے کے لیے میں نے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۳۷ء کے آخر میں اور پھر دوسرا سلسلہ ۳۸ء کے آغاز میں شائع کیا۔ ان مجموعوں میں میرے پیشِ نظر صرف یہ چیز تھی کہ مسلمان کم از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبے سے نیچے نہ جانے پائیں اور اپنے تشخص کو گم نہ کر دیں۔ اس لیے میں نے ان کے اندر اسلامی قومیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی، ان کو اُس جمہوری لادینی نظامِ حکومت کے نقصانات سے آگاہ کیا جو واحد قومیت کے مفروضہ پر ہندوستان میں قائم کیا جا رہا تھا، اُن آئینی تحفظات اور "بنیادی حقوق" کی حقیقت واضح کی جن پر اعتماد کر کے مسلمان اُس مہلک جمہوری دستور کے جال میں پھنسنے کے لیے آمادہ ہو رہے تھے، اور ان کے سامنے "شبہ دار الاسلام"[2] کا نصب العین پیش کیا تاکہ کسی نصب العین کے موجود نہ ہونے سے خیالات اور اعمال کی جو پراگندگی اُن کے اندر پیدا ہو گئی ہے وہ بھی دور ہو اور اُن کو نظر جمانے کے لیے ایک ایسا مطمحِ نظر بھی مل جائے جو نہ تو اصل اسلامی سمت سے ہٹا ہوا ہو اور نہ اتنا زیادہ بلند ہو کہ اُس کی بلندی کو دیکھ کر ان کی ہمتیں پست ہو جائیں۔

اُس وقت چونکہ تحفظ کا کام مقدم تھا اس لیے میں نے آزادی، قومیت، قومی تہذیب، حکومتِ خود اختیاری، اقلیت و اکثریت وغیرہ کے متعلق رائج الوقت تصورات کے خلاف کچھ کہنے سے قصداً احتراز کیا، اور ان الفاظ کے جو مفہومات ذہنوں میں راسخ تھے ان کو جوں کا توں قبول کر کے اُسی زبان میں گفتگو کی جس کو لوگ

---

[1] مراد ہے علماء کا وہ گروہ جو اُس وقت کانگریس کا ساتھ دے رہا تھا۔ (جدید)

[2] یعنی ہندوستان اگر پورا دار الاسلام نہ بن سکے تو دار الاسلام سے مشابہ ایک ایسا ملک بن جائے جس میں ان کا اسلامی تشخص برقرار رہ سکے۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

سمجھ سکتے تھے۔ اِسی طرح مَیں نے مطلوب اصلی سے بحث کرنے کے بجائے حالتِ واقعی تک اپنی بحث کو محدود رکھنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ دونوں چیزوں کو بیک وقت پیش کرنے سے دماغ پراگندہ نہ ہو جائیں اور ایک ہی چھلانگ میں مقصدِ بعید تک پہنچنے کی کوشش کہیں مقصدِ قریب کے بھی ہاتھ سے جانے کی موجب نہ بن جاتی۔

یہ کام جس غرض کے لیے کیا گیا تھا اللہ کے فضل و کرم سے وہ پچھلے دو تین سال میں حاصل ہو چکی ہے اور اب اس امر کا کوئی خطرہ باقی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی وطنی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دیں گے یا اپنے آپ کو کسی ایسے جمہوری نظام میں ضم کرالیں گے جو واحد قومیت کے مفروضہ پر تعمیر کیا گیا ہو۔ یہ جو کچھ ہوا کسی انسانی کوشش سے نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوا۔ اُسی کی مہربانی سے متعدد اسباب ایسے پیدا ہوئے جن کی بدولت مسلمان اس خطرے سے بچنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اِس سلسلہ میں جن جن لوگوں کو اس نے تھوڑی یا بہت خدمت کی توفیق بخشی ان کے لیے فخر کا مقام نہیں بلکہ شکر کا مقام ہے۔

اس مرحلہ کے طے ہو جانے کے بعد اب میرے سامنے دوسرا سوال یہ تھا کہ آیا مسلمانوں کو اُس نتیجہ پر مطمئن ہو رہنے دیا جائے جو حاصل ہو چکا ہے یا ان میں مزید بے چینی پیدا کر کے انہیں اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی جائے؟ آیا مسلمانوں کو سیاست و اجتماع کے اُنہی غلط تصورات میں مبتلا رہنے دیا جائے جو مغربی جاہلیت سے اُنہوں نے سیکھے ہیں یا اُن کے سامنے اسلام کے اجتماعی و سیاسی تصورات کو صرف علمی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک عملی مطمحِ نظر کی حیثیت سے بھی پیش کر دیا جائے؟ آیا مسلمانوں کو محض اپنی انفرادیت کے سنبھالنے ہی میں لگا رہنے دیا جائے یا انہیں یہ بتایا جائے کہ تمہاری انفرادیت مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک عظیم تر مقصد کے لیے مطلوب ہے؟ یہ سوال سامنے آتے ہی میرے ضمیر نے قطعی فیصلہ صادر کیا کہ پہلی شق غلط ہے اور صرف دوسری شق ہی صحیح ہے۔

چنانچہ اگر کوئی دوسرا سبب پیش نہ آتا تب بھی مجھے وہ کام کرنا ہی تھا جو میں نے کیا۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے ساتھ دو مزید وجوہ ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے مجبور کر دیا کہ پچھلے مجموعہ کی اشاعت کے فوراً بعد ہی اُن مضامین کا سلسلہ شروع کر دوں جن کا مجموعہ اس وقت ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نئی تحریک کے دَور میں عامۂ مسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دُنیوی مفاد کے لیے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے اور اُس قدرِ قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے۔ یہ براہِ راست نتیجہ ہے علماء کرام کی اُس غلط سیاسی روش کا جس پر وہ ابھی تک اصرار کیے چلے جا رہے ہیں۔ اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمائے دین سے ہٹ کر اِس شدت کے ساتھ غیر دیندار اور ناواقفِ دین رہنماؤں پر نہیں جما تھا۔ میرے نزدیک یہ صورتِ حال اسلام کے لیے وطنی قومیت کی تحریک سے کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ٹرکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں[1]) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رُل مِل جائے[2]۔

---

[1] یہ اُس وقت کی کیفیت تھی جب یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ (جدید)

[2] یہ بات جب لکھی گئی تھی تو لوگوں کو بہت ناگوار ہوتی تھی۔ لیکن اب ۱۹۷۲ء کے پاکستان میں جو حالت ہے اسے سب دیکھ رہے ہیں۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسری وجہ یہ تھی کہ مَیں نے اس تحریک کے اندر داعیۂ دینی کے بجائے داعیۂ قومی کو بہت زیادہ کارفرما دیکھا۔ اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام اور مسلم قوم پرستی ایک مدت سے خلط ملط ہیں، لیکن قریبی دَور میں اس معجون کا اسلامی جُزء اتنا کم اور قوم پرستانہ جُزء اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس میں نِری قوم پرستی ہی قوم پرستی نہ رہ جائے۔ حد یہ ہے کہ ایک بڑے ممتاز لیڈر کو ایک مرتبہ اس امر کی شکایت کرتے ہوئے سُنا گیا کہ بمبئی اور کلکتہ کے دولتمند مسلمان اینگلو انڈین فاحشات کے ہاں جاتے ہیں حالانکہ مسلمان طوائفیں ان کی سرپرستی کی زیادہ مستحق ہیں! اس حدِ کمال کو پہنچ جانے کے بعد اس مسلم قوم پرستی کے ساتھ مزید رواداری برتنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔ یہ ظاہر بات ہے کہ مستحکم جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے افراد میں بہرحال کوئی ایک مشترک وفاداری پیدا کرنا کافی ہے، خواہ وہ خدا کی وفاداری ہو یا قوم کی یا وطن کی۔ اِس لحاظ سے جن لوگوں کو محض جماعتی استحکام مطلوب ہے اُن کے لیے تو یہ امر کسی تشویش کا باعث نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں میں خدا کے بجائے قوم کی مشترک وفاداری سے یہ مقصد حاصل ہو، لیکن ہم خدا پر ایمان رکھنے والوں کو آخر کس زمین میں پناہ اور کس آسمان کے نیچے سر چھپانے کی جگہ ملے گی اگر ہم بھی خدا کے اِن بندوں کو خدا کے بجائے کسی اور کی مشترک وفاداری پر مجتمع ہوتے دیکھتے رہیں اور کچھ نہ بولیں۔

یہ ہیں وہ محرکات جن کے تحت اس مجموعہ کے مضامین لکھے گئے ہیں۔ مَیں نے ان مضامین میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں پر اور کہیں کہیں اُن کے لیڈروں پر بھی صاف صاف تنقید کی ہے، مگر خدا شاہد ہے کہ کسی شخصیت یا کسی پارٹی سے مجھ کو کوئی ذاتی عداوت نہیں ہے۔ مَیں صرف حق کا دوست اور باطل کا دشمن ہوں۔ جس چیز کو مَیں نے حق سمجھا ہے اس کے حق ہونے کی دلیل بیان کر دی ہے، اور جسے باطل سمجھا ہے اس کے بُطلان پر بھی دلائل بیان کر دیے ہیں۔ اگر کوئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شخص مجھ سے اختلاف رکھتا ہو اور وہ دلیل سے میری رائے کی غلطی واضح کر دے تو میں اپنی رائے واپس لے سکتا ہوں۔ رہے وہ حضرات جو صرف یہ دیکھ کر کہ کچھ اُن کی پارٹی یا ان کی محبوب شخصیتوں کے خلاف کہا گیا ہے غضبناک ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے بحث نہیں کرتے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ حق ہے یا باطل، تو ایسے لوگوں کے غیظ و غضب کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں نہ ان کی گالیوں کا جواب دوں گا اور نہ اپنے طریقہ ہی سے ہٹوں گا۔

لاہور

محرم ۱۳۶۰ھ (فروری ۱۹۴۱ء)

ابوالاعلیٰ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تعارفِ مقصد

قوانینِ فطرت سب کے سب بلا استثناء، دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ جو آج سے لاکھوں برس پہلے جس قانون کی تابع تھی، اسی کی تابع آج بھی ہے اور اسی کی تابع قیامت تک رہے گی۔ زمانہ کے تغیّرات کا اس پر کوئی اثر نہیں۔ روشنی اور حرارت کے لیے جو قانون دنیا کے ایک حصّہ میں ہے وہی دوسرے حصّہ میں بھی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا کہ مشرق میں حرارت کی ماہیت و کیفیت کچھ اور ہو اور مغرب میں کچھ اور، شمال میں روشنی ایک رفتار سے چلے اور جنوب میں دوسری رفتار سے۔ اشیاء کے بننے اور بگڑنے، بڑھنے اور گھٹنے، پیدا ہونے اور فنا ہو جانے کے لیے جو قوانین مقرر ہیں ان کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے۔ ان میں کوئی رُو رعایت، کوئی لاگ لپیٹ، کوئی جانب داری نہیں پائی جاتی۔ فطرت کا کسی کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ وہ کسی کی دوست اور کسی کی دشمن نہیں۔ کسی پر مہربان اور کسی پر نامہربان نہیں۔ جو آگ میں ہاتھ ڈالے گا، جل جائیگا۔ جو زہر کھائے گا، مر جائے گا۔ جو غذا کھائے گا، قوت اور نشوونما پائے گا۔ فطرت کے حدودِ فرمانروائی میں یہ ممکن نہیں کہ دیا سلائی کی رگڑ سے ایک کے لیے تو آگ کا شعلہ پیدا ہو اور دوسرے کے لیے پانی کی دھار۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسان جس فطرت پر پیدا کیا گیا ہے وہ بھی اُسی فطرت کا ایک رُخ ہے جو ساری کائنات پر حاوی ہے، لہٰذا انسانی فطرت کے قوانین بھی فطرتِ کائنات کی طرح دائمی، عالمگیر اور بے لاگ ہیں۔ زمانہ کے تغیرات سے مظاہر میں خواہ کتنا ہی تغیر ہو جائے، حقائق میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ علم اور وہم میں جو فرق آج سے دس ہزار برس پہلے تھا وہی آج بھی ہے اور قیامت تک رہے گا۔ ظلم اور عدل کی جو حقیقت دو ہزار برس قبل مسیح تھی وہی دو ہزار برس بعد مسیح بھی ہے۔ جو چیز حق ہے وہ چین میں بھی ویسی ہی حق ہے جیسی امریکہ میں ہے، اور جو چیز باطل ہے وہ کالے کے لیے بھی اُسی طرح باطل ہے جس طرح گورے کے لیے ہے۔ انسان کی سعادت و شقاوت اور فلاح و خسران کے لیے فطرت کا قانون قطعاً بے لاگ ہے۔ اس میں کسی شخص، کسی قوم، کسی نسل کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہیں جو دوسرے کے ساتھ نہ ہو۔ اسبابِ سعادت اور اسبابِ شقاوت سب کے لیے یکساں ہیں۔ جو شقاوت کے اسباب فراہم کرے گا وہ محض اس بنا پر سعادت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا کہ اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل یا قوم سے ہے، اور اسی طرح جو سعادت کے اسباب فراہم کرے گا وہ بھی محض اس بنا پر اپنے کسب کے ثمرات سے محروم نہ رکھا جائے گا کہ وہ فلاں نسل سے تعلق رکھتا ہے یا فلاں نام سے موسوم ہے۔

فطرتِ انسانی کے اس دائمی، عالمگیر اور بے لاگ قانون ہی کا دوسرا نام "اسلام" ہے۔ اس کو انسان پر منکشف کرنے والا وہی فاطرِ کائنات ہے جس نے انسان کی اور سارے جہان کی فطرت بنائی ہے۔ یہ کسی قوم پرست کا تخیل نہیں ہے جو ساری دنیا کو اپنی قوم کے مفاد و مصالح کی نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ کسی طبقاتی لیڈر کی فکر بھی نہیں ہے جو سارے معاملات پر ایک طبقہ کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتا ہو۔ فی الجملہ یہ کسی انسان کے اجتہاد کا نتیجہ نہیں ہے کہ کسی خاص عہد کا، کسی خاص ماحول کا اور کسی خاص شخص یا گروہ کی دلچسپیوں کا مُقید ہو۔ یہ تو درحقیقت رب العالمین کی ہدایت سے ماخوذ ہے، اور رب العالمین وہ ہے جس کی نگاہ میں سب انسان

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یکساں ہیں۔ وہ انسان کو انسان کی حیثیت سے دیکھتا ہے نہ کہ ہندی اور جرمن اور اٹالین کی حیثیت سے، یا مزدور اور کسان اور سرمایہ دار کی حیثیت سے۔ اس کو اشخاص اور اقوام سے دلچسپی نہیں بلکہ محض انسان سے ہے۔ اس لیے وہ دیانت، اخلاق اور مدنیتِ فاضلہ کے جتنے اصول بتاتا ہے وہ سب کے سب ہر قسم کی حدبندیوں سے پاک ہیں۔ اُن میں بحیثیتِ مجموعی تمام انسانوں کی فلاح و بہبود اور زندگی کے ہر مرحلے میں ان کی کامیابی مدِنظر رکھی گئی ہے۔ وہ فطرت کے تمام دوسرے قوانین کی طرح عالمگیر ہیں۔ ان کا کسی شخص یا قوم کے ساتھ کوئی مخصوص رشتہ نہیں ہے جو کسی دوسرے شخص یا قوم کے ساتھ نہ ہو سکتا ہو۔ جو کوئی بھی ان اصولوں کو قبول کر کے ان کے مطابق عمل کرے گا، فلاح پائے گا، خواہ رومی ہو یا حبشی، آریہ نسل سے تعلق رکھتا ہو یا سامی نسل سے، امریکہ میں رہتا ہو یا ایشیا میں۔ اور جو ان اصولوں سے انحراف کرے گا، نقصان اُٹھائے گا، خواہ وہ کسی پیغمبر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کے انہی عالمگیر اصولوں پر انسانی حیات کی تعمیرِ نو کرنا ہر اُس شخص کا فرض ہے جو اسلام کی صداقت پر ایمان لاتے۔ اور چونکہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اس لیے یہی ہماری تمام کوششوں کا مقصدِ اصلی ہے۔

مگر جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد سب سے پہلے اپنے وطن کو اور بالآخر تمام دنیا کو "دارالاسلام" بنانا ہے تو اس سے ایک ناواقف آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جس طرح ہر جوشیلا قوم پرست زمین میں اپنی قوم کا غلبہ اور تمکن چاہتا ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی اپنی قوم کو غالب اور حکمران دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی "قوم" میں پیدا ہوتے ہیں اس لیے "مسلمانوں کی حکومت" ان کا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوتے ہوتے تو مونجے اور ساورکر بنتے[1]۔ جرمنی میں پیدا ہوتے ہوتے تو ہٹلر اور گورنگ کے رُوپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوش

---

[1] یہ دونوں اُس زمانے میں ہندوستان کے نہایت متعصب ہندو لیڈر تھے۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجسمت میں جنم لینے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔

یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ "دارالاسلام" کو "دارالمسلمین" کا ہم معنی سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ دونوں میں حقیقتہً بڑا فرق ہے۔ جو لوگ کلمہ گو ہونے کی وجہ سے "دائرۂ اسلام" میں داخل ہیں اور معاشرت کے اعتبار سے مسلمانوں میں شمار کیے جاتے ہیں، وہ اگر غیر اسلامی طریقوں پر حکومت کریں، تو اُن کی حکومت مسلمانوں کی حکومت تو ضرور کہلائے گی کہ اتفاق سے اس کے حکمران کلمہ گو ہیں، مگر ایسی حکومت اسلامی حکومت ہرگز نہ ہوگی اور نہ اس پر صحیح معنوں میں "دارالاسلام" کا اطلاق ہو سکے گا۔ حاشا و کلّا، ہمارا نصب العین ایسی "مسلمان حکومت" کا قیام ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حیثیت سے ہم اپنی قوم کی بڑائی چاہیں، اور اگر ہمارا مقصد یہ ہو کہ محض فوجی طاقت سے مسندِ حکومت پر قبضہ کرکے زمین کی دولت اور فرماں روائی کے تکبّر کو اپنی قوم کے لیے مخصوص کرلیں تو خود اسلام ہی سب سے پہلے آگے بڑھ کر ہم کو ظالم اور مفسد ٹھیراتے گا، کیونکہ وہ صاف کہتا ہے کہ:-

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ (القصص۔۸۳)

"آخرت میں عزت کا مقام ہم نے صرف اُنہی لوگوں کے لیے رکھا ہے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

دراصل جو چیز ہمارے پیشِ نظر ہے وہ مسلمانوں کی حکومت نہیں بلکہ اسلام کی حکومت ہے۔ اُسی اسلام کی حکومت جو مجموعہ ہے دیانت، اخلاق اور مدنیّتِ فاضلہ کے عالمگیر اصولوں کا۔ یہ اسلام ہماری یا کسی کے باپ دادا کی میراث نہیں ہے۔ اس کا کسی سے کوئی خاص رشتہ نہیں۔ جو ان اصولوں پر ایمان لائے اور ان پر عمل کرے وہی اسلام کا علمبردار ہے۔ وہ اگر نسل کے اعتبار سے چمار یا بھنگی بھی ہو تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسندِ خلافت پر بیٹھ سکتا ہے، وہ اگر نکٹا حبشی غلام بھی ہو تو عرب و عجم کے شرفاء اور سادات کا امام بن سکتا ہے۔ ساڑھے تیرہ سو برس سے جن کے خاندان میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسلام چلا آرہا ہے وہ اگر آج ان اصولوں سے منحرف ہو جائیں تو اسلام میں ان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اور کل تک جو شخص ہندو یا عیسائی یا پارسی تھا، شرک اور بت پرستی، شراب نوشی اور سود اور قمار بازی میں مبتلا تھا، وہی اگر آج اسلام کی فطری صداقتوں کو مان کر عملاً ان کا پابند ہو جائے تو اس کے لیے اسلام میں عزت اور بزرگی کے اونچے سے اونچے مراتب تک پہنچنے کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

اس مختصر توضیح سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ہمارا مقصد ایک قوم پر دوسری قوم کی برتری نہیں ہے، بلکہ نظام تمدن کو اُن اصولوں پر مرتب کرنا ہے جو ہمارے ضمیر و ایمان کے مطابق صحیح ہیں۔ اِس پر اگر کوئی ناک بھوں چڑھائے تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس کے پاس آخر وجوہِ اعتراض کیا ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ کسی مسلک کا تنقیدی یا تحقیقی مطالعہ کر کے اس امر کا اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ اُس میں انسانیت کی فلاح اور انسانی معاملات و تعلقات کی بہتری کمال درجہ پر موجود ہے تو اس کے اندر فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جس اجتماعی زندگی سے خود اس کا تعلق ہے، جس سوسائٹی کے ساتھ اس کی زندگی و موت وابستہ ہے، جس حصّۂ انسانیت کے ساتھ وہ تمدنی، سیاسی اور معاشی تعلقات میں جکڑا ہوا ہے، سب سے پہلے اُسی کے نظامِ حیات کو اس مسلک کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے۔ اُسے اپنے اِس پسندیدہ مسلک کے صحیح و مفید ہونے کا جتنا زیادہ یقین ہوگا، اور اس کے دل میں حُبِّ انسانیت یا حُبِّ وطن کا جذبہ جتنا زیادہ قوی ہوگا، اُتنا ہی زیادہ وہ اپنے ابنائے نوع یا ابنائے وطن کو اُس مسلکِ حق کے فوائد سے بہرہ مند کرنے کے لیے بے چین ہوگا جس میں وہ اُن کی فلاح و بہبود اور کامرانی و خوش حالی مُضمر دیکھتا ہے، اور اتنی ہی زیادہ شدت کے ساتھ وہ اُن مسلکوں کی حکمرانی کا مخالف ہوگا جن کو وہ پورے یقین کے ساتھ غلط اور نقصان دہ سمجھتا ہے۔ یہ عین انسانی فطرت کا مقتضا ہے اور اس میں کوئی بات خلافِ حُبِّ وطن (Unpatriotic) نہیں ہے۔ بلکہ خلافِ حُبِّ وطن تو یہ بات ہے کہ آدمی جس مسلک کو ایمانداری کے ساتھ

موجبِ فلاح سمجھتا ہو اس کو خاموشی کے ساتھ اپنے دل میں یا اپنے گھر میں لیے بیٹھا رہے اور جن طریقوں کو وہ ایمانداری کے ساتھ نقصان رساں سمجھتا ہو انہیں اپنے ابنائے وطن کی زندگی پر مسلّط ہونے دے۔

جن لوگوں نے مغرب کے جمہوری نظام کا مطالعہ کیا اور اسے اپنے نزدیک برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے نظامِ تمدن کو مغربی ڈیموکریسی کے نمونہ پر ڈھالیں۔ جن لوگوں نے سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اسے برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی اجتماعی تعمیرِ نو (Social Reconstruction) مارکسی اشتراکیت کے طریقہ پر ہو۔ یہ آخر کیوں ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی حجت اس کے سوا پیش کی جاسکتی ہے کہ اُن کے ایمان و اعتقاد کا مقتضا یہی ہے؟ کیا اُن کے اس اقدام کو کوئی شخص خلافِ حُبِّ وطن یا خلافِ حُبِّ انسانیت کہہ سکتا ہے؟ کیا اُن کے حق میں یہ راست بازی ہوگی کہ وہ جس مسلک کو اپنے ابنائے جنس کے لیے سعادت و فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اُس کو رائج کرنے کی جدوجہد نہ کریں اور کسی ایسے نظامِ زندگی کی حکمرانی کو گوارا کرلیں جو ان کے نزدیک باشندگانِ ملک کو پستی اور بدحالی کی طرف لے جانے والا ہو؟ اگر بالفرض ملک کی آزادی اور اقوامِ عالم کے درمیان اہلِ وطن کی عزت بڑھنے کا امکان کسی شخصی استبدادی حکومت کے قیام یا سرمایہ دارانہ نظام کے بقا میں ہو، تو کیا کسی سچے جمہوریت پسند یا کسی راست باز اشتراکی سے آزادی اور وطن کی عزت کے نام پر یہ اپیل کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مسلکوں کو چھوڑ کر اُس طریقہ کو قبول کرلیں؟ اور کیا ان دونوں کو اس قسم کی اپیل سُن کر واقعی ہتھیار ڈال دینا چاہیئے؟

بالکل یہی پوزیشن ہماری بھی ہے۔ ہم کو جو چیز "دارالاسلام" کی صدا بلند کرنے پر مجبور کرتی ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو "جمہوریت" اور "اشتراکیت" کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ہم نے برسوں اسلام کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ کیا ہے، ہم نے اس کی اعتقادی اساس، اُس کے نظریۂ حیات، اُس کے اصولِ اخلاق، اُس کے نظامِ تمدن، اُس کے قوانینِ معاشرت و معیشت، اُس کے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آئینِ سیاست وطرزِ حکومت، غرض اس کی ایک ایک چیز کو جانچا اور پرکھا۔ ہم نے دُنیا کے دوسرے اجتماعی نظریات اور تمدّنی مسلکوں کو کھنگال کر دیکھا اور اسلام سے ان کا تقابل کیا۔ اس تمام مطالعے اور تحقیق و تنقید نے ہمیں اس امر پر پوری طرح مطمئن کر دیا کہ انسان کے لیے حقیقی فلاح و سعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہر مسلک ناقص ہے۔ کسی دوسرے مسلک کی اخلاقی بنیاد صالح اور مستحکم نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں انسان کی شخصیت کے ارتقاء (Development of Personality) کا پُورا موقع نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں اجتماعی عدل (Social Justice) اور بین الانسانی تعلقات کا صحیح توازن (Balance) نہیں۔ کسی دوسرے مسلک میں فطرتِ انسانی کے تمام پہلوؤں کی متناسب رعایت نہیں۔ اسلام کے سوا کوئی مسلک دنیا میں ایسا موجود نہیں جو انسان کو حقیقی آزادی سے ہم کنار کرتا ہو، اُسے عزت کے بلند ترین مدارج کی طرف لے جاتا ہو، اور ایک ایسا اجتماعی ماحول پیدا کرتا ہو جس میں ہر شخص اپنی قوت و استعداد (Capacity) کے مطابق اخلاقی، رُوحانی اور مادّی ترقی کے انتہائی مدارج تک پہنچ سکے اور ساتھ ہی اپنے دوسرے ابنائے جنس کے لیے بھی ایسی ہی ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اطمینان اور یقین حاصل ہو جانے کے بعد ہمارے لیے راست بازی کا تقاضا کیا ہے؟ کیا بالکل وہی نہیں جو ہمارے جمہوریت پسند یا اشتراکیت پسند ابنائے جنس کے لیے ہے؟ جس مسلکِ اجتماعی کو ہم پوری دیانت کے ساتھ انسانیت کے لیے رحمت سمجھتے ہیں، کیا ہم پر یہ فرض عائد نہیں ہو جاتا کہ اپنے ملک اور اپنے ابنائے نوع کی اجتماعی زندگی کو اسی مسلک کے مطابق منظم کرنے کی جدّوجہد کریں؟ جو چیز جمہوریت پسندوں اور اشتراکیت پسندوں کے لیے حق ہے وہ ہمارے لیے کیوں غیر حق ہے؟

اسلام کے متعلق ہماری یہ رائے کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوتے ہیں، اور اسلام کے حق میں ایک طرح کا پیدائشی میلان رکھتے ہیں۔ اپنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرے رفقاء کے متعلق تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کا کیا حال ہے، مگر اپنی ذات کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو جس صورت میں مَیں نے اپنے گردوپیش کی مسلم سوسائٹی میں پایا، میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ تنقید و تحقیق کی صلاحیت پیدا ہونے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اُس بے روح مذہبیت کا قلادہ اپنی گردن سے اُتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی۔ اگر اسلام صرف اُسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے تو شاید میں بھی آج ملحدوں اور لامذہبوں میں جا ملا ہوتا، کیونکہ میرے اندر نازی فلسفہ کی طرف کوئی میلان نہیں ہے کہ محض حمایتِ قومی کی خاطر اجداد پرستی کے چکر میں پڑا رہوں۔ لیکن جس چیز نے مجھے الحاد کی راہ پر جانے یا کسی دوسرے اجتماعی مسلک کو قبول کرنے سے روکا اور ازسرِنو مسلمان بنایا وہ قرآن اور سیرتِ محمدیؐ کا مطالعہ تھا۔ اُس نے مجھے انسانیت کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ اس نے آزادی کے اُس تصور سے مجھے رُوشناس کیا جس کی بلندی تک دنیا کے کسی بڑے سے بڑے لبرل اور انقلابی کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس نے انفرادی حسنِ سیرت اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا نقشہ میرے سامنے پیش کیا جس سے بہتر کوئی نقشہ میں نے نہیں دیکھا۔ اس کے تجویز کردہ لائحۂ زندگی (Scheme of Life) میں مجھے ویسا ہی کمال درجہ کا توازن (Balance) نظر آیا جیسا کہ ایک سالمہ (Atom) کی بندش سے لے کر اجرامِ فلکی کے قانونِ جذب و کشش تک ساری کائنات کے نظم میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی چیز نے مجھے قائل کر دیا کہ یہ نظامِ اسلامی بھی اُسی حکیم کا بنایا ہوا ہے جس نے اس جہانِ ارض و سما کو عدل اور حق کے ساتھ بنایا ہے۔

پس درحقیقت میں ایک نومسلم ہوں۔ خوب جانچ کر اور پرکھ کر اُس مسلک پر ایمان لایا ہوں جس کے متعلق میرے دل و دماغ نے گواہی دی ہے کہ انسان کے لیے فلاح و صلاح کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے۔ مَیں صرف غیر مسلموں ہی کو نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اس دعوت سے میرا مقصد اُس نام نہاد

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلم سوسائٹی کو باقی رکھنا اور بڑھانا نہیں ہے جو خود ہی اسلام کی راہ سے بہت دور ہٹ گئی ہے، بلکہ یہ دعوت اس بات کی طرف ہے کہ آؤ اُس ظلم و طغیان کو ختم کر دیں جو دنیا میں پھیلا ہوا ہے، انسان پر سے انسان کی خدائی کو مٹا دیں اور قرآن کے نقشہ پر ایک نئی دنیا بنائیں جس میں انسان کے لیے بحیثیت انسان کے شرف و عزت ہو، حریت اور مساوات ہو، عدل اور احسان ہو۔

بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کر لی ہے جس کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ کا نام سنتے ہی ایک شخص کا ذہن فوراً ووٹ بڑھانے کی کوشش اور سیاسی غلبہ (Domination) کی خواہش اور اسی قبیل کی بہت سی دوسری چیزوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف جمہوری طرزِ حکومت کے قیام نے سیاسی طاقت اور اس کے تمام ضمنی فوائد کو ووٹوں کی کثرت پر منحصر کر دیا ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کی پوزیشن یہاں کچھ ایسی ہے کہ ان کی جانب سے اپنے مسلک کو پھیلانے کی کوئی کوشش اس شبہ سے بچ نہیں سکتی کہ یہ حوصلہ مند (Ambitious) قوم اس راستہ سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ان شبہات کو قوت پہنچانے میں خود مسلمانوں کا اپنا بھی کافی حصہ ہے۔ ان کے بہت سے غلط نمائندوں نے تبلیغ تبلیغ کا شور کچھ اس طرح بلند کیا کہ گویا یہ محض ایک سیاسی حربہ ہے جسے اس جمہوری دَور میں صرف اس غرض کے لیے استعمال کرنا چاہیئے کہ اپنی قلتِ تعداد کے پیچیدہ مسئلے کو حل کیا جاتے۔ اس چیز نے اسلام کے راستے میں ایک شدید قسم کا سیاسی تعصب حائل کر دیا ہے۔ سوشلزم، کمیونزم، فاشزم یا اور کسی ازم کی تبلیغ کی جائے تو لوگ اس کو محض اس کے ذاتی اوصاف (Merits) کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اگر ان کے دماغ کو وہ اپیل کرتا ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔ مگر "اسلام ازم" کا نام آتے ہی لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ یہ ہمارے ملک کی ایک ایسی قوم کا مسلک ہے جو پہلے یہاں حکومت کر چکی ہے اور اِس جمہوری دَور میں قلیل التعداد ہونے کی وجہ سے اپنے ووٹ بڑھانا چاہتی ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تاکہ نمائندہ مجالس کی نشستوں اور دفتری ملازمت کی کرسیوں پر قبضہ کرے۔ یہ خیال آتے ہی دل و دماغ پر قومی تعصب کے قفل چڑھ جاتے ہیں اور ذاتی اوصاف کے لحاظ سے جانچنے پرکھنے کا سوال ہی خارج از بحث ہو جاتا ہے۔

ہمیں اِن حالات کا بڑے صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑے گا۔ نیکی اور صداقت کی راہ میں ہمیشہ مشکلات حائل ہوتی رہی ہیں۔ شیطانی راہیں آسان ہوتی ہیں اور حق کی راہ بہر حال موانع سے لبریز رہتی ہے۔ محض صبر، لگاتار سعی اور خالصتہً لوجہ اللہ کام کرنے سے ہم مسلمانوں کے دل بھی بدل سکتے ہیں اور غیر مسلموں کے دل بھی۔ جب ہماری سعی و جہد میں خدا کی خوشنودی اور بنی نوعِ انسان کی خیر خواہی کے سوا کسی دنیوی غرض کا شائبہ تک نہ ہوگا تو لوگوں کے دل خود بخود اِس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے کہ اِسلام کسی نسل اور قوم کی میراث نہیں ہے بلکہ ایک انسانی مسلک ہے جس کا تعلق تمام انسانوں سے ویسا ہی عام ہے جیسا ہوا اور پانی کا تعلق سب سے ہے۔ اس میں ہر انسان دوسرے انسان کے ساتھ برابر کا شریک ہو سکتا ہے۔ یہ جس طرح مسلمانوں کی چیز ہے اسی طرح تمہاری بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ اگر نیکی اور تقویٰ اور قانونِ الٰہی کی اطاعت میں تم نسلی مسلمانوں سے بڑھ جاؤ تو امامت تم کو ملے گی، تقدم اور شرف تم کو حاصل ہوگا۔ خلافت کے امین تم ہوگے اور نسلی مسلمان پیچھے رہ جائیں گے۔ یہاں برہمنیت اور نسل پرستی نہیں ہے کہ عزت و شرف اور قوت و اقتدار پر کسی خاص گروہ کا دائمی اجارہ ہو۔ یہاں ایک قوم پر دوسری قوم کے غلبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تبلیغِ اسلام کی نوعیت اچھوت اُدھار[1] کی سی نہیں ہے کہ ایک قوم محض دوسری قوم کے ووٹ بڑھانے کے لیے اُس کی جُزو بنائی جاتے مگر زندگی کی متاع میں اسے برابر کا حصہ نہ دیا جاتا[2]۔ اسلام میں تو برابر ہی نہیں بلکہ

---

[1] اچھوت قوموں کو پستی سے اُٹھانے کی کوشش۔ (جدید)

[2] اُس زمانے میں ہندو لیڈروں نے یہ تحریک صرف اس لیے اٹھائی تھی کہ (باقی صفحہ، پر)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اوصافِ ذاتی کے لحاظ سے ایک شخص زیادہ کا حصہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں پیدائش کی وجہ سے آدمی اور آدمی میں کوئی امتیاز نہیں۔ کسی شخص کی راہ میں اس کے پیشے یا اس کی قومیت کی وجہ سے کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ تم اپنے کیرکٹر اور اپنے کردار کے زور سے جہاں تک اُڑنے کی طاقت رکھتے ہو اُڑ سکتے ہو۔ فرش سے عرش تک تمہاری ترقی کی راہ میں کوئی روک نہیں۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال بھی کھٹکتا ہے کہ اسلام تیرہ چودہ صدی پہلے کا ایک مذہب ہے، اس کو آج ایک فکری و اخلاقی اور تمدنی و سیاسی تحریک کی حیثیت سے زندہ کرنے کا کون سا موقع ہے؟

جو لوگ دُور سے کسی چیز کو محض سرسری نظر ہی سے دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں ان کی رائے عموماً غلط ہوا کرتی ہے۔ ایسی ہی غلطی یہ لوگ بھی کر رہے ہیں۔ انہوں نے قرآن کا غائر نظر سے مطالعہ نہیں کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی۔ اس لیے محض قیاسی مفروضات کی بنا پر یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ اسلام اب سے تیرہ سو برس پہلے کی ایک مذہبی تحریک تھی جو اُس زمانہ کے مخصوص تمدنی حالات میں تو بلاشبہ مفید ثابت ہوئی مگر اب حالات بہت بدل چکے ہیں، اس زمانہ کے حالات میں وہ پرانا مسلک کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہو گا ——— اس غلط فہمی کے پیدا ہونے اور جڑ پکڑنے میں خود مسلمانوں کے اپنے طرزِ عمل کا بھی بہت کچھ دخل ہے، انہوں نے خود بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور اسے ایک تحریک (Movement) کے بجائے محض زمانۂ سلف کی ایک مقدس میراث بنا کر رکھ دیا ——— حالانکہ ایک سلیم الفطرت آدمی اگر اپنے ذہن سے تاریخی اور سیاسی تعصبات اور پیشگی مفروضات کو نکال کر اسلام کا سائنٹفک مطالعہ کرے تو اس پر یہ حقیقت بآسانی منکشف ہو سکتی ہے کہ اسلام کسی خاص زمانہ کی مذہبی تحریک نہیں ہے جس کی بنیاد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶ سے) ہندوستان کے کروڑوں اچھوت کہیں ہندو قوم سے الگ نہ ہو جائیں لیکن عملاً ان مظلوم لوگوں کی جو حیثیت ہندو معاشرے میں تھی وہ جُوں کی تُوں رہی۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وقتی اور مکانی حالات پر ہو، بلکہ یہ ایسے اصولوں کا مجموعہ ہے جو انسانی فطرت کے حقائق پر مبنی ہیں اور عام قوانینِ فطرت کے ساتھ کامل موافقت (Harmony) رکھتے ہیں۔ انسان کے حالات اور خیالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں، مگر اس کی فطرت ہر حال میں جوں کی توں رہتی ہے۔ زمانہ خواہ کتنے ہی پلٹے کھائے، بہرحال کائناتِ فطرت کے حقائق اور قوانین میں کوئی تغیّر واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو فطری اصول طوفانِ نوحؑ کے وقت انسانی زندگی کے لیے مفید تھے وہی اس بیسویں صدی عیسوی میں بھی مفید ہیں، اور وہی ۵۰۰۰ عیسوی میں بھی منزلِ سعادت کی طرف انسان کی رہنمائی کے لیے کافی ہوں گے۔ تغیّر جو کچھ بھی ہو گا ان فطری اصولوں میں نہیں بلکہ بدلنے والے حالات پر اُن کے انطباق (Application) میں ہو گا۔ اسلام کی اصطلاح میں اس کا نام اجتہاد ہے، یعنی اصول کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر قانون کی اسپرٹ کے مطابق نئے حالات پر منطبق کرنا۔ اور یہ اجتہاد ہی وہ چیز ہے جو نظامِ اسلامی کو ایک محرک و متحرک (Dynamic) نظام بناتا ہے اور اس کے قوانین کو حالات و ضروریات کے مطابق مرتّب (Adjust) کرتا رہتا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۳۹ء)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تحریکِ اسلامی کا تنزّل

دنیا میں جب کوئی تحریک کسی اخلاقی یا اجتماعی یا سیاسی مقصد کو لے کر اُٹھتی ہے تو اس کی طرف وہی لوگ رجوع کرتے ہیں جن کے ذہن کو اُس تحریک کے مقاصد اور اس کے اصول اپیل کرتے ہیں، جن کی طبیعتیں اس کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں، جن کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہی تحریک صحیح اور معقول ہے، اور جو اپنے نفس کی پوری آمادگی کے ساتھ اس کو چلانے اور دُنیا میں قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ اُن کے سوا باقی تمام لوگ جن کی طبیعت کی اُفتاد اُس تحریک کے مقاصد اور اصولوں سے مختلف ہوتی ہے، پہلے ہی اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اُس کے دائرے میں آنے والے لائے نہیں جاتے بلکہ خود آتے ہیں۔ انہیں کوئی چیز مجبور کر کے خواہ مخواہ اس میں داخل نہیں کر دیتی، نہ کوئی طاقت اُنہیں لا کر اس میں چھوڑ جاتی ہے، جیسے کوئی کسی اندھے کو جنگل میں لے جا کر چھوڑ دے اور اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کس لیے لایا گیا ہوں۔ بلکہ وہ اسے جانچ کر، پرکھ کر، سمجھ کر، پورے شعور اور کامل قصد کے ساتھ آتے ہیں، اور جب آجاتے ہیں تو اس کے مقصد کو اپنا مقصد بنا کر کام کرتے ہیں کیونکہ وہی مقصد ان کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اصولوں کو وہ اپنے اصول بنا کر چلتے ہیں کیونکہ ان اصولوں کو صحیح و برحق سمجھ کر ہی وہ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں۔ اِن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے لیے اس تحریک کو چلانا زندگی کا مشن بن جاتا ہے کیونکہ جو چیز اُن سے اُن کا پچھلا مسلک و مشرب چھڑاتی ہے اور ان کو اس نئے مسلک کی طرف کھینچ کر لاتی ہے وہ دراصل اُن کے قلب و رُوح کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ یہی مسلک حق اور راست ہے۔ دراصل اُس تحریک میں اُن پر حق منکشف ہوتا ہے۔ اُس کا انکشاف ہی اُن کو اس تحریک کی طرف کھینچتا ہے۔ اور انکشافِ حق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو کبھی اُس مقام پر نہیں ٹھیرنے دیتا جہاں وہ انکشاف سے پہلے تھا، بلکہ وہ اسے کشاں کشاں اُس مقام کی طرف کھینچ لے جاتا ہے جدھر حق کی روشنی اُسے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی تحریک کی صداقت کے معترف ہو کر اُسے قبول کرتے ہیں ان کی زندگیوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جن کی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاتی۔ وہ اپنے اصول کی خاطر دوستیوں اور خونی و قلبی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار، اپنی پوزیشن، اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں، حتیٰ کہ قید و بند کی تکالیف اور موت کے خطرات تک سہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ان کی عادات بدل جاتی ہیں، ان کے خصائل میں تغیر آجاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی شکل، صورت، لباس، خوراک اور عام طرزِ زندگی پر بھی اس کے اثرات ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ گرد و پیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔

ہر تحریک کی ابتدا یوں ہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے وہ جماعت بنتی ہے جو اسے چلانے کے لیے اُٹھتی ہے۔ اس کے مقاصد اور اس کے اصول خود ہی آدمیوں کی اس بھیڑ میں سے، جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوتی ہے، اپنے مطلب کے آدمی چھانٹتے ہیں اور صرف انہی لوگوں کو اس تحریک کے دائرے میں لاتے ہیں جنہیں اس سے مناسبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُن کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد بھی اُسی مسلک پر اُٹھے جس کو خود انہوں نے حق پاکر قبول کیا ہے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی نئی نسلوں پر تعلیم، تربیت، گھر کی زندگی اور باہر کے ماحول سے اِس قسم کے اثرات ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے خیالات، اخلاق، عادات اور خصائل سب کے سب اُس مسلک کی رُوح اور اس کے اصولوں کے مطابق ڈھل جائیں۔ اس میں انہیں ایک حد تک کامیابی ہوتی ہے، مگر بس ایک حد تک ہی ہوتی ہے۔ پوری کامیابی ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت اور سوسائٹی کے ماحول اور خاندانی روایات، کو طبائع کے ڈھالنے میں بہت کچھ دخل حاصل ہے، مگر فطرت، دماغ کی ساخت، مزاج کی پیدائشی اُفتاد بھی ایک اہم چیز ہے، اور حقیقت میں دیکھا جائے تو بنیادی چیز یہی ہے۔ فطری طور پر دنیا میں ہر قسم کے آدمی، ہر مزاج، ہر رُجحان، ہر ساخت کے آدمی ہمیشہ سے پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جس طرح اُس تحریک کے ظہور کے وقت ہر طرح کے آدمی دنیا میں موجود تھے، اور اُن سب نے اُس کو قبول نہیں کر لیا تھا بلکہ صرف وہی اس کی طرف کھنچے تھے جو اس سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے، اُسی طرح بعد میں بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے حامیوں کی نسل سے پیدا ہوں گے انہیں لامحالہ اس تحریک سے مناسبت ہی ہوگی۔ ان میں ابوجہل اور ابولہب بھی ہوں گے۔ عمرؓ اور خالدؓ بھی ہوں گے۔ اور ابوبکرؓ بھی ہوں گے۔ جس طرح آذر کے گھر میں ابراہیمؑ حنیف پیدا ہو سکتا ہے، اسی طرح نوحؑ کے گھر میں "عمل غیر صالح"[1] بھی پیدا ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق یہ امر لازمی ہے کہ اُس سوسائٹی سے باہر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اپنے مزاج کی اُفتاد اور اپنی طبیعت کے رُجحان کے لحاظ سے اُس کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور خود اُس کے اندر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اس کے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ پس یہ ضروری نہیں کہ تعلیم و تربیت

---

[1] قرآن مجید میں حضرت نوحؑ کے کافر بیٹے کو "عمل غیر صالح" قرار دیا گیا ہے۔
(ہود۔ آیت ۴۶)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا وہ نظام جو تحریک کے ابتدائی حامی آئندہ نسلوں کے لیے قائم کرتے ہیں وہ ان کی پوری نئی پود کو ان کے مسلک کا حقیقی متبع بنا دے۔

اس خطرے کے سدِباب اور تحریک کو اس کے بنیادی اصولوں پر برقرار رکھنے کے لیے دو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں:-

ایک یہ کہ جو لوگ تعلیم و تربیت اور اجتماعی ماحول کی تاثیرات کے باوجود ناکارہ نکلیں، تکفیر[1] کے ذریعہ سے ان کو جماعت سے خارج کر دیا جاتے، اور اس طرح جماعت کو غیر مناسب عناصر سے پاک کیا جاتا رہے۔

دوسرے یہ کہ تبلیغ کے ذریعہ سے جماعت میں اُن نئے لوگوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رہے جو رجحان و ذہنیت کے اعتبار سے اس تحریک کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور جن کو اس کے اصول و مقاصد اُسی طرح اپیل کریں جس طرح ابتدائی پیرودں کو انہوں نے اپیل کیا تھا۔

یہ اور صرف یہی دو صورتیں ایسی ہیں جو کسی تحریک کو زوال سے اور کسی جماعت یا پارٹی کو انحطاط سے بچا سکتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ ان دونوں تدبیروں کی اہمیت سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ جماعت کے باہر سے نئے لوگوں کو اندر لانے کی کوشش کم ہونے لگتی ہے۔ جماعت کی افزائش کے لیے تمام تر نسلی افزائش ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ اس طرح جماعت کے اندر پیدا ہوتے ہیں اُن میں سے ناکارہ لوگوں کو خارج کرنے میں بھی خونی رشتوں اور معاشرتی تعلقات اور دنیوی مصلحتوں کی خاطر تساہل برتا جاتا ہے۔ طرح طرح کے بہانوں سے جماعتی مسلک میں ایسی گنجائشیں نکالی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے رطب و یابس اُس میں سما سکیں۔ اور اس مسلک کو اتنا وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سرے سے اس کے

---

[1] موجودہ زمانہ کی تحریکوں میں اسی چیز کو (Purge) سے تعبیر کیا جاتا ہے اور تمام جماعتیں نامناسب آدمیوں کو اپنے دائرے سے خارج کرتی رہتی ہیں۔ بلکہ جماعت کے اصولوں سے علانیہ منحرف ہو جانے والوں کو قتل تک کر دیا جاتا ہے۔ (قدیم)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

سرحدی نشانات اور امتیازی حدود باقی ہی نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ بھانت بھانت کے آدمی جماعت کے دائرے میں جمع ہو جاتے ہیں جن کو کسی قسم کی مناسبت اُس کے مسلک سے اس کے اصولوں سے اور اس کے مقاصد سے نہیں ہوتی۔

پھر جب جماعت میں اس کے اصولوں سے حقیقی مناسبت رکھنے والے کم اور مناسبت نہ رکھنے والے زیادہ ہو جاتے ہیں تو اجتماعی ماحول اور تعلیم و تربیت کا نظام بھی بگڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر نئی نسل پہلے کی نسل سے بدتر اُٹھتی ہے۔ جماعت کا قدم روز بروز تنزل و انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اُس مسلک کا اور اُن اصول و مقاصد کا تصور بالکل ہی ناپید ہو جاتا ہے جن پر ابتدا میں وہ جماعت بنی تھی۔ اس مقام پر پہنچ کر حقیقت میں جماعت ختم ہو جاتی ہے اور محض ایک نسلی اور معاشرتی قومیت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ وہ نام جو ابتدا میں ایک تحریک کے علمبرداروں کے لیے بولا جاتا تھا، اس کو وہ لوگ استعمال کرنے لگتے ہیں جو اس تحریک کو مٹانے والے اور اس کے جھنڈے کو سرنگوں کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ نام جو ایک مقصد اور ایک اصول کے ساتھ وابستہ تھا، وہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملنے لگتا ہے بلالحاظ اس کے کہ صاحبزادے کی زندگی کے اصول اور مقاصد اس نام سے کوئی مناسبت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ درحقیقت ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ کر وہ نام اپنی معنویت (Significance) کھو دیتا ہے۔ وہ خود بھول جاتے ہیں اور دنیا بھی بھول جاتی ہے کہ یہ نام کسی مقصد، کسی مسلک، کسی اصول کے ساتھ وابستہ ہے، بے معنی و مفہوم نہیں ہے۔

اسلام اس وقت اسی آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہے۔ مسلمان کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے، اور اس کے طرزِ عمل نے دنیا کو بھی یہ بات بھلا دی ہے کہ اسلام اصل میں ایک تحریک کا نام ہے جو دنیا میں ایک مقصد اور کچھ اصول لے کر اٹھی تھی، اور مسلمان کا لفظ اُس جماعت کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اس کی علمبرداری کے لیے بنائی گئی تھی۔ تحریک گم ہو گئی۔ اُس کا مقصد فراموش کر دیا گیا۔ اس کے اصولوں کو ایک ایک کر کے توڑا گیا۔ اور اس کا نام اپنی تمام معنویت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کر دینے کے بعد اب محض ایک نسلی و معاشرتی ذہنیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ اسے ان مواقع پر بھی بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے جہاں اسلام کا مقصد پامال ہوتا ہے، جہاں اس کے اصول توڑے جاتے ہیں، جہاں اسلام کے بجائے غیر اسلام ہوتا ہے۔

بازاروں میں جائیے، "مسلمان رنڈیاں" آپ کو کوٹھوں پر بیٹھی نظر آئیں گی اور "مسلمان زانی" گشت لگاتے ملیں گے۔ جیل خانوں کا معائنہ کیجیے، "مسلمان چوروں"، "مسلمان ڈاکوؤں" اور "مسلمان بدمعاشوں" سے آپ کا تعارف ہوگا۔ دفتروں اور عدالتوں کے چکر لگائیے۔ رشوت خوری، جھوٹی شہادت، جعل، فریب، ظلم اور ہر قسم کے اخلاقی جرائم کے ساتھ آپ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگا ہوا پائیں گے۔ سوسائٹی میں پھریے، کہیں آپ کی ملاقات "مسلمان شرابیوں" سے ہوگی۔ کہیں آپ کو "مسلمان قمار باز" ملیں گے کہیں "مسلمان سازندوں" اور "مسلمان گویّوں" اور "مسلمان بھانڈوں" سے آپ دوچار ہوں گے۔ بھلا غور تو کیجیے، یہ لفظ "مسلمان" کتنا ذلیل کر دیا گیا ہے اور کن کن صفات کے ساتھ جمع ہو رہا ہے۔ مسلمان اور زانی! مسلمان اور شرابی! مسلمان اور قمار باز! مسلمان اور رشوت خور! اگر مسلمان بھی وہ سب کچھ کرنے لگے جو ایک کافر کر سکتا ہے تو پھر مسلمان کے وجود کی دنیا میں حاجت ہی کیا ہے؟ اسلام تو نام ہی اس تحریک کا تھا جو دنیا سے ساری بد اخلاقیوں کو مٹانے کے لیے اٹھی تھی۔ اس نے تو مسلمان کے نام سے ان چیدہ آدمیوں کی جماعت بنائی تھی جو خود بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اصلاحِ اخلاق کے علمبردار بنیں۔ اس نے اپنی جماعت میں چوری کے لیے ہاتھ کاٹنے کی، پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی، کوڑے مار مار کر کھال اڑا دینے کی حتیٰ کہ سولی پر چڑھا دینے کی ہولناک سزائیں اسی لیے تو مقرر کی تھیں کہ جو جماعت دنیا سے زنا کو مٹانے اٹھی ہے خود اس میں کوئی زانی نہ پایا جائے۔ جس کا کام شراب کا استیصال ہے وہ خود شراب خوروں کے وجود سے خالی ہو۔ جسے چوری اور ڈاکہ کا خاتمہ کرنا ہے خود اس میں کوئی چور اور ڈاکو نہ ہو۔ اس کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جنہیں دنیا کی اصلاح کرنی ہے وہ دنیا بھر سے زیادہ نیک سیرت، عالی مرتبہ اور باوقار

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لوگ ہوں۔ اسی لیے قمار بازی، جعل سازی، اور رشوت خوری تو درکنار، اُس نے تو اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی مسلمان سازندہ اور گویا ہو، کیونکہ معلمین اخلاق کے مرتبہ سے یہ بھی گری ہوئی چیز ہے۔ جس اسلام نے ایسی سخت قیود اور اتنے شدید ڈسپلن کے ساتھ اپنی تحریک اُٹھائی تھی، اور جس نے اپنی جماعت میں چھانٹ چھانٹ کر بلند ترین کیرکٹر کے آدمیوں کو بھرتی کیا تھا، اس کی رسوائی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ رنڈی اور بھڑوے اور چور اور زانی تک کے ساتھ لفظِ "مسلمان" کا جوڑ لگ جاتے۔ کیا اس قدر ذلیل اور رسوا ہو جانے کے بعد بھی "اسلام" اور "مسلمان" کی یہ وقعت باقی رہ سکتی ہے کہ سر اُس کے آگے عقیدت سے جھک جائیں اور آنکھیں اُس کے لیے فرشِ راہ بنیں؟ جو شخص بازار بازار اور گلی گلی خوار ہو رہا ہو کیا کبھی اس کے لیے بھی آپ نے کسی کو ادب سے کھڑے ہوتے دیکھا ہے؟

یہ تو بہت ذلیل طبقہ کی مثال تھی۔ اس سے اُونچے تعلیم یافتہ طبقہ کی حالت اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ یہاں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام ایک نسلی قومیت کا نام ہے اور جو شخص مسلمان ماں باپ کے ہاں پیدا ہوا ہے وہ بہر حال مسلمان ہے خواہ عقیدہ و مسلک اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے وہ اسلام کے ساتھ کوئی دُور کی مناسبت بھی نہ رکھتا ہو۔ سوسائٹی میں آپ چلیں پھریں تو آپ کو ہر جگہ عجیب و غریب قسم کے "مسلمانوں" سے سابقہ پیش آئے گا۔ کہیں کوئی صاحب علانیہ خدا اور رسولؐ کا مذاق اُڑا رہے ہیں اور اسلام پر پھبتیاں کس رہے ہیں، مگر ہیں پھر بھی "مسلمان" ہی۔ ایک دوسرے صاحب خدا اور رسالت اور آخرت کے قطعی منکر ہیں اور کسی مادہ پرستانہ مسلک پر پورا ایمان رکھتے ہیں، مگر ان کے "مسلمان" ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایک تیسرے صاحب سُود کھاتے ہیں اور زکوٰۃ کا نام تک نہیں لیتے، مگر ہیں یہ بھی "مسلمان"۔ ایک اور بزرگ بیوی اور بیٹی کو میم صاحبہ بناتے ہوئے سینما لیے جا رہے ہیں، یا کسی رقص و سرود کی محفل میں صاحب زادی سے وایولین بجوا رہے ہیں، مگر آپ کے ساتھ بھی لفظ "مسلمان" بدستور چپکا ہوا ہے۔ ایک دوسرے ذاتِ شریف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تمام فرائض سے مستثنیٰ ہیں، شراب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

زنا، رشوت، جُوا اور ایسی سب چیزیں ان کے لیے جائز ہو چکی ہیں۔ حلال اور حرام کی تمیز سے نہ صرف خالی الذہن ہیں بلکہ اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں بھی اُن کو یہ معلوم کرنے کی پروا نہیں ہوتی کہ خدا کا قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ خیالات، اقوال اور اعمال میں ان کے اور ایک کافر و مشرک کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ مگر ان کا شمار بھی "مسلمانوں" ہی میں ہوتا ہے۔ غرض اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا "مسلمان" نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں ہے۔

پھر لطف یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام سے انحراف کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کا نظریہ اب یہ ہو گیا ہے کہ "مسلمان" جو کچھ بھی کرے وہ "اسلامی" ہے، حتیٰ کہ اگر وہ اسلام سے بغاوت بھی کرے تو وہ اسلامی بغاوت ہے۔ یہ بینک کھولیں تو اس کا نام "اسلامی بینک" ہو گا۔ یہ انشورنس کمپنی قائم کریں تو وہ "اسلامی انشورنس کمپنی" ہو گی۔ یہ جاہلیت کی تعلیم کا ادارہ کھولیں تو وہ "مسلم یونیورسٹی"، "اسلامیہ کالج" یا "اسلامیہ اسکول" ہو گا۔ ان کی کافرانہ ریاست کو "اسلامی ریاست" کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ ان کے فرعون اور نمرود "اسلامی بادشاہ" کے نام سے یاد کیے جائیں گے۔ ان کی جاہلانہ زندگی "اسلامی تہذیب و تمدن" قرار دی جائے گی۔ ان کی موسیقی، معموری اور بُت تراشی کو "اسلامی آرٹ" کے معزز لقب سے ملقب کیا جائے گا۔ ان کے زندقے اور اوہام لاطائل کو "اسلامی فلسفہ" کہا جائے گا۔ حتیٰ کہ یہ سوشلسٹ بھی ہو جائیں گے تو "مسلم سوشلسٹ" کے نام سے پکارے جائیں گے۔ ان سارے ناموں سے آپ آشنا ہو چکے ہیں۔ اب صرف اتنی کسر باقی ہے کہ "اسلامی شراب خانے"، "اسلامی قحبہ خانے" اور "اسلامی قمار خانے" جیسی اصطلاحوں سے بھی آپ کا تعارف شروع ہو جائے۔ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل نے اسلام کے لفظ کو اتنا بے معنی کر دیا ہے کہ ایک کافرانہ چیز کو "اسلامی کفر" یا "اسلامی معصیت" کے نام سے موسوم کرنے میں اب کسی کو تناقض فی الاصطلاح (Contradiction in Terms)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا شُبہ تک نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر کسی دُکان پر آپ "سبزی خوروں کی دُکانِ گوشت"، یا "ولایتی سودیشی بھنڈار" کا بورڈ لگا دیکھیں یا کسی عمارت کا نام "موحّدین کا بُت خانہ" سُنیں تو شاید آپ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکے گی۔

جب افراد کی ذہنیتوں کا یہ حال ہے تو قومی مقاصد اور قومی پالیسی کا اِس تناقُض سے متاثر نہ ہونا امرِ محال ہے۔ آج مسلمانوں کے اخباروں اور رسالوں میں، مسلمانوں کے جلسوں اور انجمنوں میں، مسلمان پڑھے لکھے طبقہ میں آپ ہر طرف کس چیز کی پُکار سُنتے ہیں؟ بس یہی نا کہ سرکاری ملازمتوں میں ہمیں جگہیں ملیں۔ غیر الٰہی نظامِ حکومت کو چلانے کے لیے جس قدر پُرزے درکار ہیں اُن میں سے کم از کم اِتنے پُرزے ہم پر مشتمل ہوں۔ شریعت ساز مجلسوں (Legislatures) کی نشستوں میں کم از کم اتنا تناسب ہمارا ہو۔ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ[1] میں کم سے کم اتنے فی صدی ہم بھی ہوں۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ[2] میں غالب حصّہ ہمارا ہی رہے۔ اِسی کی ساری چیخ پُکار ہے۔ اِسی کا نام اِسلامی مفاد ہے۔ اِسی محور پر مسلمانوں کی قومی سیاست گھوم رہی ہے۔ یہی گروہ عملاً اِس وقت مُسلم قوم کی پالیسی کو کنٹرول کر رہا ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کو نہ صرف یہ کہ اِسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اُس کی عین ضد ہیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ ہوتا تو کیا اس کا نقطۂ نظر یہی ہوتا؟ کیا کوئی اجتماعی اصلاح کی تحریک اور کوئی ایسی جماعت جو خود اپنے اصول پر دنیا میں حکومت قائم کرنے کا داعیہ رکھتی ہو کسی دوسرے اصول کی حکومت میں اپنے پیروؤں کو کل پُرزے بننے کی اجازت دیتی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سُنا ہے کہ اشتراکیوں نے بینک آف انگلینڈ کے نظام میں اشتراکی مفاد کا سوال اُٹھایا ہو؟ یا فاشسٹ گرانڈ کونسل میں اپنی نمائندگی کے مسئلہ پر اشتراکیت کی بقاء و فنا کا انحصار رکھا ہو؟ اگر آج روسی کمیونسٹ

---

[1] جو اللہ کے نازل کردہ (قانون) کے مطابق فیصلہ نہ کریں (المائدہ، آیت ۴۴)

[2] جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں (النساء۔ آیت ۷۶)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پارٹی کا کوئی ممبر نازی حکومت کا وفادار خادم بن جائے تو کیا آپ توقع کرتے ہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اسے پارٹی میں رہنے دیا جائے گا؟ اور اگر کہیں وہ نازی آدمی بن داخل ہو کر نازیت کو سر بلند کرنے کی کوشش کرے تو کیا آپ اس کی جان کی سلامتی کی بھی امید کر سکتے ہیں؟ مگر یہاں آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ اسلام جس روٹی کو زبان پر رکھنے کی اجازت بھی شاید انتہائی اضطرار کی حالت میں دیتا، اور جس کو حلق سے اتارنے کے لیے غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ[1] کی شرط لگاتا، اور پھر تاکید کرتا کہ جس طرح سخت بھوک کی حالت میں جان بچانے کے لیے سؤر کھایا جا سکتا ہے اُسی طرح بس یہ روٹی بھی بقدرِ سدِّ رمق کھا لو، یہاں اس روٹی کو نہ صرف یہ کہ هَنِيئًا مَّرِيئًا[2] کر کے پورے انبساط کے ساتھ کھایا جاتا ہے، بلکہ اسی پر کفر اور اسلام کے معرکے سر ہوتے ہیں، اور اسی کو اسلامی مفاد کا مرکزی نقطہ قرار دیا جاتا ہے! اس کے بعد تعجب دیکھیے اگر ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک کی حیثیت سے اسلام کے دعوائے حکمرانی کو ہنسی کر دنیا مذاق اُڑانے لگے، کیونکہ اسلام کی نمائندگی کرنے والوں نے خود اس کے وقار کو اور اس کے دعوے کو اپنے معدۂ شکم کے تنور میں بھینٹ چڑھایا ہے۔

اور دیکھیے۔ آپ کے ہاں ایک صاحب بڑے طنطنہ کے ساتھ ایک قومی تحریک لے کر اٹھتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ تمہاری شوکتِ رفتہ کو پھر تازہ کر دوں گا اور تمہیں زمین میں غلبہ عطا کر کے چھوڑوں گا۔ آپ کے بڑے علما نہیں، لاکھوں آدمی ان کی طرف دوڑتے ہیں۔ لاکھوں ان سے فلاح و کامرانی کی آس لگاتے ہیں۔ آپ کا پریس ادھر سے ادھر تک ان کی حمایت کرتا ہے اور دیکھتے دیکھتے یہ صاحب اسلام کے سپہ سالار اور ملت کے امیرِ مطاع بن جاتے ہیں۔ مگر آپ میں سے بہت کم لوگوں کو یہ خیال آتا ہے کہ ان کے عقائد، ان کے فہمِ قرآن، ان کے اخلاق، ان کی گفتار، ان کے اعمال، اور ان کے

---

[1] نہ قانون شکنی کا خواہشمند ہو اور نہ حدِ ضرورت سے تجاوز کرے۔ (البقرہ۔ آیت ۱۷۳)

[2] یعنی خوشگوار اور پُر لطف۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طریقِ کار کا بھی جائزہ لے کر دیکھیں۔ ایک شخص اسلامی اصطلاحات کے پردے میں میکیاویلی، ڈارون، ارنسٹ ہیکل اور کارل پیرسن جیسے لوگوں کے نظریات پیش کرتا ہے، قانونِ طبعی اور قانونِ شرعی کو خلط ملط کر کے اسلام کی جڑ بنیاد تک اکھاڑ پھینکتا ہے، ایمان، اسلام، تقویٰ، عبادت، توحید، رسالت، جہاد، ہجرت، اطاعتِ امر، جماعت سب کے مفہوم بدل کر رکھ دیتا ہے، اور تم زہر کے یہ سارے گھونٹ محض اس لالچ میں حلق سے نیچے اتار جاتے ہو کہ "یہ مسلم قوم" کی عسکری تنظیم تو کر ہی دے گا۔ ایک شخص علانیہ جھوٹ بولتا ہے، جھوٹ پر اپنی تحریک کی پوری عمارت کھڑی کرتا ہے، غیر مسلموں تک کے سامنے اپنے کذب و دروغ سے اسلام اور مسلمانوں کو رسوا کرتا ہے، [illegible] بدزبانی اور لاف زنی سے مسلمانوں کے قومی اخلاق کی خوب تذلیل و تضحیک کراتا ہے، [illegible] کے مقابلہ پر آکر پہلی ضرب کھاتے ہی معافی مانگتا ہے، پھر اپنے وقار کو بچانے کے لیے علی الاعلان جھوٹ بولتا ہے کہ میں نے معافی نہیں مانگی، اور پھر لاف زنی کرتا ہے کہ تم اور میں [illegible] پہنچ جاتا ہے جہاں اس نے واپس نہ جانے کا [illegible] کیا تھا، [illegible] دیکھتے ہو اور اس کے باوجود اس کے پیچھے لگے رہتے ہو [illegible] امید [illegible] زمین [illegible] کر دے گا۔ ایک شخص کی تحریر و تقریر [illegible] بازاریت ٹپکی پڑتی ہے، تقویٰ [illegible] تم اس کی امارت تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہیں [illegible] کی جائیں غیر الٰہی حکومت کے لیے بار بار پیش کرتا ہے اور اس خدمت کی [illegible] تمہیں یہ بتاتا ہے کہ اس بہانے تم کو عسکری ٹریننگ مل جائے گی [illegible] مضبوط ہو جائے گی، تم اس ذلیل تدبیر کی خبر اک ہی حلق سے اتار لیتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ ہمیں ایک [illegible] تسلیم کرنے والا امیر تو مل گیا[1]۔ یہ سب باتیں بتا رہی ہیں کہ تمہارا معیارِ اخلاق

---

[1] یہ سب وہ [illegible] کے جاننے کی باتیں ہیں جو اب ۱۹۴۶ء میں زیرِ بحث نہیں ہیں، مگر ہم نے ان کو اس لیے ساقط نہیں کیا کہ اُس وقت کی شائع شدہ کتاب کو ہم ان باتوں کی ترمیم و تنسیخ کے بغیر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انسانیت کس قدر گر گیا ہے۔ تم جس اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہو وہ دنیا میں یہ اصول قائم کرنے آیا تھا کہ انسان کا مقصد ہی صرف پاک نہ ہونا چاہیئے بلکہ اس کو حاصل کرنے کے ذرائع بھی پاک ہونے چاہئیں۔ مگر تمہارا حال یہ ہے کہ جس ذریعہ سے بھی تم کو کامیابی کے حصول کی اُمید نظر آتی ہے، خواہ وہ کتنا ہی ناپاک اور ذلیل ذریعہ کیوں نہ ہو، تم دوڑ کر اسے دانتوں سے پکڑ لیتے ہو اور جو تمہیں اس سے روکنا چاہے اُلٹا اُسی کو پھاڑ کھانے پر آمادہ ہوجاتے ہو۔ ذرائع کی پاکی و ناپاکی سے قطع نظر کر کے محض کامیابی کو مقصود بالذات بنانا تو دہریوں اور کافروں کا شیوہ ہے۔ اگر مسلمان نے بھی یہی کام کیا تو اُس کی خصوصیت کیا باقی رہی؟ بلکہ یہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد دوسری جاہل قوموں سے الگ "مسلمان" کے جداگانہ وجود کے لیے کون سی وجہ جواز رہ جاتی ہے؟

اور اوپر چلیے، آپ کی سب سے بڑی قومی مجلس مسلم لیگ، جس کو نو کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے، ذرا اس کو دیکھیے کہ اس وقت وہ کس روش پر چل رہی ہے۔ موجودہ[1] جنگ کے آغاز میں اس نے اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا اور پھر وائسرائے کے اعلان پر جس رائے کا اظہار کیا، اس کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے[2]۔ اگر آپ ایک اصول پرست جماعت کے طرز عمل اور ایک ایسی جماعت کے طرز عمل میں جو محض اپنی قوم کی سیاسی اغراض کی خدمت کے لیے بنی ہو، فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو اوّل نظر میں آپ کو محسوس ہو جائے گا کہ جنگ کے موقع پر جو پالیسی لیگ نے اختیار کی ہے وہ اصول پرستی

---

[1] مراد ہے جنگِ عظیم دوم جو یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی تھی۔ اور ۳ ستمبر کو برطانوی حکومت بھی اس میں شامل ہو گئی تھی۔ (جدید)

[2] سلسلۂ بیان ہی سے واضح ہے کہ یہاں زیر بحث مسلم لیگ کی وہ پالیسی ہے جو اس نے جنگِ عظیم کے موقع پر اختیار کی تھی۔ اس مضمون کے آخر میں ہم آل انڈیا مسلم لیگ کے ریزولیشن مورخہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو بطور ضمیمہ درج کرتے ہیں۔ اسے پڑھ کر ہر شخص خود دیکھ لے کہ کیا یہ کسی ایسی جماعت کا ریزولیشن ہے جو جنگ کے متعلق خود اپنا کوئی اخلاقی نظریہ رکھتی ہو؟ (جدید)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ہر نشان سے خالی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ در حقیقت یہی پالیسی مسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے تو اس کے آئینے میں ہر صاحبِ نظر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ان نام کے مسلمانوں پر پوری اخلاقی موت وارد ہو چکی ہے۔ مقامی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی جو سیاسی پوزیشن اس وقت ہے اس پوزیشن میں اگر دنیا کی کوئی اور قوم ہوتی تو اس کی لیگ بھی ایسی ہی پالیسی اختیار کرتی، اور قریب قریب انہی الفاظ میں اپنا ریزولیوشن مرتب کرتی۔ آپ مسلم کے بجائے سکھ، پارسی، جرمن، اٹالین، جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں۔ یہی سیاسی موقف اور یہی مقامی حالات اس کے ساتھ وابستہ کر دیجیے، اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ آپ اس ریزولیوشن کو ان میں سے ہر قوم کی طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ مسلمان اب اسی سطح تک گر گیا ہے جس سطح پر دنیا کی تمام قومیں ہیں۔ ایک موقع و محل پر دنیا کی کوئی کافر و مشرک قوم جو طرزِ عمل اختیار کر سکتی ہے وہی مسلمان بھی اختیار کر رہا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ میں اوّلاً اور بالذات ایک اخلاقی اصول کا نمائندہ اور وکیل ہوں، اسی حیثیت سے میرا نام مسلمان ہے، میرا کام سب سے پہلے ایک معاملہ کے اخلاقی پہلو کو دیکھنا ہے، اور میری مسلمان ہونے کی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسی پہلو پر اپنے فیصلہ کا مدار رکھوں۔ اگر میں نے بھی صرف یہی دیکھا کہ پیش آمدہ معاملہ خود مجھ پر اور میری قوم پر کیا اثر ڈالتا ہے، اور یہ کہ میں اس صورتِ حال میں اپنے لیے کس طرح فائدہ حاصل کر سکتا ہوں، تو پھر "مسلمان" کے نام سے میرے الگ وجود کی کوئی وجہ باقی ہی نہیں رہتی۔ ایسا طرزِ عمل تو اگر میں نامسلمان ہوتا اور کسی آسمانی کتاب کی ہوا بھی مجھے نہ لگی ہوتی تب بھی میں اختیار کر سکتا تھا۔

میں اس معاملہ کو ہندوستانی وطن پرست کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا۔ مجھے اس سے بھی کوئی بحث نہیں کہ سیاسی حیثیت سے مسلم لیگ کی یہ پالیسی مسلمان نام کی اس قوم کے لیے، جو ہندوستان میں بستی ہے، مفید ہوگی یا مضر۔ میرے لیے جو سوال اہمیت رکھتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو قوم اس وقت مسلمان کے نام سے پکارے جانے کے باعث دنیا میں اسلام کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے، اس کی سب سے بڑی مجلس نے دنیا کے سامنے اسلام کو کس رنگ میں پیش کیا ہے؟ اس نقطۂ نظر سے جب میں مسلم لیگ کے

ریزولیوشن کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے[1]۔ ان لوگوں کو ایک موقع اور نادر موقع ملا تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا کی ساری قوموں پر اپنے اخلاقی مرتبہ کی برتری کا سکہ جما دیتے۔ ان کو ایک بیش قیمت موقع ملا تھا اس حقیقت کے اظہار کا کہ ہم ایک اخلاقی اصول کے پیروکار ہیں، اور وہ اخلاقی اصول حق اور عدل کی پاک ترین مرجع کا حامل ہے، اور دنیا میں صرف ہماری جماعت ہی وہ ایک جماعت ہے جو شخصی یا قومی نفع و نقصان کے تصورات سے بالاتر ہو کر مجرد اخلاق کی بنیاد پر کام کرتی ہے۔ اگر لیگ کے رہنماؤں میں اسلامی ذہن کا شائبہ بھی موجود ہوتا تو وہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے، اور اس کا جو گہرا اخلاقی اثر مترتب ہوتا، اس کی قدر و قیمت کے مقابلہ میں کوئی نقصان جو ایسا طرزِ عمل اختیار کرنے کی وجہ سے حاصل ہونے کی توقع ہے قطعاً کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مگر افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ ان کی نگاہ میں مسلمان بھی ویسی ہی ایک قوم ہیں جیسی دنیا میں دوسری اقوام ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ممکن سیاسی چالبازی اور ہر مفیدِ مطلب سیاسی تدبیر سے اس قوم کے مفاد کی حفاظت کرنا ہی "اسلامی سیاست" ہے ——— حالانکہ ایسی ادنیٰ درجہ کی سیاست کو اسلامی سیاست کہنا اسلام کے لیے ازالۂ حیثیتِ عرفی سے کم نہیں!

"مسلمانوں" کی زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف پہلوؤں سے یہ چند مثالیں جو میں

---

[1] بعض لوگوں نے کمال بددیانتی کے ساتھ اس فقرے کو سیاق و سباق سے الگ نکال کر مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں نے یہ بات مسلم لیگ کے مارچ ۱۹۴۰ء والے ریزولیوشن کے بارے میں لکھی تھی۔ حالانکہ یہ مضمون نومبر ۱۹۳۹ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مارچ ۴۰ء کے ریزولیوشن پر اظہارِ خیال کسی الہامی طاقت ہی سے کیا جا سکتا تھا!

(جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے پیش کی ہیں، یہ سب ایک ہی نتیجہ کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اس وقت تنزل و انحطاط کے اس آخری مرحلے پر پہنچ گئی ہے جہاں ایک تحریک کی روح ناپید ہو جاتی ہے، صرف اس کا نام باقی رہ جاتا ہے، اور اس نام کا اطلاق برعکس نہند نام زنگی کافور کے بمصداق، اُن چیزوں پر ہونے لگتا ہے جو اس کے اصلی معنی کی ضد ہوتی ہیں۔ نظریات غیر اسلامی اور نام اُن کا مسلمان۔ مقاصد غیر اسلامی اور ان کا نام بھی مسلمان۔ سیرت غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان چسپاں۔ کیریکٹر غیر اسلامی اور اس پر بھی لفظ مسلمان کا بے تکلف اطلاق۔ افراد سے لے کر جماعتوں تک، سوسائٹی کے ادنیٰ ترین طبقوں سے لے کر بلند ترین طبقوں تک، چھوٹی انجمنوں سے لے کر بڑی سے بڑی جلسوں تک، ہر طرف اسی ایک وبائے عام کے اثرات پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے دل نے بارہا یہ سوال کیا ہے کہ اسلام جو کبھی آندھی اور طوفان کی طرح اٹھا تھا جس کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھیر سکتی تھی آج اس کی کشور کشائی اور عالمگیری آخر کس چیز نے چھین لی ہو؟ اس کا جواب ہر بار مجھے یہی ملا کہ اسلامی تحریک پر تنزل و انحطاط کے اسی قانون کا عمل جاری ہوا ہے جسے میں ابتدا میں بیان کر آیا ہوں۔ اب اصلاح کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کو از سرِ نو ایک تحریک کی حیثیت سے اٹھایا جائے اور مسلم کے معنی کو پھر سے تازہ کیا جائے۔ مُردوں کی اس بستی میں جو تھوڑے سے بہت مسلمان دل ابھی حرکت کر رہے ہیں، اور جن کی گہرائیوں سے ابھی تک یہ شہادت بلند ہو رہی ہے کہ اسلام ہی حق اور صدق ہے اور انسانیت کی فلاح صرف طریق اسلامی ہی میں ہے اُن کو جان لینا چاہیے کہ اب کرنے کا کام یہی ہے۔ مگر اس کام کو کرنا کھیل نہیں ہے۔ یہ وہ کام ہے جس کے تصور ہی سے فرہاد کا زہرہ آب ہو جاتا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ نومبر ۱۹۳۹ء)

ضمیمہ

ذیل میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا وہ ریزولیوشن درج کیا جا رہا ہے جو اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے ۱۰ ستمبر ۱۹۳۹ء کو پاس کیا تھا۔

"ورکنگ کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ۲۷ اگست ۱۹۳۹ء کو جو قرارداد نمبر ۸ منظور کی تھی وہ مسلمانانِ ہند کے صحیح جذبات اور آراء کی عکاسی کرتی ہے۔ اس قرارداد کے الفاظ یہ ہیں کہ: "برطانوی حکومت کی اس پالیسی پر اظہارِ افسوس کیا جائے کہ اس نے مسلمانانِ ہند کی مرضی کے خلاف ان پر ایک کانسٹی ٹیوشن مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص وہ فیڈریشن جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رُو سے تجویز کیا گیا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان پر ایک ایسی مستقل اور معاندانہ فرقہ وارانہ اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی جو مسلمانوں کے مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق کو پامال کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گی۔ نیز وائسرائے اور کانگرسی صوبوں کے گورنروں کا فرض تھا کہ اپنے اختیاراتِ خاص استعمال کر کے اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرتے اور ان سے انصاف کرتے۔ لیکن انہوں نے اس ضمن میں بدرجہ غفلت، بے اعتنائی اور بے تدبیری کا ثبوت دے کر کچھ بھی نہیں کیا۔ اس کے علاوہ فلسطین کے عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کیا گیا ہے۔ اندریں حالات اگر برطانوی حکومت آئندہ خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانانِ عالم اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کی ہمدردی کے حصول کی خواہاں ہے تو اس کا فرض ہے کہ بلاتامل ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کرے۔"

ورکنگ کمیٹی وائسرائے کے اس اعلان کو بنظرِ تحسین دیکھتی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ فیڈریشن کی وہ سکیم جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں درج ہے معطل کر دی گئی ہے۔ وائسرائے کا یہ اعلان ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے مفاد کے مطابق ہے۔ ورکنگ کمیٹی چاہتی ہے کہ معطل کرنے کے بجائے اس سکیم کو قطعی ترک کر دیا جائے اور ملک معظم کی حکومت تک اپنی آواز پہنچاتی ہے کہ بلاتوقف اس مطالبے پر عمل کیا جائے۔ کمیٹی یہ امر بھی واضح کرنا چاہتی ہے کہ وائسرائے نے مرکزی مجلسِ قانون ساز کے ممبروں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے "فیڈریشن مقصود ہے" کی جو ترکیب استعمال کی ہے اور کہا ہے کہ ملک معظم کی حکومت کے پیشِ نظر یہ "فیڈریشن مقصود" ہے، کمیٹی ہرگز اس کی تائید نہیں کرتی اور برطانوی حکومت

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے پُرزور درخواست کرتی ہے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے صوبائی حصے پر عمل در آمد کرنے کے بعد جو نتائج سامنے آئے ہیں اور جو حالات بدلے ہیں ان کی روشنی میں ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے مسئلے پر از سرِ نو غور کیا جائے۔

"اس ضمن میں کمیٹی یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو ایک خاص اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ اور عرصۂ دراز سے مسلمان متوقع رہے ہیں کہ وہ ہندوستان کی قومی زندگی، یہاں کی حکومت اور ملک کے نظم ونسق میں باعزت مقام حاصل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا تاکہ آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام رونما ہو اور وہ اپنے مذہبی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی حقوق کی طرف سے مطمئن ہو کر اکثریت رکھنے والی قوم کے ساتھ اشتراک کر سکیں۔ لیکن حالات میں جو تغیّر پیدا ہوا ہے، بالخصوص اس صوبائی آئین کے نفاذ کے بعد جو ایک نام نہاد پارلیمنٹری جمہوریت کے طرزِ حکومت پر وضع کیا گیا ہے، حالات نے جس قسم کا پلٹا کھایا ہے اس کا گذشتہ دو سال سے کچھ اوپر مدت میں یہ تلخ تجربہ ہوا ہے کہ اس صوبائی آئین نے بلاشک وشبہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ہندو اکثریت کی ایک دائمی اور مستقل حکومت قائم کر دی ہے۔ اور مختلف کانگرسی صوبوں کی حکومتوں کے تحت مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہاں تک کہ ہر روز یہ کانگرسی حکومتیں مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور کلچر کو مٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان اس بات کے خلاف ہیں کہ ہندوستان کے باشندوں کو لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بنایا جائے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں نے بار بار ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ہرگز مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر ہندو اکثریت کی حکومت قائم نہیں ہونے دیں گے۔ اور نہ مسلمانوں کو ہندوؤں کا غلام بننے دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے "فیڈریشن مقصود" کے قطعی خلاف ہیں جس سے جمہوریت اور پارلیمنٹری نظامِ حکومت کی آڑ میں ہندوستان پر اکثریت کی حکومت قائم ہو۔ اس ملک کے لیے جس میں مختلف قومیں آباد ہوں اور جو ایک قومی مملکت نہیں بن سکتا اس قسم کا پارلیمنٹری نظامِ حکومت ہرگز موزوں نہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلم لیگ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے نظریئے کی مخالف ہے۔ وہ ایسے حملے کی مذمت کرتی ہے جو بغیر کسی وجہ کے دوسرے پر کیا جاتے۔ وہ انسانیت کی آزادی کی علمبردار ہے اور طاقتور کو محض طاقت کے بل پر دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی۔ ورکنگ کمیٹی کو پولینڈ، انگلستان اور فرانس سے گہری ہمدردی ہے۔ بایں ہمہ وہ محسوس کرتی ہے کہ اس آزمائش کی گھڑی میں برطانیہ کو اس وقت تک مسلمانوں کی مدد اور تعاون بخوبی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ملک معظم کی حکومت اور وائسرائے کانگرسی صوبوں میں، جہاں آج مسلمانوں کا مال محفوظ ہے نہ جان، عزت محفوظ ہے نہ آبرو، اور جہاں ان کے ابتدائی حقوق کو نہایت بے رحمی سے کچلا جا رہا ہے، ان کے ساتھ حق و انصاف کا سلوک نہیں کرتی۔ ورکنگ کمیٹی نہایت پُرزور الفاظ میں ملک معظم کی حکومت اور وائسرائے سے درخواست کرتی ہے کہ وہ گورنروں کو ہدایت کریں کہ جہاں جہاں صوبائی وزارتیں مسلمانوں کے حقوق کو تلف کر رہی ہیں، انہیں مظالم کا نشانہ بنا رہی ہیں، اور ان کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں، وہاں یہ گورنر اپنے اختیاراتِ خاص کو جو از روئے آئین انہیں حاصل ہیں استعمال کریں۔ ورکنگ کمیٹی نہایت افسوس سے یہ کہتی ہے کہ گورنروں نے اب تک مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے سے کوتاہی برتی ہے اور اپنے ان اختیاراتِ خاص کو محض اس خوف سے استعمال نہیں کیا کہ کانگرس کا ہائی کمان مسلسل یہ دھمکیاں دے رہا ہے کہ اگر گورنروں نے یہ اختیاراتِ خاص استعمال کیے تو وہ ان صوبوں میں جہاں کانگرس کی اکثریت ہے "ڈیڈلاک" پیدا کر دے گا۔

مسلم لیگ اگرچہ ہندوستان کی آزادی کی علمبردار ہے لیکن ورکنگ کمیٹی ملک معظم کی حکومت سے کہتی ہے کہ مسلم لیگ کی منظوری اور رضامندی کے بغیر اس قسم کا کوئی اعلان نہ کیا جائے جس کا مقصد ہندوستان میں آئینی اور دستوری ترقی کے مدارج معین کرنا ہو۔ نیز ملک معظم کی حکومت اور برطانوی پارلیمنٹ کسی قسم کا دستور وضع نہیں کر سکتی اور نہ منظور کر سکتی ہے جب تک اس بارے میں مسلم لیگ کی منظوری اور رضامندی حاصل نہ کر لی جائے۔

فلسطین کے عربوں کے بارے میں برطانوی حکومت نے جو پالیسی اختیار کی ہے اس نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلمانوں کے احساسات وجذبات کو سخت مجروح کیا ہے اور اس ضمن میں جس قدر احتجاج کیا گیا ہے اس کا کوئی معقول نتیجہ اب تک نہیں نکلا۔ ورکنگ کمیٹی پھر ایک بار ملک معظم کی حکومت پر زور ڈال کر کہتی ہے کہ عربوں کے قومی مطالبات جلد تسلیم کیے جائیں۔

آج دنیا کو جو خطرناک بحران درپیش ہے اگر اس سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے حکومت برطانیہ کو مسلمانوں کا حقیقی اور آبرومندانہ تعاون درکار ہے تو اس کا فرض ہے کہ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا کرے کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں۔ نیز اس کا یہ بھی فرض ہے کہ اس سلسلہ میں مسلم لیگ کا جو مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے، اعتماد حاصل کرے۔

موجودہ نازک گھڑی میں ورکنگ کمیٹی ہر مسلمان سے یہ درخواست کرتی ہے کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم کے نیچے اس عزم صمیم کے ساتھ کھڑا ہو جائے کہ وہ بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ کیونکہ اسی پر ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کی آئندہ تقدیر اور عزت و آبرو کا انحصار ہے[1]۔"

(ماخوذ از "ہماری قومی جدوجہد جنوری ۱۹۳۹ء سے دسمبر ۱۹۳۹ء تک" تالیف ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔ مطبوعہ پاکستان ٹائمز پریس، لاہور)

---

[1] جن عبارتوں پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے ان پر غور کر لیا جائے۔ ان میں حکومت برطانیہ کو اس شرط پر جنگ عظیم دوم میں تعاون کا یقین دلایا گیا ہے کہ وہ ہندوستان میں مسلمان قوم کے حقوق کا تحفظ کرے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ تھے کہ ہمیں اس سے بحث نہیں تھی کہ برطانیہ اور اس کے حریفوں کی باہمی جنگ قتال فی سبیل اللہ ہے یا قتال فی سبیل الطاغوت۔ ہمیں صرف اس سے بحث تھی کہ ہمارے قومی حقوق کا تحفظ ہو اور اس تحفظ کی یقین دہانی حاصل کرنے کے بعد ہم اس قتال میں تعاون کے لیے تیار تھے جو بہر حال قتال فی سبیل اللہ نہیں بلکہ فی سبیل الطاغوت ہی تھا۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نسلی مسلمانوں کے لیے دو راہیں

عمل، خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، بہرحال اس کی صحت کے لیے دو چیزیں شرط لازم ہیں:

پہلی شرط خود شناسی ہے۔ آپ کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہیئے کہ آپ کیا ہیں، اور جو کچھ آپ ہیں اِس ہونے کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر اگر اس تحقیق سے آپ پر کوئی ایسی حقیقت منکشف ہو جس سے آپ راضی نہ ہوں، یعنی آپ کی یہ خواہش ہو کہ جو کچھ آپ ہیں وہ نہ رہیں بلکہ کچھ اور ہو جائیں، تب بھی آپ کے لیے لازم ہے کہ اُس "کچھ اور" کا تعین کریں اور جو کچھ بھی آپ ہونا چاہتے ہیں اس کے مقتضیات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

دوسری شرط قوّتِ فیصلہ اور قوّتِ ارادی ہے۔ آپ کو بہرحال یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ جو کچھ آپ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، یا کچھ اور بننے کے خواہش مند ہیں پھر اس فیصلہ کی رُو سے جو کچھ بھی آپ ہونا چاہیں، اُس ہونے کے مقتضیات کا بار اُٹھانے کے لیے آپ کو تیار رہنا چاہیئے۔ اِس سے بڑھ کر خطرناک بات کسی شخص یا گروہ کے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ ایک حیثیت سے محبت اور دوسری حیثیت کا لالچ رکھتا ہو، کبھی اِس حیثیت سے چمٹ جاتے اور کبھی اُس حیثیت کی طرف لپکے۔ مگر دونوں میں سے کسی ایک کے مقتضیات بھی پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ اس تلوّن اور تردّد

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا لازمی نتیجہ خام کاری ہے۔ جو شخص یا گروہ اس حالت میں مبتلا ہو وہ بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے لیے کوئی ثبات اور قرار نہیں ہوتا۔ اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک پتہ جو زمین پر پڑا ہو اور ہواؤں کے جھونکے اُسے اُڑائے اُڑائے لیے پھریں۔

مسلمانوں کے افراد اور اُن کی جماعتوں کے اعمال میں تلوّن اور خام کاری کی جو کیفیات ایک مدّت سے نمایاں ہیں اور اب نمایاں تر ہو گئی ہیں اُن کے اسباب پر میں نے جتنا زیادہ غور کیا اتنا ہی زیادہ مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ تمام خرابیوں کی جڑ انہی دو چیزوں کا فقدان ہے۔ کہیں خود شناسی مفقود ہے اور کہیں قوّتِ فیصلہ و قوّتِ ارادی۔

ایک معتدبہ جماعت ہم میں ایسی ہے جو سرے سے اپنی خودی کا احساس ہی نہیں رکھتی۔ اُسے یہ معلوم ہی نہیں کہ مسلمان ہونے کے معنی کیا ہیں اور اس کے مقتضیات کیا ہیں۔ پھر بھلا اس سے یہ اُمید کیسے کی جا سکتی ہے کہ اپنے انفرادی یا اجتماعی عمل کے لیے وہ کوئی ایسا راستہ منتخب کرے گی جو مسلمان کو کرنا چاہیئے ؟

ایک دوسری جماعت، اور وہ بھی معتدبہ، ایسی ہے جو شعورِ ذات تو رکھتی ہے مگر قوّتِ فیصلہ اور قوّتِ ارادی نہیں رکھتی۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ جو کچھ ہم ہیں اس کے ہونے کے مقتضیات کیا ہیں۔ لیکن اس علم نے اُن میں محبّت اور خوف کے دو گونہ جذبات پیدا کر دیئے ہیں۔ جو کچھ یہ ہیں وہی رہنا چاہتے ہیں، کیونکہ اُنہیں اپنی حیثیت سے محبّت ہے۔ لیکن جو کچھ یہ ہیں اس ہونے کے مقتضیات کی دہشت اُن پر طاری ہو گئی ہے۔ جانتے ہیں کہ مسلمان ہونا کھیل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ذمہ داریوں کا ایک بھاری بوجھ آتا ہے۔ اس کے ساتھ پابندیاں ہیں، ایثار اور قربانی ہے، جہاد اور مشقت ہے، ایک ایسا سخت مشن ہے جس میں دنیا بھر سے لڑائی ہے، اور اس لڑائی کے معاوضہ میں خدا کی خوشنودی کے سوا کسی چیز کی طلب بھی جائز نہیں۔ اس ہولناک چیز کا خوف ان کے دلوں پر ایسا بیٹھا ہوا ہے کہ یہ مسلمان ہونے کے مقتضیات سے کترا کر بھاگتے ہیں اور کوئی ایسی حیثیت اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں آسانی ہو۔ مگر انہیں خود بھی معلوم ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ مسلمان ہونے کی حیثیت باقی رکھ کر یہ کوئی دوسری حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کی قوتِ فیصلہ جواب دے گئی ہے۔ یہ اسلام اور کفر کے درمیان مُتردّد ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسلام سے چمٹنا چاہتے ہیں مگر اس کے مقتضیات کا خوفناک چہرہ دیکھ کر دُور بھاگتے ہیں۔ کفر کی آسائشوں اور لذّتوں اور فائدوں کو دیکھ کر اس کی طرف لپکتے ہیں، مگر وہ کہتا ہے کہ میری طرف آتے ہو تو پُورے کافر بن کر آؤ اور میرے مقتضیات پورے کرو۔ یہ اس کے لیے بھی تیار نہیں۔ لہٰذا اس سے بھی دُور بھاگتے ہیں۔ اب ان کی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہو کر رہ گئی ہے جو ہر طرف آسائشیں اور فائدے ڈھونڈتا ہو مگر کسی طرف کی بھی ذمّہ داریاں قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔

مسلمانوں کی جماعت زیادہ تر انہی دو گروہوں پر مشتمل ہے، اس لیے عموماً جو اجتماعی تحریکیں مسلمانوں میں پھیل رہی ہیں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے غلط ہیں۔ ان کے مقاصد میں غلطی ہے، ان کے طریقِ کار میں غلطی ہے، اُن کی قیادت میں غلطی ہے اور اُن کی رُوحی کیفیت میں غلطی ہے۔ بہت سے لوگوں کو بے شعوری کی وجہ سے اس غلطی کا احساس ہی نہیں ہوتا اس لیے وہ جوش و خروش کے ساتھ ان تحریکوں کو چلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی تحریک کے درست ہونے کے لیے بس یہی بات کافی ہے کہ اس میں "مسلمانوں کا فائدہ" ہے۔ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔[1] اور بہت سے لوگ جن کو غلطی کا احساس ہے وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی کمزوری کے باعث ان تحریکوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نفس نے انہیں یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان ایک بین بین راہ چلنے ہی میں سلامتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جاہلیت کے درمیان کوئی بیچ کی راہ نہیں ہے اور ایسی کسی راہ پر چل کر مسلمان کہیں کے بھی نہیں رہتے۔ لہٰذا مسلمانوں کی حقیقی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے سامنے واضح طور پر اسلام اور جاہلیت کی راہوں کو اُن کے مقتضیات اور اُن کے نتائج کے ساتھ کھول کر

---

[1] "وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں خوب کر رہے ہیں۔" (الکہف۔ آیت ۱۰۴)

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیش کر دیا جائے ، اور انہیں مشورہ دیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرلیں۔

میں نے ترجمان القرآن میں "قوم" اور "جماعت" کے اصولی فرق کی بحث اِسی توضیح کے لیے چھیڑی تھی[1]۔ اس بحث میں میں نے قرآن اور حدیث کی شہادت سے یہ ثابت کیا تھا کہ "مسلمان" کی اصطلاح جس گروہ کے لیے وضع کی گئی ہے ، وہ دراصل ایک "قوم" نہیں ہے بلکہ ایک "جماعت" ہے۔ اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "قوم" ہونے اور "جماعت" ہونے کے مقتضیات و نتائج میں کیا فرق ہے۔ مجھے اور کسی شخص کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ آپ کو قوم کے بجائے جماعت بننے پر مجبور کرے۔ آپ کو پورا اختیار ہے کہ جو چاہیں بنیں۔ البتہ جو خدمت ہم انجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آپ کے ذہن کی اُلجھن اور نظر کے دُھند کو دُور کر دیں ، تاکہ آپ دونوں حیثیتوں کا صحیح موازنہ کرلیں ، اور آپ پر یہ واضح ہو جائے کہ ان حیثیتوں کے جمع کرنے کی جو صورتیں آپ نکال رہے ہیں یہ اصولاً غلط اور نتائج کے اعتبار سے مہلک ہیں۔

ایک گروہ میں قومیت کا احساس دراصل تاریخی اثرات اور تہذیبی وراثت کے تسلسل سے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی جب کچھ لوگ ایک طویل مدت تک ایک قسم کے اخلاقی تصورات اور ایک قسم کے معاشرتی طور طریقوں کے ساتھ باہم متفق اور دوسرے گروہوں سے ممتاز ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں ، اور ایک نسل کے بعد دوسری نسل اس ورثہ کو لے کر اپنے اندر مستحکم کرتی چلی جاتی ہے ، تو ان میں اپنے مستقل اجتماعی وجود کا وہ احساس پیدا ہوتا جاتا ہے جسے "قومیت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چند عادتیں اور رسمیں ہوتی ہیں جن سے وہ مانوس ہوتے ہیں۔ چند تخیلات ہوتے ہیں جن سے انہیں محبت ہوتی ہے اور جن کی ترجمانی اُن کا لٹریچر کیا کرتا ہے۔ انہی چیزوں کے مجموعہ کو ان کی قومی تہذیب کہا جاتا ہے۔ ان میں طبعاً یہ

---

[1] ملاحظہ ہو "تفہیمات" جلد اول، مضمون "اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم"۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "مسئلہ قومیت"۔ یہ مضامین پہلے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوتے تھے اور بعد میں ان کو مذکورہ بالا کتابوں میں شامل کر دیا گیا۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خواہش ہوتی ہے کہ اس تہذیب یعنی اسلاف کے اِس ورثہ کو باقی رکھیں اور اپنے اخلاف کے لیے اسے چھوڑ جائیں تاکہ ان کی قومی زندگی کا تسلسل قائم رہے۔

اس معنی میں جو گروہ ایک قوم بن گیا ہو اس میں قومیت کا شعور پیدا ہونے کے بعد طبعی طور پر یہ خواہش اُبھر آتی ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کا ضبط اس کے اپنے ہاتھ میں ہو اور کسی دوسرے گروہ کی مرضی اس پر مسلّط نہ ہونے پاتے۔ یہ ایک قوم کا سیاسی مفاد ہے۔

اسی طرح وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ معیشت کے جو وسائل اس کے پاس ہیں ان کی حفاظت کرے، اور جو مزید وسائل حاصل ہو سکتے ہوں انہیں حاصل کرے تاکہ اس کے افراد زیادہ سے زیادہ خوش حال ہوں۔ یہی چیز ہے جس کو قوم کے معاشی مفاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اِس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ قومیت کا یہ مفہوم جو اوپر بیان ہوا ہے، اس کے لحاظ سے مسلمان صدیوں کے توارث کی بدولت ایک قوم بن چکے ہیں، اور اب دوسرے تمام گروہوں سے ممتاز وہ اپنا ایک مستقل اجتماعی وجود رکھتے ہیں۔ اِس میں بھی کسی شبہہ کی گنجائش نہیں کہ دوسرے گروہوں کی ایک کثیر تعداد کے درمیان گھرے ہوئے ہونے کی وجہ سے اُن کے سیاسی اور معاشی مفاد اور اُن کی قومی تہذیب کے تحفظ کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت بس یہی ہے؟ کیا وہ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کی بہت سی قوموں میں سے ایک قوم ہیں؟ کیا ان کی قومیت کی حقیقت بس اتنی ہی ہے کہ ایک گروہ نے نسلاً بعد نسلٍ ایک طرح کی زندگی بسر کر کے اپنے اندر "قومیت" پیدا کر لی ہے؟ کیا وہ تہذیب جسے یہ اسلامی تہذیب کہتے ہیں محض موروثی عادات و رسوم اور تاریخی تجاریب کا مجموعہ[1] ہے؟ کیا ان کے اصل قومی مسائل صرف یہی ہیں کہ جس ورثہ کو انھوں نے باپ دادا سے پایا ہے اس کی حفاظت

---

[1] اسلامی تہذیب دراصل کس چیز کا نام ہے اِس کو مَیں نے اپنی کتاب "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" میں بیان کیا ہے۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کریں، جن وسائلِ معیشت اور جن سیاسی اقتدارات پر وہ ابھی تک قابض ہیں انہیں ہاتھ سے نہ جانے دیں، جن چیزوں کی انہیں اپنے گروہ کے افراد کی خوش حالی کے لیے ضرورت ہے اُن کو حاصل کر لیں، اور فی الجملہ اُن کی اجتماعی زندگی کا ضبط اُن کے اپنے ہی ہاتھ میں رہے؟

اگر یہی مسلمانوں کی قومیت اور یہی ان کی تہذیب ہے۔ اور یہی ان کے قومی مسائل ہیں، تو بلاشبہ وہ سب قومی تحریکات درست ہیں جو اس وقت ان میں چل رہی ہیں۔ اس صورت میں:

اِن کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ ان کی ایک لیگ ہو جس میں وہ سب لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور مسلمانوں کے نظامِ معاشرت سے وابستہ ہیں۔ اُنہی کے گروہ کے کچھ لوگ اُن کے قائد ہوں جن کے اشاروں پر یہ حرکت کریں۔ اور اُن کی تمام جدوجہد کا مقصود صرف یہ ہو کہ جو کچھ ان کے ہاتھ میں ہے وہ جانے نہ پائے، اور جو کچھ مزید ہاتھ آسکتا ہو وہ آجائے، قطع نظر اس سے کہ اسلام جس کے نام پر یہ اپنی قوم کو مسلمان کہتے ہیں، اُس کو جائز سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو۔ اُن کے لیے تمام تر اہمیت صرف اسی چیز کی ہونی چاہیئے کہ ملک کا نظم ونسق خواہ کسی نوعیت کا ہو، بہر حال اُس کے ضبط میں خود اُن کے اپنے افراد کو کافی حصہ ملے تاکہ اپنے آبائی ورثہ (یعنی اپنی قومی تہذیب) کو وہ خود جس صورت میں بھی باقی رکھنا چاہیں، رکھ سکیں اور جس قسم کے بھی فوائد ومنافع ملک کی آبادی میں تقسیم ہو رہے ہوں ان میں سے ایک معتدبہ حصہ اُن کے افراد کو بھی مل جائے۔

اُن کے لیے یہ بھی درست ہے کہ موقع اور محل کو دیکھ کر یہ ملک کی جس پارٹی[1] کے ساتھ جن شرائط پر چاہیں معاملہ کر لیں، بشرطیکہ اُس معاملہ میں اُن کے اپنے گروہ کا مفاد متصوّر ہو۔ ایسے کسی معاملہ میں قومی غداری کا سوال صرف اُس وقت پیدا ہو گا جب معاملہ جان بوجھ کر نقصان کے ساتھ کیا جائے، یا اس میں اپنی قوم کے سیاسی ومعاشی مفاد کو

---

[1] خواہ وہ کانگریس پارٹی ہو یا سوشلسٹ پارٹی یا کوئی اور۔ (قدیم)

نظر انداز کر دیا جاتے۔

ان کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ جس طرح دوسری قوموں میں قوم پرستی (Nationalism) پیدا ہوئی ہے اُسی طرح اِن میں بھی ہو۔ یہ بھی اٹلی اور جرمنی اور جاپان کی طرح غلبہ اور تمکّن فی الارض کا مطالبہ کریں۔ اِن کی تنظیم بھی فاشستی اصولوں پر کی جائے۔ یہ بھی انتخابِ طبیعی (Natural Selection) اور بقائے اصلح (Survival of the Fittest) کے قانون کے مطابق اپنے آپ کو بھیڑیئے کی طرح "صالح" ثابت کریں اور غیر صالح بکریوں کو ہضم کرنا شروع کر دیں۔ یہ بھی استعماری قوموں کے زمرے میں شامل ہو جائیں، جس طرح ممکن ہو زمین میں غلبہ حاصل کریں، اور اسی دنیا کی زندگی میں اسی زمین پر اپنے لیے جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ کا لطف پیدا کر لیں۔

قومیت کا یہ نظریہ اختیار کر لینے کے بعد آپ کے لیے یہ سب کچھ درست ہو جاتا ہے۔ مگر خوب جان رکھیے کہ اسلام کو اِس قومیت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اسلام کو نہ تو کسی نسلی گروہ سے دلچسپی ہے، نہ وہ کسی جماعت کی موروثی عادات اور رسوم سے لگاؤ رکھتا ہے، نہ وہ دنیا کے معاملات کو چند اشخاص یا مجموعۂ اشخاص کی منفعت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ انسانیت جن گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ان کے اندر اپنے نام سے ایک اور گروہ کا اضافہ کر دے، نہ وہ انسانی جماعتوں کو جانور بنانا چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کے بالمقابل تنازع للبقاء (Struggle for Existence) کے میدان میں اُتریں اور انتخابِ طبیعی کے امتحان میں شریک ہوں۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے۔ لہٰذا اگر یہ آپ کی قومیت اور یہ آپ کی قومی تہذیب ہے، اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرمالیں۔ اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام آپ کی اس قومیت اور قومی تہذیب سے تبرّی کرتا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا اسلام ہی کا نام استعمال کرنے پر آپ کو اصرار کیوں ہو؟ "مسلمان" کے معنی و مفہوم سے تو آپ کو کوئی بحث ہے ہی نہیں۔ آپ کو تو اپنی قومیت کے لیے بس ایک نام چاہیئے۔ سو اس غرض کے لیے آپ جو نام بھی وضع کر لیں گے وہ آپ کی مستقل اجتماعی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حیثیت پر اُسی طرح دلالت کرنے لگے گا جس طرح اب لفظِ "مسلمان" کر رہا ہے۔ آخر اِس نوع کی قومیت میں کون سی خصوصیت ہے جس کے لیے لفظِ "مسلمان" ہی استعمال کرنا ضروری ہو؟

اِس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اِسی لیے نہیں ہے کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھ رہے ہیں، اوّلاً اسلام کے خلاف ہیں، بلکہ اِس کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ اِن نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کے لیے رسوائی و بدنامی کا موجب ہوگا۔ دنیا آپ کی حرکات کو دیکھ کر سمجھے گی کہ اسلام یہی کچھ سکھاتا ہوگا، اور یہ چیز اُس کو اسلام سے اور زیادہ دُور پھینکے گی۔ آپ اپنے "قومی مفاد" کی حفاظت کیلیے غیر اسلامی فوج میں اپنا تناسب قائم رکھنے کی کوشش کریں گے، اور دنیا یہ سمجھے گی کہ شاید یہ اسلام کی تعلیم ہے کہ جو تمہیں پندرہ روپے تنخواہ دے اس کے حکم سے تم ہر ایک کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آپ اپنے قومی مفاد کی خاطر ہر اُس منفعت کو دانتوں سے پکڑنے کی کوشش کریں گے جو کسی مسلمان یا بہت سے مسلمانوں کو کسی طور سے حاصل ہو یا ہو سکتی ہو، اور دنیا اس دَنائت کو اسلام کی طرف منسوب کرے گی۔ آپ انتہائی بے اصولی کے ساتھ کہیں ایک چیز کی حمایت کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے مطابق ہے، اور کہیں اُسی چیز کی مخالفت کریں گے اس لیے کہ وہ آپ کے مفاد کے خلاف ہے، کبھی ایک پارٹی سے ملیں گے اور کبھی اُسی پارٹی سے لڑیں گے، نہ اس لیے کہ آپ کے اور اُس کے درمیان اصولی اتفاق یا اتحاد ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ آپ کے پیشِ نظر اصول نہیں "قومی مفاد" ہے۔ یہ ابن الوقتی جو آپ کے کیرکٹر سے ظاہر ہوگی، دنیا سمجھے گی کہ ایسا ہی کیرکٹر اسلام پیدا کرتا ہے۔ آپ قومی مفاد کی تلاش میں ہر طرف لپکیں گے۔ فاشزم کے اصول یا کمیونزم کے نظریات بھی اختیار کریں گے، ظالمانہ سرمایہ داری اور مُستبدانہ شخصی ریاستوں کے دامن میں بھی پناہ لیں گے، انگریز اور ہندو اور ریاستہائے ہند، جس کے آستانہ پر بھی فائدہ کا بُت بیٹھا نظر آئے گا اسی کی طرف سجدہ ریز ہوں گے، اور یہ سارے داغ آپ کے توسط سے اسلام کے دامن پر لگتے چلے جائیں گے۔ اسلام نے صدیوں آپ پر جو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

احسانات کیسے ہیں اُن کا کم از کم یہ بدلہ تو نہ ہونا چاہیئے کہ آپ اس طرح اس کی رسوائی کا سامان کریں۔

لیکن اگر آپ کو اسلام سے واقعی محبت ہے اور حقیقت میں آپ مسلمان ہی رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو یہ جان لینا چاہیئے کہ اسلام یہودیت اور ہندوازم کی طرح ایک نسلی مذہب نہیں ہے جو ایک نسلی قومیت بناتا ہو بلکہ وہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک ہے۔ ایک جہانی نظریہ (World Theory) اور ایک عالمی تصور (Universal Idea) ہے۔ وہ ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو اِس مسلک، اِس نظریہ، اِس تصوّر کو لے کر اٹھے، اور دنیا کے سامنے عملاً اس کا نقشہ پیش کرے، اور جس جس قوم کے جو جو لوگ اس کو قبول کرتے جائیں انہیں اپنی جماعت میں شامل کرتی چلی جائے، یہاں تک کہ قوموں کے درمیان تفریق کی دیواریں مسمار ہو جائیں۔ اُس کے نزدیک "اسلامی" صرف وہ چیز ہے جو اُس کے مسلک اور اس کے نظریہ کے مطابق ہو۔ اور جو چیز اُس کے خلاف ہو اُس کو وہ اپنا لینے سے صاف انکار کرتا ہے خواہ تمام دنیا کے مسلمانوں کا ذاتی مفاد اس سے وابستہ ہو۔ لہٰذا اگر آپ اسلام کے مسلک کی خاطر جئیں اور اُس کو دنیا میں حکمران بنانے کے لیے جدّوجہد کریں تب تو یقیناً آپ اسلامی جماعت اور مسلمان گروہ ہوں گے، ورنہ اپنے لیے جینے اور اپنے مفاد کے لیے جدّوجہد کرنے کی صورت میں اسلام سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ آپ کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ کام اپنے لیے کریں اور نام اسلام کا لیں۔

مسلکِ اسلام کی اس جہانی و عالمی نوعیت کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ ایک عالمگیر مسلک اور جہانی نظریہ کے مقتضیات کیا ہوتے ہیں۔

اوّلاً وہ مختلف پارٹیوں میں سے ایک پارٹی بن کر رہنے پر قانع نہیں ہوتا، بلکہ اُس کی فطرت کا اقتضاء یہ ہوتا ہے کہ بس وہی ایک ہو۔ وہ مقابل کی کسی طاقت کو اپنا شریک و سہیم بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ مُدارات اور مصالحت (Compromise) کرنا اس کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ وہ سودا نہیں کرتا، وہ غالب ہونا چاہتا ہے،

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ [1]

ثانیاً وہ اشخاص یا طبقوں یا قوموں کے نقطۂ نظر سے مسائل کو نہیں دیکھتا بلکہ کُلّی اور جہانی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اُسے اس امر سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہوتی کہ اس شخص یا اس طبقہ یا اس گروہ کا فائدہ کس چیز میں ہے۔ اُس کو انسان سے بحث ہوتی ہے اور وہ اُن مسائل کو حل کرنا چاہتا ہے جو مجموعی حیثیت سے انسان کے لیے حل طلب ہوں، قطع نظر اس سے کہ کس کو کیا ملتا ہے اور کس سے کیا چھنتا ہے، كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ [2]۔

ثالثاً اس کے پیشِ نظر وقتی یا مقامی مقاصد نہیں ہوتے بلکہ ایک دائمی اور جہانی مقصد ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں زندگی کا جو نظام اُس کے اصول کے خلاف قائم ہے اُس کو توڑ ڈالے اور اپنے اصول کے مطابق مستقل طور پر ایک نظام قائم کرے۔

رابعاً وہ ایسی قومیت کے تنگ دائرے میں بند ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو نسلی اور تاریخی روایات پر قائم ہو۔ اُس کی کامیابی کے لیے تو لازمی شرط یہی ہے کہ اپنے عہد کے تمام انسانوں میں سے بہتر اور صالح تر افراد کو نکال کر اپنی تنظیم کی طرف کھینچ لائے اور اُن کی قابلیتوں سے کام لے۔ اگر وہ کسی خاص قوم کی ذاتی اغراض کا حامی بن جائے تو ظاہر ہے کہ دوسری قوموں کے لیے اس کی اپیل قطعاً غیر مؤثر ہو جائے گی۔

خامساً وہ کسی خاص قوم کی موروثی تہذیب اور روایتی رسوم و عادات سے اپنا دامن نہیں باندھتا بلکہ ہر عہد میں تمام عالمِ انسانی نے اپنی علمی تلاش و جستجو سے جو حقائق ـــــ نظریات نہیں بلکہ حقائق ـــــ دریافت کیے ہوں، یا اپنی سعی و عمل سے جو صالح نتائج پیدا کیے ہوں، اُن سب کو لے کر وہ اپنے تجویز کردہ نظامِ اجتماعی میں اپنے اصول کے مطابق اس طرح جذب کرتا ہے کہ وہ اس نظام کے فطری اجزاء (نہ کہ درآمد شدہ اشیاء) بن جائیں۔

---

[1] تاکہ وہ اس دینِ حق کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ (التوبہ: ۳۳)

[2] تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے لوگوں (کی اصلاح و ہدایت) کے لیے نکالا گیا ہے (آلِ عمران: ۱۱۰)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سارا شااس کی کامیابی کے لیے صرف یہ ثابت کردینا کافی نہیں ہوتا کہ وہ بجائے خود برحق ہے اور اس میں انسان کے لیے فلاح ہے۔ بلکہ اپنے مقصود کو پہنچنے کے لیے وہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے اصولوں کو ایک انقلابی تحریک کی بنیاد بنا دیا جائے، اُس پر ایمان رکھنے والے اُس تحریک کے زور سے ایک مجاہد جماعت بن کر اُٹھیں، اور بالآخر اُس کے نظریات ایک اسٹیٹ کے لیے بنیادی قانون بن جائیں۔

یہ اسلام کے مقتضیات ہیں اور یہی مسلمان ہونے کے مقتضیات بھی ہیں۔ اب اگر آپ "اسلامی جماعت" بن کر کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی اُس قومی پالیسی پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی جس پر آپ اب تک چلتے رہے ہیں، اور اُسے بالکلیہ بدل کر ان مقتضیات کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔

آپ کو اپنے دماغ سے قومی مفاد کا تصور نکال دینا پڑے گا اور اس کی جگہ اسلام کے اصول اور اس کے نصب العین کو دینی ہوگی۔ آپ کو وقتی اور مقامی مقاصد سے صرفِ نظر کرلینا ہوگا اور اپنی نظر اِس ایک مقصد پر جما دینی ہوگی کہ اسلام کے اصول دنیا میں حکمراں ہوں۔ اس غرض کے لیے آپ کو دنیا بھر سے لڑنے کے لیے تیار ہونا پڑے گا اور کسی ایسی پارٹی سے، جو آپ کے اصول نہ مانتی ہو، آپ کسی شرط پر بھی سودا نہ کرسکیں گے۔ آپ کو سختی کے ساتھ ایک بااصول جماعت بننا پڑے گا، اُن ناکارہ لوگوں کو اپنے سے الگ کرنا ہوگا جو آپ کے اصول کو نہ مانتے ہوں، اور سب قوموں میں سے اُن صالحین کو چُن چُن کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا جو ان اصولوں کو ماننے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کو ابن الوقتی چھوڑ دینی ہوگی۔ اپنے اصولوں سے ہٹ کر آپ کچھ نہ کرسکیں گے خواہ اُس میں کتنا ہی بڑا شخصی یا قومی فائدہ ہو۔ آپ کو ایک ایسی مجاہد جماعت بننا پڑے گا۔ جو اپنے اصولوں کے لیے لڑنے والی ہو، جس کا مقصد اپنی "قومی حکومت" (National State) قائم کرنا نہ ہو بلکہ اپنے "اصولوں کی حکومت" (Ideological State) قائم کرنا ہو۔

ایسی جماعت جب آپ بنیں گے تو آپ کو اپنی قیادت میں تغیر کرنا ہوگا۔ اُس وقت آپ کے قائد صرف وہ لوگ ہوسکیں گے جو اسلام کے اصول کو ٹھیک ٹھیک جانتے ہوں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور سب سے زیادہ اُن کا اتباع کرنے والے ہوں۔ ایک قوم کا لیڈر ہر وہ شخص ہو سکتا ہے جو قوم کا فرد ہو۔ مگر ایک جماعت کا لیڈر صرف وہی ہو سکتا ہے جو جماعت کے مسلک کا سب سے بڑا علمبردار ہو۔ مسلمانوں کی قومی تنظیم میں تو اسلام کے مسلک سے ہٹے ہوئے لوگ صفِ اول میں بھی جگہ پا سکتے ہیں، مگر جماعتی تنظیم میں ان کا مقام سب سے پچھلی صفوں میں ہو گا، بلکہ شاید اُن میں سے بہت سوں کو کسی صف میں بھی جگہ نہ ملے گی۔

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ[1]۔ آپ پر دونوں راستے واضح ہو چکے ہیں۔ اب ان کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے بھی دیکھ لیجیے تاکہ ان میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے میں آسانی ہو۔

اگر آپ محض ایک ایسی قوم ہوں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے جدوجہد کرتی ہو، تو آپ کی حیثیت ایک جامد چٹان کی سی ہو گی، اور آپ کے مقابلہ میں دوسری بہت سی قومیں ایسی ہی چٹانوں کی صورت میں موجود ہوں گی۔ آپ کا اور اُن کا مقابلہ اُسی طرح ہو گا جس طرح چٹانوں کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ ایک چٹان دوسری چٹان میں سے اجزا لے کر اپنا حجم نہیں بڑھا سکتی۔ نہ ایک چٹان کے اندر گھس سکتی ہے۔ ان کے درمیان معاملہ کی بس دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ہر ایک چٹان اپنی اپنی جگہ رہنے پر قانع ہو۔ یا ایک چٹان دوسری چٹان پر چڑھ جائے اور اس سے ٹکرا کر اسے توڑنے اور پیسنے کی کوشش کرے۔ پہلی صورت میں آپ محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں آپ کے لیے وسعت کا امکان تو ہے، مگر اُسی طرح کی وسعت جیسی فاشسٹ اٹلی اور نازی جرمنی حاصل کر رہا ہے، اور اس سے پہلے امپیریلسٹ برطانیہ حاصل کر چکا ہے۔ اس طرح کی وسعت حاصل کر کے آپ دنیا میں بس ایک مفسد قوم کا اضافہ کر دیں گے جو زمین میں کچھ مدت تک فساد پھیلائے گی اور بالآخر اپنے کیے کی سزا پائے گی۔

بخلاف اس کے اگر آپ اسلامی مفہوم کے مطابق ایک ایسی اصولی جماعت ہوں جو

---

[1] سیدھا راستہ ٹیڑھے راستے سے الگ نمایاں ہو گیا۔

محض ایک عالمگیر مسلک اور ایک جہانی نظریہ کے لیے جدوجہد کرتی ہو، اور جس میں ہر انسان آپ کے اصول قبول کر کے مساوی حقوق اور مساویانہ حیثیت کے ساتھ شریک ہو سکتا ہو، تو آپ ایک جامد پتھر کی طرح نہ ہوں گے بلکہ ایک نامی جسم (Organic Body) کی طرح ہوں گے۔ آپ کی مثال اس درخت کی سی ہو گی جو ہر طرف اپنے گردوپیش سے اجزاء جذب کرتا ہے اور پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت میں آپ ایک عالمگیر طاقت (World Force) ہوں گے۔ آپ دنیا کو اپنے لیے نہیں بلکہ اصولِ حق کے لیے فتح کرنے کی کوشش کریں گے۔ اور اگر واقعی آپ کے اصول فطرتِ انسانی کو اپیل کرنے والے اور انسانیت کی مشکلات کو حل کرنے والے ہیں ـــــ جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں ـــــ تو دنیا خود اپنے آپ کو مفتوحیت کے لیے آپ کے سامنے پیش کر دے گی۔ آپ کے شخصی یا قومی مفاد میں تو کوئی عالمگیر کشش نہیں ہے۔ اُس کی طرف آپ دعوت دیں گے تو دنیا اس کی طرف خود کبھی نہ کھنچے گی بلکہ آپ کو زبردستی اسے کھینچنا پڑے گا۔ لیکن اسلام کے اصول میں عالمگیری کی طاقت ہے۔ دنیا اُن کی طرف خود کھنچے گی بشرطیکہ آپ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے اصولوں کے لیے جئیں اور مریں۔ آپ کے سامنے اشتراکیت کی مثال موجود ہے۔ وہ ایک عالمگیر طاقت صرف اس لیے بنتی چلی گئی کہ اشتراکی لوگ اشتراکیوں کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ اشتراکیت کے اصول کے لیے جہاد کرتے رہے ہے۔ آج اگر وہ اشتراکیت کے لیے جہاد کرنا چھوڑ دیں اور ہر قوم کے اشتراکیوں کو صرف اپنے قومی مفاد کی فکر لگ جائے تو آپ دیکھیں گے کہ اشتراکیت کی عالمگیری ختم ہو جائے گی۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۳۹ء)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اقلیّت و اکثریت

مسلمانوں نے چونکہ اپنے دین کو ایک عالمگیر تحریک کے بجائے ایک جامد قومی تہذیب اور خود اپنے آپ کو ایک بین الاقوامی انقلابی جماعت کے بجائے محض ایک قوم بنا کر رکھ دیا ہے لہٰذا اس کا نتیجہ آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ اقلیت و اکثریت کا سوال پیدا ہوا ہے، اور اس کے لیے یہ بات سخت پریشانی کی موجب بن گئی ہے کہ مردم شماری کے اعتبار سے جب میں چار کے مقابلہ میں ایک کی نسبت رکھتا ہوں تو اب میں چوگنی تعداد کے غلبہ سے اپنے آپ کو کیسے بچاؤں۔

یہ پریشانی اب رفتہ رفتہ شکست خوردہ ذہنیت میں تبدیل ہو رہی ہے اور کمزور فریق کی طرح اب مسلمان کو بچاؤ کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں سوجھتی کہ وہ پسپا ہو کر اپنے خول میں سمٹ آئے۔ اس صورتِ حال کی تنہا وجہ یہی ہے کہ اس اللہ کے بندے کو نہ تو اس طاقت کا علم ہے جو اس کے دین کی صورت میں اس کے پاس ہے، اور نہ اسے یہی خبر ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے دنیا میں اس کا مقام کیا ہے۔ یہ اپنے دین کو ایک کُند ہتھیار اور اپنے آپ کو ایک "قوم" سمجھ رہا ہے، اسی وجہ سے اس کو بچاؤ کی پڑ گئی ہے۔ اگر اس کو یاد ہوتا کہ میں ایک جماعت ہوں اور وہ جماعت ہوں جس کا مشن ہی دنیا کو اپنے نظریہ و مسلک اور اپنے فلسفۂ اجتماع (Social Philosophy) کی طاقت سے فتح کرنا ہے تو ہرگز اسے کوئی پریشانی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیش نہ آتی ۔ اس کے لیے اکثریت واقلیت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ۔ یہ اپنے خول میں سمٹ آنے کی فکر نہ کرتا بلکہ آگے بڑھ کر میدان جیتنے کی تدبیریں سوچتا ۔

کثرت وقلت کا سوال صرف قوموں ہی کے لیے پیدا ہوتا ہے ۔ "جماعتوں" کے لیے نہیں ۔ جو جماعتیں کسی طاقت ور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں ۔ اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں ۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اِس وقت[1] صرف ۳۲ لاکھ ہے اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی ، مگر اس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا ۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف ۴ لاکھ ارکان پر مشتمل ہے ، اور روم پر مارچ کرتے وقت ۳ لاکھ تھی ، مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالویوں پر چھا گئی ۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے ۔ اگر قدیم زمانہ کی مثالیں خود اسلامی تاریخ سے دی جائیں تو ان کو یہ کہہ کر ٹالا جاسکتا ہے کہ وہ زمانہ گزر گیا اور وہ حالات بدل گئے ۔ لیکن یہ تازہ مثالیں آپ کے اِسی زمانہ کی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اُس طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور مسلک رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے ، اور محدود اغراض کے لیے لڑنے کے بجائے ایسے اصولوں کے لیے لڑے جو لوگوں کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے والے اور انسانی توجہات کو اُس جماعت کی طرف کھینچنے والے ہوں ۔

اسلام کے اصول اِس غرض کے لیے بہترین پروگرام دے سکتے ہیں اور اُس پروگرام کو لے کر اگر مسلمان عملی مجاہدے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں تو چند سال میں حالات کا نقشہ بدل سکتا ہے ۔ لیکن یہاں مسلمانوں کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ نہ اسلام کو جانتے ہیں ، نہ اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پہچانتے ہیں ، نہ ان کو اُس منبع کی خبر ہے جہاں اسلام کی قوتِ تسخیر چھپی ہوئی ہے ۔ ان کے دماغوں کی پہنچ زیادہ

---

[1] یہ ۱۹۳۹ء تک کے اعداد وشمار ہیں ۔ (جدید)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے زیادہ جہاں تک ہو سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یا تو اپنے آپ کو قلیل التعداد دیکھ کر محفوظ قلعوں کی طرف بھاگنے کی فکر کریں، یا اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ ہمارے لیے دوسروں کے پیچھے چلنے اور اپنے آپ کو غیر مسلموں کی قیادت کے حوالے کر دینے کے سوا کوئی زندگی نہیں ہے۔

دنیا میں اس وقت جتنی جماعتیں برسرِ اقتدار ہیں ان میں کسی جماعت کی تعداد بھی لاکھوں سے متجاوز نہیں ہے۔ غالباً روسی کمیونسٹ پارٹی اس وقت سب سے بڑی جماعت ہے، مگر جیسا کہ ابھی میں نے بیان کیا اس کے ارکان بھی ۲۲ لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جاتے تو کہنا پڑے گا کہ جس نظریہ و مسلک کے حامیوں کی تعداد صرف ایک ملک میں آٹھ کروڑ اور دنیا بھر میں چالیس کروڑ یا اس سے زیادہ ہو اس کو تمام کرۂ زمین پر حکمران ہونا چاہیے۔ یہ نتیجہ یقیناً رونما ہوتا اگر ان لوگوں میں جماعتی احساس بیدار ہوتا، اور انہیں اپنی جماعت کے مشن کا شعور نصیب ہوتا، اور یہ اس مشن کے لیے سعی و جہد پر کمربستہ ہوتے۔ لیکن جس چیز نے اس عظیم الشان تعداد کو بالکل بے اثر، قطعی ناکارہ بنا دیا ہے وہ اسی احساس و شعور اور اسی آمادگیٔ عمل کا فقدان ہے۔ مختلف قسم کی شیطانی قوتیں اس جماعت کو چمٹ گئی ہیں اور پیہم اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کسی طرح یہ اپنے آپ سے واقف نہ ہونے پاتے، اور اس کو کبھی اتنا ہوش ہی نہ آتے کہ یہ اپنی زندگی کے مشن کا خیال کر سکے۔ آپ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لے لیجیے۔ ہر جگہ آپ کو یہی نظر آتے گا کہ ایک نہ ایک شیطان اس قوم کی جان کا لاگو بنا ہوا ہے اور پوری مستعدی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے۔ جہاں مسلمانوں میں مذہب کے ساتھ ابھی دلچسپی باقی ہے وہاں یہ شیاطین مذہبیت کا جامہ پہن کر آتے ہیں اور دین کے نام سے اُن مسائل پر بحثیں چھیڑتے اور نزاعیں برپا کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات سر پھٹول تک نوبت پہنچا دیتے ہیں جن کی دین میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اِس طرح مسلمانوں کا سارا مذہبی جوش اُن کی اپنی تخریب میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں مذہب کی طرف سے کچھ سرد مہری پیدا ہو گئی ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہاں کچھ دوسری قسم کے شیاطین نمودار ہوتے ہیں اور وہ دنیوی ترقی و خوش حالی کا سبز باغ دکھا کر مسلمانوں کو ایسی تحریکوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں جو اپنے مقاصد و طریقِ کار کے لحاظ سے قطعاً غیر اسلامی ہیں۔

جن لوگوں کو مسلم عوام کی حالت دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ اِس گئی گزری حالت میں بھی اِن لوگوں کے اندر اچھی خاصی اخلاقی طاقت موجود ہے جس سے بہت کچھ کام لیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بہت سے روگ جو اس قوم کو لگے ہوتے ہیں، انہوں نے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی اِس عظیم الشان تعداد کو صفر کے درجے تک نیچے گرا دیا ہے۔ اسلام جس مقصد کے لیے جہاد اور محنت و جاں فشانی چاہتا ہے، یہ اس سے بہت دور ہٹا دیئے گئے ہیں۔ ان کے ذہن سے اسلام کا صحیح تصوّر اور مسلمان کا حقیقی مفہوم نکال دیا گیا ہے۔ یہ درحقیقت خود اپنے آپ سے بے گانہ کر دیئے گئے ہیں۔ یہ اس غلط فہمی میں ڈال دیئے گئے ہیں کہ وہ نظریۂ حیات جو اسلام اِن کو دیتا ہے اُس کے لیے کوئی مستقبل نہیں، کامیابی کا کوئی موقع نہیں۔

ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے اسلامی اغراض کے لیے قریب قریب بالکل بے کار ہو چکی ہے۔ اس تعداد کے بھروسہ پر اگر کچھ کیا جائے گا تو سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو اُمید وابستہ کی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر اسلام ازسرِنو ایک زندہ تحریک کی حیثیت سے اُٹھے اور شیطانی قوتوں کے مقابلہ میں اپنے اصول کی حکمرانی و فرمانروائی قائم کرنے کے لیے نبرد آزما ہو، تو شاید غیر مسلموں کی بہ نسبت اِن مسلمانوں میں سے اُس کو کچھ زیادہ دالنظیر نسبۃً زیادہ آسانی کے ساتھ مل سکیں گے۔

اب جو لوگ حقیقت میں اُس اسلام کو جانتے اور سمجھتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور جن کا قلب اس امر پر پوری طرح مطمئن ہے کہ انسانیت کی فلاح و سعادت اُسی اسلام کی حکمرانی میں ہے اور صرف اسلام ہی کے اصول پر انسانی تمدن و اجتماع کا ایک معتدل و متوازن نظام تعمیر ہو سکتا ہے، ان کو چند غلط فہمیوں سے اپنے ذہن کو صاف کر

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لینا چاہیے اور چند حقیقتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہییں۔

اول یہ کہ "مسلمانوں کے مفاد" سے اسلام کا دامن باندھنا غلطی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ سوال ہرگز کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ اسلام اپنے پیروؤں کے اس "مفاد" کو تسلیم کرتا ہے کہ ایک غیر الٰہی نظامِ حکومت کو چلانے کے لیے کتنے "مسلمانوں" کی خدمات فوج میں اور کتنوں کی پولیس میں اور کتنوں کی دفتروں میں حاصل کی جاتی ہیں، اور کتنی نشستیں ان کو مجالسِ قانون ساز میں ملتی ہیں تاکہ خدا کے ملک میں وہ بھی غیر مسلموں کی طرح شریعت ساز بن کر بیٹھیں، اور کن ریاستوں کی مسندِ حکمرانی مسلمان فرمانرواؤں کے لیے محفوظ رکھی جائے تاکہ وہ غیر مسلم راجاؤں کی طرح ملکِ خدا کے ناجائز مالک بنے بیٹھے رہیں۔ اس قسم کے سوالات کو اسلامی سوالات کہنا اسلام کی توہین ہے۔ ایک اسلامی تحریک کو اس قسم کے تمام سوالات سے قطعاً بے تعلق ہونا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اسلام کی کامیابی نہ تو اُن مسلمانوں کی تعداد اور طاقت پر منحصر ہے جو اس وقت مردم شماری میں مسلمان کی حیثیت سے لکھے ہوتے ہیں، اور نہ اُس کی کامیابی کی راہ میں ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں کی کثرتِ تعداد ہی کوئی مضبوط رکاوٹ ہے۔ مردم شماری کے رجسٹروں میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب دیکھ کر یہ گمان کرنا کہ اسلام کی طاقت ہندوستان میں صرف اتنی ہی ہے جتنا آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ہے، اور یہ سمجھنا کہ آبادی میں غیر مسلموں کا تناسب جتنا زیادہ ہے اتنا ہی اسلام کی کامیابی کا امکان کم ہے، یہ صرف اُن لوگوں کا کام ہے جو اسلام کو محض ایک جامد مذہبی رسم کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اگر اسلام ایک زندہ عملی تحریک کی حیثیت سے میدان میں آجائے اور اس کے اصولوں کی بنیاد پر ہندوستانی زندگی کے حقیقی مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک عملی پروگرام لے کر کوئی منظم جماعت اُٹھ کھڑی ہو تو یقین رکھیے کہ اُس کی اپیل پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہ رہے گی بلکہ شاید اُن سے بڑھ کر غیر مسلموں کو اپنی طرف کھینچے گی اور کوئی طاقت اس سیلِ رواں کو نہ روک سکے گی۔ آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہ ہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے، افسوس ہے کہ وہ اسلام کے اِن امکانات سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ناواقف ہیں۔

تیسرے یہ کہ کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ اس کے حقیقی معتقدین اور پیرووں کی تعداد ملک میں ۹۰ یا ۷۰ فی صدی ہو جائے۔ تاریخ کے واقعات اور خود موجودہ دنیا کے تجربات ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک مضبوط اور منظم پارٹی، جس کے ارکان اپنی تحریک پر پورا ایمان رکھتے ہوں، اور اس کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، اور پارٹی ڈسپلن کی کامل اطاعت کرتے ہوں، محض اپنے ایمان اور ڈسپلن کی طاقت سے برسرِ اقتدار آسکتی ہے خواہ اس کے ارکان کی تعداد ملک کی آبادی میں ایک فی ہزار بھی نہ ہو۔ پارٹی کا پروگرام کروڑوں کو اپیل کرتا ہے اور کروڑوں کی ہمدردی حاصل کرتا ہے، مگر خود پارٹی کے اندر صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ایمان اور اطاعتِ امر کے اوصاف کمال درجے پر رکھتے ہوں۔ پس اسلام کو حکمران بنانے کے لیے حقیقی مسلمانوں کی کسی بڑی تعداد کی ضرورت نہیں۔ تھوڑے سے ہی کافی ہیں بشرطیکہ علم اور عمل کے اعتبار سے مسلمان ہوں اور خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرنے پر مستعد ہوں۔

(ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۳۹ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شکایات

ناظرین "ترجمان القرآن" میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"آپ کی نظر میں نہ موجودہ لیڈروں میں، نہ عوام میں کوئی اس قابل ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے یا کہلانے کا مستحق ہو، نہ موجودہ دَور کی سیاسی کشمکش میں اِن نام نہاد مسلمانوں کی بہبودی کی جدّوجہد مستحسن ہے۔ پھر برائے خدا یہ بتا دیجئے کہ یہ مسلمان کس نام سے پکارا جائے اور اس پر جو ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان سے بچنے کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟

یہ سچ ہے کہ دَورِ حاضر کے مسلمان بُرے ہیں۔ مذہب کی پابندی نہیں کرتے۔ لیکن آخر کیا انہیں ڈوبتا ہی چھوڑ دیا جائے؟ ...... کیا جس وقت تک سب راہ راست پر نہ آجائیں اس وقت تک نہ اپنے آپ کو کوئی مسلمان کہے نہ ان کی بہتری کے واسطے انہی جیسے مسلمانوں کی طرف سے کوئی جدّوجہد کی جائے؟ ...... ڈوبتے ہوئے سے یہ کہنا کہ تو گہرے پانی میں گیا ہی کیوں تھا اور تو کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہے سراسر خلافِ انسانیت ہے۔ ضرورت تو اس کی ہے کہ اسے نکالنے کی کوشش کی جائے اور ہر ممکن تدبیر اس کی جان بچانے کی عمل میں لائی جائے۔"

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:

"آپ کی روش میرے لیے اور مجھ جیسے خیالات رکھنے والے بہت سے دوسرے لوگوں کے لیے سخت وجہ پریشانی بن گئی ہے۔ جب تک آپ نیشنلسٹ مسلمانوں یا کانگریس سے تعاون کرنے والے مسلمانوں کے طرزِ عمل پر تنقید کرتے رہے، ہم نے یہ سمجھا کہ آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی انفرادیت برقرار رکھنے کے حامی ہیں اس لیے اُن لوگوں سے اختلاف رکھتے ہیں جن کے رویہ سے آپ کو خطرہ ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی ہستی گم ہو جائے گی۔ مگر اب آپ نے اُن دو تحریکوں اور ان کے لیڈروں پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی ہے جو اس انفرادیت کے تحفظ ہی کے لیے کوشاں ہیں، یعنی مسلم لیگ اور خاکسار تحریک۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟ ہندوستان میں اگر مسلمانوں کو زندہ رہنا ہے تو بہر حال یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مرکز پر جمع ہوں، ایک منظم گروہ بنیں، کسی قیادت کے تحت حرکت کریں۔ اس مقصد کے لیے جو کوشش کی جاتی ہے اس سے آپ کا اختلاف کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر آپ مذہبیت کا احیاء چاہتے ہیں تو یہ بھی تب ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک اجتماعی نظام بن جائے۔ فی الحال بُری یا بھلی، جیسی بھی ہے، جماعت تو بن رہی ہے۔ اس کا ساتھ دیجیے۔ پھر مذہبی احیاء کے لیے بھی کوشش کر لیجیے گا۔ لیکن آپ کی روش سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں سے کسی کا بھی ساتھ آپ دینا نہیں چاہتے۔"

یہ دو خط منجملہ ان بہت سے شکایتی خطوط کے ہیں جو پچھلے دنوں مجھے وصول ہوئے ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک بہت بڑا گروہ اسی طرز پر سوچ رہا ہے اور ان خطوط میں دراصل اسی طرزِ خیال کی نمائندگی کی گئی ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے اوپر آپ تنقید کرنا اور اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینا کوئی خوش آیند چیز نہیں ہے۔ میں بھی اس کام کو خوش آیند سمجھ کر نہیں کرتا۔ بڑا تلخ گھونٹ، زہر کا گھونٹ ہے جسے حلق سے اُتارتا ہوں، اور اچھی طرح اُس تلخی کو محسوس کرتا ہوں جو میرے دوسرے بھائی اس کے اندر پاتے ہوں گے۔ اس احساس کے باوجود میرا ضمیر تقاضا کرتا ہے کہ اس تلخی سے بچنے کے بجائے اسے گوارا کرنا چاہیئے۔ تلخی تو واقعہ میں موجود ہے۔ تغافل کا فائدہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے احساس کو حقیقی اور واقعی تلخی کے ادراک سے معطّل کر لیا جائے۔ دوسروں کی چیرہ دستیوں اور جارحانہ کارروائیوں پر شکوہ سنج ہونا اور اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے نہ صرف غفلت برتنا بلکہ ان کے لیے جواز و استحسان کے دلائل ڈھونڈنا بہت خوشگوار چیز ہے جس سے دل خوب بہلتا ہے، مگر اس کی حیثیت مارفیا کے انجکشن کی سی ہے۔ یہ ایک پینک ہے جس کے نشہ میں مریض سو جاتا ہے مگر وہ اندرونی خرابیاں دُور نہیں ہوتیں جن کے سبب سے بیرونی آفات کو اس پر تسلط حاصل ہوتا ہے۔ میرے بھائی چاہتے ہیں کہ میں بھی انہیں اسی پینک کی خوراکیں دیا کروں۔ ان کی خواہش ہے کہ جس خیالی جنّت میں وہ جی رہے ہیں، جن سرابوں سے وہ چشمۂ آبِ حیواں پانے کی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں، اور جن غلط فہمیوں کا دل فریب طلسم انہوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے، ان سب چیزوں کو جوں کا توں رہنے دوں۔ بلکہ اگر ہو سکے تو خود بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤں جن کے لیے ان چیزوں کا سرا ہنا دین اور امت کی سب سے بڑی خدمت بنا ہوا ہے۔ اس خدمت کے فوائد بھی مجھے معلوم ہیں، مگر میں مجبور ہوں کہ مجھے محبوب دشمن کے بجائے مبغوض دوست بننا زیادہ مرغوب ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

مسلمانوں کا مفاد، مسلمانوں کی فلاح و بہبود، مسلمانوں کی تنظیم، مسلمانوں کی جمعیت و مرکزیت، مسلمانوں کی ترقی و خوشحالی، یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر بار بار زبانوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پرانا ہے۔ میں بھی یہ ذکر کرتا ہوں، زید بھی کرتا ہے، بکر بھی کرتا ہے، اور ہر ایک شخص جو اس گروہِ مسلمین میں شامل ہے، انہی الفاظ سے اپنے مدعا کے اظہار میں کام لیتا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہمارے عمل کی راہوں میں اختلاف ہے۔ ایک کسی طرف جا رہا ہے، دوسرا کسی اور طرف، تیسرا کسی اور طرف۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ محض اتفاقی امر ہے؟ یا اس کی تہ میں کوئی بنیادی سبب ہے جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی؟

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے درمیان الفاظ مشترک ہیں مگر معنی و مفہوم میں اختلاف ہے۔ ایک ہی لفظ ہے "مسلمان"، لیکن میں اس سے کچھ اور مراد لیتا ہوں، اور دوسرے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے مفاد، فلاح و بہبود، تنظیم، جمعیت و مرکزیت، ترقی و خوشحالی اور ہر ایک چیز جو لفظ "مسلمان" کی نسبت سے بولی جاتی ہے، ہمارے درمیان مختلف المعنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی الجھن کے سبب سے غلط فہمیاں واقع ہو جاتی ہیں، اور جب لوگ اسے سلجھانے سے عاجز رہ جاتے ہیں تو شکایات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تم کو مسلمانوں کے مفاد اور فلاح و بہبود اور ترقی و خوشحالی وغیرہ سے ہمدردی نہیں، جمعیت بن رہی ہے، مرکزیت پیدا ہو رہی ہے، مگر تم اس کی مخالفت کرتے ہو، مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام ہوتا ہے اور تم اس میں روڑے اٹکاتے ہو۔ حالانکہ ایک شخص ان الفاظ کا اطلاق جن مخصوص و متعین چیزوں پر کرتا ہے دوسرے کے نزدیک ان پر یہ الفاظ منطبق ہی نہیں ہوتے، ورنہ ظاہر ہے کہ کون کافر ہو گا جس کو فی نفسہ فلاحِ مسلمین وغیرہ سے دشمنی ہو۔ آئیے، ذرا تحقیق کر کے دیکھیں کہ اس الجھن کی نوعیت کیا ہے۔

مُطلَق اور مُقیَّد کا فرق ایک ایسی واضح چیز ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جب ہم کوئی ایسا لفظ بولتے ہیں جس میں اطلاق اور عموم ہو تو اس کے استعمال میں وسعت ہوتی ہے۔ اور جب اُسے مُقیَّد کر دیا جاتا ہے تو اُس قید کا لحاظ کیے بغیر اُس لفظ کا استعمال صحیح نہیں ہوتا۔ مثلاً جب ہم "رنگ" بولتے ہیں تو اس کا استعمال ہر رنگ پر ہو گا۔ کوئی چیز خواہ سیاہی میں ترقی کرے، یا سفیدی میں، یا سُرخی میں، بہرحال ہم کہیں گے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

کہ اس کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مگر جب رنگ کے ساتھ ہم سفید کی قید لگا دیں تو سیاہ، سُرخ، سبز اور دوسرے رنگ کی چیزوں پر ہم اس لفظ کا اطلاق نہ کر سکیں گے، اور سیاہی یا سرخی میں ترقی کرنے کو سفید رنگ کی ترقی کہنا صحیح نہ ہوگا۔ اسی طرح مثال کے طور پر لفظ "قافلہ" کو لیجیے۔ ہر قافلہ جو کسی طرف جا رہا ہو، اس لفظ سے موسوم ہو سکتا ہے۔ جس طرف بھی وہ بڑھے اس کی پیش قدمی کو قافلہ کی پیش قدمی کہا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اُس کا میرِ قافلہ بن سکتا ہے۔ ہر گاڑی پر وہ سفر کر سکتا ہے۔ ہر قسم کا زادِ سفر اس کا زادِ سفر ہو سکتا ہے۔ غرض اصل کے مطلق ہونے کی وجہ سے ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو مطلق ہی ہوگی۔ لیکن جب مثلاً عزمِ پشاور کی قید سے مقید کر کے "قافلۂ پشاور" کہہ دیا جائے تو پھر وہ عموم باقی نہیں رہ سکتا جو محض قافلہ ہونے کی صورت میں تھا۔ "قافلۂ پشاور" کا اطلاق صرف اُسی قافلہ پر ہوگا جو عازمِ پشاور ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ جا تو رہا ہو مدراس یا بمبئی کی طرف اور کہلائے قافلۂ پشاور۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو اس سے تعلق رکھتی ہو، پشاور کی قید سے مقید ہو جائے گی۔ مثلاً قافلۂ پشاور کی پیش قدمی کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ پشاور کی سڑک پر چل رہا ہے۔ اگر وہ کسی دوسری سڑک پر بڑھ رہا ہو تو اسے قافلۂ پشاور کی پیش قدمی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ اسے پیش قدمی کے بجائے رجعت کہا جائے گا۔ کیونکہ دوسرے راستہ پر وہ جتنے قدم بھی چلے گا، پشاور کی نسبت سے دُور ہوتا چلا جائے گا۔ اس کا میرِ قافلہ بھی صرف وہی ہو سکتا ہے جو پشاور کا راستہ جانتا ہو۔ دوسرے راستوں کے علم میں کوئی شخص خواہ کتنا ہی ماہر ہو، اگر وہ پشاور کی راہ سے ناواقف ہے تو بہر حال وہ قافلۂ پشاور کا سردار نہیں بن سکتا۔ اسی پر دوسرے امور کو بھی قیاس کر لیجیے۔

اب دیکھیے کہ الجھن کس طرح پیش آتی ہے۔ قافلہ ہی کی مثال کو لے لیجیے۔ ایک قافلہ کا نام تو ہے "قافلۂ پشاور"۔ مگر آپ یا تو پشاور کی قید کو بھول کر اسے محض قافلہ سمجھ لیتے ہیں۔ یا آپ کو پشاور کا راستہ معلوم نہیں ہے۔ یا آپ کا خیال یہ ہے کہ اس قافلہ کے لوگ جب ایک دفعہ "قافلۂ پشاور" کے نام سے موسوم ہو چکے ہیں تو اب یہ پشاور کے سوا جس رُخ پر جا ہیں سفر کریں بہر حال انہیں کہنا چاہیے "قافلۂ پشاور" ہی۔

بخلاف اس کے میں قافلہ پشاور کو اس کے اصلی معنی میں لیتا ہوں اور پشاور کی قید کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قافلے کے بارے میں جتنی گفتگو ہوتی ہے، میرے اور آپ کے درمیان بات بات پر تصادم واقع ہوتا ہے۔ جب تک بات مجمل رہتی ہے ہم متفق رہتے ہیں۔ قافلہ کے منتشر مسافروں کو جمع کیا جائے، انہیں دوسرے قافلوں میں گم نہ ہونے دیا جائے، رہزنوں سے ان کی حفاظت کی جائے، ان کے لیے زادِ راہ درکار ہے، انہیں ایک میر قافلہ کی ضرورت ہے، ان کو منظم طور پر تیز رفتاری سے منزل کی طرف پیش قدمی کرنی چاہیئے، یہ سب باتیں مبہم اور مجمل الفاظ میں جب تک کہی جاتی ہیں، میں اور آپ دونوں ان سے اتفاق کرتے ہیں۔ مگر جب انہی چیزوں کے تعین کا وقت آتا ہے تو آپ کے اور میرے خیالات میں بُعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ ایک شخص آتا ہے اور اس قافلہ کے لوگوں کو جمع کر کے بمبئی کی طرف چلانا شروع کر دیتا ہے، دوسرا آتا ہے اور کلکتہ کی طرف چل پڑتا ہے، تیسرا آتا ہے اور کسی اور طرف کا رُخ کرتا ہے۔ آپ ہر میرِ قافلہ کے جھنڈے کو دیکھ کر زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہیں اور پکارتے ہیں کہ چل پڑا "پشاوری قافلہ"۔ میں اسی پر اعتراض کرتا ہوں کہ یہ جمعیت اور یہ پیش قدمی قافلہ پشاور کی جمعیت اور پیش قدمی تو نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ منتشر مسافر جمع تو ہو رہے ہیں اور صورتِ قافلیّہ بن تو رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بجا و درست، مگر محض جمع ہونے اور صورتِ قافلیّہ بن جانے کا نام تو قافلہ پشاور بننا نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ دیکھو کتنی اچھی، تیز رفتار، شاندار گاڑی ہے جس پر یہ قافلہ جا رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ کی بیان کردہ صفات سے انکار نہیں، مگر یہ گاڑی جا کدھر رہی ہے؟ اگر اس کا رُخ پشاور کی طرف نہیں ہے تو قافلہ پشاور کے لیے موزوں نہیں۔ اس صورت میں اس کی تیز رفتاری اور زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ یہ روز بروز قافلہ کو اس کی منزلِ مقصود سے دُور تر لے جاتی رہے گی۔ آپ کہتے ہیں کہ صاحب، قافلہ بننے اور گاڑی چلنے تو دو، پھر پشاور کی سڑک بھی لے ہی لیں گے۔ میں عرض کرتا ہوں جب تک عزم پشاور ملتوی ہے اور دوسرے راستوں پر آپ گامزن ہیں، اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

وقت تک کے لیے نام تبدیل فرما لیجیے۔ مجھے آپ کی گاڑی چلنے پر اعتراض نہیں بلکہ اس پر ہے کہ آپ چلیں تو بمبئی یا مدراس یا کلکتہ کی طرف اور نام آپ کا قافلۂ پشاور ہی رہے۔ آپ کہتے ہیں کہ حضرت پشاور کی سڑک تو بڑی دشوار گزار ہے، اس وقت اُدھر جانا تو محال ہے؛ لہٰذا سر دست تو قافلۂ پشاور کو دوسرے آسان راستوں ہی پر چلنے دو۔ میں گذارش کرتا ہوں کہ میں نے آپ کو دشوار گزار راستے کی طرف گھسیٹنے پر اصرار کب کیا تھا؟ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ قافلۂ پشاور کا پشاور کے سوا دوسری سمت میں چلنا اور پھر قافلۂ پشاور ہی رہنا متناقض بات ہے۔ آپ اس تناقض کو دُور فرما دیں۔

اِس تمام بحث میں بنائے نزاع صرف یہ ہے کہ آپ مُقیَّد کو مُطلق بناتے ہیں اور اس کے تمام متعلقات کو قید سے آزاد کیے دیتے ہیں۔ اور میں مُقیَّد کو مُقیَّد ہی سمجھ کر بات کرتا ہوں۔ اگر آپ اپنے ذہن کو صاف کرلیں اور یہ بات سمجھ لیں کہ مطلق قافلہ، اور قافلۂ پشاور میں کیا فرق ہے تو کوئی اُلجھن پیش نہیں آسکتی۔ لیکن آپ سیدھی سمجھ کی بات اختیار کرنے کے بجائے گفتگو کا رُخ کچھ دوسری ہی باتوں کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ تم قافلہ کے اجتماع اور اس کی تنظیم اور اس کی پیش قدمی کے مخالف ہو۔ حالانکہ نفسِ اجتماع و تنظیم اور پیش قدمی سے کس کافر نے انکار کیا تھا؟ کبھی آپ سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ قافلۂ پشاور نہیں تو اسے اور کس نام سے یاد کیا جاتے؟ حالانکہ اس کا نام تجویز کرنے کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میری بات تو صاف ہے۔ اگر یہ پشاور کی سڑک پر ہے تو قافلۂ پشاور ہے۔ اور اگر اس پر نہیں ہے تو اپنے لیے جو نام چاہے تجویز کرلے، بہر حال اس پر قافلۂ پشاور کا نام راست نہیں آتا۔ آپ چاہیں تو اس امر پر بحث کرلیجیے کہ جس سڑک پر یہ جارہا ہے، وہ پشاور کی سڑک ہے یا نہیں۔ مگر یہ اصول آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ جو اس سڑک پر نہ ہو وہ قافلۂ پشاور نہیں ہے۔

پھر آپ ہمدردی کا سوال چھیڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمدردی اور بے دردی کا یہاں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو واقعہ اور حقیقت کا سوال ہے۔ مدراس یا کلکتہ کی طرف جانے والوں کو آخر میں عازمِ پشاور کس طرح کہوں؟ جانتے بُوجھتے ایک خلافِ واقعہ

بات باور کرنا آخر ہمدردی کی کون سی قسم ہے ؟ میرے نزدیک تو ہمدردی کی صورت یہی ہے کہ صاف صاف لوگوں کو بتا دیا جائے کہ یہ پشاور کی سڑک ہے اور یہ دوسری سڑکیں فلاں فلاں سمت کو جاتی ہیں ۔ جو لوگ فی الواقع پشاور جانا چاہتے ہیں مگر راستہ سے ناواقف ہونے کے باعث دوسرے راستوں پر بھٹک رہے ہیں یا بھٹکائے جا رہے ہیں وہ صحیح راستہ معلوم کر لیں گے ۔ اور جو حقیقت میں جانا ہی دوسری طرف چاہتے ہیں میں نہ تو ان کا راستہ روکنا چاہتا ہوں ، نہ ان سے مجھے کوئی دشمنی ہے کہ انسانیت کے خلاف ان کے ساتھ کوئی بے دردی کردں ۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ جدھر جانا چاہتے ہیں سمجھ بوجھ کر پورے شعور کے ساتھ جائیں ، اور جب جائیں تو غلط نام کے ساتھ سفر نہ کریں ۔

مسلمانوں کے معاملہ میں جو اُلجھن پیش آ رہی ہے اس کی نوعیت بعینہٖ وہی ہے جو اُوپر کی مثال میں بیان کی گئی ہے ۔ مسلمان کا لفظ اسلام سے ماخوذ ہے اور اسلام ایک طریقِ فکر ، ایک مقصدِ زندگی ، ایک سیرت و کردار اور ایک طرزِ عمل کا نام ہے ۔ اس لحاظ سے مسلمان کے معنی محض آدمی کے نہیں ہیں بلکہ اُس آدمی کے ہیں جو زندگی کے تمام معاملات میں وہ خاص طریقِ فکر ، وہ خاص مقصدِ حیات ، وہ خاص اخلاق و اطوار اور وہ خاص طرزِ عمل رکھتا ہو جس کا نام اسلام ہے ۔ لفظ "مسلمان" کے اِن تقیّدات کو اگر صاف صاف سمجھ لیا جائے تو مسلمانوں کی فلاح و بہبود ، اُن کا مفاد ، اُن کی تنظیم ، اُن کی قیادت و امارت ، غرض اُن سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کا مفہوم متعیّن ہو جائے گا ۔ لیکن اگر اِن تقیّدات سے قطع نظر کر کے "مسلمان" کے لفظ کو مطلقاً ایک گروہِ اشخاص کے معنی میں لے لیا جائے تو پھر ہر شخص کو آزادی ہو گی کہ جس چیز کو چاہے مسلمانوں کا مفاد کہہ دے ، جس چیز کو چاہے اُن کی فلاح و بہبود قرار دے لے ، جس نوع کی تنظیم کو چاہے اُن کی تنظیم سمجھ لے ، اور جو شخص بھی انسانی گلّے کو ہانکنے کی قابلیت رکھنے والا دکھائی دے اُسے مسلمانوں کا قائدِ ملّت اور امیرِ مطاع ماننے پر آمادہ ہو جائے ۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بدقسمتی سے یہاں کچھ ایسی ہی صورتِ حال درپیش ہے۔ "اسلام" کی قید سے قطع نظر کرکے فی الواقع "مسلمانوں" کو محض ایک گروہِ اشخاص سمجھ لیا گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عجیب عجیب چیزوں پر مسلمانوں کے مفاد، اُن کی فلاح و بہبود، اُن کی تنظیم و جمعیت، اُن کی قیادت و امارت وغیرہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہنے والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا مفاد اِس میں ہے کہ یہ بینک اور انشورنس اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں سے استفادہ کریں۔ حالانکہ مسلمان کا لفظ اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اس کی رُو سے مسلمان مامور ہیں اِس پر کہ اُس پورے نظامِ مالیات کو توڑ ڈالیں جو اِس وقت دنیا میں قائم ہے اور اپنے اصول پر ایک نیا نظام بنائیں پھر یہ اُلجھے ہوئے دماغ کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ مسلمان کی حیثیت سے جس نظام کے ساتھ آپ کی اصولی عداوت ہے اسی میں آپ اپنا مفاد سمجھیں اور پھر اس کا نام "مسلمانوں کا مفاد" رکھیں؟ اسی طرح سرکاری ملازمتوں اور شریعت ساز مجالس کی نشستوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو "مسلمانوں کے مفاد" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مسلمان کے لفظ کو اگر اسلام کی قید سے مقیّد کرکے لیا جائے تو یہ سب چیزیں مسلمان کے مفاد کی ضد ہیں۔ مسلمان کے مفاد کی حیثیت سے تو آپ کا کام اُس نظامِ حکمرانی کو بدل ڈالنا ہے جسے چلانے کو آپ اپنا مفاد کہہ رہے ہیں۔ اِسی طرح وہ نظامِ تعلیم جو انگریزوں نے یہاں قائم کیا ہے اُس کے تحت اپنی نسلوں کا ذہن تیار کرنا آپ کے نزدیک مسلمان کی فلاح و بہبود اور ترقی کا ذریعہ ہے، اور اُس نظام کے تحت آپ خود اپنے خرچ سے درس گاہیں بنا کر ان کے نام اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ پورا نظامِ تعلیم انسانیت کی تشکیل ایسے نقشے پر کرتا ہے جو اسلامی نقشے کے عین برعکس ہے۔

ایسا ہی غلط تصوّر آپ کے ذہن میں مسلمانوں کی جمعیت، مسلمانوں کی تنظیم اور مسلمانوں کی قیادت کا بھی ہے۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ اسلام کس تحریک کا نام ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اس کے اصول کیا ہیں، اور وہ کیا طرزِ عمل چاہتا ہے، تو آپ

بڑی آسانی کے ساتھ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُن سیاسی جمعیتوں اور تنظیموں اور اُن قائدوں اور امیروں کی صحیح حیثیت کیا ہے جو اسلام کے نام سے اِس وقت کام کر رہے ہیں۔ اسلام کی رُو سے مسلمانوں کی جمعیت صرف وہ ہو سکتی ہے جو غیر الٰہی حکومت کو مٹا کر الٰہی حکومت قائم کرنے اور قانونِ خداوندی کو حکمران کرنے کے لیے جدّوجہد کرتی ہے۔ جو جماعت ایسا نہیں کرتی بلکہ غیر الٰہی نظام کے اندر "مسلمان" نامی ایک قوم کے دُنیوی مفاد کے لیے جدّوجہد کرتی ہے وہ نہ تو اسلامی جماعت ہے، اور نہ اسے مسلمانوں کی جماعت ہی کہنا درست ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی تنظیم صرف وہی ہو سکتی ہے جو خالص اسلامی اصولِ اجتماع پر قائم ہو اور جس کا مقصد اسلامی ہو۔ ورنہ جو تنظیم فاشستی اصولوں پر کی جائے اور جس کا مقصد محض اپنی قوم کا غلبہ و تملّک ہو اُسے محض اِس بنا پر مسلمانوں کی تنظیم نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مردم شماری کے مسلمانوں کو منظم کرتی ہے اور ان کے "استخلاف فی الارض" کے لیے کوشاں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مسلمانوں کے رہنما بھی صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو سب سے پہلے اِسلامی تحریک کے مقصد، اصول اور طریق کار کو جانتے ہوں اور اہلِ تقویٰ و دیانت ہوں۔ باقی رہے وہ لوگ جو سرے سے اسلام کا علم ہی نہ رکھتے ہوں، یا ناقص علم کی بنا پر اسلام اور جاہلیت کو خلط ملط کرتے ہوں اور پھر تقوٰے و دیانت کی کم سے کم ضروری شرائط سے بھی عاری ہوں، تو ایسے لوگوں کو محض اس لیے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرز تنظیم کے استادِ فن ہیں، اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوتے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔

یہ باتیں جب مسلمانوں سے صاف صاف کہی جاتی ہیں تو وہ اس پر چیں بجبیں ہوتے ہیں اور شکایات کے طومار باندھ دیتے ہیں۔ مگر فی الحقیقت اس معاملہ میں جذبات کی برانگیختگی کا کوئی موقع نہیں ہے۔ لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ اسلام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے لیے اسلام کے اصول پر کام کرنا چاہتے ہیں یا اپنے لیے اپنے اصول پر۔ اگر پہلی بات ہے تو انہیں سیدھی طرح ہر اُس چیز کو ترک کرنا چاہیئے جو غیر اسلامی ہے۔ اور اگر دوسری بات ہے تو جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں شوق سے کریں، ہم اُن کا راستہ روکنے نہیں آتے، ہمارا مطالبہ ان سے صرف یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے نام کو غلط طریقے پر استعمال کرنا چھوڑ دیں۔

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۳۹ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

راہ رو پشت بمنزل

دنیا میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی کام کرتے ہیں۔ ایک وہ جو حالات کو، جیسے کہ وہ فی الواقع ہیں، جوں کا توں قبول کر لیتے ہیں، اور اُن کے مطابق کام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اُنہیں کیا ہونا چاہیئے، اور اِس نقطۂ نگاہ سے وہ حاضر الوقت نظام پر تنقید کرتے ہیں۔ پہلا گروہ حال کی گاڑی کو چلاتا ہے، اور دوسرا مستقبل کی اصلاح و ترقی کے لیے راستہ صاف کرتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں تعاون ضروری ہے، مگر ان کے تعاون کی فطری صورت یہی ہے کہ ان میں تصادم ہو۔

"کیا ہے" پر نظر رکھنے والے ہمیشہ حال پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے۔ اس میں کسی تنقید کی گنجائش نہیں۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو یہ وقت تنقید کا نہیں ہے، کیونکہ اِس وقت تنقید کی جائے گی تو یہ یہ خرابیاں پیدا ہوں گی، اور فلاں فلاں مصلحتوں کو ٹھیس لگے گی۔ یہ سب باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ اُن کی نگاہ وقتی مصالح اور فوری فوائد میں اُلجھی رہتی ہے۔ عاجلہ کی محبت انہیں اتنی فرصت ہی نہیں دیتی کہ آجلہ کی فکر کریں۔ اُن کے نقطۂ نظر کو دیکھا جائے تو کوئی وقت بھی تنقید کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس وقت جو کچھ بھی ہو رہا ہوگا خوب ہی ہو رہا ہوگا، ہر وقت کچھ نہ کچھ وقتی مصلحتیں ٹھیس کھانے کے لیے موجود ہوں گی۔ ہر وقت اُن مصلحتوں کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ یہی کہیں گے کہ ابھی تنقید کا وقت نہیں ہے، اور سچ یہ ہے کہ وہ خود کبھی نہ بتا سکیں گے کہ کون سا وقت تنقید کے لیے موزوں ہے۔

لیکن جن کی نظر "کیا ہونا چاہیئے" پر ہوتی ہے وہ چونکہ حالات کو ایک دوسری نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے وہ اُسی وقت کو تنقید کے لیے موزوں سمجھتے ہیں جو "اہلِ حال" کے نزدیک سخت غیر موزوں ہوتا ہے۔ اُنہیں اپنا کام پرستارانِ عاجلہ کی چیخوں اور فریادوں، بلکہ گالیوں کے درمیان کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اصلاح و ترقی ناممکن ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ "جو کچھ ہو رہا ہے خوب ہو رہا ہے" کی ذہنیت عام لوگوں پر مستولی ہو جانے کے بعد کسی اصلاح کی ضرورت محسوس نہیں ہو سکتی۔ خامیوں کا احساس یا تو پیدا ہی نہ ہوگا کہ انہیں دُور کرنے کی طرف توجہ ہو، یا اگر تھوڑا سا احساس اُبھرا بھی تو حال کے شیدائی اُسے دبانے کے لیے بیسیوں قسم کی تاویلیں کریں گے، تاکہ اُن خامیوں کو ناگزیر ثابت کریں اور بس چلے تو خوبیوں میں تبدیل کر دکھائیں۔

"کیا ہونا چاہیئے" کے نقطۂ نظر سے جو تنقید کی جاتی ہے اس کا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوتا کہ حال میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ یکلخت بند ہو جائے، اور اُس وقت تک جمود و تعطّل کی حالت طاری رہے جب تک کہ وہ مثالی (Ideal) حالت رونما نہ ہو جائے جسے مقصود قرار دے کر ناقد تنقید کرتا ہے۔ ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فطری طور پر تنقید کا اثر ہمیشہ بتدریج ہوا کرتا ہے۔ اوّل اوّل تو اُسے سخت تلخی اور ناگواری کے ساتھ دیکھا جاتا ہے، کیونکہ عام طبیعتیں نقد سے مانوس اور نسیہ سے نفور ہوتی ہیں۔ پھر ایک دورِ شبہات کا گزرتا ہے جس میں صداقت اور نیک نیتی کے سوا ہر ممکن چیز ناقد کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کے بعد اگر فی الواقع تنقید میں کوئی جان ہوتی ہے اور درحقیقت حاضر الوقت نظام میں وہ خامیاں پائی جاتی ہیں جن کی نشان دہی تنقید میں کی گئی ہے، اور سننے والوں کا ضمیر بھی راست بازی کے ساتھ اُسی معیار کو حق تسلیم کرتا ہے جسے مدِّ نظر رکھ کر ناقد نے تنقید کی ہے، تب کہیں آہستہ آہستہ لوگ اصلاح کی ضرورت محسوس کرنی شروع کرتے ہیں، اور جوں جوں اصلاح کے حق میں رائے عام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تیار ہوتی جاتی ہے، وقت کی قیادت پر دباؤ بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ یا تو پچھلے قائدوں کو اپنی پالیسی بدلنی پڑتی ہے، یا پھر تغیر پذیر حالات کے اقتضاء سے ایک نئی قیادت (Leadership) خود بخود نشوونما پاکر سامنے آجاتی ہے۔ اس عمل کے دوران میں کبھی تاریخ کی رفتار میں خلا یا شگاف پیدا نہیں ہوتا کہ تعطل کی وہ حالت پیش آئے جس کی بھیانک تصویر کھینچ کھینچ کر "اہلِ حال" حضرات اصلاح و ترقی کی ہر کوشش کو سعیِ ناکام ثابت کیا کرتے ہیں۔

کسی حالت کو مثال یا آئیڈیل قرار دے کر اس کے لحاظ سے حال پر تنقید کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم موجودہ حالت سے دفعتہً چھلانگ لگا کر اُس مثالی حالت میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی ظاہر ہے کہ ایسے اچانک تغیر کا تصور بھی نہیں کرسکتا، کیونکہ تغیر بہرحال تدریجاً ہی ہوگا۔ مگر کسی صاحبِ عقل آدمی سے شاید یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ جس حالت کو مثالی حالت قرار دیتا ہو اس کے بالکل برعکس حالت کی طرف جانے پر کسی درجہ میں بھی راضی ہو جائے۔ وہ اگر ذوی العقول میں سے ہے تو اس میں کم از کم اس بات کی طلب بلکہ تڑپ ہونی چاہیے کہ حالات کی رفتار اُسی منزل کی سمت میں ہو جسے وہ مقصود قرار دے رہا ہے، خواہ وہ ابتداءً چند قدم ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے خلافتِ راشدہ کے طرز کی قیادت، سیاست اور زندگی مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب جو مسلمانوں کا لیڈر ہو، وہ فاروقِ اعظمؓ سے کم نہ ہو اور اس کے ساتھی سب کے سب علی مرتضیٰؓ اور ابو عبیدہؓ بن الجراح اور عبدالرحمانؓ ابن عوف کے مثیل ہوں۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ ہونا چاہیے کہ میری آخری منزلِ مقصود تو ہو وہ مقام جس پر صحابہ کرام تھے اور اس منزل کی طرف جانے کے لیے میرے رہبر و رہنما ہوں وہ لوگ جو نہ اس راہ سے واقف ہیں، نہ اس کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، بلکہ اس کے عین مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔

فرض کیجیے کہ میں سطحِ زمین سے دس ہزار فیٹ کی بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو بہرحال میں وہی ذریعہ تلاش کروں گا جو مجھے اوپر کی طرف لے جاسکتا ہو، خواہ ابتداءً وہ مجھے دس فیٹ سے زیادہ نہ اٹھائے۔ ایسا ذریعہ مجھے نہ ملے گا تو میں سطحِ زمین ہی پر قیام کرنا پسند

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کروں گا ـــــــــ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ میں اوپر جانے کے ارادہ سے ایک برقی جھولے میں بیٹھ کر کسی کوئلے کی کان میں اترنا شروع کر دیتا ہوں اور اِس راستے سے اُس بلندی پر جانا چاہتا ہوں تو کیا آپ کو میرے فاترالعقل ہونے میں ذرا سا شبہ بھی ہوگا؟ بالکل اسی طرح آپ کو میرے فتورِ عقل میں اس وقت بھی شبہ نہ ہونا چاہیے جب آپ دیکھیں کہ میں اسلامی تہذیب کو زندہ کرنے اور فاروقی حکومت کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے اُن لوگوں کے پیچھے چلا جارہا ہوں جن کی عملی زندگی میں، اور جن کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی، جن کا حال یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے نہ وہ اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کرتے ہیں[1]، جن کو نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے، اسی کی طرف وہ رجوع کرتے ہیں، اور اس کے بعد اگر کوئی چیز اُن کی نگاہ میں قابلِ لحاظ ہوتی ہے تو محض وقتی سیاست کی مصلحتیں جنہیں وہ خالص مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

منزلِ مقصود وہ اور راستہ یہ! کون عقلمند یہ مان لے گا کہ اُس چیز کو مقصود قرار دینے والا انسان اِس راستہ پر قدم رکھنے کا خیال بھی کر سکتا ہے؟

پشت بمنزل چلنے والا تو خیر نادان بن کر چھوٹ سکتا ہے، مگر اُس شخص کا معاملہ بڑا ہی عجیب ہے جو اپنے ہی آئیڈیل سے ـــــــــ جس کو وہ خود آئیڈیل کہتا

---

[1] اس عجائب کی دنیا میں جو عجیب باتیں سُننے میں آتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "ہمارے لیڈر اگرچہ قرآن سے ناواقف ہیں مگر پھر بھی جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ عین قرآن کے مطابق ہے۔" دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت ایک فضول چیز ہے، علم قرآن کے بغیر بھی انسان اس صراطِ مستقیم پر چل سکتا ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ حمیّتِ جاہلیہ کی اس سے بدتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ (تدبیم)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو ـــــــ گھبراتے، اُس کا نام سُن کر چیں بر جبیں ہو جاتے، اُس کو پامال ہوتے دیکھ کر آفرین و مرحبا کے نعرے بلند کرے، اس کی حمایت کرنے والے کا منہ نوچنے کے لیے دوڑے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا جائے کہ آئیڈیل تو میرا وہی ہے۔ یہ آئیڈیل کی ایک بالکل ہی نرالی قسم دریافت ہوئی ہے جس سے ہم اب تک آشنا نہ تھے۔ ہمیں تو یہی معلوم تھا کہ آئیڈیل انسان کی محبوب ترین چیز ہوتی ہے۔ اس کا نام سُن کر دلوں میں حرارت پیدا ہونے لگتی ہے۔ اگر آدمی اس تک پہنچنے سے عاجز ہوتا ہے تو رنجیدہ اور غمگین ہوتا ہے۔ اگر کسی مجبوری سے اس کے خلاف چلتا ہے تو شرمندہ ہوتا ہے۔ اور اگر کہیں اس غلط روی پر اُسے ٹوک دیا جاتا ہے تو اس کی نگاہ شرم کے مارے اُٹھ نہیں سکتی۔ مگر اب ہمارا تعارف اِس نئی قسم کے آئیڈیل سے ہوا ہے، جو ہے تو آئیڈیل ہی، لیکن اس کا نام لیجیے تو چہرے بگڑنے لگتے ہیں، اس کی طرف چلنے کے لیے کہیے تو شدتِ غضب سے تیوریاں چڑھ جاتی ہیں، اُس کے خلاف چلنے پر ٹوکیے تو شرمندگی کے بجائے کمال دیدہ دلیری و جسارت کے ساتھ تاویلیں کی جاتی ہیں، اس کی حمایت کرنے والے سے بڑھ کر نگاہ میں مبغوض کوئی نہیں ہوتا، اور اسے پامال کرنے والوں سے بڑھ کر محبوب کوئی نہیں ہوتا۔ ـــــــ کیسا عجیب ہے یہ آئیڈیل اور کتنے عجیب ہیں اس کے پرستار!

طُرفہ تماشا یہ ہے کہ کانگریس اور اس کے نیشنلزم کی مخالفت میں تو اسلام اور اسلامی تہذیب کا نام لیا جاتا ہے، اور انہی نعروں کو نعرۂ جنگ بنا کر مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت دی جاتی ہے۔ مگر جہاں یہ اسلام اور اس کی تہذیب کا تحفظ کرنے والے جمع ہوتے ہیں وہاں اسی اسلام کے قوانین خلاعیہ توڑے جاتے ہیں، اُسی تہذیب کو ذبح کیا جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی ساری جنگ صرف اس لیے ہے کہ دوسروں کے ہاتھوں اِس تہذیب کا جھٹکا نہ ہونے پائے بلکہ یہ خود اپنے ہاتھوں سے اس کو حلال کریں۔

وہاں "مسلمان" عورت اُسی تبرّجِ جاہلیت کے ساتھ شمعِ انجمن بنی نظر آتی ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس طرح کوئی شریمتی جی یا کوئی میم صاحبہ ہوسکتی ہیں۔ وہاں عین نماز کے وقت جلسے ہوتے رہتے ہیں اور اگر بادلِ نخواستہ ملتوی کیے بھی جاتے ہیں تو پیشواؤں سے لے کر پیروؤں تک شاذ و نادر ہی کوئی نماز کے لیے اُٹھتا ہے۔ وہاں لباسوں میں نشست و برخاست میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں اسلامی تہذیب کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آتا اور ایک معمولی مسلمان اِن حامیانِ اسلام اور محافظینِ تہذیبِ اسلامی کی صحبت میں پہنچ کر اپنے آپ کو اتنا ہی اجنبی محسوس کرتا ہے جتنا ہندوؤں اور پارسیوں کی کسی محفل میں کرسکتا ہے۔ وہاں کے مباحث آپ گھنٹوں سُنتے رہیں مگر بھُولے سے بھی کہیں قرآن و حدیث کا ذکر نہیں آئے گا، کسی مسئلے کا حل دریافت کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع نہ کیا جائے گا، بلکہ قرآن و سُنّت کا نقطۂ نظر صریح طور پر اُن کے سامنے رکھ دیا جائے تب بھی بلاتکلف اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا۔ ان کی کمیٹیوں اور اُن کے جلسوں میں آپ مسلمان کا ذکر کبھی اس حیثیت سے نہ سُنیں گے کہ اس کا کوئی جماعتی نصب العین بھی ہے، وہ دنیا میں کوئی اخلاقی منصب بھی رکھتا ہے، اور کوئی الٰہی مشن بھی اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اِن باتوں کے بجائے وہاں ساری گفتگو صرف اس حیثیت سے ہوگی کہ مسلمان کے نام سے جو ایک مجموعۂ افراد پایا جاتا ہے اس کو دنیوی نقصانات سے کس طرح بچایا جائے اور دنیوی فوائد سے کس طرح متمتع کیا جائے۔ پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں ان کا حال کیا ہے؟ ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمتِ قبلہ کدھر ہے، اور اسبابِ عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہوسکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شاید کوئی صاحب دو فیصدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے، اِلّا ماشاء اللہ۔

کیا وہ کلچر جسے کانگریس اور اس کی تحریکِ وطنیت سے بچانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے یہی ہے؟ اور یہی اس کے تحفظ اور احیاء کے ڈھنگ ہیں؟ اور اِنہی طریقوں سے،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایسے ہی رہنماؤں کی قیادت میں اُس حکومتِ الٰہیہ تک پہنچ جائے گا جسے منتہائے نظر اور نصب العین قرار دیا جاتا ہے؟ ——— یہ سوال اِتنا خطرناک ہے کہ اسے زبان پر لانا اپنی شامت کو خود دعوت دینا ہے۔ آپ کی زبان سے اسلام اور اس کی تہذیب کا ذکر سنتے ہی ہر طرف سے شور برپا ہوگا کہ یہ کیا صدائے بے ہنگام بلند کرنی شروع کر دی؟ آخر اس ذکر کا یہ کون سا موقع تھا؟ دیکھتے نہیں کہ ابھی ہم تہذیب کی حفاظت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ بھلا جمع ہونے کے دوران میں بھی کہیں اُس کا تحفظ کیا جاتا ہوگا؟

یہی دورنگی اور گندم نمائی و جَو فروشی ہے جسے دیکھ کر غیروں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ اصل سوال محض معاشی و سیاسی ہے اور تہذیب و مذہب کو محض عام مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے بہانہ بنا لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِن حرکات کو دیکھ کر کون سمجھے گا کہ اپنے دین اور کلچر کی حمیت میں واقعی آپ مخلص ہیں؟ زبان سے کہیے کہ دل میں درد ہے، مگر ہاتھ سے بار بار پیٹ ہی کو بھینچے جائیے تو دیکھنے والا یہی خیال کرے گا کہ درد آپ کے پیٹ میں ہے نہ کہ دل میں۔ ایسی ہی باتوں سے ایک قوم کی ہوا اکھڑتی ہے اور دوسری قوموں کے دل سے اس کا رُعب اُٹھ جاتا ہے۔

تفرقہ و انتشار اور بے نظمی کے تلخ نتائج دیکھ کر مسلمانوں میں اجتماع و تنظیم اور مرکزیت کی ضرورت کا احساس تو پیدا ہوا، مگر افسوس کہ عقل و خرد کی کمی نے اس مفید احساس کو بھی غلط راستہ پر لگا دیا۔ عام طور پر لوگ اب اِس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ اجتماع اور تنظیم اور مرکزیت بجائے خود رحمت ہیں، لہٰذا جو مرکز سامنے آئے اس کے گرد جمع ہو جاؤ اور سب مِل کر چلو، انشاء اللہ کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گے۔ گویا جس طرح کبھی یہ خبط پیدا ہوا تھا کہ "آرٹ محض آرٹ کی خاطر" اور "ادب محض ادب کے لیے" اُسی طرح اب یہ ایک نیا خبط پیدا ہو رہا ہے کہ "اجتماع بس اجتماع کی خاطر" اور "تنظیم محض بغرضِ تنظیم" اور "مرکزیت صرف مرکزیت کے لیے"۔ حالانکہ ان چیزوں کے مفید ہونے کا تمام تر انحصار اجتماع کی روح اور تنظیم کے اصولوں اور مرکز کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نوعیت پر ہے۔ کسی غلط مرکز کے گرد بے مقصد جمع ہو جانا، یا غلط مقصد کے لیے جمع ہونا بجائے مفید ہونے کے اُلٹا مضر ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ آخر ان کا مطمحِ نظر کیا ہے اور وہ کس غرض کے لیے اجتماع اور تنظیم چاہتے ہیں۔

اگر آپ اصلی معنوں میں ایک ایسی مسلم جماعت کی تنظیم چاہتے ہیں جو اسلام اور اس کی تہذیب کا تحفظ کر سکتی ہو اور بالآخر اسلامی حکومت کی منزل تک پہنچ سکتی ہو، تو آپ کو جان لینا چاہیئے کہ جو صورتِ تنظیم اس وقت بن رہی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس تنظیم میں جو لوگ سب سے آگے کی صف میں نظر آتے ہیں اسلامی جماعت میں ان کا صحیح مقام سب سے پیچھے کی صف ہے، بلکہ بعض تو وہاں بھی بہ رعایت ہی جگہ پا سکتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو پیشوا بنانا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ریل کے سب سے پچھلے ڈبہ کو انجن کی جگہ لگا دینا۔ جس چڑھائی پر آپ جانا چاہتے ہیں، یہ نام نہاد انجن آپ کی گاڑی کو اس کی طرف ایک انچ بھی لے کر نہیں جا سکتا، البتہ گاڑی اپنے وزن سے آپ نشیب کی طرف لڑھکے گی اور آپ لوگ کچھ مدت تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے کہ ماشاء اللہ ہمارا "انجن" اسے خوب اُڑاتے لیے جا رہا ہے۔ اس حقیقت کو جتنے جلدی سمجھ لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے، کیونکہ ہر لمحہ جو گزر رہا ہے وہ آپ کو اوپر کے بجائے نیچے کی طرف لے جا رہا ہے۔ جو لوگ آپ کی تہذیب کو جانتے ہی نہیں وہ اس کا تحفظ کیا کریں گے؟ جو اس سے علانیہ برسرِ بغاوت ہیں کس طرح امید کی جا سکتی ہے کہ ان کے ہاتھوں سے اس کا احیاء اور ارتقاء ہو سکے گا؟ وہ اپنی زبان سے کلچر کلچر ضرور پکارتے ہیں، لیکن اگر حقیقت میں کلچر کا درد ان کے دل میں اُٹھا ہوتا تو یقیناً ان کی زندگیاں بدل گئی ہوتیں، ان کی ذہنیتیں بدل گئی ہوتیں، اور ان کا طرزِ فکر بدل گیا ہوتا۔ یہ علامت اُن کی زندگیوں میں ناپید ہے، اور یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس گروہ میں حقیقی اسلامی جذبہ ہرگز مشتعل نہیں ہوا ہے۔

اور اگر اسلامی نصب العین آپ کے سامنے نہیں ہے بلکہ محض سادہ معنی میں ایک

قوم کی حیثیت سے آپ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں، اور اپنے اندر نیشنلزم کی روح پیدا کرکے دوسری قوموں کے ساتھ کامیاب مسابقت کرنا آپ کا آخری مطمح نظر ہے تو بلاشبہ آپ کو اپنے پیشواؤں میں اسلام کا رنگ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور مجھے آپ سے کسی بحث کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ کا راستہ جدا ہے اور میرا راستہ جدا۔ البتہ وہی بات پھر کہوں گا جو اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی اس قوم پرستانہ تحریک کے لیے آپ کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اسلام ہر قسم کی قوم پرستی کا دشمن ہے خواہ وہ ہندوستانی قوم پرستی ہو یا نام نہاد "مسلم قوم پرستی"۔

بعض حضرات اس قسم کے غیر اسلامی اجتماع اور مرکزیت کے حق میں قرآن و حدیث سے اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ "جماعت" ہے جس کے التزام کا حکم دیا گیا ہے اور جس سے الگ ہونے یا الگ رہنے پر جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ اسے ناواقفیت کا کرشمہ سمجھا جائے یا خدا اور رسول کے مقابلہ میں جسارت۔ قرآن تو اس مسجد تک میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں دیتا جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہو۔ اور یہاں تقویٰ کا نام لینے والے خبطی سمجھے جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ "اللہ کی رسی" کو مضبوط تھامو۔ اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ بس لوگوں کا متفق ہو کر کسی رسی کو تھام لینا ہی ذریعۂ نجات ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ اللہ کی رسی ہو یا نہ ہو۔ قرآن صاف کہتا ہے کہ :-

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ۔

(المائدہ۔ آیت ۵۵)

"مسلمانو، تمہارے حقیقی دوست اور ساتھی صرف اللہ اور رسول اللہ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور خدا کے آگے جھکنے والے ہیں۔"

بلکہ یہاں تک کہتا ہے کہ :-

فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فِي الدِّيْنِ ۔ (التوبہ۔ آیت ۱۱)

"پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔"

مگر یہاں نماز اور زکوٰۃ کی شرط کو محض بے معنی سمجھا جاتا ہے۔ برادری اور ولایت تو درکنار، امامت اور سرداری تک کے لیے یہ چیزیں شرط نہیں ہیں۔ بلکہ خدا کی مقرر کی ہوئی اِن شرطوں کا نام لیجیے تو تیوریوں میں بل پڑ جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احادیث میں التزام جماعت اور اطاعتِ امام کے متعلق جو احکام ہیں، اور مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ[1] اور اسی قسم کی جو وعیدیں جماعت اور امام سے الگ ہونے والوں کو سنائی گئی ہیں، انہیں کوئی واسطہ اُن جماعتوں اور اماموں سے نہیں ہے جو محض قوم پرستی کے اصولوں پر دُنیوی اغراض کے لیے بنی ہوں۔ وہاں تو التزام جماعت سے مراد دراصل اُس جماعت کا التزام ہے جو دُنیوی اغراض سے پاک ہو کر خالصۃً لوجہ اللہ اسلام کے مشن کی خدمت کے لیے بنی ہو۔ ایسی جماعت سے الگ ہونے کا نتیجہ یقیناً نارِ جہنّم ہے اور ہونا چاہیے۔ مگر اِن ہدایات کو دُنیوی جتھہ بندی اور سیاسی پارٹیوں کی وفاداری کے لیے دلیل بنانا خدا کے رسول پر بہتان گھڑنا ہے۔ کسی قوم کو کسی دوسری قوم کے مقابلہ میں اگر معاشی یا سیاسی اغراض کے لیے جدّوجہد کرنی ہو تو وہ عام قوانینِ طبیعی کے مطابق اپنا جتھہ بنائے اور قوت فراہم کرنے کی کوشش کرے۔ اسے خدا کو بیچ میں لانے کا کیا حق ہے؟ دو قوموں کی خالص نفسانی کشمکش میں آخر خدا کو جانبدار بننے کی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ ایک کی جتھہ بندی سے الگ ہونے والوں کو تو وہ جہنّم کی سزا دے اور دوسری کے جتھے کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ ہر اُس شخص کے سامنے جہنّم پیش کر دے جو اس سے الگ ہو یا الگ رہے؟

بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور

---

[1] جو جماعت سے الگ ہوا وہ آگ میں گیا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ دو، لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی اور جس قیادت کی متّبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مُراد دراصل اُن مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو، جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی رُوح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ضرور ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ ایسے مسلمانوں کی اکثریت کبھی باطل پر مجتمع نہیں ہو سکتی، اور اگر وہ کبھی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو بھی جاتے تو اس پر زیادہ دیر تک بھی نہیں رہ سکتی۔ اسی بنا پر حضورؐ نے سوادِ اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید فرمائی۔ مگر جو لوگ اِن ضروری صفات سے عاری ہوں اور جن میں کھرے اور کھوٹے کی بالکل ابتدائی پرکھ بھی نہ ہو اُن کے "گلّہ" کا نام ہرگز "سوادِ اعظم" نہیں ہے، نہ ان کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے "جماعت" ہے، نہ اُن کی امارت اسلامی اصطلاح کی رُو سے "امارت" ہے، نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ "مسلمان" سے دھوکا کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم خالص اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہوگی اُن کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔

(ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۴۰ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسلام کی دعوت اور مسلمان کا نصب العین

جب کسی شخص پر بار بار تشنج، ہذیان اور بحران کے دورے پڑتے ہوں اور درمیانی وقفوں میں بھی وہ ہر وقت کسی نہ کسی تکلیف سے بے تاب رہتا ہو تو اس کی حالت کو دیکھ کر عقل مند لوگ کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟ وہ اسے محض اُوپری خلل کا اثر قرار دیتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خود اس کے اپنے نظامِ جسمانی کے اندر کوئی خرابی موجود ہے؟ وہ تشنج کا علاج ہاتھ پاؤں باندھنے سے، ہذیان کا علاج منہ بند کرنے سے اور بخار کا علاج برف میں دبانے سے کرتے ہیں یا ان کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس اصلی خرابی کو سمجھیں جو کارگاہِ بدن کی ترکیب میں پیدا ہو گئی ہے، اور ساری تدبیریں اُسی کو دُور کرنے میں صرف کر دیں؟

جہاں تک انفرادی حالات کا تعلق ہے، ہر صاحبِ عقل ایسے مواقع پر دوسری صورت ہی اختیار کیا کرتا ہے۔ مگر تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جو عقل ایک فرد کو اس حالت میں دیکھ کر صحیح نتیجہ اخذ کرتی ہے وہ کہاں ماری جاتی ہے جب پوری انسانیت اُس کے سامنے اسی حال میں ہو۔ تمام عالمِ انسانی اس وقت ایک شدید بحران میں مبتلا ہے۔ اُس پر تشنج کا ایک ایسا زبردست دورہ پڑا ہے جس سے ساری زمین ہل گئی ہے[1]

---

[1] واضح رہے کہ اُس وقت جنگِ عظیم دوم پوری شدت کے ساتھ جاری تھی۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور یہ کوئی پہلا دورہ نہیں ہے۔ ایک مدت سے پیہم اُس پر ایسے ہی دورے پڑ رہے ہیں، اور دوروں کے درمیان جو وقفہ گزرتا ہے اس میں بھی کبھی وہ چین سے نہیں رہتا۔ ہر وقت کسی نہ کسی درد سے بے چین ہی رہتا ہے۔ مگر باوجودیکہ مدت ہائے دراز سے یہ صورتِ حال ساری دنیا میں مشاہدہ کی جا رہی ہے، کسی کا ذہن اِدھر نہیں جاتا کہ انسانی تمدّن و عمران کی اُساس میں ایک بنیادی خرابی موجود ہے۔ ساری دنیا کے بوجھ بجھکڑ اپنی اپنی نظریں صرف اُن خارجی علامات ہی پر جماتے ہوتے ہیں جو اندرونی خرابی کی وجہ سے سطح پر نمایاں ہوتی ہیں، اور ہر ایک کو سطح پر جو پھوڑا سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے اسی پر اُنگلی رکھ کر کہہ دیتا ہے کہ بس اِس کا آپریشن کر دو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ بس کی گانٹھ ڈکٹیٹرشپ ہے، اِس کو کاٹ دو۔ کوئی کہتا ہے کہ ساری خرابی امپیریلزم کی وجہ سے ہے، اِسے مٹا دو۔ کوئی کہتا ہے کہ سرمایہ داری نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے، اِس کا خاتمہ کر دو۔ ان نادانوں کی عقل کہاں گم ہو گئی ہے؟ یہ شاخوں کو جڑ سمجھ رہے ہیں۔ ان کو خبر نہیں کہ جڑ کہیں اور ہے، اور وہ جب تک زمین پکڑے رہے گی، شاخیں برابر نکلتی ہی رہیں گی خواہ قیامت تک اُن کو کاٹنے میں وقت ضائع کیا جاتا رہے۔

دنیا میں جہاں جو خرابی بھی پائی جاتی ہے اُس کی جڑ صرف ایک چیز ہے، اور وہ ہے اللہ کے سوا کسی اور کی حاکمیت تسلیم کرنا۔ یہی اُمّ الخبائث ہے۔ یہی اصل بس کی گانٹھ ہے۔ اِسی سے وہ شجرِ خبیث پیدا ہوتا ہے جس کی شاخیں پھیل پھیل کر انسانوں پر مصیبتوں کے زہریلے پھل ٹپکاتی ہیں۔ یہ جڑ جب تک باقی ہے، آپ شاخوں کی جتنی چاہیں قطع و برید کر لیں، بجز اس کے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا کہ ایک طرف سے مصائب کا نزول بند ہو جائے اور دوسری طرف سے شروع ہو جائے۔

ڈکٹیٹرشپ یا مطلق العنان بادشاہی کو مٹایا جائے گا تو حاصل کیا ہو گا؟ یہی نا کہ ایک انسان یا ایک خاندان خدائی کے مقام سے ہٹ جائے گا اور اس کی جگہ پارلیمنٹ خدا بن جائے گی۔ مگر کیا فی الواقع اس طریقہ سے انسانیت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے؟ کیا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ظلم اور بغی اور فساد فی الارض سے وہ جگہ خالی ہے جہاں پارلیمنٹ کی خدائی ہے؟

امپیریلزم کا خاتمہ کیا جائے گا تو اس کا حاصل کیا ہوگا؟ بس یہی کہ ایک قوم پر سے دوسری قوم کی خدائی اُتر جائے گی۔ مگر کیا واقعی اس کے بعد زمین پر امن اور خوشحالی کا دور شروع ہو جاتا ہے؟ کیا وہاں انسان کو چین نصیب ہے جہاں قوم آپ اپنی خدا بنی ہوتی ہے؟

سرمایہ داری کا استیصال ہو جائے گا تو اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا؟ صرف یہ کہ محنت پیشہ عوام مالدار طبقوں کی خدائی سے آزاد ہو کر خود اپنے بنائے ہوئے خداؤں کے بندے بن جائیں گے۔ مگر کیا اس سے حقیقت میں آزادی، عدل، اور امن کی نعمتیں انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں؟ کیا انسان کو وہاں یہ نعمتیں حاصل ہیں جہاں مزدوروں کے اپنے بنائے ہوئے خدا حکومت کر رہے ہیں؟

اللہ کی حاکمیت سے منہ موڑنے والے زیادہ سے زیادہ بہتر نصب العین جو پیش کر سکتے ہیں وہ بیش از ایں نیست کہ دنیا میں مکمل جمہوریت قائم ہو جائے، یعنی لوگ اپنی بھلائی کے لیے آپ اپنے حاکم ہوں۔ لیکن قطع نظر اس سے کہ یہ حالت واقعی دنیا میں رونما ہو بھی سکتی ہے یا نہیں[1]، غور طلب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت اگر رونما ہو جائے تو کیا اُس فرضی جنت میں انسان خود اپنے نفس کے شیطان، یعنی اُس جاہل اور نادان "خدا" کی بندگی سے بھی آزاد ہو جائے گا جس کے پاس خدائی کرنے کے لیے علم، حکمت، عدل، راستی کچھ بھی نہیں، صرف خواہشات ہی خواہشات ہیں، اور وہ بھی اندھی جابرانہ خواہشات۔

غرض دنیا کے مختلف گوشوں میں انسانی مصائب اور پریشانیوں کے جتنے حل بھی سوچے جا رہے ہیں ان سب کا خلاصہ بس اتنا ہی ہے کہ خدائی یا حاکمیت بعض انسانوں سے

---

[1] تجربات شاہد ہیں کہ حقیقی جمہوریت آج تک دنیا میں کبھی قائم نہیں ہو سکی اور عقلی دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا ہونا عملاً محال ہے۔ (قدیم)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سلب ہوکر بعض دوسرے انسانوں کی طرف منتقل ہوجاتے۔ اور یہ مصیبت کا ازالہ نہیں ہے بلکہ صرف اُس کا اِمالہ ہے۔ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ سیلابِ بلا اب تک جس راستہ سے اُمڈ رہا ہے اُدھر سے نہ آتے بلکہ دوسرے راستہ سے آتے۔ اس کو اگر حل کہا جا سکتا ہے تو یہ ایسا ہی حل ہے جیسے دق کی بیماری کو سرطان سے تبدیل کر لیا۔ اگر مقصود محض دِق کو دُور کرنا تھا تو بے شک آپ کامیاب ہوتے، لیکن اگر اصل مقصد جان بچانا تھا تو ایک پیامِ اجل کو دوسرے پیکِ اجل سے تبدیل کرکے آپ نے کوئی بھی کامیابی حاصل نہ کی۔

خواہ ایک انسان دوسرے کا خدا بنے، یا دوسرے کی خدائی تسلیم کرے، یا آپ اپنا خدا بن جاتے، بہرحال ان تمام صورتوں میں تباہی اور خسران کا اصل سبب جوں کا توں باقی رہتا ہے۔ کیونکہ جو فی الواقع بادشاہ نہیں ہے وہ اگر بادشاہ بن بیٹھے، جو حقیقت میں بندہ اور غلام ہے وہ اگر اپنے آپ کو خواجگی و خداوندی کے مقام پر متمکن سمجھ لے، جو دراصل ذمّہ دار اور مسئول رعیت ہے وہ اگر غیر ذمّہ دار اور خود مختار حاکم بن کر کام کرنے لگے، تو اس اِدّعا کی اور ایسے اِدّعا کو تسلیم کرنے کی حقیقت ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگی۔ اصلیت جو کچھ ہے وہ تو بہرحال وہی کی وہی رہے گی۔ حقیقت میں تو جو خدا ہے وہ خدا ہی رہے گا اور جو بندہ ہے وہ بندہ ہی رہے گا۔ مگر جب بندہ اِس عظیم الشّان بنیادی غلط فہمی پر اپنی زندگی کی ساری عمارت اُٹھائے گا کہ وہ خود حاکمِ اعلیٰ ہے یا کوئی دوسرا بندہ اِس کا حاکمِ اعلیٰ ہے، اور جب وہ یہ سمجھ کر کام کرے گا کہ اس سے بالاتر کوئی حاکم نہیں ہے جس کے سامنے وہ جوابدہ ہو اور اپنے امر و نہی میں جس کی رضا لینے کا محتاج ہو، تو یقیناً اس کی زندگی کی عمارت از سرتاپا غلط ہو کر رہ جائے گی اور اس میں راستی و صحت کو تلاش کرنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

یہ بات آخر کس طرح انسان کی عقل قبول کر لیتی ہے کہ خلق کسی کی ہو اور امر کسی اور کا ہو؟ پیدا کرنے اور پالنے والا کوئی ہو اور حکم کسی اور کا چلے؟ ملک کسی کا ہو اور بادشاہت کسی اور کی ہو؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جس نے انسان کو بنایا، جس نے انسان کے لیے زمین کی قیام گاہ بنائی، جو اپنی ہوا اپنے پانی، اپنی روشنی اور حرارت، اور اپنے پیدا کیے ہوئے سامانوں سے انسان کی پرورش کر رہا ہے، جس کی قدرت انسان کا اور اُس پوری زمین کا، جس میں انسان رہتا ہے، احاطہ کیے ہوئے ہے، اور جس کے حیطۂ قدرت سے انسان کسی حال میں نکل ہی نہیں سکتا، عقل اور فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہی انسان کا اور اس زمین کا مالک ہو، وہی خدا اور رب ہو اور وہی بادشاہ اور حاکم بھی ہو۔ اُس کی بنائی ہوئی دنیا میں خود اُس کے سوا اور کس کو حکومت و فرمانروائی کا حق پہنچتا ہے؟ کس طرح ایک مملوک یہ کہنے کا حق دار ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے مملوکوں کا مالک ہے؟ صانع اور پروردگار کے سوا اپنی مصنوعات اور اپنے پروردوں کی ملکیت اور کس کے لیے جائز ہو سکتی ہے؟ کون اتنی قدرت رکھتا ہے، کس کے پاس اتنا علم ہے، کس کا یہ ظرف ہے کہ اس سلطنت میں فرمانروائی کر سکے؟ اگر انسان اس سلطنت کے اصل سلطان کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتا اور اُس کے سوا کسی دوسرے کی حاکمیت مانتا ہے، یا خود اپنی حاکمیت کا ادّعا کرتا ہے تو یہ صریح واقعہ کے خلاف ہے بنیادی طور پر غلط ہے۔ ایک عظیم الشان جھوٹ ہے۔ سب سے زیادہ سفید جھوٹ۔ ایسا جھوٹ جس کی تردید زمین و آسمان کی ہر شے ہر وقت کر رہی ہے۔ ایسے بے بنیاد دعوے اور ایسی غلط تسلیم و اطاعت سے حقیقتِ نفس الامری میں ذرہ برابر بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جو مالک ہے وہ مالک ہی رہے گا، جو بادشاہ اور حاکم ہے وہ بادشاہ اور حاکم ہی رہیگا، البتہ خود اُس انسان کی زندگی از سرتا پا غلط ہو کر رہ جائے گی جو واقعہ کے خلاف دوسرے کی حاکمیت تسلیم کرے، یا خود اپنی حاکمیت کا مدعی بن کر کام کرے گا۔ حقیقت اس کی محتاج نہیں ہے کہ تم اس کا ادراک کرو تب ہی وہ حقیقت ہو۔ نہیں! تم خود اس کے محتاج ہو کہ اس کی معرفت حاصل کر کے اپنی سعی و عمل کو اس کے مطابق بناؤ۔ اگر تم حقیقت کو محسوس نہیں کرتے اور کسی غلط چیز کو حقیقت سمجھ بیٹھے ہو تو اس میں نقصان تمہارا اپنا ہے۔ تمہاری غلط فہمی سے حقیقت میں کوئی تغیّر رونما نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے کہ جس چیز کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہو اس کو جزوی ترمیمات اور فروعی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اصلاحات سے کبھی درست نہیں کیا جا سکتا۔ ایک جوڑ کے ہٹ جانے اور اس کی جگہ دُوسرے جوڑ کے آجانے سے حقیقت میں کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ اِس قسم کی تبدیلی سے طفل تسلی تو ہو سکتی ہے مگر غیر حق پر زندگی کی عمارت قائم کرنے کا جو نقصان ایک صورت میں تھا وہی دوسری صورت میں بھی علیٰ حالہٖ باقی رہتا ہے۔

اس نقصان کو دُور کرنے اور انسانی زندگی کو حقیقی فلاح وسعادت سے ہمکنار کرنے کی کوئی صورت اِس کے سوا نہیں ہے کہ غیر اللہ کی حاکمیت سے کلیۃً انکار کیا جائے اور اُس کی حاکمیت تسلیم کی جائے جو فی الواقع مالک الملک ہے۔ ہر اُس نظامِ حکومت کو رَد کر دیا جائے جو انسانی اقتدارِ اعلیٰ کے باطل نظریہ پر قائم ہو، اور صرف اُس نظامِ حکومت کو قبول کیا جائے جس میں اقتدارِ اعلیٰ اُسی کا ہو جو فی الحقیقت مُقتدرِ اعلیٰ ہے۔ ہر اُس حکومت کے حقِ حکمرانی کو ماننے سے انکار کر دیا جائے جس میں انسان بذاتِ خود حاکم اور صاحبِ امر و نہی ہونے کا مدّعی ہو، اور صرف اُس حکومت کو جائز قرار دیا جائے جس میں انسان اصلی اور حقیقی حاکم کے ماتحت خلیفہ ہونے کی حیثیت قبول کرے۔ یہ بنیادی اصلاح جب تک نہ ہو گی، جب تک انسان کی حاکمیت، خواہ وہ کسی شکل اور کسی نوعیت کی ہو، جڑ پیڑ سے اُکھاڑ کر نہ پھینک دی جائے گی، اور جب تک انسانی حاکمیت کے غیر واقعی تصوّر کی جگہ خلافتِ الٰہی کا واقعی (Realistic) تصوّر نہ لے لے گا، اُس وقت تک انسانی تمدّن کی بگڑی ہوئی کل کبھی درست نہ ہو سکے گی، چاہے سرمایہ داری کی جگہ اشتراکیت قائم ہو جائے، یا ڈکٹیٹر شپ کی جگہ جمہوریت متمکن ہو جائے، یا امپیریلزم کی جگہ قوموں کی حکومت خود اختیاری کا قاعدہ نافذ ہو جائے۔ صرف خلافت ہی کا نظریہ انسان کو امن دے سکتا ہے، اُسی سے ظلم مٹ سکتا ہے اور عدل قائم ہو سکتا ہے، اور اسی کو اختیار کر کے انسان اپنی قوتوں کا صحیح مصرف اور اپنی سعی وجہد کا صحیح رُخ پا سکتا ہے۔ ربّ العالمین اور عالم الغیب والشہادۃ کے سوا اور کوئی انسانی تمدّن وعمران کے لیے ایسے اصول اور حدود تجویز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو بے لاگ ہوں، جن میں جانب داری، تعصب اور خود غرضی کا شائبہ تک نہ ہو، جو ٹھیک ٹھیک عدل پر قائم ہوں، جن میں تمام انسانوں کے مفاد اور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حقوق کا یکساں لحاظ کیا گیا ہو، جو گمان و قیاس پر نہیں بلکہ حقائقِ فطرت کے یقینی علم پر مبنی ہوں۔ ایسے ضابطہ کی نعمتوں سے انسان صرف اسی طرح بہرہ ور ہو سکتا ہے کہ وہ خود صاحبِ امر اور قانون ساز بننے کے زعم سے دست بردار ہو جاتے، خدا پر اور اس کے بھیجے ہوئے قانونِ زندگی پر ایمان لاتے اور آخرت کی جوابدہی کا احساس رکھتے ہوئے اُس ضابطہ کو دنیا میں قائم کرے۔

اِسلام انسانی زندگی میں یہی بنیادی اصلاح کرنے آیا ہے۔ اس کو کسی ایک قوم سے دلچسپی اور کسی دوسری قوم سے عداوت نہیں ہے کہ ایک کو چڑھانا اور دوسری کو گرانا اُس کا مقصود ہو۔ بلکہ اُسے تمام نوعِ انسانی کی فلاح و سعادت مطلوب ہے جس کے لیے وہ ایک عالمگیر کلیہ و ضابطہ پیش کرتا ہے۔ وہ ایک تنگ زاویہ سے کسی خاص ملک یا کسی خاص گروہِ انسانی کو نہیں دیکھتا بلکہ وسیع نظر سے تمام روئے زمین کو اُس کے تمام باشندوں سمیت دیکھتا ہے، اور چھوٹے چھوٹے وقتی حوادث و مسائل سے بالاتر ہو کر اُن اصولی و بنیادی مسائل کی طرف توجہ کرتا ہے جن کے حل ہو جانے سے تمام زمانوں اور تمام حالات و مقامات میں سارے فروعی و ضمنی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔ اسے ظلم کی شاخوں اور فساد کی فروعی شکلوں سے بحث نہیں ہے کہ آج ایک جگہ ایک شاخ کو کاٹنے پر زور صرف کرے اور کل دوسری جگہ کسی دوسری شاخ سے طبع آزمائی کرنے لگے، بلکہ وہ ظلم کی جڑ اور فساد کے سرچشمے پر براہِ راست حملہ کرتا ہے تاکہ اِن شاخوں کی پیدائش ہی بند ہو جائے اور جگہ جگہ آئے دن کی کاٹ چھانٹ کا جھگڑا ہی باقی نہ رہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے ضمنی مسائل جن میں آج دنیا کی مختلف قومیں اور جماعتیں الجھ رہی ہیں، مثلاً یورپ میں ہٹلر کا طغیانِ نازی، یا حبش میں اٹلی کا فساد، یا چین میں جاپان کا ظلم، یا ایشیا و افریقہ میں برطانیہ و فرانس کی قیصریت، اسلام کی نگاہ میں ان کی اور ایسے تمام مسائل کی کوئی اہمیت نہیں۔ اُس کی نگاہ میں ایک ہی سوال اہمیت رکھتا ہے۔ وہ تمام دنیا سے پوچھتا ہے:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔

(یوسف - آیت ۳۹)

"متفرق چھوٹے چھوٹے خداؤں کی بندگی اچھی ہے یا اُس ایک اللہ کی جو سب پر غلبہ و تسلط رکھتا ہے ؟"

جو لوگ پہلی صورت کے پسند کرنے والے ہیں اسلام اُن سب کو ایک سمجھتا ہے، خواہ وہ آپس میں کتنے ہی مختلف شعبوں میں بٹے ہوئے ہوں۔ اُن کی ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد اسلام کی نظر میں ایک فساد کے خلاف دوسرے فساد کی جدوجہد ہے۔ ان میں سے کسی کی دشمنی بھی نفسِ فساد سے نہیں ہے بلکہ فساد کی کسی خاص شاخ سے ہے اور اس لیے ہے کہ جس فساد کا جھنڈا ایک فریق نے بلند کر رکھا ہے وہ سرنگوں ہو اور اُس کی جگہ وہ فساد سربلند ہو جس کا جھنڈا دوسرا فریق اُٹھائے ہوتے ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے فریقین میں سے کسی کے ساتھ بھی اُس کا اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا جو اصل فساد کا دشمن ہو۔ اُس کے لیے تو ایک جھوٹے رب کے پرستاروں اور دوسرے جھوٹے رب کے بندوں میں ترجیح کا سوال ہی نہیں۔ اس کی تو بیک وقت سب سے لڑائی ہے۔ وہ تو اپنا سارا زور صرف ایک ہی مقصد پر صرف کرے گا اور وہ یہ ہے کہ انسان کو متفرق غیر حقیقی ربوں اور الٰہوں کی بندگی سے نکالا جائے اور اُس اللہ واحد قہار کی حاکمیت تسلیم کرائی جائے جو فی الحقیقت رَبُّ النَّاس، مَلِكُ النَّاس اور اِلٰهُ النَّاس ہے۔

لفظ "مسلمان" اگر کوئی بے معنی لفظ ہے اور محض عَلَم کے طور پر انسانوں کے کسی گروہ کے لیے استعمال ہونے لگا ہے، تب تو مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہونی چاہیئے کہ اپنی زندگی کے لیے جو مقصد چاہیں قرار دے لیں اور جن طریقوں پر چاہیں کام کریں۔ لیکن اگر یہ لفظ اُن لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جنہوں نے اسلام کو بطورِ مسلک و مشرب قبول کیا ہے تو یقیناً مسلمانوں کے لیے کوئی نظریہ، کوئی مقصد اور کوئی طریقِ کار اسلام کے نظریہ، مقصد اور طریق کار کے سوا نہیں ہو سکتا۔ غیر اسلامی نظریہ اور پالیسی اختیار کرنے کے لیے حالاتِ زمانہ اور مقتضیاتِ وقت کا بہانہ کوئی بہانہ نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

ہے۔ مسلمان جہاں جس ماحول میں بھی ہوں گے ان کو وقتی حوادث اور مقامی حالات و معاملات سے بہرحال سابقہ پیش ہی آئے گا۔ پھر وہ اسلام آخر کس کام کا اسلام ہے جس کا اتباع صرف مخصوص حالات ہی میں کیا جاسکے اور جب حالات دگرگوں ہوں تو اسے چھوڑ کر حسبِ سہولت کوئی دوسرا نظریہ اختیار کر لیا جائے؟ دراصل تمام مختلف حالات میں اسلام کے اساسی نظریہ اور بنیادی مقصد کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنا ہی مسلمان ہونا ہے، ورنہ اگر مسلمان ہر حادثہ اور ہر حال کو ایک جداگانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے لگیں اور ہمیشہ موقع و محل دیکھ کر ایک نئی پالیسی وضع کر لیا کریں جس کو اسلام کے نظریہ و مقصد سے کوئی لگاؤ نہ ہو، تو ایسے مسلمان ہونے میں اور نامسلمان ہونے میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ایک مسلک کی پیروی کے معنی ہی یہ ہیں کہ آپ جس حال میں بھی ہوں آپ کا نقطۂ نظر اور طریق کار اُس مسلک کے مطابق ہو جس کے آپ پیرو ہیں۔ ایک مسلمان، سچا مسلمان اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ زندگی کے تمام جزئی معاملات اور وقتی حوادث میں اسلامی نقطۂ نظر اور اسلامی طریقہ اختیار کرے۔ جو مسلمان کسی موقع و محل میں اسلامی پہلو چھوڑ کر غیر اسلامی پہلو اختیار کرتا ہے اور یہ عذر پیش کرتا ہے کہ اس موقع اور اس محل میں تو مجھے غیر اسلامی طریقہ ہی پر کام کر لینے دو، بعد میں جب حالات سازگار ہو جائیں گے تو مسلمان بن کر کام کرنے لگوں گا، وہ دراصل یہ ظاہر کرتا ہے کہ یا تو اسلام کو وہ سمجھتے خود کوئی ایسا ہمہ گیر نظامِ زندگی ہی نہیں سمجھتا جو زندگی کے ہر معاملہ اور زمانہ کی ہر گردش پر یکساں حاوی ہو سکتا ہو، یا پھر اس کا ذہن اسلام کے سانچے میں پوری طرح نہیں ڈھلا ہے جس کی وجہ سے اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اسلام کے کلیات کو جزئی حوادث پر منطبق کر سکے اور یہ سمجھ سکے کہ مختلف احوال میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔

ایک حقیقی مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب میں دنیا پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے اس امر پر اظہارِ مسرت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ٹرکی پر ترک، ایران پر ایرانی اور افغانستان پر افغان حکمران ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکم الناس علی الناس للناس [1]

---

[1] (Government of the People, by the People, for the People)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے نظریہ کا قائل نہیں ہوں کہ مجھے اس پر مسرت ہو۔ میں اس کے برعکس حکم اللہ علی الناس بالحق¹ کا نظریہ رکھتا ہوں، اور اس اعتبار سے میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہلِ فرانس کی حاکمیت جس قدر غلط ہے، اسی قدر ترکی اور دوسرے ملکوں پر اُن کے اپنے باشندوں کی حاکمیت بھی غلط ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ غلط، اس لیے کہ جو قومیں اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں اُن کا خدا کی حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت اختیار کرنا اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے۔ غیر مسلم اگر ضالین کے حکم میں ہیں تو یہ اس طرزِ عمل کی بنا پر مغضوب علیہم کی تعریف میں آجاتے ہیں۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں مسلم کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے وہ یہ ہے کہ آپ کے اس "پاکستان" میں نظامِ حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریۂ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے، تو یقیناً یہ "پاکستان" ہوگا ورنہ بصورتِ دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان" ہوگا جیسا ملک کا وہ حصہ ہوگا جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے۔ بلکہ خدا کی نگاہ میں یہ اس سے زیادہ ناپاک، اس سے زیادہ مبغوض و ملعون ہوگا، کیونکہ یہاں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والے وہ کام کریں گے جو غیر مسلم کرتے ہیں۔ اگر میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں رام داس کے بجائے عبداللہ خدائی کے منصب پر بیٹھے گا تو یہ اسلام نہیں ہے بلکہ نرا نیشنلزم ہے، اور یہ "مسلم نیشنلزم" بھی خدا کی شریعت میں اتنا ہی ملعون ہے جتنا "ہندوستانی نیشنلزم"۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اس کو ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ اب تک کی

---

¹ (Rule of God on Man with Justice)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

تقسیم اگر جائز تھی تو آئندہ مزید تقسیم ہو جائے گی تو کیا بگڑ جائے گا؟ یہ کون سا ایسا بڑا مسئلہ ہے جس پر مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی غور و فکر میں اپنا وقت ضائع کرے؟ مسلمان کو تو صرف اس چیز سے بحث ہے کہ یہاں انسان کا سر حُکم اللہ کے آگے جھکتا ہے یا حُکم الناس کے آگے۔ اگر حُکم اللہ کے آگے جھکتا ہے تب تو ہندوستان کو اور زیادہ وسیع کیجیے، ہمالیہ کی دیوار کو بیچ میں سے ہٹا دیجیے اور سمندر کو بھی نظر انداز کر دیجیے تاکہ ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ سب ہندوستان میں شامل ہو سکیں۔ اور اگر یہ حُکم الناس کے آگے جھکتا ہے تو جہنم میں جائے ہندوستان اور اس کی خاک کا پرستار، مجھے اس سے کیا دلچسپی کہ یہ ایک ملک رہے یا دس ہزار ٹکڑوں میں بٹ جائے۔ اس بُت کے ٹوٹنے پر تڑپے وہ جو اسے معبود سمجھتا ہو۔ مجھے تو اگر یہاں ایک مربع میل کا رقبہ بھی ایسا مل جائے جس میں انسان پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت نہ ہو تو میں اس کے ایک ذرۂ خاک کو تمام ہندوستان سے زیادہ قیمتی سمجھوں گا۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرا یا جائے۔ انگریز کی حاکمیت سے نکلنا تو صرف لَآ اِلٰہَ کا ہم معنی ہوگا۔ فیصلہ کا انحصار محض اس نفی پر نہیں ہے بلکہ اس پر ہے کہ اس کے بعد اثبات کس چیز کا ہوگا؟ اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اس لیے ہے ــــــــ اور مجاہدین حریت میں سے کون صاحب یہ جھوٹ بولنے کی ہمت رکھتے ہیں کہ اس لیے نہیں ہے ــــــــ کہ امپیریلزم کے اِلٰہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی کے اِلٰہ کو بُت خانۂ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک درحقیقت اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات گیا مَنات آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔ باطل کی بندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے تعبیر کر سکتا ہے؟ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَمْحُوا السَّیِّیٔ بِالسَّیِّیٔ وَلٰکِنْ یَمْحُوا السَّیِّیٔ بِالْحَسَنِ اِنَّ الْخَبِیْثَ لَا یَمْحُو الْخَبِیْثَ[1]

---

[1] یہ حدیث نبوی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ بدی بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے مٹتی ہے۔ ایک ناپاک کو ہٹا کر دوسرا ناپاک اس کی جگہ لے لے تو ناپاکی مٹی کہاں؟

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ کاسد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا قدیم طرز کے مذہبی رہنما، دونوں ہی اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ دونوں اپنے اصلی ہدف کو چھوڑ کر ہوا میں چوبائی تیر چلا رہے ہیں۔ ایک گروہ کے دماغ پر ہندو کا ہوّا سوار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ہندو امپیریلزم کے چنگل سے بچ جانے کا نام نجات ہے۔ دوسرے گروہ کے سر پر انگریز کا بھوت مسلط ہے اور وہ انگریزی امپیریلزم کے جال سے بچ نکلنے کو نجات سمجھ رہا ہے۔ ان میں سے کسی کی نظر بھی مسلمان کی نظر نہیں، ورنہ وہ دیکھتے کہ اصل شیطان نہ یہ ہے نہ وہ، اصل شیطان غیر اللہ کی حاکمیت ہے۔ اُس سے نجات نہ پائی تو کچھ نہ پایا۔ لڑنا ہے تو اُس کو مٹانے کے لیے لڑو۔ جو تیر چلانا ہے اُس ہدف کی طرف شست باندھ کر چلاؤ۔ جس قدر قوت صرف کرنی ہے اُسے مؤثر کرنے پر صرف کر دو۔ اس کے سوا جس کام میں بھی تم اپنی مساعی صرف کرو گے وہ اسی طرح پراگندہ اور رائگاں ہو کر رہیں گی جس طرح اُن لوگوں کی مساعی جن کے متعلق قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا۔ (الکہف۔ آیات ۱۰۳ تا ۱۰۵)

مغربی طرز کے لیڈروں پر تو چنداں حیرت نہیں کہ ان بے چاروں کو قرآن کی ہوا تک نہیں لگی ہے، مگر حیرت اور ہزار حیرت ہے اُن علمائے کرام پر جن کا رات دن کا مشغلہ ہی قال اللہ وقال الرسول ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ قرآن کو کس نظر سے پڑھتے ہیں کہ ہزار بار پڑھنے کے بعد بھی انہیں اُس قطعی اور دائمی پالیسی کی طرف ہدایت نہیں ملتی جو مسلمان کے لیے اصولی طور پر مقرر کر دی گئی ہے۔ جن

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسائل کو انہوں نے اہم اور اقدم قرار دے رکھا ہے، قرآن میں ہم کو ان کی فروعی اور ضمنی اہمیت کا بھی نشان نہیں ملتا۔ جن معاملات پر بے چین ہو کر انہوں نے دہلی میں آزاد مسلم کانفرنس منعقد فرمائی اور تڑپ تڑپ کر تقریریں کیں، اس نوعیت کے معاملات کہیں اشارۃً بھی قرآن میں زیر بحث نہیں آتے۔ برعکس اس کے قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے: یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ[1] خواہ بابل کی سرزمین ہو یا ارضِ سدوم، یا مُلکِ مَدیَن، یا حجر کا علاقہ، یا نیل کی وادی۔ خواہ وہ چالیسویں صدی قبل مسیح ہو، یا بیسویں یا دسویں۔ خواہ وہ غلام قوم ہو یا آزاد، خستہ و درماندہ ہو یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے بام عروج پر، ہر جگہ، ہر دور میں، ہر قوم میں اللہ کی طرف سے آنے والے رہنماؤں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ تھی کہ "اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعاون، کوئی اشتراک عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اس اصل الاصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنہ۔ آیت ۴) حضرت موسیٰ نے فرعون کے پاس جا کر اَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ کا مطالبہ کرنے سے پہلے اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف۔ ۱۰۴) کا اعلان کیا، اور هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (النازعات ۱۸-۱۹) کی دعوت دی، اور اسے آگاہ کیا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور جینے کا طریقہ بتایا رَبُّنَا الَّذِيٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (طٰہٰ۔ ۵۰)۔ حضرت عیسیٰ نے، جن کی قوم رومیوں کی غلام ہو چکی تھی، بنی اسرائیل اور آس پاس کی قوموں کو رومن امپیریلزم کے خلاف جنگ آزادی کے جھنڈے

---

[1] اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔

کی طرف دعوت نہ دی بلکہ اس چیز کی طرف دعوت دی کہ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (آل عمران - ۵۱) ظاہر ہے کہ یہ واقعات جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، کسی اور دنیا کے نہیں، اسی دنیا کے ہیں جس میں ہم بستے ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السّلام آئے ان میں سرے سے کوئی سیاسی، معاشی، تمدّنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی۔ پس جب یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر رہنما نے ہر ملک اور ہر زمانے میں تمام وقتی اور مقامی مسائل کو نظر انداز کرکے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی پر اپنا سارا زور صرف کیا تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ اُمّ المسائل تھا اور وہ اسی کے حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے۔

اب یا تو یہ کہہ دیجیے کہ اسلامی تحریک کے وہ رہنما جو خدا کی طرف سے آئے تھے، سب کے سب عملی سیاسیات سے نابلد تھے، نہ جانتے تھے کہ انسانی زندگی کے معاملات میں کون سی چیز مقدّم اور کون سی مؤخّر ہونی چاہیے، اور انہیں خبر نہ تھی کہ آزادی کے لیے جدّوجہد کس طرح کی جاتی ہے اور ملکی معاملات کو حل کرنے کی کیا تدبیریں ہیں۔ یا پھر یہ تسلیم کیجیے کہ اس دَور میں جو حضرات اسلام کے نمائندے اور مسلمانوں کے قائد و رہنما بنے ہوئے ہیں وہ جُزئیاتِ شرع پر کتنا ہی عبور رکھتے ہوں، بہرحال اسلامی تحریک کے مزاج کو وہ نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے کہ اس تحریک کو چلانے اور آگے بڑھانے کا طریقہ کیا ہے۔

تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اُس تحریک سے ہے جس کے رہبر و رہنما انبیاء علیہم السّلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظامِ فکر اور ایک خاص طریقِ کار ہوتا ہے۔ اسلام کا نظامِ فکر اور طریقِ کار وہ ہے جو ہم کو انبیاء علیہم السّلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں ہوں، اور ہمارے گرد و پیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیے مقصد و نصب العین وہی ہے جو انبیاء کا تھا، اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاء ہر زمانے میں چلتے رہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ۔ (الانعام - ۹۰)[1] ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو اُسی نظر سے دیکھنا چاہیئے جس سے اُنہوں نے دیکھا۔ ہمارا معیارِ قدر وہی ہونا چاہیئے جو اُن کا تھا۔ اور ہماری اجتماعی پالیسی اُنہی خطوط پر قائم ہونی چاہیئے جن پر انہوں نے قائم کی تھی۔ اس مسلک کو چھوڑ کر اگر ہم کسی دوسرے مسلک کا نظریہ اور طرزِ عمل اختیار کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے۔ یہ بات ہمارے مرتبہ سے فروتر ہے کہ ہم اُس تنگ زاویہ سے معاملاتِ دنیا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست، یا ایک جمہوریت پسند یا ایک اشتراکی ان کو دیکھتا ہے۔ جو چیزیں ان کے لیے بلند ترین منتہائے نظر ہیں وہ ہمارے لیے اتنی پست ہیں کہ ادنٰی التفات کی بھی مستحق نہیں۔ اگر ہم ان کے سے رنگ ڈھنگ اختیار کریں گے، اُنہی کی زبان میں باتیں کریں گے، اور اُنہی گھٹیا درجہ کے مقاصد پر زور دیں گے جن پر وہ فریفتہ ہیں، تو اپنی وقعت کو ہم خود ہی خاک میں ملا دیں گے۔ شیر اگر بکری کی سی بولی بولنے لگے اور بُزغالوں کی طرح گھاس پر ٹوٹ پڑے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگل کی بادشاہی سے وہ آپ ہی دست بردار ہو گیا۔ اب وہ اس کی توقع کیسے کر سکتا ہے کہ جنگل کے لوگ اس کی وہ حیثیت تسلیم کریں گے جو شیر کی ہونی چاہیئے؟ یہ تعداد کی بنا پر قومی حکومت کے مطالبے، یہ اکثریت کے خوف سے اقلیت کے نوحے، یہ تحفظات اور حقوق کی چیخ پکار، یہ انگریزی سلطنت اور والیانِ ریاست کے ظلِّ عاطفت میں قومی مفاد کے تحفظ کی تدبیریں، اور دوسری طرف یہ آزادیٔ وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے سُروں میں امپیریلزم کی مخالفت، یہ سب ہمارے لیے بکری کی بولیاں ہیں۔ یہ بولیاں بول کر ہم خود ایک غلط حیثیت اختیار کرتے ہیں اور اپنی حیثیت اس قدر غلط طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ دنیا ہمیں بکری ہی سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ خدا نے ہمیں اس سے بہت اونچا منصب دیا ہے۔ ہمارا منصب یہ ہے کہ ہم کھڑے

---

[1] وہی لوگ تھے جن کی اللہ نے رہنمائی کی تھی لہٰذا ان کی ہدایت کی پیروی کرو۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہو کر تمام دنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت مٹا دیں اور خدا کے بندوں پر خدا کے سوا کسی کی حاکمیت باقی نہ رہنے دیں۔ یہ شیر کا منصب ہے اور اس منصب کو ادا کرنے کے لیے کسی قسم کی خارجی شرائط درکار نہیں ہیں، بلکہ صرف شیر کا دل درکار ہے۔ وہ شیر، شیر نہیں ہے جو اگر پنجرے میں بند ہو تو بکری کی طرح ممیانے لگے، اور شیر وہ بھی نہیں جو بکریوں کی کثرت تعداد کو دیکھ کر یا بھیڑیوں کی چیرہ دستی دیکھ کر اپنی شیریت بھول جائے۔

(ترجمان القرآن۔ مئی و جون ۱۹۴۰ء)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اصلی مسلمانوں کے لیے ایک ہی راہِ عمل

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام تمام عالم انسانی کے لیے بنیادی اصلاح کا ایک پیغام اور عملی اصلاح کا ایک انقلابی پروگرام لے کر آیا ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ تمام انسان اللہ وحدہٗ لاشریک کی حاکمیت تسلیم کریں حتیٰ کہ اس کے حکم کے سوا ہر دوسرا حکم باطل ہو جائے۔ اور اس کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اِس دعوت کو قبول کریں وہ ایک جتھا بنا کر اپنا پورا زور اِس بنیادی اصلاح کو عملاً نافذ کرنے میں صرف کر دیں، یہاں تک کہ اشخاص کی، خاندانوں اور طبقوں کی، قوموں اور نسلوں کی فرماں روائی اور جمہور کی حکومت خود اختیاری بالکلیہ مٹ جائے اور خدا کی سلطنت میں اس کی رعیت پر صرف اُسی کا قانون عملاً جاری ہو۔ یہی پیغام اور یہی پروگرام انبیاء علیہم السلام ابتدا سے لے کر آتے رہے ہیں۔ اسی ایک مقصد پر انہوں نے اپنی تمام سعی وجہد کو مرکوز کیا ہے۔ اور مسلمان، جو انبیاء کے وارث اور ان کے پیرو ہیں، ان کے لیے بھی اِس کے سوا نہ کوئی دوسرا مقصد ہے اور نہ کوئی دوسری راہِ عمل۔ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں پر مجھے جو کچھ اعتراض ہے وہ یہی ہے کہ اپنے آپ کو مسلم (یعنی متبعینِ انبیاء) کہنے کے باوجود انہوں نے اس نصب العین اور اس راہِ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کر لیے ہیں جن کو اسلام سے کوئی دُور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُن لوگوں کو چھوڑ کر جو اسلام کے علم سے بالکل ہی بے بہرہ ہیں، آج تک مجھے کوئی مسلمان، خواہ وہ کسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، ایسا نہیں ملا جس نے اِس اعتراض کو سُن کر اصولی حیثیت سے تسلیم نہ کیا ہو۔ سب مانتے ہیں کہ بلا شبہ مسلمان کا اصلی کام یہی ہے اور اسی منزل کی طرف انبیاء علیہم السلام نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ لیکن جواب میں دو مختلف سمتوں سے دو مختلف آوازیں آتی ہیں:۔

"آزادی پسند" علماء اور اُن کے ہم خیال مسلمان اس راستہ پر آنے کی مشکلات یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر صرف مسلمان آباد ہوتے، یا مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہوتی، جیسی مصر، ایران، عراق وغیرہ ممالک میں ہے، تب تو ہمارے لیے آسان تھا کہ حکومتِ الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتے، اور اس صورت میں اس کے قائم ہونے کا امکان بھی تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ہم قلیل التعداد ہیں، اکثریت غیر مسلم ہے، حکومتِ الٰہیہ کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتی ہے، اور صرف مشترک وطنی حکومت ہی کے نصب العین تک اس کی نظر جا سکتی ہے۔ اوپر انگریزی حکومت بیٹھی ہے جو ہمیں اور غیر مسلم ہمسایوں کو ایک ساتھ دبائے ہوئے ہے۔ خود مسلمانوں کی آبادی کا کثیر حصہ بھی اخلاقی و اعتقادی حیثیت سے انتہائی تنزل کی حالت میں ہے۔ لہٰذا اس وقت جو کچھ ہو سکتا ہے وہ یہی ہے کہ مشترک حکومت کے نصب العین کو قبول کر کے، غیر مسلموں کے ساتھ مل کر، انگریزی اقتدار سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد آزاد ہندوستان میں ہم اپنی قوتوں کو پھر مجتمع کریں گے اور اپنے نصب العین کے لیے جدوجہد شروع کر دیں گے۔ اِس کے سوا اور کوئی راستہ اِس وقت قابلِ عمل نہیں ہے۔

دوسری طرف مسلم لیگ اور اس کے ہم خیال لوگ اپنی مشکلات کو ایک دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یہاں اوّل تو قلیل التعداد ہیں، پھر تعلیمی اور معاشی حیثیت سے ہماری قوت بہت کم ہے، اور مزید برآں ایک ایسی تنگ نظر اکثریت نے سیاسی اور معاشی قوتوں کے منابع پر تسلط حاصل کر لیا ہے جو عملاً تو ہم کو ایک الگ قوم سمجھ کر تعلیم حاصل کرنے اور پیٹ بھرنے کے ہر دروازے سے دُور ہٹاتی ہے، مگر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیاسی اغراض کے لیے اصولاً ہمارے مستقل قومی وجود سے انکار کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ ہم "ہندوستانی قوم" میں شامل ہو کر یہاں ایک ایسی جمہوری حکومت قائم ہو جانے دیں جس میں سیاسی طاقت کے حصول کا ذریعہ محض ووٹوں کی کثرت ہو۔ اِس مقصد میں اُس کے کامیاب ہو جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنی قومی شخصیت ہی کو سرے سے کھو دیں، پھر بھلا حکومتِ الٰہیہ کا خواب کہاں دیکھا جا سکے گا؟ لہٰذا سرِ دست اِس کے سوا کوئی قابلِ عمل صورت نہیں ہے کہ جس طرح دنیا کی اور سب قومیں اپنی تنظیم کیا کرتی ہیں اسی طرح ہم بھی اپنی تنظیم کریں، اور دنیا میں جس طرح سیاسی لڑائی لڑی جاتی ہے اُسی طرح ہم بھی لڑ کر سب سے پہلے اُن علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اُسی جمہوری دستور کے مطابق جو انگریزی تصوّرِ جمہوریت کے تحت بنتا ہے، اپنی حکومت قائم کر لیں۔ بعد میں جب اختیارات ہمارے ہاتھ میں آجائیں گے تو ہم مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اخلاق و تمدّنی حالت کو درست کر کے رفتہ رفتہ حکومتِ جمہوریہ کو حکومتِ الٰہیہ میں تبدیل کر لیں گے، اور اللہ نے چاہا تو پھر باقی ہندوستان کی بازیافت کے لیے بھی جدّوجہد کرتے رہیں گے۔

بظاہر دونوں فریقوں کے خیالات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان زیادہ تر انہی دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن مشکلات کا یہ لوگ ذکر کرتے ہیں ان میں قطعاً کوئی وزن نہیں ہے، بلکہ خود یہی بات کہ حکومتِ الٰہیہ کے راستے میں انہیں اِس نوعیت کی مشکلات نظر آتی ہیں، اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ انہوں نے اسلامی تحریک کے مزاج اور اس کے طریقِ کار (Technique) کو سرے سے سمجھا ہی نہیں۔ زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں، اگر اس تحریک کی تاریخ ہمارے سامنے ہو تو بادی النظر ہی میں ان عذرات کی غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی رسول آیا ہے اکیلا ہی آیا ہے۔ اقلیت اور اکثریت کا کیا سوال، وہاں سرے سے کوئی "مسلمان قوم" موجود ہی نہ تھی۔ ایک فی قوم، بلکہ ایک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نی دنیا کی حیرت انگیز اقلیت کے ساتھ رسول یہ دعوٰی لے کر اُٹھتا ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنے آیا ہوں۔ چند گنے چنے آدمی اُس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور یہ آٹے میں نمک سے بھی کم اقلیت، حکومتِ الٰہیہ کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ اکثریت کا سمندر اس کے ساتھ جو کچھ سلوک کرتا ہے، اُس کے مقابلہ میں ہندوستان کی غیر مسلم اکثریت کے اُس قہر و تسلط کی سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جس کا نوحہ کرتے کرتے ہمارے "مسلم قوم پرست" بھائیوں کے آنسو خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ دفتروں کی ملازمت، منڈیوں کے کاروبار، اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے معاملات کا کیا ذکر، وہاں سانس لینے کا حق بھی اس اقلیت کو نہیں دیا جاتا تھا۔ پھر حکومت، خواہ وہ ملکی ہو یا غیر ملکی، جس پنجۂ ظلم و شکنجۂ قہر میں اُن کو کستی تھی اُس کو کسی معنی میں بھی ہندوستان کے اُن انگریز فرمانرواؤں کے برتاؤ سے تمثیل نہیں دی جا سکتی جن کے ظلم و جور کا رونا ہمارے "آزادی پسند" بھائی رات دن رویا کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی کچھ ضروری نہ تھا کہ بہر حال رسول اور اصحابِ رسول حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے ہوں۔ بارہا وہ اِس مقصد میں ناکام ہوتے ہیں۔ اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے، اور خدائی کے جھوٹے مدعیوں نے اپنی دانست میں اس تحریک کا قلع قمع کر کے چھوڑا ہے۔ مگر اس کے باوجود جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے تھے، اور جن کے نزدیک کرنے کا کام بس یہی تھا، انہوں نے آخری سانس تک اِسی مقصد کے لیے کام کیا، اور کسی ایک نے بھی اکثریت کا یا حکومت کا رنگ دیکھ کر، یا وقتی و مقامی مشکلات کا خیال کر کے دوسرے راستوں کی طرف ادنٰی التفات تک نہ کیا۔

پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اِس تحریک کو اُٹھانے اور چلانے کے لیے خارج میں کسی سامان اور ماحول میں کسی سازگاری کی ضرورت ہے۔ جس سامان اور جس سازگار ماحول کو یہ لوگ ڈھونڈتے ہیں وہ نہ کبھی فراہم ہوا ہے، نہ فراہم ہوگا۔ دراصل خارج میں نہیں بلکہ مسلمان کے اپنے باطن میں ایمان کی ضرورت ہے۔ اِس قلبی شہادت کی ضرورت ہے کہ یہی مقصد حق ہے، اور اِس عزم کی ضرورت ہے کہ میرا جینا اور مرنا اِسی مقصد کے لیے ہے۔ یہ ایمان، یہ شہادت، یہ عزم موجود ہو تو دنیا بھر میں ایک اکیلا انسان یہ اعلان

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنے کے لیے کافی ہے کہ میں زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کی پشت پر کسی منظم اقلیت یا کسی حکومتِ خود اختیاری رکھنے والی اکثریت کی قطعاً کوئی حاجت نہیں۔ نہ اِس امر ہی کی کوئی حاجت ہے کہ اُس کا ملک پہلے بیرونی قوم کے تسلط سے آزاد ہو جائے۔ بیرونی قوم کیا، اور گھر کی قوم کیا، اللہ کے سوا دوسروں کی حاکمیت تسلیم کرنے والے سب انسان اس کے لیے یکساں ہیں۔ سب کی اُس سے اور اس کی سب سے یکساں لڑائی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے رومیوں نے جو کچھ برتاؤ کیا، اُس سے زیادہ ہولناک برتاؤ وہ تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کی اپنی قوم نے کیا۔

یہ تو وہ بات ہے جو بادی النظر میں ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہے۔ لیکن ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس نوعیت کی مشکلات کو یہ لوگ اپنی راہ میں حائل پا رہے ہیں وہ دراصل ایک قوم کی مشکلات ہیں نہ کہ ایک تحریک کی۔ جہاں ایک قوم اپنی زندگی اور اپنی قومی اغراض کے لیے جدوجہد کر رہی ہو وہاں تو بلاشبہ اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اُس کے لیے اِن سوالات میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کہ جس ملک میں وہ آباد ہے وہاں اس کی تعداد کتنی ہے؟ اس میں تنظیم ہے یا نہیں؟ اس کی تعلیمی حالت کیسی ہے؟ اس کی معاشی حالت کیسی ہے؟ اس کے اوپر ایک پتھر کا بوجھ ہے یا دو پتھروں کا؟ انہی سوالات کے جوابات پر اس کا مستقبل منحصر ہوتا ہے، اور انہی سوالات کے لحاظ سے اس کو اپنی پالیسی متعین کرنی پڑتی ہے۔ مگر ایک اصولی تحریک جو کسی خاص قوم کی اغراض سے وابستہ نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے وہ ایک دعوت لے کر اُٹھے اس کے سامنے اِن سوالات میں سے کوئی سوال بھی نہیں ہوتا۔ اُس کے مسائل کی نوعیت بالکل دوسری ہوتی ہے۔ اُس کی کامیابی و ناکامی کا انحصار اِس پر ہوتا ہے کہ اس کے اصول بجائے خود معقول ہیں یا نہیں؟ وہ انسانی زندگی کے مسائل کو کہاں تک حل کرتے ہیں؟ وہ بالعموم فطرتِ انسانی کو کس حد تک اپیل کرتے ہیں؟ اور اس کی طرف دعوت دینے والے خود اس کی پیروی میں کتنے مخلص اور کتنے صادق العزم ہیں؟

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلمانوں کو جو کچھ بھی پریشانی پیش آ رہی ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اُن کے سوچنے والے دماغوں نے اپنی حیثیت کو اِن دو مختلف حیثیتوں کے درمیان خلط ملط کر دیا ہے۔ کبھی تو یہ اُن عزائم اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں جن کا تعلق اسلامی تحریک سے ہے، اور ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک اصولی تحریک کے پیرو اور داعی ہیں۔ اور کبھی یہ محض ایک قوم بن کر رہ جاتے ہیں، اُس طرح سوچنے لگتے ہیں جس طرح قومیں سوچا کرتی ہیں، ایسے مسائل میں اُلجھ جاتے ہیں جو صرف قوموں ہی کو پیش آتے ہیں، اور اپنے اِس طرزِ فکر کی وجہ سے اُن مشکلات کو سدِّ راہ پاتے ہیں جو محض قومی مقاصد ہی کے لیے سدِّ راہ ہوا کرتی ہیں۔ ان لوگوں نے آج تک اِن دونوں حیثیتوں کے فرق کو نہیں سمجھا، نہ واضح طور پر فیصلہ کیا کہ دراصل یہ ہیں کیا۔ اسی لیے یہ کوئی ایسی پالیسی ابھی تک اپنے لیے متعین نہ کر سکے جو تناقض سے خالی اور اُلجھاؤ سے پاک ہو۔

یہ ایک کھُلی ہوئی بات ہے کہ قومیت اور قومی اغراض قابلِ تبلیغ چیزیں نہیں ہیں۔ مثلاً جرمنیت، اطالویت، انگریزیت یا ہندویت کے متعلق کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان کی طرف دوسروں کو دعوت دی جا سکتی ہے۔ یہ کوئی اصول نہیں ہیں کہ ہر انسان کے سامنے انہیں پیش کیا جا سکے۔ یہ تو نسل، تاریخ اور تمدن کے بنے ہوئے بے لچک دائرے ہیں۔ اِن دائروں کے مفاد اور مقاصد سے جو کچھ بھی دلچسپی ہو سکتی ہے اُنہی لوگوں کو ہو سکتی ہے جو ان دائروں کے اندر پیدا ہوتے ہوں۔ دوسرے دائروں کے لوگوں کو ان سے دلچسپی ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ایک جرمن اپنی جرمنیت کی بنیاد پر کوئی کام کرنا چاہے تو لامحالہ وہ جرمنوں ہی سے ہمدردی و اعانت کی توقع کر سکتا ہے۔ انگریز کو کیا پڑی ہے کہ جرمنیت کی زندگی یا اس کی برتری کے معاملہ میں اس کا ساتھ دے۔ جرمنوں کا بول بالا کرنے کی تڑپ تو صرف جرمنوں ہی میں پیدا ہو سکتی ہے، اور یہ بالکل فطری بات ہے کہ ان کے مقابلہ میں انگریز بھی متحد ہو کر اپنا بول بالا کرنے یا رکھنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ یہ ضرور ممکن ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کے بعض افراد کو ناجائز ذرائع سے خرید کر اپنا آلۂ کار بنا لیں، مگر یہ ممکن نہیں ہے کہ انگریز جرمنیت پر ایمان لا کر جرمنوں کا ولی حمیم بن جائے یا جرمن انگریزیت اختیار

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرکے انگریزوں کا حامی و ناصر بن جائے وہی وجہ ہے کہ جہاں دو قوموں کے درمیان موافقت ہوتی ہے وہاں محض خود غرضی کی موافقت ہوا کرتی ہے اور صرف اُس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک خود غرضی اس کی مقتضی ہو۔ اور جہاں ان کے درمیان کشمکش و مزاحمت ہوتی ہے وہاں دونوں کو صرف اپنی قومی طاقت، اپنی تنظیم، اپنے معاشی وسائل، اپنی تعداد، اور اپنے آلاتِ جنگ ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے جو قوم کمزور ہو وہ پس جاتی ہے اور جو طاقت ور ہو وہ اُسے پیس ڈالتی ہے۔ جرمنی کے مقابلہ میں پولینڈ، ڈنمارک، ناروے، ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کیوں مغلوب ہو گئے؟ فن لینڈ اور رومانیا کو روس اور جرمنی سے کیوں دبنا پڑا؟ اسی لیے کہ مقابلہ ایک قوم اور دوسری قوم کا تھا۔ دونوں طرف قومیتیں تھیں۔ لہٰذا جس کی قومیت تعداد اور آلات و وسائل اور تنظیم میں بڑھی ہوئی تھی اس نے کمزور کو دبا لیا۔ کوئی فریق بھی خالص انسانیت کی بنیاد پر ایسے اصول لے کر نہ اُٹھا تھا کہ مخالف فریق کے انسانوں کو اپیل کرتا اور یہ ممکن ہوتا کہ خود دشمنوں میں سے اس کو دوست ملتے چلے جاتے۔

یہ ہوتی ہے ایک قوم کی حیثیت۔ اب غور کیجیے کہ فی الحقیقت کیا مسلمانوں کی حیثیت اُس دنیا میں یا اس ہندوستان میں یہی ہے؟ کیا ہم محض نسل، تاریخ اور موروثی تمدن کا بنایا ہوا ایک ایسا گروہ (Group) ہیں جس کی قومیت دنیا کی تمام قومیتوں کی طرح ناقابلِ تبلیغ ہو؟ کیا ہمارے مقاصد کی نوعیت بھی اُنہی قومی اغراض و مقاصد کی سی ہے جن پر دوسری قوموں کا ایمان لانا فطرتاً غیر ممکن ہوتا ہے؟ کیا ہمارے مقاصد اُسی قسم کے قومی مقاصد ہیں جن کا حصول صرف ایک قوم کی تعداد، تنظیم اور وسائل ہی پر موقوف ہوتا ہے؟ کیا وہ اسلامی حکومت جس کا ہم نام لیا کرتے ہیں محض ایک قومی ریاست (National State) ہے جس کے قیام کی بنیاد ایک قوم کی کثرتِ تعداد ہوا کرتی ہے؟ کیا قلیل التعداد ہونے کی صورت میں ہماری حیثیت واقعی ایک قومی اقلیت (National Minority) کی رہ جاتی ہے جس کے لیے اکثریت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے یا پھر اپنی انفرادیت کے تحفظ کی تدبیریں اختیار کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں ہوتا؟ کیا حقیقت میں دنیا کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسری قوموں کی طرح ہمارے لیے بھی آزادی کا یہی مفہوم ہے کہ ہمیں غیر قوم کی حکومت سے نجات حاصل ہو جائے؟ اور کیا اپنی قوم کی حکومت یا اپنے اہلِ وطن کی حکومت قائم ہو جانا ہمارے مقاصد کے لیے بھی ضروری ہے؟

اگر واقعی یہی ہماری حیثیت ہے تو بلا شبہ وہ سب کچھ صحیح ہے جو مسلمانوں کی مختلف جماعتیں اس وقت کر رہی ہیں۔ غیر مسلم ہمسایوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد بھی صحیح، برطانوی حکومت اور دیسی ریاستوں کا سہارا لے کر ہندو امپیریلزم کا مقابلہ بھی صحیح، فوج میں اور سرکاری ملازمتوں میں اور انتخابی مجالس میں اپنی نمائندگی کا جھگڑا بھی صحیح، مسلم ریاستوں کی حمایت بھی صحیح، تقسیم ملک کا مطالبہ بھی صحیح، خاکساروں کی فوجی تنظیم بھی صحیح، اور وہ مسلم قوم پرستی بھی صحیح جس کی بنا پر حق اور اصول سے قطع نظر کر کے ہر اُس فائدے کو دانتوں سے پکڑا جاتا ہے جو مسلمان قوم یا مسلمان اشخاص کو حاصل ہوتا ہو۔ غرض یہ سب کچھ صحیح ہے کیونکہ قومیت کا آئین یہی ہے، قومیں یونہی کام کیا کرتی ہیں، اور ایک قوم جو کسی اصول کی علمبردار نہیں بلکہ محض اپنی قومی بہتری کی خواہش مند ہو، ان تدابیر کے سوا آخر اور کیا تدبیریں اختیار کر سکتی ہے؟ البتہ ان سب چیزوں کے ساتھ اگر کوئی بات غیر صحیح ہے تو وہ ہماری یہ خوش فہمی ہے کہ یہ حیثیت اختیار کرنے کے بعد بھی ہم اس زمین پر حکومتِ الٰہیہ قائم کر سکیں گے، حالانکہ اس حیثیت میں یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو ہی نہیں سکتا۔

دراصل ایک ملک پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر چھا جانے کی قوت اگر ہے تو وہ صرف ایک ایسی اصولی تحریک میں ہے جو انسان کو بحیثیتِ انسان خطاب کرتی ہو اور اس کے سامنے خود اس کی اپنی فلاح کے فطری اصول پیش کرتی ہو۔ قومیت کے برعکس ایسی تحریک ایک تبلیغی طاقت ہوتی ہے۔ قومیت کے حصار، نسلوں کے تعصبات، قومی ریاستوں کے مضبوط بند، کوئی چیز بھی اُس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ وہ ہر طرف، ہر جگہ نفوذ کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کی طاقت کا انحصار اپنے پیرووں کی تعداد یا ان کے وسائل پر نہیں ہوتا۔ ایک اکیلا آدمی اس کو اُٹھانے کے لیے کافی ہے۔ پھر وہ خود اپنے اصولوں کی طاقت سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ اپنے دشمنوں میں سے دوست پیدا کرتی ہے۔ سب قوموں میں سے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے جھنڈے کے نیچے آنے لگتے ہیں اور وسائل اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جو فوجیں اس سے لڑنے آتی ہیں اُن پر وہ صرف اپنی توپ و تفنگ سے ہی آتشباری نہیں کرتی بلکہ اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کے تیر بھی چلاتی ہے۔ خون کے پیاسے دشمنوں میں سے وہ اپنے سرگرم حامی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ سپاہی، جنرل، ماہرینِ فنون، سرمایہ دار، صناع اور کاریگر سب انہی میں سے اس کو مل جاتے ہیں، اور بے سروسامانی میں سے ہر قسم کا سامان نکلتا چلا آتا ہے۔ قومیتیں اس کے سیلاب کے مقابلہ میں کبھی نہیں ٹھہر سکتیں۔ بڑے بڑے پہاڑ اس کے سامنے آتے ہیں اور نمک کی طرح پگھل پگھل کر اس آبِ رواں میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے اقلیت اور اکثریت کے سارے سوالات بے معنی ہیں۔ وہ اس کی ہرگز محتاج نہیں ہوتی کہ کسی منظم اور باوسیلہ قوم کی طاقت اس کی پشت پر ہو۔ وہ قومی حکومت قائم کرنے نہیں اُٹھتی کہ قومیں اس کی مزاحمت کر سکیں۔ اُسے تو ایک ایسے اصول کی حکومت قائم کرنی ہوتی ہے جو سب قوموں کے لوگوں کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔ جاہلی تعصبات کچھ دیر تک اس سے لڑتے رہتے ہیں، مگر جب فطرتِ انسانی پر لگا ہوا زنگ چھوٹتا ہے تو وہ کیفیت ہوتی ہے کہ:

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بامید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

مسلمان قرآن اور سیرتِ رسولؐ کے آئینے میں اپنی صورت دیکھیں۔ جس چیز کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، کہیں وہ اسی نوعیت کی تحریک تو نہیں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ قوموں کے درمیان رہتے رہتے اور انہی جیسی تعلیم و تربیت پا کر اپنی اصلی حیثیت بھول گئے ہوں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو قوم کہتے کہتے انہوں نے وہ سب محدودیتیں بھی اپنے خیال میں خود اپنے اوپر عائد کر لی ہوں جو ایک قلیل الوسائل قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں؟

اگر واقعہ یہی ہے اور مسلمانوں کی اصل حیثیت ایک عالمگیر اصولی تحریک کے پیرووں اور داعیوں کی ہے تو وہ سارے مسائل یک قلم اُڑ جاتے ہیں جن پر اب تک مسلمانوں کے سیاسی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مذہبی رہنما وقت ضائع کرتے رہے ہیں۔ پوری صورتِ حال بالکل بدل جاتی ہے۔ مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیتہ العلماء اور آزاد کانفرنس، سب کی اِس وقت تک کی تمام کارروائیاں حرفِ باطل کی طرح محو کر دینے کے لائق ٹھیرتی ہیں۔ نہ ہم قومی اقلیت ہیں، نہ آبادی کے فیصدی تناسب پر ہمارے وزن کا انحصار ہے، نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی قومی جھگڑا ہے، نہ انگریزوں سے وطنیت کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے، نہ اُن ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان فرمانروا بنے بیٹھے ہیں، نہ اقلیت کی حیثیت سے اپنے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے، نہ اکثریت کی بنیاد پر اپنی قومی حکومت ہمیں مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں، بندوں کی حاکمیت ختم ہو جائے اور حکومت اُس قانونِ عدل کی قائم ہو جو اللہ نے خود بھیجا ہے۔ اس مقصد کو ہم انگریز، والیانِ ریاست، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی اور مردم شماری کے مسلمان، سب کے سامنے پیش کریں گے۔ جو اسے قبول کرے گا وہ ہمارا رفیق ہے، اور جو اس سے انکار کرے گا اس سے ہماری لڑائی ہے بلا لحاظ اس کے کہ اُس کی طاقت کتنی ہے اور ہماری کتنی۔

یہ حیثیت اختیار کرنے اور اِس تحریک کو لے کر اُٹھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے شخصی اور قومی مفاد و اغراض کو بھول جائیں، تمام تعصبات سے بالاتر ہو جائیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے نظر ہٹا لیں جن سے ہمارے حقیر دنیوی فوائد کا تعلق ہے۔ اگر ہم میں ہندستانیت کا تعصب ہو گا تو فطری بات ہے کہ انگریز اور ہر غیر ہندوستانی کے کان ہماری دعوت کے لیے بہرے ہو جائیں گے۔ اگر ہم نام نہاد مسلم قوم کے تعصب میں مبتلا ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندو یا سکھ یا عیسائی کے دل کا دروازہ ہماری پکار کے لیے کھل جائے۔ اگر ہم حیدرآباد، بھوپال، بہاول پور اور رامپور جیسی ریاستوں کی حمایت محض اس لیے کریں کہ ان کے رئیس مسلمان ہیں اور ان سے مسلمانوں کو کچھ معاشی سہارا مل جاتا ہے، تو کوئی احمق ہی ہو گا جو اِس کے بعد بھی یہ باور کر لے گا کہ ہم اسلام کے نظریۂ سیاسی پر ایمان رکھتے ہیں اور واقعی حکومتِ الٰہی قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے۔ اگر ہم غیر مسلم حکومت کی ملازمت اور غیر اسلامی جمہوری اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی پر جھگڑا کریں تو ہماری اِس آواز میں کوئی وزن باقی نہ رہے گا کہ ہم اصولِ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسلام کی فرمانروائی قائم کرنے اُٹھے ہیں۔ اگر ہم تناسب آبادی کے لحاظ سے تقسیم ملک کا مطالبہ کریں تو غیر مسلموں کو ہم میں اور خود اپنے آپ میں سر بسر سے کوئی فرق ہی محسوس نہ ہوگا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر ہماری دعوت پر لبیک کہنے کی کوئی ضرورت سمجھیں۔ اگر ہم غیر اسلامی اصول پر مشترک وطنی حکومت قائم کرنے میں حصّہ لیں تو ہمارے اس فعل میں اور ہماری اس دعوت میں ایسا صریح تناقض ہوگا کہ ہماری صداقت کیا معنی ہماری عقل تک مشتبہ ہو کر رہ جائے گی۔ اس راستے پر چلنے کے لیے ہمیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔ بلاشبہ ہمیں اس سے بہت نقصانات پہنچیں گے، مگر ایسے نقصانات اُٹھائے بغیر اسلامی تحریک نہ کبھی چلی ہے نہ چل سکتی ہے۔ جو کچھ جاتا ہے جانے دو۔ سیدنا مسیحؑ کے قول کے مطابق جُبّہ جاتا ہے تو کرتا بھی چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ تب ہی خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو سکے گی۔

(ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۴۰ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسلام کی راہِ راست اور اس سے انحراف کی راہیں

مسلمانوں میں سے جو لوگ پاکستان کے نصب العین پر اپنی نظر جماتے ہوتے ہیں، اور جو انگریزی حکومت سے ہندوستان کی آزادی پر اپنی تمام امیدوں کا انحصار رکھتے ہیں، اور جو ان دونوں کے درمیان مختلف راہیں تلاش کر رہے ہیں، ان سب کے اندر ایک چیز مجھے مشترک نظر آتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام کے اصلی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے یہ سب لوگ جھجکتے ہیں۔ مشکلات کا ایک بہت بڑا پہاڑ ان کو اس راستہ میں حائل نظر آتا ہے اور اس کو دور سے دیکھ کر یہ دائیں یا بائیں جانب مڑ جاتے ہیں تاکہ پھیر کے راستوں سے نکل جائیں۔ حالانکہ میں علی وجہ البصیرت یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی نصب العین تک کسی پھیر کے راستے سے پہنچنا غیر ممکن ہے۔ اس کی طرف اگر پیش قدمی کی جا سکتی ہے تو براہِ راست ہی کی جا سکتی ہے، اور جو مشکلات اس راستہ میں نظر آتی ہیں وہ ناقابلِ عبور نہیں ہیں، بشرطیکہ ان کو صحیح طور سے سمجھنے اور دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اوپر کے فقرے میں جو مجمل دعویٰ میں نے کیا ہے اب میں اس کا تجزیہ کر کے ایک ایک جزء پر الگ الگ بحث کروں گا۔

۱۔ اصل اسلامی نصب العین کیا ہے؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

۲- اس کی طرف پیش قدمی کا سیدھا راستہ کون سا ہے؟

۳- اس راستہ میں جو مشکلات نظر آتی ہیں وہ کیا ہیں؟

۴- ان مشکلات کو دیکھ کر کہ پھیر کے راستے کون کون سے اختیار کیے جا رہے ہیں؟

۵- ان مختلف راستوں میں غلطی کیا ہے اور یہ اصل مقصود تک کیوں نہیں پہنچا سکتے؟

۶- مشکلات کی حقیقی نوعیت کیا ہے اور وہ کس طرح دور ہو سکتی ہیں؟

یہ سوالات ہیں جن پر مجھے اس مضمون میں مختصراً بحث کرنی ہے۔

۱- اسلامی نصب العین

پہلے سوال کا جواب قرآن مجید میں جو کچھ دیا گیا ہے وہ یہ ہے:۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

(التوبہ۔ آیت ۳۳)

"وہی ہے (یعنی اللہ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ یہ کام مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔"

اس آیت میں اَلْھُدٰی (ہدایت) سے مراد دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ انفرادی برتاؤ، خاندانی نظام، سوسائٹی کی ترکیب، معاشی معاملات، ملکی انتظام، سیاسی حکمتِ عملی، بین الاقوامی تعلقات، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسانی زندگی کے لیے صحیح رویّہ کیا ہونا چاہیے، یہ چیز اللہ نے اپنے رسول کو بتا کر بھیجا ہے۔

دوسری چیز جو اللہ کا رسول لے کر آیا ہے وہ دینِ حق ہے۔ دین کے معنی اطاعت کے ہیں۔ کیش اور مذہب کے لیے جو دین کا لفظ استعمال ہوتا ہے، یہ اس کا اصل مفہوم نہیں ہے بلکہ اس کو دین اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں بھی انسان خیال و

عمل کے ایک خاص سسٹم کی اطاعت کرتا ہے۔ دراصل "دین" کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانۂ حال میں "اسٹیٹ" کے معنی ہیں۔ لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کرنا، یہ "اسٹیٹ" ہے۔ یہی "دین" کا مفہوم بھی ہے۔ اور "دین حق" یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی اور تمام مخلوقات کی بندگی و اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اُسی کی بندگی و اطاعت اختیار کرے۔ پس درحقیقت اللہ کا رسول اپنے بھیجنے والے کی طرف سے ایک ایسے "اسٹیٹ" کا نظام لے کر آیا ہے جس میں نہ تو انسان کی خود اختیاری کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ انسان پر انسان کی حاکمیت کے لیے کوئی مقام، بلکہ حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ جو کچھ بھی ہے صرف اللہ کے لیے ہے[1]۔

---

[1] اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کے سمجھنے میں بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی شخص کی نظر جدید نظریۂ ریاست (Theory of State) پر نہ ہو اس کے لیے اس مضمون کا سمجھنا مشکل ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسٹیٹ محض اس انتظامی مشینری کا نام نہیں ہے جو اندرونی نظمِ مملکت کا تحفظ اور بیرونی حملوں کی مدافعت کرتی ہے، بلکہ آج کل کا اسٹیٹ درحقیقت پوری انسانی زندگی کا ٹھیکہ اُسی طرح اعلان کرتا ہے جس طرح مذہب کرتا ہے۔ اشتراکی اسٹیٹ ہو یا فاشستی یا جمہوری، ہر ایک کی بنیاد میں ایک خاص مابعد الطبیعی نظریہ ہے، ایک خاص تصورِ کائنات ہے، ایک خاص تصورِ انسان ہے، ایک خاص فلسفۂ اخلاق اور ایک خاص اجتماعی فلسفہ ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک اپنے مخصوص فلسفہ کے لحاظ سے ایک مقتدرِ اعلیٰ کا تعین کرتا ہے (مثلاً قوم یا باشندگانِ ملک یا کمیونٹی) جس کی نیابت و خلافت کسی ڈکٹیٹر، یا پارلیمنٹ یا پارٹی کے سپرد ہوتی ہے۔ پھر اسٹیٹ کے حدود میں رہنے والے تمام افراد سے اس مقتدرِ اعلیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنے اور اس کی غیر محدود اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ افراد کی زندگی اور بحیثیت مجموعی سوسائٹی کی زندگی کا کوئی شعبہ اسٹیٹ کی گرفت سے باہر نہیں ہوتا۔ اسٹیٹ ہی اپنے نظریات کے مطابق ان کی تعلیم اور تعمیر سیرت کا ذمہ لیتا ہے، اسٹیٹ ہی اپنے فلسفۂ اخلاق کے مطابق ان کے (باقی صفحہ ۱۴۴ پر)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر رسول کے بھیجنے کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اُس نظامِ اطاعت (دین) اور اُس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۳ سے) لیے اخلاقی معیار مقرر کرتا ہے۔ اسٹیٹ ہی ان کی زندگی کے لیے قوانین وضع کرتا ہے اور حلال و حرام کے حدود مقرر کرتا ہے۔ اور اسٹیٹ ہی یہ طے کرتا ہے کہ وہ اپنی سعی و جہد کن راہوں میں صرف کریں اور کن میں نہ کریں۔ اگرچہ اسٹیٹ کی یہی حقیقت ہر زمانہ میں تھی اور اسی بنا پر کہا گیا تھا کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ، مگر پہلے اس حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا اور اب یہ بالکل کھل کر سامنے آگئی ہے اور تمام دنیا میں یہی نظریۂ ریاست مسلّم ہو چکا ہے۔

اب خود دیکھیے کہ دین اس کے سوا اور کس چیز کا نام ہے؟ ایک مابعد الطبیعی عقیدہ، ایک مقتدرِ اعلیٰ کا تصور جس سے بالاتر کوئی اقتدار (Authority) نہ ہو، اُس مقتدرِ اعلیٰ کی حاکمیت تسلیم کرنا، اور اپنے آپ کو اُس کی اطاعت میں دے دینا، ایک فلسفۂ اخلاق و فلسفۂ اجتماع (Social Philosophy) جس پر زندگی کا پورا نظام قائم ہو، ایک ہمہ گیر قانون جو تمام معاملاتِ زندگی کا احاطہ کر لے، انہی چیزوں کے مجموعہ کا نام تو دین ہے۔ اسی بنا پر خود آج کل کے مغربی فلاسفہ و مفکرین بھی یہ کہنے لگے ہیں کہ موجودہ دور کے اسٹیٹ نے خدا اور مذہب کی جگہ لے لی ہے۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف اس حیثیت سے ہے کہ جو شخص ان ریاستوں میں سے کسی کی اطاعت کرتا ہے اور اسی کی اطاعت کے برحق ہونے کا اعتقاد بھی رکھتا ہے وہ مومن بغیر اللہ و مسلم لغیر اللہ ہے، اور جو اِن کے برحق ہونے کا منکر اور اللہ کا معتقد ہے مگر اِن کی اطاعت پر راضی ہے وہ مومن باللہ و مسلم لغیر اللہ ہے۔ بخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام جو دعوت لے کر آئے تھے وہ یہ تھی کہ لوگ مومن باللہ اور مسلم للہ ہو جائیں۔ اللہ ہی کو مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کریں، اسی کی اطاعت قبول کریں اور ان کی پوری زندگی پر وہی ہمہ گیر ضابطۂ اخلاق و قانون محیط ہو جو اللہ نے مقرر کیا ہے۔

اس چیز کو میں جن الفاظ میں بیان کرتا ہوں، بلاشبہ وہ متقدمین کے ہاں کہیں نہ ملیں گے، کیونکہ اُس وقت یہ الفاظ اِن معانی کے ساتھ مستعمل نہ ہوتے تھے۔ مگر انصاف کیجیے اور دیکھیے کہ جس حقیقت کو میں بیان کر رہا ہوں، کیا وہی قرآن میں بیان نہیں ہوئی ہے اور کیا اسی کو تمام انبیاء بیان نہیں کرتے چلے آ رہے ہیں؟ افسوس یہ ہے کہ لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر (باقی صفحہ ۱۲۵ پر)

قانونِ حیات (اَلْھُدیٰ) کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے۔ پوری جنسِ دین سے کیا مراد ہے؟ دنیا میں انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر جن جن صورتوں سے کسی کی اطاعت کرتا ہے وہ سب "جنسِ دین" کی مختلف انواع ہیں۔ بیٹے کا والدین کی اطاعت کرنا، بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا، نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا، ماتحت کا افسر کی اطاعت کرنا، رعیت کا حکومت کی اطاعت کرنا، پیروؤں کا پیشواؤں اور لیڈروں کی اطاعت کرنا، یہ اور ایسی ہی بے شمار اطاعتیں بحیثیتِ مجموعی ایک نظامِ اطاعت بناتی ہیں اور اللہ کی طرف سے رسول کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پورا نظامِ اطاعت اپنے تمام اجزا سمیت ایک بڑی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۴ سے) سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تمام انبیا نے یہی کہا ہے کہ اللہ ہی کو الٰہ اور رب (یعنی ہر حیثیت سے مقتدرِ اعلیٰ) تسلیم کرو، اسی کی بندگی اختیار کرو اور جو ضابطۂ اخلاق و قانون (نظامِ شریعت) ہم اس کی طرف سے لے کر آتے ہیں اسی کی پیروی کرو۔ اور میں نے اسٹیٹ کی جو تعریف بیان کی ہے اس کو سامنے رکھ کر دیکھیے، انبیاء علیہم السلام نے اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا عقیدہ، انسان کی طرف سے اس کی تسلیم و اطاعت، اور انسانی زندگی پر شریعتِ الٰہی کے نفاذ کا مطالبہ جو پیش کیا تھا وہ ایک الٰہی اسٹیٹ یا حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی دعوت کے سوا اور کیا تھا؟ اگر معترضین اس کے قائل نہیں ہیں تو وہ مجھے بتائیں کہ انبیاء آخر یہ شریعتیں لے کر کیوں آتے تھے؟ یہ حرام و حلال کے حدود کس لیے تھے؟ یہ دیوانی و فوجداری کے قوانین کیوں انہوں نے پیش کیے تھے؟ یہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (المائدہ-۴۵) اور فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (البقرہ-۲۵۶) اور اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (یوسف-۴۰) کا اعلان کیوں کیا جاتا تھا؟ اور ہر نبی یہ کیوں کہتا تھا کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ؟ "اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"۔ کیا یہ شریعتیں اس حیثیت سے آتی تھیں کہ یہ بھی برحق ہوں اور انسانی ساخت کے قوانین بھی برحق ہوں اور انسان کے لیے یکساں جائز ہو کہ چاہے ان کی پیروی کرے اور چاہے اُن کی؟ (ترجمان القرآن، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۴۱ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

اطاعت اور ایک بڑے قانون کے ماتحت ہو جاتے، تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں، اُن سب کو منضبط (Regulate) کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو، اور اِس بڑی اطاعت اور اس ضابطۂ قانون کی حدود سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ رہے۔

یہ رسول کا مشن ہے اور رسول اِس مشن کو پورا کرنے پر مامور ہے، خواہ شرک کرنے والے اس پر کتنی ہی ناک بھوں چڑھائیں۔ شرک کرنے والے کون ہیں؟ وہ سب لوگ جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات (یعنی خدا کی اطاعت سے آزاد) اطاعتیں شریک کرتے ہیں۔ جہاں تک اللہ کے قانونِ طبیعی (Law of Nature) کا تعلق ہے، ہر انسان طوعاً و کرہاً اس کی اطاعت کر رہا ہے کیونکہ اس کے بغیر تو اس کے لیے کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انسان کے دائرۂ اختیار کا تعلق ہے، اِس دائرے میں بعض انسان تو بالکل ہی غیر اللہ کے مطیع بن جاتے ہیں اور بعض انسان اپنی زندگی کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے کسی حصّہ میں خدا کے بھیجے ہوئے قانونِ اخلاقی (شریعت) کی اطاعت کرتے ہیں اور کسی دوسرے حصّے میں اپنے نفس یا دوسروں کی اطاعت بجالاتے ہیں۔ اِسی چیز کا نام اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری اطاعتوں کو شریک کرنا ہے، اور جو لوگ شرک کی ان مختلف صورتوں میں مبتلا ہیں، ان کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے کہ اپنی فطری اطاعت کی طرح اپنی اختیاری اطاعت و بندگی کو بھی بالکلیہ اللہ کے لیے خالص کر دیں۔ خواہ نادانی کے سبب سے، یا اخلاقی کمزوری کے سبب سے، بہرحال وہ شرک پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن اللہ کے رسول پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی مزاحمت کے باوجود اپنے مشن کو پورا کرے۔

۲۔ اس نصب العین تک پہنچنے کا سیدھا راستہ

یہ ہے اسلامی نصب العین، اور اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے راہِ راست وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو "الہدیٰ" اور "دینِ حق" کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی و

اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں، اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنا لیں، ان کا ایک مضبوط جتھا بن جائے۔ پھر یہ جتھا تمام ان اخلاقی، علمی اور مادی ذرائع سے جو اس کے امکان میں ہوں، دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے جہادِ کبیر کرے، یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بل پر قائم ہیں ان سب کا زور ٹوٹ جائے اور پورے نظامِ اطاعت پر "الہدیٰ" اور "دینِ حق" غالب آ جائے۔

اس راہِ راست کا ہر جُز قابلِ غور ہے۔

پہلا جُز یہ ہے کہ انسانوں کو بالعموم اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ یہ دعوت عام ہونی چاہیے، ہر وقت جاری رہنی چاہیے، اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق باتوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے۔ قوموں اور نسلوں اور ملکوں کے باہمی جھگڑے، خود اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی بحثیں، غیر الٰہی نظامات میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، یا کسی ایسے نظامِ فاسد کی خود غرضانہ حمایت کرنا، یا کسی نظامِ فاسد میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنا، یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ "الہدیٰ" اور "دینِ حق" کے ساتھ میل نہیں کھاتیں بلکہ صریح طور پر اس کے منافی اور اس کے لیے معزت رساں ہیں۔ پس جب کسی شخص یا گروہ کو دعوتِ حق کی خدمت انجام دینی ہو تو اسے ان تمام جھگڑوں اور بحثوں سے الگ ہو جانا چاہیے اور اپنی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے غیر متعلق اور بے جوڑ قضیے کو شامل نہ کرنا چاہیے۔

دوسرا جُز یہ ہے کہ جتھا صرف اُن لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں، جو دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ واقعی شریک کرنا چھوڑ دیں اور حقیقت میں اللہ کے قانون کو اپنا قانونِ زندگی بنا لیں۔ رہے دوسرے لوگ جو اس طرزِ خیال یا اس طرزِ زندگی کے محض معتقد ہوں، یا اس سے ہمدردی رکھتے ہوں، تو وہ مجاہدہ کرنے والے جتھے کے لیے دکیا معنی،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کارکن بھی نہیں بن سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو جس درجہ میں بھی اس کا ہمدرد یا بیرونی معاون بن جائے بسا غنیمت ہے۔ مگر ارکان اور ہمدردوں کے درمیان جو حقیقی فرق و امتیاز ہے اسے کسی حال میں بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

تیسرا جزء یہ ہے کہ براہِ راست غیر الٰہی نظامِ اطاعت پر حملہ کیا جائے۔ تمام کوششوں کا مقصود صرف اس ایک بات کو بنایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو، اور اس کے سوا کسی دوسری چیز کو مقصود بنا کر اس کے پیچھے قوتیں ضائع نہ کی جائیں۔[1]

---

[1] بعض لوگ سرے سے اس بات ہی کا انکار کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت قائم کرنا نبی کے مقاصدِ بعثت میں سے ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ عجیب و غریب بات بھی کہتے ہیں کہ "جب نبی کوئی پیغام لے کر آتا ہے اور اس کے مخاطبینِ اوّلین کا کوئی گروہ اس پیغام کو قبول کرتا ہے تو ان کو اپنی حکومت قائم کرنی پڑتی ہے اور وہ اپنی حکومت اسلامی طریقہ پر قائم کرتے ہیں۔ مگر اس حکومت کا قیام ایک ضمنی بات ہے۔ نبی کی بعثت کا اصل مقصد نہیں ہے"۔ سوال یہ ہے کہ آخر نبی وہ کس قسم کا پیغام لاتا ہے جس کے قبول کرنے والوں کو اپنی حکومت ضرور قائم کرنی پڑتی ہے؟ اگر نبی کا پیغام صرف یہ ہے کہ اللہ کی پوجا کرو تو اس پیغام کے لیے اپنی حکومت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ پھر اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہ "حکومت اسلامی طریقہ پر قائم کرتے ہیں"۔ اگر نبی کوئی نظامِ حکومت قائم کرنے نہ آیا تھا، نہ اس نے کوئی نظام پیش کیا، نہ وہ نظامِ حکومت اُس کے پیغام کا کوئی جز تھا تو یہ "اسلامی طریقہ کی حکومت" کہاں سے آگئی؟ اور اگر ایک نظامِ حکومت بھی اُس نے پیش کیا تھا اور وہ اس کے پیغام کا ایک جز تھا تو اس کا قیام مقصدِ بعثت سے خارج اور ایک ضمنی چیز کیسے ہو گیا؟ کیا اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو جو پیغام دیتا ہے اس کا کوئی حصہ اختیاری (Optional) بھی ہوتا ہے؟ یا اُسے محض ضمیمہ کے طور پر ساتھ لگا دیا جاتا ہے کہ جی چاہے تو اس کے لیے کوشش کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے؟ پھر اگر نبی کوئی نظامِ حکومت پیش کرتا ہے تو آیا اُس کی حیثیت یہ ہوتی ہے کہ یہ نظام بھی برحق ہے اور اس کے خلاف کوئی دوسرا نظام ہو تو وہ بھی برحق؟ یا اس کی یہ حیثیت ہوتی ہے کہ یہی ایک برحق نظامِ حکومت ہے اور اس کے خلاف جو نظام ہے وہ باطل ہے؟ اگر آپ پہلی بات کے قائل ہیں (باقی صفحہ ۱۲۹ پر)

۳۔ مشکلات

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی مستقل سیاسی جماعتیں ہیں، قریب قریب اُن سب کا دعویٰ یہی ہے کہ ہمارا نصب العین اسلامی نصب العین ہی ہے مگر ان سب نے اُس راہِ راست کو چھوڑ دیا ہے جس کی تشریح ابھی میں نے بیان کی ہے۔ وہ نہ تو "الھدیٰ" اور "دینِ حق" کی خالص، بے آمیز دعوتِ عام دیتی ہیں، نہ اُس پارٹی کی تشکیل کرتی ہیں جس کی قیادت و رکنیت صرف اُن لوگوں تک محدود ہو جو واقعی اپنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوں، اور نہ وہ غیر متعلق مقاصد کو چھوڑ کر صرف اُس ایک مقصد کو اپنی کوششوں کا ہدف بناتی ہیں جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے۔ راہِ راست کے اِن تینوں اجزاء سے یہ سب جماعتیں منحرف ہیں۔

اِس انحراف نے مختلف جماعتوں کے مسلک میں کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں؟ اس کی تفصیل تو میں بعد میں بیان کروں گا۔ پہلے میں اِس انحراف کا سبب بتا دینا چاہتا ہوں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اِن لوگوں کو اصل اِسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیشقدمی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۸ سے) تو گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلام کی حکومت اور کفر کی حکومت دونوں یکساں ہیں۔ اور اگر آپ دوسری بات کے قائل ہیں تو براہِ کرم اچھی طرح غور کر کے بتائیے کہ حکومتِ اسلام اور حکومتِ کفر کے درمیان بنیادی فرق کیا ہے اور ایک کے برحق اور دوسرے کے باطل ہونے کی توجیہہ آپ کس طرح کریں گے؟ کاش اِن باتوں پر غور کیا گیا ہوتا تو سمجھ میں خود یہ بات آجاتی کہ حکومتِ اسلامی کا بنیادی نظریہ اِسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور یہ چیز ضمنی نہیں ہے بلکہ اساسی اہمیت رکھتی ہے۔ لا الٰہ کی نفی میں حاکمیتِ غیر اللہ کا انکار اور اِلّا اللہ کے اثبات ہی میں حاکمیتِ اللہ کا اقرار شامل ہے اور یہی بُنیاد ہے اِسلامی حکومت کی۔

(ترجمان القرآن۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۴۱ء)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کرنے میں تین بڑی مشکلات نظر آتی ہیں جن کا کوئی حل اِن کی سمجھ میں نہیں آتا۔

(۱) سب سے پہلی مشکل جو ان کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ "اُمیدِ الٰہی" اور "دینِ حق" کی طرف دعوتِ عام کا نتیجہ خیز اور کامیاب ہونا موجودہ حالات میں ان کو محال نظر آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دوسری تحریکیں تو محض سیاسی، تمدنی اور معاشی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں اور جن لوگوں کو اُن کا تجویز کردہ حل اپیل کرتا ہے وہ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کیے بغیر ان تحریکوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام محض دُنیوی مسائل کا حل پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد کا ایک نظام اور عبادات اور قوانینِ شرعیہ کا ایک ضابطہ بھی پیش کرتا ہے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ لوگ اپنا مذہب اور اپنی قومیت تبدیل کر دیں۔ پھر یہ کیسے اُمید کی جا سکتی ہے کہ اسلام کی دعوتِ عام اُس طرح پھیل سکے گی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں؟

(۲) دوسری مشکل جو انہیں اِس راستہ میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف لوگوں میں شدید تعصبات پھیلے ہوتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دوسری تحریکوں کا پھیلنا آسان ہے کیونکہ ان کے خلاف تعصبات موجود نہیں ہیں، مگر اسلام کا پھیلنا مشکل ہے کیونکہ اس کا نام سنتے ہی ماضی اور حال کے تعصبات کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

(۳) تیسری مشکل اُن کی نگاہ میں یہ ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی ایک قوم یہاں موجود ہے جو "قومیت" کے اعتبار سے تو "مسلمان" ہے، مگر اس کا اخلاقی مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے کہ وہ اسلامی نصب العین کے لیے جدّوجہد کر سکے۔ اِس قوم کو لے کر اُس راستہ پر چلنا چاہیں تو چل نہیں سکتے۔ اِس کو چھوڑ کر چلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور پھر یہ سوال بھی دماغ کو پریشان کرتا ہے کہ اگر تمام مقاصد کو نظر انداز کر کے صرف ایک حکومتِ الٰہی کے مقصد پر توجہات مرکوز کر دی جائیں تو آخر موجودہ سیاسی حالات اور آئندہ کے دستوری تغیرات میں "مسلمانوں" کے قومی مفاد کا کیا حشر ہوگا۔

۴۔ انحراف کی راہیں

یہی تین مشکلات ہیں جن کو اس راہ میں حائل دیکھ کر لوگ دائیں اور بائیں رُخ پر راستہ کترا کر نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جزئیات کے اعتبار سے مختلف لوگوں کے نظریات اور عملی طریقوں میں جو اختلافات ہیں اُن کو نظرانداز کر کے بڑی اور اصولی تقسیم اگر کی جائے تو یہ صرف تین گروہوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔

ایک وہ گروہ جو کہتا ہے کہ پہلے ہمیں ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے ساتھ موافقت کر کے اِس ملک کو انگریزی اقتدار سے آزاد کرا لینا چاہیئے تاکہ یہاں ایک مشترک جمہوری اسٹیٹ قائم ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم بتدریج اُس اسٹیٹ کو اِسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کرنے کے لیے کوشش کریں گے۔

دوسرا وہ گروہ جس کا خیال ہے کہ پہلے انگریزی اقتدار کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہمیں مستقل ہندو اکثریت کے تسلّط کا سدّباب کرنا چاہیئے، اور ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ اس ملک میں ایک جمہوری اسٹیٹ کے بجائے دو اسٹیٹ قائم ہوں۔ ایک وہ اسٹیٹ جس میں مسلم اکثریت کی وجہ سے اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے اور دوسرا وہ اسٹیٹ جس میں ہندو اکثریت کی وجہ سے اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں جائے مگر زیادہ سے زیادہ جو آئینی تحفظات ممکن ہیں ان کے ذریعہ سے مسلمانوں کی پوزیشن محفوظ ہو جائے۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد ہم مسلم اکثریت والے اسٹیٹ کو بتدریج اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کریں گے اور پھر ہندو اکثریت والے اسٹیٹ میں تغیر و اصلاح کی کوشش کریں گے۔

تیسرا گروہ جو موجودہ حالات میں دعوتِ عام اور ایک انقلابی پارٹی کی تشکیل کو آسان بنانے کے لیے اسلام کو ایک دوسرے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، تاکہ وہ اُن لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہو جائے جو اسلامی عقائد اور عبادات اور نظامِ شریعت کی بندشوں سے گھبراتے ہیں۔ اِس گروہ نے اگرچہ کوئی مستقل جماعتی صورت اختیار نہیں کی ہے، مگر مجھے معلوم

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ اس طرزِ خیال کے لوگ ایک اچھی خاصی تعداد میں پیدا ہو گئے ہیں اور اُن کی تجویزیں اِس وقت حالتِ جنینی سے گزر رہی ہیں۔

۵۔ منحرف راستوں کی غلطی

اب میں ان میں سے ایک ایک گروہ کے طریقہ پر الگ الگ تنقید کر کے بتاؤں گا کہ ان طریقوں میں غلطی کیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے اسلام کی راہِ راست سے انحراف کس طرح کیا ہے، اور ان پھیر کے راستوں سے اصل اسلامی نصب العین تک پہنچنا ابداً غیر ممکن الوقوع کیوں ہے۔

"آزادیٔ ہند" کو مقدم رکھنے والے

پہلا گروہ زیادہ تر علماء و مذہبی خیالات کے لوگوں پر مشتمل ہے اور بالعموم اس گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کی بہ نسبت زیادہ مذہبی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے انحراف پر مجھ کو سب سے زیادہ افسوس ہے۔ ان حضرات نے مذکورۂ بالا مشکلات سے خوف زدہ ہو کر یہ خیال قائم کر لیا کہ موجودہ حالات میں اصل اسلامی نصب العین کی طرف براہِ راست پیش قدمی نہیں کی جا سکتی، اس لیے انہوں نے اپنی کوششوں کا مقصود یہ ٹھیرایا کہ "ہندوستان انگریزی اقتدار سے آزاد ہو جائے"۔ مقصود بدل جانے سے لامحالہ راستہ بھی بدل گیا۔ اسلام کی راہِ راست کے تین اجزا جو میں نے بیان کیے ہیں، ان کا راستہ ہر جُز میں اُس سے مختلف ہے،

(۱) دعوت کے باب میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کی طرف بلایا جائے۔ مگر یہ ہندوستان کے باشندوں کو اس طرف بلاتے ہیں کہ تم خود مالک الملک بنو۔ یہ غیر الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی نہیں کرتے بلکہ صرف انگریزی اقتدارِ اعلیٰ کی نفی کرتے ہیں۔ اور یہ الٰہی اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات بھی نہیں کرتے بلکہ اُس کی جگہ باشندگانِ مُلک کی خود اختیاری اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ کا اثبات کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرک ہونے کی حیثیت سے انگریزی اقتدارِ اعلیٰ اور جمہوری اقتدارِ اعلیٰ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کی دعوت سراسر غیر اسلامی بلکہ مخالفِ اسلام دعوت ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اِن کے نزدیک انگریزی اقتدار کے مقابلہ میں جمہورِ اہلِ ہند کا اختیار، اور انگریزی شریعت کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کی قانون سازی قابلِ ترجیح ہے، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے دونوں یکساں بغاوت، یکساں کُفر اور یکساں طُغیان و معصیت ہیں۔

پھر یہ انگریز اور ہندوستانی کے درمیان قومی و وطنی عداوت و تعصب کی آگ بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں، حالانکہ اسلام کی دعوتِ عام کے راستہ میں یہ رکاوٹ ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انگریز اور ہندوستانی دونوں انسان ہیں۔ وہ دونوں کو یکساں اپنی دعوت کا مخاطب بناتا ہے۔ اس کا جھگڑا انگریز سے اِس بات پر نہیں ہے کہ وہ ایک ملک کا باشندہ ہو کر دوسرے ملک پر حکومت کیوں کرتا ہے؟ بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کی اطاعت کیوں نہیں تسلیم کرتا؟ بعینہٖ اسی بات پر اس کا جھگڑا ہندوستانی سے بھی ہے۔ وہ دونوں کو ایک ہی بات کی طرف بُلاتا ہے۔ ایک کا حامی بن کر دوسرے سے لڑنا اس کی حیثیت کے منافی ہے۔[1] کیونکہ اگر وہ ہندوستانی اور انگریز کے وطنی و قومی جھگڑے میں ایک کا طرفدار اور دوسرے کا مخالف بن جائے تو انگریز کے دل کا دروازہ اس کی دعوت کے لیے بند ہو جائے گا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایک طرف اسلام کے داعی بنتے ہیں اور دوسری طرف اس وطنی اور قومی جھگڑے میں فریق بھی بنتے ہیں وہ دراصل اسلام کے مفاد کو ہندوستانیت کے مفاد پر قربان کرتے ہیں۔

اِن تمام بنیادی غلطیوں کے ساتھ یہ حضرات کبھی کبھی اسلام کی تبلیغ بھی فرمایا کرتے ہیں۔

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ایک قوم دوسری قوم پر ظلم کرے یا اس کے حقوق تلف کرے تو اسلام مظلوم قوم کی حمایت نہ کرے گا۔ بلکہ درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ قومیت اور وطنیت کی بنیاد پر دونوں قوموں میں جو نزاع ہو گی، اسلام اس میں کوئی حصہ نہ لے گا۔ وہ ظالم کو ملامت کرے گا، نہ اس لیے کہ وہ فلاں قوم کا آدمی ہے، بلکہ اس لیے کہ وہ ظالم ہے۔ اور اسی طرح وہ مظلوم کی حمایت بھی اس حیثیت سے نہ کرے گا کہ وہ فلاں قوم سے تعلق رکھتا ہے بلکہ صرف اس لیے کہ وہ مظلوم ہے۔ (قدیم)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مگر ایسی تبلیغ کبھی مؤثر نہیں ہو سکتی۔ ایک ساز سے دو بالکل مختلف آوازیں سُن کر اور ایک زبان سے دو قطعی متضاد باتیں سماعت کر کے آخر کون متاثر ہو سکتا ہے؟

(۲) تشکیل جماعت کے باب میں یہ حضرات اس سے بھی زیادہ خلط ملط ہیں۔ اوّل تو دعوت کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے خود ہی جماعت کی ترکیب اور اجزائے ترکیبی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ پھر "مسلمان قوم" کے تخیل نے پریشان خیالی کے لیے ایک اور وجہ بھی پیدا کر دی ہے۔ ان اسباب سے یہ ہر قسم کے رطب و یابس آدمی اکٹھے کر لیتے ہیں، اور اُن آدمیوں کے اقوال و افعال میں بیک وقت بیسیوں قسم کی متضاد باتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک متحد المزاج نظریہ کی حمایت کے لیے آپ اُٹھیں تو لامحالہ آپ اپنی پارٹی کے لیے انہی آدمیوں کا انتخاب کریں گے جو یکسوئی کے ساتھ اس خاص نظریہ کے متبع ہوں۔ بخلاف اس کے ایک مخلوط اور غیر متعین مزاج رکھنے والے نظریہ کو لے کر جب آپ اُٹھیں گے تو آپ کا معیارِ انتخاب... اکثر اُن قیود سے آزاد ہو جائے گا جو متحد المزاج نظریہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ کچھ مدت ہوئی مجھے ایک مجلس میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا جہاں ہندوستان کی ایک بہت بڑی ذمہ دار جمعیت کی مقامی شاخ کو منظم کرنے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کی بحث و تمحیص کے بعد جو بات قرار پائی وہ یہ تھی کہ رکنیت کے فارم طبع کرا لیے جائیں اور پندرہ دن کے اندر زیادہ سے زیادہ ممبر بھرتی کر کے ارکان کا ایک جلسۂ عام کر لیا جائے جس میں عہدداروں کا انتخاب ہو جائے۔ لیجیے، بس جمعیت کی شاخ منظم ہو گئی۔ اس طرح بھانت بھانت کے آدمی محض رکنیت کے فارموں پر دستخط کر کے اور چار آنہ سالانہ فیس ادا کر کے ان جماعتوں میں داخل ہو جاتے ہیں، پھر انہی آدمیوں کے ووٹوں سے منتخب ہو کر وہ لوگ برسرِ کار آتے ہیں جن کا کام رہنمائی و سربراہ کاری ہوتا ہے، اور ایسے ہی لوگوں کی متفقہ خواہشات سے پالیسیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ کیا کوئی شخص توقع کر سکتا ہے کہ جماعتی تشکیل کے اس طریقہ سے کبھی اسلامی نصب العین کی طرف بھی کوئی پیش قدمی کی جا سکتی ہے؟

(۳) اسی طرح تیسرے جزء میں بھی ان کا طریقہ اسلام کی راہِ راست سے ہٹا ہوا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا اسلام براہِ راست غیر اسلامی نظامِ اطاعت پر حملہ کرتا ہے اور

اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام مساعی کو حاکمیتِ رب العالمین کے قیام و اثبات پر مرکوز کر دیا جاتے۔ لیکن اس کے برعکس یہ لوگ اپنی سعی و جہد کا رُخ برطانوی نظامِ اطاعت کی تخریب اور حاکمیتِ عوام کے قیام کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ یہ صریح انحراف ہے صراطِ مستقیم سے۔ اِس انحراف پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ برطانوی نظامِ اطاعت اسلامی نصب العین کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے، ہم تنہا اِس رکاوٹ کو دُور نہیں کر سکتے، اس لیے پہلے دوسروں کی مدد سے اس کو دُور کر لیں، پھر اصل منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے راستہ آسان ہو جائے گا۔ مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ راستہ آسان کیسے ہو جائے گا؟ ظاہر بات ہے کہ ایک نظامِ اطاعت یا دین کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا نظامِ اطاعت یا دین کبھی قائم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ نفوسِ انسانی میں پہلے نظام کی تخریب اور دوسرے نظام کی تعمیر کا خیال اور ارادہ کمال درجہ قوت کے ساتھ مستحکم نہ کر دیا جائے۔ اگر ہندوستان کے موجودہ انگریزی نظامِ اطاعت کی جگہ آپ جمہوری نظامِ اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب صرف اسی طرح ممکن ہے کہ آپ باشندگانِ ہند کے دلوں میں حاکمیتِ انگریز کے بجائے خود اپنی حاکمیت کے برحق ہونے کا تخیل اور عملاً مالک الملک بن جانے کا عزم پوری شدت کے ساتھ پیدا کر دیں۔ برعکس اس کے اگر آپ ہندوستان میں الٰہی نظامِ اطاعت قائم کرنا چاہیں تو یہ انقلاب بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ عوام الناس کو خود اپنی حاکمیت سے دست بردار ہونے اور غیر اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنے پر آمادہ کریں اور اللہ کے مالک الملک ہونے کا عقیدہ ان کے دلوں میں اتنی قوت کے ساتھ بٹھائیں کہ وہ اُس کی حاکمیت کے آگے برضا و رغبت سر جھکا دیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کا آخری مقصد الٰہی نظامِ اطاعت کا قیام ہے وہ کس طرح بحالتِ ہوش و حواس اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ذریعہ کے طور پر یہ تدبیر اختیار کر سکتے ہیں کہ عوام الناس کے دل میں خود اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور ارادہ اتنی قوت کے ساتھ بٹھا دیں کہ اس کے زور سے دینِ انگریز کی مضبوط جمی ہوئی جڑیں اُکھڑ جائیں اور دینِ جمہور کی جڑیں زمین میں جگہ پکڑ لیں؟ جہاں عامۃ خلائق کے دلوں میں اپنی حاکمیت کا عقیدہ اور عزم اتنی قوت کے ساتھ جم گیا ہو کیا وہاں لوگوں کو خداوندِ عالم کے آگے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنی حاکمیت سے دست بردار ہو جانے پر آمادہ کرنا موجودہ انگریزی حاکمیت کی جڑیں اُکھاڑنے سے کچھ کم مشکل ہے ؟ کیا امریکہ، جاپان، جرمنی اور انگلستان جیسے اصطلاحاً "آزاد" ممالک میں حکومتِ الٰہی کا قیام اس سے کچھ کم دشوار ہے جتنا ہندوستان جیسے اصطلاحاً "غلام" ملک میں دشوار نظر آتا ہے ؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی ہی میں دیا جا سکتا ہے، تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ برطانوی اقتدار کی جگہ ہندوستانی اقتدار کا قیام آخر کس معنی میں حکومتِ الٰہی کے قیام کی طرف ایک گونہ پیش قدمی ہے ؟

تاہم اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ تدبیر عملاً کارگر ہو سکتی ہے تب بھی میں اس کے صحیح ہونے سے انکار کرتا ہوں ______ لازم نہیں کہ ہر تدبیر جو کارگر ہو وہ صحیح بھی ہو ______ دراصل یہ سخت ناپاک تدبیر ہے جسے اختیار کرنے کا خیال بھی ایک مسلمان دل میں نہیں لا سکتا۔ جو شخص درحقیقت پوری سچائی کے ساتھ اللہ کے مالک الملک ہونے پر ایمان رکھتا ہو وہ آخر کس دل سے یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اپنے ایمان کے خلاف عوام الناس میں اس عقیدے کی تبلیغ کرے کہ تم خود مالک الملک ہو ؟ جس شخص کا اعتقاد یہ ہو کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی صرف حدود اللہ کی پابند ہونی چاہیئے اور حکومت وہ ہونی چاہیئے جو اللہ کے سامنے جوابدہ ہو وہ کیونکر اپنی کوششوں کا مقصود یہ قرار دے سکتا ہے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی پر حدودِ جمہور کا تسلط قائم ہو اور حکومت جمہور کے سامنے جواب دہ ہو ؟ کس طرح ایک سچے آدمی کی زبان ایسے عقیدے کی اشاعت یا حمایت میں کھل سکتی ہے جس کو وہ فی الواقع باطل سمجھتا ہے ؟ اور کس طرح وہ اُس چیز کے قیام کی راہ میں جان و مال سے جہاد کر سکتا ہے جو اس کے اعتقاد میں حق نہیں بلکہ طاغوت ہے ؟

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا، یہ تو محض اس امر کا ثبوت ہے کہ اِن لوگوں کا راستہ اسلام کی راہِ راست سے منحرف ہے۔ رہی یہ بات کہ اس پھیر کے راستے سے یہ لوگ کبھی اسلام کے نصب العین تک نہیں پہنچ سکتے، تو اس دعوے پر میرے پاس یہ دلیل ہے کہ جن مشکلات سے خوفزدہ ہو کر انہوں نے یہ پھیر کی راہ اختیار کی ہے وہ ہندوستان کے انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے بعد بھی جوں کی توں قائم رہیں گی۔ اوپر میں نے مشکلات کی جو تشریح کی

ہے ان پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈال کر دیکھ لیجیے۔ کیا ان میں سے کوئی مشکل بھی آزاد ہندوستان کے دَور میں دُور ہو جائے گی؟ اگر نہیں تو جو لوگ آج اِن مشکلات کا مقابلہ کرنے کی حکمت اور ہمت نہ رکھنے کی وجہ سے راستہ کترا کر نکل رہے ہیں وہ کل بھی اِسی وجہ سے اصل مقصدِ اسلامی کی طرف براہِ راست پیش قدمی کرنے سے جی چرائیں گے۔ خوب جان لیجیے کہ اِس مقصد کی طرف جب بھی آپ اقدام کرنا چاہیں گے، بہر حال آپ کو اِن مشکلات سے سابقہ پیش آئے گا۔ جو لوگ اِن کا مقابلہ کرنے کی تدبیر اور عزم نہیں رکھتے وہ موجودہ حالات ہی میں نہیں بلکہ کسی حال میں بھی اِس طرف اِقدام نہیں کر سکتے۔ اور جن کے پاس تدبیر اور عزم دونوں موجود ہیں، اُن کے لیے کسی پھیر کے راستے پر چلنا تضیعِ وقت اور حماقت ہے۔ وہ تو اس پہاڑ کو کاٹ کر براہِ راست ہی اپنے مقصد کی طرف قدم بڑھائیں گے۔

پاکستانی خیال کے لوگ

دوسرا گروہ زیادہ تر اُس طبقہ پر مشتمل ہے جس نے تمام تر مغربی طرز پر ذہنی تربیت پائی ہے[1]۔ یہ لوگ سیاسی فکر تو مغربی مآخذ سے لیتے ہیں، مگر چونکہ موروثی طور پر اسلام کے حق میں ایک تعصب اِن کے اندر موجود ہے اور "مسلمان قوم" ہونے کا شعور ان کے اندر بیدار ہو گیا ہے اس لیے جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں "مسلمان قوم" کے لیے اسلام کے نام ہی سے کرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اقوال اور اعمال میں اسلامی اصطلاحات اور مغربی طرزِ فکر و عمل عجیب طریقہ سے خلط ملط ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس مضمون میں یہ موقع نہیں ہے کہ میں اس خلطِ مبحث کا تجزیہ کر کے تفصیل کے ساتھ اس مخلوطہ کے ایک ایک جزو کی اصل نوعیت کی نشان دہی کر سکوں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے میں صرف

---

[1] جس زمانے میں یہ مضمون لکھا گیا تھا اُس وقت تک علماء کا کوئی قابلِ ذکر گروہ اس طبقے کے ساتھ شامل نہیں ہوا تھا۔ بعد میں ایک اچھی خاصی تعداد اس میں شامل ہوئی، مگر اس کی پالیسی اور طرزِ عمل پر وہ کبھی اثر انداز نہ ہو سکی۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پہلے گروہ کی طرح اِس گروہ کا راستہ بھی راہِ راست کے تینوں اجزا سے منحرف ہے۔

(۱) پہلے دعوت کو لیجیے۔ ان کے ذمہ دار لیڈروں کی تقریریں، ان کی نمائندہ مجالس کی قرار دادیں، ان کے کارکنوں کی باتیں، ان کے اہلِ قلم کی تحریریں، سب کی سب اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ اِن کی دعوت اصل میں ایک قوم پرستانہ دعوت ہے، یعنی اِن کی پکار اسلام کے نصب العین کی طرف نہیں ہے، بلکہ اِس طرف ہے کہ اِن کی قوم متفق و متحد ہو کر ہندو قوم کے مقابلہ میں اپنے دنیوی مفاد کی حفاظت کرے۔ گویا جس طرح آزادی پسند لوگوں نے انگریزوں کو اپنا قومی حریف بنایا ہے اِسی طرح اِنہوں نے ہندوؤں کو اپنا قومی حریف بنا لیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اور "آزادی پسند" حضرات ایک سطح پر کھڑے ہیں۔ لیکن جس چیز نے اُن کی بہ نسبت اِن کی روش کو اسلام کے لیے اور زیادہ مضر بنا دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تو وطن اور وطنی مفاد کے نام پر لڑتے ہیں، مگر یہ اپنی قومی اور دُنیوی لڑائی میں بار بار اسلام اور مسلم کا نام لیتے ہیں جس کی وجہ سے اِسلام خواہ مخواہ ایک فریقِ جنگ بن کر رہ گیا ہے اور غیر مسلم قومیں اُس کو اپنا سیاسی اور معاشی حریف سمجھنے لگی ہیں۔ اس طرح اِنہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اسلام کی طرف دعوت دینے کے قابل نہیں رکھا ہے بلکہ اسلام کی اشاعت کے راستے میں اتنی بڑی رکاوٹ پیدا کر دی ہے کہ اگر دوسرے مسلمان بھی یہ کام کرنا چاہیں تو غیر مسلموں کے دلوں کو اسلام کے لیے مقفّل پائیں گے۔

اِس میں شک نہیں کہ اِس قوم پرستانہ دعوت کے ساتھ یہ لوگ کبھی کبھی اسلام کی خوبیاں اور اس کے اصولوں کی فضیلت بھی بیان کیا کرتے ہیں۔ مگر اوّل تو قوم پرستی کے پس منظر میں یہ چیز ایک اصولی دعوت کے بجائے محض ایک قومی تفاخر بن کر رہ جاتی ہے۔ اور مزید براں دعوتِ اسلام کے ساتھ جن دوسری باتوں کی یہ آمیزش کرتے ہیں وہ بالکل اس دعوت کی ضد ہیں۔ ایک طرف اسلامی نظامِ حکومت کی تبلیغ اور دوسری طرف اُن "مسلمان" ریاستوں اور حکومتوں کی حمایت جن کا نظام بالکل غیر اسلامی ہے،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک طرف اسلامی نظامِ معاشی کی تشریح اور دوسری طرف خود اپنی قوم کے قارونوں کی تائید و مدافعت، ایک طرف انسانی قانون سازی کا اصولی ابطال اور دوسری طرف خود قانون ساز مجالس میں اپنے حصّہ کا مطالبہ، ایک طرف حاکمیتِ ربّ العالمین کا اقرار و اثبات اور دوسری طرف حاکمیتِ جمہور کے اصول پر خود اپنی قومی حکومت کے قیام کی فکر، ایک طرف انسانیت کی نسلی، قومی اور وطنی تقسیم کا ابطال اور دوسری طرف ہر وقت قوم قوم کا شور اور خود قومیت ہی کے اصولوں پر دوسری قوموں سے جدال و کشمکش، ایک طرف بے غرضانہ حق پرستی کا دعویٰ اور دوسری طرف شب و روز اپنے دنیوی مفاد کا نوحہ و ماتم، ایک طرف اسلامی تہذیب و تمدّن پر فخر و ناز اور اس کی حفاظت کے لیے پُرشور لام بندی اور دوسری طرف اُسی تہذیب و تمدّن کے باغیوں اور قاتلوں کی سرداری و پیشوائی، یہ دونوں چیزیں آخر کس طرح ایک ساتھ نبھ سکتی ہیں؟ "منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن"۔ ایسی متضاد باتوں سے دنیا نے کب اثر قبول کیا ہے کہ آج ان سے اسلام کا جھنڈا زمین میں گڑ جانے کی اُمید کی جاتی ہے؟

(۲) اب دیکھیے کہ یہ اپنی جماعتی تشکیل کس ڈھنگ پر کرتے ہیں۔ اِن کا قاعدہ یہ ہے کہ یہ اُن سب لوگوں کو جو از روئے پیدائش مسلمان قوم سے تعلق رکھتے ہیں اپنی جماعت کی رکنیت کا بلاوا دیتے ہیں اور جو اس کو قبول کرلے اُسے ابتدائی رُکن بنا لیتے ہیں۔ پھر انہی ابتدائی ارکان کے ووٹوں سے ذمّہ دار کارکن اور عہدہ دار منتخب ہوتے ہیں اور انہی کی کثرتِ رائے سے تمام معاملات انجام دیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ صرف قومی تنظیم ہی کے لیے موزوں ہو سکتا ہے اور اس طریقہ سے جو نظام بنے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کرسکتا کہ ایک قوم کی خواہشات جیسی کچھ بھی ہوں اُن کے حصول کی کوشش کرے۔ رہی ایک اصولی تحریک، تو اس کو چلانے کے لیے یہ طریق جماعت سازی نہ صرف بے کار بلکہ مضر ہے۔ ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کرلینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول ہی پر ہوگا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہِ عظیم جس کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اِس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویّہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اُسے قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ اِن کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ اُمید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(۳) اس کے بعد اُس طریقہ کا جائزہ لیجیے جس سے یہ بزعمِ خود اسلامی نصب العین تک پہنچنے کی اُمید رکھتے ہیں۔ اِن کی تجویز یہ ہے کہ پہلے اُسی جمہوری دستور کے مطابق، جو انگریزی حکومت یہاں نافذ کرنا چاہتی ہے، مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے، پھر کوشش کی جائے گی کہ یہ قومی حکومت اِسلامی نظامِ حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے[1]۔ لیکن یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی "آزادیِ ہند" کو

---

[1] اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمّہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اِس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے پیشِ نظر ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصّہ دار ہوں، مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصّہ غالب ہو۔ بالفاظِ دیگر ان کو مطمئن کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ باقی رہا نظامِ حکومت تو وہ "پاکستان" میں بھی ویسا ہی ہوگا جیسا "ہندوستان" میں ہوگا۔ ان کے اس نصب العین پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہے، تو ذمّہ دار لیڈروں میں سے تو کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ البتہ جو لوگ پاکستانی حلقوں کی صفِ آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جن کی کوئی ذمّہ دارانہ حیثیت نہیں ہے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم اکثریت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائے گی تب ہم نظامِ حکومت بدلنے کی کوشش کریں گے۔ واضح رہے کہ یہ اُس وقت تک کی پوزیشن تھی جب یہ مضمون لکھا گیا تھا۔ (تجدید)

مقدم رکھنے والے حضرات کر رہے ہیں۔ اُن کی تجویز پر مجھے جو اعتراضات ہیں بعینہٖ وہی اعتراضات ان کی تجویز پر بھی ہیں۔ ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حاکمیتِ جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیتِ رب العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ جیسی مسلم اکثریت اس مجوزہ پاکستان میں ہے، ویسی ہی، بلکہ عددی حیثیت سے بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، عراق، ٹرکی اور مصر میں موجود ہے، اور وہاں اُس کو وہ "پاکستان" حاصل ہے جس کا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت کسی درجہ میں بھی حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں مددگار رہی ہے یا ہوتی نظر آتی ہے؟ مددگار ہونا تو درکنار، میں پوچھتا ہوں، کیا آپ وہاں حکومتِ الٰہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلاوطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں؟ اگر آپ وہاں کے حالات سے کچھ بھی واقف ہیں تو آپ اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ اور جب صورتِ حال یہ ہے تو آپ کو غور کرنا چاہیئے کہ آخر اسلامی انقلاب کے راستہ میں مسلمان قوموں کی ان آزاد حکومتوں کے سدِّ راہ ہونے کا سبب کیا ہے۔ اس معاملہ کی جتنی تحقیق آپ کریں گے جواب اس کے سوا کچھ نہ پائیں گے کہ دراصل اصطلاحاً و نسلاً مسلمان ہونا اور چیز ہے اور نظریۂ حیات و مقصدِ زندگی کا اسلامی ہونا بالکل ایک دوسری چیز۔ جو لوگ روح و اخلاق کے اعتبار سے مسلم نہ ہوں بلکہ محض اصطلاحی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہوں ان کو اگر بیرونی اثر و اقتدار سے کامل آزادی نصیب بھی ہو جائے، اور اگر ان کے جمہور کو خود اپنی پسند کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا پورا اختیار بھی حاصل ہو، تب بھی حکومتِ الٰہی وجود میں نہیں آسکتی۔ وہ اپنے دُنیوی مفاد کے پرستار ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان میں حق اور صداقت کے لیے اپنے مفاد کو قربان کرنے کی طاقت نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس جب کبھی ان کی اغراضِ دنیوی سے حق اور صداقت کا تصادم ہوتا ہے، وہ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ اُس طرف جاتے ہیں جس طرف ان کی اغراض پوری ہوتی ہیں۔ جہاں ایسے لوگوں کی اکثریت ہو وہاں کبھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ عام انتخاب میں ان کے ووٹوں سے وہ صالحین منتخب ہوں گے جو منہاجِ نبوت پر حکومت کرنے والے ہوں۔ جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں :

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے۔ اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہوگا۔ اسی طرح سوسائٹی اگر بگڑی ہوئی ہو تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہوکر برسرِ اقتدار آئیں گے جو اس سوسائٹی کی خواہشاتِ نفس سے سندِ قبولیت حاصل کر سکیں گے۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ اس کا نام حکومتِ الٰہی رکھنا اس پاک نام کو ذلیل کرنا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عوام کی اخلاقی و ذہنی تربیت کرکے، اُن کے نقطۂ نظر کو تبدیل کر کے اور ان کے نفسیات میں انقلاب برپا کرکے ایک جمہوری نظام کو الٰہی حکومت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اخلاقی و نفسیاتی انقلاب کے برپا کرنے میں کیا مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کچھ بھی مددگار ہوگی؟ کیا وہ لوگ جو موجودہ بگڑی ہوئی سوسائٹی کے مادی مفاد سے اپیل کرکے اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے ان سے آپ یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ حکومت کا ذریعہ، اس کے وسائل اور اس کے اختیارات کسی ایسی تحریک کی اعانت میں صرف کریں گے جس کا مقصد عوام کی ذہنیت تبدیل کرنا اور انہیں حکومتِ الٰہی کے لیے تیار کرنا ہو؟ اس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ لوگ اس انقلاب میں مدد دینے کے بجائے اُلٹی اس کی مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر عوام کے نفسیات میں تغیر واقع ہوگیا تو اُس بدلی ہوئی سوسائٹی میں ان کا چراغ نہ جل سکے گا۔ یہی نہیں اس سے زیادہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ نام کے مسلمان ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کفار کی بہ نسبت بہت زیادہ جسارت و بے باکی کے ساتھ ایسی ہر کوشش کو کچلیں گے اور ان کے نام اُن کے ظلم کی پردہ پوشی کے لیے کافی ہوں گے۔ جب صورتِ معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام

کی کوشش کرے جو ہر کا فرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اس کے مقصد کی راہ میں حائل ہو گی؟

تحریفِ دین کے مجوزین

اب تیسرے گروہ کو لیجیے۔ یہ لوگ مختلف قسم کی تجویزیں سوچ رہے ہیں۔ کوئی فکرِ اسلامی کے ساتھ غیر اسلامی افکار کا جوڑ لگا کر ایک نئی "خوش گوار" معجون بنانا چاہتا ہے۔ کوئی اس خیال میں ہے کہ "ہندوستانی اسلام" کا ایک نیا ایڈیشن نکالے۔ کوئی یہ چاہتا ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اس کے سیاسی و معاشی اصولوں کو لے لیا جائے اور ان کی بنیاد پر ایک ایسی سیاسی جماعت بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے عقائد، عبادات اور احکامِ شرعیہ کی پابندی لازم نہ ہو۔ یہ سب لوگ اپنے نزدیک نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ان طریقوں سے رفتہ رفتہ وہ "تنفر" دور ہو جائے گا جو اسلام کے خلاف طبیعتوں میں پیدا ہو گیا ہے، اور جب وہ بعضِ اسلام سے کسی حد تک مانوس ہو جائیں گے تو پورے اسلام سے مانوس ہونے میں زیادہ دیر نہ لگے گی۔

لیکن یہ سب خیالاتِ خام ہیں۔ نہ اصولی حیثیت سے ان کو صحیح کہا جا سکتا ہے اور نہ عملی حیثیت سے ہی ان کی کوئی قدر و قیمت ہے۔ میرے نزدیک ایسی تمام تجویزیں ضعفِ دل اور ضعفِ دماغ کا نتیجہ ہیں۔

اصولی حیثیت سے درحقیقت ہم اسلام میں کسی ردّ و بدل، کسی کمی و بیشی، اور کسی ترمیم و تشکیلِ جدید کے مجاز ہی نہیں ہیں۔ ہم اسلام کے مالک نہیں ہیں، اس کے صانع نہیں ہیں، اس کے شارع نہیں ہیں۔ اسلام ہمارا مال نہیں ہے کہ مارکیٹ میں جیسی طلب ہو اس کے مطابق اپنے اس مال کو بنا کر بازار میں لائیں۔ ہماری حیثیت صرف پیرو اور مبلغ کی ہے۔ مالک نے عقائد، عبادات اور احکام کا یہ پورا مجموعہ ہمیں دیا ہے تاکہ ہم خود اس کی پیروی کریں اور دوسروں تک اسے پہنچائیں۔ اس مجموعہ میں کوئی ترمیم کرنے کا، یا اس کی اصلی صورت کو بدل کر اس کی کوئی اور صورت بنانے کا ہم کو ہرگز کوئی حق نہیں پہنچتا۔ جس کو لینا ہے اُسے پورے مجموعہ کو لینا پڑے گا اور اُسی صورت میں لینا ہو گا جس میں مالک نے اسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دیا ہے۔ اور جو اُس کو اس حیثیتِ مجموعی اور اِس مقررہ صورت کے ساتھ نہ لینا چاہے اُس کی خوشامد کرنے اور اُسے کم و بیش پر راضی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام تو ایک حکم ہے خالق کی طرف سے مخلوق کی طرف۔ خالق کا کام مخلوق کی خوشامد کرنا اور اس کو راضی کرنا نہیں ہے۔ مخلوق کو دیا تو اس کا حکم، جیسا کہ وہ ہے، جوں کا توں ماننا پڑے گا۔ ورنہ وہ خود اپنا ہی کچھ بگاڑے گی، خالق کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گی۔ اسی لیے اللہ کی طرف سے اس کے جو رسول دنیا میں آئے انہوں نے پورے حکم کو لوگوں کے سامنے بعینہٖ پیش کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ چاہو اس کو لو اور چاہو رد کر دو، بہر حال تمہاری خواہشات کے مطابق اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا جائے گا۔ ٹھیک یہی پوزیشن رسول کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہماری بھی ہے۔

پھر یہ کتنی غیر معقول تجویز ہے کہ اسلام کے مجموعی نظام میں سے محض اُس کے معاشی و سیاسی اصولوں کو لے لیا جائے اور انہی کی بنیاد پر ایک پارٹی ایسی بنائی جائے جس میں شامل ہونے کے لیے توحید، آخرت، قرآن، رسالت، کسی چیز پر بھی ایمان لانے کی ضرورت نہ ہو اور نہ عبادات کی بجا آوری اور احکام شرعیہ کی پابندی ضروری ہو۔ کیا کوئی صاحبِ نظر آدمی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال کر سکتا ہے کہ کسی اجتماعی نظریہ اور لائحہ عمل کو اس کے بنیادی فلسفے، اس کے نظامِ اخلاق اور اس کے تعمیرِ سیرت کرنے والے ارکان سے الگ کر کے چلایا جا سکتا ہے؟ اللہ کی حاکمیت کا تصور نکال دینے کے بعد اسلام کا سیاسی نظام آخر ہے کس چیز کا نام؟ اور اگر قرآن کو ماخذِ قانون اور محمد رسول اللہ کو رعیت (انسان) اور بادشاہ (اللہ) کے درمیان نزولِ احکام کا واحد مستند ذریعہ نہ مانا جائے، تو کیا اسلامی طرز کے اسٹیٹ کی تعمیر ہوا پر کی جائے گی؟ نیز وہ کون سا نظامِ تمدن و سیاست ہے جو کسی نظامِ اخلاق کا سہارا لیے بغیر قائم ہو سکتا ہو؟ اور کیا اللہ کے سامنے انسان کی ذمہ داری و جوابدہی کا تخیل نکال دینے کے بعد اُس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے کوئی اخلاقی سہارا باقی رہ جاتا ہے جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے؟ کیا اس نظام کو آپ مادہ پرستانہ اخلاقیات کے بل پر ایک دن کے لیے بھی قائم کر سکتے ہیں؟ مزید برآں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ خاص قسم کی انفرادی سیرت اور جماعتی زندگی جو اس نظامِ تمدن و سیاست کے لیے درکار ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے سوا اور کس ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور وہ نہ ہو تو یہ نظام چل کہاں سکتا ہے؟ پس یہ غایت درجہ کا افلاسِ فکر ہے کہ کوئی شخص محض شاخوں کا حسن دیکھ کر کہنے لگے کہ اکھڑ جڑ کے بغیر ان شاخوں ہی سے درخت قائم کریں۔

عملی حیثیت سے بھی اس قسم کی تمام تجویزیں سراسر غلط ہیں۔ ان سے اصل مقصد تک پہنچنے کے بجائے خطرہ یہ ہے کہ کہیں ہم خود ہی راستہ میں گم نہ ہو جائیں۔ ترمیم شدہ صورت میں جس نام نہاد اسلام کی تبلیغ کی جائے گی، ایک روز وہی اصل معیار بن جائے گا، اور جو لوگ اس پر ایمان لا کر جماعت میں شریک ہوں گے، نہ صرف وہ خود اصل اسلام کی طرف رجوع کرنے سے انکار کریں گے، بلکہ وہ مصلحت پرست مسلمان بھی، جنہوں نے ان سے کم و بیش پر سودا کیا تھا ان کے ساتھ ان کی گمراہی میں شریک ہو جائیں گے۔ مدارات (Compromises) پر جو کام مبنی ہوتے ہیں ان میں ہمیشہ یہی خرابی ہوتی ہے۔

۶۔ مشکلات کا جائزہ

اب ہمیں ایک نظر ان مشکلات پر ڈالنی چاہیے جن سے خوف زدہ ہو کر یہ انحراف کی راہیں اختیار کی جا رہی ہیں۔ کیا حقیقت میں وہ ایسی ہی مشکلات ہیں کہ ان کو حل نہیں کیا جا سکتا؟۔

تکرارِ بیان سے بچنے کے لیے میں ناظرین کو پھر ایک مرتبہ تکلیف دوں گا کہ پیچھے پلٹ کر مضمون کے اس حصہ پر نگاہ ڈال لیں جہاں ہم نے ان مشکلات کی تشریح کی ہے۔

پہلی مشکل

پہلی مشکل کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام صرف تمدنی، سیاسی، اور معاشی مسائل کا حل ہی پیش نہیں کرتا بلکہ عقائد، عبادات اور ضوابطِ شرعیہ کا ایک مجموعہ بھی اس کے ساتھ دیتا ہے، اور اس کو قبول کرنے کے معنی انسان کی پوری زندگی تبدیل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز اسلام کو اس طرح پھیلنے نہیں دیتی جس طرح دوسری تحریکیں پھیلتی ہیں۔ لیکن

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ مشکل بظاہر جتنی زبردست نظر آتی ہے، بباطن اتنی ہی کمزور اور بے حقیقت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی اجتماعی نظریہ اور مسلک بھی ایسا نہیں ہے جو انسانی زندگی کے عملی مسائل کا مجرد حل پیش کرتا ہو اور اس کے ساتھ اپنے کچھ اعتقادات اور اپنا ایک مخصوص فلسفہ نہ رکھتا ہو۔ چند امور مابعد الطبیعت (Metaphysical Problems) ایسے ہیں جن کے متعلق سلبی یا ایجابی حیثیت سے ایک نہ ایک رائے قائم کرنا بہر حال ہر اُس مسلک کے لیے ناگزیر ہے جو انسان کے لیے ایک لائحۂ زندگی بنانے کا عزم کرے۔ یہ سوالات کہ کائنات کا یہ نظام کس نوعیت کا ہے؟ اور اس نظام میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟ اور انسان کی زندگی کا مآل کیا ہے؟ اور یہ کہ دنیا میں سب کچھ تو انسان کیلیے ہے مگر انسان خود کس کیلیے ہے؟ یہ دراصل انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں جن کا ایک قابلِ عمل حل (Workable Solution) پیش کیے بغیر کوئی ذہنی، اخلاقی، تعلیمی اور تمدنی نظام بنایا ہی نہیں جاسکتا اور کسی نظام کے بھی محض عملی پہلوؤں کو لے کر آدمی کام نہیں کرسکتا جب تک کہ ساتھ ساتھ اس کے بنیادی فلسفے، یا بالفاظِ دیگر اس کے اعتقادات کو بھی قبول نہ کرلے۔ پس ایک اعتقادی نظام ہونا تنہا اسلام ہی کی کوئی انوکھی خصوصیت نہیں ہے۔ اس جہت سے اگر اسلام کی راہ میں کوئی مشکل حائل ہے تو ایسی مشکل ہر اجتماعی مسلک کی راہ میں حائل ہے۔ ہر اجتماعی مسلک فی الواقع ایک مذہب ہی ہے اور جو بھی اس کی پیروی اختیار کرتا ہے وہ حقیقت میں ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے، خواہ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر وہ یہ کہتا اور سمجھتا رہے کہ میں بدستور اپنے پہلے مذہب پر ہوں۔

میں ایک سیدھی سی مثال سے اس نکتہ کی مزید توضیح کروں گا۔ یہ کمیونزم آپ کے سامنے ہے۔ اسی کو مثال میں لے لیجیے۔ اگر اسلام اس مابعد الطبیعی نظریہ سے اپنے مسلک کی ابتدا کرتا ہے کہ خدا ہے، تو کمیونزم اس نظریہ سے چلتا ہے کہ خدا نہیں ہے یا کم از کم اس کا وجود ہمارے لیے خارج از بحث ہے۔ اگر اسلام یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دنیا خدا کی سلطنت ہے اور انسان یہاں اس کا تابع امر ہے تو کمیونزم یہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے کہ یہ دُنیا ایک اتفاقی بساط ہے اور انسان یہاں مطلقاً خود مختار (Independent) ہے۔ اگر اسلام یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پہلو لیتا ہے کہ انسان کو یہاں کام کرنے کے لیے خدا کی ہدایت درکار ہے اور وہ وحی کے ذریعہ سے آتی ہے تو کمیونزم یہ پہلو لیتا ہے کہ کوئی ہدایت درکار نہیں اور کوئی وحی نہیں آتی۔ اگر اسلام اس مقام سے سلوک کا آغاز کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جس میں انسانوں کو موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دینا ہے، تو کمیونزم اس مقام سے چلتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے اور بعد میں نہ کوئی زندگی ہے نہ حساب نہ کتاب۔ دیکھیے یہ دونوں یکساں مابعد الطبیعی نظریے ہیں اور دونوں میں سے کسی کو بھی تجربہ یا مشاہدہ سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ اب اگر کسی سائنٹیفک ثبوت کے بغیر محض استدلال اور تسلی شہادت کی بنا پر بہت سے وہ لوگ جو کل تک کمیونسٹ نہ تھے، آج کمیونزم کے نقطۂ نظر کو قبول کر سکتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ آخر انہی دو بنیادوں پر بہت سے وہ لوگ جو آج مسلم نہیں ہیں، کل اسلام کا نقطۂ نظر کیوں قبول نہیں کر سکتے؟

اسی طرح ایک ہادی پر ایمان لانے کا معاملہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ اگر مسلم ہونے کے لیے محمد رسول اللہ پر ایمان لانا پڑتا ہے تو کمیونسٹ بھی آخر مارکس پر ایمان لاتا ہی ہے۔ پھر اگر ایک شخص جو کل تک مارکسی نہ تھا، آج مارکس کی تعلیمات کو دیکھ کر اس کو اپنا رہنما تسلیم کر سکتا ہے، تو آخر کون سی چیز مانع ہے کہ ایک وہ شخص جو کل تک مسلم نہ تھا، آج محمد رسول اللہ کی زندگی، انؐ کی تعلیمات اور انؐ کے کارنامے کو دیکھ کر انؐ کو اپنا ہادی و رہبر تسلیم نہ کرے؟

ایسا ہی معاملہ جماعتی ضوابط (Party Discipline) کا بھی ہے۔ اگر اسلام اُن لوگوں کو جو اس کی جماعت میں شامل ہوں، اپنے کچھ ضوابط کا پابند بناتا ہے تو کیا کمیونسٹ پارٹی ان لوگوں کو جو اس کی جماعت میں شامل ہیں، کسی ضابطہ اور کسی قاعدے میں نہیں جکڑتی؟ پھر جب بہت سے انسان کمیونزم کے اصولوں پر ایمان لانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ضوابط کی پابندی قبول کر لیتے ہیں تو آخر اسلام ہی کے جماعتی ضوابط میں کونسا ہوّا چھپا ہوا ہے کہ جو لوگ اسلام کے اصولوں کو جانچ کر ان پر ایمان لانے کے لیے تیار ہوں گے اُن کو یہ ہوّا اپنی صورت دکھا کر بھگا دے گا؟

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس مثال سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلام میں خدا کی ہستی اور اس کی توحید کا اعتقاد یا آخرت کا اعتقاد یا پیغمبر کی ناقابلِ منازعت پیشوائی (Indisputable Leadership) اور قرآن کے آخری منبعِ قانون ہونے کا اعتقاد شرطِ لازم ہونا، اور نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ضوابط کی پابندی فرض ہونا، ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے پھیلنے اور غیر مسلموں کے اس کی طرف کھنچ کر آنے میں سدِّ راہ ہو۔ مابعد الطبیعی اعتقادات اور جماعتی ضوابط دوسرے مسلکوں میں بھی موجود ہیں، اور جو انسان اِن مسلکوں میں اپنی زندگی کے مسائل کا حل اپنی سمجھ کے مطابق صحیح پاتے ہیں وہ اِن کے عقائد اور ضوابط دونوں کو قبول کرتے ہی ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر اسلام اُن کے سامنے تمام مسائلِ زندگی کا بہترین حل پیش کرے اور ان کی اپنی فلاح وسعادت کا راستہ کھول کر ان کے سامنے رکھ دے تو عقائد اور ضوابط کی شرط صرف اسلام ہی کے معاملہ میں ان کے لیے غیر معمولی رکاوٹ ثابت ہو۔ رکاوٹ اگر ہے تو فی الواقع صرف اِسی حد تک ہے کہ لوگوں کے لیے بالعموم اپنے پُرانے مسلک کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مسلک اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن جو تحریک بھی دنیا میں پھیلتی ہے اُسے بہرحال اس رکاوٹ سے سابقہ پیش آتا ہی ہے اور جو لوگ کسی تحریک پر ایمان لاتے ہیں وہ بہرحال اس رکاوٹ کو عبور کر کے ہی آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ اس کو سامنے کھڑا دیکھ کر راستہ کترانے کی کوشش صرف وہی شخص کرے گا جو یا تو اپنے ایمان ہی میں صادق نہیں ہے یا پست ہمت اور ناکارداں ہے۔

البتہ اسلام کے حق میں اس رکاوٹ کو جس چیز نے شدید تر رکاوٹ بنا دیا ہے وہ ہماری یہ اپنی جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جا رہا ہے۔

اس بے رُوح مذہبیت کا پہلا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں اسلام کے عقائد محض ایک دھرم (Religion) کے مزعومات (Dogmas) بنا کر رکھ دیے گئے ہیں حالانکہ وہ ایک مکمل فلسفۂ اجتماع اور نظامِ تمدن کی منطقی بنیاد ہیں۔ اور اسی طرح اُس کی عبادات محض پوجا اور تپسیا بنا کر رکھ دی گئی ہیں، حالانکہ وہ اُن ذہنی اور اخلاقی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کرنے کے وسائل ہیں جن پر اسلام نے اپنا نظامِ اجتماعی تعمیر کیا ہے۔ اس عملِ تحریف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کی سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی کہ آخر ایک سیاسی، معاشی اور تمدنی لائحہ عمل کو چلانے کے لیے اِن عقائد اور اِن عبادات کی ضرورت ہی کیا ہے۔

دوسرا بنیادی نقص اِس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہدِ گزشتہ کی ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے اور اسلام کی تعلیم دینے والی درس گاہیں آثارِ قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ اس چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ تاریخی ذوق کی بنا پر اظہارِ قدر شناسی تو کر سکتے ہیں، مگر یہ توقع اُن سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ حال کی تدبیر اور مستقبل کی تعمیر کے لیے اس سے ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے۔

تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول، مقداروں کے غیر منصوص تعیّن، اور رُسوم سے بڑھ کر مظاہر پر مدارِ دین داری رکھنے کی بیماری اِس میں حد سے بڑھ گئی ہے، اور وہ غیروں کی تالیف تو کیا کرے گی اُلٹی اپنوں کی تنفیر کا باعث بن رہی ہے۔ اِس غلط مذہبیت کے علمبرداروں کی زندگی دیکھ کر اور ان کی باتیں سُن کر آدمی اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ انسان کی ابدی فلاح و خسران کا مدار کیا انہی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہے جن پر یہ لوگ اتنا زور دیتے ہیں؟

اِسلام کے راستے میں یہ بہت بڑی رکاوٹ ہے مگر یہ اسلام کا قصور نہیں ہمارا اپنا قصور ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے اُس نظامِ تعلیم کو بدلیں جس نے دین کے تصور کو اتنا غلط اور شریعت کے علم کو اس قدر جامد بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک زندہ تحریک محض عقائد کے بل پر تو نہیں اُٹھ سکتی۔ ہمیں اس کے عقائد کو معقول دلائل کے ساتھ پیش کرنا ہوگا۔ پھر عقائد کے ساتھ عبادات کا اور عبادات کے ساتھ زندگی کے قوانین کا منطقی ربط واضح کرنا پڑے گا۔ پھر ان قوانین کو زندگی کے تمام عملی مسائل پر منطبق کر کے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ جتنی انسانی ضروریات ہیں اُن سب کا حل اِن قوانین میں موجود ہے۔ تب

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہیں لوگ اس نظام کو ایک معقول نظام کی حیثیت سے سمجھ سکیں گے، اور جب وہ اسے سمجھیں گے تو قبول بھی کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ تعمیری کام چونکہ محنت طلب ہے اس لیے اس محنت سے جی چرا کر لوگ بنے بنائے آسان طریقوں کی طرف دوڑ جاتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے راستہ بنانے کی زحمت بہرحال ہمیں اٹھانی ہی پڑے گی۔ جس نے بھی کوئی مقصدِ عظیم پیش نظر رکھا ہے اُسے یہ زحمت اٹھانی پڑی ہے، اور اگر واقعی ہم اپنے مقصد میں صادق ہیں تو ہمیں اس کام کے لیے تیار ہونا چاہیے۔

دُوسری مشکل

اب دوسری مشکل کو لیجیے۔ جن تعصبات کو اسلام کی راہ میں حائل بتایا جاتا ہے اُن کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:-

ایک قسم کا تعصب تو وہ ہے جو طبعاً ہر شخص کے اندر اُس چیز کے خلاف ہوتا ہے جو اس کے لیے نئی ہو، جس پر اُس نے اپنے باپ دادا کو نہ پایا ہو، اور جس سے وہ مانوس نہ ہو۔ یہ تعصب صرف آج ہی اسلام کی راہ میں حائل نہیں ہے، پہلے بھی حائل تھا، اور جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، یہ صرف اسلام ہی کی راہ میں حائل نہیں ہے، ہر تحریک کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ تاہم یہ ایسی رکاوٹ نہیں ہے جس کو دُور نہ کیا جا سکتا ہو۔ پہلے بھی اس رکاوٹ کے باوجود اسلام پھیلا ہے اور اب بھی پھیل سکتا ہے۔

دوسری قسم کا تعصب وہ ہے جو در اصل اسلام کے خلاف نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف پیدا ہوا ہے اور مسلمانوں کے واسطے سے اسلام کی راہ میں حائل ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے پچھلی کئی صدیوں میں جو غیر اسلامی طریقے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اختیار کیے اور اب بھی اپنے انفرادی کردار اور اجتماعی رویّے میں جس غیر اسلامی سیرت کا وہ اظہار کر رہے ہیں، یہ سارے تعصبات فی الحقیقت اسی کے بھڑکائے ہوئے ہیں۔

اِس واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان کو اصلی اسلامی حکومت، خالص اسلامی اخلاق اور حقیقی اسلامی تمدّن سے لذّت آشنا ہونے کا کبھی موقع ملا ہی نہیں۔ گزشتہ زمانہ میں مسلمان بادشاہوں نے، مسلمان امراء نے، مسلمان حکّام اور اہل کاروں اور سپاہیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے، مسلمان زمینداروں اور رئیسوں نے اور مسلمان عوام نے اپنے برتاؤ سے اسلام کا جو نمونہ پیش کیا وہ ہرگز ایسا نہ تھا کہ اِس ملک کے عام باشندوں کو اسلام کا گرویدہ بنا سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس نفسانی اغراض کے لیے جو کشمکش ان کے اور غیر مسلم عناصر کے درمیان مدتہائے دراز تک برپا ہوتی رہی اس نے اسلام کے خلاف مستقل تاریخی تعصبات پیدا کر دیے۔

اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اسلام کا جو نمونہ آج اِس زمانہ میں مسلمان اپنی انفرادی زندگی اور اجتماعی طریق کار سے پیش کر رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسا خوبصورت نہیں ہے کہ اِس قسم کے نمونے کو دیکھ کر لوگ اُس تحریک کے عاشق ہو جائیں جس کی نمائندگی اس شان سے کی جا رہی ہو۔ انفرادی زندگی میں ایک عام مسلمان ایک عام غیر مسلم سے آخر کس چیز میں برتر نظر آتا ہے کہ لوگ اِس برتری کے منبع کی جستجو کریں؟ اس کے برتاؤ میں، اس کے اخلاق میں، اس کے معاملات میں کہاں کوئی خفیف سی چمک بھی ایسی نمودار ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ یہ شخص فائق تر اور پاکیزہ تر اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا ایک مسلمان زمیندار یا "شریف" اصطلاحی "کمینوں" کے مقابلہ میں اپنے طبقہ کے کسی غیر مسلم "شریف" یا رئیس سے کچھ کم نخوت برتتا ہے؟ کیا ایک مسلمان تاجر یا پیشہ ور آدمی اپنے ہم پیشہ غیر مسلم سے کچھ زیادہ متدین ہوتا ہے؟ کیا ایک مسلمان حاکم یا عہدہ دار اپنے اختیارات کے استعمال میں کسی غیر مسلم ہمسر سے کچھ بہتر اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتا ہے؟ کیا دفتروں کے مسلمان ملازم رات دن انہی تمام ذلیل طریقوں کی پیروی نہیں کر رہے ہیں جن کی پیروی اُن کے غیر مسلم ساتھی کرتے ہیں؟ کیا وہی جائز و ناجائز طریقوں سے اپنی قوم کا تعصب، وہی کمینہ چالوں سے غیر قوم والوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کرنا، اور انہی چھوٹی چھوٹی دنیوی اغراض کے پیچھے لڑتے مرنا، جس کی شکایت یہ غیر مسلموں سے کرتے ہیں، خود ان کا بھی رات دن کا مشغلہ نہیں ہے؟ پھر جب ایک غیر مسلم اسلام کے اِن نمائندوں کی زندگی میں کہیں بھی کوئی فوقیت کا نشان نہیں پاتا، جب وہ انہیں بھی وہی سب کچھ کرتے دیکھتا ہے جو وہ خود کرتا ہے، اور جب وہ انہیں بھی انہی مقاصد کے لیے لڑتے جھگڑتے اور کشمکش کرتے دیکھتا ہے جن کے لیے وہ خود لڑتا جھگڑتا اور کشمکش کرتا ہے، تو آخر کون سی چیز اُس کو اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں :

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلک کی طرف مائل کرسکتی ہے جس کی نمائندگی یہ لوگ کررہے ہیں؟ بلکہ جب ایک ہی نفسانیت اور دنیا پرستی کے میدان میں وہ اور یہ برابر کے حریف ہیں تو اپنے حریفوں کے مسلک پر وہ کھلے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کرنے لگا؟ ایک طرف پچھلے تاریخی تعصبات، اور پھر آج کی نفسانی کشمکش، کیا یہ دونوں چیزیں اس کے دل کے دروازوں پر قفل چڑھانے کے لیے کافی نہیں ہیں؟

انفرادی زندگی سے وسیع تر قومی دائرے میں مسلمان اس وقت تک جس پالیسی پر مصر ہیں، بلکہ جسے اپنی حیاتِ اجتماعی کا ضامن سمجھ رہے ہیں وہ کیا ہے؟ اصول اسلام اور مقاصدِ اسلام کا کہیں نام تک نہیں آتا۔ کسی خطبے، کسی تقریر، کسی ریزولیوشن میں آپ ایک فقرہ تک ایسا نہیں پاسکتے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہ لوگ اپنی اغراض اور اپنے دنیوی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ انسانوں کی فلاح کے لیے عالمگیر حق اصول لے کر اٹھے ہیں اور ان کی لڑائی محض اصولِ حق کی خاطر ہے۔ اس کے برعکس آپ یہ دیکھیں گے کہ ان کے اور دوسری قوموں کے درمیان بالکل برابر کی قوم پرستانہ جنگ برپا ہے، دونوں ایک سطح پر اتر آئے ہیں، ایک ہی مرتبے کی دنیوی اغراض کے لیے کشمکش کررہے ہیں، ایک ہی قسم کی چالیں (Tactics)، زبان، اصطلاحات اور اصولِ نزاع اختیار کررہے ہیں، اور سارا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا انہی چیزوں کے لیے ہے جن کے لیے ان کے حریفوں کا رونا دھونا اور لڑائی جھگڑا ہے۔ پھر کس طرح یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ جن لوگوں سے آپ دنیوی اغراض کے لیے مساوی مرتبے پر لڑ رہے ہوں، جن سے آپ رقابت اور حریفی کا پرانا اور تازہ رشتہ رکھتے ہوں، جن کے ساتھ آپ کی سیاسی اور معاشی مفاد کے لیے کشمکش برپا ہو، وہ آپ کی طرف سے کسی اصولی تحریک کی دعوت پر اسی طرح کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں گے جس طرح وہ اشتراکیت یا ڈیموکریسی یا کسی اور مسلک کی دعوت کے لیے تیار ہوتے ہیں؟

یہ تعصبات اسلام کے راستے میں دوسری عظیم الشان رکاوٹ ہیں، مگر ان کا علاج یہ ہے کہ ہم ان تعصبات کی پیدائش کے سبب کو باقی رکھیں اور پھر ان کی موجودگی کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بہانہ بنا کر اپنے مقصد کی طرف براو راست پیش قدمی کرنے سے مُنہ موڑیں، بلکہ ان کا صحیح علاج یہ ہے کہ ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل کو بدلیں اور اس طرح تمام تعصبات کی جڑ کاٹ کر اپنے مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے سیدھا راستہ تیار کریں۔ جو لوگ محض سرسری نگاہ میں یہ دیکھ کر کہ اسلام کے خلاف ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، تمام قوموں میں سخت تعصبات پھیلے ہوتے ہیں، یہ فیصلہ صادر کر دیتے ہیں کہ اس حالت میں اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں پھیل سکتا، وہ دراصل واقعات کو غلط رنگ میں دیکھتے اور غلط نتائج نکالتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر ثابت کیا ہے، یہ تعصبات اسلام اور اسلامی سیرت کے بھڑکائے ہوئے نہیں ہیں (جس سے ان قوموں کو ہندوستان میں کم ہی سابقہ پیش آیا ہے) بلکہ اسلام کے اُن غلط نمائندوں کی روش سے پیدا ہوئے ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود غیر اسلامی طریقوں پر چلتے رہے اور خالصتہً لِلّٰہ کام کرنے کے بجائے اپنی دُنیوی اغراض اور نفسانی خواہشات کے لیے کام کرتے رہے۔

لہٰذا ان تعصبات کے تدارک کی صحیح صورت یہ ہے کہ اب اپنی سیرت، اپنے اعمال، اور اپنی اجتماعی جدّوجہد سے اسلام کی صحیح نمائندگی کیجیے، نہ یہ کہ تعصبات کی موجودگی کو اُسی غلط روش پر چلنے کے لیے حجت بنائیے جس کی وجہ سے تعصبات پیدا ہوتے ہیں۔ بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ قومی تعصبات کی موجودگی میں اسلام کا ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے چلنا محال ہے، تو سوال یہ ہے کہ اسلامی مقاصد کے بجائے مسلمانوں کے دُنیوی مفاد کے لیے جو کشمکش آپ کے اور دوسری قوموں کے درمیان برپا ہے اور ان کے قوم پرستانہ طریقوں کے جواب میں ویسے ہی قوم پرستانہ طریقے جس طرح آپ اختیار کر رہے ہیں، کیا اُس سے یہ تعصبات کبھی قیامت تک بھی دُور ہو سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر یہ نہ کہیے کہ اِس وقت کچھ خاص حالات ایسے ہیں جن کی وجہ سے اسلام ایک خالص اصولی تحریک کی حیثیت سے نہیں چل سکتا، بلکہ یوں فرمایئے کہ آئندہ بھی ہمیشہ ایسے ہی حالات موجود رہیں گے اور اگر اسلام آپ ہی کا ورثہ آبائی بنا رہا تو وہ ہمیشہ بنی اسرائیل کی طرح محض آپ کا قومی مذہب بن کر رہے گا، کبھی ایک عالمگیر دعوت نہ بن سکے گا۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ انسانی فطرت کا اقتضا ہے کہ خود غرضی کے جواب میں خود غرضی اور قوم پرستی کے جواب میں قوم پرستی پیدا ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے بے غرضانہ حق پرستی کے مقابلہ میں تمام تعصبات اور تمام مخالفانہ جذبات آخرکار ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور ایک سچے بے لوث حق پرست کے آگے انسان عقیدت و محبت کے سوا اور کوئی چیز پیش کرنے پر قادر ہی نہیں رہتا۔ اگر مسلمان اپنی وہی حیثیت قائم رکھتے جو دراصل ان کی تھی تو یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان میں ان کے خلاف وہ تعصبات پلتے جاتے جن کی آج شکایت کی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے خود اپنی وہ حیثیت کھو دی۔ دُنیوی فائدوں کے لیے دوسری قوموں سے لڑنے جھگڑنے لگے اور اصولِ حق کے بجائے اپنی اغراضِ ذاتی و قومی کو انہوں نے اپنی جدوجہد کا محور بنا لیا۔ اس کے جواب میں اگر دوسروں کے اندر تعصب نہ پیدا ہوتا تو تعجب کی بات تھی۔ جن اصولوں کا آپ نام لیتے ہیں اُن کی آپ خود پیروی نہیں کرتے بلکہ رات دن اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں ان کے خلاف عمل کرتے رہتے ہیں۔ جس مقصدِ عالی کا آپ اظہار کرتے ہیں، آپ کی عملی جدوجہد اس مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ آپ کے افراد انفرادی طور پر اور آپ کی پوری جماعت بحیثیتِ مجموعی اس کو پسِ پُشت ڈال کر دوسرے مقاصد کے پیچھے چلی جا رہی ہے۔ اس صورت میں اگر اپنے خیالی نصب العین اور اپنے محض زبانی اصولوں کے لیے آپ کی اپیل دوسروں پر کارگر نہ ہو، اگر وہ اس اپیل میں آپ کو جھوٹا سمجھیں اور آپ کی تبلیغ کو محض خود غرضانہ چال سمجھ کر حقارت سے رد کر دیں تو آخر اس میں حیرت کی بات ہی کون سی ہے؟

ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم مسٹر جناح کے ۱۴ یا ۲۴[1] نکات پر تو ایمان نہیں لا سکتا۔ نہ

---

[1] یہ مرحوم کے اُن ۱۴ نکات کی طرف اشارہ ہے جو مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے انہوں نے مارچ ۱۹۲۹ء میں پیش کیے تھے۔ ان نکات کی اصل عبارت مسٹر جی الانا کی کتاب (Pakistan Movement : Historic Documents) صفحہ ۷۰-۷۲ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان نکات کو بغور پڑھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اسی وقت تک مسلمانوں کو تحفظ دے سکتے تھے جب تک (باقی صفحہ ۱۵۵ پر)

مسلم لیگ یا مجلسِ احرار یا جمیعت العلماء کے ریزولیوشنوں میں کوئی ایسی چیز ہے جس پر کوئی ایمان لائے۔ ایمان اگر کوئی لا سکتا ہے تو لا الٰہ الا اللہ پر لا سکتا ہے بشرطیکہ ایک جماعت اسی کلمہ کے لیے جینے اور اسی پر مرنے والی اس کے سامنے موجود ہو۔ مگر وہ ہے کہاں؟ کون سی جماعت آپ کے اندر ایسی موجود ہے جس نے خالص اطاعتِ حق کو اپنا مسلک اور خالص دین کے قیام کو اپنی کوششوں کا مرکز و محور بنا لیا ہو؟ لوگ اسلام کی دعوت اور اس کے اصولِ حق کو کتابوں میں دیکھتے ہیں اور ان کے معترف ہو جاتے ہیں۔ مگر اس پر عمل کرنیوالی اور اس کے نصب العین کے لیے کام کرنے والی سوسائٹی اُن کو کہیں نہیں ملتی۔ پھر وہ جائیں تو آخر کہاں جائیں؟ کیا اس سوسائٹی میں شامل ہوں جو رات دن دنیا ہی کے پیچھے مری جاتی ہے اور انہی راستوں پر چلی جا رہی ہے جن پر غیر مسلم چلتے ہیں؟ آپ کی ایک جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ارضِ ہند پر انگریز کے بجائے ہندوستانی کا اقتدار قائم ہو۔ بعینہٖ یہی چیز ایک شخص کو غیر مسلم جماعتوں میں بھی مل جاتی ہے۔ پھر وہ آپ کے پاس کیوں آئے؟ آپ کی دوسری جماعت لڑتی ہے اس لیے کہ ہندو کے مقابلہ میں نسلی مسلمانوں کے دنیوی مفاد کا تحفظ کیا جائے۔ یہ چیز اس کو خود اپنی قوم پرستی کی مدِ مقابل نظر آتی ہے۔ پھر وہ اپنی قوم پرستی کو چھوڑ کر آپ کی قوم پرستی پر کیوں ایمان لائے؟ انسان کو غیر اللہ کے تسلط سے آزاد کرانے والی جماعت آپ میں ہے کہاں کہ کوئی اس کے اصول و مقاصد پر ایمان لائے اور اس میں شامل ہونے کے لیے آگے بڑھے؟

تیسری مشکل

سب سے بڑی گتھی جو ہمارے سوچنے والے دماغوں کے لیے ناقابلِ حل بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کروڑوں کی تعداد میں ایک ایسی قوم بستی ہے جو نہ پوری مسلمان ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سے) انگریزی حکومت ملک میں رہتی۔ ہندوستان کے ایک آزاد مملکت بن جانے کی صورت میں یہ تحفظات کسی کام نہ آسکتے تھے۔ اس لیے دعوتِ اسلام تو درکنار خود مسلمانوں کے آئینی تحفظ کے لیے بھی ان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہ پوری غیر مسلم۔ اس قوم کے اس حال میں یہاں موجود ہونے سے متعدد پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کا کوئی حل لوگوں کو نہیں ملتا اور اسی وجہ سے رہنما اور کارکن سب پراگندہ عمل ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں ان چند بڑی بڑی الجھنوں کی طرف اشارہ کروں گا جو اس صورتِ حال نے پیدا کر دی ہیں :۔

بعض لوگ لفظ مسلمان سے دھوکا کھا کر اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ اصل سوال اسلام کے احیاء (Revival) کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے احیاء کا ہے۔ یعنی یہ قوم جو مسلمان کے نام سے پائی جاتی ہے، اِس کو ایک زندہ اور طاقت ور قوم بنانا اور برسرِ عروج لانا اصل مقصود ہے اور اِسی کا نام اسلام کا احیا ہے۔ یہ غلط فہمی ان کو "مسلم قوم پرستی" کی حد تک کھینچ لے گئی ہے۔ جس طرح مُونجے اور ساورکر[۱] کے لیے سوال ہندو قوم کے عروج کا ہے، جس طرح مسولینی کے لیے اطالوی قوم اور ہٹلر کے لیے جرمن قوم کے عروج کا سوال ہے، اسی طرح اِن "مسلم قوم پرستوں" کے لیے اصل سوال اس مسلمان قوم کے عروج کا ہے جس میں یہ پیدا ہوتے ہیں اور جس کے ساتھ ان کی قسمتیں وابستہ ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت اس کو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیم (قطع نظر اس سے کہ وہ تعلیم کیسی ہی ہو)، اُن کی معاشی خوش حالی (خواہ وہ کسی قسم کے ذرائع سے حاصل ہو)، اور اُن کی سیاسی و عسکری تنظیم (مجرد قومی تنظیم) پر اپنا زور صرف کیا جائے، اور اُن کو ایک زبردست قوم بنا دیا جائے۔ پھر جب یہ اِن کا مقصد قرار پایا تو انہوں نے معاملات کو اس نظر سے دیکھنا شروع کیا کہ کون سی تدابیر اس مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہو سکتی ہیں، اور جو تدبیریں بھی ان کو دنیا میں قومی عروج کے لیے مفید و کارگر نظر آئیں اس کو بے تکلف انہوں نے استعمال کرنا شروع کر دیا، خواہ وہ اسلام سے ان کو کتنی ہی دُور لے جانے والی ہوں۔ یہ ذہنیت سر سید احمد خاں کے وقت سے آج تک مسلمانوں کے اکثر و بیشتر رہنماؤں، کارکنوں اور اداروں پر مسلط ہے۔ اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا جا رہا ہے مسلمانوں کے لیے سوچا جا رہا ہے اور اسلام کی قید سے آزاد ہو کر سوچا جا رہا ہے۔

---

[۱] یہ اس زمانے کے مشہور متعصب ہندو لیڈر تھے۔ (جدید)

کچھ دوسرے لوگ اسلام اور مسلمان کو اس حیثیت سے تو غلط ملط نہیں کرتے، لیکن ایک دوسری حیثیت سے وہ اسلام کے مستقبل کو موجودہ نسلی مسلمانوں کے دامن سے باندھ دیتے ہیں۔ وہ چاہتے تو اسلام ہی کا احیاء ہیں، مگر ان کا خیال یہ ہے کہ اسلام کا احیاء موقوف ہے اُن سب مسلمانوں کے مکمل مسلمان بن جانے پر جو اِس وقت قومی و نسلی حیثیت سے مسلمان ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک یہ سارے کے سارے مسلمان ذہنی، اخلاقی اور عملی حیثیت سے تبدیل نہ ہو جائیں، قدم آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔ اور یہ چیز چونکہ سخت دشوار بلکہ محال نظر آتی ہے، اس لیے یہ لوگ اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے بجائے اِدھر اُدھر کے فضول کاموں میں مختلف ضمنی مقاصد کے پیچھے اپنی قوتیں ضائع کر رہے ہیں۔

کچھ اور لوگ ہیں جن کے سامنے اسلامی نصب العین قریب قریب بالکل واضح ہو چکا ہے اور وہ اُس کی طرف بڑھنا بھی چاہتے ہیں، مگر یہ سوال ان کو بار بار پریشان کرتا ہے کہ اگر ہمارے کارفرما دماغ اور کارکن ہاتھ سب کے سب اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے میں لگ جائیں تو آخر موجودہ کافرانہ نظامِ تمدن و سیاست اور اس کے آئندہ تغیرات میں ہماری قوم کے سیاسی و معاشی مفاد کا کیا حشر ہوگا۔ اس سوال کی اہمیت اُن کی نگاہ میں اتنی زیادہ ہے کہ وہ اپنے عزمِ سفر کو ملتوی کر کے کہتے ہیں کہ پہلے اِس سوال کو حل کیا جائے اور اصل مقصد کی طرف قدم اُس وقت بڑھایا جائے جب اپنی قوم کا کوئی مسئلہ ہمارے لیے حل طلب باقی نہ رہے۔

لیکن یہ تمام اُلجھنیں غیر اسلامی طرزِ فکر اور غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔ اگر خالص مسلمان ہونے کی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی اُلجھن بھی ہمارے لیے اُلجھن نہیں رہتی۔ ہمارے سامنے اصل سوال کسی قوم کے احیاء کا نہیں بلکہ مسلکِ اسلام کے احیاء کا ہے۔ قوم کے احیاء کا خیال دماغ سے نکالتے ہی وہ تمام مسائل کافور کی طرح اُڑ جاتے جو قومیت کی اصطلاحوں میں سوچنے والے لوگوں کو پریشان کیا کرتے ہیں۔ جب ہم مسلکِ اسلام کے پیرو ہیں اور اس کو فروغ دینا ہمارا مقصد ہے تو ہمیں کسی ایسے مفاد سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی نہیں ہو سکتی جو کسی غیر اسلامی نظام سے وابستہ ہو یا اصولِ اسلام سے متصادم ہو۔ ہم اپنے دماغ کو اُس کے لیے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوچنے کی کچھ بھی زحمت نہ دیں گے۔ قومی احیاء کی اُن تمام تدبیروں سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہ ہوگا جو غیر اسلامی اصول پر مبنی ہوں۔ ایک قوم اور دوسری قوم کی باہمی کشمکش، اور ایک قوم پر دوسری قوم کے تفوق کی کوششوں سے بھی ہم پوری تبرّی کریں گے۔ ہم کو جو کچھ بھی دلچسپی ہوگی اسلامی نظامِ فکر و عمل سے ہے، اس کی تبلیغ و اشاعت سے ہے، اور اس کو حکمراں بنانے کی سعی و جہد سے ہوگی۔ مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف اُسی حد تک ہوگا جس حد تک اُن کا تعلق اسلام سے ہے۔ جو اپنی خواہشِ نفس اور ہر غیر اللہ کی بندگی چھوڑ کر صرف اللہ کی بندگی میں آجائے وہ ہمارا بھائی اور رفیق ہے، خواہ وہ نسلی مسلمانوں میں سے آئے یا غیر مسلموں میں سے۔ ہم پیدائشی مسلمانوں کو بھی اِسی مسلک کی طرف دعوت دیں گے اور غیر مسلموں کو بھی۔ ہمارے نزدیک اسلام کا دامن نسلی مسلمانوں کے دامن سے بندھا ہوا نہ ہوگا کہ یہ اُٹھیں تو وہ بھی اُٹھے اور یہ نہ اُٹھیں تو وہ بھی نہ اُٹھے۔ اسلام اِن کے باپ دادا کی جائداد نہیں ہے۔ یہ اس کے لیے جینے اور اُسی کے لیے مرنے پر تیار ہوں تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ورنہ جس جہنم میں ان کا جی چاہے جا کر گر جائیں۔ ہم اللہ کا کلمہ دوسرے انسانوں کے پاس لے جائیں گے۔

یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں بعینہٖ یہی طرزِ عمل انبیاءؑ و رسلؑ کا تھا اور اسی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا۔ قرآن میں جن کو اہلِ کتاب کہا گیا ہے وہ آخر "نسلی مسلمان" ہی تو تھے۔ خدا اور ملائکہ اور نبی اور کتاب اور آخرت سب کو مانتے تھے، اور عبادات اور احکام کی رسمی پیروی بھی کرتے تھے۔ البتہ اسلام کی اصلی روح، یعنی بندگی و اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر دینا اور دین میں شرک نہ کرنا، یہ چیز اُن میں سے نکل گئی تھی۔ اب دیکھیے، کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس "نسلی مسلمان" قوم کے احیاء پر اپنی کوششوں کو مرکوز فرمایا تھا؟ نہیں۔ کیا آپ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک یہ سارے کے سارے "نسلی مسلمان" اصلی مسلمان نہ بن جائیں گے قدم آگے نہ بڑھایا جائے گا؟ یہ بھی نہیں۔ کیا آپ نے ان "نسلی مسلمانوں" کے دُنیوی مسائل کو حل کرنے تک اقامتِ دین کی کوششوں کو ملتوی رکھا تھا؟ یہ بھی نہیں۔ پھر آپ نے کیا کیا؟ سب جانتے ہیں کہ آپ نے تمام معاملات اور تمام مسائل سے قطع نظر کر کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"نسلی مسلمانوں" اور غیر مسلموں سب کو خالص اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دی، جس نے اسے قبول کیا اور غیر اللہ کی بندگی و اطاعت ترک کر دی اُسے اپنے جتھے میں شامل کر لیا اور پھر ان لوگوں کو لے کر الٰہی نظام اطاعت یعنی دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے براہِ راست جدّوجہد شروع کر دی یہاں تک کہ اس کو قائم کر کے چھوڑا۔"

ٹھیک یہی طریقہ ہے جس کی پیروی کو میں حق سمجھتا ہوں، اسی کی پیروی خود کرنا چاہتا ہوں، اور اسی کا مشورہ ان سب لوگوں کو دیتا ہوں جن کا نصب العین اسلامی ہے۔

(ترجمان القرآن - جنوری ۱۹۴۱ء)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اِسلامی حکومت کسطرح قائم ہوتی ہے؟[1]

اس مقالہ میں مجھے اُس عمل (Process) کی تشریح کرنی ہے جس سے ایک طبعی نتیجہ کے طور پر اسلامی حکومت وجود میں آتی ہے۔ آج کل میں دیکھ رہا ہوں کہ اسلامی حکومت کا نام بازیچۂ اطفال بنا ہوا ہے۔ مختلف حلقوں سے اِس تصور اور اِس مقصد کا اظہار ہو رہا ہے مگر ایسے ایسے عجیب راستے اس منزل تک پہنچنے کے لیے تجویز کیے جا رہے ہیں جن سے وہاں تک پہنچنا اتنا ہی محال ہے جتنا موٹر کار کے ذریعہ سے امریکہ تک پہنچنا۔ اِس خام خیالی (Loose Thinking) کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ بعض سیاسی و تاریخی اسباب سے کسی ایسی چیز کی خواہش تو پیدا ہو گئی ہے جس کا نام "اسلامی حکومت" ہو مگر خالص علمی (Scientific) طریقہ پر نہ تو یہ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس حکومت کی نوعیت کیا ہے اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ قائم کیونکر ہوا کرتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علمی طریقہ پر اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔

نظامِ حکومت کا طبعی ارتقاء

جو لوگ اجتماعیات میں کچھ بھی نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حکومت خواہ کسی نوعیت

---

[1] یہ ایک مقالہ ہے جو ۱۲ ستمبر ۱۹۴۰ء کو اسٹریچی ہال، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا۔

کی ہو، مصنوعی طریقہ سے نہیں بنا کرتی۔ وہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہیں وہ بن کر تیار ہو اور پھر اُدھر سے لاکر اس کو کسی جگہ جما دیا جاتے۔ اس کی پیدائش تو ایک سوسائٹی کے اندر اخلاقی، نفسیاتی، تمدنی اور تاریخی اسباب کے تعامل سے طبعی طور پر ہوتی ہے۔ اس کے لیے کچھ ابتدائی لوازم (Prerequisites)، کچھ اجتماعی محرکات، کچھ فطری مقتضیات ہوتے ہیں جن کے فراہم ہونے اور زور کرنے سے وہ وجود میں آتی ہے۔ جس طرح منطق میں آپ دیکھتے ہیں کہ نتیجہ ہمیشہ مقدمات (Premises) کی ترتیب ہی سے برآمد ہوتا ہے، جس طرح علم الکیمیا میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک کیمیاوی مرکب ہمیشہ کیمیاوی کشش رکھنے والے اجزا کے مخصوص طریقہ پر ملنے ہی سے برآمد ہوتا ہے، اُسی طرح اجتماعیات میں بھی یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ ایک حکومت صرف اُن حالات کے اقتضاء کا نتیجہ ہوتی ہے جو کسی سوسائٹی میں بہم ہو گئے ہوں۔ پھر حکومت کی نوعیت کا تعین بھی بالکلیہ اُن حالات کی کیفیت پر منحصر ہوتا ہے جو اس کی پیدائش کے مقتضی ہوتے ہیں۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ مقدمات کسی نوعیت کے ہوں اور ان کی ترتیب سے نتیجہ کچھ اور نکل آئے، کیمیاوی اجزا کسی خاصیت کے ہوں اور ان کو ملانے سے مرکب کسی اور قسم کا بن جائے، درخت لیموں کا لگایا جائے اور نشوونما پاکر وہ پھل آم کے دینے لگے، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اسباب ایک خاص نوعیت کی حکومت کے فراہم ہوں، اُن کے مل کر کام کرنے کا ڈھنگ بھی اسی نوعیت کی حکومت کے نشوونما پانے کے لیے مناسب ہو، مگر ارتقائی مراحل سے گزر کر جب وہ تکمیل کے قریب پہنچے تو اُنہی اسباب اور اُسی عمل کے نتیجہ میں بالکل ایک دوسری ہی نوعیت کی حکومت بن جائے۔

یہ گمان نہ کیجیے کہ میں یہاں جبریت (Determinism) کو دخل دے رہا ہوں اور انسانی ارادہ و اختیار کی نفی کر رہا ہوں۔ بلاشبہ حکومت کی نوعیت متعین کرنے میں افراد اور جماعتوں کے ارادہ و عمل کا بہت بڑا حصہ ہے، مگر دراصل میں یہ ثابت کر رہا ہوں کہ جس نوعیت کا بھی نظامِ حکومت پیدا کرنا مقصود ہو، اُسی کے مزاج اور اُسی کی فطرت کے مناسب اسباب فراہم کرنا اور اُسی کی طرف لے جانے والا طرزِ عمل اختیار کرنا بہرحال

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ناگزیر ہے۔ اُس کے لیے ضروری ہے کہ ویسی ہی تحریک اُٹھے، اُسی قسم کے انفرادی کیرکٹر تیار ہوں، اُسی طرح کا اجتماعی اخلاق بنے، اُسی طرز کی لیڈر شپ ہو، اور اُسی کیفیت کا اجتماعی عمل ہو جس کا اقتضاء اُس خاص نظامِ حکومت کی نوعیت فطرۃً کرتی ہے جسے ہم بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے اسباب و عوامل جب بہم ہوتے ہیں اور جب ایک طویل مدّت تک جدّوجہد کرنے سے اُن کے اندر اتنی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اُن کی تیار کی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسری نوعیت کے نظامِ حکومت کا جینا دشوار ہو جاتا ہے تب ایک طبعی نتیجہ کے طور پر وہ خاص نظامِ حکومت اُبھر آتا ہے جس کے لیے ان طاقت ور اسباب نے جدّوجہد کی ہو۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کہ ایک بیج سے جب درخت پیدا ہوتا ہے اور اپنے زور میں بڑھتا چلا جاتا ہے تو نشوونما کی ایک خاص حد پر پہنچ کر اس میں وہی پھل آنے شروع ہو جاتے ہیں جن کے لیے اُس کی فطری ساخت زور کر رہی تھی۔ اس حقیقت پر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو یہ تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ ہوگا کہ جہاں تحریک، لیڈر شپ، انفرادی سیرت، جماعتی اخلاق، اور حکمتِ عملی ہر ایک چیز ایک نوعیت کا نظامِ حکومت پیدا کرنے کے لیے موزوں و مناسب ہو، اور اُمید یہ کی جائے کہ اُن کے نتیجہ میں بالکل ہی ایک دوسری نوعیت کا نظام پیدا ہوگا، وہاں بے شعوری، خام خیالی اور خام کاری کے سوا کوئی چیز کام نہیں کر رہی ہے۔

اصولی حکومت

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ حکومت جس کو ہم اسلامی حکومت کہتے ہیں، اُس کی نوعیت کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ مجرّد ایک اصولی حکومت ہے۔ انگریزی میں مَیں اس کو (Ideological State) کہوں گا۔ یہ "اصولی حکومت" وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآشنا رہی ہے اور آج تک ناآشنا ہے۔ قدیم زمانہ میں لوگ صرف خاندانوں یا طبقوں کی حکومت سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

واقف تھے۔ بعد میں نسلی اور قومی حکومتوں سے واقف ہوئے۔ محض ایک اصولی حکومت، اس بنیاد پر کہ جو اس اصول کو قبول کرلے وہ بلا لحاظِ قومیت اسٹیٹ کو چلانے میں حصہ دار ہوگا، دنیا کے تنگ ذہن میں کبھی نہ سما سکی۔ عیسائیت نے اِس تخیل کا بہت ہی دھندلا سا نقش پایا، مگر اس کو وہ مکمل نظامِ فکر نہ مل سکا جس کی بنیاد پر کوئی اسٹیٹ تعمیر ہوتا۔ انقلابِ فرانس میں اصولی حکومت کے تخیل کی ایک ذرا سی جھلک انسان کی نظر کے سامنے آئی مگر نیشنلزم کی تاریکی میں گم ہوگئی؎۔ اشتراکیت نے اس تخیل کا خاصا چرچا کیا حتیٰ کہ ایک حکومت بھی اس کی بنیاد پر تعمیر کرنے کی کوشش کی، اور اس کی وجہ سے دنیا کی سمجھ میں یہ تخیل کچھ کچھ آنے لگا تھا، مگر اس کی رگ رگ میں بھی آخر کار نیشنلزم گھس گیا۔ ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں صرف اسلام ہی وہ مسلک ہے جو قومیت کے ہر شائبہ سے پاک کرکے حکومت کا ایک نظام خالص آئیڈیالوجی کی بنیاد پر تعمیر کرتا ہے اور تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ اس آئیڈیالوجی کو قبول کرکے غیر قومی حکومت بنائیں۔

یہ چیز چونکہ نرالی ہے، اور گرد و پیش کی تمام دنیا اس کے خلاف چل رہی ہے اس لیے نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی اس کو اور اس کے جملہ مضمرات (Implications) کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جو لوگ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوتے ہیں، مگر جن کے اجتماعی تصوّرات تمام تر یورپ کی تاریخ اور یورپ ہی کے سیاسیات اور علومِ عمران (Social Sciences) سے بنے ہیں، اُن کے ذہن کی گرفت میں یہ تصور کسی طرح نہیں آتا۔ بیرونِ ہند کے وہ ممالک جن کی بیشتر آبادی مسلمان اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہے، وہاں اِس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں جب زمامِ حکومت آئی تو ان کو حکومت کا کوئی نقشہ قومی حکومت (National State) کے سوا نہ سوجھا کیونکہ وہ اسلام کے علم و شعور

؎ اس کی بنیاد نفرت پر تھی اس لیے شروع ہی سے خود اپنی قوم کے لوگوں پر وہ ظلم و ستم توڑے گئے اور اس قدر بے دردی سے قتلِ عام کیا گیا کہ چنگیز اور ہلاکو کے قصے مات پڑ گئے۔ اس کے بعد اس کا رُخ نیشنلزم کی طرف پھر گیا۔ (جدید)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور اصولِ حکومت کے تصور سے بالکل خالی الذہن تھے۔ ہندوستان میں بھی جن لوگوں نے اس طرز کی دماغی تربیت پائی ہے وہ اسی مشکل میں مبتلا ہیں۔ اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں مگر بے چارے اپنے ذہن کی ساخت سے مجبور ہیں کہ پھیر پھیر کر جو نقشہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے قومی حکومت ہی کا آتا ہے، قوم پرستانہ طرزِ فکر (Nationalistic Ideology) ہی میں دانستہ و نادانستہ پھنس جاتے ہیں، اور جو پروگرام سوچتے ہیں وہ بنیادی طور پر قوم پرستانہ ہی ہوتا ہے۔ اُن کے نزدیک پیشِ نظر مسئلہ کی نوعیت بس یہ ہے کہ "مسلمان" کے نام سے جو ایک "قوم" بن گئی ہے اس کے ہاتھ میں حکومت آجائے یا کم از کم اس کو سیاسی اقتدار نصیب ہو جائے۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے یہ جتنا بھی دماغ پر زور ڈالتے ہیں، اِس کے سوا کوئی طریقِ کار انہیں نظر نہیں آتا کہ دنیا کی قومیں عموماً جو تدابیر اختیار کیا کرتی ہیں وہی اس قوم کے لیے بھی اختیار کی جائیں۔ جن اجزا سے یہ قوم مرکب ہے ان کو جوڑ کر ایک ٹھوس مجموعہ بنایا جائے، ان میں نیشنلزم کا جوش پھونکا جائے[لہ]، ان کے اندر مرکزی اقتدار ہو، ان کے نیشنل گارڈس منظم ہوں، ان کی ایک قومی ملیشیا تیار ہو، وہ جہاں اکثریت میں ہوں وہاں اقتدارِ اکثریت (Majority Rule) کے مسلّم جمہوری اصول پر اُن کے قومی اسٹیٹ بن جائیں، اور جہاں ان کی تعداد کم ہو وہاں ان کے "حقوق" کا تحفظ ہو جائے، ان کی انفرادیت اسی طرح محفوظ ہو جس طرح دنیا کے ہر ملک میں

لہ ہندوستان کے مسلمانوں کو محض ایک قوم سمجھتے ہوئے اُن کو نیشنلزم کی بنیاد پر اٹھانے کے نتائج اُس وقت تو کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے جب ۱۹۴۰ء میں یہ تقریر کی گئی تھی، لیکن ۱۹۷۱ء میں یہ بات سب کے سامنے آگئی کہ مشرقی پاکستان میں زبان کی بنیاد پر ایک نئے نیشنلزم نے مسلمان کو مسلمان سے پھاڑ دیا اور خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا وہ قتلِ عام ہوا جس کی نظیر مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ پھر ۱۹۷۲ء میں یہ بھی دنیا نے دیکھ لیا کہ سندھ میں علی الاعلان یہ تحریک اُٹھی کہ سندھی زبان بولنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں، اور جو مسلمان سندھی نہیں بولتے وہ نہ صرف دوسری قوم ہیں، بلکہ کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ سندھ میں ان کو رہنے کا حق بھی نہیں ہے۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہر قومی اقلیت (National Minority) اپنی انفرادیت محفوظ کرنا چاہتی ہے، ملازمتوں اور تعلیمی وانتخابی اداروں میں ان کا حصّہ مقرر ہو، اپنے نمائندے یہ خود چنیں، وزارتوں میں ایک قوم کی حیثیت سے یہ شریک کیے جائیں، وغیر ذالک من القومیات۔ یہ سب باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ امّت، جماعت، ملّت، ملّیت، امیر، اطاعتِ امیر اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اسلامی اصطلاحات سے لے کر بولتے ہیں، مگر اسلامی فکر کے اعتبار سے یہ سب ان کے لیے مذہبِ قوم پرستی کی اصطلاحوں کے مترادفات ہیں جو خوش قسمتی سے پرانے ذخیرے میں گھڑے گھڑائے مل گئے اور غیر اسلامی رنگ کے لیے اسلامی رنگ کے غلاف کا کام دینے لگے۔

اصولی حکومت کی نوعیت آپ سمجھ لیں تو آپ کو یہ بات سمجھنے میں ذرّہ برابر بھی دقّت پیش نہ آئے گی کہ اُس کی بنا رکھنے کے لیے یہ طرزِ فکر، یہ اندازِ تحریک، یہ عملی پروگرام نقطۂ آغاز کا بھی کام نہیں دے سکتا، کجا کہ تعمیر کے انجام تک پہنچا سکے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کا ہر جُز ایک تیشہ ہے جس سے اصولی حکومت کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اصولی حکومت کے تخیّل کی تو بنیاد ہی یہ ہے کہ ہمارے سامنے قومیں اور قومیتیں نہیں، صرف انسان ہیں۔ ہم اُن کے سامنے ایک اصول اِس حیثیت سے پیش کرتے ہیں کہ اُسی پر تمدّن کا نظام اور حکومت کا ڈھانچہ تعمیر کرنے میں اُن کی فلاح ہے اور جو اُس کو قبول کر لے وہ اُس نظام کو چلانے میں برابر کا حصّہ دار ہے۔ غور کیجیے، اِس تخیل کو لے کر وہ شخص کس طرح اُٹھ سکتا ہے جس کے دماغ، زبان، افعال و حرکات، ہر چیز پر قومیت اور قوم پرستی کا ٹھپّا لگا ہوا ہو۔ اس نے تو وسیع تر انسانیت کو اپیل کرنے کا دروازہ خود ہی بند کر دیا، پہلے ہی قدم پر اپنی پوزیشن کو آپ غلط کر کے رکھ دیا۔ قوم پرستی کے تعصّب میں جو قومیں اندھی ہو رہی ہیں، جن کے لڑائی جھگڑوں کی ساری بنیاد ہی قوم پرستی اور قومی ریاستیں ہیں، اُن کو انسانیت کے نام پر پکارنے اور انسانی فلاح کے اصول کی طرف بُلانے کا آخر یہ کونسا ڈھنگ ہے کہ ہم خود اپنے قومی حقوق کے جھگڑے اور قومی اسٹیٹ کے مطالبہ سے اس دعوت کی ابتدا کریں؟ کس طرح آپ کی عقل یہ بات قبول کرتی ہے کہ مقدمہ بازی سے لوگوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو رد کرنے کی تحریک خود ایک مقدمہ عدالت میں دائر کرنے سے شروع کی جاسکتی ہے؟

خلافتِ الٰہیہ

اسلامی حکومت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اُس کی پوری عمارت خدا کی حاکمیت کے تصور پر قائم کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ملک خدا کا ہے۔ وہی اس کا حاکم ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا طبقہ یا قوم کو بلکہ پوری انسانیت کو بھی حاکمیت (Sovereignty) کے حقوق حاصل نہیں ہیں۔ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق صرف خدا کے لیے خاص ہے۔ حکومت کی صحیح شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ انسان خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرے، اور یہ حیثیت صحیح طور پر صرف دو صورتوں سے قائم ہوسکتی ہے: یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست خدا کی طرف سے قانون اور دستورِ حکومت آیا ہو، یا وہ اُس شخص کی پیروی اختیار کرے جس کے پاس خدا کی طرف سے قانون اور دستور آیا ہے۔ اس خلافت کے کام میں تمام وہ لوگ شریک ہوں گے جو اس قانون پر ایمان لائیں اور اس کی پیروی کرنے پر تیار ہوں۔ یہ کام اس احساس کے ساتھ چلایا جائے گا کہ ہم سب بہ حیثیتِ مجموعی، اور ہم میں سے ہر ایک فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہے، اُس خدا کے سامنے جو ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جس کے علم سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، اور جس کی گرفت سے ہم مر کر بھی نہیں چھوٹ سکتے۔ خلافت کی ذمہ داری جو ہمارے سپرد کی گئی ہے، یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم لوگوں پر اپنا حکم چلائیں، اُن کو اپنا غلام بنائیں، ان کے سر اپنے آگے جھکوائیں، اُن سے ٹیکس وصول کر کے اپنے محل تعمیر کریں، حاکمانہ اختیارات سے کام لے کر اپنے عیش، اپنی نفس پرستی اور اپنی کبریائی کا سامان کریں، بلکہ یہ سارا بار ہم پر اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ہم خدا کے قانونِ عدل کو اس کے بندوں پر جاری کریں۔ اُس قانون کی پابندی

ا؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میرا رسالہ "اسلام کا نظریۂ سیاسی"۔ (قدیم)

اور اس کے نفاذ میں ہم نے اگر ذرا سی کوتاہی بھی کی، اگر ہم نے اس کام میں ذرہ برابر بھی خود غرضی، نفس پرستی، تعصب، جانب داری یا بد دیانتی کو دخل دیا تو ہم خدا کی عدالت سے سزا پائیں گے خواہ دنیا میں ہر سزا سے محفوظ رہ جائیں۔

اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومتوں (Secular States) سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اُس کی ترکیب، اُس کا مزاج، اُس کی فطرت، کوئی چیز بھی اُن سے نہیں ملتی۔ اُس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت، اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔ اُس کی فوج، اُس کی پولیس، اُس کی عدالت، اُس کے مالیات، اُس کے قوانین، اُس کے محاصل، اُس کی انتظامی پالیسی، اُس کی خارجی سیاست، اُس کی صلح و جنگ کے معاملات، سب کے سب دنیوی ریاستوں سے مختلف ہیں۔ اِن کی عدالتوں کے چیف جسٹس اُس کی عدالت کے کلرک بلکہ چپراسی تک بننے کے اہل نہیں ہو سکتے۔ اِن کی پولیس کے انسپکٹر جنرل وہاں کانسٹیبل کی جگہ کے لیے بھی موزوں نہیں ٹھیرتے۔ اِن کے جنرل اور فیلڈ مارشل وہاں سپاہیوں میں بھرتی کرنے کے قابل بھی نہیں۔ اِن کے وزرائے خارجہ وہاں کسی منصب پر تو کیا فائز ہوں گے، شاید اپنے جھوٹ، دغا، اور بددیانتیوں کی بدولت جیل جانے سے بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ غرض وہ تمام لوگ جو اِن حکومتوں کے کاروبار چلانے کے لیے تیار کیے گئے ہوں، جن کی اخلاقی و ذہنی تربیت اِن کے مزاج کے مناسبِ حال کی گئی ہو، اسلامی حکومت کے لیے قطعی ناکارہ ہیں۔ اُس کو اپنے شہری، اپنے ووٹر، اپنے کونسلر، اپنے اہل کار، اپنے سپاہی، اپنے جج اور مجسٹریٹ، اپنے محکموں کے ڈائرکٹر، اپنی فوجوں کے قائد، اپنے خارجی سفراء اور اپنے وزیر، غرض اپنی اجتماعی زندگی کے تمام اجزاء، اپنی انتظامی مشین کے تمام پُرزے، بالکل ایک نئی ساخت کے درکار ہیں۔ اس کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتے ہوں، جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے والے ہوں، جن کی نگاہ میں اخلاقی نفع و نقصان کا وزن دنیوی نفع و نقصان سے زیادہ ہو، جو ہر حال میں اُس

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضابطے اور اُس طرزِ عمل کے پابند ہوں جو ان کے لیے مستقل طور پر بنا دیا گیا ہے، جن کی تمام سعی و جہد کا ہدفِ مقصود خدا کی رضا ہو، جن پر شخصی یا قومی اغراض کی بندگی اور ہوا و ہوس کی غلامی مسلط نہ ہو، جو تنگ نظری و تعصب سے پاک ہوں، جو مال اور حکومت کے نشہ میں بدمست ہو جانے والے نہ ہوں، جو دولت کے حریص اور اقتدار کے بھوکے نہ ہوں، جن کی سیرتوں میں یہ طاقت ہو کہ جب زمین کے خزانے اُن کے دستِ قدرت میں آئیں تو وہ پکے امانت دار ثابت ہوں، جب بستیوں کی حکومت ان کے ہاتھ میں آئے تو وہ راتوں کی نیند سے محروم ہو جائیں اور لوگ ان کی حفاظت میں اپنی جان، مال، آبرو، ہر چیز کی طرف سے بے خوف رہیں، جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوں تو لوگوں کو ان سے قتل و غارت گری، ظلم و ستم اور بدکاری و شہوت رانی کا کوئی اندیشہ نہ ہو، بلکہ ان کے ہر سپاہی کو مفتوح ملک کے باشندے اپنی جان و مال اور اپنی عورتوں کی عصمت کا محافظ پائیں، جن کی دھاک بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ کی ہو کہ اُن کی راستی، انصاف پسندی، اصولِ اخلاق کی پابندی اور عہد و پیمان پر تمام دنیا میں اعتماد کیا جائے۔ اس قسم کے اور صرف اسی قسم کے لوگوں سے اسلامی حکومت بن سکتی ہے۔ اور یہی لوگ اس کو چلا سکتے ہیں۔ رہے مادہ پرست، افادی ذہنیت (Utilitarian Mentality) رکھنے والے لوگ، جو دنیوی فائدوں اور شخصی یا قومی مصلحتوں کی خاطر ہمیشہ ایک نیا اصول بناتے ہوں، جن کے پیشِ نظر نہ خدا ہو، نہ آخرت، بلکہ جن کی ساری کوششوں کا مرکز و محور اور ساری پالیسیوں کا مدار صرف دنیوی فائدہ و نقصان ہی کا خیال ہو، وہ ایسی حکومت بنانے یا چلانے کے قابل تو کیا ہوں گے، اُن کا اِس حکومت کے دائرے میں موجود ہونا ہی ایک عمارت میں دیمک کی موجودگی کا حکم رکھتا ہے۔

اسلامی انقلاب کی سبیل

اسلامی حکومت کی اس نوعیت کو ذہن میں رکھ کر غور کیجیے کہ اس منزل تک پہنچنے کی کیا سبیل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں، کسی سوسائٹی میں جس قسم

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیے فکری، اخلاقی، تمدنی اسباب و محرکات فراہم ہوتے ہیں، اُن کے تعامل سے اُسی قسم کی حکومت وجود میں آتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک درخت اپنی ابتدائی کونپل سے لے کر پورا درخت بننے تک تو لیموں کی حیثیت سے نشو و نما پائے، مگر بار آوری کے مرحلے پر پہنچ کر یکایک آم کے پھل دینے لگے۔ درحقیقت اسلامی حکومت کسی معجزے کی شکل میں صادر نہیں ہوتی۔ اس کے پیدا ہونے کے لیے ناگزیر ہے کہ ابتدا میں ایک ایسی تحریک اُٹھے جس کی بنیاد میں وہ نظریۂ حیات، وہ مقصدِ زندگی، وہ معیارِ اخلاق، وہ سیرت و کردار ہو جو اسلام کے مزاج سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے لیڈر اور کارکن صرف وہی لوگ ہوں جو اس خاص طرز کی انسانیت کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے مستعد ہوں۔ پھر وہ اپنی جدّوجہد سے سوسائٹی میں اسی ذہنیت اور اُسی اخلاقی رُوح کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ پھر اسی بنیاد پر تعلیم و تربیت کا ایک نیا نظام اُٹھے جو اس مخصوص ٹائپ کے آدمی تیار کرے۔ اس سے مسلم سائنٹسٹ، مسلم فلسفی، مسلم مؤرخ، مسلم ماہرینِ مالیات و معاشیات، مسلم ماہرینِ قانون، مسلم ماہرینِ سیاست، غرض ہر شعبۂ علم و فن میں ایسے آدمی پیدا ہوں جو اپنی نظر و فکر کے اعتبار سے مسلم ہوں، جن میں یہ قابلیت ہو کہ افکار و نظریات کا ایک پورا نظام اور عملی زندگی کا ایک مکمل خاکہ اسلامی اصولوں پر مرتب کر سکیں، اور جن میں اتنی طاقت ہو کہ دنیا کے ناخدا شناس ائمۂ فکر کے مقابلہ میں اپنی عقلی و ذہنی ریاست (Intellectual Leadership) کا سکہ جما دیں۔[1]

اس دماغی پس منظر کے ساتھ یہ تحریک عملاً اس غلط نظامِ زندگی کے خلاف جدّوجہد کرے جو گرد و پیش پھیلا ہوا ہے۔ اس جدّوجہد میں اس کے علمبردار مصیبتیں اُٹھا کر، سختیاں جھیل کر، قربانیاں دے کر، مار کھا کر اور جانیں دے کر اپنے خلوص اور اپنے ارادے کی مضبوطی کا ثبوت دیں۔ آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں اور ایسا سونا بن کر نکلیں جس کو ہر پرکھنے والا ہر طرح سے جانچ کر بے کھوٹ کامل العیار (Finest Standard) سونا ہی

---

[1] ملاحظہ ہو میرا رسالہ "نیا نظامِ تعلیم"۔ (قدیم)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پائے۔ اپنی لڑائی کے دوران میں اپنے ہر قول اور ہر فعل سے اپنی اُس مخصوص آئیڈیالوجی کا مظاہرہ کریں جس کے علمبردار بن کر وہ اُٹھے ہیں۔ اور ان کی ہر بات سے عیاں ہو کہ ایسے بے لوث، بے غرض، راست باز، پاک سیرت، ایثار پیشہ، با اصول، خدا ترس لوگ انسانیت کی فلاح کے لیے جس اصولی حکومت کی طرف دعوت دے رہے ہیں اُس میں ضرور انسان کے لیے عدل اور امن ہوگا۔ اِس طرح کی جدوجہد سے سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جن کی فطرت میں کچھ بھی نیکی اور راستی موجود ہے اس تحریک میں کھنچ آئیں گے، پست سیرت لوگوں اور ادنیٰ درجے کے طریقوں پر چلنے والوں کے اثرات اُس کے مقابلہ میں دبتے چلے جائیں گے، عوام کی ذہنیت میں ایک انقلاب رونما ہوگا، اجتماعی زندگی میں اُس مخصوص نظامِ حکومت کی پیاس پیدا ہو جائے گی، اور اِس بدلی ہوئی سوسائٹی میں کسی دوسرے طرز کے نظام کا چلنا مشکل ہو جائے گا۔ آخر کار ایک لازمی اور طبعی نتیجہ کے طور پر وہی نظامِ حکومت قائم ہو جائے گا جس کے لیے اِس طرح پر زمین تیار کی گئی ہو۔ اور جوں ہی کہ وہ نظام قائم ہوگا، اُس کو چلانے کے لیے ابتدائی اہل کاروں سے لے کر وزراء اور نظماء تک ہر درجہ کے مناسب کل پُرزے اُس نظامِ تعلیم و تربیت کی بدولت موجود ہوں گے جس کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں۔

یہ ہے اس انقلاب کے ظہور اور اس حکومت کی پیدائش کا فطری طریقہ جس کو اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ دنیا کے انقلابات کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ آپ سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ایک خاص نوعیت کا انقلاب اُسی نوعیت کی تحریک، اُسی نوعیت کے لیڈر اور کارکن اور اُسی نوعیت کا اجتماعی شعور اور تمدنی و اخلاقی ماحول چاہتا ہے۔ انقلابِ فرانس کو وہی خاص اخلاقی و ذہنی اساس درکار تھی جو روسو، والٹیر اور مونٹسکیو جیسے لیڈروں نے تیار کی۔ انقلابِ روس صرف مارکس کے افکار اور لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ اور اُن ہزارہا اشتراکی کارکنوں ہی کی بدولت رونما ہو سکتا تھا جن کی زندگیاں اشتراکیت کے سانچے میں ڈھل چکی تھیں۔ جرمنی کا نیشنل سوشلزم اُسی مخصوص اخلاقی، نفسیاتی اور تمدنی زمین ہی میں جڑ پکڑ سکتا تھا جو ہیگل،

فشتے، گیوٹے، نیتشے، اور بہت سے مفکرین کے نظریات اور ہٹلر کی لیڈر شپ نے تیار کیا۔
اسی طرح سے اسلامی انقلاب بھی صرف اُسی صورت میں برپا ہو سکتا ہے جب کہ ایک عمومی تحریک قرآنی نظریات و تصورات اور محمدی سیرت و کردار کی بنیاد پر اُٹھے اور اجتماعی زندگی کی ساری ذہنی، اخلاقی، نفسیاتی اور تہذیبی بنیادوں کو طاقت ور جدّوجہد سے بدل ڈالے۔
یہ بات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قوم پرستانہ نوعیت کی کوئی تحریک، جس کا پس منظر ناقص نظام تعلیم ہو جو اس وقت ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، اور جس کی بنیاد افادی اخلاقیات (Utilitarian Morals) اور مصلحت پرستی (Pragmatism) پر ہو، اسلامی انقلاب آخر کس طرح برپا سکتی ہے؟ میں اُس قسم کے معجزات پر یقین نہیں رکھتا جن پر فرانس کے سابق وزیر اعظم موسیو ریو یقین رکھتے تھے[1]۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ جیسی تدبیر کی جائیگی ویسے ہی نتائج برآمد ہوں گے۔

خام خیالیاں

ہمارے ہاں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ بس مسلمانوں کی تنظیم ان کے تمام دردوں کی دوا ہے "اسلامی حکومت" یا "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کے مقصد تک پہنچنے کی سبیل یہ سمجھی جا رہی ہے کہ مسلمان قوم جن افراد سے مرکب ہے وہ سب ایک مرکز پر جمع ہوں، متحد ہوں، اور ایک مرکزی قیادت کی اطاعت میں کام کریں۔ لیکن دراصل یہ قوم پرستانہ پروگرام ہے۔ جو قوم بھی اپنا بول بالا کرنے کے لیے جدّوجہد کرنا چاہے گی وہ یہی طریق کار اختیار کرے گی خواہ وہ ہندو قوم ہو، یا سکھ، یا جرمن، یا اطالوی۔ قوم کے عشق میں ڈوبا ہوا ایک لیڈر، جو موقع و محل کے لحاظ سے مناسب چالیں چلنے میں ماہر ہو اور جس میں حکم چلانے کی خاص قابلیت موجود ہو، ہر قوم کی سربلندی کے لیے مفید ہوتا ہے، خواہ

---

[1] دوسری جنگ عظیم میں فرانس کی شکست سے چند روز پہلے موسیو ریو نے، جو اس وقت وزیر اعظم تھے، ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اب فرانس کو صرف ایک معجزہ ہی بچا سکتا ہے اور میں معجزات کا قائل ہوں"۔ (قدیم)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ موسیٰ بے باساور کر ہو، یا ہٹلر یا مسولینی۔ ایسے ہزاروں لاکھوں نوجوان جو قومی عزائم کے لیے اپنے لیڈر کی اطاعت میں منظم حرکت کر سکتے ہوں، ہر قوم کا جھنڈا بلند کر سکتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ جاپانیت پر ایمان رکھتے ہوں یا چینیت پر۔ پس اگر "مسلمان" ایک نسلی و تاریخی قومیت کا نام ہے اور پیشِ نظر مقصد صرف اُس کا بول بالا کرنا ہے تو اس کے لیے واقعی یہی سبیل ہے جو تجویز کی جارہی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ایک قومی حکومت بھی میسّر آسکتی ہے اور بدرجۂ اوّل وطنی حکومت میں اچھا خاصا حصّہ بھی مل سکتا ہے۔ لیکن اسلامی انقلاب اور اسلامی حکومت کے مقصد تک پہنچنے کے لیے یہ پہلا قدم بھی نہیں بلکہ اُلٹا قدم ہے۔

یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب ویابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیرکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں، اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ، اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے مؤکل کی پیروی کرتے وقت خدا کے خوف سے اُتنا ہی خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پاکر، یا ایک مسلمان عہدہ دار حکومت پاکر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کرکے ایک منظم گلّہ بنادینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہشیاری سکھانا، یا فوجی تربیت سے اُن میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کر دینا جنگل کی فرماں روائی حاصل کرنے کے لیے تو مفید ہو سکتا ہے، مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کون اُن کی اخلاقی برتری تسلیم کرے گا؟ کس کی نگاہیں اُن کے سامنے عزت سے جھکیں گی؟ کس کے دل میں انہیں دیکھ کر اسلام کے لیے جذبۂ احترام پیدا ہوگا؟ کہاں ان کے "انفاسِ قدسیہ" سے

یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا کا منظر دکھائی دے سکے گا؟ کس جگہ ان کی روحانی امامت کا سکہ جمے گا؟ اور زمین پر بسنے والے کہاں اُن کا خیر مقدم اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے کریں گے؟ اعلائے کلمۃ الحق جس چیز کا نام ہے اُس کے لیے تو صرف اُن کارکنوں کی ضرورت ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور خدا کے قانون پر فائدہ و نقصان کی پروا کیے بغیر جمنے والے ہوں، خواہ وہ اِس نسلی مسلمان قوم میں سے ملیں یا کسی دوسری قوم سے بھرتی ہو کر آئیں۔ ایسے دس آدمی اس مقصد کے لیے زیادہ قیمتی ہیں بہ نسبت اس کے کہ وہ انبوہ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں ۲۵ لاکھ یا پچاس لاکھ کی تعداد میں بھرتی ہو جائے۔ اسلام کو تانبے کے اُن سکّوں کا خزانہ مطلوب نہیں ہے جن پر اشرفی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو۔ وہ سکّہ کے نقوش دیکھنے سے پہلے یہ دریافت کرتا ہے کہ ان نقوش کے نیچے خالص سونے کا جوہر بھی ہے یا نہیں۔ ایسا ایک سکہ جعلی اشرفیوں کے ڈھیر سے اس کے نزدیک زیادہ قیمتی ہے۔

پھر جس لیڈر شپ کی اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ضرورت ہے وہ ایسی لیڈر شپ ہے جو اُن اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنے کے لیے تیار نہ ہو جن کا بول بالا کرنے کے لیے اسلام اُٹھا ہے، خواہ اِس ہٹ کی بدولت تمام مسلمان بھوکے ہی کیوں نہ مر جائیں بلکہ تہ تیغ ہی کیوں نہ کر دیئے جائیں۔ ہر معاملہ میں اپنی قوم کا فائدہ تلاش کرنے والی اور اصول سے بے نیاز ہو کر ہر اُس تدبیر کو جس میں قوم کی دنیوی فلاح نظر آتے، اختیار کر لینے والی لیڈر شپ اور وہ لیڈر شپ جس میں تقویٰ اور خدا ترسی کا رنگ مفقود ہو، اُس مقصد کے لیے قطعی ناکارہ ہے جس پر اسلام نے اپنی نظر جما رکھی ہے۔

پھر وہ نظامِ تعلیم و تربیت جس کی بنیاد اس مشہور مقولہ پر رکھی گئی ہے کہ "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" اُس اسلام کی خدمت کے لیے کس طرح موزوں ہو سکتا ہے جس کا قطعی ناقابلِ ترمیم فیصلہ یہ ہے کہ ہوا خواہ کسی طرف کی ہو، تم بہرحال اُس راستہ پر چلو جو خدا نے تمہارے لیے معیّن کر دیا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج اگر آپ کو ایک خطۂ زمین حکومت کرنے کے لیے دے بھی دیا جائے تو آپ اِسلامی اصول پر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کا انتظام ایک دن بھی نہ چلا سکیں گے۔ اسلامی حکومت کی پولیس، عدالت، فوج، مال گذاری، فینانس، تعلیمات، اور خارجی پالیسی کو چلانے کے لیے جس ذہنیت اور جس اخلاقی روح رکھنے والے آدمیوں کی ضرورت ہے اُن کو فراہم کرنے کا کوئی بندوبست آپ نے نہیں کیا ہے۔ یہ تعلیم جو آپ کے کالجوں میں دی جارہی ہے، غیر اسلامی حکومت کے لیے سیکرٹری اور وزراء تک فراہم کرسکتی ہے، مگر بُرا نہ مانیے، اسلامی عدالت کے لیے چپراسی اور اسلامی پولیس کے لیے کانسٹیبل تک فراہم نہیں کرسکتی۔ اور یہ بات جدید تعلیم ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہمارا وہ پرانا نظامِ تعلیم جو حرکتِ زمین کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے، وہ بھی اس معاملہ میں اتنا ناکارہ ہے کہ اس دورِ جدید میں اسلامی حکومت کے لیے ایک قاضی، ایک وزیرِ مال، ایک وزیرِ جنگ، ایک ناظمِ تعلیمات اور ایک سفیر بھی مہیا نہیں کرسکتا۔ اس تیاری پر اسلامی حکومت کا حوصلہ! سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ یہ نام زبان پر لاتے ہیں اُن کے ذہن اسلامی حکومت کے صحیح تصور سے خالی ہیں۔

بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی، مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے، پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعہ سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں، اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، حکومت کا نظام اجتماعی زندگی میں بڑی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ جب تک اجتماعی زندگی میں تغیر واقع نہ ہو، کسی مصنوعی تدبیر سے نظامِ حکومت میں کوئی مستقل تغیر پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ عمر ابن عبدالعزیز جیسا فرمانروا جس کی پشت پر تابعین و تبع تابعین کی ایک بڑی جماعت بھی تھی، اس معاملہ میں قطعی ناکام ہو چکا ہے، کیونکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی اس اصلاح کیلیے تیار نہ تھی۔ محمد تغلق اور عالمگیر جیسے طاقت ور بادشاہ اپنی شخصی دینداری کے باوجود نظامِ حکومت میں کوئی تغیر نہ کرسکے۔ مامون الرشید جیسا باجبروت حکمران نظامِ حکومت میں نہیں بلکہ صرف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی اوپری شکل میں خفیف سی تبدیلی پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس میں بھی ناکام ہوا۔ یہ اُس وقت کا حال ہے جب کہ ایک شخص کی طاقت بہت کچھ کر سکتی تھی۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جو قومی اسٹیٹ جمہوری طرز پر قائم ہوگا وہ اس بنیادی اصلاح میں آخر کس طرح مددگار ہو سکتا ہے۔ جمہوری حکومت میں اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھ میں آتا ہے جن کو ووٹروں کی پسندیدگی حاصل ہو۔ ووٹروں میں اگر اسلامی ذہنیت اور اسلامی فکر نہیں ہے، اگر وہ صحیح اسلامی سیرت و کردار کے عاشق نہیں ہیں، اگر وہ اُس بے لاگ عدل اور اُن بے لچک اصولوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جن پر اسلامی حکومت چلائی جاتی ہے، تو ان کے ووٹوں سے کبھی "مسلمان" قسم کے آدمی منتخب ہو کر پارلیمنٹ یا اسمبلی میں نہیں آ سکتے۔ اس ذریعہ سے تو اقتدار انہی لوگوں کو ملے گا جو مردم شماری کے رجسٹر میں چاہے مسلمان ہوں، مگر اپنے نظریات اور طریق کار کے اعتبار سے جن کو اسلام کی ہوا بھی نہ لگی ہو۔ اس قسم کے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُسی مقام پر کھڑے ہیں جس پر غیر مسلم حکومت میں تھے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر مقام پر، کیونکہ وہ "قومی حکومت" جس پر اسلام کا نمائشی لیبل لگا ہوگا، انقلاب کا راستہ روکنے میں اُس سے بھی زیادہ جری اور بے باک ہوگی جتنی غیر مسلم حکومت ہوتی ہے۔ غیر مسلم حکومت جن کاموں پر قید کی سزا دیتی ہے، وہ "مسلم قومی حکومت" ان کی سزا پھانسی اور جلاوطنی کی صورت میں دے گی اور پھر بھی اس حکومت کے لیڈر جیتے جی غازی اور مرنے پر رحمۃ اللہ علیہ ہی رہیں گے۔ پس یہ سمجھنا قطعی غلط ہے کہ اس قسم کی "قومی حکومت" کسی معنی میں بھی اسلامی انقلاب لانے میں مددگار ہو سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ہم کو اُس حکومت میں بھی اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے ہی کی کوشش کرنی پڑے گی، اور اگر ہمیں یہ کام حکومت کی امداد کے بغیر، بلکہ اس کی مزاحمت کے باوجود اپنی قربانیوں ہی سے کرنا ہوگا، تو ہم آج ہی سے یہ راہِ عمل کیوں نہ اختیار کریں؟ اُس نام نہاد "مسلم حکومت" کے انتظار میں اپنا وقت یا اُس کے قیام کی کوشش میں اپنی قوت ضائع کرنے کی حماقت آخر ہم کیوں کریں جس کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ وہ ہمارے مقصد کے لیے نہ صرف غیر مفید ہوگی بلکہ کچھ زیادہ ہی سدِّراہ ثابت ہوگی۔[1]

اسلامی تحریک کا مخصوص طریقِ کار

اب میں ایک مختصر تاریخی بیان کے ذریعہ سے اس امر کی تشریح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے لیے اجتماعی زندگی کی بنیادیں بدلنے اور از سرِ نو تیار کرنے کی صورت کیا ہوتی ہے، اور اس جدوجہد کا وہ مخصوص طریقِ کار (Technique) کیا ہے جس سے یہ کامیابی کی منزل تک پہنچتی ہے۔

اسلام دراصل اُس تحریک کا نام ہے جو خدائے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اِس کے لیڈر وہ لوگ تھے جن کو رُسُل اللہ (خدا کے فرستادے) کہا جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ انہی لیڈروں کے طرزِ عمل کی پیروی کرنی ہوگی، کیونکہ اِس کے سوا کوئی اور طرزِ عمل اِس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقشِ قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گزرے ہیں اُن کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل اسکیم نہیں بن سکتی۔ بائیبل کے عہدِ جدید (New Testament) میں سیّدنا مسیح علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلہ میں کس طرح چلائی جاتی ہے اور کن مسائل سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آئے کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔[2] اس معاملہ

---

[1] پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ سے یہ بات کس حد تک ثابت ہوئی ہے وہ ناظرین کے سامنے ہے۔ (جدید)

[2] چونکہ مسیح کا طریقِ تعلیم و تربیت بھی اس تحریک کے ابتدائی مرحلے کو سمجھنے کے لیے مفید ہے اس لیے انجیل متی و لوقا کے چند اقتباسات اِس مضمون کے ضمیمہ کے طور پر آخر میں درج کر دیئے گئے ہیں۔ (قدیم)

میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف اور مکمل رہنمائی ملتی ہے اور وہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی وجہ نری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے اسی طرف رجوع کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام لیڈروں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی، اور نظم مملکت کے نہج تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں۔ لہٰذا میں اسی ماخذ سے اس تحریک کے طریق کار کا ایک مختصر نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوتے ہیں تو آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریلزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ ناجائز معاشی انتفاع (Economic Exploitation) بھی ہو رہا تھا اور اخلاقی ذمائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل موجود تھے جو ایک لیڈر کے ناخنِ تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، طوائف الملوکی اور خانہ جنگی میں مبتلا تھی۔ کویت سے یمن تک مشرقی اور جنوبی عرب کے تمام ساحلی علاقے، عراق کے زرخیز صوبے سمیت ایرانی تسلط میں تھے، شمال میں حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گڑھ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی سودخواری کے جال میں پھانس رکھا تھا۔ مغربی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے مکہ پر چڑھائی کر چکی تھی۔ اس کے ہم مذہب اور اس سے ایک گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان نجران کے مقام پر موجود تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر جس لیڈر کو اللہ نے رہنمائی کے لیے مقرر کیا تھا اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی توجہ نہ کی، بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اُسی ایک اللہ کی بندگی قبول کرو۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اُس رہنمائی نگاہ میں دوسرے مسائل کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے، یا وہ کسی توجہ کے لائق ہی نہ تھے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ آگے چل کر اس نے ان سب مسئلوں کی طرف توجہ کی اور ان سب کو ایک ایک کرکے حل کیا۔ مگر ابتدا میں ان سب کی طرف سے نظر پھیر کر اسی ایک چیز پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدّنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی بنیادی علت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار (Independent) اور غیر ذمّہ دار (Irresponsible) سمجھنا، بالفاظِ دیگر آپ اپنا الٰہ بننا ہے، یا پھر یہ ہے کہ وہ اللہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو صاحب امر تسلیم کرے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ چیز جب تک جڑ میں موجود ہے اسلامی نظریہ کی رُو سے کوئی اُوپری اصلاح، انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دُور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دُور کیا جائے گا اور کسی دوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری کی ہوا کو نکالا جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اس کا ایک بادشاہ موجود ہے، اور اس کی بادشاہی تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے مٹائے سے مٹ سکتی ہے، نہ تو اس کے حدودِ سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اس اٹل اور اَٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہوگا۔ عقل اور حقیقت پسندی (Realism) کا تقاضا یہ ہے کہ سیدھی طرح اُس کے حکم کے آگے سر جھکا دے اور مطیع بندہ بن کر رہ۔ دوسری طرف اُس کو واقعہ کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختار کار ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ واقع میں کسی کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکم چلتا ہے۔ اس لیے تو اس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن۔ کسی کا حکم نہ مان۔ کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہز ہائینس نہیں ہے، ہائینس صرف ایک ہی کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے، ہولی نس ساری کی ساری اسی ایک کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے، لارڈ شپ بالکلیہ اسی ایک کا حصہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز (Law Giver) نہیں ہے، قانون اُسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حق دار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی ان داتا، کوئی ولی و کارساز، کوئی دعائیں سُننے والا اور فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہٰذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے اور اُسی ایک کا غلام، مطیع اور پابندِ حکم بن جا۔ یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت اُدھڑ کر از سرِ نو ایک نئے نقشے پر بنتی ہے اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدمؑ سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہِ راست پیش کر دیا۔ انہوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہ کیا کہ پہلے کچھ سیاسی یا سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جاتے، پھر اس اثر سے کام لے کر کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک لے آئیں۔ یہ سب کچھ، کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا، اور چھوٹتے ہی اُس نے لا الٰہ الا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی نظر نہ ٹھیری۔ اس کی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور جوش نہیں ہے۔ دراصل اسلامی تحریک کا طریق کار ہی یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیدا کیا جائے، اِس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں۔ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آپ کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اِس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اِس کام میں تو وہی لوگ مفید ہوسکتے ہیں جو آپ کی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سُن کر ہی آئیں، اِسی چیز میں ان کے لیے کشش ہو، اِسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں، اور اِسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اُٹھیں۔ لہٰذا اسلامی تحریک کو چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبّر اور حکمتِ عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز اِسی دعوتِ توحید سے کیا جائے۔

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، اِس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری، یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے مؤذن کو اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سُن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سُننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے، لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اِس اعلان کا مقصد یہ ہے، اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اِس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرمانروا نہیں ہے، کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون کو میں نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود و اختیارات (Jurisdiction) مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب کا باغی اور سب سے منحرف ہوں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اِس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہوگئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو

اور درندے ہی درندے ہیں۔

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اس لیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اِس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت و پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق (Racial Superiority) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بُت کے پرستار کو اپنے بُت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہوا، اس لیے اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَاحِدَةٌ، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اِس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آئے جن کا ذہن صاف تھا، جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے، جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک دو دو چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست، آشنا، سب چھوٹ گئے۔ کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت و ریاست اور ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں، اِن کا آنا ضروری تھا، اِن کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ بڑھ سکتی تھی۔

اِن کا پہلا فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے بودی سیرت اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اِس طرف آہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا جس کی دراصل ضرورت

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آتے وہ اس بھٹی میں سے گزر کر آتے۔

پھر جو لوگ آتے ان کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے نہیں، بلکہ محض حق و صداقت کے لیے، صرف خدا اور اس کی رضا کی خاطر مصائب و آلام کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ اسی کے لیے وہ پٹتے، اسی کے لیے بھوکے مرتے، اسی کے لیے دنیا بھر کی جفاکاریوں کا تختۂ مشق بنتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی گئی جس کی ضرورت تھی۔ اُن کے اندر خالص اسلامی سیرت پیدا ہوتی۔ اُن کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اس زبردست تربیت گاہ میں کیفیت اسلامی کا طاری ہونا ایک طبعی ارتقا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اٹھتا ہے اور اس کی راہ میں کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اس ذاتی تجربہ کی بدولت اُس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اس کی پوری شخصیت اس مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے نماز اُن پر فرض کی گئی تاکہ نظر کی پراگندگی کا ہر امکان دور ہو جاتے۔ اپنے نصب العین پر اُن کی نگاہ جمی رہے، جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اس کی حاکمیت کا باربار اقرار کر کے وہ اپنے عقیدے میں مضبوط ہو جائیں، جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اس کا عالم الغیب والشہادۃ ہونا، اس کا مالک یوم الدین ہونا، اس کا قاھر فوق عبادہٖ ہونا پوری طرح اُن کے ذہن نشین ہو جاتے، اور کسی حال میں بھی اُس کی اطاعت کے سوا دوسرے کی اطاعت کا خیال تک اُن کے دل میں نہ آنے پاتے۔

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اس طرح ہو رہی تھی اور دوسری طرف اسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند انسان پیٹے جا رہے ہیں تو خواہ مخواہ ان کے اندر یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ان کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت ان پر منکشف ہوئی ہے، تو اُن کے دلوں میں آپ سے آپ یہ جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ اس چیز کو معلوم کریں، آخر ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا کہ وہ چیز ہے لا الٰہ الا اللہ، اور اس سے انسانی زندگی میں اس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، اور اس دعوت کو لے کر ایسے لوگ اُٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد، ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو اُن کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اُن کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اس پس منظر کے ساتھ یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت کے تکبر یا اجداد پرستی کی جہالت، یا اغراضِ دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اِس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اس کشمکش کی مزاحمت کرتا رہا، مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند، بے لوث آدمی کو اِس طرف کھنچنا ہی پڑا۔

اِس دوران میں تحریک کے لیڈر نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اصولوں کا اور ہر اُس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اُٹھی تھی، پورا پورا مظاہرہ کیا۔ ان کی ہر بات، ہر فعل اور ہر حرکت سے اسلام کی روح ٹپکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی تفصیل طلب بحث ہے جس کی تشریح کا یہاں موقع نہیں۔ مگر مختصراً چند نمایاں باتوں کا میں یہاں ذکر کروں گا۔

اُن کی بیوی حضرت خدیجہؓ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار عورت تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو آنحضرتؐ کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اس تحریک کے پھیلانے پر چند سال میں لٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک آئی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حجاز کا ملک اختیار تھا، اس کو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسر نہ ہوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حجاز کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں گے، عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دے دیں گے، دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے بشرطیکہ آپ اس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اٹھا تھا، اس نے ان سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمدؐ! ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام اور مفلس (معاذ اللہ) کمین لوگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے زیادہ نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد و پیش جمع کر رکھا ہے، انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلہ، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ اسی چیز نے دنیا کو یقین دلایا کہ آپ انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اٹھے ہیں، اور اسی چیز نے آپ کی دعوت کی طرف ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپ اس بات کے لیے کبھی بے چین ہوتے کہ قریش کے اقتدار کو کسی طرح بچاؤں تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپ عرب کی برتری کے لیے اٹھتے تو حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ اور فارس کے سلمانؓ کو کیا غرض تھی کہ اس کام میں آپ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی، ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔

مکہ سے جب آپ کو ہجرت کرنی پڑی تو وہ تمام امانتیں جو دشمنوں نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں حضرت علیؓ کے سپرد کر کے نکلے کہ میرے بعد ہر ایک کی امانت اس کو پہنچا دینا۔ دنیا پرست ایسے موقع پر جو کچھ ہاتھ لگتا ہے، لے کر چلتے ہیں۔ مگر خدا پرست نے اپنی جان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے دشمنوں، اپنے خون کے پیاسوں کا مال بھی انہیں واپس پہنچانے کی فکر کی اور اُس وقت کی جب کہ وہ اس کے قتل کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ وہ اخلاق تھا جس کو دیکھ کر عرب کے لوگ دنگ رہ گئے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ جب وہ دو سال کے بعد بدر کے میدان میں آنحضرتؐ کے خلاف لڑنے کھڑے ہوتے ہوں گے تو ان کے دل اندر سے کہہ رہے ہوں گے کہ یہ تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اُس فرشتہ خصلت انسان سے جو قتل گاہ سے رخصت ہوتے وقت بھی انسانوں کے حقوق اور امانت کی ذمہ داری کو نہیں بھولتا؟ اُس وقت ان کے ہاتھ ضد کی بنا پر لڑتے ہوں گے مگر ان کے دل اندر سے چیخ رہے ہوں گے۔ عجب نہیں کہ بدر میں کفار کی شکست کے اخلاقی اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہو۔

۱۳ برس کی شدید جدوجہد کے بعد وہ وقت آیا جب مدینہ میں اسلام کا ایک چھوٹا سا اسٹیٹ قائم کرنے کی نوبت آئی۔ اس وقت ڈھائی تین سو کی تعداد میں ایسے آدمی فراہم ہو چکے تھے جن میں سے ایک ایک اسلام کی پوری تربیت پا کر اس قابل ہو چکا تھا کہ جس حیثیت میں بھی اُسے کام کرنے کا موقع ملے مسلمان کی حیثیت سے اُس کو انجام دے سکے۔ اب یہ لوگ ایک اسلامی اسٹیٹ کو چلانے کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ وہ قائم کر دیا گیا۔ دس برس تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسٹیٹ کی رہنمائی کی اور اس مختصر سی مدت میں ہر شعبۂ حکومت کو اُس اسلامی طرز پر چلانے کی پوری مشق ان لوگوں کو کرا دی۔ یہ دَور اسلامی آئیڈیالوجی کے ایک مجرّد تخیل (Abstract Idea) سے ترقی کر کے ایک مکمل نظام تمدن بننے کا دَور ہے جس میں اسلام کی انتظامی، تعلیمی، عدالتی، معاشی، معاشرتی، مالی، جنگی، بین الاقوامی پالیسی کا ایک ایک پہلو واضح ہوا، ہر شعبۂ زندگی کے لیے اصول بنے، اُن اصولوں کو عملی حالات پر منطبق کیا گیا، اس خاص طرز پر کام کرنے والے کارکن تعلیم اور تربیت اور عملی تجربہ سے تیار کیے گئے، اور ان لوگوں نے اسلام کی حکمرانی کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں مدینہ جیسے ایک چھوٹے سے قصبہ کا اسٹیٹ پورے عرب کی سلطنت میں تبدیل ہو گیا۔ جوں جوں لوگ اسلام کو اُس کی عملی صورت میں اور اس کے نتائج کو محسوس شکل میں دیکھتے تھے، خود بخود اس بات کے قائل ہو جاتے تھے کہ فی الواقع انسانیت اس کا نام ہے اور انسانی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فلاح اسی چیز میں ہے۔ بدترین دشمنوں کو بھی آخر قائل ہو کر اسی مسلک کو قبول کرنا پڑا جس کے خلاف وہ لڑ رہے تھے۔ خالد بن ولید قائل ہو گئے۔ ابو جہل کے بیٹے عکرمہ قائل ہو گئے۔ ابوسفیان قائل ہو گئے۔ قاتلِ حمزہ وحشی قائل ہو گئے۔ ہندہ جگر خوار تک کو آخر اس شخص کی صداقت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا جس سے بڑھ کر اس کی نگاہ میں کوئی مبغوض نہ تھا۔

غلطی سے تاریخ نگاروں نے غزوات کو اتنا نمایاں کر دیا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں عرب کا یہ انقلاب لڑائیوں سے ہوا۔ حالانکہ آٹھ سال کی تمام لڑائیوں میں جن سے عرب جیسی جنگجو قوم مسخر ہوئی، طرفین کے جانی نقصان کی تعداد ہزار بارہ سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انقلابات کی تاریخ اگر آپ کے پیش نظر ہے تو آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ انقلاب غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہے جانے کا مستحق ہے۔ پھر اس انقلاب میں فقط ملک کا طریقِ انتظام ہی تبدیل نہیں ہوا بلکہ ذہنیتیں بدل گئیں، نگاہ کا زاویہ بدل گیا، سوچنے کا طریقہ بدل گیا، زندگی کا طرز بدل گیا، اخلاق کی دنیا بدل گئی، عادات اور خصائل بدل گئے، غرض ایک پوری قوم کی کایا پلٹ کر رہ گئی۔ جو زانی تھے وہ عورتوں کی عصمت کے محافظ بن گئے۔ جو شرابی تھے وہ منعِ شراب کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ جو چور اور اُچکے تھے ان کا احساسِ دیانت اتنا نازک ہو گیا کہ دوستوں کے گھر کھانا کھانے میں بھی ان کو اس بنا پر تامل تھا کہ کہیں ناجائز طریقہ پر دوسروں کے مال کھانے کا اطلاق اس فعل پر بھی نہ ہوتا ہو، حتیٰ کہ قرآن میں خود اللہ تعالیٰ کو انہیں اطمینان دلانا پڑا کہ اس طرح کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں[1]۔ جو ڈاکو اور لٹیرے تھے وہ اتنے متدین بن گئے کہ ان کے ایک معمولی سپاہی کو پایۂ تخت ایران کی فتح کے موقع پر کروڑوں کی قیمت کا شاہی تاج ہاتھ لگا اور وہ رات کی تاریکی میں اپنے پیوند لگے ہوئے کمبل میں اسے چھپا کر سپہ سالار کے حوالے کرنے کے لیے پہنچا تاکہ اس غیر معمولی واقعہ سے اس کی دیانت کی شہرت نہ ہو جائے اور اس کے خلوص پر ریاکاری کا میل نہ آ جائے۔

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ نور، آیت ۶۱۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ جن کی نگاہ میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی، جو اپنی بیٹیوں کو آپ اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کرتے تھے، ان کے اندر جان کا اتنا احترام پیدا ہو گیا کہ کسی مرغ کو بھی بے رحمی سے قتل ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ جن کو راست بازی اور انصاف کی ہوا تک نہ لگی تھی ان کے عدل اور راستی کا یہ حال ہو گیا کہ خیبر کی صلح کے بعد جب ان کا تحصیل دار یہودیوں سے سرکاری معاملہ وصول کرنے گیا تو یہودیوں نے اس کو ایک بیش قرار رقم اس غرض کے لیے پیش کی کر وہ سرکاری مطالبہ میں کچھ کمی کر دے، مگر اس نے رشوت لینے سے انکار کر دیا اور حکومت اور یہودیوں کے درمیان پیداوار کا آدھا آدھا حصہ اس طرح تقسیم کیا کہ دو برابر کے ڈھیر آمنے سامنے لگا دیتے اور یہودیوں کو اختیار دیا کہ دونوں میں سے جس ڈھیر کو چاہیں اٹھالیں۔ اس نرالی قسم کے تحصیلدار کا یہ طرز عمل دیکھ کر یہودی انگشت بدنداں رہ گئے اور بے اختیار ان کی زبانوں سے نکلا کہ ایسی عدل پر زمین و آسمان قائم ہیں۔ ان کے اندر وہ گورنر پیدا ہوئے جو گورنمنٹ ہاؤسوں میں نہیں بلکہ رعایا کے درمیان انہی جیسے گھروں میں رہتے تھے، بازاروں میں پیدل پھرتے تھے، دروازوں پر دربان نہ رکھتے تھے اور رات دن میں ہر وقت جو چاہتا تھا ان سے انٹرویو کر سکتا تھا۔ ان کے اندر وہ قاضی پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے ایک یہودی کے خلاف خود خلیفہ وقت کا دعویٰ اس بنا پر خارج کر دیا کہ خلیفہ اپنے غلام اور اپنے بیٹے کے سوا کوئی گواہ پیش نہ کر سکا[1]۔ ان کے اندر وہ سپہ سالار پیدا ہوتے جن میں سے ایک نے دوران جنگ میں ایک شہر خالی کرتے وقت پورا جزیہ یہ کہہ کر اہل شہر کو واپس دے دیا کہ ہم اب تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں، لہٰذا جو ٹیکس ہم نے حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا اسے رکھنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ ان میں وہ سفیر پیدا ہوئے جن میں سے ایک نے سپہ سالار ایران کے بھرے دربار میں اسلام کے اصول مساوات انسانی کا ایسا مظاہرہ کیا اور ایران کے طبقاتی امتیازات پر ایسی برمحل تنقید کی کہ خدا جانے کتنے ایرانی سپاہیوں کے دلوں میں اس مذہب انسانیت کی عزت و وقعت کا بیج اسی وقت

---

[1] یہ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پڑ گیا ہوگا۔ اُن میں وہ شہری پیدا ہوتے جن کے اندر اخلاقی ذمّہ داری کا احساس اتنا زبردست تھا کہ جن جرائم کی سزا ہاتھ کاٹنے اور پتھر مار مار کر ہلاک کر دینے کی صورت میں دی جاتی تھی اُن کا اقبال خود آکر کرتے تھے اور تقاضا کرتے تھے کہ سزا دے کر انہیں گناہ سے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ چور یا زانی کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں نہ پیش ہوں۔ ان میں وہ سپاہی پیدا ہوتے جو تنخواہ لے کر نہیں لڑتے تھے بلکہ اس مسلک کی خاطر جس پر وہ ایمان لائے تھے، اپنے خرچ پر میدانِ جنگ میں جاتے اور پھر جو مالِ غنیمت ہاتھ لگتا وہ سارا کا سارا لا کر سپہ سالار کے سامنے رکھ دیتے۔ کیا اجتماعی اخلاق اور اجتماعی ذہنیت کا اتنا زبردست تغیّر محض لڑائیوں کے زور سے ہو سکتا تھا؟ تاریخ آپ کے سامنے موجود ہے۔ کہیں آپ کو کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ تلوار نے انسانوں کو اس طرح مکمل طور پر بدل ڈالا ہو؟

درحقیقت یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ۱۳ برس کی مدت میں تو کل ڈھائی تین سَو مسلمان پیدا ہوتے مگر بعد کے دس سال میں سارا کا سارا ملک مسلمان ہو گیا۔ اس معمے کو لوگ حل نہیں کر سکتے اس لیے عجیب عجیب توجیہیں کرتے ہیں۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ جب تک اس نئی آئیڈیالوجی پر زندگی کا نقشہ نہیں بنا تھا، لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نرالی قسم کا لیڈر آخر کیا بنانا چاہتا ہے۔ طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا ہوتے تھے۔ کوئی کہتا یہ نری شاعرانہ باتیں ہیں۔ کوئی اسے محض زبان کی ساحری قرار دیتا۔ کوئی کہتا کہ یہ شخص مجنون ہو گیا ہے، اور کوئی اُسے محض ایک خیالی آدمی (Visionary) قرار دے کر گویا اپنے نزدیک رائے زنی کا حق ادا کر دیتا۔ اس وقت صرف غیر معمولی سمجھ اور ذہانت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لائے جن کی نگاہِ حقیقت بیں اس نئے مسلک میں انسانی فلاح کی صورت صاف دیکھ سکتی تھی۔ مگر جب اس نظامِ فکر پر ایک مکمل نظامِ حیات بن گیا اور لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اس کو کام کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اُس کے نتائج ان کے سامنے عیاناً آگئے تب ان کی سمجھ میں آیا کہ یہ چیز تھی جس کو بنانے کے لیے وہ اللہ کا نیک بندہ دنیا بھر کے ظلم سہہ رہا تھا۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے لیے پاؤں جمانے کا کوئی موقع باقی نہ رہا جس کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں اور اُن آنکھوں میں نُور تھا اس کے لیے آنکھوں دیکھی حقیقت سے انکار

کرنا غیر ممکن ہو گیا۔

یہ ہے اُس اجتماعی انقلاب کے لانے کا طریقہ جس کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کا راستہ ہے، اسی ڈھنگ پر وہ شروع ہوتا ہے اور اسی تدریج سے وہ آگے بڑھتا ہے۔ لوگ اس کو معجزہ کی قسم کا واقعہ سمجھ کر کہہ دیتے ہیں کہ اب یہ کہاں ہو سکتا ہے، نبی ہی آئے تو یہ کام ہو۔ مگر تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ یہ بالکل ایک طبعی قسم کا واقعہ تھا۔ اس میں علت و معلول کا پورا منطقی اور سائنٹفک ربط ہمیں نظر آتا ہے۔ آج بھی ہم اُس ڈھنگ پر کام کریں تو وہی نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ اس کام کے لیے ایمان، شعورِ اسلامی، ذہن کی یکسوئی، مضبوط قوتِ فیصلہ، اور شخصی جذبات اور ذاتی امنگوں کی سخت قربانی درکار ہے۔ اس کے لیے اُن جواں ہمت لوگوں کی ضرورت ہے جو حق پر ایمان لانے کے بعد اس پر پوری طرح نظر جما دیں، کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ کریں۔ دنیا میں خواہ کچھ ہوا کرے، وہ اپنے نصب العین کے راستے سے ایک اِنچ نہ ہٹیں۔ دنیوی زندگی میں اپنی ذاتی ترقی کے سارے امکانات کو قربان کر دیں، اپنی اُمیدوں کا اور اپنے والدین کی تمناؤں کا خون کرتے ہوئے نہ جھجکیں، عزیزوں اور دوستوں کے چھوٹ جانے کا غم نہ کریں، سوسائٹی، حکومت، قانون، قوم، وطن جو چیز بھی ان کے نصب العین کی راہ میں حائل ہو اس سے لڑ جائیں۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی اللہ کا کلمہ بلند کیا تھا، ایسے ہی لوگ آج بھی کریں گے، اور یہ کام ایسے ہی لوگوں کے کیے سے ہو سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن۔ ستمبر ۱۹۴۰ء)

استدراک[ل]

اوپر کے مضمون میں اسلامی انقلاب کے طریق کار کی جو توضیح کی گئی ہے، اگرچہ وہ

ل یہ حصہ اُس اصل مقالہ میں شامل نہ تھا جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھا گیا تھا۔ بعد میں اشاعت کے موقع پر اس کا اضافہ کیا گیا۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بجائے خود کافی ہے، لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسیح علیہ السلام کے چند اقوال ایک خاص ترتیب کے ساتھ نقل کر دیئے جائیں جن سے اس تحریک کے ابتدائی مرحلہ پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ چونکہ ہمارے موجودہ زمانے کے حالات اُن حالات سے بہت ملتے جلتے ہیں جن میں سیدنا مسیح علیہ السلام نے اہلِ فلسطین کو حکومتِ الٰہیہ کی دعوت دی تھی اس لیے اُن کے طریقِ عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں:۔

"فقیہوں میں سے ایک نے ——— اُس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کونسا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ اوّل یہ ہے، اے اسرائیل سُن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے[1] اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ ——— فقیہ نے اُس سے کہا اے استاد، کیا خوب! تُو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں"

(مرقس - ۱۲ : ۲۸ - ۳۲)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اُسی کی عبادت کر"

(لوقا - ۴ : ۸)

"پس تم اس طرح دُعا مانگا کرو کہ اے ہمارے باپ[2]! تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو" (متی ۶ : ۹ - ۱۰)

آخری آیت میں حضرت مسیحؑ نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ جو عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد محض روحانی بادشاہت تھی،

---

[1] "خداوند" اور "الٰہ" دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ (قدیم)

[2] بنی اسرائیل کے ہاں خدا کے لیے باپ کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوتا تھا۔ اسے ساری خلق کا باپ کہا جاتا تھا اور اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ خلق اس کی اولاد ہے۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے۔ اُن کا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اُس کا حکم شرعی اُسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اُس کا قانونِ طبیعی نافذ ہے۔ اسی انقلاب کے لیے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔ اور جو کوئی اپنی صلیب[1] نہ اُٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔" (متی ۱۰: ۳۴-۳۹)

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی[2] سے انکار کرے اور اپنی صلیب اُٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے۔" (متی ۱۶: ۲۴)

"بھائی کو بھائی قتل کے لیے حوالے کرے گا اور بیٹے کو باپ۔ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے۔ مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔" (متی ۱۰: ۲۱-۲۲)

"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑوں کو بھیڑیوں کے بیچ میں ——— آدمیوں سے خبردار رہو۔ کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کریں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے

---

[1] اپنی صلیب آپ اٹھانے سے مراد سزائے موت کے لیے تیار رہنا ہے۔ جس طرح اردو میں محاورہ ہے سر ہتھیلی پر لے کر نکلنا۔ (قدیم)

[2] اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراضِ ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔ (قدیم)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔" (۱۰: ۱۶-۱۸)

"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے[1] تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اُٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک بُرج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر اس پر ہنسنا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عمارت شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا ——— تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کرے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔"

(لوقا ۱۴: ۲۶-۳۳)

یہ تمام آیات صاف دلالت کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں اُٹھے تھے بلکہ پورے نظام تمدّن و سیاست کو بدل دینا اُن کے پیشِ نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقیہوں اور فریسیوں کے اقتدار اور فی الجملہ تمام بندگانِ نفس و ہوائے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو کُھلے الفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے اور میرے ساتھ اُسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔" (متی ۵: ۳۹-۴۱)

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے ان سے نہ ڈرو

---

[1] دشمنی کرنے سے مراد اُن کی محبت اور ان کے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کر دینا ہے۔ (قدیم)

بلکہ اُس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کرسکتا ہے۔"

(متی ۱۰: ۲۸)

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں، بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو۔"

(متی ۶: ۱۹-۲۰)

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کرسکتا ——— تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کرسکتے ——— اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھائیں گے۔ یا کیا پئیں گے، اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے ——— ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں پھر بھی تمہارا آسمانی باپ اُن کو کھلاتا ہے۔ کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے ؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کرکے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے ؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو ؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں، نہ کاتتے ہیں۔ پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی شان و شوکت کے ان میں سے کسی کے مانند پوشاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو، تم کو کیوں نہ پہنائے گا ؟ ——— تم پہلے اُس کی بادشاہت اور اس کی راستبازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تمہیں مل جائیں گی۔" (متی ۶: ۲۴-۳۳)

"مانگو تو تمہیں دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔" (متی ۷: ۷)

عام غلط فہمی ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے رہبانیت اور ترک و تجرید کی تعلیم دی تھی۔ حالانکہ اس انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمل شدائد اور توکل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دیئے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ جہاں ایک نظام تمدن سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھایا ہوا ہو اور تمام وسائل و ذرائع زندگی اس کے قبضہ و اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انقلاب کے لیے اٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبت دل سے نکال نہ دے ؛ سختیاں اُٹھانے کو تیار نہ ہو جاتے ، اپنے بہت سے فوائد کو قربان کرنے اور بہت سے نقصانات گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔ حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات و مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہے۔ یہ کام جنہیں کرنا ہو انہیں ایک تھپڑ کھا کر دوسرے تھپڑ کے لیے تیار رہنا چاہیئے ، کُرتا ہاتھ سے جاتا ہو تو چوغہ بھی چھوڑنے کے لیے آمادہ ہونا چاہیئے ، اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہو جانا چاہیئے۔ خزائن رزق فی الوقت جن کے ہاتھ میں ہیں، ظاہر ہے کہ اُن سے لڑ کر رزق پانے کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا جو اسباب سے قطع نظر کر کے صرف خدا کے بھروسہ پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو وہی اُن سے لڑ سکتا ہے۔

"اے محنت اُٹھانے والو! بوجھ سے دبے ہوئے لوگو سب میرے پاس آؤ ، میں تمہیں آرام دوں گا۔ کیونکہ میرا جُوا ملائم ہے اور میرا بوجھ ہلکا"

(متی ۱۱ : ۲۸-۳۰)

شاید حکومتِ الٰہیہ کا مینی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پُر اثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ انسان پر انسانی حکومت کا جُوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کو الٰہی حکومت کا نقیب جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جوا میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں وہ نرم بھی ہے اور خفیف بھی۔

"غیر قوموں کے بادشاہ اُن پر حکومت چلاتے ہیں۔ اور جو اُن پر اختیار رکھتے ہیں وہ خداوند نعمت کہلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے کے مانند اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کے مانند ہے۔" (لوقا ۲۲: ۲۵-۲۶)

مسیح علیہ السلام یہ ہدایت اپنے حواریوں (یعنی صحابیوں) کو فرماتے تھے۔ اس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ انہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ہٹا کر تم خود فرعون و نمرود نہ بن جانا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

"فقیہ اور فریسی[1] موسیٰ کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن اُن کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے، باندھ کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھانے کو کرتے ہیں۔ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے اور ضیافتوں میں صدرنشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے رَبّی کہلانا پسند کرتے ہیں۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو، نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دَورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔"

"اے اندھے راہ بتانے والو! تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے، تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔" (متی ۲۳: ۲-۲۸)

---

[1] فریسی سے مراد حاملانِ شریعت ہیں۔ (قدیم)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر اُس وقت کے علماء اور حاملانِ شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود محض بندگیٔ نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے اور اس انقلاب کے راستہ میں رومی قیاصرہ سے بڑھ کر وہی حائل تھے۔

"اس وقت فریسیوں نے جا کر مشورہ کیا کہ اسے کیونکر باتوں میں پھنسائیں۔ پس انہوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں[1] کے ساتھ اُس کے پاس بھیجا اور انہوں نے (یعنی شاگردوں نے) کہا کہ اے استاد ہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا ———— ہمیں بتا تو کیا سمجھتا ہے قیصر کو جزیہ دینا روا ہے یا نہیں؟ یسوع نے ان کی شرارت جان کر کہا اے ریاکارو مجھے کیوں آزماتے ہو؟ جزیہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ دینار اس کے پاس لے آئے۔ اس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر اس نے کہا جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو خدا کا ہے خدا کو ادا کرو۔"

(متی ۲۲: ۱۵-۲۱)

اس قصّہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک چال تھی۔ فریسی اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے چاہتے تھے کہ حضرت مسیحؑ کا قبل از وقت حکومت سے تصادم کرا دیا جاتے اور تحریک کے جڑ پکڑنے سے پہلے حکومت کے زور سے اُسے کچلوا ڈالا جاتے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے یہ سوال اُٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جائے یا نہیں۔ جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے جو ذو معنی بات کہی اس کو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کرو اور اطاعت ہر اُس

---

[1] مسیح علیہ السلام کے زمانے میں فلسطین کے ایک حصّہ میں ہندوستان کی دیسی ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنتِ روم کی تابع فرمان تھی۔ اس کے بانی ہیرود کے نام پر اس کو عموماً ہیرودی ریاست کہتے تھے۔ ہیرودیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔ (قدیم)

حکومت کی کرتے رہو جو تمہارے زمانہ میں موجود ہو۔ لیکن دراصل مسیح علیہ السلام نے نہ تو یہ فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا روا ہے، کیونکہ ایسا کہنا اُن کی دعوت کے خلاف تھا، اور نہ یہ فرمایا کہ اُسے ٹیکس نہ دیا جائے، کیونکہ اُس وقت تک ان کی تحریک اِس مرحلہ تک نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس رد کرنے کا حکم دیا جاتا، اس لیے انہوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اس کی صورت تو قیصر ہی کو واپس کر دو، اور سونا جو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کر دو۔

اس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیح علیہ السلام کے حواریوں میں سے ایک کو رشوت دے کر اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیحؑ کو گرفتار کرائے جب کہ عام بلوے کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہوداہ سکریوتی نے مسیحؑ کو پکڑوا دیا۔

> "پھر اُن کی ساری جماعت اُٹھ کر اسے پیلاطُس (رومی حاکم) کے پاس لے گئی اور اُنہوں نے الزام لگانا شروع کیا کہ اسے ہم نے اپنی قوم کو بہکاتے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا ———— پیلاطس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کوئی قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہودیہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکھا سکھا کر اُبھارتا ہے ———— وہ چلا چلا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جائے اور اُن کا چلانا کارگر ہوا۔"

(لوقا ۲۳ : ۱ - ۲۳)

اس طرح دنیا میں حضرت مسیح علیہ السلام کا مشن اُن لوگوں کی بدولت ختم ہوا جو اپنے آپ کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی رُو سے حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت کا کُل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اِس مختصر مدت میں اُنہوں نے اُتنا ہی کام کیا جتنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کُل زندگی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ابتدائی دو تین سال میں کیا تھا۔ اگر کوئی شخص انجیل کی مذکورہ بالا آیات کا مقابلہ قرآن مجید کی مکی سورتوں اور زمانہ قیام مکہ کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائے گا۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک صالح جماعت کی ضرورت

دنیا میں اس وقت بڑے زور کے ساتھ توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے[1]۔ یہ ہم نہیں جانتے کہ أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا۔ (الجن۔ آیت ۱۰) اہلِ زمین کو محض ان کے کرتوتوں کی سزا ہی دینے کا ارادہ کیا گیا ہے یا اس توڑ پھوڑ کے بعد کوئی صالح چیز بھی بننے والی ہے۔ مگر ظاہر آثار سے اتنا محسوس ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی کی امامت اب تک جس تہذیب کے علمبرداروں کو حاصل رہی ہے، اس کی عمر پوری ہو چکی ہے، اُن کے امتحان کا زمانہ خاتمہ پر آلگا ہے، اور سنت اللہ کے مطابق اب وقت آگیا ہے کہ اُن کو اور اُن کی اس جاہلی تہذیب کو دنیا کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائے۔ اُن کو زمین پر کام کرنے کا جتنا موقع ملنا تھا، مل چکا۔ وہ اپنے تمام اوصاف اور اپنی تمام چھپی ہوئی قابلیتوں کا پورا پورا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ ان کے اندر شاید اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جو باہر نہ آچکی ہو۔ لہٰذا غالب گمان یہی ہے کہ عنقریب وہ میدان سے ہٹائے جانے والے ہیں، اور یہ زبردست شکست و ریخت اسی لیے ہو رہی ہے کہ وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مراسمِ تجہیز و تدفین ادا کر دیں۔ اس کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ دنیا میں پھر ایک

---

[1] اشارہ ہے دوسری جنگِ عظیم کی طرف جو اُس وقت بڑی شدت کے ساتھ چل رہی تھی۔ (جدید)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ظلمت کا دور شروع ہو جس طرح آخری اسلامی تحریک کے زوال اور موجودہ جاہلی تہذیب کی پیدائش کے درمیان گزر چکا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسی ٹوٹ پھوٹ کے دوران میں کسی نئی تعمیر کی صورت نکل آئے۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت، قومی اجتماعیت (نیشنل سوشلزم) اور اشتراکیت (کمیونزم) کی جو طاقتیں اس وقت آپس میں متصادم ہیں یہ دراصل الگ الگ تہذیبیں نہیں ہیں کہ ان کے درمیان انتخاب، اور ان میں سے بہتر کے باقی رہنے کا کوئی سوال ہو۔ حقیقت میں یہ ایک ہی تہذیب کی تین شاخیں ہیں۔ ایک ہی تصوّرِ کائنات، ایک ہی تصوّرِ انسان، ایک ہی نظریۂ حیات اور ایک ہی اساسِ اخلاق ہے جس پر ان تینوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ انسان کو حیوان سمجھنا، دنیا کو بے خدا فرض کرنا، علوم طبیعی سے انسانی زندگی کا قانون اخذ کرنا، اور اخلاق کی بنیاد تجربہ و مصلحت اور خواہشات پر رکھنا، یہ ان سب کی مشترک بنیاد ہے۔ ان کے درمیان فرق صرف اس حیثیت سے ہے کہ اس جاہلی تہذیب نے سب سے پہلے فرد کی آزادی اور قوموں کی انفرادیت کا بیج بویا تھا جس سے قومی ریاستوں کے ساتھ سرمایہ دارانہ جمہوریت پیدا ہوئی اور مدتہائے دراز تک انسانیت کو تباہ و برباد کرتی رہی۔ پھر جب اُس کے ظلم و ستم سے انسانی مصائب حد کو پہنچ گئے تو اسی تہذیب نے اشتراکی انقلاب کو بطورِ علاج پیش کیا۔ مگر بہت جلدی ظاہر ہو گیا کہ یہ علاج اصل مرض سے بھی زیادہ تباہ کُن ہے۔ آخر کار وہی تہذیب پھر ایک دوسری تجویز سامنے لائی جس کا نام فاشزم یا نیشنل سوشلزم ہے اور چند سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ اس ام الخبائث کا یہ آخری بچہ فتنہ انگیزی و شر باری میں پہلے دونوں برخورداروں سے بھی بازی لے گیا ہے۔

اب دنیا کے لیے اُس تہذیب کو اور زیادہ آزمانے کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے جو آدمی کو جانور سمجھ کر اور اُس جانور کو بے لگام فرض کر کے اپنا کام شروع کرتی ہے اور اس کے اندر جوع البقر سے لے کر بدترین قسم کی درندگی تک ہر وہ بیماری پیدا کر دیتی ہے جو آدمیت کے حق میں نہایت مہلک ہے۔ درحقیقت یہ پوری تہذیب اپنی تمام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

شاخوں سمیت عمر طبیعی کو پہنچ چکی ہے ، امتحان کی مدت ختم کر چکی ہے ، اس کے پاس اب کوئی اور اَنجِر ایسا باقی نہیں رہا ہے جس کو یہ انسانی مسائل کے حل کی حیثیت سے پیش کر سکے ۔ اور بالفرض اگر یہ اپنی زندگی کی مہلت بڑھانے کے لیے کسی اور " ازم " کی تخلیق کا بہانہ کرے بھی تو خدا کی مشیت اب یہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اسے اپنی زمین کو فساد سے بھرنے کا کوئی اور موقع دے گا۔ بہت ممکن ہے کہ موجودہ تصادم کے بعد اس کی شاخوں میں سے کوئی شاخ باقی رہ جائے ، مگر یقیناً اس کا بقاء عارضی ہوگا ، جلدی ہی وہ شاخ خود چیخ کر اپنے اندر سے آگ جھاڑے گی اور آپ اپنی ہی آگ سے جل کر خاکستر ہو جائے گی۔

اب رہا یہ سوال کہ آیا اس تہذیب کی تباہی کے بعد دنیا میں پھر کوئی ظلمت کا دور آنا ہے یا کوئی نئی تعمیر شروع ہوتی ہے ، تو اس کا فیصلہ دو چیزوں پر منحصر ہے۔

ایک یہ کہ جاہلیتِ خالصہ کی ناکامی کے بعد کوئی اور ایسا نظریہ انسان کو ملتا ہے یا نہیں جو پچھلے فاسد نظریوں سے بہتر ہو، جس سے انسانی عقل صلاح کی توقعات وابستہ کر سکے اور جس پر ایک جاندار اور طاقت ور تہذیب قائم ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ نوعِ انسانی میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جس کے اندر جہاد اور اجتہاد کی وہ صلاحیتیں اور قوتیں ہوں جو ایک نئے نظریے پر ایک نئی تہذیب کا قصر تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہیں ، اور جس کے اخلاق و اوصاف ان لوگوں سے مختلف ہوں جن کی خباثت و شرارت کا ابھی تجربہ ہی میں انسان کو تجربہ ہو چکا ہے۔

اگر ایسا کوئی نظریہ بروقت سامنے آجائے اور اس کو لے کر ایسی ایک صالح جماعت اُٹھ کھڑی ہو تو یقیناً نوعِ انسانی ایک دوسرے دَورِ ظلمت (Dark Age) سے بچ سکتی ہے ، ورنہ کوئی قوت اس کو اس تاریک گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی ۔ یہ صدمۂ عظیم جس سے انسانیت اس وقت دوچار ہے ، یہ بھیڑیوں سے بدتر سلوک جو اس وقت آدمی آدمی کے ساتھ کر رہا ہے ، یہ بے دردی و سنگدلی جو کبھی دَورِ وحشت میں بھی آدمی سے ظاہر نہیں ہوتی تھی ، یہ بے رحمی و قساوت جس کی نظیر درندہ جانور بھی پیش کرنے سے عاجز ہیں ، یہ علم و حکمت کے نتائج جو آج جہاں سوز طیاروں اور انسان پاش ٹینکوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی شکل میں دیکھے جا رہے ہیں، یہ تنظیمی قابلیتوں کے ثمرات جنہوں نے آج غارت گر فوجوں کی صورت اختیار کی ہے، یہ صنعتی ترقی کے پھل جو آج آلاتِ جنگ کی بھیانک شکل میں نمودار ہو رہے ہیں، یہ وسائل نشر و اشاعت کا کمال جس سے آج دنیا میں جھوٹ پھیلانے اور قوموں میں منافرت کے بیج بونے کا کام لیا جا رہا ہے، یہ سب کچھ انسان کا دل توڑ دینے اور اس کو اپنے آپ سے اور اپنی ساری قابلیتوں اور صلاحیتوں سے مایوس کر دینے کے لیے بالکل کافی ہے، اور اس کا فطری نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نوعِ انسانی دل شکستہ اور مایوس ہو کر صدیوں کے لیے نیند اور بے ہوشی کی حالت میں مبتلا ہو جاتے۔

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور ایک صالح جماعت کا برسرِ کار آنا ہے۔

مگر وہ کونسا نظریہ ہو سکتا ہے جس کے لیے آج کامیابی کا کوئی موقع ہو؟

مشرکانہ جاہلیت جس پر دنیا کی بہت سی قدیم تہذیبیں قائم ہوئی تھیں، اب اس کے احیاء کا کوئی امکان نہیں۔ شرک کی جڑ بنیاد کٹ چکی ہے۔ جاہل عوام پر چاہے اس کا تسلط ابھی باقی ہو، مگر علم و عقل رکھنے والے لوگ اب اس وہم میں مبتلا نہیں ہو سکتے کہ کائنات کے نظام کو بہت سے خدا چلا رہے ہیں اور انسانی فلاح و سعادت کا سررشتہ دیوتاؤں یا روحوں سے وابستہ ہے۔ علاوہ بریں یہ حقیقت ہے کہ مشرکانہ نظریہ سے انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ یہ پیچیدگیاں کچھ اور بڑھ جاتی ہیں۔ سب سے بڑی مشکل جس نے اس وقت دنیا کو پریشان کر رکھا ہے نوعِ انسانی میں وحدت کا فقدان ہے۔ مگر شرک اس مشکل کو حل نہیں کرتا، بلکہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے مزید تفریق و تقسیم کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا کسی مشرکانہ نظریہ کے لیے آج دنیا میں برسرِ اقتدار آنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

راہبانہ جاہلیت دنیا میں کبھی کوئی طاقت نہ تھی نہ بن سکتی ہے۔ گرما اور تناسخ اور اہنسا اور ہمہ اوست کے نظریات، جو روح کو سرد اور ہمتوں کو پست اور قوائے فکر کو افیونِ تخیل کی پینک میں مست کر دینے والے ہیں، اپنے اندر اتنی جان ہی نہیں رکھتے کہ ان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے بل پر کوئی ایسی تہذیب پیدا ہو سکے جو زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہو اور دنیا کی امامت و پیشوائی کے منصبِ جلیل پر فائز ہو سکتی ہو۔ کوئی ساحری اس تنِ مردہ میں رُوح پھونکنے کی جتنی چاہے کوشش کر دیکھے، یہ نظریات کبھی گیان، تیاگ اور تپسیا کے مقام سے آگے بڑھ کر ایک صالح تمدن کی تخلیق اور ایک عادل مملکت کی تاسیس اور ایک درخشاں تہذیب کی تعمیر تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا مردہ اور رو بزوال قومیں تو ان نظریات کے چکر میں پڑی رہ سکتی ہیں مگر کسی زندہ اور اُبھرنے والی قوم کے تخیل کو یہ کبھی اپنی طرف نہیں کھینچ سکیں گے۔

رہی جاہلیتِ خالصہ تو اس کا اور اس کی پیداوار کا اب دنیا کو اتنا کافی تجربہ ہو چکا ہے کہ عنقریب وہ اس سے مایوس ہونے والی ہے۔ انسان کا اپنے آپ کو جانور فرض کرنا، جانوروں کی زندگی سے تنازع للبقاء اور انتخابِ طبیعی اور بقائے اصلح کا قانون اپنے لیے اخذ کرنا، مادی فوائد اور لذتوں کو مقصودِ حیات ٹھیرانا، تجربات اور مصالح کو اخلاق کا ماخذ قرار دینا، اور کسی فوق الانسانی اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرنا، جو کچھ نتائج پیدا کر سکتا تھا وہ سب اپنی تمام تلخیوں کے ساتھ سامنے آ چکے ہیں۔ ان نظریات کی بدولت انسان کو جو کچھ ملا ہے وہ قومی اور نسلی تعصبات ہیں، رنگ و نسل کی برتری کے دعوے ہیں، قومی ریاستوں کی معاشی و سیاسی رقابتیں ہیں، قیصریت اور استعمار اور معاشی لوٹ کے نقشے ہیں، افراد سے لے کر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں تک کا اپنے معاملات میں ہر اخلاقی قید سے آزاد ہو جانا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کا واقعی جانور بن کر کام کرنا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ جانوروں کا سا بلکہ بے روح مشینوں کا سا سلوک کرنا ہے۔ یہ نظریات اگر جمہوریت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو ظلم اور کسبِ حرام اور فحش اور بے حیائی کی آزادی ملتی ہے۔ اور اگر اشتراکیت یا اجتماعیت پیدا کرتے ہیں تو ایسی جس میں افراد کو بھیڑ بکریوں کے گلے کی طرح ایک ڈکٹیٹر یا ایک چھوٹی سی پارٹی کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ انہیں جس طرح چاہے ہانکے اور اُن کا جو جی چاہے بنائے۔ یہ پھل جو ان نظریات سے پیدا ہوتے ہیں، کسی اتفاقی غلطی کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ اس شجرِ خبیثہ کی عین فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ اس

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سے یہ پھل پیدا ہوں۔ لہٰذا جس طرح اب تک انسان اس سے کسی قسم کی فلاح نہیں پاسکا ہے اسی طرح آئندہ بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ انسانیت کے اِس حیوانی تصور اور کائنات کے اِس مادہ پرستانہ نظریے اور اخلاق کی اس تجربی اور مصلحت پرستانہ بنیاد پر کوئی ایسا اجتماعی مسلک پیدا ہوسکے گا جو انسان کے لیے موجبِ فلاح ہو۔

ان سب نظریات کی ناکامی کے بعد دنیا اگر کسی نظریہ سے فلاح کی امیدیں وابستہ کرسکتی ہے تو وہ صرف ایک ایسا نظریہ ہی ہوسکتا ہے:

جو انسان کو انسان قرار دے نہ کہ جانور، جو اپنی ذات کے متعلق انسان کی رائے کو بہتر بنائے، جس کا تصوّرِ انسانیت مغربی سائنس کے "تصورِ حیوانی" اور مسیحیت کے "پیدائشی گنہگار" اور ہندومت کے "مجبورِ تناسخ" سے بلند تر ہو،

جو انسان کو مختارِ مطلق اور شترِ بے مہار نہ بنائے بلکہ اسے سُلطانِ کائنات کے اقتدارِ اعلیٰ کا تابع قرار دے اور اس کے آگے ذمّہ دار و جوابدہ ٹھیرائے،

جو اخلاق کے ایک ایسے قابلِ عمل ضابطے کا انسان کو پابند بنائے جس میں اپنی خواہشات کے مطابق ردّوبدل کرنے کا حق اُس کو نہ ہو،

جو مادّی بنیادوں پر انسانیت کو تقسیم کرنے کے بجائے ایک ایسی اخلاقی و روحانی بنیاد فراہم کرے جس پر انسانیت متحد ہوسکتی ہو،

جو اجتماعی زندگی کے لیے ایسے اصول انسان کو دے جن پر افراد اور جماعتوں اور قوموں کے درمیان صحیح اور متوازن عدل قائم ہوسکے،

جو زندگی کے نفس پرستانہ مقاصد سے بلند تر مقاصد اور قدر و قیمت کے مادہ پرستانہ معیاروں سے بہتر معیار انسان کو دے،

اور ان سب خصوصیات کے ساتھ جو علمی و عقلی اور تمدّنی ارتقاء میں انسان کی صرف مدد ہی نہ کرے بلکہ صحیح رہنمائی بھی کرے اور مادّی و اخلاقی، ہر دو حیثیتوں سے اسے ترقی کی طرف لے جائے۔

ایسا ایک نظریہ اسلام کے سوا دنیا میں اور کونسا ہے؟ لہٰذا یہ کہنا بالکل حق بجانب ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ اب انسانیت کا مستقبل اسلام پر منحصر ہے۔ انسان کے اپنے بنائے ہوئے تمام نظریات ناکام ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کسی کے لیے کامیابی کا اب کوئی موقع نہیں۔ اور انسان میں اب اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ پھر کسی نظریہ کی تصنیف اور اس کی آزمائش پر اپنی قسمت کی بازی لگا سکے۔ اس حالت میں صرف اسلام ایک ایسا نظریہ و مسلک ہے جس سے انسان فلاح کی توقعات وابستہ کر سکتا ہے، جس کے نوعِ انسانی کا دین بن جانے کا امکان ہے، اور جس کی پیروی اختیار کر کے انسان کی تباہی ٹل سکتی ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیا بس مفتوح ہونے کے لیے تیار بیٹھی ہے، اسلام کی خوبیوں پر ایک وعظ اور اس پر ایمان لانے کے لیے ایک دعوت نامہ شائع ہونے کی دیر ہے، پھر ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ سب مسخر ہوتے چلے جائیں گے۔ ایک تہذیب کا سقوط اس طرح اچانک نہیں ہوا کرتا کہ کل تھی اور آج ناپید ہو گئی۔ اور دوسری تہذیب کا قیام بھی اس طرح واقع نہیں ہوتا کہ آج چٹیل میدان ہے اور کل کسی منتر کے زور سے ایک عالیشان قصر بن کھڑا ہو۔ گرنے والی تہذیب کے افکار، اصول، طریقے، مدتہائے دراز تک دلوں اور دماغوں پر، علوم و آداب پر اور تمدن و معاشرت پر اپنا اثر جمائے رہتے ہیں۔ اس اثر کا استیصال خود بخود نہیں ہو جاتا، کرنے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح گرنے والی تہذیب کے علمبردار بھی زوال پذیر ہونے کے باوجود سالہا سال تک زمین پر قبضہ جمائے رہتے ہیں۔ وہ خود جگہ چھوڑ کر نہیں ہٹ جاتے، ہٹانے سے ہٹتے ہیں۔ علی ہذا القیاس نئی تہذیب پر نئی عمارت بنانا بھی کوئی کھیل نہیں ہے کہ آپ سہولت سے بیٹھے رہیں اور وہ خود بن جائے۔ اس کام کے لیے ایک زبردست تنقیدی، تخریبی اور تعمیری تحریک کی ضرورت ہے جو ایک طرف علم و فکر کی طاقت سے پرانی تہذیب کی جڑیں اکھاڑ دے اور دوسری طرف علوم و فنون و آداب کو اپنی مخصوص فکری بنیادوں پر از سر نو مدون کرے، حتیٰ کہ ذہنی دنیا پر اس طرح چھا جائے کہ لوگ اسی کے طرز پر سوچنا اور محسوس کرنا شروع کر دیں۔ ایک طرف ان پرانے سانچوں کو ڈھائے جن میں انسانیت ڈھلا کرتی تھی اور دوسری طرف نئے سانچے تیار کرے جن میں نئے اخلاق اور نئی سیرتوں کے آدمی ڈھلنے لگیں۔ ایک طرف پرانے نظامِ تمدن و

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سیاست کو بزور مٹاتے اور دوسری طرف ایک پورا نظامِ تمدن و سیاست اپنے اصولوں پر عملاً قائم کر دیے۔

پس دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت کے خطرے سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ اُن کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ صرف اسی طرح دیا جا سکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اُس کے خود مطیع بنیں جس ضابطے پر ایمان لاتے ہیں اس کے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اُس کا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں، اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اُسے خود چھوڑیں۔ اس کے بغیر تو اُن کی صداقت آپ ہی مشتبہ ہو گی کجا کہ کوئی ان کے آگے سرِ تسلیم خم کرے۔ پھر اُن کو اِس فاسد نظامِ تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی، اُس سے اور اس کے پیروؤں سے تعلق توڑنا ہوگا، اُن تمام فائدوں، لذتوں، آسائشوں اور اُمیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں، اور رفتہ رفتہ اُن تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظامِ غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اوقاتِ عزیز بھی صرف کرنے پڑیں گے، اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا، اور قید اور جلا وطنی اور ضبطِ اموال اور تباہیِ اہل و عیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے، اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی پڑیں گی۔ ان راہوں سے گزرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو، محض نظریہ، خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ ہو، کتابوں کے صفحات سے منتقل ہو کر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پکڑ سکتا۔ نظریہ کی کامیابی کے لیے خود اس کے اصولوں کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طاقت جس قدر ضروری ہے، اُسی قدر اُن انسانوں کی سیرت، اُن کے عمل اور اُن کی قربانی و سرفروشی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ زراعت کے طریقہ کی درستی، بیج کی صلاحیت، موسم کی موافقت، سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں، مگر زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے صبر سے، اپنی محنت سے، اپنے بہتے ہوئے پسینہ سے، اور اپنی جفاکشی سے اُس پر اپنا حق ثابت نہیں کر دیتا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اُگلنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔

اگرچہ خلوصِ ایمان اور قربانی و جانفشانی ہر دین کے قیام کے لیے ناگزیر ہے، خواہ وہ دینِ حق ہو یا دینِ باطل، مگر دینِ حق اُس سے بہت زیادہ اخلاص اور قربانی مانگتا ہے جو دینِ باطل کے قیام کے لیے درکار ہے۔ حق ایک ایسا باریک بین صراف ہے جو ذرا سی کھوٹ کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ خالص سونا چاہتا ہے۔ آزمائشوں کی بھٹی میں سے گزر کر جب تک ساری کھوٹ جل نہ جائے اور پورے عیار (Standard) کا کندن نکل نہ آئے وہ اپنے نام سے اُس کو بازار میں لانے کی ذمہ داری لینا پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ حق ہے، باطل نہیں ہے کہ کھوٹے سکے اور ملمع کیے ہوئے زیور بیچتا پھرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۔ (آل عمران- آیت ۱۷۹)

"اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان لانے والوں کو اسی حالت پر چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں) وہ نہ مانے گا جب تک کھوٹے کو کھرے سے الگ نہ کر دے۔"

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۔ (عنکبوت- ۲-۳)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے،

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں :

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چھوڑ دیئے جائیں گے اور انہیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ان سے پہلے جو گزر چکے ہیں (یعنی جنہوں نے بھی ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے) ان سب کو ہم نے تپایا ہے۔ پس ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟"

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۤءُ وَالضَّرَّاۤءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ (بقرہ: ۲۱۴)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گزری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکی ہے؟ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟"

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً۔ (توبہ: ۱۶)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنہوں نے سعی وجہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا؟"

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ، وَلَئِنْ جَاۤءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ، اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ، وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ

(العنکبوت - ۱۰-۱۱)

"اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے مگر جب

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اللہ کی راہ میں نہیں ستایا گیا تو انسانوں کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے۔ اور اگر تیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جاتے تو یہی لوگ اُٹھ کہیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھ تھے۔ کیا اللہ اہلِ دنیا کے دلوں سے خوب واقف نہیں ہے؟ مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایماندار کون ہیں اور منافق کون۔"

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ (بقرہ۔ ۱۵۵ - ۱۵۷)

"ہم ضرور تم کو خطرات اور فاقوں سے اور جان و مال اور کمائیوں کے نقصانات سے آزمائیں گے اور کامیابی کی بشارت دیدو اُن مستقل مزاج لوگوں کو جنہوں نے ہر مصیبت کی آمد پر کہا کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور آخر اسی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ راہِ راست پانے والے ہیں۔"

قرآن یہ سب کچھ کہنے کے ساتھ اس حقیقت پر بھی متنبہ کر دیتا ہے کہ

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ۔ (محمّد۔ ۴)

"اللہ چاہتا تو خود ہی ان سے نمٹ لیتا، مگر وہ تم میں سے کچھ لوگوں کو کچھ لوگوں کے ذریعہ سے آزماتا ہے۔"

یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی خود نہیں کر سکتا اس لیے تم سے مدد مانگتا ہے نہیں، وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اشارے میں اُن کو تباہ کر کے رکھ دے اور اپنے دین کو خود قائم کر دے، مگر اس نے یہ جہاد اور محنت و قربانی کا بار تم پر اس لیے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ڈالا ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں آزمانا چاہتا ہے۔ جب تک باطل پرستوں سے تمہارا تصادم نہ ہو، اور اس تصادم میں مصائب و شدائد اور خطرات و مہالک پیش نہ آئیں، سچے اہلِ ایمان جھوٹے مدعیوں سے ممیّز نہیں ہو سکتے، اور جب تک ناکارہ لوگوں میں سے کارآمد آدمی چھٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ جتھا نہیں بن سکتا جو خلافتِ الٰہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔

لہٰذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ کوئی نظریۂ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں، کیونکہ نظریۂ حق تو موجود ہے، البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پہ ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جو سچے ایمان دار، دُھن کے پکے اور اپنی ہر عزیز و محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگ بھلا اب کہاں مل سکتے ہیں؟ وہ تو بس ایک مبارک دَور میں پیدا ہوئے تھے اور پھر خالق نے اُس ماڈل کو ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا۔ لیکن یہ محض ایک وہم ہے اور ایسا وہم اُنہی لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے جنہیں خود اپنے آپ سے مایوسی ہے۔ دنیا میں ہر قابلیت اور صلاحیت کے آدمی ہر زمانہ میں پائے گئے ہیں اور پائے جاتے ہیں۔ جہاں منافقانہ خصوصیات رکھنے والے اور ضعیف الارادہ لوگ اور سہولت پسند اشخاص ہمیشہ پائے گئے ہیں اور آج بھی پائے جاتے ہیں، وہاں ایسے لوگ بھی ہر زمانہ میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جو کسی چیز پر ایمان لانے کے بعد اس کو سربلند کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا سکتے ہیں۔ آج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک دو نہیں ہزاروں انسان ایسے ہیں جو ہٹلر اور جرمنی پر ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنے اس ایمان کی خاطر ہوائی جہاز سے عین دشمن کے ملک میں جست لگاتے ہیں جہاں ان کو معلوم ہے کہ بے شمار شکاری اُن کی گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ روس کا انقلاب جو ابھی چوبیس پچیس سال پہلے ہی کی بات ہے، اُس کی تاریخ آپ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہزار ہا آدمی جو انقلابی نظریات پر ایمان رکھتے تھے، مسلسل نصف صدی تک ہر قسم کی قربانیاں دیتے رہے ہے، سائبیریا کے جہنم میں بھیجے گئے، پھانسی پر چڑھائے گئے، جلاوطنی کی حالت میں برسوں تک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ملک کی خاک چھانتے پھرے، اپنی ذاتی خوش حالی کی تمام خواہشوں اور تمناؤں کا خون کیا، خانماں بربادی کو خود اپنے ہاتھوں مول لیا۔ اور یہ سب کچھ اُس وقت کیا جب کہ زار کی سلطنت کے مٹنے کا تصور بھی مشکل ہی کیا جا سکتا تھا۔ دُور نہ جائیے خود ہندوستان ہی کو دیکھ لیجیے۔ یہاں جو نوجوان اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ کشت و خون کے ذریعہ سے وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکیں گے انہوں نے اپنے مقصد کے پیچھے اپنی زندگیوں کو برباد کرنے اور خطرات کا مقابلہ کرنے میں کیا کسر اٹھا رکھی؟ کون سی ممکن التصور مصیبت ایسی تھی جسے انہوں نے برداشت نہ کیا ہو؟ قید خانوں میں شدید ترین اذیتیں اُٹھائیں، حبسِ دوام میں عمریں گزار دیں، پھانسی کے تختہ پر جانیں تک دے دیں۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کے طریقے صحیح تھے یا غلط، مگر اس سے یہ تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کسی مقصد پر ایمان لانے کے بعد اس کے لیے جان و مال اور شخصی امنگوں کی قربانی گوارا کرنے اور مصیبتیں سہنے کی صفت آج بھی انسانوں میں ناپید نہیں ہے۔ گاندھی جی کی سول نافرمانی ابھی حال ہی کی بات ہے۔ کیا اسی ہندوستان کے باشندوں میں ایسے لوگ موجود نہ تھے جنہوں نے لاٹھیاں کھائیں جیل گئے اور مالی نقصانات برداشت کیے؟ کیا باردولی کے کسانوں نے اپنی زمینوں، اپنے جانوروں اور اپنے گھروں کے برتنوں تک کی قرقی اور نیلامی کو صبر کے ساتھ برداشت نہیں کیا؟ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آج ایثار و قربانی کی وہ صفات انسانوں میں مفقود ہیں جو پہلے لوگوں میں پائی جاتی تھیں؟ اگر ہٹلر اور مارکس اور گاندھی پر ایمان لا کر انسان یہ سب کچھ کر سکتا ہے، تو کیا خدا پر ایمان لا کر کچھ نہیں کر سکتا؟ اگر خاکِ وطن میں اتنی کشش ہے کہ اس کے لیے آدمی جان و مال کی قربانی گوارا کر سکتا ہے تو کیا خدا کی رضا اور اس کے تقرب میں اتنی کشش بھی نہیں ہے؟ پس جو لوگ خود پست ہمت اور ضعیف الارادہ ہیں انہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کارِ عظیم کے لیے جن اولوالعزم انسانوں کی ضرورت ہے وہ کہیں مل ہی نہیں سکتے۔ البتہ اپنی ذات کی حد تک وہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اِذْھَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا ھٰھُنَا قٰعِدُوْنَ "جاؤ تم اور تمہارا رب دونوں لڑیں اور ہم یہاں بیٹھے ہیں" (المائدہ۔ ۲۴) (ترجمان القرآن۔ اپریل ۱۹۴۱ء[1])

---

[1] واضح رہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے ۴ مہینے بعد ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ (جدید)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اضافے

مطالبۂ پاکستان کو

یہود کے مطالبہ "قومی وطن" سے تشبیہ دینا غلط ہے

سوال: "ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان آدم علیہ السّلام کی خلافت ارضی کا وارث ہے۔ مسلمان کی زندگی کا مقصد صرف اللہ پاک کی رضا اور اس کے مقدس قانون پر چلنا اور دوسروں کو چلنے کی ترغیب دینا ہے۔ اس لیے اس کا فطری نصب العین یہ قرار پاتا ہے کہ سارے عالم کو قانونِ الٰہیہ کے آگے مفتوح کر دے۔ لیکن مسٹر جناح اور ہمارے دوسرے مسلم لیگی بھائی پاکستان چاہتے ہیں، ہندوستان کی زمین کا ایک گوشہ! تاکہ ان کے خیال کے مطابق مسلمان چین کی زندگی گزار سکیں۔ کیا خالص دینی نقطۂ نظر سے یہ قابلِ اعتراض نہیں؟ یہودی قوم مقہور و مغضوب قوم ہے۔ اللہ پاک نے اس پر زمین تنگ کر دی ہے اور ہر چند کہ اس قوم میں دنیا کے بڑے سے بڑے سرمایہ دار اور مختلف علوم کے ماہرین موجود ہیں لیکن اُن کے قبضہ میں ایک انچ زمین بھی نہیں ہے۔ آج وہ اپنا قومی وطن بنانے کے لیے کبھی انگریزوں سے بھیک مانگتے ہیں اور کبھی امریکہ والوں سے۔ میرے خیال میں مسلمان، یا بالفاظ دیگر مسلم لیگ بھی یہی کر رہی ہے۔ وہ یہودیوں کی طرح پاکستان کی بھیک کبھی ہندوؤں سے اور کبھی انگریزوں سے مانگتی پھر رہی ہے۔ تو پھر کیا یہ ایک مقہور اور مغضوب قوم کی پیروی نہیں ہے؟ اور کیا ایک مقہور و مغضوب قوم کی پیروی مسلمانوں کو بھی اسی صف میں لا کر کھڑا نہ کر دے گی؟"

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جواب : پاکستان کے متعلق آپ میرے مفصل خیالات "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم میں ملاحظہ فرمایئے۔ میرے نزدیک پاکستان کے مطالبہ پر یہودیوں کے قومی وطن کی تشبیہ چسپاں نہیں ہوتی۔ فلسطین فی الواقع یہودیوں کا قومی وطن نہیں ہے۔ اُن کو وہاں سے نکلے ہوئے دو ہزار برس گزر چکے ہیں، اُسے اگر اُن کا قومی وطن کہا جاسکتا ہے تو اُسی معنی میں جس معنی میں جرمنی کی آریہ نسل کے لوگ وسط ایشیا کو اپنا قومی وطن کہہ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی اصل پوزیشن یہ نہیں ہے کہ ایک ملک واقعی اُن کا قومی وطن ہے اور وہ اسے تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ بلکہ ان کی اصلی پوزیشن یہ ہے کہ ایک ملک اُن کا قومی وطن نہیں ہے اور اُن کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم کو دنیا کے مختلف گوشوں سے سمیٹ کر وہاں بسایا جائے اور اُسے بزور ہمارا قومی وطن بنا دیا جائے۔ بخلاف اس کے مطالبہ پاکستان کی بنیاد یہ ہے کہ جس علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت آباد ہے وہ بالفعل مسلمانوں کا قومی وطن ہے، اور مسلمانوں کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ موجودہ جمہوری نظام میں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ساتھ لگے رہنے سے اُن کے قومی وطن کی سیاسی حیثیت کو جو نقصان پہنچتا ہے اُس سے اس کو محفوظ رکھا جائے اور متحدہ ہندوستان کی ایک آزاد حکومت کے بجائے ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کی دو آزاد حکومتیں قائم ہوں۔ یعنی بالفاظ دیگر وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کا قومی وطن جو بالفعل موجود ہے اُس کو اپنی آزاد حکومت الگ قائم کرنے کا حق حاصل ہو جائے۔

یہ چیز بعینہ وہی ہے جو آج دنیا کی ہر قوم چاہتی ہے اور اگر مسلمانوں کے "مسلمان" ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے انہیں صرف ایک قوم کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اُن کے اس مطالبہ کے حق بجانب ہونے میں کوئی کلام نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اصولاً اس بات کے مخالف ہیں کہ دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم پر سیاسی و معاشی حیثیت سے مسلط ہو۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ ہر قوم کا حق ہے کہ اس کی سیاسی و معاشی باگیں اس کے اپنے ہاتھوں میں ہوں۔ اس لیے ایک قوم ہونے کی حیثیت سے اگر مسلمان یہ مطالبہ کرتے ہیں تو جس طرح دوسری قوموں کے معاملہ میں یہ مطالبہ صحیح ہے اسی طرح ان کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ البتہ ہمیں اس چیز کو نصب العین بنانے پر جو اعتراض ہے وہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک اصولی جماعت اور ایک نظام کی داعی

اور علم بردار جماعت ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کر کے صرف ایک "قوم" ہونے کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اگر وہ اپنی اصلی حیثیت کو قائم رکھتے تو ان کے لیے قومی وطن اور اس کی آزادی کا سوال ایک نہایت حقیر سوال ہوتا، بلکہ حقیقتاً سرے سے وہ ان کے لیے پیدا ہی نہ ہوتا۔ اب وہ کروڑوں ہو کر ایک ذرا سے خطے میں اپنی حکومت حاصل کر لینے کو ایک انتہائی نصب العین سمجھ رہے ہیں، لیکن اگر وہ نظامِ اسلامی کے داعی ہونے کی حیثیت اختیار کریں تو تنہا ایک مسلمان ساری دنیا پر اپنی، یعنی درحقیقت اپنے اُس نظام کی جس کا وہ داعی ہے، حکومت کا مدعی ہو سکتا ہے اور صحیح طور پر سعی کرے تو اسے حاصل بھی کر سکتا ہے۔

(ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۲ء)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلم لیگ سے اختلاف کی نوعیت

مسلم لیگ کی مجلس عمل کی جانب سے حسب ذیل سوال نامہ ہمارے پاس بھیجا گیا ہے:-

"کن اصول خطوط اور بنیادوں پر ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی و معاشی اصلاح، اُن حالات کے اندر رہتے ہوئے جن میں وہ گھرے ہوتے ہیں۔ اصول، روایات اور نقطۂ نظر کے مطابق ممکن ہے؟ براہ کرم حسب ذیل خطوط پر اپنی تفصیلی رائے تحریر کیجیے:-

(الف) ایک ایسا قابلِ عمل دستور تجویز کیجیے جس کے ذریعہ قومی احیاء کے مشترکہ مقصد کے لیے مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور مدارسِ فکر کو متحد اور مربوط کیا جا سکے۔

(ب) ایک ایسا اقتصادی نقشہ و نظام مرتب کیجیے جو اصول اسلام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔

(ج) ہندوستانی مسلمان جن مخصوص حالات میں گھرے ہوئے ہیں انہیں ذہن میں رکھ کر بتائیے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر، اور جب، وہ ایسی آزاد ریاستیں حاصل کر لیں جن میں ان کی اکثریت ہو تو ایک ایسا نظام حکومت قائم کر سکیں جس میں مذہب اور ریاست کے درمیان ایک خوش آئند ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

(د) اسلامی اصول، روایات، تصوّرات اور نظریات کے مطابق ایک ایسی اسکیم مرتب کیجیے جو مسلمانوں کے معاشرتی، تہذیبی اور تعلیمی پہلوؤں پر حاوی ہو۔

(ر) مجموعی قومی بہبودی کی خاطر مذہبی ادارات یعنی اوقاف اور دوسرے ذرائع آمدنی کو ایک مرکز کے ماتحت منظم کرنے کے لیے طریقِ کار اور نظام اس طرح مرتب کیجیے کہ ان اداروں پر قبضہ رکھنے والے اشخاص کے احساسات، میلانات، اغراض اور مختلف نظریات کا لحاظ رہے۔"

اس سوالنامے کا جو جواب ہماری طرف سے بھیجا گیا وہ درج ذیل ہے:

آپ نے جو تفصیلی سوالات دریافت کیے ہیں وہ دراصل ایک ہی بڑے سوال کے اجزا ہیں۔ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان مسائل کو الگ الگ لینے اور ان پر الگ الگ رائے ظاہر کرنے کے بجائے اسی بڑے سوال کو بیک وقت سامنے لے آیا جائے جس کے یہ سب اجزاء ہیں؟ وہ وہ بڑا سوال یہ ہے کہ مسلمان کس طرح وہ اصلی مسلمان بنیں جنہیں بنانا قرآن کا اصل منشا تھا؟ یہ ہے اصل سوال اور اس کے حل ہونے سے باقی سب سوالات خود بخود حل ہو جائیں گے۔

میرے پاس اس سوال کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ پہلے اسلام کو، جو کچھ کہ وہ ہے اور جو کچھ کہ انسان سے اُس کے مطالبات ہیں، واضح طور پر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا جائے اور اُن سے شعوری طور پر اُسے قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ پھر جو لوگ اسے جاننے اور سمجھنے کے بعد قبول کریں اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کریں کہ واقعی انہوں نے اسے قبول کیا ہے، ان کو ایک پارٹی کی صورت میں منظم کرنا شروع کیا جائے اور باقی مسلمانوں میں مسلسل تبلیغ و تلقین کا سلسلہ اس ارادہ کے ساتھ جاری رکھا جائے کہ بالآخر ہمیں اس پارٹی میں پوری قوم کو جذب کر لینا ہے۔

اس پارٹی کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین ہو، یعنی اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے عملاً زمین پر قائم کرنا۔ اور اس کا ایک ہی اصول ہو، یعنی اسلام کے خالص طریقہ پر چلنا (خواہ یہ طریقہ دنیا کو مرغوب ہو یا نہ ہو) اور غیر اسلام کے ساتھ سمِ مدارات و مصالحت (Compromise)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور ہر آمیزش و اختلاط کو قطعی چھوڑ دینا۔ اس نصب العین اور اس اصول پر جو پارٹی کام کرے گی اس کے لیے وہ سوالات جو آپ کے سامنے آرہے ہیں اوّل تو سرے سے پیدا ہی نہ ہونگے اور اگر ان میں سے بعض سوالات پیدا ہوتے بھی تو وہ اس شکل میں نہیں ہوں گے جس شکل میں آپ کے سامنے اب یہ سوالات آرہے ہیں۔ انہیں کوئی نئی اسکیم وضع نہیں کرنی ہوگی، بلکہ صرف وہ قوت فراہم کرنی ہوگی جس سے وہ اس اسکیم کو نافذ کرسکیں جو پہلے ہی بنی ہوئی موجود ہے۔ وہ اس کی پروا نہیں کریں گے کہ موجودہ حالات ہماری اسکیم کے نفاذ کے لیے سازگار ہیں یا نہیں۔ وہ ناسازگار حالات کو بزور بدلیں گے تاکہ وہ اس اسکیم کے لیے سازگاری کرنے پر مجبور ہوں۔ غرض یہ کہ ان کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں اُس نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہوگا جو آپ حضرات نے اختیار کیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ حضرات ایک ایسی پیچیدگی میں پڑ گئے ہیں جس کا کوئی حل شاید آپ نہ پاسکیں، اور وہ پیچیدگی یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ اس پوری مسلمان قوم کو "مسلمان" کی حیثیت سے لے رہے ہیں جس کے ننانوے فی صدی افراد اسلام سے جاہل، اور پچانوے فی صدی منحرف، اور نوے فی صدی انحراف پر مصر ہیں، یعنی وہ خود اسلام کے طریقہ پر چلنا نہیں چاہتے اور نہ اُس منشا کو پورا کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ان کو مسلمان بنایا گیا ہے۔ دوسری طرف آپ حالات کے اُس پورے مجموعہ کو جو اس وقت عملاً قائم ہے، تھوڑی سی ترمیم کے بعد قبول کرلیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ حالات تو یہی رہیں اور پھر ان کے اندر کسی اسلامی اسکیم کے نفاذ کی گنجائش نکل آئے۔ یہی چیز آپ کے لیے ایک بڑی پیچیدگی پیدا کرتی ہے۔ اور اسی وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ جن مسائل سے آپ حضرات تعرض کررہے ہیں ان کا کوئی حل آپ کبھی نہ پاسکیں گے۔

(ترجمان القرآن، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۲ء)

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وقت کے سیاسی مسائل میں جماعتِ اسلامی کا مسلک

سوال:- "اس وقت مسلمانانِ ہند دو فتنوں میں مبتلا ہیں۔ اوّل کانگریس کی وطنی تحریک کا فتنہ جو واحد قومیت کے مفروضے اور مغربی ڈیموکریسی کے اصول پر ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے۔ دوم مسلم نیشنلزم کی تحریک جسے مسلم لیگ چلا رہی ہے اور جس پر ظاہر میں تو اسلام کا لیبل لگا ہوا ہے مگر باطن میں روحِ اسلامی سراسر مفقود ہے۔ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے مطالعہ سے یہ بات ہم پر واضح ہو چکی ہے کہ یہ دونوں تحریکیں اسلام کے خلاف ہیں۔ لیکن حدیث میں آیا ہے کہ انسان جب دو بلاؤں میں مبتلا ہو تو چھوٹی بلا کو قبول کرلے۔ اب کانگریس کی تحریک تو سراسر کفر ہے، اس کا ساتھ دینا مسلمانوں کی موت کے مترادف ہے۔ اس کے مقابلہ میں لیگ کی تحریک اگرچہ غیر اسلامی ہے، لیکن اس سے یہ خطرہ تو نہیں ہے کہ دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی قومی ہستی ختم ہو جائے۔ لہٰذا کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم لیگ سے باہر رہتے ہوئے اس کے ساتھ ہمدردی کریں؟ اس وقت ہندوستان میں انتخابات کی مہم درپیش ہے اور یہ انتخابات فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف تمام غیر لیگی عناصر مل کر مسلم لیگ کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں جن میں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کانگریس کی وطنی تحریک مسلمانوں پہ

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

زبردستی مسلط ہو کے رہ جائے گی۔ دوسری طرف مسلم لیگ یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ مسلمان ایک مستقل قوم ہیں اور وہ اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان دونوں کا فیصلہ رائے دہندوں کے ووٹوں پر منحصر ہے۔ ایسی صورت میں ہم کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیئے؟ کیا ہم لیگ کے حق میں ووٹ دیں اور دلوائیں؟ یا خاموش بیٹھے رہیں؟ یا خود اپنے نمائندے کھڑے کریں"؟

جواب :۔ آپ کے ذہن پر ملک کے موجودہ سیاسی حالات کا غلبہ ہے، اس لیے آپ کو صرف دو ہی فتنے نظر آتے جن میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں۔ حالانکہ اگر آپ ذرا وسیع نگاہ سے دیکھتے تو ان دو فتنوں کے علاوہ آپ کو اور بہت سے اخلاقی، فکری، تمدنی، مذہبی اور سیاسی و معاشی فتنے نظر آتے جو اس وقت مسلمانوں پر ہجوم کیے ہوئے ہیں، اور یہ ایک فطری سزا ہے جو اللہ کی طرف سے ہر اُس قوم کو ملا کرتی ہے جو کتاب اللہ کی حامل ہونے کے باوجود اُس کے اتباع سے منہ موڑے اور اس کے منشا کے مطابق کام کرنے سے جی چرائے۔ اس سزا سے اگر مسلمان بچ سکتے ہیں تو وہ صرف اس طرح کہ اپنے اُس اصلی و بنیادی جرم سے باز آجائیں جس کی پاداش میں ان پر یہ فتنے مسلط ہوتے ہیں، اور اُس کام کے لیے کھڑے ہو جائیں جس کی خاطر اُنہیں کتاب اللہ دی گئی تھی۔ لیکن اگر وہ اس سے مُنہ موڑتے ہیں تو پھر جو تدبیریں چاہیں کر کے دیکھ لیں، یقین جانیے کہ کسی ایک فتنہ کا بھی سدِّ باب نہ ہوگا بلکہ ہر تدبیر چند اور فتنے برپا کر دے گی۔

آپ نے جو سوال جماعت اسلامی کی توجہ اور فیصلے کے لیے پیش کیا ہے اس کے متعلق میں دو باتیں واضح طور پر عرض کیے دیتا ہوں تاکہ آپ کو اور آپ کی طرح سوچنے والے اصحاب کو آئندہ اس سلسلہ میں کوئی الجھن نہ پیش آئے۔

اوّل یہ کہ پہلے آپ اس جماعت کے مقصدِ قیام کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ یہ جماعت کسی ملک یا قوم کے وقتی مسائل کو سامنے رکھ کر وقتی نداہب سے اُن کو حل کرنے کے لیے نہیں بنی ہے، اور نہ اس کی بنائے قیام یہ قاعدہ ہے کہ پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے جس وقت جو اصول چلتے نظر آئیں ان کو اختیار کر لیا جائے۔ اس جماعت کے سامنے تو صرف ایک ہی عالمگیر

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور ازلی و ابدی مسئلہ ہے جس کی لپیٹ میں ہر ملک اور ہر قوم کے سارے وقتی مسائل آجاتے ہیں اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی دُنیوی فلاح اور اُخروی نجات کس چیز میں ہے؟ پھر اس مسئلے کا ایک ہی حل اس جماعت کے پاس ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام بندگانِ خدا (جن میں ہندستان کے مسلمان بھی شامل ہیں) صحیح معنوں میں خدا کی بندگی اختیار کریں اور اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس کے سارے پہلوؤں سمیت اُن اصولوں کی پیروی میں سپرد کر دیں جو خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت میں پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اِس مسئلے اور اس کے اِس واحد حل کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور جو شخص بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہتا ہو اسے لازم ہے کہ ہر طرف سے نظر ہٹا کر پوری جمعیتِ خاطر کے ساتھ اس شاہراہ پر قدم جماتے چلا جائے۔ اور جو شخص اتنی ذہنی و عملی یکسوئی بہم نہ پہنچا سکے، جس کے ذہن کو اپنے ملک یا اپنی قوم کے وقتی مسائل بار بار اپنی طرف کھینچتے ہوں اور جس کے قدم بار بار ڈگمگا کر اُن طریقوں کی طرف پھسلتے ہوں جو دنیا میں آج رائج ہیں، اس کے لیے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پہلے اُن ہنگامی تحریکوں میں جا کر اپنا دل بھر لے۔

دوم یہ کہ ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں بھی آپ ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیں۔ پیش آمدہ انتخاب یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو، بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم اُن اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیتِ جمہور (Sovereignty of the People) کے اصول پر قائم ہوا ہے، اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اُس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو، اور آخری سند (Final Authority) خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الٰہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہے[1]۔ اگر ہندوستان کے علماء اور عامۂ مسلمین اس حقیقت سے ذہول برت رہے ہیں اور وقتی مصلحتیں ان کے لیے مقتضیاتِ ایمانی سے اہم ترین گئی ہیں تو اس کی جوابدہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے۔ لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشے سے اِس اصولی مسئلے میں موجودہ نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے۔ آپ خود ہی سوچ لیجیے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر ہم کس طرح انتخابات میں حصّہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لیے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کو شرک قرار دیں، اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے اُن لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے آئینی اختیارات غصب کرنے کے لیے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لیے اس معاملہ میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے پر صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتابِ الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے۔ جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب اور کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔

(ترجمان القرآن ستمبر و اکتوبر ۴۵ء)

---

[1] یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی نے تقسیم کے بعد انتخابات میں حصہ لینے اور اسمبلیوں کی رکنیت حاصل کرنے کو اس وقت تک جائز تسلیم نہیں کیا جب تک پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد (Objectives Resolution) پاس کر کے اللہ تعالٰی کی حاکمیت تسلیم نہ کر لی۔

(جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نظامِ کفر کی قانون ساز مجلس میں مسلمانوں کی شرکت کا مسئلہ

سوال :۔ "آپ کی کتاب "اسلام کا نظریۂ سیاسی" پڑھنے کے بعد یہ حقیقت تو ذہن نشین ہوگئی ہے کہ قانون سازی کا حق صرف خدا ہی کے لیے مختص ہے اور اس حقیقت کے مخالف اصولوں پر مبنی ہونے والی قانون ساز اسمبلیوں کا ممبر بننا عین شریعت کے خلاف ہے۔ مگر ایک شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ اگر تمام مسلمان اسمبلیوں کی شرکت کو حرام تسلیم کریں تو پھر سیاسی حیثیت سے مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ سیاسی قوت ہی سے قوموں کی فلاح و بہبود کا کام کیا جا سکتا ہے اور ہم نے اگر سیاسی قوت کو بالکلیہ غیروں کے حوالے ہو جانے دیا تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ اغیار مسلم دشمنی کی وجہ سے ایسے قوانین نافذ کریں گے اور ایسا نظام مرتب کریں گے جس کے نیچے مسلمان دب کر رہ جائیں گے، پھر آپ اس سیاسی تباہی سے بچنے کی کیا صورت مسلمانوں کے لیے تجویز کرتے ہیں؟"

جواب :۔ آپ نے اپنے سوال میں سوچنے کا انداز غلط اختیار کیا ہے۔ یہ بات تو آپ کی سمجھ میں آگئی ہے کہ وہ نظام جس میں انسان خود اپنا قانون ساز بنتا ہے یا دوسرے انسانوں کو قانون سازی کا حق دیتا ہے، اسرے سے غلط ہے۔ نیز یہ بات بھی آپ سمجھ چکے ہیں کہ امرِ حق یہی ہے کہ حکم صرف اللہ کے لیے ہے اور انسان کا کام اس کے حکم کا اتباع کرنا ہے نہ کہ خود

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

واضع حکم بن جانا۔ اب آپ کو یہ سوچنا چاہیے کہ مسلمان جن کے مفاد کی آپ فکر کر رہے ہیں وہ کس غرض کے لیے "مسلم" نامی ایک جماعت بنائے گئے تھے؟ آیا اس غرض کے لیے کہ وہ اُس امرِ حق کو جو قرآن سے ثابت ہے، دنیا کے سامنے پیش کریں، اُس کو تسلیم کرائیں، خود اپنی زندگی کو اُس پر قائم کریں اور دنیا میں اُس کو جاری کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر دیں؟ یا اس غرض کے لیے کہ اس کے بالکل برخلاف جو باطل بھی دنیا میں قائم ہو جائے (اور خود ان کی اپنی غفلتوں کی بدولت قائم ہو) اس کی موافقت کریں اور اُس کو اپنا لیں اور اُس کو مٹانے کی سعی سے اس لیے گریز کرتے رہیں کہ کہیں ان کے مفاد کو نقصان نہ پہنچ جائے؟ اگر پہلی بات ہے تو مسلمان آج جو کچھ کر رہے ہیں، غلط کر رہے ہیں، اور ان کا مفاد اگر اسی غلطی سے وابستہ ہے تو وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ اُس کی پروا کی جائے، اور ایسی صورتِ حال میں ایک سچے مسلمان کو اپنی قوم کے ساتھ لگ کر جہنّم کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے امرِ حق کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، خواہ اس کی قوم اس کا ساتھ دے یا نہ دے۔ اور اگر آپ دُوسری بات کے قائل ہیں تو پھر مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، حق کو حق جاننے کے باوجود خلافِ حق طریقہ پر اگر محض قومی مفاد کی خاطر آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔

یہ اندیشہ اکثر پیش کیا جاتا ہے کہ اگر ہم اسمبلیوں سے پرہیز کریں تو ان پر غیر مسلم قابض ہو کر نظامِ حکومت کے تنہا مالک و متصرف بن جائیں گے اور اگر نظامِ باطل کے کل پرزے ہم نہ بنیں تو دوسرے بن جائیں گے اور اس طرح زندگی کے سارے کاروبار پر قابض ہو کر وہ ہماری ہستی ہی کو ختم کر دیں گے، حتّٰی کہ اسلام کا نام لینے والے باقی ہی نہ رہیں گے کہ تم ان سے خطاب کر سکو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اندیشے جتنے ہولناک ہیں اس سے زیادہ خام خیالی کے نمونے ہیں۔ اگر ہم نے یہ کہا ہوتا کہ صرف ایک منفی پالیسی اختیار کر کے مسلمان زندگی کا سارا کاروبار چھوڑ دیں اور گوشوں میں جا بیٹھیں تو یہ اندیشے ضرور کسی حقیقت پر مبنی ہوتے۔ لیکن ہم اس نفی کے ساتھ ساتھ ایک اثبات بھی تو پیش کرتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اس نظام کے ساتھ سازگاری کرنے کے بجائے دنیا میں نظامِ حق قائم کرنے کے لیے منظّم سعی شروع کریں اور دوسری قوموں کے ساتھ اپنے دُنیوی مفاد کے لیے کشمکش اور مزاحمت کرنے کے بجائے ان کے سامنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ دینِ حق پیش کریں جس کی پیروی میں تمام انسانوں کی فلاح ہے، اور قرآن کے ذریعہ سے، سیرت رسولؐ کے ذریعہ سے اور اخلاق اسلامی کے ذریعے سے دنیا میں فکری، اخلاقی معاشی، اور تمدنی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں۔

ہماری اس دعوت کے جواب میں دو صورتیں پیش آسکتی ہیں:

ایک یہ کہ تمام ہندوستان کے مسلمان، جن کی تعداد دس کروڑ ہے اور جن کے پاس مادّی وسائل اور ذہنی اور دماغی قوتوں اور ہاتھ پاؤں کی طاقتوں کی کمی نہیں ہے، بیک وقت ہماری اس دعوت کو قبول کرلیں اور ذہنی، اخلاقی اور عملی تمام حیثیتوں سے اسلام کے سچے داعی بن جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو آپ تو یہ اندیشہ کر رہے ہیں کہ سب کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور میں یہ یقین رکھتا ہوں کہ ہندوستان ہی نہیں دنیا کا ایک بڑا حصّہ آپ کے ہاتھ آجائے گا، ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کا جھگڑا دیکھتے دیکھتے ختم ہو جائے گا، ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت کو قائم ہونے سے کوئی طاقت نہ روک سکے گی، بہت قلیل مدت کے اندر مسلمان ممالک کی بھی کایا پلٹ جائے گی اور خود وہ قومیں تک جو آج ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں، مسخر ہونے سے محفوظ نہ رہ سکیں گی۔

دوسری صورت یہ پیش آسکتی ہے، اور یہی اس وقت متوقع بھی ہے، کہ مسلمانوں میں سے بتدریج تھوڑی تعداد میں پاک نفس اور اعلیٰ درجہ کے ذہن رکھنے والے لوگ ہماری اس دعوت کو قبول کرتے جائیں گے اور جب تک صالحین کا یہ گروہ منظم ہو کر ایک طاقت بنے، عام مسلمان اپنے لیڈروں کی پیروی میں وہی کچھ کرتے رہیں گے جو ایک مدت سے کرتے آ رہے ہیں اور آج کر رہے ہیں۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ وہ خطرہ پیش نہیں آسکتا جس کا آپ اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں، کیونکہ غلط کار مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت وہ سارے کام کرنے کے لیے موجود رہے گی جن کے نہ کرنے سے آپ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کا قومی مفاد خاک میں مل جائے گا۔ البتہ اگر یہ سارے کام ہوتے رہیں اور صرف وہی ایک کام نہ ہو جس کی طرف ہم بُلا رہے ہیں اور اگر ہم بھی امرِ حق اور اُس کے تقاضوں سے آنکھیں بند کرکے محض قوم اور اُس کے مفاد کی فکر میں اُن باطل کاریوں کی طرف دوڑ جائیں جو آج اسلام اور مسلم مفاد کے نام سے ہو

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہی ہیں، تو یقین رکھیے کہ اسلام کا جھنڈا تو خیر کیا بلند ہوگا، مسلمان قوم اُس ذلّت و خواری اور اس پستی کے گڑھے سے بھی نہ نکل سکے گی جس میں وہ یہودیوں کی طرح صرف اس لیے مبتلا ہوئی ہے کہ خدا کی کتاب رکھتے ہوئے اس نے اس کتاب کا منشا پورا کرنے سے منہ موڑا۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۶۵ھ۔ دسمبر ۱۹۴۵ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مجالس قانون سازی کی رکنیت شرعی نقطۂ نظر سے

سوال: "کیا مسلمان کو بحیثیت مسلمان ہونے کے اسمبلی کی ممبری جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ یہاں مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں کے نمائندے اسمبلی کی رکنیت کے لیے کھڑے ہوئے ہیں اور ان کی طرف سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے مجھ پر دباؤ پڑ رہا ہے، حتّٰی کہ علماء تک کا مطالبہ یہی ہے۔ اگرچہ مجملاً جانتا ہوں کہ انسانی حاکمیت کے نظریے پر قائم ہونے والی اسمبلی اور اس کی رکنیت دونوں شریعت کی نگاہ میں ناجائز ہیں، مگر تاوقتیکہ معقول وجوہ پیش نہ کر سکوں، ووٹ کے مطالبہ سے چھٹکارا پانا دشوار ہے۔"

جواب: اسمبلی کے متعلق یہ سمجھ لیجیے کہ موجودہ زمانہ میں جتنے جمہوری نظام بنے ہیں (جن کی ایک شاخ ہندوستان کی موجودہ اسمبلیاں بھی ہیں) وہ اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ باشندگان ملک اپنے معاملات کے متعلق خود تمدن، سیاست، معیشت، اخلاق اور معاشرت کے اصول وضع کرنے اور ان کے مطابق تفصیلی قوانین و ضوابط بنانے کا حق رکھتے ہیں اور اس قانون سازی کے لیے رائے عام سے بالاتر کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نظریہ اسلام کے نظریہ سے بالکل برعکس ہے۔ اسلام میں توحید کے عقیدے کا لازمی جُز یہ ہے کہ لوگوں کا اور تمام دنیا کا مالک اور فرماں روا اللہ تعالیٰ ہے، ہدایت اور حکم

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دینا اُس کا کام ہے اور لوگوں کا کام یہ ہے کہ اس کی ہدایت اور اس کے حکم سے اپنے لیے قانونِ زندگی اخذ کریں، نیز اگر اپنی آزادی رائے استعمال کریں بھی تو اُن حدود کے اندر کریں جن حدود میں خود اللہ تعالیٰ نے ان کو آزادی دی ہے۔ اس نظریئے کی رُو سے قانون کا ماخذ اور تمام معاملاتِ زندگی میں مرجع اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت قرار پاتی ہے، اور اس نظریہ سے ہٹ کر اوّل الذکر جمہوری نظریئے کو قبول کرنا گویا عقیدۂ توحید سے منحرف ہو جانا ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانہ کے جمہوری اصول پر بنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے، کیونکہ ووٹ دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اپنی رائے سے کسی ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں جس کا کام موجودہ دستور کے تحت وہ قانون سازی کرنا ہے جو عقیدۂ توحید کے سراسر منافی ہے۔ اگر علمائے کرام میں سے کوئی صاحب اس چیز کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں تو ان سے اس کی دلیل دریافت کیجیے۔[1]

اس قسم کے معاملات میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ چونکہ یہ نظام مسلط ہو چکا ہے اور زندگی کے سارے معاملات اس سے متعلق ہیں، اس لیے اگر ہم انتخابات میں حصّہ نہ لیں اور نظامِ حکومت میں شریک ہونے کی کوشش نہ کریں تو ہمیں فلاں اور فلاں نقصانات پہنچ جائیں گے۔ ایسے دلائل سے کسی ایسی چیز کو، جو اصولاً حرام ہو، حلال ثابت نہیں کیا جا سکتا، ورنہ شریعت کی کوئی حرام چیز ایسی نہ رہ جائے گی جس کو مصلحتوں اور ضرورتوں کی بنا پر حلال نہ ٹھیرا لیا جائے۔ اضطرار کی بنا پر حرام چیزیں استعمال کرنے کی اجازت شریعت میں پائی تو جاتی ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ خود اپنی غفلتوں سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے اضطرار کی حالتیں پیدا کریں، پھر اس اضطرار کو دلیل بنا کر تمام محرمات کو اپنے لیے حلال کرتے جائیں اور اس اضطرار کی حالت کو ختم کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کریں۔ جو نظام اس

---

[1] اس مسئلہ کو جو لوگ تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہیں وہ میری کتاب "اسلامی ریاست" ملاحظہ فرمائیں۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وقت مسلمانوں پر مسلط ہوتا ہے ، جس کے تسلط کو وہ اپنے لیے دلیلِ اضطرار بنا رہے ہیں ، وہ آخر ان کی اپنی ہی غفلتوں کا تو نتیجہ ہے ۔ پھر اب بجائے اس کے کہ اپنا سرمایۂ قوت و عمل اس نظام کے بدلنے اور خالص اسلامی نظام قائم کرنے کی سعی میں صرف کریں ، وہ اس اضطرار کو حجت بنا کر اسی نظام کے اندر حصہ دار بننے اور پھلنے پھولنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

(ترجمان القرآن ۔ محرم ۶۵ ھ ۔ دسمبر ۱۹۴۵ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پُرامن انقلاب کا راستہ

سوال: "ذیل میں دو شبہات پیش کرتا ہوں۔ براہِ کرم صحیح نظریات کی توضیح فرما کر انہیں صاف کر دیجیے۔

(۱) ترجمان القرآن کے گزشتہ سے پیوستہ پرچے میں ایک سائل کا سوال شائع ہوا ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی منظم اسٹیٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے ایک منظم اسٹیٹ تھا اور انہوں نے جب ریاست کو اقتدارِ کُلی منتقل کرنے پر آمادہ پایا تو اسے بڑھ کر قبول کر لیا اور یہ طریق کار اختیار نہیں کیا کہ پہلے مومنین صالحین کی ایک جماعت تیار کریں۔ کیا آج بھی جب کہ اسٹیٹ اس دَور سے کئی گنا زیادہ ہمہ گیر ہو چلا ہے، اس قسم کا طریقِ کار اختیار کیا جا سکتا ہے؟" اس سوال کے جواب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھے پورا پورا اطمینان نہیں ہوا مجھے یہ دریافت کرنا ہے کہ ہم کو حضرت یوسف علیہ السلام کا اتباع کرنا ہی کیوں چاہیے؟ ہمارے لیے تو صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ واجب الاتباع ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ مکہ کی بادشاہت کی پیش کش کو رد کر کے اپنے ہی خطوط پر جداگانہ ریاست کی تعمیر و تشکیل کا کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا، اور ہمارے لیے بھی طریقِ کار اب یہی ہے! واضح فرمایئے کہ میری رائے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کس حد تک صحیح یا غلط ہے ؟

(۲) آپ نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کسی مرحلہ پر اگر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجودالوقت دستوری طریقوں سے نظامِ باطل کو اپنے اصول پر ڈھالا جا سکے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہ ہوگا۔ اس جملہ سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جماعتِ اسلامی بھی ایک حد تک اسمبلیوں میں آنے کے لیے تیار ہے اور الیکشن کو جائز سمجھتی ہے۔ اس معاملہ میں جماعتی مسلک کی توضیح فرمایئے۔"

جواب :- ہمارے لیے سارے انبیاء علیہم السلام واجب الاتباع ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی ہدایت تھی کہ اسی طریق پر چلیں جو تمام انبیاء کا طریق تھا۔ جب قرآن کے ذریعہ سے ہمیں معلوم ہو جائے کہ کسی معاملہ میں کسی نبی نے کوئی خاص طرزِ عمل اختیار کیا تھا اور قرآن نے اس کو منسوخ بھی نہ قرار دیا ہو تو وہ ویسا ہی دینی طریق کار ہے جیسا وہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مسنون ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بادشاہی پیش کی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ آپ اس دین کو اور اس کی تبلیغ کو چھوڑ دیں تو ہم سب مل کر آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں گے۔ یہ بات اگر یوسف علیہ السلام کے سامنے بھی پیش کی جاتی تو وہ بھی اُسی طرح اس پر لعنت بھیجتے جس طرح نبی کریمؐ نے اس پر لعنت بھیجی، اور ہم بھی اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو جو اختیارات پیش کیے گئے تھے وہ غیر مشروط اور غیر محدود تھے اور ان کے قبول کر لینے سے حضرت یوسفؑ کو یہ اقتدار حاصل ہو رہا تھا کہ ملک کے نظام کو اس ڈھنگ پر چلائیں جو دینِ حق کے مطابق ہو۔ یہ چیز اگر نبی کریمؐ کے سامنے پیش کی جاتی تو آپ بھی اسے قبول کر لیتے اور خواہ مخواہ لڑ کر ہی وہ چیز حاصل کرنے پر اصرار نہ فرماتے جو بغیر لڑے پیش کی جا رہی ہو۔ اسی طرح اگر کبھی ہم کو یہ توقع ہو کہ ہم رائے عام کی تائید سے نظامِ حکومت پر اس طرح قابض ہو سکیں گے کہ اُس کو خالص اسلامی دستور پر چلا سکیں تو ہمیں بھی اُس کے قبول کر لینے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔

الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لیے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ایک لادینی (Secular) جمہوری (Democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستورِ حکومت تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں۔ جو چیز بڑے بغیر سیدھے طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ مگر یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ہم یہ طریق کار صرف اُس صورت میں اختیار کریں گے جب کہ:

اولاً، ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہوں کہ محض رائے عام کا کسی نظام کے لیے ہموار ہو جانا ہی عملاً اُس نظام کے قائم ہونے کے لیے کافی ہو سکتا ہو۔

ثانیاً، ہم اپنی دعوت و تبلیغ سے باشندگانِ ملک کی بہت بڑی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا چکے ہوں اور غیر اسلامی نظام کے بجائے اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے ملک میں عام تقاضا پیدا ہو چکا ہو۔

ثالثاً، انتخابات غیر اسلامی دستور کے تحت اُس کو چلانے کے لیے نہ ہوں بلکہ بنائے انتخاب ہی یہ مسئلہ ہو کہ ملک کا آئندہ نظام کس دستور پر قائم کیا جائے۔

(ترجمان القرآن۔ محرم ۶۵ھ۔ دسمبر ۴۵ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۹۴۶ء کے انتخابات اور جماعت اسلامی

(۱۹۴۶ء کے انتخابات کے موقع پر مسلم لیگ کے ایک پُر جوش حامی نے جماعت اسلامی کے مسلک پر تنقید کرتے ہوئے ایک مضمون لکھا تھا۔ ذیل میں ہم وہ مضمون اور اس کا جواب جوں کا توں نقل کر رہے ہیں)

کچھ دنوں سے اخبارات میں مولانا مودودی صاحب کے اُس مضمون کا تذکرہ ہو رہا ہے جو ایک سوال کے جواب میں سہ روزہ "کوثر" مورخہ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۴۵ء کے صفحہ ۴ پر شائع ہوا ہے۔ مولانا نے انتخابات کی شرکت اور راے دہی کو حرام قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:

○ ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجیے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو، بہر حال ایک با اصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ نا ممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم اُن اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اُس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لیے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے عقیدہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

توحید کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حاکمیت، جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الٰہی کے ماتحت ہو نہ کہ اُس سے بے نیاز۔"

دَورِ حاضر کے علماء حضرات، کانگریسی ہوں یا احراری، بریلوی ہوں یا دیوبندی، مختلف سیاسی نظریات رکھنے کے باوجود اسمبلیوں کے اشتراک و انسلاک میں متفق العمل ہیں۔ صاف انکار اور بائیکاٹ کی آواز پٹھانکوٹ کے سوا کہیں سے نہیں اُٹھی اور وہ بھی اب تک محض ایک اُلکلہ ہے۔ ایک مسئلہ کی حیثیت سے یہ معاملہ تشنۂ بحث ہے۔ سطورِ ذیل میں اجمالی طور پر اپنے تاثرات پیش کرتا ہوں، ممکن ہے اہلِ علم اصحاب کی توجہ سے اس کے جزئیات دلیل و برہان کے ساتھ مزید روشنی میں آجائیں۔

اگر ممبرانِ اسمبلی کو قانون سازی کا غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہیں۔ یعنی ان کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ ایسا قانون مرتب کریں جس میں "آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الٰہی کے ماتحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز" کیونکہ آخر زمین کے مُنہ پر خدا کے بندوں ہی کو خدائی قانون کی ذمہ داریوں کو انجام دینا ہے۔ اگر حکم و اختیار نیک بندوں کے ہاتھ میں آئیگا تو یقیناً خدا کی زمین پر نیکی کی اشاعت ہوگی اور بُرائی مٹتی جائے گی۔ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ۔

لہٰذا اس مقصدِ اعلیٰ کے حاصل کرنے کے لیے ایجابی پہلو تو یہ ہوا کہ ایسے لوگوں کے منتخب ہونے کی کوشش کی جائے جن پر رضائے الٰہی کے ماتحت کام کرنے کا گمان غالب ہو، اور سلبی پہلو یہ رہا کہ ایسے لوگوں کے اختیار و اقتدار میں شدید مزاحمت کی جائے جن کی نسبت اس کے برعکس چلنے کا خیال ہو۔ علیحدگی، بائیکاٹ اور تعطّل کا جواز کسی صورت میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ اگر نیک لوگوں کے برسرِ اقتدار آنے میں تعاون نہ کیا جائے تو تعاون علی البر کے خلاف ہے اور اگر خالی چھوڑ کر بُروں کو موقع دے دیا جائے تو سکوت عن الحق کا جرم ثابت۔

ہاں اگر موجودہ جماعتوں میں کوئی جماعت تعاون کی مستحق اور اہل نہیں تو جماعت اسلامی کو میدان میں آنا چاہیئے تاکہ یہ لوگ "اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے میں صرف کردیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہو اور قانون سازی کتاب الہٰی کی سند پر مبنی ہو" تاہم اس سارے زور کے لیے بائیکاٹ اور تجنّب کا میدان تلاش کرنا یقیناً وضاحت طلب ہے۔

اگر ہر معاملہ کو وقتی قرار دے کر مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنے کی تلقین کردی جائے تو ایک ایسی دنیا مسلمانوں کے آباد ہونے کے لیے تلاش کرنی پڑے گی جو اس لیل و نہار اور وقت و زمان کی قیود سے ماوراء ہو۔ نیز یہ بھی خیال کرنا پڑے گا کہ کیا اسلامی نظام کی ہمہ گیری اس سے قاصر ہے کہ وقتی مسائل کو اپنے ابدی و ازلی قوانین کے ماتحت حل کرسکے۔ علیحدگی کسی صورت میں بھی اس مسئلہ کا حل نہیں کہلا سکتی۔ یا اس نظام کے ساتھ منع و مزاحمت کا معاملہ ہو، یا قبول و اذعان کا تعلق۔ اگر پوری مزاحمت ناممکن بھی ہو تو بھی مسلمان حتی الامکان کام کرنے کے لیے مجبور ہے۔

اس سلسلہ میں اکثر اضطرار و اختیار کی بحث پیش آتی ہے۔ سو اس کی نسبت عرض ہے کہ محترم مولانا مودودی صاحب نے اپنی اکثر تحریروں میں اظہار افسوس کرتے ہوئے با لوضاحت لکھا ہے کہ بدقسمتی سے اس وقت ہندوستان میں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں اسلامی قانون بغیر کسی منع و مزاحمت کے نافذ ہو۔ واقعی موجودہ حکومت کے ماتحت رہتے ہوئے اور اس قانون و تمدن میں زندگی بسر کرتے ہوئے یہ بھی ناممکن کہ ہم اپنی تمام قوتوں اور مال و املاک کو نظام باطل کا آلہ کار بننے سے محفوظ رکھ سکیں۔ اور ہندوستان کے وسیع و عریض برِّاعظم میں زمین کا ایک انچ بھر ٹکڑا ایسا تلاش کرسکیں جو اس نظام کے اثر سے ماؤف نہ ہو۔ تاہم گورداسپور کے ضلع میں قصبہ پٹھانکوٹ کے قریب زمین کے ایک ٹکڑے کو دارالاسلام بنایا جاتا ہے، اور اس شیطانی نظام کی تمام خرابیوں کے باوجود اس کے اندر وہ دارالاسلام ہے۔ اور یہ اسی مجبوری کا نتیجہ ہے کہ جو چیز مکمل حاصل نہ کی جاسکے اس میں سے جس قدر حاصل ہوسکے کرلی جائے۔

پھر مولانا نے دارالاسلام کے نظام کی توضیح فرماتے ہوئے اس سے رہبانیت اور قدامت پرستی کے شائبہ کو بھی یہ رفع فرمایا ہے۔ لکھا ہے کہ دارالاسلام کے قیام کا مقصد اکثر غلط فہم پندار وں کی طرح یہ نہیں کہ تمدن و حضارت کی جو حالت صحابہ کرام کے زمانہ میں تھی بالکل وہی پیدا کی جائے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور ایک متحجر صورت میں قائم رکھی جائے بلکہ آپ آیۂ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ سے استدلال کر کے قوانین طبعی کی ہر نئی قوت و ایجاد کو شرعی قانون کے ماتحت استعمال کرنا ہی عین اسلام قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرمایا ہے کہ:

"ریڈیو بجائے خود ناپاک نہیں، ناپاک وہ تہذیب ہے جو ریڈیو کے ڈائرکٹر کو داروغۂ اربابِ نشاط یا ناشر کذب و افترا بناتی ہے۔"

(رسالہ "دار الاسلام" صفحہ ۲۰)

اور فرمایا:

"یہ طاقتیں تو تلوار کی طرح ہیں کہ جو اُس سے کام لے گا وہی کامیاب ہوگا خواہ وہ ناپاک مقصد کے لیے کام لے یا پاک مقصد کے لیے۔ پاک مقصد والا اگر اپنے مقصد کی پاکی کو لیے بیٹھا رہے اور تلوار استعمال نہ کرے تو یہ اس کا قصور ہے اور اس قصور کی سزا اسے بھگتنی پڑے گی، کیونکہ اس عالم اسباب میں خدا کی جو سُنّت ہے اسے کسی کی خاطر نہیں بدلا جاسکتا۔"

(رسالہ مذکور صفحہ ۲۰)

اب گزارش ہے کہ اسمبلی کی غیر مشروط قانون ساز قوت یا حکومت کے اختیار کی تلوار کا قبضہ اگر آپ جیسے صحیح الخیال اصحاب کے ہاتھ میں آنے کا موقع مل سکتا ہے تو اسے مسترد کر دینے اور اس سے امکانی فوائد حاصل کرنے سے باز رہنے کے لیے وجہ جواز کیا ہے؟ مزاحمتِ باطل اور اعلائے حق کے مصائب سے عمداً کنارہ کش ہو کر گوشۂ عافیت اختیار کرنے کی یہ ایک دانشمندانہ کوشش تو نہیں۔

اگر پاک جماعت اپنے پاک مقاصد کو لیے بیٹھی رہے اور ناپاک مقاصد رکھنے والے لوگوں کے لیے عمداً جگہ چھوڑ دے اور نظام باطل کی گاڑی کے سامنے مزاحمت پیدا کرنے کے بجائے اس کے پہیئے سے اپنے آپ کو بے حس و حرکت باندھ دینا ہی دین داری اور خدمت اسلام یقین کر لے تو کیا اس عالم اسباب میں خدا کی سُنّت کے مطابق اس قصور کی سزا بھگتنی نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پڑے گی؟

یا تو نظام باطل سے کامل بے تعلقی عملاً حاصل ہو جائے اور مسلمان ایک خالص اسلامی ماحول پیدا کر لے ۔ لیکن اگر یہ صورت ناممکن ہو جیسا کہ ظاہر ہے تو پھر یہ کون سا مسلک ہے کہ وہ تعاون تو اضطرار ًا جائز رکھا جائے جس سے یہ نظام کما حقہ متمتع ہو کر دن بدن مضبوط سے مضبوط تر ہو رہا ہے ، اور ان صورتوں سے اختیاراً دست کشی کر لی جائے جہاں کسی قدر اسلامی مفاد بھی حاصل کرنا مقصود ہو ۔ اگر اسم اور مسمّٰی میں کسی وجہِ تسمیہ کا ہونا لازم ہے تو ایسی روش کو مسلک (چلنے کی راہ) کے بجائے بقولِ "کوثر" موقف (ٹھہرنے کی جگہ) کہنا زیادہ موزوں ہو گا ۔

"کوثر" کے اسی نمبر کے افتتاحیہ میں مولانا نصراللہ خان عزیز نے بھی اسی مسئلہ پر بحث فرمائی ہے جس کے مطالعہ سے اس سلسلہ میں اور بھی الجھن پیدا ہو جاتی ہے اور جمود و تعطّل کا شائبہ یقین کی حد کو پہنچ جاتا ہے ۔ آپ جہاد کے لیے دو شرطیں مقرر فرماتے ہیں ۔ لکھا ہے :

"اس کے لیے دو شرطیں ضروری ہیں ۔ ایک یہ کہ وہ بااختیار امیر کی قیادت میں ہو کسی دوسرے نظامِ قاہر و مسلط کے اندر رہتے ہوئے جہاں کسی بااختیار امیر کا وجود ناممکن ہے قتال کرنا بدامنی اور فساد ہے جو جائز نہیں ۔"

یہ حکم مزید توضیح کا محتاج نہیں ۔ بااختیار امیر کی قیادت کے بغیر جہاد فساد ہے اور امیر کا وجود کسی دوسرے قاہر و مسلط نظام کی موجودگی میں ناممکن ہے[1] ۔

اس شرط کی صحت تسلیم کر لینے کے بعد نظام حقہ قائم ہونے کی صرف یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ قاہر و مسلط نظام کے ارکان خود بخود مہربانی کر کے مسلمانوں پر سے اپنا قہر و تسلط اٹھا لیں اور انہیں کامل آزاد ماحول میں چھوڑ کر ٹھنڈے ٹھنڈے کہیں سدھار جائیں تاکہ مسلمان

---

[1] یہ محض ایک مغالطہ بحث ہے ۔ مدیر کوثر نے اس موقع پر جس جہاد سے بحث کی ہے وہ جہاد بالسیف ہے نہ کہ وہ جہاد جو جدّ و جہد کے معنی میں بولا جاتا ہے ۔ اس دوسری قسم کے جہاد کے لیے بااختیار امیر کی شرط کا کوئی بھی قائل نہیں ۔ (قدیم)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کو ایک بااختیار قیادت قائم کرنے کا شرعی حق حاصل ہو جاتے - یہ علیحدہ بات ہے کہ پھر جہاد کی ضرورت رہے یا نہ رہے - بہر حال جہاد حلال ہونے کی شرط یہی ہے -

اگر یہ شرعی فتویٰ کسی غیر منتق کو مشتبہ نظر آئے تو پھر سوا اس کے چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ جس طرح نظام باطل کے منع و مزاحمت کے باوجود ایک غیر اسلامی ماحول میں دارالاسلام قائم کرنے کی کوشش مناسب و موزوں بلکہ ضروری نظر آتی ہے اور اس نظام کے پیدا کردہ تمام آلات و قوٰی سے کام لینا عین اسلام اور کام نہ لینا ہلاکت قرار دیا جاتا ہے ، وہاں اسمبلیوں سے اپنا حصّہ حاصل کرنا اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنا ہی تقاضائے عقل و انصاف ہے -

مسلم لیگ کی پیدا کردہ موجودہ فضا اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ اگر دیہات کے ناخواندہ زمینداروں کے سامنے ، جو آج تک ذات پات کی عصبیت میں اعراب عرب سے کسی حالت میں کم نہیں ہیں ، ایک طرف کوئی غیر متشرع نواب ہوتا اور دوسری طرف ایک عالم دین تو یقیناً وہ عالم دین کو کامیاب کر کے چھوڑتے - اس نادر موقع سے فائدہ اُٹھانے اور عوام کو مذہبی قیادت سے محروم رکھنے کی ذمہ داری صرف ان لوگوں پر ہے جو محض اپنے آرام کی خاطر علماء کو بائیکاٹ کا مشورہ دے رہے ہیں -

یوسف صدیق علیہ السلام نے اِجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ کا مطالبہ کر کے غیر اسلامی حکومت کے ایک شعبہ کو ہاتھ میں لیا اور بہترین انتظام کر کے دنیا کو ہلاکت سے بچایا -

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے أَنْ أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَ اللَّهِ اور أَنْ أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ کے مسلسل مطالبات کر کے ایک غیر مہذب اور غیر صالح بھیڑ کو اسی ملک کے ایک حصّہ میں رکھ کر اصلاح و تہذیب کی کوشش کی -

مریض کی صحت اُنہی اخلاط کی تبدیلی پر منحصر ہے جو مریض کے وجود کے اندر موجود ہیں - ہمسائے کے گھر میں خواہ کسی قدر بہترین اور قیمتی ادویات کا انبار عمدہ سے عمدہ قرینہ اور ترتیب ہی سے کیوں نہ لگا دیا جائے دوسرے گھر والا مریض صحت یاب نہیں ہو سکتا -

---

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جواب

یہ مضمون دراصل متعدد مغالطوں یا غلط فہمیوں کا مجموعہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کر کے یہاں ہم صرف تین بڑی اور بنیادی غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱) صاحب مضمون کی پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ "اگر ممبرانِ اسمبلی کو قانون سازی کا غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہیں، یعنی ان کو اختیار حاصل ہوگا کہ ایسا قانون مرتب کریں جس میں آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جاتے" بظاہر یہ بات بڑی معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی تھوڑی سی تحلیل کرنے سے ہی یہ حقیقت بآسانی کُھل جاتی ہے کہ یہ مغالطہ یا غلط فہمی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آزادی کا ایک مفہوم یہ ہے کہ انسان کو یا انسانوں کے کسی گروہ کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار حاصل ہو، اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ اپنا یہ اصول قرار دے اور اس نظریے پر کاربند ہو کہ وہ اپنے عمل میں خود مختار ہے اور خود اپنی خواہش اور صوابدید کے سوا کسی آسمانی ہدایت سے امر و نہی کے احکام لینے اور اپنے معاملات میں رہنمائی حاصل کرنے کا پابند نہیں ہے۔ ان دونوں مفہومات میں سے پہلے مفہوم کی آزادی تو انسان کی فطری مسئولیت و ذمّہ داری کی اساس ہے جس کی بنیاد ہی پر وہ شرائعِ الٰہیہ کا مخاطب بنایا گیا ہے۔ یہ آزادی مومن ہونے کے لیے بھی اسی طرح ناگزیر ہے جس طرح کافر ہونے کے لیے۔ اسے ایمان و اسلام کی راہ میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور کفر و معصیت کی راہ میں بھی۔ اس کو بجائے خود نہ کُفر کہا جا سکتا ہے نہ ایمان، بلکہ یہ ایک شرطِ مقدّم ہے جس کے حصول کے بغیر کوئی فرد یا گروہ نہ ایمان کی راہ پر چل سکتا ہے نہ کفر کی راہ پر۔ بخلاف اس کے دوسری قسم کی آزادی قطعی طور پر ایک کافرانہ آزادی ہے اور کسی فرد یا قوم کا اُسے بطور ایک نظریہ و مسلک کے اختیار کرنا صریحاً یہ معنی رکھتا ہے کہ اس نے ایمان کے بجائے کُفر کی راہ اپنے لیے انتخاب کی ہے، کیونکہ کُفر اس کے سوا کسی اور چیز کا نام ہی نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز قرار دے کر اپنے نظریات و

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اعمال میں خود مختاری کا طریقہ اختیار کرے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں جس دستور پر حکومت خود اختیاری کا نظام اِس وقت قائم کیا گیا ہے اور جن خطوط پر آئندہ اس دستور کا نشو و نما ہو رہا ہے، اس کی بنیاد آیا محض پہلی ہی قسم کی آزادی ہے یا دوسری قسم کی آزادی بھی اس میں شامل ہے؟ جو شخص ہندوستان کے موجودہ نظامِ حکومت سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ پورا نظام دنیوی، لادینی ریاست (Secular State) کے نظریہ پر مبنی ہے، اور اب جو اس کا مزید دستوری ارتقا ہو رہا ہے اس میں بھی یہ بات اصل و اساس کے طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ وہ اسی دُنیوی لادینی ریاست کے قاعدہ پر مبنی ہو گا، یعنی اس میں باشندگانِ ملک کو صرف یہی آزادی حاصل نہیں ہو گی کہ اپنے لیے جو دستور چاہیں اختیار کریں، بلکہ اس کی بنیاد لازماً اس نظریہ پر قائم ہو گی (اور آج بھی ہے) کہ حاکمیت (Sovereignty) جمہور کی ہے اور قانون سازی میں رائے عام سے بالاتر کسی کتابِ الٰہی اور ہدایتِ خداوندی سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بنا پر یہ پورا نظام دراصل ایک کافرانہ نظام ہے، اِس کی بنیاد اسلام کی بنیاد سے متصادم ہے اور اس کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اس میں داخل ہونا قطعاً ایمان کے خلاف ہے۔ یہ آواز اگر صرف "پٹھان کوٹ" سے اُٹھی ہے تو اس میں بے چارے "پٹھان کوٹ" کا کوئی قصور نہیں، قصور اُن دوسری جگہوں کا ہے جہاں سے یہ اُٹھنی چاہیے تھی مگر نہ اُٹھی۔

یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم اس نظام کے اندر داخل ہو کر[1] اس کو اسلام کی طرف پھیر لیں گے۔ اس کے اندر داخل ہونا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ پہلے اس کے بنیادی نظریے کو تسلیم کیا جائے، اور اس کے بنیادی نظریے کو تسلیم کرنا اسلام کے بنیادی نظریے سے انکار کا ہم معنی ہے۔ لہٰذا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ باہر[2] رہ کر اس کے خلاف لڑیں اور اپنی تمام تر کوشش پہلے یہ اصول

---

[1] یعنی اس کی کارفرمائی دکارکنی میں شریک و حصہ دار بن کر۔
[2] باہر رہنے سے ہماری مراد حکومت کی مشینری سے باہر رہنا ہے، نہ کہ اس تمدن سے باہر نکل جانا جو اس حکومت کے تحت چل رہا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

منوانے میں صرف کریں کہ قانون سازی کتابِ الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیئے نہ کہ اس سے آزاد، اور باشندگانِ ملک کی حکومت خود اختیاری دوسری قوموں اور ملکوں کے مقابلہ میں خود اختیاری ہونی چاہیئے، نہ کہ خدا کے مقابلہ میں۔ اصولی حیثیت سے قطع نظر عملی حیثیت سے بھی یہ تدبیر قطعاً ایک غلط تدبیر ہے کہ اِس کافرانہ نظامِ حکومت کی مجالسِ قانون ساز میں داخل ہو کر ہم مذکورۂ بالا اصول منوانے کی کوشش کریں۔ یہ پارلیمنٹری طریقِ کار صرف اُن جماعتوں کے لیے مفید ہو سکتا ہے جو اصول میں رائج الوقت نظام سے متفق ہوں اور صرف فروعی اصلاحات کے معاملہ میں اپنا الگ مسلک رکھتی ہوں۔ لیکن جو جماعت سرے سے اِس نظام ہی کو اصولی طور پر بدل ڈالنا چاہتی ہو اس کے لیے پارلیمنٹری طریقِ کار کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ اس کو تو لازماً انقلابی طریقِ کار اختیار کرنا پڑتا ہے، یعنی یہ کہ وہ رائج الوقت نظام کے خلاف عام بے چینی پیدا کرے اور اس کو بدلنے کا ایک زبردست داعیہ باشندگانِ ملک میں اُبھار دے، پھر وقت کے حالات کے لحاظ سے ایسی تدبیر اختیار کرے جس سے نظامِ حکومت عملاً تبدیل ہو سکے۔

(۲) دوسری غلط فہمی جس میں صاحبِ مضمون مبتلا ہیں، یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس نظام کی اصلاح اِس طرح اور صرف اِسی طرح ہو سکتی ہے کہ اچھے لوگوں کو منتخب کر کے اُن اسمبلیوں میں بھیجنے کی کوشش کی جائے جو اِس کافرانہ دستور پر بنائی گئی ہیں، اور چونکہ جماعتِ اسلامی نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا ہے اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ اس جماعت نے محض علیحدگی و اجتناب کا سلبی پہلو اختیار کر رکھا ہے جس سے اصلاح تو کسی طرح نہ ہو گی البتہ اقتدار کی تلوار بُرے لوگوں کے ہاتھ میں جا کر باطل کو اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ جمانے میں استعمال ہو گی۔ اِس غلط فہمی میں نہ صرف صاحبِ مضمون مبتلا ہیں، بلکہ بکثرت لوگ اِسی طرز پر سوچ رہے ہیں اور اس کی اصل وجہ سطح بینی اور قلتِ فکر و تدبر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دراصل یہ حضرات اس بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ کروڑوں مسلمانوں کے موجود ہوتے ہوئے موجودہ کافرانہ نظام اِس ملک میں آخر قائم کیسے ہو گیا؟ اور کیا وجہ ہے کہ ملک کا سارا دستوری ارتقاء اِنہی کافرانہ اصولوں پر ہوتے چلا جا رہا ہے؟ اس سوال پر اگر انہوں نے کچھ غور کیا ہوتا تو ان پر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خود یہ حقیقت منکشف ہو جاتی کہ اس خرابی کی اصل وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً شعور اسلامی مردہ یا نیم مردہ ہو گیا ہے، ان کے اندر اسلامی دستورِ حیات پر چلنے اور اس کے لیے جینے اور مرنے کا ارادہ مفقود یا فقدان کی حد تک ضعیف ہے۔ اور انہوں نے ہندستان کے غیر مسلم باشندوں کو بھی صحیح نظامِ زندگی سمجھانے اور اس کی طرف دعوت دینے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کی اپنی زندگی بھی فکری، اخلاقی اور تمدنی حیثیت سے بیشتر غیر اسلامی ہو گئی ہے اور ہندوستان کا پورا نظامِ تمدن و سیاست بھی کافرانہ اصولوں پر قائم ہو گیا ہے۔ اب اس خرابی کا اور اس کے بُرے نتائج کا مداوا کرنے کے لیے اس قسم کی تدابیر سے کچھ کام نہیں چل سکتا کہ اس کافرانہ نظام کی مشینری میں ہم چند نیک مومنوں کو بھجوانے کی کوشش کریں۔ تھوڑی دیر کے لیے اگر اس اصولی سوال کو نظر انداز کر بھی دیا جائے کہ ایک نیک مومن اس مشینری کی کافرانہ بنیادوں کو تسلیم کر کے اس میں داخل ہونے پر آمادہ ہی کیسے ہو سکتا ہے، اور اگر تقیہ کے شیعی طریقہ کو اختیار کر کے چند مومن اس نظام میں داخل ہونے پر آمادہ ہو بھی جائیں، تو دیکھنا یہ ہے کہ اس تدبیر سے حاصل کیا ہو سکتا ہے۔

جمہوری نظام میں کوئی گروہ اپنے اصول کے مطابق نظامِ حکومت کو اس وقت تک ہرگز نہیں چلا سکتا جب تک کہ وہ حکومت کی مشینری پر قابض نہ ہو۔

حکومت کی مشینری پر قابض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مجالس قانون ساز میں اس گروہ کو غالب اکثریت حاصل ہو۔

اس غالب اکثریت کا حصول بحالاتِ موجودہ ہندوستان کے ایک بڑے حصّہ میں اہلِ ایمان کے لیے ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس وقت اسلام اس ملک میں ایک ایسی اصولی تحریک کی حیثیت نہیں رکھتا جس کے علمبردار باشندگانِ ملک سے محض اپنے اصول کی بنا پر عام اپیل کر سکتے ہوں اور یہ امید کی جا سکے کہ وہ اپنی دعوت کو مقبولِ عام بنا کر اکثریت کی تائید حاصل کر لیں گے۔ فی الحال تو اسلام ہندوستان کی ایک ایسی قوم کا مذہب ہے جس کی دوسری قوموں سے کشمکش ہو رہی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی گروہ اس وقت خالص اسلامی اصول لے کر انتخابی مقابلہ میں اُترے گا تو مسلمان قومیت کے پرستاروں کی طرح اس کو بھی صرف موجودہ مسلمان قوم ہی کے ووٹوں پر انحصار کرنا پڑیگا،

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور معلوم ہے کہ یہ قوم ملک کے بڑے حصّے میں بجائے خود اقلیت میں ہے۔

رہے وہ علاقے جہاں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے، تو اگر بالفرض وہ پاکستان کی صورت میں خود مختار ہو جائیں اور ایک مستقل صاحبِ حاکمیت اسٹیٹ کی حیثیت بھی ان کو حاصل ہو جائے تب بھی خالص اسلامی اصولوں پر جو گروہ کام کرنا چاہتا ہو اس کے غالب اکثریت حاصل کرنے کا بحالت موجودہ وہاں بھی کوئی امکان نہیں ہے، کیونکہ ان علاقوں میں اس کے اکثریت حاصل کرنے کا تمام تر انحصار مسلمانوں کی رائے عام پر ہے اور مسلمانوں کی رائے عام اس وقت بالکل نا تربیت یافتہ ہے، اسلامی فہم و شعور سے بہت بڑی حد تک عاری ہے اور اسلامی مقاصد کی بہ نسبت اپنی دنیوی خواہشات و اغراض کے عشق میں بُری طرح مبتلا ہے۔ اس رائے عام کی تائید سے کسی ایسے گروہ کا اکثریت کے ساتھ منتخب ہونا تقریباً ناممکن ہے جو بے لاگ طریقہ سے خالص اسلامی اصولوں پر کام کرنا چاہتا ہو۔

پھر اگر بالفرض ایسا ایک گروہ اکثریت میں منتخب ہو بھی جائے تو جو حالات اس وقت پائے جاتے ہیں ان میں یہ ممکن نہیں ہے کہ آزاد پاکستان کے نظام کو اسلامی دستور میں تبدیل کیا جا سکے۔ کیونکہ جنت الحمقا میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں، لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریکِ حکومت ہوں گے جس طرح مسلمان، اور پاکستان میں اُن کی تعداد اتنی کم اور اُن کی نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہوگی کہ شریعتِ اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اُس جمہوری نظام کا دستور بنایا جا سکے[1]۔

۱؎ واضح رہے کہ یہ مضمون فروری ۱۹۴۶ء میں لکھا گیا تھا جب پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا تخیل تک پیدا نہ ہوا تھا، اور مسلم لیگ کے تجویز کردہ مسلم علاقے میں آسام بھی پورا کا پورا شامل تھا۔ اُس وقت مجوزہ پاکستان کے مغربی حصّے میں غیر مسلموں کی تعداد ۲۷ر۹۳ فی صدی اور مشرقی حصّے میں ۲۰ر۳۱ فی صدی تھی۔ مزید برآں دونوں حصّوں میں غیر مسلموں کو معاشی، سیاسی، تعلیمی اور انتظامی حیثیت سے اتنی قوت حاصل تھی کہ ان کی اس تعداد اور اس طاقت کی موجودگی میں پاکستان کے اندر اسلامی ریاست کا خیال محض (باقی صفحہ ۲۵۷ پر)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہم ان حقائق کو سمجھتے ہیں اور اس بنا پر ہمارے نزدیک وہ تدابیر بالکل لاحاصل ہیں جن سے ہمارے محترم مضمون نگار اور ان کے طرز پر سوچنے والے بہت سے مسلمان اسلامی نظام کے قیام کی اُمیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس مقصد تک پہنچنے کا کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کا سیاسی نظام جس ڈھنگ پر چل رہا ہے اور جس راہ پر وہ آگے بڑھتا نظر آرہا ہے اس سے فی الحال ہم قطع نظر کرلیں اور اپنی ساری قوت اُس بنیادی کام پر صرف کریں جس کے ذریعہ سے نظامِ زندگی میں اسلامی طرز کا انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی جو جماعتیں حقیقی صورتِ معاملہ کو اچھی طرح نہیں سمجھ رہی ہیں وہ اپنے طرزِ عمل میں آزاد ہیں، جس طرح وہ کام کرنا چاہیں کریں، ہم ان کے خلاف خواہ مخواہ کوئی معرکہ آرائی نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ پچھلے زمانہ کی غلطیوں کی بدولت اس وقت فوری طور پر ایسی کوئی قوت فراہم نہیں کی جاسکتی جس سے واقعات کی موجودہ رفتار پر وہ کم سے کم اثر بھی ڈالا جاسکے جو اسلام کے مقصد کے لیے مطلوب ہے۔ اس لیے ہم اِس وقت کی سیاسی کارروائیوں میں دخل دینا تضیعِ وقت بھی سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے بھی اس سے احتراز کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اِس وقت ہم اپنے اصول سے ہٹے بغیر سیاسی جدوجہد میں حصّہ نہیں لے سکتے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اِس وقت سیاسی معاملات کا فیصلہ خواہ کچھ ہو جائے اور اس کے نتائج آگے چل کر خواہ کتنے ہی خوفناک نکلتے نظر آئیں، لیکن اگر ہم اُس پروگرام پر ٹھیک ٹھیک عملدرآمد کرنے میں کامیاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۱ سے) کرنا اُتنا ہی مشکل تھا جتنا وہ ہندوستانی اکثریت کے علاقوں میں تھا۔ درحقیقت حالات نے پلٹا اُس وقت کھایا جب بنگال، آسام اور پنجاب تینوں صوبے ۱۹۴۷ء کے وسط میں تقسیم کر دیئے گئے، اور مزید تغیر اس وقت ہوا جب عین تقسیم ہند کے موقع پر آبادیوں کا جبری تبادلہ رونما ہوا جو کسی اسکیم میں شامل نہ تھا۔ اس طرح مشرق میں مسلم آبادی کا تناسب ۸۰ فی صدی اور مغرب میں ۹۸ فی صدی ہوگیا۔ اس کے باوجود پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے میں جیسی جیسی دشواریاں پیش آئی ہیں ان سے اب کوئی بھی ناواقف نہیں ہے۔ (جدید)

ہو گئے جو ہمارے پیش نظر ہے تو واقعات کی رفتار بالآخر پلٹ کر رہے گی اور ان سارے نقصانات کی تلافی ہو جائے گی جو اس وقت کے اجتناب سے ہمیں پہنچیں گے۔ ہمارا پروگرام مختصر یہ ہے:

(ا) مسلمانوں کے اِس مخلوط انبوہ میں سے صالح اہل ایمان کے عنصر کو چھانٹ کر اعلیٰ درجہ کی اخلاقی تربیت کے ساتھ منظم کیا جائے اور ان کو اس کام کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ مسلم قومیت کے بجائے خود اسلام کو ایک اصولی تحریک کی حیثیت سے لے کر اُٹھ سکیں۔

(ب) اس گروہ کے ذریعہ سے عامۂ مسلمین میں اسلامی شعور و فہم اور اسلام اور غیر اسلام کی تمیز پیدا کی جائے، ان کی اخلاقی قدروں (Moral Values) کو تبدیل کر کے خالص اسلامی قدریں ان کے ذہن نشین کی جائیں، اُن میں اسلامی نظام زندگی کے قیام کا مضبوط ارادہ (موہوم اور مبہم ارادہ نہیں بلکہ واضح اور شعوری ارادہ) پیدا کیا جائے اور ان کی رائے عام کو اس حد تک تیار کر دیا جائے کہ اگر جمہوری طریقوں پر ملک میں انقلاب کرنا ممکن ہو تو خالص اسلامی طرز پر کام کرنے والی جماعت کے سوا کوئی دوسرا گروہ انہیں بیوقوف بنا کر یا ان کے سامنے غیر اسلامی مقاصد پیش کر کے ان سے ووٹ نہ حاصل کر سکے، اور اگر جمہوری طریقے قابلِ عمل نہ ہوں تو وہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو جائیں۔

(ج) مسلمانوں اور غیر مسلموں کی موجودہ سیاسی کشمکش سے جو تعصبات ہندوستان کے غیر مسلموں میں پیدا ہو گئے ہیں اُن سے بالاتر ہو کر غیر مسلموں کے سامنے اسلامی نظام زندگی کو اور اُن اخلاقی بنیادوں کو جن پر یہ نظام زندگی قائم ہوتا ہے، پیش کیا جائے اور پوری حکمت، جانفشانی اور خالص للّٰہیت کے ساتھ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں یہ ممکن ہو کہ غیر مسلموں کا بھی ایک صالح عنصر اسلامی نظام زندگی کا معتقد اور اس کے قیام کا طالب ہو جائے اور اسلامی نظام کا قیام صرف موجودہ مسلمان قوم کی رائے عام پر منحصر نہ رہے بلکہ اُن قوموں کی رائے عام بھی اس کی مؤید ہو جائے جو آج غیر مسلم ہیں اور جن کو مسلمانوں کی موجودہ قوم پرستانہ جنگ نے اسلام کے خلاف سخت تعصبات میں مبتلا کر رکھا ہے۔

اِس پروگرام میں جب ہم ایک قابلِ لحاظ حد تک کامیاب ہو جائیں گے (اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرز پر ہم کام کر رہے ہیں اس سے آخر کار ان شاء اللہ ہم کو کامیابی ضرور ہو گی) تب ہم ملک

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے حالات پر نظر ڈال کر دیکھیں گے کہ آیا اس وقت یہاں جمہوریت اتنی ترقی کر چکی ہے کہ دستورِ حکومت میں کوئی اصولی تغیّر صرف اِس بنیاد پر ہو سکتا ہے کہ رائے عام اُس تغیّر کی خواہش مند ہے؟ اگر یہ صورت ہم نے موجود پائی تو ہم وقت کے دستورِ حکومت کو تبدیل کرنے اور اسلامی اصول پر نیا دستور بنانے کا مطالبہ ملک کی رائے عام کے سامنے پیش کریں گے، اس تغیّر کے لیے اسے تیار کریں گے، اور وقت کے سیاسی نظام پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ ایک نئی دستور ساز اسمبلی (Constituent Assembly) منعقد کرے جو اس امر کا فیصلہ کرے کہ ملک کا آئندہ دستور کیا ہو۔ اس اسمبلی کے الیکشن میں ہم پوری کوشش کریں گے کہ رائے عام کی تائید سے ہم کو اکثریت حاصل ہو اور ہم ملک کا دستور اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس پروگرام کو ایک بڑا لمبا پروگرام سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید اس کے پورا ہونے میں دو تین صدیاں لگ جائیں گی، اس لیے اُن کے نزدیک یہ کوئی عملی پروگرام نہیں ہے بلکہ وہ اسے خیالی پلاؤ سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس پروگرام میں سارا دیر طلب کام صرف اُس ابتدائی صالح گروہ کی تنظیم و تربیت کا ہے جو اسلامی انقلاب کی ایک وسیع تحریک کا موزوں محرک بن سکے۔ ایسے ایک گروہ کی تنظیم کے بعد یہ تحریک اس طرح پھیلے گی جیسے خشک گھاس میں آگ پھیلتی ہے۔ وقت کے تعین کی پیشین گوئی تو میں نہیں کر سکتا، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس ابتدائی مرحلہ کے گزرنے کے بعد ہماری منزلِ مقصود اتنی دُور نہیں رہے گی جتنی بہت سے لوگ کام کیے بغیر صرف اپنے خیال میں دُور سمجھ رہے ہیں۔ تاہم اگر وہ دُور بھی ہو تو چونکہ منزلِ حق وہی ہے اس لیے ہم اس کی طرف دوڑتے ہوئے مر جانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں بہ نسبت اس کے کہ جانتے بوجھتے غلط مگر آسان راہوں میں اپنی قوت صرف کریں یا نادانی کے ساتھ جنت الحمقاء کے حصول میں اپنی قوت ضائع کریں۔

(۳) تیسری غلط فہمی جس میں صاحبِ مضمون کے ساتھ بہت سے سادہ لوح مسلمان مبتلا ہیں، یہ ہے کہ مسلم لیگ کی پیدا کردہ موجودہ فضا اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ عام مسلمانوں کے ووٹوں سے صالح مومنین کا ایسا گروہ منتخب ہو کر آ سکتا ہے جو وقت کی سیاسی رفتار کو

اسلامی نصب العین کی طرف پھیرنے کے قابل ہو۔ اسی بنا پر یہ حضرات کہتے ہیں کیسا نادر موقع مل رہا ہے اور تم اسے کھوئے دیتے ہو۔ اندھے ایمان کی بات تو دوسری ہے کہ اس میں تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور جب کوئی تحریک شور و غل اور ہنگامہ کے ساتھ طوفانی رفتار سے چل رہی ہو تو عام طبائع میں اندھے ایمان کا رُجحان پیدا ہو ہی جایا کرتا ہے لیکن جب ہم تحقیق کی نگاہ ڈال کر اس فضا کا جائزہ لیتے ہیں جو مسلم لیگ نے پیدا کی ہے تو ہمیں کسی نادر تو درکنار غیر نادر موقع کا بھی نشان نہیں ملتا۔

مسلم لیگ کی تحریک کے متعلق پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ اس کے بنیادی تصورات، اس کا نظام ترکیبی، اس کا مزاج اور اس کی اسپرٹ، اس کا طریق کار اور اس کے مقاصد سب کچھ وہی ہیں جو قومی اور قوم پرستانہ تحریکوں کے ہوا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مسلمانوں کی قومی تحریک ہے اور مسلمان کی ہر چیز "اسلامی" بن جایا کرتی ہے اس لیے خواہ مخواہ اسے بھی اسلامی تحریک سمجھ لیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک دوسری ہی چیز ہوتی ہے جس کا کوئی شائبہ بھی مسلم لیگ کی قومی تحریک میں نہیں پایا جاتا، اور یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اسلام اپنے مخصوص طریق کار سے جس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے اس تک آپ ایک قوم پرستانہ تحریک کے ڈھنگ اختیار کرکے پہنچ جائیں۔ ہر منزل اپنی فطرت کے لحاظ سے اپنی ہی ایک مخصوص راہ رکھتی ہے۔ آپ اسلام کی منزل مقصود کو پہنچنا چاہیں تو آپ کو اسلامی تحریک ہی کی مخصوص راہ کو سمجھنا اور اُسے اختیار کرنا پڑے گا۔ قوم پرستی کے طریقے اختیار کرکے آپ قومیت کی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں مگر یہ توقع کرنا انتہائی پراگندہ خیالی ہے کہ ان ڈھنگوں سے آپ اسلامی منزل مقصود پر جا پہنچیں گے۔ اس نکتہ کی توضیح کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میں اس سے پہلے تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ ایک اصولی تحریک اور ایک قوم پرستانہ تحریک میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ضرورت ہو تو پھر اس کی تشریح کر سکتا ہوں۔ یہاں میں اشارۃً صرف اتنی بات واضح کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک اصولی تحریک کے کارکنوں کو یہ خبر دینا کہ تمہارے لیے ایک قوم پرستانہ تحریک نے بڑے اچھے مواقع پیدا کر دیتے ہیں کسی بصیرت اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کسی عازمِ کلکتہ کو یہ خبر دی جائے کہ کراچی میل تیار کھڑا ہے۔

ان کی یہ خوشخبری کسی حد تک اگر صحیح ہو بھی سکتی تھی تو شاید اُس صورت میں ہوتی جب کہ مسلمانوں کی اِس قوم پرستانہ تحریک میں کم از کم ثانوی حیثیت ہی سے مذہبیت کا پُرزور اثر موجود ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں اس کا بھی فقدان ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ فی الواقع مسلمانوں کو اسلام اور اس کی تہذیب اور اس کے احکام کی اطاعت سے روز بروز دُور تر لیے جارہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عام مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے اس میں اسلام کا نام بہت لیا جاتا ہے، اور ایسی نمائشی باتیں بھی کچھ کردی جاتی ہیں جن سے اکابر لیگ کے گہرے جذبۂ دینی کا ثبوت بہم پہنچ جاتے۔ لیکن یہ چیزیں صرف سطح بین لوگوں کو دھوکے میں ڈال سکتی ہیں۔ حقیقت جو کچھ ہے وہ ہر صاحبِ نظر کے سامنے بالکل بے نقاب ہے۔ لیگ کی قیادت، اس کی پالیسی کی تشکیل، اس کے پورے نظام کی کارفرمائی، اور اس کی ساری قوتِ محرکہ اس وقت مسلمان قوم کے ایک ایسے طبقہ کے ہاتھ میں ہے جو زندگی کے جملہ مسائل میں دینی کے بجائے دُنیوی (Secular) نقطۂ نظر سے سوچنے اور کام کرنے والا ہے، اسلام کے بجائے مغربی اصولِ حیات کا معتقد اور مقلد ہے، دینی تعلق کے بجائے قومیت کے تعلق کی بنا پر مسلمانوں کی حمایت و وکالت اُسی طرح کر رہا ہے جس طرح ہر قوم پرست کیا کرتا ہے، اور صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ یہ گروہ خود علانیہ اسلام کے اصول و احکام کی خلاف ورزی کرنے میں بیباک ہے بلکہ اس کی رہنمائی و سربراہ کاری کی وجہ سے مسلمانوں میں بالعموم اسلام کے احکام کی خلاف ورزی اور اس خلاف ورزی میں بیباکی روز بروز بڑھتی جارہی ہے، اُن کی دینی حس مُردہ ہورہی ہے اور ان پر وہ ذہنیت بڑی تیزی کے ساتھ چھا رہی ہے جو اپنی اصل کے لحاظ سے قطعاً ایک دُنیا پرستانہ ذہنیت ہے مگر "مسلم قوم کے مفاد" اور "ملت کی زندگی کے بقا" کا نام لے لے کر اس پر "اسلامیت" کا جھوٹا ملمع چڑھایا جارہا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ اس صورتِ حال کے پیدا کرنے کی ذمہ داری میں اُن مذہبی رہنماؤں کی ناوانی بھی برابر کی شریک ہے جن کے ہاتھ میں تحریکِ خلافت کے زمانہ سے مسلمانوں کی قیادت کی باگیں تھیں اور جنہوں نے مسلمانوں کے عام احساسات کے علی الرغم ہندوستانی قوم پرستی کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سراسر غلط مسلک پر اصرار کر کے مسلمانوں کو زبردستی لامذہب رہنماؤں کی گود میں دھکیل دیا لیکن اسباب خواہ کچھ ہوں، یہ امر بجائے خود واقعہ ہے کہ مسلم لیگ کی پیدا کی ہوئی موجودہ فضا اسلام کے لیے کوئی موافق فضا نہیں ہے بلکہ انتہائی ناموافق اور ناسازگار فضا ہے جس میں خالص دینی نقطۂ نظر سے کام کرنے کے مواقع کم اور کم تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ لیگ کے حلقہ میں ایسے لوگوں کا بھی ایک بہت بڑا گروہ شامل ہے جو اخلاص کے ساتھ مسلمان ہیں اور سچے دل سے اسلام کی برتری چاہتے ہیں۔ مگر مجھے ان کی سادہ لوحی پر بڑا ترس آتا ہے۔ یہ بیچارے اُسی نادانی کا ارتکاب کر رہے ہیں جس کا ارتکاب ٹرکی کے بہت سے نیک نیت مسلمانوں نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد کیا تھا اور اس کا بُرا انجام دیکھ لیا۔ انہوں نے بھی اسی طرح قومی تحفّظ کی خاطر (اور "مسلمان قوم" کا تحفظ تو ایک مقدس مذہبی کام بن ہی جاتا ہے) مصطفےٰ کمال اور اس کی قوم پرست پارٹی کو زمامِ کار سونپی تھی۔ وہ بھی اسی طرح مذہبی تاویلیں کر کے لادینی کی طرف اس کی ہر پیش قدمی کو گوارا کرتے رہے، اور یونہی وہ بھی اپنا دل یہ سوچ سوچ کر بہلایا کرتے تھے کہ اس وقت تو قوم کا تحفظ مقدم ہے اور اس کے لیے اللہ اپنے دین کی تائید اس رجُلِ فاجر کے ذریعہ کر رہا ہے، جب یہ وقت گزر جائے گا تو انشاء اللہ ہمارا کاروان جادۂ اسلام کی طرف پھر مڑ جائے گا۔ مگر جو کاروان اپنے آپ کو بے دین قیادت کے قابو میں خود دے چکا تھا اسے پھر اسلام کی راہ پر جادہ پیمائی کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔

اب ذرا دینی پہلو سے قطع نظر کر کے محض قومیت کے نقطۂ نظر سے اس فضا کا جائزہ لیجیے جو مسلم لیگ نے اس وقت پیدا کی ہے۔ اس کا یہ پہلو خواہ کتنا ہی شاندار ہو کہ مسلمانوں میں ایک عام قومی حرکت پیدا ہو گئی ہے اور وہ ایک مرکزی طاقت سے بظاہر وابستہ ہو گئے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ لیگ کی یہ تحریک محض ایک اضطراری ہیجان ہے جو ہندو قوم پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے خوف سے مسلمانوں میں بھڑک اٹھا ہے۔ اس ہیجان کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا نقشہ نہیں ہے، کوئی واضح مقصد[1] نہیں ہے، کوئی تعمیری سعی نہیں ہے

---

[1] کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان ایک واضح مقصد ہے۔ لیکن کسی مقصد کے لیے محض ایک نام (باقی صفحہ ۲۵۸ پر)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو حصولِ مقصد کے لیے طاقت فراہم کر سکے، کوئی ایسی کارکن جماعت نہیں ہے جو قابلِ اعتماد سیرت اور ایک منظم فکر رکھتی ہو اور کوئی ایسی قیادت نہیں ہے جو ایک عمومی تحریک کو چلانے کی اہل ہو۔ فی الواقع مسلمانوں میں جو حرکت پیدا ہوئی ہے وہ لیگ اور اس کی قیادت نے سوچ سمجھ کر کسی نقشے کے مطابق پیدا نہیں کی بلکہ ہندوؤں کی قومی سامراجیت اور ان کے لیڈروں کی تنگ دلانہ سیاست سے مسلمانوں میں خود بخود ایک احساسِ خطر اور ہیجانِ اضطراب بھڑک اٹھا اور اس حالت میں جب مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ مذہبی اور سیاسی لیڈر جن کی طرف وہ تحریکِ خلافت کے زمانہ سے رجوع کرتے رہے تھے، ان کے کسی کام نہیں آرہے تو جس نے بھی آگے بڑھ کر ان کی طرف مدد کا ہاتھ بڑھایا اس کا دامن انہوں نے تھام لیا۔ اب یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اس ہیجان کی حالت میں جو رہنمائی ان کو میسر آئی وہ بجز کانفرنسوں اور اسمبلیوں کی لڑائی لڑنے کے اور کسی طرزِ جنگ اور طریقِ تیاری سے واقف نہیں ہے۔ اور یہ کھیل چونکہ کسی تیاری اور کسی نقشہ کے بغیر کھیلا گیا تھا اس لیے اس کا کوئی فائدہ اس کے سوا نہ ہوا کہ مسلمانوں کے قومی کیرکٹر کی کمزوری اور زیادہ بے نقاب ہو گئی اور ان کی ہوا پہلے سے زیادہ اُکھڑ گئی۔ سب سے زیادہ افسوس ناک معاملہ جس نے لیگ کی موجودہ رہنمائی کا انتہائی نااہل ہونا واضح کر دیا ہے، اشتراکیوں کا معاملہ ہے۔ اس گروہ کے متعلق ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی وفاداریاں اور ہمدردیاں روس کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کی رہنمائی کی باگیں تک روس کے ہاتھ میں ہیں۔ کوئی قوم جو اپنے گھر میں آزاد ہونا یا رہنا چاہتی ہو، اپنے درمیان ایسے ایک گروہ کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دے سکتی جو کسی بیرونی طاقت کے اشاروں پہ کام کرتا ہو۔ اسی وجہ سے کانگریس نے اس گروہ کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۷ سے) چھپا ہوا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ مقصد ایک واضح مقصد ہے۔ جس چیز کو پاکستان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ قطعی مبہم ہے اور اس کی اصل تعبیر غالباً ایک جمہوری لادینی اسٹیٹ کے سوا کچھ نہ ہو گی۔ مگر اس کو محض اس لیے صاف صاف بیان نہیں کیا جاتا کہ سادہ لوح مسلمان جو اسلامی نظام کے قیام کی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں اس سے مایوس نہ ہو جائیں۔

(قدیم)

اپنے اندر سے نکال باہر کیا اور ہندوؤں میں اس کے اثرات پھیلنے کا دروازہ تقریباً بند کر دیا۔ لیکن لیگ جس نے اپنے قابلِ اعتماد کارکن بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور جو اس وقت اندھوں کی طرح ہر اُس شخص یا گروہ کا سہارا لے رہی ہے جو بس اس کا الیکشن پروپیگنڈا کرنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دے، اِن اشتراکیوں کو بے تکلف اپنے اندر لے آئی ہے[1] اور اس کو کچھ نہیں سُوجھا کہ اپنے پاکستان میں وہ ایک ایسی طاقت کے ایجنٹوں کو قدم جمانے کا موقع دے رہی ہے جو ایران پر اپنا تسلط قریب قریب مضبوط کر چکی ہے اور اب اس کے اور پاکستان کے درمیان صرف افغانستان کی بودی سی دیوار حائل ہے۔ حد یہ ہے کہ اس کم نظر قیادت کو یہ کھلے ہوئے آثارِ غداری بھی نظر نہیں آتے کہ یہ کمیونسٹ جو ہندوستان میں بڑے مسلمان قوم پرست بنے ہوئے ہیں، ایران اور ٹرکی پر روس کی دست درازیوں کے خلاف ایک حرف نہیں کہتے بلکہ الٹا روس کو حق بجانب اور ایران و ٹرکی کو قابلِ الزام ٹھیرا رہے ہیں۔ کیا اس سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ کل اگر یہی روس پاکستان میں دخل اندازی شروع کرے گا تو ان کا رویہ کیا ہو گا؟

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اسلام اور اس کے مقاصد سے تھوڑی دیر کے لیے قطع نظر کر لیجیے کہ اس کے لحاظ سے تو لیگ کی تحریک مسلمانوں کو کوسوں دُور لیے جا رہی ہے، لیکن محض قومی مفاد کو بھی اگر سامنے رکھا جائے تو مجھے وہ فضا کہیں نظر نہیں آتی جس کے متعلق خبر دی جا رہی ہے کہ وہ بڑی ہی کوئی سازگار فضا ہے۔ یہ مختلف عناصر آج کانگریس کے مقابلہ میں متحد و متفق ہو سکتے ہیں، لیکن یہ قطعی ناممکن ہے کہ کل یہ سب مل کر کوئی ایک تعمیری اسکیم بنا سکیں اور اسے ٹھیک ٹھیک چلا لے جائیں۔

(ترجمان القرآن - فروری ۱۹۴۶ء)

---

[1] اس سلسلہ میں یہ لطیفہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ لیگ کا دستورِ اساسی کمیونسٹوں کے داخلہ میں کسی طرح مانع نہیں ہے۔ چونکہ یہ مسلم لیگ بلا اسلام بنائی گئی ہے اس لیے اس میں داخل ہونے کے لیے اسلام پر اعتقاد اور اس کی پیروی شرط نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جس کا نام مسلمانوں کا سا ہو اس میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ خدا اور آخرت اور رسالت کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ (قدیم)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تقسیم سے قبل
ہندوستان کے مسلمانوں کو آخری مشورہ

(یہ وہ تقریر ہے جو ۲۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو جماعت اسلامی کے اجلاس منعقدہ مدراس میں کی گئی تھی۔)

رفیقو اور دوستو! اس وقت ہم ہندوستان کی تاریخ کے ایک بہت نازک اور فیصلہ کُن مرحلے سے گزر رہے ہیں (اور یہ مرحلہ جس طرح ہندوستان کے باشندوں کی قسمت کے لیے فیصلہ کن ہے اُسی طرح ہماری اِس تحریک کے لیے بھی فیصلہ کُن ہے۔ اِس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اِس موقع پر ہم پوری ہوشمندی کے ساتھ اپنے اُس مقصد کو جس کے لیے ہم کام کرنا چاہتے ہیں، اور اُن حالات کو جن میں ہمیں کام کرنا ہے، اور اُس رُخ کو جس کی طرف یہ حالات جا رہے ہیں اور جن میں سے ہمیں اپنا راستہ نکالنا ہوگا، اچھی طرح سمجھ لیں، اور ہمارا ہر کارکن پوری بصیرت کے ساتھ یہ جان لے کہ موجودہ اور آئندہ حالات میں اُسے کس حکمتِ عملی پر کاربند ہونا ہے۔

ہماری اس تحریک کا مقصد، جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، صاف اور واضح الفاظ میں یہ ہے کہ ہم اُس صحیح طریقِ زندگی کو جس کا نام اسلام ہے، انفرادی اور اجتماعی طور پر عملاً قائم کریں، اپنے قول و عمل سے اس کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ کریں، دنیا کو اِس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کریں کہ اُسی طریقِ زندگی میں اس کے لیے فلاح اور سعادت ہے، اور موجودہ باطل نظاموں کی جگہ وہ نظامِ حق برپا کرنے کی جدوجہد کریں جو سراسر اُس طریقِ زندگی پر مبنی ہو۔ اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مقصد کے لیے اگرچہ ہمیں کام تو ساری دنیا اور تمام نوعِ انسانی میں کرنا ہے، لیکن فطرۃً ہمارے کام کی جگہ وہی سرزمین ہے جہاں ہم پیدا ہوتے ہیں، جہاں کی زبان ہماری زبان ہے، جہاں کے رسم و رواج سے ہم واقف ہیں، جہاں کے نفسیات سے ہم آشنا ہیں اور جہاں کی معاشرت سے ہمارا پیدائشی رشتہ ہے۔ خود پیغمبروں کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے ان کے اپنے وطن ہی کو جائے عمل اور مقامِ دعوت قرار دیا تھا، حالانکہ اُن کا پیغام ساری دنیا کے لیے تھا۔ کسی پیغمبر کے لیے جائز نہ تھا کہ اپنے اس فطری حلقۂ کار کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے جب تک کہ اس کے اہلِ وطن اُسے نکال نہ دیں یا وہ خود دعوت و تبلیغ میں انتہائی کوشش صرف کرنے کے بعد ان سے مایوس نہ ہو جائے۔ لہٰذا ہماری اس جماعت کا فطری دائرۂ عمل بھی یہی سرزمین ہے جسے خدا نے ہماری سکونت کے لیے منتخب فرمایا ہے ——— پوری جماعت کا دائرۂ عمل پورا ملک، ہر علاقے کے ارکان کا دائرہ ان کا اپنا علاقہ، اور ہر شہر، قصبے، یا گاؤں کے ارکان کا دائرہ ان کا اپنا وطن ——— ہم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ پورے استقلال کے ساتھ اپنی جگہ جم کر دعوتِ اصلاح اور سعیِ انقلاب میں منہمک رہے اور اپنے مقام سے ہرگز نہ ہٹے جب تک کہ اس کا وہاں رہنا قطعی غیر ممکن نہ ہو جائے، یا پھر وہاں دعوتِ حق کے بار آور ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہے۔ آنے والے حالات میں آپ بہت کچھ ہجرت و مہاجرت کی آوازیں سُنیں گے اور بعید نہیں کہ عام رَو کو دیکھ کر، یا خیالی اندیشوں سے سہم کر آپ میں سے بہتوں کے پاؤں اُکھڑنے لگیں۔ لیکن آپ جس مشن کے حامل ہیں اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آپ میں سے جو شخص جہاں ہے وہیں ڈٹ جائے اور اپنی دعوت کو اپنے ہی علاقے کی زندگی پر غالب کرنے کی کوشش کرے۔ آپ کا حال جہاز کے اُس بہادر کپتان کا سا ہونا چاہیے جو آخر وقت تک اپنے جہاز کو بچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور ڈوبتے ہوئے جہاز کو چھوڑنے والوں میں سب سے آخری شخص وہی ہوتا ہے۔ آپ جس مقصد پر ایمان لائے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ جس علاقے میں آپ رہتے ہیں وہیں کے نظامِ زندگی کو بدلنے اور راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ اس علاقے پر آپ کا اور آپ پر اس علاقے کا حق ہے اور وہ حق اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ اس کی اجتماعی زندگی میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں انہیں دُور کرنے میں آپ اپنا پُورا زور صرف کریں اور جس ہدایت سے آپ سرفراز کیے گئے ہیں اس کا فائدہ سب سے پہلے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُسے پہنچائیں۔

ہندوستان میں اس وقت جو حالات رونما ہیں وہ بظاہر ہماری دعوت کے لحاظ سے نہایت مایوس کن ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ سب لوگوں پر ان کا دل شکن اثر پڑ رہا ہے۔ ملک کی مختلف قومیں قومی خود غرضی میں بُری طرح مبتلا ہیں اور قوم پرستی کا جنون بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ان سے وہ حرکات سرزد ہو رہی ہیں جنہیں اگر جانوروں سے بھی منسوب کیا جائے تو وہ اپنی توہین سمجھیں۔ قومی کشمکش نے جنگ کی اور جنگ نے وحشت و درندگی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پہلے تو بات یہیں تک تھی کہ ہر قوم ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے دعوے اور جواب دعوے پیش کر رہی تھی اور اس پر تلخ کلامی کا سلسلہ چل رہا تھا، مگر اب نوبت یہ آگئی ہے کہ یہ مختلف قومیں ایک دوسرے کا نام ونشان تک مٹا دینے کے درپے ہیں۔ انہوں نے اپنی رہنمائی کا کام ایسے ایسے لیڈروں اور اخبار نویسوں کے سپرد کر دیا ہے جو انہیں ہر روز خود غرضانہ قوم پرستی کی شراب، نفرت وعداوت کا زہر ملا کر پلاتے ہیں اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی قومی خواہشات کی وکالت میں انصاف اور اخلاق کی ساری حدوں کو پھاندتے چلے جاتے ہیں۔ اخلاقی تصورات کے لیے ان کے دلوں میں اب فی الواقع کوئی گنجائش نہیں رہی ہے۔ تمام اخلاقی معیارات قومیت کے تابع ہو گئے ہیں۔ جو کچھ قومی مفاد اور قومی خواہشات کے مطابق ہے وہی سب سے بڑا اخلاق ہے، خواہ وہ جھوٹ ہو، خیانت ہو، ظلم ہو، سنگدلی اور بے رحمی ہو، یا اور کوئی ایسی چیز جو دنیا کے معروف اخلاقیات میں ہمیشہ سے بدی سمجھی جاتی رہی ہے۔ بخلاف اس کے سچائی، انصاف، دیانت، رحم، شرافت، انسانیت سب گناہ قرار پا چکے ہیں اگر وہ قومی مفاد کے خلاف پڑتے ہوں یا قومی خواہشات کے حصول میں مانع ہوں۔

ان حالات میں کسی ایسی دعوت کے لیے کام کرنا سخت مشکل ہے جو قومیتوں کو نظرانداز کر کے انسانیت کو خطاب کرتی ہو، جو قومی خواہشات کو چھوڑ کر خالص اصولِ حق کی طرف بلاتی ہو، اور قومی خود غرضیوں کو توڑ کر عالمگیر انصاف قائم کرنا چاہتی ہو۔ جنونِ قومیت کے اس دور میں ایسی دعوت کی آواز سُننے کے لیے نہ ہندو تیار ہیں نہ مسلمان۔ مسلمان کہنے

ہیں کہ تم ہماری قوم کے افراد ہو، تمہارا فرض تھا کہ قوم کے جھنڈے تلے کھڑے ہو کر قومی لڑائی لڑتے، یہ تم نے الگ جتھا بنا کر دین و اخلاق اور اصولِ حق کی رٹ کیا لگانی شروع کردی؟ تمہاری اس صدائے بے ہنگام سے قوم کی طاقت منتشر ہوتی ہے اور قومی مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔ لہٰذا ہم تمہیں قوم کا دشمن سمجھتے ہیں خواہ تمہاری دعوت اسی اسلام کی طرف ہو جس کا نام لے کر ہم یہ قومی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ دوسری طرف ہندوؤں کے پاس جاییئے تو وہ خیال کرتے ہیں کہ اِن لوگوں کی بات دل کو تو ضرور لگتی ہے، مگر اس چھاچھ کو ذرا پھونک کر پینا چاہیے، کیونکہ یہ ہیں تو اسی قوم کے افراد جس سے ہماری لڑائی ہے، کیا خبر کہ یہ اصولی دعوت بھی مسلمان قومیت ہی کو فروغ دینے کے لیے ایک دوسری تدبیر ہو۔

لیکن یہ حالات خواہ کتنے ہی حوصلہ شکن اور صبر آزما ہوں، بہرحال مستقل نہیں ہیں بلکہ عنقریب بدل جانے والے ہیں۔ اس وقت آپ کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ صبر اور حسنِ اخلاق سے اپنا کام کیے جائیں۔ اُلجھنے والوں کے ساتھ نہ اُلجھیں، نادان لوگوں کی مخالفتوں پر برافروختہ نہ ہوں، جن لوگوں میں دوست اور دشمن تک کی تمیز باقی نہیں رہی ہے اور جو لوگ جوشِ جنوں میں اب خود اپنے بھلے اور برے تک کا ہوش نہیں رکھتے وہ اگر جہالت اور جاہلیت پر اُتر آئیں تو آپ شریف آدمیوں کی طرح ان کے مقابلے سے ہٹ جائیں اور ان کی زیادتیوں کو خاموشی سے سہہ لیں۔ اس کے ساتھ آپ کو چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ معقول طریقہ سے اپنی دعوت مسلم اور غیر مسلم سوسائٹی کے اُن سب لوگوں تک پہنچائیں جو معقول بات کو سُننے اور اس پر کھلے دل سے غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس طریقہ پر اگر آپ نے عمل کیا تو ایک طرف آپ کی اخلاقی برتری کا سکہ بیٹھ جائے گا اور دوسری طرف وہ ذہنی فضا ایک حد تک تیار ہو جائے گی جو آنے والے حالات میں مؤثر کام کے لیے ضروری ہے۔

جس تغیر کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عنقریب ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ہندوؤں کو ان کی اکثریت کے علاقے اور مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقے الگ الگ مل جائیں گے۔ دونوں اپنے اپنے علاقوں میں پوری طرح خود مختار ہوں گے اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے اسٹیٹ کا نظام چلائیں گے۔ یہ بڑا تغیر اس نقشے کو بالکل بدل دے گا جس پر اس وقت تک

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حالات چلتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسری قوموں کے مسائل اور اُن کی نوعیتیں بالکل بدل جائیں گی۔ اُن کو بالکل ایک دوسری ہی صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے گا۔ جس ڈھنگ پر اس وقت تک انہوں نے اپنے قومی رویہ اور اپنی تحریکات اور جماعتی نظاموں کو قائم کر رکھا ہے وہ بڑی حد تک بے معنی اور ناکارہ ہو جائے گا۔ بدلے ہوئے حالات میں ان سب کو سوچنا پڑے گا کہ جو کچھ اب تک وہ کرتے رہے ہیں اس نے انہیں کہاں لا کھڑا کیا ہے اور اب اِس نئے دورِ زندگی میں ان کے لیے راہِ عمل کیا ہے۔ آج کے بنے اور جمے ہوئے عقیدے اس وقت مہمل ہو جائیں گے۔ آج کے خیالات اور تصورات کے لیے اُس وقت کوئی جگہ نہ ہوگی۔ آج کے نعرے اس وقت کھوٹے سکے ہوں گے جنہیں کوئی مفت کو بھی نہ پوچھے گا۔ جن بنیادوں پر آج کی قومی تحریکیں اور جماعتیں قائم ہیں وہ خود بخود ڈھ جائیں گی۔ اس لیے صرف یہی نہیں کہ آج کی لیڈریاں اپنی طبعی موت مر جائیں گی بلکہ بعید نہیں کہ جو لوگ آج انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں کل وہی ان کو اپنے مصائب و آلام کا اصلی سبب سمجھنے لگیں۔

آنے والے اس دور میں ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے حالات بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے، اور چونکہ ہمیں دونوں علاقوں میں کام کرنا ہوگا اس لیے ہمیں بھی اپنی تحریک کو دو مختلف طریقوں پر چلانا پڑے گا۔ بلکہ بعید نہیں کہ نظامِ جماعت کو بھی دو حصوں میں بانٹ دینا پڑے تاکہ ہر حصہ اپنے اپنے علاقے کے حالات کے مطابق مناسب پالیسی پر خود چل سکے اور اس کے لیے ضروری انتظامات خود کر سکے۔ جہاں تک مسلم علاقے کا تعلق ہے اس پر تو میں یہاں کوئی بحث نہ کروں گا، کیونکہ اس کے لیے موزوں مقام شمالی مغربی حلقہ کا اجتماع ہے جو عنقریب ہونے والا ہے۔ آپ کے سامنے مجھے صرف ہندو ہندوستان کے مستقبل پر گفتگو کرنی ہے کہ یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کو آئندہ کن حالات سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور ان حالات میں آپ کو کس طرح کام کرنا ہوگا۔

سب سے پہلے مسلمانوں کے معاملہ کو لیجیے۔ ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کر لیں گے کہ جس مسلم قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویہ کی بنیاد رکھی تھی وہ

انہیں بیابانِ مرگ میں لاکر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ، جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے، ایک ایسے نتیجہ پر ختم ہوئی ہے جو اُن کے لیے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ جن جمہوری اصولوں پر ایک مدت سے ہندوستان کا سیاسی ارتقا ہو رہا تھا اور جنہیں خود مسلمانوں نے بھی قومی حیثیت سے تسلیم کر کے اپنے مطالبات کی فہرست مرتب کی تھی، انہیں دیکھ کر بیک نظر معلوم کیا جا سکتا تھا کہ ان اصولوں پر بنے ہوئے نظام حکومت میں جو کچھ ملتا ہے اکثریت کو ملتا ہے، اقلیت کو اگر ملتا بھی ہے تو خیرات کے طور پر دست نگر ہونے کی حیثیت سے، نہ کہ حق کے طور پر حریف اور مدِ مقابل اور شریک کی حیثیت سے۔ یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت تھی، مگر مسلمانوں نے اس کی طرف سے جانتے بُوجھتے آنکھیں بند کر لیں اور اس دوہری حماقت کا ارتکاب کیا کہ ایک طرف تو نظام حکومت کے لیے مغرب کے انہی جمہوری اصولوں پر راضی ہو گئے اور دوسری طرف خود اپنی طرف سے تقسیم ملک کا یہ اصول پیش کیا کہ جہاں ہم اکثریت میں ہیں وہاں ہم حاکم اور تم محکوم ہو، اور جہاں تم اکثریت میں ہو وہاں تم حاکم اور ہم محکوم ہوں۔ کئی سال کی تلخ اور خونریز کشمکش کے بعد اب یہ مرکب حماقت "کامیابی" کے مرحلے میں پہنچ گئی ہے، اور جس چیز کے لیے اقلیت کے صوبوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان خود لڑ رہے تھے وہ حاصل ہوا چاہتی ہے، یعنی اکثریت کی آزاد و خود مختار حکومت جس میں وہ بحیثیت ایک قوم کے محکوم ہوں گے اور محکوم بھی اُس اکثریت کے جس سے وہ ابھی کل تک قومی جنگ لڑتے رہے تھے۔

جو اسٹیٹ اب مسلم اقلیت کے علاقوں میں بن رہا ہے وہ ہندوؤں کا قومی اسٹیٹ ہوگا۔ قومیت و جمہوریت کے جن نظریات کو مسلمان اور ہندو یکساں تسلیم کر کے اپنی قومی تحریکوں کی اساس بنا چکے ہیں ان کی بنیاد پر کوئی قومی اسٹیٹ اپنے اندر کسی دوسری ایسی قوم کے وجود کو گوارا نہیں کرتا جو حکمران قومیت سے الگ اپنی مستقل قومیت کی مدعی ہو اور پھر اس قومیت کے دعوے کے ساتھ اپنے مخصوص قومی مطالبات بھی رکھتی ہو۔ یہ چیز صرف اُسی وقت تک چل سکتی تھی جب تک ملک میں عملاً اقتدار ایک بیرونی قوم کا تھا اور ہندو اور مسلمان دونوں اس کے محکوم تھے۔ صرف اُسی وقت یہ ممکن تھا کہ اقلیت بھی اکثریت کی طرح

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اپنی الگ قومیت کا دعویٰ کرے اور کم و بیش اپنے کچھ مستقل حقوق منوا لے۔ مگر جب جمہوری اصول پر اہل ملک کی آزاد حکومت بن جائے گی تو ہندو ہندوستان اکثریت کا قومی اسٹیٹ بن کر رہے گا اور اس میں کسی اقلیت کی جداگانہ قومیت اور مخصوص قومی مطالبات کے لیے گنجائش نہ ہوگی۔ قومی اسٹیٹ ایسی کسی قومیت کو تسلیم کر کے اس کے مطالبے کبھی پورے نہیں کیا کرتا، بلکہ وہ پہلے تو یہ کوشش کرتا ہے کہ اسے تحلیل کر کے اپنے اندر ہضم کر لے، پھر اگر وہ اتنی سخت جان نکلتی ہے کہ ہضم نہ ہو سکے تو اسے دبا دینا چاہتا ہے تاکہ جداگانہ قومی وجود اور اس کی بنا پر مستقل قومی مطالبوں کی آواز بلند ہونے ہی نہ پائے، اور بالآخر اگر وہ دباؤ کے نیچے بھی پنپتی ہی چلی جائے تو پھر قومی اسٹیٹ اسے باقاعدہ فنا کرنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ یہی کچھ ہندوؤں کے قومی اسٹیٹ میں مسلم اقلیت کو پیش آنے والا ہے۔ اس کے سامنے بھی عملاً یہی تین راستے پیش کیے جائیں گے:

یا تو اپنی جداگانہ قومیت کے دعوے اور اس کی بنا پر مستقل حقوق کے مطالبے سے دستبردار ہو کر اسٹیٹ کی قومیت میں جذب ہو جائے۔

یا اگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہو تو اسے ہر قسم کے حقوق سے محروم کر کے شودروں اور اچھوتوں کی سی حالت میں رکھا جائے۔

یا اس پر استیصال کا پیہم عمل جاری کر دیا جائے یہاں تک کہ قومی اسٹیٹ کے حدود میں اس کا نام و نشان باقی نہ رہے۔

یہ لازمی نتیجہ ہے مغربی طرز کے ایک جمہوری نظام میں قومیت کی اساس پر اپنی سیاسی پالیسی کی عمارت اٹھانے کا۔ بصیرت کی آنکھیں اس نتیجہ کو اسی وقت دیکھ سکتی تھیں جب یہ پالیسی اختیار کی جا رہی تھی اور یہ نتیجہ ابھی بہت دور تھا۔ مگر اس وقت دیکھنے سے انکار کیا گیا اور دکھانے کی کوشش کرنے والوں کو دشمن سمجھا گیا۔ اب یہ نتیجہ بالکل سامنے آ گیا ہے اور افسوس کہ اسے دیکھنا ہی نہیں بھگتنا بھی پڑے گا۔

مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے جو گروہ اس وقت پیش پیش ہیں ان میں سے ایک 'نیشنلسٹ' مسلمانوں کا گروہ ہے جو آنے والے دور میں وہی پارٹ ادا کرے گا جو انگریزی دور میں خان بہادر

طبقہ ادا کر چکا ہے۔ یہ گروہ مسلمانوں کو دعوت دیگا کہ پہلی صورت کو برضا و رغبت قبول کریں یعنی اپنی قومی انفرادیت کے دعوے اور مخصوص حقوق کے مطالبے سے دست بردار ہو کر سیدھی طرح اسٹیٹ کی قومیت میں مدغم ہو جائیں۔ اس گروہ کی بات اب تک تو نہیں چلی ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ آگے بہت کچھ چلنے لگے گی، کیونکہ آئندہ یہی لوگ سرکار رس ہوں گے، انہی کی مدد سے نوکریاں اور ٹھیکے اور تعلیم گاہوں کے گرانٹ وغیرہ ملا کریں گے اور یہی حکمران قوم اور محکوم قوم کے درمیان واسطہ و وسیلہ بنیں گے۔ ان کی کوششیں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد کو اس حد تک گرا دینے میں کامیاب ہو جائیں گی کہ وہ خود مہاشے اور ان کی بیویاں اور بیٹیاں شریمتیاں بنیں اور لباس، زبان، معاشرت، خیالات، ہر چیز میں حکمران قوم سے اس درجہ ہم رنگ ہو جائیں "تاکس نگوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری"۔ جس قوم کی ایک بڑی تعداد اس سے پہلے مسٹر اور مس بن چکی ہے آخر اس کے لیے اب یہ نیا تغیر نا ممکن کیوں ہونے لگا؟ خصوصاً جب کہ آئندہ روٹی اور خوش حالی اور ترقی کا انحصار اسی پر ہوگا۔ لیکن مجھے امید نہیں کہ مسلمان من حیث القوم اس طرح سپر ڈال دینے پر راضی ہو جائیں گے۔ قومی حیثیت سے ان کی کوشش یہی ہوگی کہ اس جذب و انجذاب کی مزاحمت کریں۔

مزاحمت کے لیے وہ ابتداءً اسی گروہ کی طرف رجوع کریں گے جو اس وقت سیاسی میدان میں ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ مگر تجربہ بہت جلدی مسلمانوں کو بتا دے گا کہ اب اس گروہ کی سیاست پر چل کر وہ سیدھے تباہی کے گڑھے کی طرف جائیں گے۔ اکثریت کے قومی جمہوری اسٹیٹ میں رہ کر اگر اقلیت قومی جنگ لڑے گی تو ہر طرف سے پیسی اور کچلی جائے گی، زندگی کے ہر شعبے سے نکالی جائے گی، ہر قسم کے حقوق سے محروم کی جائے گی، اچھوتوں سے بھی بدتر حالت میں گرا دی جائے گی اور پھر بھی اگر اس کی آواز اٹھتی رہی تو اسے اس طرح مٹا یا جائے گا کہ اس پر نہ زمین روئے گی نہ آسمان۔

کہا جاتا ہے کہ اقلیت کے مسلمانوں کو اس انجام سے بچانے کے تین ذریعے ہیں:

ایک یہ کہ پاکستان کی ریاست ہندوستان کی ریاست سے سودا کرے گی، یعنی وہ کہے گی کہ پاکستان کی ہندو اقلیت سے ہم وہی سلوک کریں گے جو تم ہندوستان کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسلمان اقلیت سے کریں گے اور اس طرح مسلمانوں کو وہی آئینی تحفظات مل جائیں گے جو ہندو پاکستان میں ہندوؤں کے لیے چاہیں گے۔ لیکن آغازِ کار میں یہ تجویز خواہ کیسی ہی خوش آئند نظر آئے، مجھے یقین ہے اور تجربہ بتا دے گا کہ آگے چل کر یہ قطعاً ناکام ہوگی[1]۔ ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں مغربی طرزِ سیاست کی راہ پر چلے جا رہے ہیں۔ اس طرزِ سیاست کے جو نتائج مغرب میں نکل چکے ہیں وہی یہاں نکل کر رہیں گے۔ اقلیت کی جداگانہ قومیت اور قومی حقوق اور مطالبوں کو نہ مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ زیادہ مدت تک برداشت کر سکے گا اور نہ ہندوؤں کا قومی اسٹیٹ۔ خصوصاً جب یہ دونوں اقلیتیں اپنی اپنی ہم قوم بیرونی ریاست کی طرف استمداد کا ہاتھ پھیلائیں گی اور اپنے ملک کی حکومت کے بجائے بیرونی حکومت سے وفاداری، دلچسپی اور محبت کی پینگیں بڑھائیں گی تو ان کا وجود ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتے گا۔ ابتدا میں خواہ کیسے ہی اطمینان بخش آئینی تحفظات دونوں نے ایک دوسرے کی اقلیتوں کو دیئے ہوں، رفتہ رفتہ عملاً ان کو ختم کر دیا جائے گا، روزمرہ کے برتاؤ میں اقلیتوں کا استیصال کرنے والی پالیسی چل پڑے گی، دونوں حکومتیں اپنی اپنی قومی اقلیتوں کی خاطر ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گی اور بالآخر یا تو جنگ تک نوبت پہنچے گی ـــــــ جس کے نتیجہ کے متعلق پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی، ـــــــ یا دونوں کو اس پر راضی ہونا پڑے گا کہ ایک حکومت ہندوؤں کے ساتھ اور دوسری حکومت مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ چاہے کرے۔

دوسرا ذریعۂ تحفظ یہ بتایا جاتا ہے کہ اقوامِ متحدہ کے نظام (United Nations Organisation) سے اس معاملہ میں مدد لی جاتے گی۔ لیکن جو لوگ اس نظام کے مزاج کو کچھ بھی جانتے ہیں وہ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ذریعۂ تحفظ کے بل پر کوئی دبی ہوئی

---

[1] اپریل ۱۹۵۰ء میں پاکستان نے اس کی کوشش کی تھی جس کے نتیجہ میں لیاقت نہرو پیکٹ وجود میں آیا۔ لیکن اس سے ہندوستان کی مسلم اقلیت کا جیسا کچھ تحفظ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قوم کتنے دن جی سکتی ہے۔ اوّل تو اقوام متحدہ کے نظام سے مُرافعہ کسی ایسے ہی معاملے میں کیا جا سکتا ہے جس میں کوئی بہت بڑی اور نمایاں ظالمانہ کارروائی کی گئی ہو۔ روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے معاملات خواہ مجموعی طور پر مل کر کتنا ہی بڑا ظلم بن جائیں، بہرحال اس نظام میں قابلِ مرافعہ قرار نہیں پا سکتے۔ نہ اُن بظاہر معصوم پالیسیوں کو وہاں زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے جو مغربی معیار کے لحاظ سے بالکل برحق ہوتی ہیں مگر ہمارے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی حیاتِ دینی و ملّی کو بالکل ختم کر دینے والی ہیں۔ پھر اس نظام نے اب تک تو یہ ثابت نہیں کیا ہے کہ وہ بالکل بے لاگ انصاف کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے ارکان صرف یہی نہیں دیکھتے کہ معاملہ بجائے خود کیسا ہے اور اُس میں انصاف کا تقاضا کیا ہے، بلکہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شکایت جس حکومت کے خلاف کی گئی ہے اس سے ہماری اپنی حکومتوں کے تعلقات کیسے ہیں اور آیا اسے ملعون کرنا ہماری حکومتوں کی مصلحت کے مطابق ہے یا خلاف۔ اس لحاظ سے کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ زمانہ میں نظامِ اقوام متحدہ کے اندر ہندوستان اور پاکستان کی اضافی (Relative) پوزیشن کیا ہوگی اور کس کی بات وہاں زیادہ وزن دار ہوگی۔

تیسرا ذریعہ ہجرت اور تبادلۂ آبادی کا بیان کیا جاتا ہے۔ ہجرت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان خود ہندوستان چھوڑ کر پاکستان میں جا بسنے شروع ہوں۔ اور تبادلۂ آبادی کا مطلب یہ ہے کہ دونوں حکومتیں باہمی قرارداد سے ایک نظم کے ساتھ اپنی اپنی ہم قوم آبادی کو اپنے علاقے میں منتقل کر لیں۔ ان میں سے پہلی صورت قابلِ عمل ہے مگر وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ حل نہ کر سکے گی۔ کیونکہ اس صورت میں وقتاً فوقتاً صرف کھلتے پیتے لوگ یا بہت برداشتہ خاطر افراد و خاندان یا کچھ من چلے قسمت آزما لوگ ہی عمل کر سکیں گے، مسلمانوں کی عام آبادی جہاں اب بس رہی ہے وہیں بستی رہے گی اور اس کا کسی بڑے پیمانے پر خود مہاجرت کرنا ممکن نہ ہوگا، اِلّا یہ کہ کسی وقت خدانخواستہ وہ حالات پیش آ جائیں جو بہار وغیرہ میں پیش آ چکے ہیں۔ رہی دوسری صورت، تو مجھے امید نہیں کہ آئندہ پچاس سال تک ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں اور ڈھائی تین کروڑ غیر مسلموں کو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر منتقل کرنے کا انتظام کر سکیں گی، خواہ وہ دل سے ایسا کرنا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چاہیں۔ تاہم اگر کوئی اس اُمید پر جینا چاہتا ہو تو ضرور جیے۔

یہ ہے اُن ذرائع کی حقیقت جن کی بنا پر اُمید کی جارہی ہے کہ قوم پرستانہ سیاست جس طرح انگریزی اقتدار کے دَور میں چلتی رہی ہے، اسی طرح ہندوستان کی قومی حکومت بن جانے کے بعد بھی چل سکے گی۔ آج مسلمان اپنی جہالت اور کم نگاہی کی وجہ سے ان حقائق کو نہیں سمجھ رہے ہیں، مگر وہ وقت قریب ہے جب یہ حقائق خود اپنے آپ کو ان کی سمجھ میں اُتار دیں گے اور اس وقت لامحالہ ان کو تین راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔

ایک یہ کہ "نیشنلسٹ" مسلمانوں کی پالیسی قبول کرکے ہندو قومیت میں جذب ہونے پر تیار ہو جائیں۔

دوسرے یہ کہ "مسلم قوم پرستی" کی موجودہ روش پر بدستور چلتے رہیں یہاں تک کہ مٹ جائیں۔

تیسرے یہ کہ قوم پرستی اور اس کے طور طریقوں اور اس کے دعوؤں اور مطالبوں سے توبہ کرکے اسلام کی رہنمائی قبول کرلیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنی قومی اغراض کے لیے سعی وجہد کرنے کے بجائے اپنی تمام کوششوں کو صرف اسلام کی اصولی دعوت پر مرکوز کردیں اور من حیث القوم اپنے اخلاق، اعمال اور اجتماعی زندگی میں اُس کی شہادت دیں جس سے دنیا یقین کرسکے کہ فی الواقع یہ وہ قوم ہے جو اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ محض دنیا کی اصلاح کے لیے جینے والی ہے اور در حقیقت جن اصولوں کو یہ پیش کررہی ہے وہ انسانی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی طور پر نہایت اعلیٰ وارفع اور اصلح بنا دینے والے ہیں۔

یہی آخری راہ مسلمانوں کے لیے پہلے بھی راہِ نجات تھی اور اب بھی اِسی میں ان کے لیے نجات ہے۔ مَیں کئی سال سے اُن کو اسی کی طرف بلا رہا ہوں۔ اگر یہ قوم پرستانہ سیاست کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اِس راہ کو اختیار کرتے، اور جس طرح پچھلے دس سال میں انہوں نے اپنی پُوری قومی طاقت کو اُس راہ پر لگایا ہے اسی طرح کہیں اِس راہ پر لگایا ہوتا تو آج ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہوتا اور دو چھوٹے چھوٹے پاکستانوں کی جگہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سارے ہندوستان کے پاکستان بن جانے کے امکانات ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتے لیکن اُس وقت میری دعوت انہیں دشمن کی دعوت یا ایک دیوانے دوست کی دعوت محسوس ہوئی۔ اب واقعات انہیں گھیر کر "ناچار مسلمان شو" کے مقام پر خود کھینچ لاتے ہیں۔ اب ان کے لیے زندگی کی راہ صرف ایک ہی رہ گئی ہے اور وہ اسلام کی ——— اصلی اور حقیقی اور مخلصانہ اسلام کی ——— راہ ہے۔ دوسری راہیں زندگی کی نہیں بلکہ خودکشی یا سزائے موت یا طبعی وفات کی راہیں ہیں۔

یہ وقت جس کے آنے کی میں خبر دے رہا ہوں اب بالکل قریب آگیا ہے۔ جونہی کہ ہندوستان کی سیاست کا موجودہ دور ختم ہو کر نیا دور شروع ہوا، اقلیت کے علاقوں میں مسلمانوں کو اپنی واقعی یاس انگیز پوزیشن کا عام احساس شروع ہو جائے گا۔ یہ ایک بڑی تحریک کے انہدام کا وقت ہوگا جو تحریکِ خلافت کے انہدام سے کئی گنا زیادہ خطرناک ہوگا۔ تحریکِ خلافت کی ناکامی نے مسلمانوں پر جو جمود و انتشار طاری کیا تھا وہ اگرچہ نہایت نقصان دہ تھا مگر مہلک نہ تھا۔ اب اگر وہ کیفیت کہیں پھر طاری ہوئی تو قطعاً مہلک ثابت ہوگی۔ اپنے اس وقت تک کے رہنماؤں سے مایوس ہو کر کوئی صحیح رہنمائی اور کوئی شعاعِ امید اگر مسلمانوں نے نہ پائی تو ان پر گھبراہٹ اور طوائف الملوکی مسلط ہو جائے گی۔ کوئی نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف دوڑے گا، کوئی کمیونسٹ گروہ کی طرف لپکے گا، کوئی ہجرت کی تیاری کرے گا، کوئی مایوسی کی حالت میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے گا، اور کوئی دل برداشتگی کے عالم میں، یا محض احمقانہ جھنجھلاہٹ کی بنا پر ہاری ہوئی قومی جنگ کو پھر تازہ کر کے نہ صرف اپنے اوپر بلکہ اپنے ہزاروں لاکھوں بے گناہ بھائیوں پر بھی تباہی کا طوفان اُٹھا لائے گا۔ اس نازک وقت کے لیے ابھی سے ایک ایسا منظم گروہ تیار رہنا چاہیے جو ہوش میں آنے والے مسلمانوں کے سامنے بروقت صحیح راہِ عمل پیش کر سکے، ان کی مائل بانتشار قوتوں کو غلط کاریوں اور خام کاریوں سے بچا کر ایک روشن نصب العین کے گرد سمیٹ سکے، اور ان کو یاس کے بعد حقیقی کامیابیوں کی بشارت دے سکے۔ میری دعا ہے کہ آپ ہی کا یہ گروہ اُس خدمت کے انجام دینے کی توفیق پائے اور اُس وقت کے آنے سے پہلے اِس حد تک طاقت ور اور منظم اور مستعد ہو جائے کہ یہ خدمت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انجام دے سکے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا ہندو ہندوستان کی اکثریت کے مستقبل کا بھی جائزہ لیں۔ میں آپ لوگوں سے اکثر کہتا رہا ہوں کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کا جتنا امکان مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہے قریب قریب اتنا ہی امکان غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی ہے۔ میری اس بات کو بہت سے لوگ ایک غرقِ تخیّل آدمی کا خواب سمجھتے ہیں، اور بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غالباً یہ تصوّف کا کوئی نکتہ ہے جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس لیے کہ ان کو صریح طور پر یہ نظر آرہا ہے کہ غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک مضبوط متحد اور منظم بلاک بنی ہوئی ہے۔ اُس کے اندر کہیں کوئی خلل یا شگاف نہیں ہے جہاں سے اس کے ٹوٹنے کا امکان ہو۔ اُس پر قوم پرستی کا نشہ پوری طرح مسلط ہے۔ ہندو انڈیا کا پورا نظامِ حکومت نہایت مستحکم طریقہ سے اس کے ہاتھ میں آچکا ہے اور جو تھوڑی سی کسر باقی ہے وہ عنقریب پوری ہوتی جاتی ہے۔ اِس حالت کو دیکھتے ہوئے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہاں اِسلامی انقلاب کا راستہ کدھر سے نکل آئے گا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ مضبوط بلاک جو آپ کے سامنے نظر آرہا ہے، اور بظاہر ٹھوس بھی محسوس ہوتا ہے، اس کی ساخت کو ذرا سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ یہ کن اجزا سے مرکب ہے اور ان کی پیوستگی کی نوعیت کیا ہے۔

ہندوستان کے ان کروڑوں غیر مسلموں کو جس چیز نے متحد اور منظم کیا ہے وہ کوئی مستقل نظریۂ حیات، کوئی مضبوط فلسفۂ زندگی اور کوئی شعوری نصب العین نہیں ہے کہ اس کا متزلزل ہونا اور بدل جانا مشکل ہو، بلکہ وہ محض ایک قوم پرستی کا جذبہ ہے جو ایک طرف اجنبی اقتدار کے خلاف اور دوسری طرف مسلم قوم پرستی کے مقابلہ میں بھڑکایا گیا تھا۔ قوم پرستی کا فطری خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف کسی مخالف و مزاحم اور مبارز طاقت ہی کے مقابلہ میں پیدا ہوا کرتی ہے، اس کی شدت مزاحمت ہی سے بھڑکتی ہے، اور جب تک وہ طاقت مقابلہ میں موجود ہو اسی وقت تک باقی رہتی ہے۔ جونہی کہ مزاحمت ختم ہوئی اور قوم پرستی کا مقصد حاصل ہوا یہ جذبہ آپ سے آپ دب جاتا ہے، اندرونی زندگی کے دوسرے اہم تر مسائل لوگوں کی توجہات کو اپنی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طرف کھینچ لیتے ہیں اور وہ عناصر جو محض قوم پرستی کے جذبہ سے باہم پیوستہ ہوئے تھے، بکھرنے لگتے ہیں۔ ہندو قوم پرستی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ جن دو پاؤں پر کھڑی ہوئی تھی ان میں سے ایک ـــــ یعنی انگریزی اقتدار سے نجات پانے کا جذبہ ـــــ عنقریب گرا چاہتا ہے۔ اس کے بعد صرف دوسرا پاؤں باقی رہ جاتا ہے، یعنی مسلم قوم پرستی کے مقابلہ کا جذبہ۔ سو پاکستان کے بن جانے کے بعد اس کا قائم رہنا بھی مشکل ہے۔ بشرطیکہ ہندو علاقے کی مسلمان اقلیت اپنے مسئلے کو حل کرنے کی کوئی ایسی راہ نکال لے جس سے نہ تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی و نزاع کے اسباب پیدا ہوں اور نہ ہندوستان کے اندر مسلم قوم پرستی کے دعووں اور مطالبوں کو دبانے کے لیے ہندو قوم پرستی کے مشتعل ہونے کا کوئی موقع باقی رہے۔ یہ حکمت اگر خدا نے مسلمانوں کو عطا کر دی تو آپ دیکھیں گے کہ نیشنلسٹ لیڈر اور قومی و مذہبی عصبیتوں کے مبلغین مصنوعی خطرے اور جعلی ہوّے پیش کر کر کے موجودہ قوم پرستی کو زندہ اور مشتعل رکھنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کریں، وہ بہرحال مر کے رہے گی اور وہ مختلف و متضاد عناصر جن کی ترکیب سے یہ قوم پرست بلاک بنا ہے، بکھر کر رہیں گے۔ اس لیے کہ اس بلاک کے اندر خود اس کے اپنے عناصر ترکیبی کے درمیان جو تمدنی، معاشرتی بے انصافیاں، جو معاشی جفا کاریاں، جو اغراض و مقاصد کی کشاکشیں، اور جو طبقاتی منافرتیں موجود ہیں، وہ بیرونی خطرات کے ہٹتے ہی اپنے آپ کو بزور محسوس کرائیں گی اور ملک کے آئندہ نظام، اختیارات کی تقسیم، حقوق کے تعین اور سماجی نظام کی تشکیل کے مسائل لامحالہ ان کو آپس میں پھاڑ دیں گے۔ اس تفرقہ کے لیے ایسے طاقت ور اور فطری اسباب موجود ہیں کہ اسے رونما ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

ہندوستان کا موجودہ سماجی نظام کچھ اس طرز پر بنا ہے کہ وہ بے شمار طبقات پر مشتمل ہے جن میں سے بعض بعض پر چڑھے ہوئے اور بعض ان سے دبے ہوتے ہیں۔ ان طبقوں کے درمیان پیدائشی برتری و پستی، اور اٹل امتیازات کا تصور گہری جڑوں کے ساتھ جما ہوا ہے اور اس کو تناسخ کے فلسفے سے اور زیادہ مضبوط کر دیا گیا ہے۔ پست طبقوں کے حق میں یہ یقین پیدا کیا گیا ہے کہ وہ پستی ہی کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور یہ ان کے پچھلے کرموں کا لازمی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نتیجہ ہے جسے انہیں بہرحال بھگتنا ہی پڑے گا، جسے بدلنے کی ہر کوشش بے سود ہے۔ اور اُونچے طبقوں کے حق میں یہ اذعان پیدا کیا گیا ہے کہ وہ پیدا ہی برتری کے لیے ہوتے ہیں۔ برتری اُن کا حق اور ان کے پچھلے کرموں کا نتیجہ ہے اور اس کو بدلنے کی کوشش قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ اس سماجی نظام میں ہر اُوپر کا طبقہ نیچے والے طبقہ کے سر پہ پاؤں رکھے کھڑا ہے اور اسے رَوندر رہا ہے۔ معاشرت کے ہر پہلو میں اُونچ اور نیچ کا امتیاز ہے۔ قدم قدم پر بے شمار بے انصافیاں ہیں۔ تمدن کے ہر گوشہ میں امتیاز کا برتاؤ ہے، خواہ کھانے پینے کا معاملہ ہو یا رہن سہن کا یا شادی بیاہ کا، اور اس امتیاز میں صرف تفریق ہی کا نہیں بلکہ تحقیر اور تذلیل کا عنصر بھی شامل ہے۔ حد یہ ہے کہ اُونچے طبقے اس بات کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ نیچے طبقوں کے مرد اور عورتیں ان کے سے لباس اور زیور پہن لیں۔ حال ہی کی بات ہے کہ راجپوتانہ کے گوجروں اور جاٹوں نے اس بات پر ہنگامہ برپا کر دیا تھا کہ چمار وغیرہ نیچے طبقوں نے ــــــ جو جنگ کی وجہ سے خوشحال ہو گئے ہیں اور کچھ باہر کی ہوا بھی کھا آتے ہیں ــــــ اپنی عورتوں کو ان کی عورتوں کے سے لباس اور زیور پہنانے شروع کر دیئے ہیں۔ باوجودیکہ یہ جاٹ اور گوجر خود بھی اپنے ساتھ راجپوتوں کے ایسے ہی سلوک کی تلخی محسوس کرتے ہیں، مگر پھر بھی انہوں نے اس بات کو اپنی توہین قرار دیا کہ چمار اُٹھ کر معاشرت میں اُن کے ہم سر بنیں۔ چنانچہ مجموعی طور پر ان کی برادری نے زور لگانا شروع کیا کہ ان غریبوں کو زبردستی اُسی پستی میں پھینک دیں جس سے وہ اٹھنا چاہتے ہیں۔

معاشی نظام بڑی حد تک اسی سماجی نظام کی ترتیب پر قائم ہے اور اس کے قدیم ظالمانہ پہلوؤں پر جدید سرمایہ داری کی خصوصیات کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ جو طبقے قدیم اجتماعی نظریات اور مابعد الطبیعی فلسفوں (Metaphysical Philosophies) کی مدد سے اوپر کی سیڑھیوں پر متمکن ہو چکے ہیں، انہوں نے صرف اِتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ ملک کی تمدنی زندگی میں برتری کو اپنے لیے مخصوص کر لیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہی ملک کی دولت اور اس کے وسائل و ذرائع پر بھی قابض ہو گئے ہیں اور نیچے کی سیڑھیوں پر رہنے والی عام آبادی کے لیے انہوں نے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں چھوڑی ہے کہ وہ ذلت کے ساتھ ان کی خدمت اور مزدوری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کریں۔ اس معاشی نظام میں محروم اور محنت پیشہ طبقوں کے ساتھ جو بے انصافیاں اور زیادتیاں پائی جاتی ہیں ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ پھر اونچے طبقوں نے خود اپنے دائرے میں بھی ظلم و ناانصافی کی بہت سی شکلیں اختیار کر رکھی ہیں جن کی بنا پر کم لوگ خوشحال اور زیادہ لوگ بدحال ہیں۔ ان کی سُود خواری، ان کا مشترک خاندانی جائیداد کا طریقہ (Joint Family System)، ان کا توریثِ اولادِ اکبر کا قانون (Rule of Primogeniture) اور اسی طرح کے اور بہت سے طریقے ایسے ہیں جو دولت اور اس کے ذرائع کو سمیٹ کر چند لوگوں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں اور بہت سوں کو محروم اور دست نگر بنا دیتے ہیں۔ انہی طریقوں سے جن ہاتھوں میں دولت سمٹی ہے وہ اب جدید سرمایہ داری کے ڈھنگ اختیار کر کے ملک کی صنعت، تجارت اور مالیات پر مسلط ہو رہے ہیں اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اب جو سیاسی نظام بنایا جا رہا ہے اس کی تصنیف میں کاغذ پر تو بلاشبہ جمہوریت، اجتماعی انصاف (Social Justice) مساوات اور مواقع کی یکسانی (Equality of Opportunities) کے بڑے بڑے نفیس تصورات بہت ستھری اور دلکش زبان میں رقم کیے جا رہے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان الفاظ کی اصل قیمت ان کے تلفظ میں نہیں، ان پر واقعی عمل درآمد میں ہے۔ عملاً جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اس سیاسی نظام کی تشکیل، تعمیر اور تنفیذ کے سارے کام پر وہی طبقے حاوی ہیں جو سماجی اور معاشی نظام کی اُوپر والی سیڑھیوں پر تشریف فرما ہیں ـــــ نہیں، بلکہ پیدا ہوتے ہیں ـــــ اور تجربہ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ ان طبقوں کو خدا نے سب کچھ دیا ہے مگر بڑا دل، وسیع ظرف اور فراخ حوصلہ نہیں دیا۔ ان کی تنگ دلی اب تک بھی ہندوستان کو بہت کچھ نقصان پہنچا چکی ہے اور آئندہ بھی اسے دیکھتے ہوئے مشکل سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ لوگ اپنی سیاسی طاقت کو واقعی انصاف قائم کرنے میں استعمال کریں گے۔

یہ حالات اپنے اندر اتنی تلخیاں رکھتے ہیں جنہیں ملک کی عام آبادی شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ اب تک قوم پرستی کے نشے نے اس احساس کو بڑی حد تک دبائے رکھا تھا، اور لوگ اس امید پر جی رہے تھے کہ ملک کا انتظام جب ہمارے ہاتھ میں آجائیگا

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تو یہ بے انصافیاں ختم ہو جائیں گی۔ اب انتظام کے اختیارات جب فی الواقع اہلِ ملک کی طرف منتقل ہو جائیں گے تو یہ سوال زیادہ دیر تک نہ ٹل سکے گا کہ اِن اختیارات کو آئندہ کس طرح استعمال کیا جائے جس سے ملک میں حقیقی انصاف قائم ہو۔ ہندوستان کے مستقبل کی باگیں اس وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں وہ ہندو کلچر کی سابق روایات کے ساتھ مغربی یورپ اور امریکہ کے طریقِ زندگی اور کچھ سوشلزم کا جوڑ لگاتے نظر آتے ہیں۔ یہ میرا اندازہ اگر صحیح ہے تو اس طرح سے وہ ایک نمائشی جمہوریت، ایک ظاہری مساوات اور ایک نظر فریب عدل قائم کرنے میں تو ضرور کامیاب ہو جائیں گے، مگر اس کی تہہ میں بدستور وہی بے انصافیاں، وہی ناہمواریاں اور وہی تفریقیں برقرار رہیں گی جو اِس وقت پائی جاتی ہیں، کیونکہ تفریق و امتیاز ہندو کلچر کی رگ رگ میں پیوست ہے جس کے ہوتے کسی حقیقی جمہوریت کا قیام غیر ممکن ہے، اور اس کے ساتھ مغربی نظریات کا جوڑ لگنے سے اِس کے سوا کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی کہ اونچے طبقوں کی برتری و سرمایہ داری کو الیکشنوں اور ووٹوں کے ذریعہ سے سندِ جواز مِل جائے۔ اسی لیے یہ امر قریب یقینی نظر آتا ہے کہ یہ لوگ بہت جلدی ہندوستان کی عام آبادی کو مایوس کر دیں گے۔ ان کے ہاتھوں انصاف قائم نہ ہو سکے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزرنے پائے گی کہ ہندوستانی عوام، کسان، مزدور، اور خود اونچے طبقہ کے محروم لوگ کسی دوسرے منصفانہ نظام کی طلب میں بے چین ہونے لگیں گے۔

اشتراکی گروہ اِسی صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ جونہی کہ موجودہ قوم پرستی اپنے مدعا کو پہنچنے کے بعد مضمحل ہوئی، وہ اِسی طبقاتی خلل اور اِسی تصادمِ اغراض کے شگافوں میں سے اپنا راستہ نکالنے کی کوشش کرے گا اور عام باشندوں کو انصاف کی امیدیں دلا کر سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہے گا۔ مگر اِس گروہ کے پاس اِن بے انصافیوں کو ختم کرنے کے لیے کوئی ایسا پروگرام نہیں ہے جو خود ظلم سے، بے انصافی سے، کشت و خون اور فساد سے اور بالآخر جباری و قہاری سے پاک ہو۔ وہ ہندوستان کو موجودہ فرقہ وارانہ منافرت اور نزاع کی جگہ طبقہ وارانہ منافرت اور نزاع کا تحفہ دے گا۔ اب تک جہاں ہندو اور مسلمان کے جھگڑے کی بنا پر لوگ ایک دوسرے کے سر پھاڑتے اور گھر جلاتے رہے ہیں وہاں اب

روٹی کے جھگڑے کی بنا پر وہی لوگ کشت و خون کرنے لگیں گے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف اسی طرح نفرت اور غصے سے بھڑک اُٹھے گا جس طرح آج ایک فرقہ دوسرے فرقے کیخلاف بھڑکا ہوا ہے۔ فرقہ پرستی اور قوم پرستی کی جگہ طبقاتی مفاد کی پرستاری لے لے گی اور انصاف کے حقیقی جذبہ سے دل جس طرح آج قومی جنگ کے زمانے میں خالی ہیں اسی طرح اُس وقت طبقاتی جنگ کے زمانہ میں بھی خالی ہوں گے۔ برسرِ اقتدار طبقے محروم طبقوں کو محروم رکھنے کے لیے لڑیں گے، اور محروم طبقے ان کی جگہ لے کر اُلٹا انہیں محروم کر دینے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں گے۔ اس طرح ہندوستان ایک مدت تک امن کی صورت کو ترستا رہے گا، اور آخر کار اگر خدانخواستہ اشتراکی انقلاب کامیاب ہو گیا تو مزید ایک طویل مدت تک یہاں روس کی طرح اُونچے طبقوں کو ان کی زمینوں، جائدادوں اور کارخانوں سے بے دخل کرنے کے لیے سخت کشت و خون اور ظلم و جور کا بازار گرم رہے گا۔ پھر اشتراکی نظام قائم ہو جانے کے بعد ویسی ہی ڈکٹیٹر شپ یہاں بھی قائم ہو گی جیسی روس میں ہے۔ اسی طرح ملک کی پوری آبادی کو ایک جابرانہ اور ہمہ گیر (Totalitarian) اقتدار کے شکنجے میں کس دیا جاتے گا، اسی طرح لوگ زبان اور قلم اور خیال کی آزادی سے محروم ہو جائیں گے، اُسی طرح تمام لوگوں کا رزق چند لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتے گا، اور اسی طرح بندگانِ خدا کو اتنی آزادی بھی حاصل نہ رہے گی کہ اس نظام کی سختیوں سے دل برداشتہ ہوں تو کچھ چیخ پکار کر لیں، یا اس حالت کو بدلنے کے لیے کوئی سیاسی تنظیم اور اجتماعی کوشش کر سکیں ——— اور ان سب سے بڑھ کر اس اشتراکی انقلاب سے جو نقصان ہندوستان کو پہنچے گا وہ یہ ہے کہ پچھلی صدیوں کے انحطاط کے باوجود جو تھوڑی بہت روحانی اور اخلاقی قدریں ہندوستان کی تہذیب میں باقی ہیں وہ بھی ختم ہو جائیں گی اور یہ ملک سراسر ایک مادہ پرست ملک بن کر رہ جائیگا۔

اس انجام سے اگر کوئی چیز ہندوستان کو بچا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ کوئی گروہ ایک ایسے نظامِ فکر و عمل کو لے کر اُٹھے جس میں اعلیٰ درجہ کی اور حقیقی روحانی و اخلاقی قدریں بھی ہوں، سچائی اور بے لاگ اجتماعی انصاف بھی ہو، اصلی جمہوریت ——— محض سیاسی ہی نہیں بلکہ تمدنی و معاشرتی جمہوریت (Social Democracy) ——— بھی ہو، اور تمام

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باشندگان ملک کے لیے بلا امتیاز طبقہ ونسل انفرادی و اجتماعی حیثیت سے ترقی کے یکساں مواقع بھی ہوں۔ جو ایک یا چند طبقوں کے مفاد کو نہیں بلکہ سب انسانوں کے مفاد کو یکساں ہمدردی اور انصاف کی نظر سے دیکھے، کسی کا حمایتی اور کسی کا دشمن نہ ہو، طبقوں اور گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف اکسانے اور لڑانے کے بجائے ایک مبنی بر انصاف نظامِ زندگی پر انہیں متحد کرے، محروم طبقوں کو وہی کچھ دلائے جو ان کا فطری حق ہے اور اونچے طبقوں سے صرف وہی کچھ لے جو ان کے پاس ان کے فطری حقوق سے زائد ہے۔ ایسے ایک نظام کو اگر ملک کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کو پیش کرنے والے وہ لوگ ہوں جن کی سیرت اور اخلاق پر اعتماد کیا جاسکے، جو خود کسی قسم کی قومی یا طبقاتی یا ذاتی خود غرضی میں مبتلا نہ ہوں، جن کی اپنی زندگیاں اس بات پر گواہ ہوں کہ درحقیقت انہی سے انصاف کی اُمید وابستہ کی جاسکتی ہے، اور جن میں دیانت اور انتظامِ دنیا کی صلاحیت دونوں جمع ہوں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندے اِس نظام کے مقابلہ میں اشتراکی انقلاب کے راستے کو ترجیح دیں۔ اشتراکی انقلاب تو ایک آپریشن ہے جو مرض کے ساتھ تندرستی کے بھی ایک بڑے حصے کا استیصال کر دیتا ہے، اور انسان اسے صرف ایسی مجبوری کی حالت ہی میں گوارا کیا کرتا ہے جب دوا سے مرض کی اصلاح ہونے کی کوئی اُمید باقی نہ رہے۔ دنیا میں جہاں بھی کسی ملک کے لوگوں نے اس آپریشن کے طریقے کو اختیار کیا ہے اسی وجہ سے کیا ہے کہ ان کے سامنے ظالمانہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان کوئی ایسا تیسرا راستہ تھا ہی نہیں جس میں وہ اِن دونوں کی خرابیوں سے بچ کر انصاف پالینے کی اُمید کر سکتے۔ اگر اس قسم کا تیسرا راستہ پیش کر دیا جائے ——— جیسا کہ پیش کرنے کا حق ہے ——— تو نہ ہندوستان کے لوگ ایسے پاگل ہیں اور نہ دُنیا کے دوسرے ملکوں کی آبادی ہی کو اس قدر دیوانہ فرض کرنے کی کوئی وجہ ہے کہ وہ ایک کارگر دوا کو آزمانے کے بجائے خواہ مخواہ آپریشن ہی پر اصرار کریں۔

سوال یہ ہے کہ آیا مسلمان یہ تیسرا راستہ پیش کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر پیش کر سکتے ہیں اور اس تیسرے راستے کا نام اسلام ہی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مستقبل کے ہندوستان میں اشتراکیت کے بالمقابل اسلام کے لیے کامیابی کے کم از کم ۹۰ فی صدی امکانات

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں یہ مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی اور سخت نالائقی ہوگی کہ ان کے پاس اسلام جیسا ایک کامل اور صحیح نظام موجود ہو اور پھر وہ اسے لے کر اٹھنے کے بجائے پورا میدان اشتراکیت کے لیے خالی چھوڑ دیں۔

اب میں آپ کو مختصر طور پر یہ بتاؤں گا کہ ہندوستان میں اسلامی انقلاب کا راستہ ہموار کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔

(۱) سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اُس قومی کشمکش کا خاتمہ کیا جائے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اب تک برپا رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ بات پہلے بھی غلط تھی کہ مسلمان اسلام کے لیے کام کرنے کے بجائے اپنی قومی اغراض اور مطالبوں کے لیے لڑتے رہے۔ مگر اب تو اس لڑائی کو جاری رکھنا محض غلطی نہیں بلکہ مہلک غلطی اور احمقانہ خودکشی ہے۔ اب یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمان اپنے طرزِ عمل کو بالکل بدل دیں۔ یہ اسمبلیوں میں نمائندگی کے تناسب کا سوال، یہ انتخابات کی دوڑ دھوپ، یہ ملازمتوں کے لیے کشمکش، اور یہ دوسرے قومی حقوق اور مطالبوں کے لیے چیخ پکار آئندہ دور میں لاحاصل ہوگی اور نقصان دہ بھی۔ لاحاصل اس لیے کہ اب جن لوگوں کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت آرہی ہے وہ مخلوط انتخابات اور ملازمتوں میں صرف "قابلیت" کے لحاظ کا اصول مقرر کر کے مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی ہستی کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر چکے ہیں اور ان کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کسی طرح نہیں روکا جا سکتا۔ نقصان دہ اس لیے کہ ان "حقوق" کے استقرار کی جتنی کوشش بھی مسلمان کریں گے وہ ہندوؤں کے قومی تعصب کو اور زیادہ مشتعل کرے گی، اور اگر وہ اپنی شکایات کو رفع کرانے کے لیے پاکستان کی مدد حاصل کرنا چاہیں گے تو یہ بین الاقوامی پیچیدگی اور کشمکش کا سبب بن جائے گا جس سے ہندو قوم پرستی کو زندگی کی مزید طاقت مل جائے گی۔ لہٰذا اب ہمیں وسیع پیمانے پر مسلمانوں میں ایسی رائے عام تیار کرنی چاہیے کہ وہ بحیثیت ایک قوم کے حکومت اور اس کے نظام سے بے رُخی اختیار کر لیں اور ہندو قوم پرستی کو اپنے طرزِ عمل سے یہ اطمینان دلادیں کہ میدان میں کوئی دوسری سیاسی قومیت اس کے ساتھ کشمکش کرنے کے لیے موجود نہیں ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے اس غیر معمولی تعصب کو ختم کر دینے کا جو اس وقت غیر مسلم اکثریت کے اندر اسلام کے خلاف

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

پیدا ہو گیا ہے، اور اسی طریقے سے غیر مسلموں کے اِس اندیشے کو بھی دُور کیا جاسکتا ہے کہ اگر اسلام کو مزید اشاعت کا موقع دیا گیا تو کہیں پھر کسی علاقے کے مسلمان ایک اور پاکستان مانگنے کے لیے کھڑے نہ ہو جائیں۔

(۲) دُوسرا اہم کام ہمارے لیے یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر اسلام کا علم پھیلائیں، ان میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عام جذبہ پیدا کر دیں، اور ان کی اخلاقی و تمدنی اور معاشرتی زندگی کی اس حد تک اصلاح کر لیں کہ ان کے ہمسایہ غیر مسلموں کو خود اپنی سوسائٹی کی بہ نسبت ان کی سوسائٹی صریحاً بہتر محسوس ہونے لگے اور ان میں سے جو لوگ بھی اس سوسائٹی میں شامل ہونے کے لیے آمادہ ہوں، خواہ وہ کسی طبقے کے ہوں، ان کو بالکل مساویانہ حیثیت سے اپنے اندر لیا جاسکے۔ یہ کام برسوں کی انتھک اور لگاتار محنت چاہتا ہے، مگر جب تک ہم مسلم سوسائٹی کے ایک بڑے حصّہ کو علمی و عملی اور تمدنی و معاشرتی حیثیت سے اسلام کا صحیح نمائندہ نہ بنالیں ہمارا یہ اُمید کرنا محض ایک بوالفضولی ہے کہ ہندوستان کی عام غیر مسلم آبادی کی رائے کو اسلام کے حق میں ہموار کیا جاسکے گا۔ غیر مسلموں کے سامنے آپ کاغذ پر یا تقریر میں اسلام کو کیسے ہی دلپذیر انداز سے پیش کریں، بہر حال وہ ان کو اپیل نہیں کرسکتا کیونکہ اسلام کے نمائندوں کا جو تجربہ انہیں رات دن کی زندگی میں ہو رہا ہے وہ آپ کے بیان کی تصدیق نہیں کرتا۔ پھر اگر ان میں کوئی ایسا حق پسند نکل بھی آئے کہ مسلمانوں کے بجائے اسلام کو دیکھ کر اسے قبول کر لے، تو موجودہ مسلم سوسائٹی میں اس کا کھپنا مشکل ہوتا ہے اس لیے کہ یہاں ابھی تک قدیم ہندوانہ جاہلیت کے موروثی تعصبات، اُونچ نیچ کے امتیازات، ذات برادری کے تفرقے، اسلام میں آجانے کے باوجود جوں کے توں محفوظ ہیں اور اس بنا پر ایک نومسلم کو پھر اُنہی معاشرتی خرابیوں سے سابقہ پیش آتا ہے جنہیں چھوڑ کر وہ ہندو سوسائٹی سے نکلا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کی ـــــــ اگر سب کی نہیں تو کم از کم ان کے ایک معتدبہ حصّہ کی ـــــــ اخلاقی، تمدنی، اور معاشرتی زندگی کی اصلاح کے بغیر دعوتِ اسلامی کا قدم آگے نہیں بڑھ سکتا اور یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم محض نومسلموں کی ایک الگ سوسائٹی بناسکیں۔ اس اصلاح میں اگر ہم کسی حد تک بھی کامیاب ہو جائیں اور

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں اسلام سے عام واقفیت بھی پیدا کر دیں اور ان کے اندر یہ جذبہ بھی اُبھار دیں کہ رات دن کی زندگی میں ان کو ہر جگہ غیر مسلموں سے جو سابقہ پیش آتا ہے اس میں وہ حسب موقع ان کے سامنے اسلام کو پیش کرتے رہیں، تو دعوت کی رفتار اتنی تیز ہو سکتی ہے کہ ہندوستان میں کوئی دوسری تحریک اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد چار پانچ کروڑ کے قریب ہے۔ اس تعداد کا بیسواں حصّہ بھی اگر اسلام کو جانتا ہو اور اس کی تبلیغ شروع کر دے، تو اسلام کے مبلغوں کی تعداد ۲۰، ۲۵ لاکھ کے لگ بھگ ہو گی۔ کیا کوئی دوسری تحریک ایسی موجود ہے جس کے پاس اتنے مبلغ ہوں؟ پھر مسلمان ہندوستان کی آبادی میں کھچڑی کی طرح غیر مسلموں کے ساتھ ملے جُلے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں ہر جگہ ہر وقت انہیں دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانے اور اپنے برتاؤ کا اثر ڈالنے کا موقع ملتا ہے۔ کیا کسی دوسری تحریک کو یہ مواقع حاصل ہیں؟ پھر دوسری کسی تحریک کی اپنی کوئی مستقل سوسائٹی اور اپنا کوئی تمدنی نظام نہیں ہے۔ ان کے دامن میں پناہ لے کر ہندوستان کے بسنے والے اور دبے ہوئے طبقے کچھ اپنے پیٹ کے مطالبے تو پورے کر سکتے ہیں مگر اپنی معاشرتی زندگی کی مشکلات اور خرابیاں رفع نہیں کر سکتے۔ بخلاف اس کے مسلمان اپنی ایک مستقل سوسائٹی رکھتے ہیں جو اگر ہمارے نصب العین کے مطابق کچھ بھی اصلاح یافتہ ہو جائے تو تمام اُن لوگوں کے لیے پوری پناہ گاہ بن سکتی ہے جنہیں معاشرتی زندگی میں پست بنا کر رکھ دیا گیا ہے، یا جن کو جاہلی نظام تمدن و معاشرت کی دوسری خرابیوں نے پریشان کر دیا ہے۔

(۳) تیسرا ضروری کام یہ ہے کہ ہم اس ملک کے مسلمانوں کی ذہنی طاقت کا زیادہ سے زیادہ حصّہ اپنی اِس دعوت کے لیے فراہم کر دیں اور اس سے باقاعدگی کے ساتھ کام لیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اپنے اُن مقاصد میں ناکام ہو چکا ہے جن پر اس نے اب تک نظر جما رکھی تھی۔ اس ناکامی کا شعور حاصل ہوتے ہی اس پر یاس طاری ہونی شروع ہو جاتی ہے گی۔ اس موقع پر اگر ان کے سامنے ایک روشن نصب العین امیدوں اور بشارتوں کے ساتھ آئے تو وہ ان کے ایک بڑے حصّے کی توجہات اپنی طرف کھینچ لے گا۔ اس طرح جیسے جیسے ہماری

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دعوت کو یہ طاقت حاصل ہوتی جائے ہم چاہتے ہیں کہ اُسے ان نتیجہ خیز کاموں پر لگایا جاتا ہے جو اسلامی انقلاب کو قریب تر لا سکیں۔ مثلاً ہم مسلمانوں کی اخبار نویسی کے موجودہ رجحانات کو بالکل بدل دینا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ بہتر قسم کے اہلِ قلم اب انگریزی، اُردو اور دوسری زبانوں میں اخبارات جاری کریں اور ان میں حقوق کی چیخ پکار، ملازمتوں کے فی صدی تناسب پر شور و غل اور حکموں میں ہندوگردی پر واویلا کرنے کے بجائے رائج الوقت نظام پر اصولی تنقید کریں، اس کی خامیوں کا ایک ایک پہلو نمایاں کر کے پبلک کو دکھائیں اور اس سے بہتر ایک نظامِ زندگی پیش کر کے رائے عام کو اس کے حق میں ہموار کریں۔ اسی طرح ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نوجوان ادیب ارباب نشاط کا پیشہ چھوڑ کر اپنی ادبی قابلیتوں کو ایک اعلیٰ درجہ کا تعمیری ادب پیدا کرنے میں صرف کریں جو انسانیت کے شعور کو بیدار کرے، اور ذہنوں میں ایک صالح نظام کے لیے تڑپ پیدا کر دے۔ پھر جن لوگوں کو خدا نے زیادہ بلند درجہ کی دماغی صلاحیتیں دی ہیں ان کو ہم دنیا کی ذہنی امامت کا راستہ دکھانا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن کی مشعل ہاتھ میں لے کر علم کے ہر گوشے اور مسائل حیات کے ہر پہلو کا جائزہ لیں اور تحقیق و کاوش کے ساتھ اسلامی نظامِ زندگی کی پوری تصویر دنیا کے سامنے پیش کر دیں جس سے دیکھ کر لوگ بآسانی یہ معلوم کر سکیں کہ اگر دنیا کا انتظام اس نظام کے مطابق ہو تو اس کی تفصیلی صورت کیا ہوگی۔ ان سب کے علاوہ اسی اہلِ دماغ طبقہ میں سے وہ لوگ بھی نکل سکتے ہیں جو لیڈرشپ کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ اسلامی دعوت کو ایک عمومی تحریک بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں کو اس کی رہنمائی کا منصب سنبھالنے کے لیے تیار کیا جائے۔

(۴) چوتھا ضروری کام یہ ہے کہ ہمارے سب کارکن اور وہ تمام لوگ جو آئندہ ہماری تحریک سے متاثر ہوں، ہندوستان کی اُن مقامی زبانوں کو سیکھیں اور ان میں تحریر و تقریر کی قابلیت بہم پہنچائیں جو آئندہ تعلیم اور لٹریچر کی زبانیں بننے والی ہیں۔ نیز اس امر کی انتہائی کوشش کریں کہ ان زبانوں میں جلدی سے جلدی اسلام کا ضروری لٹریچر منتقل کر دیا جائے۔ جنوبی ہند میں تامل، تلنگی، کنٹری، ملایالم اور مرہٹی، مغربی ہند میں گجراتی، مشرقی ہند میں بنگلہ اور باقی ہندوستان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

میں ہندی اب تعلیم کی زبانیں ہوں گی۔ یہی اپنے اپنے علاقوں میں دفتری اور سرکاری زبانیں بھی ہوں گی اور انہی میں ملک کا لٹریچر شائع ہو گا۔ اگر مسلمان اپنی قومی عصبیت کی بنا پر صرف اردو تک اپنی تحریر و تقریر کو محدود رکھیں گے تو ملک کی عام آبادی سے بے گانہ ہو کر رہ جائیں گے اور ان کے پاس اپنے کروڑوں ہمسایوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کوئی ذریعہ نہ رہے گا۔ بلاشبہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اردو زبان نہ صرف باقی رہے بلکہ فروغ پائے کیونکہ ہمارا اب تک کا سارا سرمایۂ علم و تہذیب اسی زبان میں ہے۔ لیکن ہم اسلام کے مستقبل کو اُردو زبان کے دامن سے باندھ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر اردو زبان ملک کی عام زبان نہیں بن سکتی، اور آثار یہی بتا رہے ہیں کہ اس کو یہ حیثیت حاصل نہ ہو گی، تو پھر جن جن زبانوں کو ملک میں رواج حاصل ہو گا، ہم ان سب میں اسلام کا لٹریچر مہیا کریں گے اور ان سب کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے استعمال کریں گے۔ ایسا کرنا محض غیر مسلموں ہی کی خاطر نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو بھی مسلمان رکھنے کی خاطر ضروری ہے، کیونکہ آگے چل کر مسلمان بچے درسگاہوں میں تعلیمی زبان اور درس گاہوں سے باہر سرکاری اور ملکی زبان سے اس قدر متاثر ہوں گے کہ اُردو سے ان کا تعلق برائے نام رہ جائے گا، اور اگر ان زبانوں میں کافی اسلامی لٹریچر نہ ملا تو وہ بالکل اکثریت کے رنگ میں رنگتے چلے جائیں گے۔

یہ چار کام ایسے ہیں جن پر ہندوستان میں اسلام کا اور خود آپ کا مستقبل منحصر ہے اس لیے آپ کو اپنے تمام ذرائع اور اپنی پوری قوتِ کار اور اپنی ساری فکر ان پر مرکوز کر دینی چاہیے، کیونکہ اس ابتدائی پروگرام کو بڑی حد تک عمل میں لائے بغیر آگے کا کوئی پروگرام آپ نہیں بنا سکتے۔ اب وہ وقت ہے کہ ایک لمحہ بھی اگر آپ تساہل میں ضائع کریں گے تو جرم کریں گے۔ جس طوفان کی میں دس سال سے خبر دیتا رہا ہوں وہ امنڈ آیا ہے۔ اب اگر آپ نے اس کے تدارک کی فکر نہ کی تو یہ سب مسلمانوں کے ساتھ آپ کو بھی لے ڈوبے گا۔ جو حالات اب اس ملک میں پیش آنے والے ہیں وہ آپ کے صبر کا، آپ کے عزم کا، آپ کے استقلال کا، آپ کی حکمت و دانائی کا، اور آپ کی عملی طاقت کا سخت امتحان لیں گے۔ آپ کے ایک طرف دجال کی جنت ہو گی جس میں داخل ہونے اور مدارجِ عالیہ پر چڑھنے کے لیے شرطِ لازم یہ ہو گی کہ تیز سے تیز قوتِ شامہ رکھنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

والے کو بھی آدمی کے اندر اسلامیت اور اسلامی غیرت کی ذرا سی بُو تک محسوس نہ ہو سکے، اور آپ دیکھیں گے کہ آپ کے گرد و پیش بہت سے مسلمان اپنی دنیوی نجات کی خاطر اس شرط کو پُورا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ آپ کے دوسری جانب، بتھوڑے اور ڈانتی کا جھنڈا بلند ہو گا اور اس کے سایہ میں ایک دوسری جنت شدّاد کا خیالی نقشہ پیش کیا جاتے گا جس کے عاشقوں کو قسم دی جاتے گی کہ خدا پرستی اور دیانت و اخلاق سے اپنے دلوں کو خالی کر لیں۔ آپ کی آنکھیں یہ بھی دیکھیں گی کہ دنیا کے بھُوکے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا ایک جم غفیر اس کی طرف دوڑ رہا ہو گا۔ ان دو جھُوٹی جنتوں کے درمیان آپ اپنے آپ کو ایسے مقام پر کھڑا پائیں گے جہاں اسلام پر چلنے والوں اور اس کے لیے کام کرنے والوں کو ترقی و خوشحالی تو درکنار زندہ رہنے کا سامان بھی مشکل ہی سے میسّر آئے گا۔ ان کو ہر قدم پر ہمت شکن حالات سے سابقہ پیش آئے گا۔ ان کی غیرت اسلامی اور عزّتِ نفس کو ہر وقت چرکے لگیں گے۔ شعائرِ اسلامی کو وہ نہ صرف مٹتے دیکھیں گے بلکہ ان کی علانیہ اہانت ہو گی اور بعید نہیں کہ مسلمانوں کے اپنے ہاتھوں ہو۔ ان حالات میں صرف وہی لوگ اسلامی انقلاب کے لیے کام کر سکیں گے جو غیر معمولی صبر و ثبات، انتہائی سرگرمی، اور غایت درجہ کی حکمت و دانشمندی سے بہرہ ور ہوں۔ یہ تین خصوصیات اگر آپ اپنے اندر پیدا کر لیں گے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انشاءاللہ اس طوفان کا رُخ پھیر دینے میں بہت زیادہ دیر نہ لگے گی۔

(ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۴۷ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں جماعت اسلامی کا مسلک

سوال: "جیسا کہ آپ کو معلوم ہے صوبہ سرحد میں اس سوال پر ریفرنڈم ہو رہا ہے کہ اس صوبہ کے لوگ تقسیم ہند کے بعد اپنے صوبے کو ہندوستان کے ساتھ شامل کرانا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ؟ وہ لوگ جو جماعت اسلامی پر اعتماد رکھتے ہیں ہم سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کو اس استصواب میں رائے دینی چاہیئے؟ اور کس طرف سے رائے دینی چاہیئے؟ کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس استصواب میں بھی ہماری پالیسی اسی طرح غیر جانب دارانہ ہونی چاہیئے جیسی مجالس قانون ساز کے سابق انتخابات میں رہی ہے، ورنہ ہم پاکستان کے حق میں اگر ووٹ دیں گے تو یہ ووٹ آپ سے آپ اُس نظام حکومت کے حق میں بھی شمار ہو گا جس پر پاکستان قائم ہو رہا ہے۔"

جواب: استصواب رائے کا معاملہ مجالسِ قانون ساز کے انتخابات کے معاملے سے اصولاً مختلف ہے۔ استصواب رائے صرف اِس امر سے متعلق ہے کہ تم کس ملک سے وابستہ رہنا چاہتے ہو، ہندوستان سے یا پاکستان سے؟ اس معاملے میں رائے دینا بالکل جائز ہے اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ لہٰذا جن جن علاقوں میں استصواب رائے کیا جا رہا ہے وہاں کے ارکان جماعت اسلامی کو اجازت ہے کہ اس میں رائے دیں۔

رہا یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں رائے دیں تو اس معاملے میں جماعت کی طرف سے کوئی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پابندی عائد نہیں کی جاسکتی، کیونکہ جماعت اپنے ارکان کو صرف اُن امور میں پابند کرتی ہے جو تحریک اسلامی کے اصول اور مقصد سے تعلق رکھتے ہیں، اور یہ معاملہ نہ اصولی ہے نہ مقصدی۔ اس لیے ارکانِ جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جو رائے چاہیں دیدیں۔ البتہ شخصی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں خود صوبہ سرحد کا رہنے والا ہوتا تو استصواب رائے میں میرا ووٹ پاکستان کے حق میں پڑتا۔ اس لیے کہ جب ہندوستان کی تقسیم ہندو اور مسلم قومیت کی بنیاد پر ہو رہی ہے تو لامحالہ ہر اُس علاقے کو جہاں مسلمان قوم کی اکثریت ہو اِس تقسیم میں مسلم قومیت ہی کے علاقے کے ساتھ شامل ہونا چاہیئے۔

پاکستان کے حق میں ووٹ دینا لازماً اُس نظام حکومت کے حق میں ووٹ دینے کا ہم معنی نہیں ہے جو آئندہ یہاں قائم ہونے والا ہے۔ وہ نظام اگر فی الواقع اسلامی ہوا جیسا کہ وعدہ کیا جاتا رہا ہے تو ہم دل و جان سے اس کے حامی ہوں گے۔ اور اگر وہ غیر اسلامی نظام ہوا تو ہم اُسے تبدیل کر کے اِسلامی اصولوں پر ڈھالنے کی جدوجہد اُسی طرح کرتے رہیں گے جس طرح موجودہ نظام میں کر رہے ہیں۔[1]

(سہ روزہ کوثر مورخہ ۵ر جولائی ۱۹۴۷ء)

---

[1] واضح رہے کہ ہٹ کے لیڈر ٹرم کے بارے میں کوئی سوال ہمارے پاس اس لیے نہیں آیا کہ اس وقت تک مشرقی بنگال اور آسام میں جماعت اسلامی کا کام شروع ہی نہیں ہوا تھا۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تقسیمِ ہند کے حالات پر تبصرہ

پچھلے سال ہماری آنکھوں نے جو ہولناک انقلاب دیکھا ہے اس نے تمام اُن انقلابات کو مات کر دیا ہے جو اس سے پہلے نہ صرف ہمارے اِس ملک[1] میں بلکہ دنیا کے کسی ملک میں پیش آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ انسانی جانوں کا اِتلاف اِس سے پہلے کہیں اِس سے بھی زیادہ وسیع رقبوں میں ہوا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اِس سے پہلے کبھی اِس سے زیادہ بڑی آبادیوں کو اُن کے آبائی وطنوں سے اُکھاڑ پھینکا گیا ہو۔ مگر شاید اِس سے پہلے کبھی اور کہیں انسان نے انسان کے ساتھ اِتنے بڑے پیمانہ پر ایسی سنگ دلانہ درندگی اور ایسی بے شرمانہ بہیمیت کا برتاؤ نہیں کیا ہے۔ قوموں میں دشمنیاں بھی ہوئی ہیں، ملکوں میں خانہ جنگیاں بھی ہو چکی ہیں، لیکن غالباً کبھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان عداوت نے یہ شدت، یہ تلخی اور یہ تُندی اختیار نہیں کی ہے۔ انسان انسان سے بارہا لڑا ہے، مگر لڑائی میں کمینہ پن اور بدمعاشی کا جو مظاہرہ یہاں ہوا ہے، یہ اپنی نظیر بس آپ ہی ہے۔ یہاں انسان صورت جانوروں نے وہ وہ کام کیے ہیں کہ اگر کُتوں اور بھیڑیوں پر ان کا الزام تھوپ دیا جائے تو وہ بھی اسے اپنی توہین محسوس کریں۔ اور یہ کرتوت چند گنے چُنے بدمعاشوں کے نہیں تھے بلکہ پوری پوری قوموں نے اپنے آپ کو بدمعاش ثابت کیا۔

---

[1] اس جگہ ملک سے مراد وہ ہندوستان ہے جو تقسیم کے وقت تک ایک ملک تھا۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

باقاعدہ حکومتیں بدمعاش بن گئیں، بڑے بڑے لیڈروں اور رئیسوں اور وزیروں نے بدمعاشی کی اسکیم سوچی اور حکومتوں کے پورے نظم و نسق نے اپنے مجسٹریٹوں اور اپنی پولیس اور اپنی فوج کے ذریعہ سے اِس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا۔ دو سال پہلے تک ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں اس کی آبادی کا اخلاقی زوال اِس انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ نفیس لباسوں، اعلیٰ ڈگریوں اور بڑے ناموں کے پردے میں جو شخصیتیں چھپی ہوئی تھیں ان کو ہم شرفا میں شمار کرتے تھے۔ عام آبادی کے پُرامن رویے کو دیکھ کر ہم سمجھتے تھے کہ یہ بھلے انسانوں کی بستیاں ہیں۔ مگر افسوس کہ واقعات نے اس سارے حُسنِ ظن کا پردہ چاک کر دیا۔ معلوم ہوا کہ پہلے جو کچھ ہم دیکھ رہے تھے وہ محض انگریز کی سنگین کا کرشمہ تھا۔ اس سنگین کے ہٹتے ہی یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ ملک لاکھوں، کروڑوں ڈاکوؤں، لٹیروں، قاتلوں، زانیوں اور سخت کمینہ صفت ظالموں سے بھرا ہوا تھا۔

کیا یہ سب کچھ جو واقع ہوا محض ایک اتفاقی حادثہ تھا؟ جو لوگ پچھلے تیس سال سے اِس ملک کی رہنمائی کرتے رہے ہیں، اور جن کی قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوا ہے، وہ ایسا ہی کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس فسادِ عظیم کے اسباب کی بحث کو باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی ایک شاعرانہ توجیہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ کشت و خون اور ظلم و ستم کا یہ مظاہرہ کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس پر کچھ فکرمند ہونے کی ضرورت ہو، یہ تو ایک آزاد قوم کی ولادت کے درد ہیں جو ایسے موقع پر ہوا ہی کرتے ہیں[1]۔ حالانکہ اگر یہ ولادت کے درد ہی تھے تو یہ دنیا کو ایک درندے کی پیدائش کی خوشخبری دے رہے تھے نہ کہ کسی انسان کے تولد کی۔ انہوں نے دنیا کو جو اطلاع دی وہ اس بات کی نہ تھی کہ کچھ انسان ہیں جن کا بندِ اسیری ٹوٹا ہے، بلکہ دراصل یہ اس بات کی اطلاع تھی کہ کچھ بھیڑیئے قید تھے جن کا پنجرہ کھل گیا ہے۔ اس کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان کے باشندے اپنی فطرت

---

[1] یہ پنڈت جواہر لال نہرو تھے جنہوں نے اس کے لیے (Birth Pangs) کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ (جدید)

اور اپنے مزاج ہی کے لحاظ سے کمینے، بدمعاش اور سفاک ہیں، یاں ان کو ایسا بنا دیا گیا ہے؟ پہلا الزام ثابت کرنے کے لیے اُس سے زیادہ قوی ثبوت کی ضرورت ہے جو پچھلے دو سال کے واقعات نے فراہم کیا ہے۔ آخر ہندوستانیوں کی پچھلی سینکڑوں برس کی تاریخ موجود ہے۔ اپنے ماضی میں انہوں نے کب ایسی ذلیل صفات کا مظاہرہ کیا تھا؟ پھر اگر یہ الزام ثابت نہیں ہے تو یقیناً دوسرا الزام آپ سے آپ ثابت ہے، یعنی یہ کہ ہمارے ملک کی آبادی کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرایا گیا ہے۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس سے بچنے کے لیے پچھلے دردناک واقعات کے اسباب کی بحث کو باتوں میں اُڑانے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ یہ بحث اُن سب لوگوں کا مُنہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہمارے ملک کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

ہندوستان میں سیاسی بیداری کی ابتدا مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر ہوئی۔ اس تعلیم اور تہذیب نے دو تحفے ہمارے ملک کے کارفرماؤں اور کارکن ہاتھوں کو دیے۔ ایک، قومیت کا احساس اور قوم پرستی کا جذبہ۔ دوسرے مادہ پرستانہ اخلاق۔

پہلی چیز کو لے کر یہاں کے سیاسی لیڈروں نے "ہندوستانی قومیت" کا ایک مصنوعی تخیل پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر چونکہ اس کے لیے کوئی حقیقی بنیاد موجود نہ تھی اس لیے قومیت کی حس بیدار کرنے کی جتنی کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اُن مختلف گروہوں میں اپنی جداگانہ قومیتوں کا شعور جاگ اُٹھا جو فی الحقیقت اپنے اندر قومیت کے فطری عناصر رکھتے تھے۔ اس طرح چالیس پچاس سال کی تبلیغ قومیت نے اس ملک میں ایک کے بجائے بہت سی چھوٹی بڑی قومیتیں پیدا کر دیں، جن میں سے تین ـــــ یعنی ہندو قومیت، مسلم قومیت اور سکھ قومیت ـــــ تو پوری طرح برسرکار آ کر اپنا کھیل کھیل چکی ہیں، اور باقی بہت سی صوبائی اور لسانی قومیتیں ابھی دورانِ تخلیق میں ہیں۔ پھر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کے لیے برطانوی اقتدار کے خلاف جو جدّوجہد ہو رہی تھی، اس کا قدم جتنا جتنا آگے بڑھتا گیا، ان مختلف قومیتوں کے درمیان آپس کی کشمکش اتنی ہی تیز تر اور تلخ تر ہوتی چلی گئی۔ اس کشمکش نے ان میں سے ہر ایک کے اندر قوم پرستی کا شعور بھڑکا دیا، اور ایک کی طرف سے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرے کے قومی حوصلوں کی مزاحمت جتنی بڑھی اتنی ہی قومی عداوت ان کے درمیان بڑھتی چلی گئی۔

دوسری طرف مادّہ پرستانہ اخلاق کا جو درس مغربی تعلیم و تہذیب سے لیا گیا تھا وہ بادلے گتے کے زہر کی طرح سارے ملک کی رگ رگ میں پھیل گیا۔ اس نے دلوں کو خدا ترسی اور حق شناسی سے خالی کر دیا، شرافت اور انسانیت کی جڑیں ہلا دیں، اور ان تمام اخلاقی قدروں کو ختم کر دیا جو اس ملک کے لوگوں نے اپنے قدیم مذہبوں سے پائی تھیں۔ یہ اس نئے اخلاق ہی کا کرشمہ تھا کہ پچھلے پچیس سال میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی قومی کشمکش روز بروز زیادہ سے زیادہ رذالت کے راستوں پر بڑھتی چلی گئی۔ بڑے بڑے لیڈروں نے بے حیائی کیساتھ ایمان نگل کر قومی خود غرضیوں کے تقاضے پورے کیے، بڑی بڑی ذمّہ دار سیاسی جماعتوں نے حق اور انصاف سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کیے، ملک بھر کے اخبارات نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ جھوٹے پروپیگنڈے کیے، گالم گلوچ کا طوفان بپا کیا، اور نفرت و عداوت کی شراب پلا پلا کر اپنی اپنی قوموں کو بدمست کر دیا۔ پھر دونوں مخالف گروہوں کے لوگوں نے سرکاری محکموں میں، منڈیوں اور بازاروں میں اور زندگی کے ہر کاروبار میں ایک دوسرے کے خلاف کھلی کھلی بے انصافیاں اور حق تلفیاں کیں اور ہر اس بے ایمانی کو اپنے لیے نیکی اور کارِ ثواب بنا لیا جو حریف قوم کے کسی فرد کے ساتھ کی جاتے۔ واقعات کی یہ رفتار صاف بتا رہی تھی کہ اس ملک کا اخلاقی زوال کس پستی کی طرف بہا چلا جا رہا ہے۔

یہی وہ اسباب ہیں جنہوں نے مِل جُل کر وہ ہولناک نتائج پیدا کیے جو ہماری آنکھیں ابھی ابھی دیکھ چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی ذمّہ داری سے وہ لوگ بری نہیں ہو سکتے جو اس دَور میں یہاں کی مختلف قوموں کے رہنما اور سربراہ کار رہے ہیں۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک طرف اپنی اپنی قوم کے لوگوں میں قومی خواہشات برانگیختہ کیں اور دوسری طرف قومی اخلاق کو سنبھالنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اسے گرایا اور گرنے میں خود اس کی حوصلہ افزائی کی۔ اگر یہ اس کھیل کے نتائج سے بے خبر تھے تو سخت اناڑی تھے، ایسے اناڑی

اس قابل نہیں ہیں کہ کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کے ساتھ بازی گری کرنے کے لیے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر انہوں نے جان بوجھ کر یہ سارا کھیل کھیلا تو درحقیقت یہ انسانیت کے اور خود اپنی قوم کے دشمن ہیں، ان کا صحیح مقام پیشوائی کی مسند نہیں بلکہ عدالت کا کٹہرا ہے جہاں ان کے اعمال کا محاسبہ ہونا چاہیئے۔

یہ خیال کرنا سخت حماقت ہے کہ جو کچھ ہو گزرا وہ اس قومی کشمکش کا آخری باب تھا اور یہ کہ اب تقسیم ملک کے بعد تاریخ ایک صحیح راستے پر چل پڑے گی۔ ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۵ اگست، ۴۷ء کی تقسیم سے یہاں جو دو مملکتیں بنی ہیں، انہوں نے قومی خود غرضی اور اخلاقی پستی کا وہ سارا زہر میراث میں پایا ہے جو قبل تقسیم کے ہندوستان کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا اور ان دونوں مملکتوں کی پیدائش کا آغاز جن سخت المناک حالات میں ہوا ہے وہ ان کی آئندہ تاریخ پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نئی سیاسی سرحدوں کے دونوں جانب جو دو قومیں آباد ہیں ان کے دل ایک دوسرے کے خلاف انتقام اور عداوت کے تلخ ترین جذبات سے لبریز ہیں ——— خصوصاً سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان تو وہ دشمنی پیدا ہو چکی ہے جو شاید اس وقت کہیں بھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان نہیں پائی جاتی ——— مسلمان، ہندو اور سکھ ایک دوسرے کو وہ چرکے لگا چکے ہیں جن کے زخم مدتوں رستے رہیں گے اور اب وہ کسی غیر قوم کے ماتحت بے بس نہیں ہیں بلکہ اپنی اپنی آزاد مملکتیں رکھتے ہیں۔ اگر اب بھی ان دونوں مملکتوں کے باشندوں کو ہوش نہ آیا، اگر اب بھی ان کی لیڈر شپ تبدیل نہ ہوئی اور اگر اس نئے دور میں بھی ان کے معاملات اسی اندھی اور گندی قوم پرستی پر اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق پر چلتے رہے جس پر اب تک وہ چلے ہیں، تو آئندہ ان با اختیار قوموں کی کشمکش بہت زیادہ بڑے پیمانے پر بدرجہا زیادہ تلخ نتائج پیدا کرے گی۔ پہلے جو گالم گلوچ اخباروں کے کالموں میں ہوتی تھی وہ اب بین الاقوامی پلیٹ فارم پر ہوگی۔ پہلے جو چھوٹے چھوٹے معرکے دفتروں اور منڈیوں میں برپا ہوا کرتے تھے اب وہ دو سلطنتوں کے درمیان سیاسی رسہ کشی اور معاشی رقابت کی شکل میں برپا ہوں گے۔ اور پھر اگر خدانخواستہ ان دونوں قوموں کے درمیان کبھی جنگ ہو گئی تو یقیناً وہ ایسی سخت انتقامی جنگ ہوگی جو اپنی وحشت و بربریت میں تاریخ انسانی کی بدترین لڑائیوں کو بھی مات کر دیگی۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لہٰذا اب پاکستان اور ہندوستان، دونوں کے مستقبل کی بہتری کا انحصار اس بات پر ہے کہ اگر ان کی آبادیوں میں شریف معقول اور خداترس انسانوں کا کوئی عنصر موجود ہے تو وہ منظم ہو کر اُٹھے، اپنی اپنی قوم کی ذہنیت بدلنے کی کوشش کرے، اور موجودہ قیادتوں کو بدل کر ایسے طریقے پر دونوں ملکوں کے معاملات چلائے جس سے ان کے تعلقات شریفانہ ہمسایگی اور منصفانہ تعاون پر قائم ہو سکیں۔

اب ذرا ایک نظر تقسیم کے اُس ڈرامے پر بھی ڈال لیجیے جو پچھلے سال یہاں کھیلا گیا ہے، تاکہ آپ کو ان لیڈروں کی سیاسی دانائی کا حال معلوم ہو جائے جن کی مہارتِ فن کا شہرہ ایک مدت سے ہم سُن رہے تھے۔

اس ڈرامے کے اصل اداکار تین تھے، انگریز، کانگریس، اور مسلم لیگ۔ ان تینوں کے کام کا جائزہ لے کر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو کیا ثابت کیا ہے۔

انگریزوں کے لیے دوسری جنگِ عظیم کے پیدا کردہ مسائل اور ہندوستان کی سیاسی بیداری نے جو سوال پیدا کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ آیا اس ملک پر آخر وقت تک قاہرانہ تسلط جاری رکھا جائے یہاں تک کہ زبردستی نکالے جانے کی نوبت آ جائے؟ یا وہ وقت آنے سے پہلے ہی باہمی رضامندی سے یہ ملک چھوڑ دیا جائے؟ پہلی صورت میں وہ مزید چند سال تک اس ملک پر قبضہ رکھ سکتے تھے، مگر اس عارضی فائدے کا مستقل نقصان یہ تھا کہ زبردستی نکالے جانے کے بعد انہیں اُن تمام فائدوں سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھولینا پڑتا جو ہندوستان سے اُٹھائے جا سکتے تھے۔ دوسری صورت میں برٹش ایمپائر کا بظاہر خاتمہ تھا، مگر آزاد ہندوستان سے فائدہ اٹھانے کے امکانات باقی رہتے تھے۔ ان دونوں صورتوں کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے انگریزی قوم نے ٹھنڈے دل سے دوسری صورت کا انتخاب کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تاریخ اور نفسیات کے اس سبق سے بھی غافل نہ تھی کہ جو قوم کسی دوسری قوم کی غلامی سے آزاد ہوتی ہے اس کے اندر مدتوں تک اُس قوم کے خلاف شدید تعصب بلکہ انتقام کا جذبہ بھڑکتا رہتا ہے جو اس پر جبراً تہرے سے حکومت کرتی رہی ہو۔ اس لیے وہ اپنے مفاد کی خاطر یہ ضروری سمجھتی تھی کہ ہندوستان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا معاملہ ایسے طریقے سے طے کیا جائے جس سے تعصب و انتقام کے وہ سارے جذبات جو اس کے خلاف بھڑک سکتے تھے خود ہندوستانیوں کے درمیان آپس میں ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو جائیں اور انگریز دونوں کا یار غار بن کر رہے۔ اس غرض کے لیے برطانوی حکومت نے پہلے لارڈ ویول کو استعمال کرنا چاہا، مگر معلوم نہیں کہ وہ چالاک کم تھا یا شریف زیادہ، بہرحال وہ تاریخ انسانی کی عظیم ترین سیاسی بدمعاشی کا وہ کام انجام نہ دے سکا جو اس کی قومی حکومت اس سے لینا چاہتی تھی۔ آخر کار نگاہِ انتخاب لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر جا کر ٹھہری[1] اور اس شخص نے آکر تقسیم ہند کا پورا نقشہ ایسے طرز پر بنایا جو لازمی اور قطعی طور پر وہی نتائج پیدا کر سکتا تھا جو اس نے فی الواقع پیدا کیے[2]۔ کلکتہ، نواکھالی، بہار، گڑھ مکتیشور، راولپنڈی اور امرتسر کے واقعات کے بعد تقسیم ملک

---

[1] یہ شخص کس کیرکٹر کا آدمی تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے:

"لندن، ۱۸ نومبر۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جو ہندوستان کے آخری برطانوی وائسرائے تھے اور جو ملکہ برطانیہ کے شوہر پرنس فلپ کے چچا ہیں، آج عدالت نے اس جرم پر ان کو ۲ پونڈ جرمانہ کی سزا دی ہے کہ انہوں نے اپنے فارم واقع کینٹ (جنوبی مشرقی انگلستان) سے دودھ میں پانی ملا کر فروخت کیا۔" (پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۱۹ نومبر ۷۱ء) (حاشیہ جدید)

[2] یہاں حقیقت معاملہ کو سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تاریخی وضاحت ضروری ہے۔ ۲۰ فروری ۴۷ء کو برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے دارالعوام میں جو بیان دیا تھا اس میں برطانیہ سے اہل ہند کی طرف اقتدار منتقل کرنے کے لیے آخری تاریخ یکم جون ۴۸ء مقرر کی گئی تھی، اور کنزرویٹو پارٹی کو اس پر یہ اعتراض تھا کہ اتنے بڑے تغیر کو روبعمل لانے کے انتظامات کرنے کے لیے ۱۵ مہینے کی مہلت ناکافی ہے۔ لیکن ۲۴ مارچ ۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہو کر آیا۔ اس نے مئی کے وسط تک تقسیم ہند کا خاکہ (جس میں پنجاب و بنگال اور آسام کی تقسیم کا تصور بھی موجود تھا) مکمل کیا اور برطانوی حکومت سے منظوری لے کر ۳ جون ۴۷ء کو اعلان کر دیا کہ ملک کی تقسیم اور برعظیم ہند میں دو آزاد مملکتوں کی تشکیل ۱۵ اگست ۴۷ء تک کر دی جائے گی۔ گویا جس کام کے لیے ۱۵ مہینے ناکافی سمجھے جا رہے تھے اس کے لیے یکایک کسی پیشگی تیاری کے بغیر یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ وہ ۷۲ دن میں مکمل کر دیا جائے گا۔ یہ صریحاً ایک ارادی شرارت تھی تاکہ تقسیم سخت (باقی صفحہ ۲۹۶ پر)

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور انتقالِ اختیارات کا جو ڈھنگ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اختیار کیا اس کو دیکھ کر ایک معمولی عقل و بصیرت رکھنے والا آدمی بھی یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس سے ملک کے ایک بڑے حصے میں سخت خونریزی ہو کر رہے گی۔ اب اگر یہ ماؤنٹ بیٹن کا اناڑی پن تھا اور کوئی دانستہ چالاکی نہ تھی جسے اس کی قوم کی رضامندی حاصل ہوتی، تو جو ہولناک نتائج اس سے برآمد ہوتے انہیں دیکھ لینے کے بعد، بجائے اس کے کہ اس شخص پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے جاتے، اس پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہونی چاہیے تھی اور لاکھوں انسانوں کے قتل اور ایک کروڑ سے زیادہ انسانوں کی خانہ بربادی کے بدلے میں اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس کی سیاست دانی کی جو داد انگلستان میں دی گئی وہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا تھا اور اسے پوری انگریزی قوم کی رضامندی حاصل تھی۔ آج یہ اسی چالاکی کا کرشمہ ہے کہ ہندو اور مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں، اور وہ انگریز جو کل تک تینوں پر یکساں ظلم کر رہا تھا تینوں کا مشترک دوست ہے۔ مسلمان کے لیے ہندوستان کی، اور ہندو اور سکھ کے لیے پاکستان کی زمین تنگ ہے، مگر انگریز کے لیے ہر جگہ فراخی ہی فراخی ہے۔ انسانیت کے نقطۂ نظر سے آپ چاہے اس کو کتنا ہی بڑا جرم قرار دے لیں، انگریز کی قومی خودغرضی کے لحاظ سے یہ بالیقین ایک کامیاب ترین سیاسی چال تھی۔ مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس پر زیادہ داد کا مستحق کون ہے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، یا ہندوستان کے وہ اندھے سیاسی لیڈر جو تقسیم کے اس نقشے کی ساخت اور تکمیل میں ہر مرحلے پر اس کے شریک کار رہے؟

اس ڈرامے کی دوسری اداکار کانگریس تھی اور اس نے جو پارٹ ادا کیا وہ احمقوں کے سوا کسی سے داد نہیں پا سکتا۔ تقسیم ہند سے دو تین برس پہلے ہی یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اب تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس کے بعد دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک راستہ یہ تھا کہ تلخی اور بدمزگی کے بڑھنے سے پہلے ہی اس چیز کو سیدھی طرح قبول کر لیا جاتا جو ناگزیر ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۹۵ سے) افراتفری کے عالم میں ہو اور کشت و خون سے یہ سرزمین لالہ زار بن جائے۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

چکی تھی، اور بھلے آدمیوں کی طرح بیٹھ کر سارے معاملات ایسے طریقے سے طے کر لیے جاتے کہ پھر مل جانے یا کم از کم شریف ہمسایوں کی طرح رہنے کے مواقع باقی رہتے۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ "لے کر رہیں گے" اور "ہرگز نہ دیں گے" کے اس جھگڑے کو انتہائی تلخی کی حد تک بڑھنے دیا جاتا اور اس ناگزیر تقسیم کو ایسے مرحلے پر پہنچ کر قبول کیا جاتا جہاں الگ ہونے والی قوموں کے درمیان دوستانہ تو درکنار شریفانہ انسانی تعلقات برقرار رہنے کے امکانات بھی ختم ہو جاتے۔ کانگریسی لیڈروں نے ان دونوں راستوں میں سے دوسرے راستے کو انتخاب کیا۔ اس کی وجہ اگر نادانی تھی تو بدقسمت ہے وہ قوم جو اپنی باگیں ایسے نادان لوگوں کے ہاتھ میں دے۔ اور اگر اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ اپنی قوم میں اپنی ہر دلعزیزی کو کھونے کے لیے تیار نہ تھے تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے اپنی پوزیشن کی خاطر ملک کو اس راستے پر جان بوجھ کر چلایا جس میں ان کے کروڑوں ہم وطنوں کی بربادی تھی۔

اس سارے کھیل میں کانگریس نے اپنے طرزِ عمل سے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کی ایک ایک بات کو سچا اور اپنی ایک ایک بات کو جھوٹا کر دکھایا۔

ہندوستان کی آزادی کے خلاف چرچل اور دوسرے انگریز مدبرین کی سب سے زیادہ پُرزور دلیل یہ تھی کہ ہمارے ہٹتے ہی ملک میں فسادِ عظیم رونما ہو جائے گا۔ کانگریسی لیڈر اس کے جواب میں کہتے تھے کہ یہ ایک بات ہے جو تم اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے بناتے ہو، ذرا ذمہ داری کا بوجھ اہلِ ملک پہ ڈال تو دو، پھر دیکھو کہ کیسا امن اور انصاف قائم ہوتا ہے۔ اب واقعات نے کسے سچا اور کسے جھوٹا ثابت کیا؟ یہ آج سارا زمانہ دیکھ رہا ہے۔

مسٹر جناح کا سب سے بڑا الزام کانگریس پر یہ تھا کہ وہ دراصل ایک متعصب ہندو قوم پرست جماعت ہے اور اس نے محض منافقت کے ساتھ ہندوستانی قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ کانگریسی اس الزام کو بالکل غلط کہتے تھے لیکن وزارتی مشن (Cabinet Mission) کی آمد کے بعد سے آج تک کانگریس اور اس کے لیڈروں نے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

جو کچھ کیا ہے وہ مسٹر جناح کے الزام کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر سے اُس لبادے کو اُتار پھینکا ہے جسے مسٹر جناح منافقت کا لبادہ کہتے تھے۔

کانگرس کے مخالفین کہتے تھے کہ جو سوراج کانگرس قائم کرنا چاہتی ہے وہ دراصل ہندو راج ہوگا جس میں مسلمانوں کے لیے کوئی آزادی نہ ہوگی۔ اسی اندیشے پر تقسیم ملک کی تجویز مبنی تھی اور اسی خطرے کی بنا پر مسلمانوں کی عظیم اکثریت اُس تحریک آزادی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی جس کی علمبرداری کا "شرف" کانگرس کو حاصل تھا۔ کانگرسی لیڈر ہمیشہ مسلمانوں کے ان اندیشوں اور خطرات کو بے بنیاد قرار دیتے رہے۔ مگر ۱۵ اگست کے بعد جو کچھ ہندوستان میں ہوا اور اب تک ہو رہا ہے اس نے ان سارے اندیشوں کو بالکل صحیح ثابت کر دیا جن کی بنا پر مسلمان کانگرس کی تحریک آزادی کو اپنے لیے تحریک بربادی سمجھتے تھے۔ بلکہ درحقیقت سوراج قائم ہوتے ہی جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ شروع ہوا وہ تو اُن بدتر سے بدتر اندازوں سے بھی بدرجہا زیادہ بدتر نکلا جو کانگرس کے شدید ترین مخالف لگا سکتے تھے۔

کانگرس کا دعوٰے تھا کہ وہ ہندوستان کی وحدت کا عقیدہ رکھتی ہے اور تقسیم کو محض مسلم لیگ اور انگریزی حکومت کی زبردستی سے بادلِ ناخواستہ قبول کر رہی ہے لیکن تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے وقت اور تقسیم کے بعد جو کچھ اس نے کیا وہ سب اِس تقسیم کو دائمی اور ابدی بنا دینے والا ہے۔ اگر آدمیت سے تقسیم کا معاملہ طے کیا جاتا شرافت سے اس پر عملدرآمد کیا جاتا اور اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں سے منصفانہ سلوک کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ کچھ مدت بعد پاکستان خود ہندوستان کے ساتھ اتحاد کا خواہشمند ہوتا۔ مگر اب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وہ دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں جو صدیوں تک انہیں ایک دوسرے سے جُدا رکھیں گی۔

اب تیسرے اداکار کو لیجیے جس کا پارٹ اس ڈرامے میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے۔

دس سال سے مسلمانوں کی قیادت عظمٰی جس لائحہ عمل پر چل رہی تھی وہ سلطان عبدالحمید خان

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی سیاست سے ملتا جلتا تھا۔ جس طرح وہ ۳۲ سال تک محض ڈوڈلی یورپ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اُٹھا کر جیتے رہے اور اس دوران میں خود اپنے ملک کی کوئی طاقت انہوں نے نہ بنائی جس کے بل بوتے پر وہ جی سکتا، اسی طرح اِس قیادت کا بھی سارا سیاسی کھیل بس انگریز اور کانگرس کی کشمکش سے فائدہ اُٹھانے تک محدود تھا۔ پورے دس سال میں اس نے خود اپنی قوم کی اخلاقی، مادی اور تنظیمی طاقت بنانے اور اس کے اندر قابلِ اعتماد سیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جس کی بنا پر وہ اپنے کسی مطالبہ کو خود اپنی طاقت سے منوا سکتی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جوں ہی انگریز اور کانگرس کی باہمی کشمکش ختم ہوئی، اِس قیادتِ عظمیٰ نے اپنے آپ کو ایسی حالت میں پایا جیسے اس کے پاؤں تلے زمین نہ ہو۔ اب وہ مجبور ہو گئی کہ جو کچھ جن شرائط پر بھی ملے اسے غنیمت سمجھ کر قبول کر لے۔ بنگال و پنجاب کی تقسیم اسے بے چون وچرا ماننی پڑی۔ سرحدوں کی تعیین جیسے نازک مسئلے کو اسے صرف ایک شخص کے فیصلے پر چھوڑ دینا پڑا۔ انتقالِ اختیارات کے لیے جو وقت اور جو طریقہ تجویز کر دیا گیا اسے بھی بلا تامل اس نے مان لیا۔ حالانکہ یہ تینوں امور صریح طور پر مسلمانوں کے حق میں مہلک تھے۔ انہی کی وجہ سے ایک کروڑ مسلمانوں پر تباہی نازل ہوئی، اور انہی کی وجہ سے پاکستان کی عمارت اول روز ہی سے سخت متزلزل بنیادوں پر اُٹھی۔

اس قیادت کی غلطیاں اس سے بہت زیادہ ہیں کہ چند سطروں میں انہیں شمار کیا جا سکے۔ مگر اس کی چند غلطیاں تو اتنی نمایاں ہیں کہ آج ہر ذی ہوش آدمی ان کو بری طرح محسوس کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر۔

۱۔ اس نے حصولِ پاکستان کی جنگ میں اُن علاقوں کے مسلمانوں کو شریک کیا جنہیں لامحالہ ہندوستان ہی میں رہنا تھا۔ آج یہ اُسی کا خمیازہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین اُن غریبوں کے لیے جہنم بن گئی ہے۔ حالانکہ اگر تقسیم کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کا مستقبل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جانے والا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تقسیم سے پہلے دونوں کی پالیسی ایک ہوتی۔

۲۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ہفتہ پہلے بھی خبردار نہ کیا کہ تقسیم کے وقت ان پر کیا طوفان ٹوٹنے والا ہے۔ اگر فی الواقع اسے ان حالات کا اندازہ ہی نہ تھا تو اس کی غفلت و بیخبری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قابلِ ماتم ہے۔ اور اگر اس نے جان بوجھ کر مسلمانوں کو بے خبر رکھا تو اس غداری کے لیے اسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ جن لیڈروں پر ہندوستان کے مسلمان آخر وقت تک اندھا اعتماد کیے ہوئے تھے وہ عین وقت پر انہیں چھوڑ کر پاکستان اُٹھ آئے اور انہیں کچھ بھی نہ بتایا کہ اُن کے پیچھے وہ کیا کریں۔

۴۔ جو عجیب و غریب ہدایت ہندوستان کے مسلمانوں کو دی گئی وہ یہ تھی کہ ایک رات میں وہ اُن سارے اصولوں کو نگل جائیں جن پر وہ دس برس سے کانگریس کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ۱۴ر اگست کا سورج دو قومی نظریئے کا کلمہ پڑھتے ہوئے غروب ہوا اور ۱۵ر اگست کا سورج طلوع ہوتے ہی ہر ہندی مسلمان ہندوستانی قومیت کا معتقد بن کر اُٹھے۔

۵۔ پچھلے دس سال کی قومی تحریک میں اسلام کا نام جس قدر لیا گیا اس کا پچاسواں حصہ بھی مسلمانوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لیے کام نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے قومی اخلاق کو پہلے سے کچھ زیادہ ہی پست کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی جنگ میں مسلمان اُن تمام اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوتے جن کا ارتکاب ان کے حریفوں نے کیا۔ مظالم کی مقدار میں چاہے کتنا ہی فرق رہا ہو مگر مظالم کی نوعیت میں دونوں کے کارنامے ایک دوسرے سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ اگر ہماری قومی قیادت نے ہمارے عوام کی اخلاقی تربیت کے لیے کوئی کوشش کی ہوتی اور اکثریت کے علاقوں کے مسلمان وہ حرکات نہ کرتے جو انہوں نے کیں، تو اقلیت کے مسلمان اِس بُری طرح نہ پیسے جاتے، اور آج پاکستان کی اخلاقی پوزیشن ہندوستان سے اتنی زیادہ اونچی ہوتی کہ ہندوستان اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکتا۔

(ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۴۸ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تقسیم کے وقت مسلمانوں کی حالت کا جائزہ

گزشتہ صفحات میں ہندوستان کے تازہ سیاسی انقلاب کا جو جائزہ لیا گیا تھا وہ اس کے صرف ایک پہلو سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں ہم نے بحیثیت مجموعی پورے ملک[1] کی حالیہ سرگزشت خونیں پر ایک نگاہ ڈال کر یہ بتایا تھا کہ اس ملک کے سابق حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں نے مل جل کر اپنی خود غرضی، تنگ دلی اور احمقانہ بے تدبیری سے اس کو کس خوفناک تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے، اور اس سے بچنے کی واحد صورت اب کیا ہے۔ آج ہم اس کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اس انقلاب میں سب سے زیادہ تباہی جس قوم پر آئی ہے —— یعنی مسلم قوم —— وہ آج کس حال میں ہے، کن اسباب نے اسے اس حالت کو پہنچا دیا ہے، اور اب کیا چیز اسے بچا سکتی ہے۔

دس گیارہ برس پہلے کی بات ہے جب ہندوستان کے سات صوبوں میں یکایک کانگرس کو برسرِ اقتدار دیکھ کر اور پنڈت نہرو سے مسلم عوام کے ساتھ براہِ راست ربط قائم کرنے (Muslim Mass Contact) کا پروگرام سُن کر مسلمانوں کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں ہندو قوم پرستی کا غلبہ ان کے لیے ایک حقیقی خطرہ ہے اور یہ خطرہ سر پر آ چکا ہے۔

---

[1] یہاں بھی ملک سے مراد وہ ہندوستان ہے جو تقسیم کے وقت تک ایک ملک تھا۔ (جدید)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اُس وقت مسلمانوں میں دو گروہ موجود تھے۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ خطرہ وطرہ کچھ نہیں ہے، سب تمہارا وہم اور انگریز کا دلایا ہوا ڈراوا ہے۔ جو سیلاب اُٹھ رہا ہے ٹھیک اُٹھ رہا ہے، اطمینان کے ساتھ اس میں کُود پڑو، اور جدھر یہ بہا کر لے جانا چاہتا ہے پُورے انشراحِ صدر کے ساتھ اُدھر بہہ جاؤ۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ خطرہ واقعی اور حقیقی ہے، یہ سیلاب محض آزادی وطن کا سیلاب نہیں بلکہ ہندو سامراجیت کا سیلاب ہے، اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دینے کے معنی قومی خودکشی کے ہیں، اور اس سے بچنے کی تدبیر ضرور کرنی چاہیئے۔ پہلا گروہ اگرچہ بڑی بڑی مذہبی شخصیتوں اور آزمودہ کار سیاسی لیڈروں پر مشتمل تھا، لیکن چونکہ وہ ایسی بات کہہ رہا تھا جو مسلمانوں کے عام احساسات کے خلاف تھی، اور پوری قوم کو ہندوستان کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر میدان میں ہندو قوم پرستی کے ہاتھوں اس کے بالکل برعکس تجربات پیش آ رہے تھے، اس لیے مسلمانوں نے مجموعی طور پر اُس کو رد کر دیا اور جوق در جوق دوسرے گروہ کی آواز پر وہ لبیک کہتے چلے گئے۔

پھر دوسرے گروہ میں بھی جلدی ہی اس مسئلے پر اختلاف رائے ہو گیا کہ ہندو سامراج کی اس بڑھتی ہوئی رَو کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے راہِ عمل کیا ہے۔

ایک رائے یہ تھی کہ مغربی جمہوریت اور قوم پرستی کے اصولوں پر ہندو اقتدار کی تحریک کا مقابلہ کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مفید نہیں۔ اصولاً اس لیے غلط ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ اصول اُن اسلامی اصولوں سے ٹکراتے ہیں جن پر ہم ایمان لانے کے مدعی ہیں۔ اور عملاً یہ راہ اس بنا پر غیر مفید ہی نہیں، قطعی مہلک بھی ہے کہ ہندوستان کے ایک چھوٹے سے حصّے کو چھوڑ کر باقی سارے ملک میں مسلمان قلیل التعداد ہیں، اور ایک جمہوری نظام میں قومی جنگ لڑ کر اقلیت بجز تباہی کے اور کچھ مول نہیں لے سکتی۔ اس رائے کے پیش کرنیوالوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر تم محض ایک قوم ہوتے تو بلاشبہ تمہارے لیے یہاں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوتا کہ قومی جنگ لڑ کر اپنے جتنے حصّے کو بچا سکتے بچا لیتے اور باقی حصّوں کی طرف سے پیشگی فاتحہ پڑھ لیتے۔ لیکن تم محض عام معنی میں ایک قوم نہیں ہو بلکہ ایک اصولی جماعت ہو جس کے پاس اصولِ اسلام کا ہتھیار وہ زبردست ہتھیار ہے جو پہلے بھی دنیا کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسخر کر چکا ہے اور آج بھی کر سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ تم یہ مایوسانہ نقشۂ جنگ بناؤ۔ تمہارے لیے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ سیاسی اور معاشی اغراض کے لیے لڑنے والی ایک قلیل التعداد قوم کی یہ پوزیشن چھوڑ دو جو غلطی سے تم نے اختیار کر رکھی ہے، اور اس کے بجائے اپنا اصل منصب سنبھالو جو مسائلِ زندگی کا ایک بہترین حل اور تمام موجود الوقت نظاموں سے زیادہ جامع اور منصفانہ نظام پیش کرنے والی جماعت کا منصب ہے۔ اس چیز کو لے کر اگر تم اٹھ کھڑے ہوئے اور تم نے علمی و فکری حیثیت سے اصولِ اسلام کا تفوّق تمام دوسرے اصولوں پر ثابت کر دیا اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو اخلاقی حیثیت سے بھی اپنے ہمسایوں پر فائق کر کے دکھا دیا تو یقین جانو کہ تھوڑی ہی مدت کے اندر ہندوستان میں توازنِ قوت بدل جائے گا، ہندوستان کی سیادت تمہارے سوا پھر کسی اور کا حصّہ نہ ہوگی، اور بجائے اس کے کہ تم اپنے بچاؤ کے لیے پریشان ہو، تمہارے حریفوں کو یہ فکر لاحق ہو جائے گی کہ وہ تمہارے بڑھتے ہوئے سیلاب سے اپنے آپ کو کس طرح بچائیں۔

یہ وہی بات تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں قریش کے لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ میں وہ کلمہ لے کر آیا ہوں کہ اگر تم اسے لے لو تو عرب اور عجم سب تمہارے زیرنگین ہو جائیں گے۔ لیکن مسلمانوں نے اس مشورے میں وہی خطرہ محسوس کیا جو قریش نے محسوس کیا تھا کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا، یعنی اگر ہم اس راہِ عمل کو اختیار کر لیں تو اس سرزمین میں ہمارا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ پوری قوم میں بہت کم لوگ اس راہ کے امکانات کو سمجھ سکے، اور بہت ہی کم لوگ اس پر چلنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ اس طرح یہ رائے قومی طرزِ عمل نہ بن سکی۔

دوسری رائے یہ تھی کہ تمام ہندوستان کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور مل کر آواز اٹھائیں کہ ہم ایک الگ قوم ہیں، ہمارا مذہب الگ ہے، ہماری تہذیب الگ ہے، ہمیں اور ہندوؤں کو ملا کر سارے ملک میں ایک قومی جمہوری ریاست بنا دینا صحیح نہیں ہے، ملک کو تقسیم کیا جائے، جہاں ہماری اکثریت ہے وہاں ہماری آزاد قومی حکومت بنے اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں اُن کی آزاد قومی حکومت بن جائے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں نہ کسی ذہنی کاوش کی کوئی حاجت تھی اور نہ کسی اخلاقی اصلاح و انضباط کا کوئی سوال۔ بظاہر بات بھی بالکل صاف تھی، اور مسلمانوں کے ذہین طبقہ کو ایک مدت سے جس قسم کی تعلیم و تربیت مل رہی تھی، اس کے لحاظ سے یہی بات ان کی دماغی سطح سے قریب تر بھی تھی۔ اس لیے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر ساری قوم نے اس راستے کو اپنا لیا۔ اس مرکزی تخیل پر جمع ہونے کے بعد سے پچھلے چند سالوں میں مسلمانوں نے من حیث القوم جو کچھ کیا ہے اسی تحریک اور اسی قیادت کے زیر اثر کیا ہے جو اس تخیل کو پیش کرنے کی ذمہ دار تھی۔ لہٰذا ہماری ماضی قریب کی سرگزشت کا اور ہمارے آج کے حال کا حسن و قبح لازماً اس تحریک ہی کی طرف راجع ہوگا۔

یہ تحریک ایک قومی تحریک تھی۔ اس میں وہ سب لوگ شریک ہوئے جو نام و نسب کے لحاظ سے مسلم قوم کے افراد تھے۔ یہ سوال اس میں سرے سے بے محل تھا کہ جو اس میں شامل ہوتا ہے وہ خدا، رسول، آخرت، وحی و کتاب اور دین و شریعت کو مانتا ہے یا نہیں، حرام و حلال کی تمیز کا قائل ہے یا نہیں اور فجور و تقویٰ، دین داری و بے دینی کی مختلف صفات میں سے کس صفت کے ساتھ متصف ہے۔ اصل مسئلہ قوم کو بچانے کا تھا اور اس کے لیے تمام قومی عناصر کا متحدہ محاذ بننا ضروری تھا۔ پھر جو کام پیش نظر تھا وہ بھی نبوت اور امامت کا نہ تھا کہ دین و اعتقاد کے تجسس کی ضرورت پیش آتی۔ مقصود صرف قومی مدافعت تھی اور اس کے لیے تحریک کی شرکت تو درکنار اس کی قیادت و رہنمائی کے معاملہ میں بھی یہ دیکھنے کی حاجت نہ تھی کہ جن لوگوں کو ہم آگے لا رہے ہیں ان کا اسلام سے کتنا اور کیسا تعلق ہے۔

یہ تحریک سیاسی تھی، اس میں اخلاق کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ جس نے سیاسی جوڑ توڑ میں جتنی زیادہ مہارت دکھائی وہ اتنے ہی زیادہ ذمہ داری کے منصب کا اہل قرار پایا۔ اس قابلیت کا ثبوت مل جانے کے بعد یہ دیکھنا بالکل غیر ضروری تھا کہ اس کی دیانت، امانت، صداقت کا کیا حال ہے اور اس کی سیرت کہاں تک اعتماد کے لائق ہے۔

اس تحریک میں اگرچہ مذہب کا کوئی دخل نہ تھا۔ بعینہٖ اسی قسم کی تحریک ایسے ہی کارکنوں اور لیڈروں اور پیروؤں کے ساتھ دنیا کی ہر قوم اٹھا سکتی تھی۔ لیکن اتفاق کی بات

تھی کہ جو قوم اپنی مدافعت کے لیے یہ تحریک لے کر اٹھی تھی اس کا مذہب اسلام تھا۔ اس لیے اسلام کی خدمات بھی اس کے لیے حاصل کی گئیں۔ اصول یہ قرار پایا کہ ہدایت و رہنمائی تو اسلام کے بس کا روگ نہیں ہے، اور نہ یہ کہنے کا اُسے حق ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہ کرنا چاہیئے، البتہ یہ اُس کا فرض اور اوّلین فرض ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ اس کی تصدیق و توثیق کرے، اس پر اجر کی اُمید دلائے، اس پر چسپاں کرنے کے لیے اپنی کوئی نہ کوئی اصطلاح مستعار دے، اور اس میں ہمارا ساتھ نہ دینے والوں کو جہنم کا راستہ دکھائے، اس لیے کہ ہم جو کچھ کریں گے اسی پر مسلم قوم کا بچنا موقوف ہے، اور مسلم قوم ہی نہ رہی تو یہ اسلام صاحب آخر رہیں گے کہاں؟ یوں اس تحریک میں اسلام سے وہ خدمت لی گئی جو بگڑے ہوئے نواب زادے اپنے خاندان کے کسی پرانے جاں نثار ملازم سے لیا کرتے ہیں۔ مشورہ اور نصیحت اُس کا کام نہیں ہوتا۔ میاں لوگ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں۔ مگر آڑے وقت میں بوڑھے خادم کو پکارا جاتا ہے کہ آ اور حقِ نمک ادا کر۔ پھر اگر وہ غریب اُن حرکات پر صبر نہیں کر سکتا جن کی وجہ سے بُرے وقت آتے ہیں اور بے چین ہو کر کبھی کہہ بیٹھتا ہے کہ صاحبزادے اپنے اطوار ٹھیک کر دو، تو اُسے ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ ایاز قدرِ خود بشناس، تو اپنے کام سے کام رکھ، تیری یہ حیثیت کب سے ہو گئی کہ ہمارے معاملات میں دخل دے۔

یہ تھیں وہ بنیادیں جن پر ہماری یہ قومی تحریک اول روز سے اٹھی اور آخر تک بڑھتی چلی گئی۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں مومن اور منافق اور کھلے کھلے ملحد سب شامل تھے۔ بلکہ دین میں جو جتنا ہلکا تھا وہ اتنا ہی اوپر آیا۔ اس میں اخلاق کی سرے سے کوئی پوچھ نہ تھی۔ عام کارکنوں سے لے کر بڑے سے بڑے ذمّہ دار لیڈروں تک میں انتہائی ناقابلِ اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے، بلکہ تحریک کا قدم جتنا آگے بڑھا اس قسم کے عناصر کا تناسب بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس میں اسلام کو اتباع کے لیے نہیں بلکہ صرف عوام میں مذہبی جوش پیدا کرنے کے لیے فریقِ جنگ بنایا گیا تھا۔ کبھی ایک دن کے لیے بھی اس کو یہ حیثیت نہیں دی گئی کہ وہ حکم دے اور یہ اسے مانیں، اور کوئی قدم اٹھاتے وقت یہ اُس سے استصواب کریں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پھر چونکہ مقابلہ ہندو سے تھا اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے ہر حربے کا جواب ویسے ہی حربے سے، ہر چوٹ کا جواب ویسی ہی چوٹ سے، اور ہر چال کا جواب ویسی ہی چال سے دیا جائے۔ جن جن پستیوں میں وہ گرا مسلمان بھی اس کی ضد میں گرے، اور جو جو کچھ وہ اپنی قومی خود غرضیوں کی خاطر کرتا گیا مسلمانوں نے اس دلیل پر اس کا ارتکاب کیا کہ ہندو ایسا کر رہا ہے۔ اس مقابلہ و مسابقت نے مسلمانوں کی عام اخلاقی سطح اتنی گرا دی کہ شاید اس سے پہلے وہ کبھی اخلاقی حیثیت سے اتنے نہ گرے تھے۔

یہ تو تھا ہماری اس عظیم الشان قومی تحریک کا اخلاقی و دینی پس منظر۔ اب ذرا اس کے اصل کام کا جائزہ لیجیے جو وہ قوم کو بچانے کے لیے کر رہی تھی۔

مسلمانوں کا قومی مطالبہ جو اس نے مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عددی اکثریت کے لحاظ سے ملک تقسیم کر دیا جائے۔ اس مطالبہ کے اندر آپ سے آپ تین باتیں شامل تھیں۔ ایک یہ کہ تقریباً آدھے مسلمان ہندوؤں کے قومی غلام بن کر رہ جائیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی قومی ریاست دو ایسے چھوٹے چھوٹے خطوں میں بٹے جن کی حیثیت ہندو ریاست کی سرحدوں پر قریب قریب وہی ہو جو پولینڈ اور چیکوسلوواکیہ جیسی ریاستوں کی حیثیت روس کی سرحدوں پر ہے۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں خطوں کے درمیان بھی ایک ہزار میل کا ہندو علاقہ حائل ہو اور ان کے درمیان نہ حالتِ امن میں پوری طرح تعاون ہو سکے نہ حالتِ جنگ میں یہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔[1]

---

[1] یہ بات ابتدا ہی سے واضح تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کا ایک ملک بن کر رہنا اسی وقت تک ممکن ہے جب تک ہندو تقسیم کے بین الاقوامی راضی نامے کا احترام کریں۔ لیکن جس وقت بھی وہ اس کا احترام بالائے طاق رکھ دیں اور مسلمانوں کے کسی گروہ سے سازش کر کے مشرقی پاکستان میں پہلے کوئی بغاوت برپا کرائیں اور پھر اس کی مدد کو خود پہنچ جائیں، یہ وحدت باقی نہ رہ سکے گی، کیونکہ اس صورت میں مغربی پاکستان کسی طرح بھی مشرقی پاکستان کو نہیں بچا سکتا۔ یہ ایسی حقیقت تھی جس کو ہندو پاکستان کے نقشے پر ایک نگاہ ڈال کر ہر شخص پہلی نظر ہی میں دیکھ سکتا تھا۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اوّل روز ہی سے معلوم تھا کہ ہندو اس مطالبہ کی سخت مزاحمت کرے گا، چنانچہ وہ اس نے کی اور ایک طرف سے مطالبے اور دوسری طرف سے مزاحمت نے چند سال کے اندر قومی جنگ کو اتنی شدید تلخی کی حد تک پہنچا دیا کہ شاید آج جرمنی اور روس، امریکہ اور جاپان، عرب اور یہود کے درمیان بھی اس سے زیادہ تلخی نہ ہوگی۔ اس قومی جنگ میں لامحالہ مسلمان ہی سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے تھے۔ کیونکہ ان کا پورا نصف حصہ ہمارے اپنے مطالبہ کی رُو سے ان کے مالکانہ تصرف میں جانے والا تھا۔ پھر چونکہ اقلیت کے مسلمانوں کو بھی اس جنگ میں شریک کیا گیا تھا، بلکہ پیش پیش وہی تھے، اس لیے یہ یقینی بات تھی کہ جنگ کے آخری مرحلوں میں، اور تقسیم کے بعد اُن کو بدترین مظالم کا تختۂ مشق بننا پڑے گا۔ یو پی، بہار، اور دوسرے ہندوستانی علاقوں میں کسی مکان پر "پاکستان زندہ باد" لکھا ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ ایک وقت میں یہی فقرے بدمست دشمنوں کو آتش زنی، قتل وغارت اور عصمت دری کی دعوت دیں۔

اس کے ساتھ مزید غضب یہ کہ قومی جنگ کے لیے ہم نے جو طاقت فراہم کی تھی وہ نعرے، جھنڈے، جلسے، جلوس، ریزولیوشن، اخباری بیانات اور سیاسی گفت وشنید سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ یہ سب ہتھیار صرف اُسی حالت کے لیے موزوں ہو سکتے تھے جب کہ قسمتوں کی میزان ایک تیسری طاقت کے ہاتھ میں ہو، اور وہ خود اپنی مصلحتوں کی خاطر توازن قائم کرنے کے لیے ایک فریق کے مقابلہ میں دوسرے فریق کے شور وغل کو وزن دینا چاہے۔ ہمارے لیڈر مدّتوں تک اس حالت میں رہتے رہتے اس کے اتنے خوگر ہو چکے تھے کہ وہ سب کچھ اس کے اندر ہی سوچ سکتے تھے۔ اس حالت کے گزر جانے کے بعد دوسری حالت میں کیا کچھ درکار ہے؟ اس کا شاید انہیں کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب دوسرے حالات یکایک پیش آگئے تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ بالکل بے سروسامان تھے۔

پچھلے سال (۱۹۴۷ء) کے آغاز تک کسی کو بھی محسوس نہ ہوا کہ ہم اپنے اندر کیا کمزوریاں لیے ہوئے ہیں، ہماری سیاست کیا نتائج اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، اور قومی جنگ کس رُخ پر جا رہی ہے۔ شور وشغب اور ہنگامہ وجوش نے ایک ایسا فریب قوّت پیدا کر دیا تھا کہ ہم اپنی تنظیم کو ایک مکمل تنظیم اور اپنی سیاست کو ایک ماہرانہ سیاست سمجھے بیٹھے تھے، اور اس وقت ہر

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہ شخص ہمیں اپنا دشمن نظر آ رہا تھا جو سطح کے نیچے چھپے ہوئے کمزور پہلوؤں کی طرف، یا سر پر آئے ہوئے طوفانِ بلا کی طرف ذرا سا اشارہ بھی کر دے۔ مگر جونہی کہ تقسیم کا فیصلہ ہوا، یکایک وہ ساری ہی کمزوریاں رنگ لے آئیں جو ہمارے قومی اخلاق میں، ہماری قومی تنظیم میں اور ہمارے سیاسی نقشے میں موجود تھیں۔

پانچ کروڑ مسلمانوں نے انتہائی بے بسی کی حالت میں ایک مفتوح اور شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو اچانک اُن ہندوؤں اور سکھوں کے جنگل میں پایا جن کے ساتھ وہ چند روز پہلے دو بدو لڑ رہے تھے۔ اس طرح جو تحریک پوری قوم کو بچانے کے لیے اُٹھی تھی اس کی تدبیرِ مدافعت کا خلاصہ یہ نکلا کہ ایک نصف کو بچانے کے لیے دوسرے نصف کو ایسی سخت تباہی کے گڑھے میں پھینک دیا گیا جس کا تصور بھی پہلے نہ کیا جا سکتا تھا۔

مشرقی پنجاب، دہلی اور اس کے آس پاس کے دوسرے علاقوں میں جب مسلمانوں پر ظلم و ستم کا پہاڑ یکایک ٹوٹ پڑا تو وہ قومی تنظیم جس پر کئی سال سے مسلمان اعتماد کیے ہوئے تھے ان کے لیے بالکل بیکار ثابت ہوئی۔ ہر جگہ کے مقامی لیڈروں اور قومی کارکنوں میں سے ۹۵ فی صدی سخت ناقابلِ اعتماد نکلے۔ انہوں نے عین وقت پر اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ دیا اور صرف اپنے بچاؤ کی فکر کی۔ ان محافظینِ قوم نے وہ اسلحہ تک، جو مسلمانوں کی مدافعت کے لیے فراہم کیے گئے تھے ازیادہ داموں پر ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں فروخت کرنے میں تامل نہ کیا۔ انہوں نے خطرے کے علاقوں سے مسلمانوں کو بچا کر نکالنے کے بجائے اپنے جانوروں اور اپنے عیش کے سامانوں کو نکال لانا زیادہ ضروری سمجھا۔ انہوں نے پاکستان کے سرکاری ٹرکوں پر پناہ گزینوں کو بٹھانے کے لیے بھی رشوتیں وصول کیں۔ انہوں نے کیمپوں میں ایک ایک دانے کے لیے ترسنے والے پناہ گزینوں کے ہاتھ بھی وہ روٹیاں مہنگے داموں بیچیں جو سرکاری خرچ پر بھیجی گئی تھیں۔

پھر مسلمانوں کے قومی اخلاق کی تعمیر سے جو غفلت برتی گئی تھی اس نے اپنے بدترین نتائج پاکستان کی سرحد کے دونوں طرف دکھائے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں نے بڑے بڑے علاقے محض دھمکیوں میں خالی کر دیئے، انہوں نے انتہائی بے غیرتی کے منظر جیتے جی اپنی آنکھوں سے دیکھے، ایک ایک سکھ کے آگے پچاس پچاس مسلمان زمین بوس ہوئے، اور اس کے ساتھ عین اُس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قیامت صغریٰ کی حالت میں بھی مسلمان نے مسلمان کو لوٹتے میں، اور ذرا ذرا سی ضرورت کی چیزیں اپنے مصیبت کے ساتھیوں کے ہاتھ بلیک مارکیٹ کے داموں بیچنے میں کوئی شرم محسوس نہ کی۔ دوسری طرف مغربی پنجاب، سرحد اور سندھ کے مسلمانوں نے، ان کے لیڈروں اور قومی کارکنوں نے، ان کے منتخب کیے ہوئے ایم ایل اے صاحبان نے اور ان سرکاری ملازموں نے جو کبھی قومی درد سے بہت تڑپا کرتے تھے، ہندوؤں اور سکھوں کے مال لُوٹ لوٹ کر جس طرح اپنے گھر بھرے' اپنے پناہ گزین بھائیوں کے بسنے میں جو مشکلات پیدا کیں، مصیبت کے مارے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ جس بیدردی کا سلوک کیا، اور پاکستان بنتے ہی بے نظمی، نا فرض شناسی، رشوت، خیانت، اقربا پروری اور ظلم و بے انصافی کی جو گرم بازاری کی اسے دیکھ کر یہ بالکل عیاں ہو گیا کہ سیرت و اخلاق کے بغیر نرے جھنڈوں، نعروں اور جلوسوں کے بل پر کسی قوم کو اٹھانے کے کیا نتائج ہوا کرتے ہیں۔

اس سارے نامۂ اعمال میں اگر کسی چیز کو نفع کے خانہ میں رکھا جا سکتا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انہوں نے کم از کم آدھے مسلمانوں کو تو بچا لیا اور ان کی ایک قومی ریاست بنا دی۔ لیکن افسوس کہ اس "روشن" کارنامے کو بھی ہم بدترین غلطیوں سے داغدار پاتے ہیں اور بُری طرح ان کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ تقسیم ہند کا معاملہ جس طریقے سے طے کیا گیا وہ غلطیوں بلکہ حماقتوں کا ایک مجموعہ تھا۔ سرحدات کا تعین گفت و شنید سے طے کرنے کے بجائے دو کمیشنوں پر چھوڑ دیا گیا۔ کمیشن کی ترکیب ایسی قبول کی گئی جس سے فیصلہ کا اختیار کلیتہً صدر کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا۔ صدر بھی کسی غیر جانبدار قوم کا آدمی نہیں بنایا گیا بلکہ انگریز قوم سے لیا گیا جو ہندوستان میں نہ غیر جانبدار تھی نہ بے غرض۔ پھر اس فیصلہ کا اعلان کرنے کے اختیارات بھی اس شخص (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) کے ہاتھ میں چھوڑ دیئے گئے جو صرف ہندوستان کا گورنر جنرل رہ جانے والا تھا، اور ہماری قیادت عظمیٰ نے پیشگی یہ قول دیدیا کہ اس فیصلے کی رُو سے جو بھی سرحدیں مقرر کر دی جائیں گی انہیں وہ بے چون و چرا مان لے گی۔ اس شدید غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال اور پنجاب دونوں میں مسلمان اکثریت کے متعدد علاقے ہندوستان کے ساتھ ملحق کر دیئے گئے، مشرقی پنجاب کی پوری تحصیلیں جن میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی، ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں چلی گئیں، اور سب سے زیادہ یہ کہ گورداسپور

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کا ضلع ہندوستان میں شامل ہو گیا جس کی وجہ سے کشمیر کے ہندو رئیس کو ہندوستان کے ساتھ تعلق جوڑنے کا راستہ مل گیا۔

انتقالِ اختیارات کی جو صورت لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تجویز کی تھی وہ صریح طور پر پاکستان کے حق میں سخت مضر تھی، مگر ہماری قیادتِ عظمیٰ نے اسے بھی جوں کا توں قبول کر لیا۔ پاکستان کے حصّہ کی فوجیں جگہ جگہ منتشر تھیں، اس کے حصّے کا سامان اور فوجی ذخائر بھی ہندوستان کے قبضے میں تھے، اس کے حصّے کا سرمایہ بھی ہندوستان ہی کے ہاتھ میں تھا، اس کے دفاتر اور اس کا عملہ تک ابھی پوری طرح منتقل نہ ہوا تھا، اور اس حالت میں پاکستان کی مستقل مملکت نظم و نسق اور دفاع کی پوری ذمّہ داری کے ساتھ قائم کر دی گئی۔ آج یہ اسی حماقت کا نتیجہ ہے کہ اپنی قوم کے جس آدھے حصّے کو انہوں نے ہندو اقتدار کے چنگل سے نکالا ہے وہ بھی اُس کے دباؤ سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا۔ جوناگڑھ پر انہوں نے زبردستی قبضہ کیا اور ہم اپنی بے بسی کی وجہ سے اُنگلی تک نہ ہلا سکے۔ کشمیر کے مسلمانوں کو وہ ہمارے سامنے پامال کر رہے ہیں اور ہم ان کے مقابلہ میں کھل کر لڑنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ ہماری گردن اُن سے دبی ہوئی ہے اور ہم ہر موقع پر ان سے دبتے چلے جا رہے ہیں۔

آج ایک سال کے بعد کہا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی زبردستی سے کیا تھا اور ہم اس پر راضی نہ تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب یہ زیادتی کی جا رہی تھی اور آپ دیکھ رہے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن ہماری بربادی کے سامان کر رہا ہے، اس وقت آپ کی زبان کہاں چلی گئی تھی؟ کیوں نہیں آپ نے اپنی قوم اور ساری دنیا کو اس شرارت کی اطلاع دی؟ کیوں آپ خاموشی کے ساتھ وہ سب کچھ قبول کرتے چلے گئے جو مسلمانوں کے لیے سخت تباہ کن تھا؟ کیوں آپ نے اسی وقت یہ اعلان نہ کیا کہ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن اپنی ذمّہ داری پر کر رہا ہے اور ہم برضا و رغبت اس کی ذمّہ داری میں شریک نہیں ہیں؟ صرف یہی نہیں کہ اس وقت آپ خاموش رہے۔ بعد میں جب اس غلط طرزِ تقسیم کے سخت ہولناک نتائج رونما ہو گئے اور لاکھوں مسلمانوں کو اس کا بدترین خمیازہ بھگتنا پڑا، اس وقت بھی آپ نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔

جیسا کہ ہم ابتدا میں کہہ چکے ہیں، دس سال پہلے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال آیا تھا کہ وہ ہندو سامراج کے تسلط سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں۔ اس سوال کا ایک حل پیش کیا گیا تھا کہ اسلام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے اصولوں اور اسلامی سیرت کی طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ کیا جائے۔ مگر اس حل نے مسلمانوں کو اپیل نہ کیا اور وہ اسے آزمانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اب یہ بحث بیکار ہے کہ اسے آزمایا جاتا تو کیا ہوتا۔ دوسرا حل جو پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ قومیت کی بنیاد پر سیاسی جنگ لڑی جائے۔ اسی حل کو مسلمانوں نے قبول کیا اور اپنی ساری قومی طاقت، اپنے تمام ذرائع اور اپنے جملہ معاملات اُس قیادت کے حوالے کر دیئے جو اُن کے قومی مسئلے کو اس طرح حاصل کرنا چاہتی تھی۔ دس برس کے بعد آج اس کا پورا کارنامہ ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح کس صورت میں ہمارے مسئلے کو حل کیا۔ جو کچھ ہو چکا ہے وہ تو اَمِٹ ہے، اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اُس پر اس حیثیت سے تو بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں، کیا ان کے حل کے لیے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلے کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آپڑے ہیں، جن کا بیشتر حصّہ خود اسی قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، انہیں حل کرنے کے لیے ہم اس پر اعتماد کریں؟

(ترجمان القرآن - جولائی ۱۹۴۸ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

تقسیم کے بعد سامنے آنے والے مسائل

مسلمان اس وقت بحیثیت ایک قوم کے جن بڑے بڑے مسائل سے دوچار ہیں ان کا ابھی تک پوری طرح جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ ہمارے سوچنے سمجھنے والے طبقے ان مسائل کا کچھ نہ کچھ ادراک ضرور رکھتے ہیں اور ان پر غور و فکر کرتے بھی رہتے ہیں، لیکن عام طور پر جو بحثیں پڑھنے اور سننے میں آتی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ نہ تو ان مسائل کا پورا احاطہ کیا گیا ہے اور نہ ان کا تجزیہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک مسئلہ کیا نوعیت رکھتا ہے، کیا اس کے اسباب ہیں، کیا اس کی اہمیت ہے، اور کس طرح وہ حل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم بحیثیت مجموعی اب تک اپنے اصل مسائل سے غافل ہے۔ پھر ہمارے اندر ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جن کی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ قوم کو ان مسائل سے غافل کیا اور رکھا جائے۔ وہ اس کی توجہ ان سے ہٹا کر ہنگامی معاملات کی طرف پھیرتے رہتے ہیں۔ وہ اسے اب تک وہی نشہ پلائے جا رہے ہیں جو آزادی سے پہلے پلا رہے تھے۔ وہ اسے تھپکیاں دے دے کر مطمئن کر رہے ہیں کہ یہ مسائل یا تو موجود ہی نہیں ہیں یا ہیں بھی تو ان کے لیے کچھ زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ باتیں خواہ نادانی کے ساتھ کی جا رہی ہوں یا ہوشیاری کے ساتھ، اور خواہ کسی پارٹی کی اغراض کے لیے یہ کتنی ہی مفید ہوں، بہر حال قوم کی خیر خواہی کا ان میں شائبہ تک نہیں ہے۔ قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس کے سامنے واضح طور پر وہ سارے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مسائل رکھ دیے جائیں جن سے اس کو عہدہ برآ ہونا ہے۔ پھر اسے یہ سوچنے کی دعوت دی جائے کہ آیا وہ اپنی موجودہ حالت میں ان مسائل سے عہدہ برا ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو الحمدللہ، اور نہیں ہے تو اسے لامحالہ اپنے اندر تبدیلی کرنی ہوگی اور غور کرنا پڑے گا کہ وہ تبدیلی کس نوعیت کی ہو۔

ہمارے لیے اس وقت سب سے زیادہ نازک اور سب سے بڑھ کر دلخراش مسئلہ ان مسلمانوں کا ہے جو تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ تقسیم کے وقت ان کی تعداد پانچ کروڑ کے لگ بھگ تھی، یعنی ہماری قوم کا پورا نصف حصہ۔ تقسیم کے بعد ان میں سے کئی لاکھ فنا کے گھاٹ اتار دیئے گئے، ایک بڑی تعداد جبراً غیر مسلم بنالی گئی، ساٹھ ستر لاکھ پاکستان میں دھکیل دیئے گئے اور دس پندرہ لاکھ کو حیدرآباد میں پناہ لینی پڑی[1]۔ اب اندازہ کیا جاتا ہے کہ چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں باقی ہیں۔ یہ باقی ماندہ مسلمان آج انڈین یونین میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو روس کے ماتحت مفتوح جرمنوں کی اور امریکہ کے ماتحت شکست خوردہ جاپانیوں کی ہے۔ دس سال کی تلخ و تیز قومی جنگ کے بعد اب وہ بالکل بے بسی کے ساتھ اپنے سابق حریفوں کے قبضے میں ہیں۔ انہیں "پاکستان زندہ باد" کی وہ قیمت دینی پڑ رہی ہے جو ان کے شہری حقوق ہی کو نہیں، انسانی حقوق تک کو کھا گئی ہے۔ وہ سب "غدار" اور سب "جاسوس" ہیں۔ ہر ایک کی وفاداری مشتبہ ہے۔ ہر ایک کے لیے خانہ تلاشی اور گرفتاری مقدر ہے الا یہ کہ کسی کی باری آنے میں ابھی کچھ دیر ہو۔ پوری قوم اصل میں یرغمال بن چکی ہے۔ اس کے لیے عزت کی زندگی کا دروازہ بند ہے اور صرف تین راستے کھلے ہوئے ہیں: یا تو برضا و رغبت مرتد ہو جائے، یا اچھوتوں سے بدتر حالت میں رہے، یا پھر خاموشی کے ساتھ ان سب تدبیروں کو برداشت کرتی چلی جائے جو اس کی امتیازی ہستی کو مٹانے اور اسے ہندو قومیت میں جذب کرنے کے لیے عمل میں لائی جارہی ہیں۔ یہ حالت اگر یوں ہی جاری رہی تو مستقبل قریب میں مسلمان

---

[1] اُس وقت تک حیدرآباد کا سقوط نہیں ہوا تھا اور آس پاس کے علاقوں سے کئی لاکھ مسلمان اس ڈوبتی ہوئی کشتی میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے تھے۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہندوستان سے اسی طرح غائب ہو جائیں گے جس طرح وہ اندلس (اسپین) اور صقلیہ (سسلی) سے غائب ہو چکے ہیں۔ لاقدر اللہ۔

چار کروڑ مسلمانوں کی یہ عظیم الشان قوم اس وقت بالکل بے سہارا ہے۔ جس سیاست پر اب تک اس کا مدارِ کار تھا اس کی بساط انقلاب کے ایک ہی پلٹے نے اُلٹ دی۔ جس قومی تنظیم پر اس کا سارا اعتماد تھا وہ طوفان کا ایک تھپیڑا بھی نہ سہ سکی۔ جن لیڈروں کے ہاتھ میں وہ اپنے معاملات سونپ کر مطمئن ہو بیٹھی تھی وہ اس کے لیے بالکل بے کار ثابت ہوئے۔ ان کے کچھ اکابر تو خاموشی کیساتھ اُٹھ کر پاکستان چلے آتے، اور باقی اکابر و اصاغر سب دشمنوں کے آگے توبہ و استغفار کرنے میں مشغول ہو گئے۔ سیرت و اخلاق کے بغیر جو لوگ محض نعروں کے بل پر لیڈر بنے تھے وہ زمانے کا رُخ بدل جانے کے بعد ایک دن بھی اپنے قبلے کی سمت اُستوار نہ رکھ سکے۔ انقلاب کی پہلی ہی رات وہ اپنے اُن نظریات اور اصولوں کو طلاقِ مُغلّظہ دے بیٹھے جن پر دس سال سے وہ اپنی قوم کو لڑا رہے تھے۔ دو قومی نظریہ یک لخت ان کے نزدیک باطل ہو گیا۔ یک قومی نظریے کی صداقت اچانک ان پر منکشف ہو گئی۔ ترنگے جھنڈے کی عقیدت یکایک ان کے دل میں گھر کر گئی۔ چند روز کے اندر ان مجاہدینِ ملّت کو وطن پرستی میں ایسا شرحِ صدر نصیب ہوا کہ اُن کے حلقے سے مخلوط ہندو مسلم شادیوں تک کی تجویزیں آنے لگیں تاکہ مسلم و ہندو کے اندر سے یہ کم بخت "من دیگرم تو دیگری" کا احساس تو کسی طرح دُور ہو! اِس پورے گروہ میں سے ایک کو کن بھی نہ نکلا جو بازی کھونے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے بٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اُس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے۔

اس سے مایوس ہو کر اس ڈوبتی ہوئی قوم نے اُن تنکوں کا سہارا لینا چاہا جو پہلے سے کانگرسی دریا کی سطح پر تیر رہے تھے، مگر اب وہ بھی اس کے لیے بے کار ثابت ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ اب بھی یہی رائے رکھتا ہے کہ مسلمان اپنے امتیازی وجود کو خود بھول جائیں اور ہندی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تحفظِ ذات کا نہیں بلکہ "انسان بھیری" کا نسخہ ہے جو مسلمان کے مزاج کو نہ پہلے راس آیا تھا اور نہ اب راس آسکتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دوسرا گروہ کچھ مسلمان کے "مستقل وجود" اور کچھ اس کے "حقوق" کا بھی تصور رکھتا ہے، مگر یہ نام زبان پر آتے ہی پرانے سے پرانا کانگرسی مسلمان بھی ہندو قوم پرستوں کی نگاہ میں بس ایک نقاب پوش مسلم لیگی بن کر رہ جاتا ہے۔

ہندوستان کے ان مسلمانوں کا مسئلہ اس وقت درحقیقت ہمارا سب سے بڑا قومی مسئلہ ہے۔ تقسیم نے ہمیں کاٹ ضرور دیا ہے، مگر وہ ہیں ہماری ہی قوم کا ایک حصہ، اور معمولی نہیں پورا ⅓ حصہ۔ ان کو ہم یوں ہی مٹنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کا ہم پر سب سے بڑا حق ہے، اس لیے کہ جس پاکستان سے ہم متمتع ہو رہے ہیں اس کی اصل قیمت انہی نے ادا کی ہے۔ وہ اس لیے بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں کہ ہمارا بہترین مردم خیز حصہ وہی ہیں۔ انہیں اس بنا پر بھی نذرِ تغافل نہیں کیا جا سکتا کہ ہماری ہزار سالہ تہذیب کے تمام چیدہ ثمرات اور ہمارے تمام بڑے بڑے معاہد (Institutions) اور تہذیبی مراکز کے امانت دار وہی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آخر ہم ٹھنڈے دل سے یہ بات کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے پچھلے ایک ہزار سال میں جو محنتیں اور جو جانفشانیاں اسلام کے پیغام کو اکنافِ ہند میں پھیلانے کے لیے کی ہیں ان سب پر پانی پھر جائے اور توحید کی دعوت سمٹ کر برعظیم ہند کے صرف دو چھوٹے چھوٹے خطوں میں محدود ہو جائے۔ لہٰذا کوئی شخص بے پروائی کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ ان کا اپنا مسئلہ ہے۔ نہیں، یہ پاکستان کا بھی ویسا ہی مسئلہ ہے جیسا ہندوستان کے مسلمانوں کا ہے، اور فی الواقع یہ اس پوری ملت اسلامیہ کا مسئلہ ہے جو اس مصنوعی تقسیم کے باوجود اب بھی ہندوستان اور پاکستان میں ایک ہی ملت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان چار کروڑ مسلمانوں کو بچانے، اور ہندوستان میں اسلام کی دعوت کو زندہ اور تازہ رکھنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اب تک چونکہ قومی حیثیت سے ہمارا مدارِ کار بالکل مسلم لیگ کے نظام اور اس کی قیادت پر رہا ہے اس لیے یہ سوال لازماً اسی کی طرف پھرتا ہے۔ کیا تقسیم سے پہلے مسلم لیگ کی قیادت عظمیٰ نے اس مسئلے کا کوئی حل تجویز کیا تھا؟ کیا تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلم لیگ کی سیاست اور قیادت کے لیے کام کرنے کا اب کوئی موقع ہے؟ کیا پاکستانی مسلم لیگ اس بارے میں اپنے پاس کوئی لائحہ عمل رکھتی ہے؟ کیا پاکستان کی موجودہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حکومت اس قابل ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت پر کوئی اچھا اثر ڈال سکے یا ہندستان میں اسلام کے مستقبل کو درخشاں نہیں تو کم از کم محفوظ ہی کرنے کے لیے کچھ کر سکے؟ اگر ان سوالات کا کوئی جواب سے ہے تو اسے معلوم کر کے ہم بہت خوش ہوں گے۔ اگر نہیں ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جب تک ہمارے قومی معاملات کی سربراہ کاری موجودہ سیاست و قیادت کے ہاتھ میں ہے، اپنی ملت کے اس سب سے بڑے مسئلے کا کوئی حل ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، اور یہی سیاست و قیادت ہماری سربراہ کار رہی تو ہمیں چند سال کے اندر یہ دیکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیئے کہ واگہ سے راس کماری تک اور مشرقی بنگال کی سرحدوں سے کاٹھیاواڑ کے سواحل تک کا پورا علاقہ اسلام سے خالی ہو جائے۔

دوسرے مسائل پاکستان سے متعلق ہیں۔ عموماً ان سب مسائل کو لپیٹ کر صرف ایک بڑا مسئلہ ہمارے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس کا عنوان ہے "پاکستان کا دفاع اور استحکام"۔ اور اس کا حل یہ پیش کیا جاتا ہے کہ سب پاکستانی مل کر ایک ہو جائیں اور فوجی حیثیت سے مضبوط ہوں۔ لیکن تھوڑا سا تجزیہ کرنے ہی پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ پاکستان کا دفاع و استحکام کوئی ایک سادہ سا مسئلہ نہیں ہے بلکہ بہت سے مسائل کا مجموعہ ہے، اور اس کا حل بھی اُتنا سادہ نہیں ہے جتنا اسے سمجھ لیا گیا ہے۔ کیا ایک ملک جس کے اخلاق کو گھن لگا ہوا ہو، محض اسلحہ اور فوجی تربیت کے بل پر کھڑا ہو سکتا ہے؟ کیا ایک ملک جس کے عناصر ترکیبی کو ایک دوسرے سے پھاڑنے اور باہم متصادم کرنے کے لیے بہت سے طاقت ور اسباب موجود ہوں بس "ایک ہو جاؤ" کی تسبیحیں پڑھنے سے واقعی ایک ہو سکتا ہے؟ پس بجائے اس کے کہ ہم سادگی و سادہ لوحی سے خود کام لیں یا دوسروں کو سادہ لوح فرض کر کے ان کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹانے اور فرضی مسائل کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں، ہمیں واضح طور پر یہ دیکھنا چاہیئے کہ فی الواقع پاکستان کا بقاء و تحفظ اور اس کا استحکام کن مسائل سے وابستہ ہے اور ہم کس طرح انہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

اولین مسئلہ ملک کے اخلاق کا ہے جو تشویشناک حد تک گر چکے ہیں۔ ہماری تمام مشکلات میں سب سے زیادہ اخلاق ہی کی خرابیاں کار فرما ہیں۔ اس بگاڑ کا زہر اتنے وسیع پیمانے پر ہماری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

سوسائٹی میں پھیل گیا ہے اور اتنا گہرا اُتر چکا ہے کہ اگر ہم اسے اپنا قومی دشمن نمبر ایک قرار دیں تو ہرگز مبالغہ نہ ہوگا۔ کوئی بیرونی خطرہ ہمارے لیے اتنا خوفناک نہیں ہے جتنا یہ اندرونی خطرہ ہے۔ یہ ہماری قوتِ حیات کو کھا گیا ہے اور کھاتے چلا جا رہا ہے۔

پچھلے سال کے فسادات میں بداخلاقی کا جو طوفان اٹھا تھا وہ ہماری آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کو بہا لے گیا۔ قتل و خون، آتش زنی، اور عورتوں کے بھگانے کی مشق تو شاید ہزاروں ہی کو ہوئی ہوگی، لیکن لوٹ مار کی آلائش نے لاکھوں کو ملوث کر کے چھوڑا۔ اس اخلاقی زوال کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک گاؤں کی ڈھائی ہزار آبادی میں صرف ایک شخص ایسا نکلا جس نے لوٹ میں حصہ لینے سے پرہیز کیا تھا، اور ایک قصبہ کے سات سو گھروں میں سے بمشکل ۲۵ گھر ایسے پائے گئے جن میں لوٹ کا مال نہ پہنچا تھا۔ پھر ان لٹیروں میں محض جاہل عوام اور بازاری لوگ ہی شامل نہ تھے، بڑے بڑے شرفاء اور معززین، اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ، سوسائٹی اور حکومت میں بڑے مرتبے رکھنے والے حضرات بھی اسی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے، بلکہ وہ تو اس میں خوب جی بھر کر نہائے۔ پولیس کے چھوٹے بڑے افسر، امن و انتظام کے ذمہ دار مجسٹریٹ، حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار، بڑے بڑے نامور قومی کارکن، اسمبلی کے ممبر اور بعض وزراء تک اس گندگی میں غوطہ لگا گئے۔ یہ واقعات کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ ایک دنیا ان کو جانتی ہے اور شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ حقیقت اب کھل چکی ہے کہ ہمارے اخلاق کے جوڑ بند بُری طرح ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ ہم میں ہزارہا آدمی ایسے موجود ہیں جو قتل و خون کے مشاق ہو چکے ہیں، ہزاروں ایسے لوگ ہیں جو موقع ملنے پر بد سے بدتر جرائم کا ارتکاب کر سکتے ہیں، اور نیچے سے لے کر اونچے طبقوں تک کم از کم ۵۰ فیصدی تعداد ان لوگوں کی ہے جنہیں حرام کا مال سمیٹنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں ہے بشرطیکہ انہیں قانون کی گرفت سے محفوظ رہنے کا اطمینان ہو۔

ان حالات میں ہمارے لیے یہ کوئی وجہ تسلی نہیں ہے کہ اس سے بدرجہا زیادہ بدتر اخلاقی صفات کا ظہور ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں سے ہوا ہے۔ جو زہر انہوں نے کھایا اس کی فکر انہیں ہو یا نہ ہو، ہمیں تو اس زہر کی فکر ہے جو ہماری رگوں میں اُتر گیا ہے۔ کیا مشتاق مجرموں

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

اور بے باک خائنوں کی اتنی کثیر تعداد اپنے اندر لیے ہوئے ہم اپنی قومی زندگی کو مستحکم بنا سکتے ہیں؟ کیا وہ بد اخلاقیاں جو کل غیروں کی جان مال اور عصمت کے معاملے میں برتی گئی تھیں، ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں اور اپنا کوئی پائدار اثر ہماری سیرت و کردار پر نہیں چھوڑ گئیں؟ کیا یہ بگڑے ہوئے اخلاق اب خود اپنوں پر ہاتھ صاف کرنے سے رُکے رہ جائیں گے؟

ایک سال کا تجربہ ہمیں بتا رہا ہے کہ جس اخلاقی زوال کی خبر گزشتہ فسادات نے دی تھی وہ وقتی اور محدود نہ تھا۔ دراصل وہ ایک نہایت خوفناک مرض کی حیثیت سے ہمارے اندر اب بھی موجود ہے اور ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے کو خراب کر رہا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جو دشواریاں فطرۃً ایک نئی مملکت کو پیش آیا کرتی ہیں وہ تو ہمیں پیش آنی ہی تھیں، اور جو مصائب انگریز، ہندو اور سکھ کی باہمی سازش سے ہم پر نازل ہوتے وہ بھی اپنی جگہ تھے، لیکن یہ سب کچھ بڑی آسانی سے انگیز کیا جا سکتا تھا اگر ہمارے عوام و خواص اور ہمارے سربراہ کاروں کے اخلاق اتنے بگڑے ہوئے نہ ہوتے۔ یہ واقعہ ہے، اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ اخلاق کی خرابیوں نے ہماری مشکلات اور مصیبتوں کو، جتنی کہ وہ تھیں، اصل سے کئی گنا زیادہ بڑھا دیا۔

مثال کے طور پر "مہاجرین" کے مسئلے کو لیجیے جو پاکستان بنتے ہی ایک پہاڑ کی طرح ہم پر نازل ہوا۔ بلاشبہ ایک ملک کے لیے اس سے بڑی کوئی مصیبت نہیں کہ اس پر ساٹھ ستر لاکھ بے سروسامان آدمی یک لخت لا کر ڈال دیے جائیں۔ لیکن غور سے دیکھیے کہ اس طرح جو مشکلات حقیقتہً رونما ہوئی تھیں ان پر کتنا اضافہ ہماری اپنی اخلاقی خرابیوں نے کر دیا۔[1] ہندوؤں

لہ آخری اعداد و شمار کی رو سے پاکستان میں پناہ لینے والوں کی مجموعی تعداد ۹۰ لاکھ تھی۔ لیکن ان کو بسانے میں جو کمالات دکھائے گئے ان کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ۱۹۵۱ کی مردم شماری کی رو سے سندھ چھوڑ کر جانے والے غیر مسلموں کی تعداد ۹ لاکھ تھی، مگر ہندوستان چھوڑ کر آنے والے ۵ لاکھ چالیس ہزار مسلمان وہاں بسائے گئے۔ اور سرحد سے جانے والے غیر مسلم ۲۹۶۰۰۰ تھے، مگر ہندوستان سے آنے والے صرف ۵۱ ہزار مسلمانوں کو وہاں بسایا گیا۔ مہاجرین کو آباد کرنے کا مسئلہ سالہا سال سے پاکستان کے لیے دردِ سر بنا ہوا (باقی صفحہ ۲۲۰ پر)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اور سکھوں نے جو عمارات، سامان، اموال، دکانیں، کارخانے، زمینیں اور دوسری چیزیں پاکستان میں چھوڑی تھیں، اگر ان پر خود پاکستان کے باشندے، حکومت کے عمّال اور قومی کارکن قبضے کر کے نہ بیٹھ جاتے تو کیا مہاجرین کو بسانے میں ہم کو وہی دقتیں پیش آسکتی تھیں جن سے اب ہم دوچار ہیں؟ مغربی پنجاب اور سرحد اور سندھ کی حکومتوں سے پوچھیے کہ جانے والوں نے کیا کچھ چھوڑا تھا، اور اس کا کتنا حصّہ آنے والوں کو دیا گیا اور کتنا حصّہ کن کن غیر مستحقین کو پہنچا؟ اگر یہ اعداد و شمار روشنی میں آجائیں تو دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ جائے کہ مہاجرین کے مسئلے کا جو زخم غیروں نے ہم کو لگایا تھا اسے سرطان کا پھوڑا بنا دینے والے دراصل کون لوگ ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حمّام میں آپ کس کس کو برہنہ دیکھیں گے۔

پھر جو لوگ کل تک "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے، جن سے بڑھ کر قوم کے درد میں تڑپنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا، اور جو آج بھی زبان سے بہت بڑے "مجاہدِ ملت" بنے ہوئے ہیں، ان میں عظیم الشان اکثریت آپ کو ایسے افراد کی نظر آئے گی جو پاکستان بننے کے بعد ہر زاویے سے اس کی کشتی میں سوراخ کیے جا رہے ہیں۔ یہ رشوت خوریاں، یہ خیانتیں، یہ غبن، یہ قومی خرچ پر اقربا پروریاں اور دوست نوازیاں، یہ فرائض سے غفلت، یہ ڈسپلن سے گریز، یہ غریب قوم کی دولت پر عیاشیاں، جن کا ایک طوفان سا ہمارے نظام حکومت کے ہر شعبے میں برپا ہے اور جس میں بکثرت چھوٹے اہل کاروں سے لے کر بہت سے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۹ سے) ہے اور اس وقت تک بھی اسے پوری طرح حل نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغربی جرمنی پر جرمن پناہ گزینوں کا ایک سیلاب ٹوٹ پڑا، حتٰی کہ جون ۱۹۶۱ء تک بڑھتے بڑھتے ان کی تعداد ایک کروڑ ۲۵ لاکھ تک پہنچ گئی، اور یہ اس حال میں ہوا کہ مغربی جرمنی سے جانے والا کوئی نہ تھا جو اپنی جائداد خالی چھوڑ گیا ہو۔ اس کے باوجود جرمنوں نے پناہ گزینوں کو بڑی خوبی سے بسایا بھی اور کام پر بھی لگا لیا، بلکہ مہاجرین کا یہ سیلاب مغربی جرمنی کی معاشی خوشحالی و ترقی کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا۔

(جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

عالی مقام حکام اور وزراء تک آلودہ ہیں، کیا یہ سب پاکستان کو مضبوط کرنے والی چیزیں ہیں؟ یہ دکانوں اور کارخانوں کی ناجائز تقسیم، جس کی بدولت ملک کی صنعت و تجارت کا بڑا حصہ نا اہل اور ناتجربہ کار ہاتھوں میں چلا گیا ہے، کیا یہ پاکستان کی طاقت کو مستحکم کرنے والی چیز ہے؟ یہ پبلک کا بالعموم حکومت کے ٹیکس ادا کرنے سے گریز کرنا اور ان سے بچنے کے لیے، نیز دوسرے ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لیے سرکاری ملازموں کو رشوتیں دینا، اور جہاں بھی قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کی امید ہو پبلک فنڈ کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے میں بھی تامّل نہ کرنا، کیا یہی وہ چیزیں ہیں جن سے پاکستان مضبوط ہو سکتا ہے؟ ملک کے باشندوں کی اخلاقی حالت اس قدر گر چکی ہے کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی لاشیں جب واہگہ اور لاہور کے درمیان پڑی سڑ رہی تھیں اور کیمپوں میں بھی موت کا بازار گرم تھا اس وقت ۱۲-۱۴ لاکھ مسلمانوں کے شہر میں سے چند ہزار نہیں، چند سو آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو اپنے بھائیوں کو دفن کرنے کی زحمت اٹھاتے۔ متعدد مثالیں ہمارے علم میں ایسی ہیں کہ کوئی مہاجر مر گیا ہے اور اس کے عزیزوں کو نماز جنازہ پڑھنے کے لیے اُجرت پر آدمی فراہم کرنے پڑے ہیں۔ یہاں تک بھی نوبت پہنچی ہے کہ سرحد کے قریب کسی گاؤں میں مہاجرین کو زمینیں دی گئیں اور مقامی مسلمانوں نے سرحد پار سے سکھوں کو بُلا کر ان پر حملہ کرا دیا تاکہ یہ بھاگ جائیں اور زمین ہمارے قبضہ میں رہ جاتے۔ حد یہ ہے کہ قوم کی جو بیٹیاں ہندوستان کے ظالموں سے بچ کر آ گئی تھیں ان کی عصمتیں یہاں خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکیں ——— اس قسم کے واقعات شاذ نہیں ہیں بلکہ بکثرت، ہمارے علم میں آئے ہیں، اور ان شرمناک جرائم کے مرتکب صرف عام شہدے ہی نہیں تھے ——— کیا اتنے شدید اخلاقی تنزل کے ہوتے ہوئے ہم یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ کسی بڑی اندرونی یا بیرونی مصیبت کے مقابلے میں ہم مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو سکیں گے؟ اور کیا یہ اخلاقی تنزل اپنے ملک کی تعمیر کے لیے ہماری کسی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ چلنے دے گا؟

تھوڑی دیر کے لیے ہم اس سوال کو جانے دیتے ہیں کہ ہماری قیادت نے سیاسی تحریک کے ساتھ قوم کی اخلاقی طاقت کو سنبھالنے کی فکر کیوں نہ کی؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اب وہ اس کے لیے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیا کر رہی ہے؟ اخلاق بنانے اور سنوارنے کا کیا سروسامان اس کے پاس ہے؟ کیا تدابیر اس کے پیش نظر ہیں؟ کیا لائحہ عمل اس نے بنایا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا واضح جواب ہمیں ملنا چاہیئے۔ اگر اس کے جواب میں اُن نصائح کی طرف اشارہ کیا جاتے جو کبھی کبھی ریڈیو اور سرکاری پریس اور تقریروں کے ذریعہ سے پبلک کو اور حکومت کے چھوٹے اہل کاروں کو کی جاتی رہتی ہیں، تو ہم پہلے ہی کہے دیتے ہیں کہ اس طرح کی طفل تسلیوں سے ہمیں معاف رکھا جاتے۔ اس لیے کہ بد اخلاقی کے اصل سرچشمے تو خود قصرِ قیادت کے ستونوں میں شامل ہیں۔ کارفرمائی اور کارپردازی کی باگیں تو اِس وقت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں جن کی بڑی اکثریت ہی کے دم قدم سے بداخلاقی کا بازار گرم ہے۔ پھر بھلا خیانت کی زبان سے امانت کا سبق، خود غرضی کی زبان سے ایثار کا وعظ اور گناہ کی زبان سے نیکی کا درس انسانی فطرت نے کب قبول کیا ہے کہ یہاں اس کے کارگر ہونے کی توقع کی جاتے!

دوسرا مسئلہ جو پاکستان کی زندگی، اس کے بقا اور اس کے استحکام کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے انہیں کس طرح جوڑ کر ایک بنیانِ مرصوص بنایا جاتے؟ یہ عناصر اس وقت شدت کے ساتھ مائل انتشار نظر آرہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے عناصرِ ترکیبی ہی اگر مجتمع اور باہم پیوستہ نہ ہوں تو اس کے وجود کا برقرار رہنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ اُس کے اجزائے وجود میں پراگندگی کا رجحان یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی اپنی تعمیر ہی میں خرابی کی صورت مضمر ہے۔ لہٰذا اگر یہ واقعہ ہے، اور کون ہے جو اس کا انکار کر سکتا ہو، کہ پاکستان کے ترکیبی عناصر میں جمع و تالیف کے بجائے کچھ انتشار و پراگندگی کے رجحانات پائے جاتے ہیں اور کچھ قوتیں اُن کو بڑھانے میں لگی ہوئی ہیں، تو ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ ہمارے بندِ استحکام، بلکہ عین ہماری بندش وجود ہی میں ایک خطرناک رخنہ موجود ہے جسے دور کیے بغیر ہم اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

پاکستان جن عناصر پر مشتمل ہے، ان میں تین تفرقیں اس وقت بالکل نمایاں ہیں۔

پہلی تفرقہ، مہاجرین اور غیر مہاجرین کے درمیان ہے۔ ہماری آبادی میں مہاجرین کی تعداد اس وقت ۷۰ لاکھ سے متجاوز ہو چکی ہے اور یہ تعداد روز افزوں ہے، کیونکہ ہندوستان کے ہر

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصّہ سے مسلمان اکھڑ اکھڑ کر برابر پاکستان کی طرف چلے آرہے ہیں۔ مشرقی ہند کے لوگوں کا رُخ مشرقی پاکستان کی طرف ہے اور باقی ہندوستان کے لوگ مغربی پاکستان کی راہ لے رہے ہیں۔ا یہ نیا عنصر اب ہماری آبادی کا ایک مستقل عنصر ہے اور تعداد کے لحاظ سے کوئی معمولی عنصر نہیں ہے۔ لیکن متعدد اسباب ایسے ہیں جو نئے اور پرانے عناصر کو مل کر ایک قوم بننے سے روک رہے ہیں۔ کچھ تو زبان، تہذیب، معاشرت اور عادات و خصائل کے قدرتی اختلافات ہیں جو بہرحال ایک مدت تک یگانگت میں مانع ہوا ہی کرتے ہیں۔ مگر ان پر غیر معمولی اضافہ جس چیز نے کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ مہاجرین اور غیر مہاجرین دونوں میں جاہلیت کے تعصبات اور نفسانی خود غرضیاں کارفرما ہیں۔ یہ چیز ہر جگہ ان دونوں عناصر کو پھاڑ رہی ہے، ان کو مخالف جتھوں کی شکل میں منظم کر رہی ہے، ان کے درمیان آویزش کی صورتیں پیدا کر رہی ہے اور دونوں طرف کے تنگ نظر اور خود غرض مفسدین ان کو باہم لڑا رہے ہیں۔؎۲

دوسری تفریق جغرافی، نسلی اور لسانی ہے۔ پاکستان اوّل تو دو ایسے خطوں پر مشتمل ہے جن کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ ہے۔ پھر یہ خطّے بھی اپنی اپنی جگہ اندرونی وحدت نہیں رکھتے بلکہ مختلف اجزا سے مرکب ہیں اور ہر جز دوسرے جز کے خلاف تعصب رکھتا ہے۔ اس وقت درحقیقت ہم ایک قوم نہیں ہیں، پانچ مختلف قومیں ہیں جو مصنوعی طور پر ایک سیاسی وحدت میں منسلک ہو گئی ہیں، یعنی سندھی، بلوچی، پٹھان، پنجابی اور بنگالی۔ ان میں سے ہر ایک قوم کے اندر علیحدگی کا رُجحان شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے اور بعض نادان

؎۱ ۱۹۵۰ء میں کھوکھراپار کے راستے آنے والے مسلمانوں کی تعداد ۲،۶۴،۸۹۹ تھی، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ تعداد ۶ لاکھ تک پہنچ گئی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۷ لاکھ مسلمان زیادہ تر بہار سے مشرقی پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔ (جدید)

؎۲ مشرقی پاکستان میں نہ صرف مہاجرین، بلکہ تمام غیر بنگالی مسلمانوں کے ساتھ خود مسلمانوں نے آخرکار وہ سلوک کیا جو درندگی و سفاکی میں اُس ظلم سے بھی بازی لے گیا جو ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

گروہ اس کو شدید تر کرنے کی پیہم جدوجہد کر رہے ہیں[1]

تیسری تفریق معاشی ہے۔ امیر اور غریب، زمیندار اور کاشت کار، مزدور اور سرمایہ دار، بڑی تنخواہیں پانے والے افسر اور چھوٹے اہل کار، یہ مختلف گروہ ہیں جن کو معاشی بے انصافیوں نے ایک دوسرے سے پھاڑ دیا ہے۔ ان کے درمیان اخوت اور ہمدردی کا تعلق نہیں ہے بلکہ حسد اور بغض کا تعلق ہے۔ یہ ایک دوسرے کے رفیق اور حامی و ناصر نہیں ہیں بلکہ حریف اور مدمقابل ہیں۔ ان کی کشمکش بھی روز بروز بڑھ رہی ہے اور ہمارے اندر ایک گروہ ایسا موجود ہے جس کا مستقل فلسفہ ہی یہ ہے کہ انہیں ملا کر ایک کر دینے کا خیال باطل ہے اور حق صرف یہ ہے کہ ان کو باہم لڑا دیا جاتے[2]

سوال یہ ہے کہ یہ مختلف تفریقیں، جو ہماری قوم اور ریاست کو پارہ پارہ کر دینے پر تلی ہوئی ہیں، جن کو نشوونما دینے کے لیے گھر کے داخلی اسباب بھی موجود ہیں، اور جنہیں بھڑکانے کے لیے خارجی محرکات کی بھی کمی نہیں ہے، آخر کس طریقے سے مٹائی جا سکتی ہیں؟ طاقت کے ذریعہ سے ان کو

---

[1] تحریک پاکستان کے وقت مسلم قومیت اور مسلمانوں کی قومی وحدت کا صور جس طرح پھونکا گیا تھا اس سے یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی تھی کہ یہ مختلف نسلی، جغرافی اور لسانی عناصر ایک اسلامی قومیت میں جذب ہو گئے ہیں اور جاہلیت کی یہ تفریقیں ان کے اندر باقی نہیں رہی ہیں۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد ہی ان تفریقوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا، اور تفرقہ پردازوں نے ان جاہلیت کے تعصبات کو ابھارنے کا کام بھی شروع کر دیا۔ مگر جو لوگ گزشتہ ۲۵ سال میں پاکستان کے معاملات کو چلا رہے تھے انہوں نے ان عناصر کو ایک وحدت میں جذب کرنے کے لیے کچھ نہ کیا، بلکہ اس کے برعکس تفرقہ پردازوں کی الٹی حوصلہ افزائی کی۔ اسی کا خمیازہ ہے کہ آج مشرقی پاکستان تو ہم سے کٹ کر الگ ہی ہو چکا ہے۔ اور باقی ماندہ پاکستان میں بھی چار قومیتوں کے نعرے علانیہ لگ رہے ہیں۔ (جدید)

[2] یہ فتنہ بھی ۲۵ سال میں پل کر خوب جوان ہو چکا ہے اور اب اسلام کے ملک میں علانیہ سوشلزم کی دعوت بلند کی جا رہی ہے جو مسلم معاشرے کو طبقات میں تقسیم کر کے ان کے درمیان طبقاتی جنگ برپا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

دبا کر ریاست کی سیاسی وحدت اور اس کے امن کو برقرار رکھنا ایک حد تک ممکن ہے، مگر یہ چیز دلوں کو جوڑ کر وہ قلبی وحدت تو ہرگز پیدا نہیں کر سکتی جو ریاست کی اندرونی ترقی اور بیرونی خطرات کے مقابلہ میں اس کی متحدہ مدافعت کے لیے ضروری ہے۔ پھٹے ہوئے دل اور کھنچے ہوئے ہاتھ نہ تعمیر میں تعاون کر سکتے ہیں اور نہ مدافعت ہی میں بنیانِ مرصوص بن کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ قومیت کا پرچار بھی اس معاملہ میں بے بس ہے۔ ہندوستان میں ہم اس کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ مغربی تصوّرات کے مطابق قومیت کی تبلیغ و تلقین وہاں جتنی بڑھتی گئی، اس نے ملک کی آبادی میں وحدت پیدا کرنے کے بجائے ان تمام گروہوں میں اپنے امتیازی وجود کا احساس جگا دیا جو اپنے اندر قومیت کے عناصر رکھتے تھے۔ پھر معاشی اغراض کا تصادم تو وہ چیز ہے جس کے زہر کا تریاق فراہم کرنے میں قومیت جگہ جگہ ناکام ہوئی اور ہو رہی ہے۔ اب ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری موجودہ قیادت کے پاس اس مسئلہ کا کیا حل ہے اور وہ کہاں تک اس سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیت رکھتی ہے؟

کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ ہم اُن دوسرے مسائل کی اہمیت سے غافل ہیں جو اس وقت پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو درپیش ہیں۔ بلاشبہ وہ مالی، صنعتی، انتظامی، دفاعی اور خارجی مسائل بھی اپنی جگہ کافی اہم ہیں جن سے ہم اس مملکت کی پیدائش کے بعد دوچار ہوتے۔ کوئی نہیں کہتا کہ ان کی طرف توجہ نہ کی جاتی۔ نہ ان واقعی خدمات کا انکار کرنا قرین انصاف ہے جو اس سلسلہ میں موجودہ قیادت نے انجام دیں۔ لیکن جہاں تک ہم سمجھتے ہیں مسلمانوں کی حیات قومی کے لیے اس وقت سب سے بڑے مسئلے یہی تین ہیں جن کا ذکر ہم نے کیا ہے، اور قیادت کا اصل محکِ امتحان یہ ہے کہ وہ انہیں صحیح طور پر حل کرنے کی اہلیت، فکری اور اخلاقی حیثیت سے کہاں تک اپنے اندر رکھتی ہے۔

(ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۴۸ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کیا پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیئے؟

(پاکستان کے قائم ہوتے ہی یہ بحثیں شروع کر دی گئی تھیں کہ اس مملکت کو ایک اسلامی مملکت بنانے میں کیا مشکلات اور قباحتیں درپیش ہیں، اور اس غرض کے لیے دلائل فراہم کیے جانے لگے تھے کہ اس کو ایک لادینی ریاست ہونا چاہیئے۔ اس کا اندازہ اُس مباحثہ سے ہو سکتا ہے جو ۱۸ مئی ۱۹۴۸ء کو ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوا تھا۔ اس مباحثہ میں سائل کی حیثیت سے وجیہہ الدین صاحب بول رہے تھے اور مجیب کی حیثیت سے سید ابوالاعلیٰ مودودی)

س۔ اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے غالباً یہ جان لینا ضروری ہے کہ آپ کے ذہن میں مذہبی ریاست کا کیا تصور ہے؟

ج۔ ظاہر بات ہے کہ ایک مسلمان جب مذہب کا لفظ بولے گا تو اس کے ذہن میں اسلام ہی مراد ہو گا۔ میں جب کہتا ہوں کہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہونا چاہیئے تو اس سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے ایک اسلامی ریاست ہونا چاہیئے، یعنی ایک ایسی ریاست جو اخلاق، تہذیب، تمدن، معاشرت، قانون، سیاست اور معیشت کے اُن اصولوں پر قائم ہو جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔

س۔ آپ نے مذہبی ریاست کا جو مفہوم بیان فرمایا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ریاست کا سیاسی اقتدار ماہرینِ دینیات کے ایک مخصوص طبقے کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس طبقہ کا کام یہ ہوگا کہ وہ سیاسی اور انتظامی امور کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے تحقیق و تفتیش کرے، ریاستی قوانین وضع کرے اور شرعی احکامات کی بنا پر ہر سیاسی گتھی کو سلجھاتے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس طبقے کی پشت پناہ کون لوگ ہوں گے؟ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اقتصادی لحاظ سے ہماری سماج مختلف طبقوں میں منقسم ہے۔ ہر طبقہ اس کوشش میں ہے کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مذہبی جواز تلاش کرے اور مذہبی نعروں کو استعمال میں لاتے۔ ماہرینِ دینیات اس طبقاتی کشمکش سے بے نیاز اور غیر متعلق نہیں رہ سکتے۔ ان کے لیے لازم ہے کہ یا تو وہ عوامی طاقتوں کا ساتھ دیں، یا اپنے آپ کو سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقہ سے وابستہ کر دیں۔ اس صورت میں قرآنی اصولوں کی جو بھی تفسیر پیش کی جائے گی وہ ان کے سیاسی رجحان کی آئینہ دار ہو گی۔ مختلف سیاسی خیالات رکھنے والے مفسروں میں اہم ترین مسائل پر شدید ترین اختلاف رائے پیدا ہو جائے گا۔ اقتصادی کشمکش ایک لامتناہی فقیہانہ بحث کی صورت اختیار کرے گی۔ اور وہ مسائل جن کا مناسب حل ڈھونڈنا اس وقت اشد ضروری ہے جوں کے توں دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

جواب: جس طبقاتی کشمکش کی طرف آپ اشارہ فرما رہے ہیں وہ دراصل پیدا ہی اس لیے ہوتی ہے کہ مدتوں سے غیر اسلامی اثرات کے تحت رہتے رہتے ہمارا معاشرہ اخلاق کی اُس روح سے اور انصاف کے اُن اصولوں سے محروم ہو گیا ہے جو اسلام نے ہم کو دیئے تھے۔ جس مادہ پرستی نے دنیا کے دوسرے معاشروں کو طبقات میں تقسیم کیا اور ان کے اندر اغراض و مفاد کا تصادم پیدا کیا، وہی بدقسمتی سے اب ہمارے معاشرے کو پھاڑنے اور باہم ٹکرا دینے کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ ابھی ابھی ہم فرقہ وارانہ کشاکش کے ہولناک نتائج بھگت چکے ہیں اور اس سے لگے ہوئے زخم ابھی بھرے بھی نہیں ہیں۔ اب ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اپنے آپ کو اُن اجتماعی فلسفوں کے حوالے کر دیں جو ہمارے اندر ایک دوسری جنگ ــــ طبقاتی جنگ ــــ برپا کر دیں اور ہمیں اس وقت تک

www.iqbalkalmati.blogspot.com

امن کی صورت نہ دیکھنے دیں جب تک ہمارا کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقوں کو ملیامیٹ نہ کر دے۔ دوسری قوموں نے تو ان اجتماعی فلسفوں کو شاید اس لیے قبول کر لیا کہ ان کے پاس اخلاق اور انصاف کے وہ اصول موجود نہ تھے جو طبقاتی خودغرضیوں کے نشوونما کو روک سکتے اور مختلف عناصر کو ایک عادل برادری میں جمع کر دیتے لیکن ہم خوش قسمتی سے ایک ایسا نظامِ حیات رکھتے ہیں جو ہمیں اِس خطرے سے بچا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اندر سے اُن لوگوں کو اُبھاریں جو اسلام کی روح کو پوری طرح سمجھتے ہوں اور طبقاتی تعصبات سے بالاتر ہو کر اسلام کے قوانین کی بے لاگ تعبیر کر سکتے ہوں۔ پھر یہ لوگ بالاتفاق یا باکثریت کے ساتھ، جو تعبیر ہمارے سامنے پیش کریں اسے ہم سب مان لیں اور ہم میں سے کوئی طبقہ اپنے ہی مطلب کی تعبیر لینے پر اصرار نہ کرے۔ ایسے لوگوں کی پشت پناہی پوری قوم کو بحیثیت مجموعی کرنی چاہیئے نہ کہ کسی ایک طبقے یا چند طبقوں کو۔ ہمیں اُن کے انتخاب میں صرف اِس معیار کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ وہ بھروسے کے قابل سیرت رکھتے ہوں، اور اسلام کی صحیح تعبیر کرنے کے اہل ہوں۔

س۔ میری ناچیز رائے میں سیاسی نظام کے مرتب کرنے میں صرف خلوص اور ایمانداری ہی سے کام نہیں چل سکتا۔ ہمارے سامنے اس وقت بہت سے پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن پر سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دیا جائے یا شخصی ملکیت؟ ریاست میں ایک ہی سیاسی پارٹی ہونی چاہیئے یا ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کا ہونا جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے؟ مزدوروں کو ہڑتال کا حق ہونا چاہیئے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ آپ ان گتھیوں کو مذہبی پیشواؤں کے حوالہ کر دیجیے، آپ دیکھیں گے کہ وہ کسی فیصلہ کن نتیجے تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ریاست کی تعمیر کیلیے فقیہانہ تحقیق و تجسس اور مذہبی کتب کی چھان بین کے بجائے سیاسی تجزیئے اور تاریخی شعور کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں دینیات کے ماہروں کی بہ نسبت سیاسیات اور اقتصادیات کے ماہرین ہماری بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں۔

۲۔ آپ جب "دینیات" کا لفظ بولتے ہیں تو شاید "دُنیویات" کو اس سے خارج کر دیتے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ اسی لیے آپ کو بجا طور پر یہ اندیشہ ہوا کہ اگر ہم نے اپنے سیاسی اور معاشی مسائل کا حل اُن ماہرینِ دینیات کے حوالہ کر دیا جو دُنیویات سے ناواقف ہیں تو ہمارا کوئی مسئلہ بھی حل نہ ہو سکے گا۔ لیکن آپ ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیں کہ اگر ہم نے اپنے تمدن، اپنی سیاست اور اپنی معیشت کے مسائل اُن ماہرین کے حوالے کر دیئے جو صرف مغربی نظریات و عملیات سے واقف ہیں اور اسلامی تعلیمات سے کوئی مَس نہیں رکھتے تو ہم کہاں پہنچیں گے؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ لوگ ماہرینِ دینیات کی بہ نسبت ہماری بہتر رہنمائی کر سکیں گے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ رہنمائی ہمیں اُسی منزل پر لے جائے گی جس پر آج دنیا کی بڑی بڑی قومیں پہنچ چکی ہیں، یعنی گھر کے اندر طبقاتی خود غرضیوں کی کشاکش، اور گھر کے باہر بین الاقوامی خود غرضیوں کی کھینچ تان۔ کیا اس سے بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم اپنی قوم میں اُن لوگوں کو تلاش کریں جو دین اور دنیا، دونوں کو اچھی طرح جانتے ہوں، جن کی نگاہ قرآن و حدیث کی تعلیمات پر اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے مسائل پر یکساں ہو، اور وہ سر جوڑ کر ہماری گتھیوں کا ایسا حل پیش کریں جو ہماری زندگی کو ساری دنیا کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بنا دے؟

س۔ ریاست پاکستان کو اسلامی شریعت کے مطابق تنظیم دینے اور شرعی احکامات کے موجودہ حالات پر اطلاق کرنے میں ہمیں ایک اور مشکل بھی پیش آئے گی۔ ہم بسا اوقات مذہبی احکامات کی روح کو فراموش کر دیتے ہیں اور ان کی لفظی حیثیت ہمارے پیش نظر رہتی ہے۔ اس طرح وسائل اور مقاصد ایک دوسرے سے خلط ملط ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سُود ہی کو لیجیے۔ سُود کو ناجائز قرار دینے کا مقصد یہی تھا کہ اقتصادی استحصال کو روکا جائے۔ اسی طرح اجارہ، احتکار اور چور بازاری کی مخالفت کی گئی۔ لیکن بیرونی تجارت کو روا رکھا گیا۔ کیونکہ اُس زمانے میں سرمایہ دارانہ نظام ابھی طفولیت کی حالت میں تھا اور صنعتی سرمایہ کی طرح ظلم و استبداد کا آلہ نہ تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں۔ آج بیرونی تجارت کا مفہوم یہ ہے کہ سامراجی نظام کو تقویت دی جائے اور دوسری قوموں کو اقتصادی اور سیاسی طور پر محکوم بنایا جائے۔ جائز اور ناجائز تجارت کا فرق مٹ چکا ہے۔ لیکن ہمارے علماء بھی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اقتصادیات پر فتوے لگاتے ہیں تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ موجودہ اقتصادی نظام میں مہاجنی سود کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ غربت اور بدحالی اُس شئے کی پیداوار ہے جسے وہ جائز قرار دیتے ہیں، یعنی صنعتی سرمایہ داری اور بینکنگ۔

۲۔ یہ خرابی جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں، ہر اُس جگہ پیدا ہو جاتی ہے جہاں قانون کے منشا اور اس کی روح کو چھوڑ کر صرف اُس کے الفاظ لے لیے جاتے ہیں۔ کہیں یہ خرابی علم اور بصیرت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اور کہیں اس وجہ سے کہ لوگ اپنی اغراض کے لیے قانون کی رُوح سے بغاوت کرنا چاہتے ہیں، مگر ظاہرداری کو قائم رکھنے کے لیے قانون کی شکل بدلنے سے احتراز کرتے ہیں۔ ہمیں اس خرابی سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ عام مسلمانوں میں اسلام کا شعور اور اس کی واقعی پیروی کا ارادہ موجود ہو۔ یہ چیز جب موجود ہو گی تو وہ اسلامی قوانین کی تعبیر کے لیے اپنے اندر سے انہی لوگوں کو منتخب کریں گے جو قرآن و سنّت کے محض الفاظ ہی نہ جانتے ہوں بلکہ ان کی روح کو بھی سمجھتے ہوں۔

۳۔ شریعت کے مفسرین اور شارحین میں سیاسی اختلافات کے علاوہ جو خالصتہً مذہبی اختلافات ہیں، ان کے بارے میں آپ کا خیال ہے؟ کیا آپ کی نظر میں یہ اختلافات مستقبل کے سیاسی اور سماجی نظام کا تصور قائم کرنے میں رکاوٹ نہ ڈالیں گے؟

۴۔ ان اختلافات کی نوعیت وہی کچھ ہے جو ہمارے دوسرے اختلافات کی ہے اور انہیں بھی ہم اسی طرح حل کر سکتے ہیں جس طرح دوسرے اختلافات کو حل کیا کرتے ہیں۔ کوئی معاشرہ جو انسانوں پر مشتمل ہو، ایسا نہیں ہو سکتا جس میں زندگی کے مختلف مسائل سے متعلق مختلف نظریے نہ پائے جاتے ہوں۔ لیکن ان اختلافات کو کہیں بھی ایسی رکاوٹ بننے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زندگی کی گاڑی کو آگے چلنے ہی نہ دیں۔ اختلافات کو حل کرنے کا جمہوری طریقہ یہ ہے کہ ریاست کا نظام اُس نقطۂ نظر کے مطابق چلایا جائے جس کو اکثریت قبول کرتی ہو، اور قلیل التعداد گروہوں کے نقطۂ نظر کی زیادہ سے زیادہ اُتنی رعایت کی جائے جس کی اصول میں گنجائش ہو، نیز اقلیت کی حیثیت سے ان کے حقوق کا منصفانہ تحفظ کر دیا جائے۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان کی ریاست اسلام

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے ان وسیع ترین اصولوں پر قائم ہو جن پر مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اتفاق پایا جاتا ہے۔ تاہم کچھ ایسے گروہ باقی رہ سکتے ہیں جو اُن وسیع ترین اصولوں میں بھی اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں۔ اس صورت میں ہم کو وہی جمہوری طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ ورنہ یہ بالکل ایک عجیب بات ہوگی کہ ہم سب غیر اسلام پر اس لیے اتفاق کر لیں کہ اسلام پر ہم متفق نہ ہو سکے۔

س۔ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے علاوہ ریاست پاکستان میں اقلیتوں کا مسئلہ بھی قابلِ غور ہے۔ آپ کس طرح اُن کو اس بات پر راضی کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی ریاست کا قیام گوارا کر لیں اور اس کے وفادار رہیں؟

۳۔ اس گتھی کا حل بھی وہی ہے جو مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کا ہے۔ جمہوری طریقہ پر ایک ملک کا نظام اُنہی اصولوں کے مطابق بنتا اور چلتا ہے جو اکثریت کی رائے میں صحیح ہوں۔ اقلیت یہ مطالبہ ضرور کر سکتی ہے کہ اُس کے نقطۂ نظر پر بھی غور کیا جائے، نیز یہ کہ اس کے حقوقِ شہریت اور اس کے پرسنل لا کو محفوظ رکھا جائے۔ لیکن از روئے انصاف وہ یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ اکثریت اس کی خاطر اپنی رائے بدل دے۔ اس ملک کی اکثریت ایمانداری کے ساتھ یہ رائے رکھتی ہے کہ اسلام کے اصولوں کی پیروی میں پاکستان کے باشندوں کی فلاح ہے۔ اُس کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ ملک کا نظام اُس کی اس رائے کے مطابق بنے۔ اقلیت اس سے اپنے حقوق کا تحفظ مانگ سکتی ہے، مگر یہ کہنے کا اسے حق نہیں ہے کہ اکثریت اسلام کے بجائے کچھ دوسرے اصولوں میں اپنی فلاح تلاش کرے۔ رہا وفاداری کا سوال، تو حقیقت یہ ہے کہ وفاداری کا تعلق کسی ریاست کے مذہبی یا غیر مذہبی ہونے سے نہیں ہے، بلکہ وہ اُس انصاف، شرافت اور فیاضی پر منحصر ہے جو اکثریت کی طرف سے اقلیت کے ساتھ برتی جاتی ہے۔ آپ اقلیت کو محض اس ریاکاری سے مطمئن نہیں کر سکتے کہ دیکھو ہم نے تمہاری خاطر اپنے مذہب کو چھوڑ دیا اور ایک غیر مذہبی ریاست بنالی۔ اقلیت تو یہ دیکھے گی کہ آپ اُس کے ساتھ انصاف کرتے ہیں یا نہیں؟ آپ کا برتاؤ تعصب اور تنگ دلی پر مبنی ہے یا رواداری اور فیاضی پر؟ یہی تجربہ دراصل فیصلہ کریگا کہ اقلیت کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس ریاست میں وفادار بن کر رہنا ہے یا بیزار بن کر۔

س۔ میری رائے میں ہر ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کے رسم و رواج، اخلاق، عادات و خصائل اور اعتقادات و توہمات کا پرتو ہوتا ہے۔ ریاستی نظام بجائے خود کسی فلسفے یا مذہب کا حامل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسے ایسا بنانے کی کوشش کی جائے تو وہ ایک مصنوعی اور عارضی کوشش ہو گی۔ قدیم یونان کی شہری ریاست افلاطون کے تخیل کی پیداوار نہیں تھی بلکہ اس انداز فکر اور فلسفہ زندگی کی پیداوار تھی جو یونان کے باشندوں میں مشترک تھا۔ اسی طرح اگر ہم اسلامی ریاست کی تعمیر چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ پاکستان کے باشندوں میں صحیح اسلامی اسپرٹ پیدا کریں اور انہیں دین کی اصل اقدار سے روشناس کرائیں۔ جب یہ اقدار مضبوط ہو جائیں گی اور ہمارے قومی کیریکٹر میں اسلامی تصورات پوری طرح سرایت کر جائیں گے، اس وقت ہمارا سیاسی نظام خود بخود اسلامی رنگ اختیار کرے گا۔ ہم اس وقت تک اسلامی ریاست کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے جب تک ہماری روحانی، شخصی اور سماجی زندگی میں اسلامی روایات پوری تابندگی سے جلوہ گر نہ ہوں۔ میری نظر میں وہ وقت ابھی بہت دور ہے جب ہم مکمل طور پر اسلامی تصورات کو قبول کر لیں گے۔ اس لیے اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی تمام کوششیں پیش از وقت ہیں۔ ہماری بنیادیں ابھی اتنی استوار نہیں ہیں کہ ہم ان پر ایک عمارت کھڑی کر سکیں۔

ج۔ آپ نے صحیح فرمایا کہ ایک ملک کا سیاسی نظام اس کے باشندوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا پرتو ہوا کرتا ہے۔ اب اگر پاکستان کے باشندے اسلام کی طرف ایک پُرزور میلان رکھتے ہیں اور ان کے اندر اسلام کے راستے پر آگے بڑھنے کی خواہش موجود ہے تو کیوں نہ اُن کی قومی ریاست اُن کے اس میلان اور اس خواہش کا پرتو ہو؟ آپ کا یہ ارشاد بھی بالکل درست ہے کہ اگر ہم پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں پاکستان کے باشندوں میں اسلامی شعور، اسلامی ذہنیت، اور اسلامی اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مگر میں نہیں سمجھا کہ اس کوشش میں حصہ لینے سے آپ خود ریاست کو کیوں مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں؟ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کی صورت حال تو یہ تھی کہ ہمارے اوپر ایک غیر مسلم اقتدار مسلط تھا، اس وجہ سے ہم اسلامی

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خطوط پر اپنی ملت کی تعمیر میں ریاست اور اُس کی طاقتوں اور اُس کے ذرائع سے کوئی مدد نہیں پارہے تھے، بلکہ درحقیقت اُس وقت ریاست کا پورا ادارہ اپنے زور سے ہمیں ایک دوسری طرف کھینچے لیے جارہا تھا اور ہم انتہائی ناسازگار حالت میں اسلامی زندگی کی تعمیر کے لیے جدّوجہد کر رہے تھے۔ اب جو سیاسی انقلاب ۱۵ اگست، ۴۷ء کو رونما ہوا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اب ہماری قومی ریاست اسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصہ لے گی جو ایک معمار کا حصہ ہوتا ہے؟ یا وہ طرزِ عمل اختیار کرے گی جو ایک بے نیاز غیر جانبدار کا ہوا کرتا ہے؟ یا اب بھی وہی پچھلی صورتِ حال برقرار رہے گی کہ ہمیں حکومت کی مدد کے بغیر ہی نہیں بلکہ اُس کی مزاحمت کے باوجود اسلامی زندگی کی تعمیر کا کام کرنا ہوگا؟ اس وقت چونکہ پاکستان کا آئندہ نظام زیرِ تشکیل ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ریاست بن جائے جو اسلامی زندگی کی معمار بن سکے۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری ہو گئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔ پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا جائے گا اسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائے گی۔

(ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۴۸ء۔ بشکریہ ریڈیو پاکستان)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاکستان میں اسلامی قانون کیوں نہیں نافذ ہو سکتا؟

ایک تقریر جو ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو لا کالج لاہور میں کی گئی تھی

(قیام پاکستان کے بعد ہی وہ عذرات پیش کرنے شروع کر دیئے گئے تھے جو کچھ لوگوں کے نزدیک، یہاں اسلامی قانون نافذ کرنے میں مانع تھے۔ اس تقریر میں انہی عذرات کا جواب دیا گیا ہے)

آج کل کسی ملک میں ـــــ غیر مسلموں کے نہیں مسلمانوں کے اپنے ملک میں ـــــ اگر اسلامی قانون کے جاری کرنے کا سوال اٹھایا جاتے تو اعتراضات کی ایک بوچھاڑ ہوتی ہے جس سے آدمی کو سابقہ پیش آتا ہے۔ کیا صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی سوسائٹی اور اسٹیٹ کی ضرورت کے لیے کافی ہو سکتا ہے؟ کیا ایک خاص زمانے کے قانون کو ہمیشہ کے لیے قابلِ عمل سمجھنا حماقت نہیں ہے؟ کیا اس مہذب دور میں ہاتھ کاٹنے اور کوڑے برسانے کی وحشیانہ سزائیں دی جائیں گی؟ کیا ہماری منڈیوں میں اب پھر غلام بکا کریں گے؟ اور آخر اس ملک میں مسلمانوں کے کس فرقہ کی فقہ جاری ہو گی؟ پھر جو غیر مسلم یہاں رہتے ہیں وہ کیسے راضی ہو جائیں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون اُن پر مسلط کر دیا جائے؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جو تابڑ توڑ برسنے شروع ہوتے ہیں اور یہ بات غیر مسلموں کی زبان سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان سے ادا ہوتی ہے[1]

[1] واضح رہے کہ پاکستان بننے سے پہلے یہی طبقہ ان سوالات کے بارے میں خاموش تھا اور (باقی صفحہ ۳۲۶ پر)

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان لوگوں کو اسلام سے کوئی دشمنی ہے۔ دراصل اس کی وجہ ناواقفیت ہے۔ آدمی کا خاصہ ہے کہ وہ جس چیز کو نہیں جانتا اس کا نام سُن کر طرح طرح کے وسوسے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور دُوری کی شناسائی اُنسیت کے بجائے اکثر وحشت ہی بڑھاتی ہے۔

ہماری بدقسمتی کی طویل داستان کا ایک نہایت افسوس ناک باب یہ بھی ہے کہ آج محض اغیار ہی نہیں، ہماری اپنی ملت کے لوگ بھی اکثر اپنے دین سے اور اپنے اسلاف کے چھوڑے ہوئے عظیم الشان ترکہ سے نابلد اور متوحش ہیں۔ اِس حالت کو ہم اچانک نہیں پہنچ گئے ہیں بلکہ صدیوں کے مسلسل انحطاط نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے۔ پہلے مدتہائے دراز تک ہمارے ہاں تہذیب و تمدن کا ارتقاء اور علوم و فنون کا نشوونما معطل رہا۔ پھر جمود کے نتیجے میں ہم پر سیاسی زوال آیا اور دنیا کی مسلمان قومیں یا تو براہِ راست غیر مسلم حکومتوں کی غلام ہو گئیں یا ان میں سے بعض کو کچھ آزادی حاصل بھی رہی تو وہ غلامی سے کم نہ تھی، کیونکہ شکست خوردگی کا اثر ان کے قلب و رُوح کی گہرائیوں تک اُتر چکا تھا۔ آخر جب ہم نے اُٹھنا چاہا تو ہر جگہ کے مسلمانوں کو، خواہ وہ غلام تھے یا آزاد، اُٹھنے کی ایک ہی صورت نظر آئی اور وہ یہ تھی کہ جدید تہذیب و تمدن اور جدید علوم کا سہارا لے کر اُٹھیں۔ ہمارے دینی علوم کے حامل جو طبقے تھے وہ خود اُسی انحطاط میں مبتلا تھے جس میں ساری اُمت مبتلا تھی۔ دینی بنیادوں پر کوئی زندگی بخش اور انقلاب انگیز حرکت برپا کرنا ان کے بس میں نہ تھا۔ ان کی رہنمائی سے مایوس ہو کر اُمت کے بے چین طبقے دنیا کے اُس نظامِ زندگی کی طرف متوجہ ہو گئے جو صریحاً کامیاب نظر آ رہا تھا۔ اُسی سے اُنہوں نے اصول لیے، اُسی کے علوم سیکھے، اُسی کے تمدنی اداروں کا نقشہ حاصل کیا، اور اُسی کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔ رفتہ رفتہ اہلِ دین کا گروہ بالکل گوشۂ خمول میں پھینک دیا گیا اور تمام مسلمان قوموں میں کارفرمائی کی باگیں اور کار کن طاقتیں انہی لوگوں کے ہاتھ میں آ گئیں جو دین سے ناواقف اور تہذیبِ جدید کے فکری و عملی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دو کو چھوڑ کر تمام آزاد مسلم ممالک کی حکومتیں مغرب کی بے دین ریاستوں (Secular States) کے نمونے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۵ سے) مسلمانوں کو یقین دلا رہا تھا کہ ہمیں خود اپنے نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے ایک الگ خطۂ زمین درکار ہے۔ مگر وہ خطہ فراہم ہوتے ہی یہ سوالات اُٹھائے جانے لگے۔ (جدید)

پربن گئیں جن میں کہیں تو پوری اسلامی شریعت منسوخ ہو چکی ہے اور کہیں غیر دینی حکومت کے نظام میں مسلمانوں کے لیے محض ان کا پرسنل لا اسلامی رہنے دیا گیا ہے، یعنی مسلمانوں کی اپنی حکومت میں اُن کو صرف وہ مذہبی حقوق عطا ہوتے ہیں جو اسلامی حکومتوں میں کبھی ذمیوں کو دیئے جاتے تھے۔ له اسی طرح جو ممالک غلام تھے ان میں بھی تمام تہذیبی اداروں اور سیاسی تحریکوں کے کارفرما اسی

له اسلامی شریعت کی تنسیخ کا سلسلہ سب سے پہلے ہندوستان میں شروع ہوا۔ یہاں انگریزی تسلط کے بعد بھی ایک مدت تک شریعت ہی کو قانون کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ ۱۹۱ء تک اس ملک میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا رہا۔ مگر اس کے بعد انگریزی حکومت نے بتدریج اسلامی قوانین کو دوسرے قوانین سے بدلنا شروع کیا یہاں تک کہ انیسویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے پوری شریعت منسوخ ہو گئی اور اس کا صرف وہ حصہ مسلمانوں کے پرسنل لا کی حیثیت سے باقی رہنے دیا گیا جو نکاح و طلاق وغیرہ مسائل سے متعلق تھا۔ پھر اسی نقشِ قدم پر خود وہ ممالک بھی چل پڑے جن میں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں قائم تھیں۔ ہندوستان کی تمام مسلمان ریاستوں نے رفتہ رفتہ اپنے پبلک لا کو برطانوی ہند کے نمونے پر ڈھال لیا اور شریعت کو صرف پرسنل لا تک محدود کر دیا۔ مصری حکومت نے ۱۸۸۳ء میں اپنے پورے قانونی نظام کو فرنچ کوڈ کے مطابق بدل لیا اور محض نکاح و طلاق اور وراثت وغیرہ کے مسائل قاضیوں کے دائرۂ اختیار میں چھوڑ دیئے۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں البانیا اور ٹرکی نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ انہوں نے صاف صاف اعلان کیا کہ ان کی حکومتیں بے دین حکومتیں ہیں، اور صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ اپنے ملکی قوانین اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور جرمنی کے نمونوں پر ڈھال لیے، بلکہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں وہ کھلی کھلی تحریفات کر ڈالیں جن کی جرأت کوئی غیر مسلم حکومت بھی نہ کر سکی تھی۔ چنانچہ البانیہ میں تعددِ ازدواج کو قانوناً ممنوع ٹھیرایا گیا، اور ٹرکی میں نکاح، طلاق اور وراثت کے متعلق قرآن کے صریح احکام تک تبدیل کر ڈالے گئے۔ اب صرف افغانستان اور سعودی عرب دو ہی ملک دنیا میں ایسے رہ گئے ہیں جہاں شریعت کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل ہے، اگرچہ شریعت کی رُوح وہاں سے بھی غائب ہے۔

(قدیم)

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

قسم کے لوگ بنے، اور آزادی کی طرف ان کا جو قدم بھی بڑھا اُسی منزل کی طرف بڑھا جس پر دوسری آزاد قومیں پہنچی ہوتی تھیں۔ اب اگر ان لوگوں سے اسلامی قانون اور اسلامی دستور کے نفاذ کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ بیچارے مجبور ہیں کہ اسے ٹالیں یا دبا دیں، کیونکہ وہ اُس چیز کی ابجد تک سے ناواقف ہیں جس کے قیام و نفاذ کا ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جو تعلیم اور ذہنی و عملی تربیت انہوں نے پائی ہے وہ انہیں اسلامی قانون کی رُوح و مزاج سے اِتنی دُور لے جا چکی ہے کہ اُس کو سمجھنا اُن کے لیے آسان نہیں رہا ہے۔ اور حاملانِ دین کی رہنمائی میں دینی تعلیم کا جو نظام چل رہا ہے وہ اس وقت تک بیسویں صدی کے لیے بارہویں صدی کے مردانِ کار تیار کرنے میں مشغول ہے۔ اس لیے کوئی ایسا گروہ بھی موجود نہیں ہے جو زُ الگردانِ مغرب کو ہٹا کر اسلامی آئین و قانون کے مطابق ایک جدید ریاست کا نظام بنا اور چلا سکے۔

یہ واقعی ایک سخت پیچیدگی ہے جس نے تمام مسلم ممالک میں اسلامی قانون و دستور کے نفاذ کو مشکل بنا رکھا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ دوسرے مسلمان ملکوں سے بالکل مختلف ہے۔ ہم اس برِ عظیم ہند میں پچھلے دس سال سے اس بات پر لڑتے رہے ہیں کہ ہم اپنی مستقل تہذیب، الگ نظریۂ زندگی اور مخصوص آئینِ حیات رکھتے ہیں، ہمارے لیے مسلم و غیر مسلم کی ایک ایسی متحدہ قومیت ناقابلِ قبول ہے جس کا نظامِ زندگی لامحالہ ہمارے آئینِ حیات سے مختلف ہوگا، ہمیں ایک الگ خطۂ زمین درکار ہے جس میں ہم اپنے آئین پر زندگی کا نظام بنا اور چلا سکیں۔ ایک طویل اور اَنتھک کشمکش کے بعد بالآخر ہمیں وہ خطۂ زمین مل گیا ہے جس کا ہم مطالبہ کر رہے تھے۔ اور اُس کی قیمت میں ہم کو لاکھوں مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو دینی پڑی ہے۔ یہ سب کچھ ہو چکنے کے بعد اگر ہم نے یہاں اپنا وہ آئینِ حیات ہی نافذ نہ کیا جس کے لیے اتنے پاپڑ بیل کر اور اتنی بھاری قیمت ادا کر کے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا ہے تو ہم سے بڑھ کر زیاں کار کوئی نہ ہوگا۔ اسلامی دستور کے بجائے جمہوری لادینی دستور، اور اسلامی قانون کی جگہ تعزیراتِ ہند اور ضابطۂ دیوانی ہی جاری کرنا تھا تو آخر ہندستان کیا بُرا تھا کہ اتنے لڑائی جھگڑوں سے یہ پاکستان لیا جاتا؟ اور اگر ہمارا مقصد اشتراکی پروگرام نافذ کرنا تھا تو یہ "کارِ خیر" بھی ہندوستان کی سوشلسٹ یا کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر انجام دیا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے بھی کوئی ضرورت نہ تھی کہ خواہ مخواہ اِتنی جانفشانی اور اِتنی بڑی قیمت پر پاکستان حاصل کرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی حمایت کی جاتی۔ دراصل ہم ایک قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو خدا اور خلق اور تاریخ کے سامنے آئین اسلامی کے نفاذ کے لیے پابند کر چکے ہیں۔ ہمارے لیے اب اپنے قول سے پھرنا ممکن نہیں رہا ہے۔ لہٰذا چاہے دوسری مسلمان قومیں کچھ کرتی رہیں، ہمیں بہرحال اُن ساری پیچیدگیوں کو حل کرنا ہی پڑیگا جو اس کام کی راہ میں حائل ہیں۔

جہاں تک اسلامی قانون کے نفاذ کی عملی مشکلات کا تعلق ہے اُن سب کو دُور کرنے کی تدبیریں کی جاسکتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اصلی مشکل نہیں ہے۔ اصلی مشکل صرف یہ ہے کہ وہ دماغ جن کی فکر و محنت اس کام کے لیے درکار ہے، بجائے خود مطمئن نہیں ہیں۔ اور اُن کے عدم اطمینان کی وجہ اُن کی عدم واقفیت ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جو کام کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ انہیں واضح طریقہ پر یہ بتایا جائے کہ اسلامی قانون کس چیز کا نام ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے۔ اُس کا مقصد، اس کے اُصول، اس کی رُوح اور اس کا مزاج کیا ہے۔ اُس میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ اور اُس میں کون سی چیز ابد تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طرح ہر دَور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضرورتوں کو پُورا کر سکتی ہے۔ اُس کے احکام کن مصالح پر مبنی ہیں اور اُن غلط فہمیوں کی کیا اصلیت ہے جو اُن احکام کے متعلق ناواقف لوگوں میں پھیل ہوئی ہیں۔ اگر یہ تفہیم صحیح طریقہ پر ہو جائے تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے بہترین کارفرما اور کارکن دماغ مطمئن ہو جائیں گے اور اُن کا اطمینان اُن ساری تدبیروں کا دروازہ کھول دے گا جو اسلامی قانون کے نفاذ کو عملاً ممکن بنا سکتی ہیں۔

میری آج کی تقریر اسی تعارف کے لیے ہے۔

قانون اور نظامِ زندگی کا باہمی تعلق

قانون کے لفظ سے ہم جس چیز کو تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل اس سوال کا جواب ہے کہ انسانی طرزِ عمل، انفرادی اور اجتماعی طور پر کیا ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا دائرہ اُس دائرہ سے بہت وسیع ہے جس میں قانون اس کا جواب دیتا ہے۔ ہم کو بہت وسیع پیمانے پر اس "کیا ہونا چاہیئے" کے سوال سے سابقہ پیش آتا ہے اور اس کے بے شمار جوابات ہیں جو مختلف عنوانات کے تحت مرتب ہوتے ہیں۔ اُن کا ایک مجموعہ ہماری اخلاقی تعلیم و تربیت میں شامل

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہوتا ہے اور اسی کے مطابق ہم اپنے افراد کی سیرت و کردار کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کا ایک دوسرا مجموعہ ہمارے معاشرتی نظام میں داخل ہوتا ہے اور اُسی کے لحاظ سے ہم اپنی معاشرت میں مختلف قسم کے انسانی تعلقات کو منضبط کرتے ہیں۔ اُن کا ایک تیسرا مجموعہ ہمارے معاشی نظام میں جگہ پاتا ہے اور اسی کی روشنی میں ہم دولت اور اس کی پیدائش اور اس کی تقسیم اور اس کے تبادلہ اور اس پر لوگوں کے حقوق کا ضابطہ بناتے ہیں۔ غرض اسی طریقہ پر ان جوابات کے بہت سے مجموعے بن جاتے ہیں جو ہماری زندگی کے مختلف شعبوں کی شکل اور ان کے ضوابطِ عمل معین کرتے ہیں۔ اور قانون اُن بہت سے مجموعوں میں سے صرف اُن جوابات پر مشتمل ہوتا ہے جن کو نافذ کرنے کے لیے سیاسی اقتدار استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی قانون کو سمجھنا چاہے تو یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کو صرف اُسی دائرے تک محدود رکھے جس میں قانون نے اس "ہونا چاہیے" کے سوال کا جواب دیا ہے، بلکہ اسے سوسائٹی کی اُس پوری اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی جس میں زندگی کے ہر شعبے کے متعلق اس سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ قانون اُسی اسکیم کا ایک جُز ہے اور اس جُز کے مزاج کو سمجھنا یا اس کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ کُل کو سمجھا جائے۔

نظامِ زندگی کی فکری اور اخلاقی بنیادیں

پھر زندگی کے پورے دائرے میں "کیا ہونا چاہیے" کے سوال کا جو جواب ہم دیتے ہیں وہ دراصل ایک دوسرے سوال یعنی "کیوں ہونا چاہیے" کے جواب سے ماخوذ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ "کیا ہونا چاہیے" کے متعلق ہمارے تمام جوابات دراصل اُن نظریات پر مبنی ہوتے ہیں جو ہم نے انسانی زندگی اور اُس کے خیر و شر اور اس کے حق و باطل اور صحیح و غلط کے بارے میں قائم یا اختیار کیے ہیں، اور اُن نظریات کی نوعیت متعین کرنے میں اُس ماخذ یا اُن ماخذ کا بہت بڑا دخل، بلکہ اصلی فیصلہ کُن اثر ہوتا ہے جہاں سے ہم نے اُن نظریات کو اخذ کیا ہے۔ دنیا میں مختلف انسانی گروہوں کے قوانین کا اختلاف اسی وجہ سے ہے کہ انسانی زندگی کے متعلق ان کے نظریات ایک ماخذ سے لیے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان کے ماخذ ایک دوسرے سے مختلف

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہیں۔ اِس اختلاف کے باعث اُن کے نظریئے مختلف ہوتے۔ اُن کے اختلاف نے زندگی کی اسکیمیں مختلف کر دیں، اور پھر اُن اسکیموں کے جو حصّے قانون سے متعلق ہیں وہ بھی لازماً مختلف ہو کر رہے۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم زندگی کی کسی خاص اسکیم کے بنیادی نظریات اور اُن کے ماخذ اور اُن سے وجود میں آنے والے پورے نظامِ حیات کو سمجھے بغیر صرف اس کے قانونی حصّہ کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں اور وہ بھی اُس قانونی حصّہ کا تفصیلی مطالعہ کر کے نہیں بلکہ اُس کے بعض پہلوؤں کے بارے میں چند اُڑتی ہوئی خبریں سُن کر!

میں یہاں تقابلی مطالعے (Comparative Study) کا ارادہ نہیں رکھتا، اگرچہ بات پوری طرح تو اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب مغربی نظامِ زندگی کو، جس کا قانون آپ پڑھتے اور اپنے ملک میں جاری کرتے ہیں، اسلامی نظامِ زندگی کے بالمقابل رکھ کر دیکھا جائے کہ اُن کے درمیان کیا اختلاف ہے اور اس اختلاف نے کیوں ان کے قوانین کو مختلف کر دیا ہے۔ لیکن اس بحث سے گفتگو بہت طویل ہو جائے گی، اس لیے میں صرف اِسلامی نظامِ زندگی کی تشریح پر اکتفا کروں گا۔

اِسلامی نظامِ زندگی کا ماخذ

اسلام جس نظامِ زندگی کا نام ہے اس کا ماخذ ایک کتاب ہے جس کے مختلف ایڈیشن قدیم ترین زمانے سے توراۃ، انجیل، زبور وغیرہ بہت سے ناموں کے ساتھ دنیا میں شائع ہوتے رہے اور آخری ایڈیشن قرآن کے نام سے انسانیت کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس کتاب کا اصل نام اسلام کی اصطلاح میں "الکتاب" (The Book) ہے اور یہ دوسرے نام دراصل اُس کے ایڈیشنوں کے نام ہیں۔ اس کا دوسرا ماخذ وہ لوگ ہیں جو مختلف زمانوں میں اس الکتاب کو لے کر آئے اور جنہوں نے اپنے قول اور عمل سے اس کے منشا کی ترجمانی کی۔ یہ لوگ اگرچہ الگ الگ اشخاص ہونے کی حیثیت سے نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ (علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین) وغیرہ ناموں سے موسوم ہیں لیکن اس بنا پر کہ یہ ایک ہی گروہ کے اشخاص ہیں جو ایک ہی مشن لے کر اُٹھے تھے، ان سب کو ایک جامع نام "الرسول" سے موسوم کرنا بالکل صحیح ہے۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اسلام کا نظریۂ زندگی

اس "الکتاب" اور "الرسول" نے زندگی کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات جو تمہیں صریحاً ایک زبردست نظام میں جکڑی ہوتی اور ایک مقررہ قانون پر چلتی ہوئی نظر آرہی ہے، دراصل ایک خدا کی حکومت ہے۔ خدا ہی اس کا خالق ہے، وہی اس کا مالک ہے، اور وہی اس کا فرمانروا ہے۔ یہ زمین جس پر تم رہتے ہو، اس کی بے پایاں سلطنت کے لاتعداد صوبوں میں سے ایک چھوٹا سا صوبہ ہے اور یہ صوبہ بھی مرکزی اقتدار کی اُس گرفت میں پوری طرح جکڑا ہوا ہے جس میں اس جہانِ ہست و بود کا ہر حصہ جکڑا ہوا ہے۔ تم اس صوبے میں خدا کی پیدائشی رعیت (Born Subjects) ہو۔ تم اپنے خالق آپ نہیں ہو بلکہ اُس کی مخلوق ہو۔ اپنے پروردگار آپ نہیں ہو بلکہ اُس کے پروردہ ہو۔ اپنے بل پر آپ نہیں جی رہے ہو بلکہ اُس کے جلائے جی رہے ہو۔ اس لیے تمہارے ذہن میں اپنی خود مختاری کا اگر کوئی زعم ہے تو وہ ایک غلط فہمی اور نظر کے ایک دھوکے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے حصے میں تو تم صریح طور پر رعیت ہو اور اپنی محکومی کو خود جانتے ہو۔ اپنی ماؤں کے پیٹوں میں استقرارِ حمل سے لے کر اپنی موت کی آخری ساعت تک تم خدا کے قانونِ طبعی (Law of Nature) سے اس طرح بندھے ہوئے ہو کہ ایک سانس تک اس کے خلاف نہیں لے سکتے، اور تمہارے اُوپر فطرت کی قوتیں اور قوانین اس طرح حاوی ہیں کہ تم جو کچھ کر سکتے ہو اُن کے تحت رہ کر ہی کر سکتے ہو، ایک لمحے کے لیے بھی تمہارا اُن سے آزاد ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ اب رہ گیا تمہاری زندگی کا اختیاری حصہ جس میں تم اپنے اندر ارادے کی آزادی محسوس کرتے ہو اور اپنی پسند کے مطابق انفرادی و اجتماعی عمل کی راہیں انتخاب کرنے کی طاقت پاتے ہو، تو بلاشبہ تمہیں اس حد تک آزادی حاصل ہے، مگر یہ آزادی تمہیں فرمانروائے کائنات کی رعیت ہونے سے خارج نہیں کر دیتی بلکہ صرف یہ اختیار دیتی ہے کہ چاہو تو اطاعت کا رویہ اختیار کرو جو پیدائشی رعیت ہونے کی حیثیت سے تمہیں اختیار کرنا چاہیے، اور چاہو تو خود مختاری و بغاوت کا رویہ اختیار کرو جو اپنی فطری حقیقت کے اعتبار سے تمہیں نہ اختیار کرنا چاہیے۔

حق کا بنیادی تصور

یہاں سے حق کا سوال پیدا ہوتا ہے اور یہ اوّلین بنیادی حق کا سوال ہے جو تمام چھوٹے

سے چھوٹے جزوی معاملات تک حق اور باطل کے فیصلے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقت کا جو نظریہ "الکتاب" اور "الرسول" نے پیش کیا ہے اس کو بطور ایک امر واقعہ کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ بات صریح طور پر حق قرار پاجاتی ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے اختیاری حصے میں بھی اُسی خدا کی حاکمیت (Sovereignty) تسلیم کرے جو اُس کی زندگی کے پورے غیر اختیاری حصے کا اور اُس تمام کائنات کا جس میں یہ زندگی بسر ہو رہی ہے، آپ سے آپ حاکم (Sovereign) ہے۔ یہ چیز کئی وجوہ سے حق ہے۔ یہ اس لیے بھی حق ہے کہ انسان جن قوتوں اور جن جسمانی آلات سے اپنے اختیارات کو استعمال کرتا ہے وہ خدا کا عطیہ ہیں۔ اِس لیے بھی حق ہے کہ خود یہ اختیارات انسان کے اپنے حاصل کردہ نہیں ہیں بلکہ تفویض کردہ (Delegated) ہیں۔ اس لیے بھی حق ہے کہ جن چیزوں پر یہ اختیارات استعمال کیے جاتے ہیں وہ سب خدا کی مِلک ہیں۔ اس لیے بھی حق ہے کہ جس مُلک میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ خدا کا مُلک ہے۔ اور اس لیے بھی حق ہے کہ عالم کائنات اور حیاتِ انسانی کی ہمواری و موافقت (Harmony) کا تقاضا یہی ہے کہ ہماری زندگی کے اختیاری اور غیر اختیاری، دونوں حصوں کا حاکم اور سرچشمۂ احکام ایک ہی ہو۔ اِن دو حصوں کے دو الگ اور ایک دوسرے سے مختلف قبلے بن جانے سے ایسا تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو موجبِ فساد ہو کر رہتا ہے۔ ایک شخص کی زندگی میں تو اِس چیز کا فساد محدود پیمانے پر ہی ظاہر ہوتا ہے، مگر بڑی بڑی قوموں کی زندگی میں اس کے بُرے نتائج اتنے بڑے پیمانے پر نکلتے ہیں کہ خشکی اور تری اور فساد سے بھر جاتی ہے۔

"اِسلام" اور "مُسلم" کے معنی

"الکتاب" اور "الرسول" انسان کے سامنے اِسی حق کو پیش کرتے ہیں اور اُس کو دعوت دیتے ہیں کہ کسی دباؤ کے بغیر وہ اپنی خوشی سے اِس کو قبول کر لے۔ چونکہ یہ انسانی زندگی کے اُس حصے کا معاملہ ہے جس میں خدا نے اِنسان کو خود ہی اختیار دیا ہے اس لیے یہ بات کہ انسان اس حصے میں خدا کو اپنا حاکم مانے، کسی دباؤ سے نہیں منوائی جاتی بلکہ برضا و رغبت تسلیم کرائی جاتی ہے۔ جس کا اطمینان بھی اُس بیانِ واقعہ (Statement of Fact) پر ہو جاتا ہے جو "الکتاب" اور "الرسول" نے کائنات کی حقیقت کے متعلق دیا ہے، اور جس کا ضمیر بھی اِس امر کی گواہی دے کہ اِس

www.iqbalkalmati.blogspot.com

واقعی حقیقت کی موجودگی میں حق وہی ہے جو منطقی نتیجہ کے طور پر اس سے نکلتا ہے، وہ اپنی مرضی سے اپنی آزادی و خود مختاری خدا کی حاکمیت کے آگے تسلیم (Surrender) کر دے۔ اسی تسلیم کا نام "اسلام" ہے۔ اور جو لوگ تسلیم کا یہ فعل کریں وہ "مسلم" کہلاتے ہیں، یعنی ایسے لوگ جنہوں نے خدا کی حاکمیت مان لی، اپنی خود مختاری سے اس کے حق میں دست بردار ہو گئے، اور اس بات کو انہوں نے خود اپنے اوپر لازم کر لیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے۔

مسلم سوسائٹی کی حقیقت

اب ایسے تمام لوگ جنہوں نے تسلیم کا یہ فعل کیا ہو ایک وحدت میں منسلک کیے جاتے ہیں اور ان کے اجتماع سے "مسلم" سوسائٹی کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی اُن سوسائٹیوں سے بالکل مختلف ہے جو اتفاقی حوادث کے نتیجہ میں بنتی ہیں[1]۔ اس کی تشکیل ایک ارادی فعل سے ہوتی ہے، اور اس کی تنظیم ایک ایسے معاہدے (Contract) کے ذریعہ سے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان شعوری طور پر قائم ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں بندے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ان کا حاکم ہے، اُسی کی ہدایت اُن کے لیے دستورِ زندگی ہے، اُسی کے احکام اُن کے لیے قانون ہیں، وہ اُسی کو خیر مانیں گے جسے خدا خیر بتاتے گا اور اسی کو شر تسلیم کریں گے جسے خدا شر کہے گا۔ صحیح و غلط اور جائز و ناجائز کا معیار وہ خدا ہی سے لیں گے اور اپنی آزادی کو اُن حدود کے اندر محدود رکھیں گے جو خدا اُن کے لیے کھینچ دے گا۔ مختصر یہ کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ واضح طور پر یہ اقرار کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملاتِ زندگی میں "کیا ہونا چاہیے" کا جواب بطورِ خود تجویز نہیں کرے گی بلکہ اُس جواب کو قبول کرے گی جو خدا کی طرف سے ملے گا[2]۔

---

[1] یعنی کسی نسل یا ملک میں پیدا ہونا، یا کسی زبان کے بولنے والوں میں پیدا ہونا، یا کسی سیاہ، زرد یا سفید قوم میں پیدا ہو جانا۔ (جدید)

[2] یہ سوسائٹی چونکہ اتفاقی حوادث پر نہیں بلکہ ارادی عقیدہ و مسلک پر مبنی ہے، اس لیے اس میں ہر ملک، ہر نسل، ہر رنگ اور ہر زبان کے لوگ بلا امتیاز بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں، اور یہی چیز اسے ایک عالمگیر سوسائٹی بناتی ہے۔ (جدید)

اس واضح اقرار کی بنیاد پر جب ایک سوسائٹی بن جاتی ہے تو "الکتاب" اور "الرسول" اُسے ایک ضابطۂ زندگی دیتے ہیں جو "شریعت" کہلاتا ہے اور سوسائٹی پر خود اپنے ہی اقرار کی وجہ سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اپنے معاملاتِ زندگی کو اُس اسکیم کے مطابق چلائے جو اِس شریعت میں تجویز کی گئی ہے۔ تاوقتیکہ کسی شخص کی عقل بالکل ہی خبط نہ ہو گئی ہو، وہ کسی طرح اس بات کو ممکن فرض نہیں کر سکتا کہ کوئی مسلم سوسائٹی اپنے بنیادی معاہدے کو توڑے بغیر شریعت کے سوا کوئی دوسرا ضابطۂ زندگی اختیار کر سکتی ہے۔ دوسرا ضابطہ اختیار کرنے کے ساتھ ہی معاہدہ خود بخود ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے ٹوٹتے ہی وہ سوسائٹی "مسلم" کے بجائے غیر مسلم بن جاتی ہے۔ اتفاقی طور پر کسی شخص کا اپنی زندگی کے کسی معاملہ میں شریعت کی خلاف ورزی کر بیٹھنا اور چیز ہے۔ اس سے معاہدہ نہیں ٹوٹتا نہیں ہے بلکہ صرف ایک جرم کا ارتکاب ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک پوری سوسائٹی جان بوجھ کر یہ طے کرے کہ شریعت اب اُس کا ضابطۂ حیات نہیں ہے، اور یہ کہ اپنا ضابطہ اب وہ خود تجویز کرے گی، یا کسی دوسرے ماخذ سے لے گی، تو یقیناً یہ ایک فسخِ معاہدہ کا فعل ہے اور قطعاً کوئی وجہ نہیں کہ ایسی سوسائٹی پر لفظ "مسلم" کا اطلاق درست ہو۔

شریعت کا مقصد اور اُس کے اُصول

اِن بنیادی اُمور کی توضیح کے بعد اب ہمیں اُس سکیم کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے جو انسانی زندگی کے لیے شریعت نے تجویز کی ہے۔ اس غرض کے لیے مناسب ہو گا کہ ہم پہلے اُس کے مقصد اور اُس کے بڑے بڑے اُصولوں کا جائزہ لے لیں۔

اُس کا مقصد انسانی زندگی کے نظام کو معروفات پر قائم کرنا اور مُنکرات سے پاک کرنا ہے۔ معروفات سے مراد وہ نیکیاں، خوبیاں اور بھلائیاں ہیں جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی رہی ہے۔ اور مُنکرات سے مراد وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر بُرا جانتا آیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں معروف فطرتِ انسانی سے مناسبت رکھنے والی چیز ہے اور مُنکر اس کے خلاف ہے۔

وہ ہمارے لیے اُنہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور اُنہی چیزوں کو بُرا قرار دیتی ہے جو اس فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں۔ وہ اُن بھلائیوں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کی محض ایک فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالہ کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نقشے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف بھلائیوں پر قائم ہوں اور معروفات اس میں پروان چڑھ سکیں، اور منکرات کو اس کی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے اور نظامِ زندگی میں اُن کے در آنے اور اُن کا زہر پھیلنے کے مواقع باقی نہ رہنے دیئے جائیں۔

اِس غرض کے لیے وہ معروفات کے ساتھ اُن اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کرتی ہے جن سے وہ قائم ہو سکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں، اور اُن موانع کو ہٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معروفات کے قیام اور نشوونما میں کسی طور پر سدِّ راہ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اصل معروفات کے ساتھ ان کے وسائلِ قیام و ترقی بھی معروف شمار ہوتے ہیں اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ بھی ہے۔ اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع، یا ظہور، یا نشوونما کا ذریعہ بنیں۔ سوسائٹی کے پورے نظام کو شریعت اِس طرز پر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی پوری صورت میں قائم ہو، زندگی کے تمام متعلق شعبوں میں اُس کا ظہور ہو، ہر طرف سے اس کو قائم ہونے اور پروان چڑھنے میں مدد ملے اور ہر وہ رُکاوٹ دُور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اِسی طرح ایک ایک منکر کو چُن چُن کر زندگی سے نکالا جائے، اس کی پیدائش اور نشوونما کے اسباب روکے جائیں، جدھر جدھر سے وہ زندگی میں گھُس سکتا ہے اس کا راستہ بند کیا جائے اور اگر وہ سر اُٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اُسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں پر تقسیم کرتی ہے۔ ایک واجب یا فرض۔ دُوسرے مندوب یعنی مطلوب۔ تیسرے مُباح یعنی جائز۔

(۱) فرض و واجب وہ معروفات ہیں جو مسلم سوسائٹی پر لازم کیے گئے ہیں۔ ان کے متعلق شریعت صاف صاف اور قطعی احکام دیتی ہے۔

(۲) مطلوب وہ معروفات ہیں جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے کہ وہ سوسائٹی میں قائم اور جاری ہوں۔ ان میں سے بعض کو صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور بعض کا اشارہ شارع کے ارشادات سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام و نشوونما کا بندوبست کیا گیا ہے اور بعض

کی صرف سفارش کی گئی ہے تاکہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی یا اس کے صالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

(۳) رہے مباح معروفات، تو شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی ممانعت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصریح ہو، یا جن کے معاملہ میں ہمیں صاف طور پر اختیار دیا گیا ہو، بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ چند بیان کردہ ممنوعات کو چھوڑ کر دنیا میں سب کچھ مباح ٹھیرتا ہے۔ یہی مباحات کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادی عمل دی ہے، اور اسی دائرہ میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین و ضوابط اور طریق کار خود تجویز کر لینے کے اختیارات حاصل ہیں۔

منکرات کو شریعت میں دو قسموں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حرام یعنی قطعی ممنوع۔ دوسرے مکروہ یعنی ناپسندیدہ۔

حرام وہ ہے جس سے باز رہنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے، اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دے دیئے گئے ہیں۔

رہا مکروہ تو اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طور پر صراحۃً، یا کنایۃً ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جس سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس درجہ میں ناپسندیدہ ہے۔ بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں، اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں، اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں۔ بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے اور بعض کو ناپسندیدہ بتا کر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ سوسائٹی خود یا اس کے صالح عناصر ان کا سدباب کریں۔

شریعت کی ہمہ گیری

معروف اور منکر کے متعلق یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوتے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق اور عادات، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، نشست و برخاست، بات چیت، خاندانی زندگی، معاشرتی تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و واجبات، قیام عدل کا نظام، حکومت کے طریقے، صلح و جنگ اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کے متعلق شریعت

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نے ہم پر نیکی اور بدی کے طریقے، بھلائی اور برائی کے راستے، اور پاک و ناپاک کے امتیازات واضح نہ کر دیئے ہوں۔ وہ ہمیں ایک صالح نظام زندگی کا پورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ کیا بھلائیاں ہیں جنہیں ہم کو قائم کرنا، بڑھانا، اور نشوونما دینا ہے، کیا برائیاں ہیں جن کو دبانا اور مٹانا ہے، کن حدود کے اندر ہماری آزادیٔ عمل کو محدود رہنا چاہیئے اور عملاً ہمیں کون سے طریقے اختیار کرنے چاہیئں جن سے ہماری زندگی میں مطلوبہ بھلائیاں پروان چڑھیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔

نظام شریعت کا ناقابلِ تقسیم ہونا

یہ پورا نقشۂ زندگی ایک ہی نقشۂ زندگی ہے اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کی وحدت کچھ اسی طرح کی ہے جیسی خود انسان کے وجود کی وحدت ہے۔ آپ جس چیز کو انسان کہتے ہیں وہ آدمی کا سالم وجود ہے نہ کہ انسانی جسم کے الگ الگ کیے ہوئے ٹکڑوں کا مجموعہ۔ ایک کٹی ہوئی ٹانگ کو آپ ۱/۸ انسان یا ۱/۴ انسان نہیں کہہ سکتے۔ نہ یہ کٹی ہوئی ٹانگ اُن خدمات میں سے کوئی خدمت انجام دے سکتی ہے جو زندہ اور سالم جسم کا ایک عضو ہونے کی صورت میں وہ انجام دیا کرتی ہے۔ نہ اس ٹانگ کو کسی اور جانور کے جسم میں لگا کر آپ یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اس جانور میں ایک ٹانگ کے بقدر انسانیت پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح انسانی جسم کے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک وغیرہ اعضاء کو الگ الگ لے کر آپ ان کے حسن یا ان کے فائدے کے متعلق بھی کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے جب تک کہ پورے زندہ جسم میں ان کے تناسب اور ان کے عمل کو نہ دیکھیں۔ ٹھیک یہی حال شریعت کے نقشۂ زندگی کا ہے۔ اسلام اس پورے نقشے کا نام ہے نہ کہ اس کے جدا جدا ٹکڑوں کا۔ اس کے اجزا کو پارہ پارہ کر کے نہ توان کے بارے میں جداگانہ رائے زنی کرنا درست ہو سکتا ہے، نہ مجموعے سے الگ ہو کر اس کا کوئی جزء وہ کام کر سکتا ہے جو صرف اپنے مجموعہ ہی میں وہ کیا کرتا ہے، نہ اس کے بعض اجزاء کو قائم کر کے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے آدھا یا چوتھائی اسلام قائم کر دیا ہے، اور نہ کسی دوسرے نظام زندگی میں اس کے کسی جزء یا اجزاء کو پیوست کر کے کوئی مفید نتیجہ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ شارع نے یہ نقشہ اس لیے بتایا ہے کہ یہ پورے کا پورا ایک ساتھ قائم ہو، نہ اس لیے کہ آپ حسب منشا اس کے

کسی جُز کو جب چاہیں لے کر قائم کر دیں بغیر اس کے کہ دوسرے اجزاء اس کے ساتھ ہوں۔ اس کا ہر جُز دوسرے اجزاء کے ساتھ اس طرح جُڑا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ہی کام کر سکتا ہے اور آپ اس کی خوبی کے متعلق صحیح رائے صرف اُسی وقت قائم کر سکتے ہیں جب کہ پورے نظامِ اسلامی کے تناسب اور عمل میں اس کو قائم کرتے ہوئے دیکھیں۔

آج شریعت کے بعض احکام کے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں ان میں سے اکثر کی وجہ یہی ہے کہ پورے اسلام پر مجموعی نگاہ ڈالے بغیر اس کے کسی ایک جُز کو نکال لیا جاتا ہے، اور پھر یا تو اسے موجودہ غیر اسلامی نظامِ زندگی کے اندر رکھ کر رائے قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا پھر بجائے خود اسی جز کو ایک مستقل چیز سمجھ کر اُس کے حُسن و قبح کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اسلامی قانونِ فوجداری کی بعض دفعات پر آج کے لوگ بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ جس نقشۂ زندگی میں یہ قانونی دفعات رکھی گئی ہیں اس کے اندر اُن کے ساتھ ایک نظامِ معیشت، ایک نظامِ معاشرت، ایک نظامِ حکومت اور ایک نظامِ تعلیم و تربیت بھی ہے جو اگر ساتھ ساتھ پوری اجتماعی زندگی میں کام نہ کر رہا ہو تو نری اِن دفعات کو قانون کی کتاب سے نکال کر عدالت کے کمرے میں جاری کر دینا خود اِس نقشۂ زندگی کے بھی خلاف ہے۔

بلاشبہ اسلامی قانون چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دیتا ہے۔ مگر یہ حکم ہر سوسائٹی میں جاری ہونے کے لیے نہیں دیا گیا ہے، بلکہ اسے اسلام ہی کی اُس سوسائٹی میں جاری کرنا مقصود تھا جس کے مالداروں سے زکوٰۃ لی جا رہی ہو، جس کا بیت المال ہر حاجت مند کی امداد کے لیے کھلا ہو، جس کی ہر بستی پر مسافروں کی تین دن ضیافت لازم کی گئی ہو، جس کے نظامِ شریعت میں سب لوگوں کے لیے بالکل یکساں حقوق اور برابر کے مواقع ہوں، جس کے معاشی نظام میں طبقوں کی اجارہ داری کے لیے کوئی جگہ نہ ہو اور جائز کسبِ معاش کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوں، جس کے نظامِ تعلیم و تربیت نے ملک کے عام افراد میں خدا کا خوف اور اس کی رضا کا شوق پیدا کر دیا ہو، جس کے اخلاقی ماحول میں فیاضی، مصیبت زدوں کی دست گیری، حاجت مندوں کی اعانت اور گرتوں کو سہارا دینے کا عام چرچا ہو، اور جس کے بچے بچے کو یہ سبق دیا گیا ہو کہ تو

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مومن نہیں ہے اگر تیسرا ہمسایہ بھوکا ہو اور تو خود پیٹ بھر کر کھانا کھا بیٹھے۔ یہ حکم آپ کی موجودہ سوسائٹی کے لیے نہیں دیا گیا تھا جس میں کوئی شخص کسی کو قرض بھی سُود کے بغیر نہیں دیتا جس میں بیت المال کی جگہ بنک اور انشورنس کمپنی ہے۔ جس میں حاجت مند کے لیے مدد کو بڑھنے والے ہاتھ کی جگہ دھتکار اور پھٹکار ہے۔ جس کا اخلاقی نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک شخص کی کمائی میں دوسروں کا کوئی حصّہ نہیں بلکہ ہر شخص اپنی کفالت کا خود ذمّہ دار ہے۔ جس کا معاشرتی نظام بعض خاص طبقوں کو مخصوص امتیازی حقوق دیتا ہے، جس کا معاشی نظام چند خوش نصیب اور چالاک لوگوں کو ہر طرف سے دولت سمیٹ لینے کا موقع دیتا ہے، اور جس کا سیاسی نظام اپنے قوانین کے ذریعہ سے اُن کے مفاد کی حفاظت کرتا ہے۔ ایسی سوسائٹی میں تو چور کا ہاتھ کاٹنا کیا معنی، شاید اکثر حالات میں تو اس کو سرے سے کوئی سزا دینا ہی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کی ایک سوسائٹی میں چوری کو جُرم قرار دینا دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ خود غرض اور حرام خور لوگوں کے مال کی حفاظت قانون کے پیشِ نظر ہے۔ برعکس اس کے اسلام وہ سوسائٹی پیدا کرتا ہے جس میں کسی شخص کے لیے چوری پر مجبور ہونے کا کوئی موقع نہ رہے، ہر ضرورت مند انسان کی جائز ضروریات پوری کرنے کے لیے لوگ خود ہی رضاکارانہ طور پر آمادہ ہوں، اور حکومت کی طرف سے بھی اُس کی دستگیری کا پورا انتظام ہو۔ پھر جو شخص اس کے باوجود چوری کرے اُس کے لیے اسلامی قانون ہاتھ کاٹنے کی عبرتناک سزا تجویز کرتا ہے، کیونکہ ایسا شخص ایک شریف، عادل اور فیاض سوسائٹی میں رہنے کے قابل نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامی قانونِ تعزیرات زنا پر سَو کوڑے مارتا ہے اور شادی شدہ زناکار کو سنگسار کر دیتا ہے۔ مگر یہ کس سوسائٹی میں؟ اُس میں جس کے پورے نظامِ تمدن کو شہوت انگیز اسباب سے خالی کیا گیا ہو، جس میں عورتوں اور مردوں کی مخلوط معاشرت نہ ہو، جس میں بنی سنوری عورتوں کا منظرِ عام پر آنا بند ہو، جس میں نکاح کو نہایت آسان کر دیا گیا ہو، جس میں نیکی اور تقویٰ اور پاکیزگیٔ اخلاق کا عام چرچا ہو، اور جس کے ماحول میں خدا کی یاد ہر وقت تازہ ہوتی رہتی ہو۔ یہ حکم اس گندی سوسائٹی کے لیے نہیں ہے جس میں ہر طرف جنسی جذبات کو بھڑکانے کے اسباب پھیلے ہوتے ہیں، گلی گلی اور گھر گھر فحش گیت بج رہے ہیں، جگہ جگہ فلم اسٹاروں کی تصویریں لٹکی ہوئی

ہیں، شہر شہر اور قصبے قصبے سینما درسِ عشق دے رہے ہیں، نہایت گندہ لٹریچر آزادی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، بے سنوری خواتین کھلے بندوں پھر رہی ہیں، زندگی کے ہر شعبہ میں جنسی اختلاط کے مواقع بڑھ رہے ہیں اور نظامِ معاشرت نے اپنے بیہودہ رواجوں سے نکاح کو بہت مشکل بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی سوسائٹی میں تو زنا کرنے والے کو سزا دینے کے بجائے زنا سے پرہیز کرنے والے کو انعام یا کم از کم خان بہادری کا خطاب ملنا چاہیئے۔

شریعت کا قانونی حصہ

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید اصطلاح کے مطابق شریعت کے جس حصے کو ہم قانون کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں وہ زندگی کی ایک مکمل اور جامع اسکیم کا جُز ہے۔ یہ جُز بجائے خود کوئی مستقل چیز نہیں ہے کہ کُل سے الگ کر کے اسے سمجھا جا سکے یا جاری کیا جا سکے۔ اگر ایسا کیا بھی جائے تو یہ اسلامی قانون کا اجراء نہ ہوگا، نہ اس سے وہ نتائج حاصل ہو سکیں گے جو اسلام کے پیشِ نظر ہیں، اور نہ یہ حرکت خود شارع کے منشا کے مطابق ہوگی۔ شارع کا اصل منشا اپنی پوری اسکیم کو اجتماعی زندگی میں جاری کرنا ہے، اور اُس اسکیم کے مجموعی عمل درآمد ہی میں اسلامی قانون کا اجراء صحیح طور پر ہو سکتا ہے۔

شریعت کی یہ اسکیم عملی لحاظ سے کئی حصّوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعض حصّے ایسے ہیں جن کو نافذ کرنا ہر مومن کا اپنا کام ہے۔ کوئی خارجی طاقت ان کو نافذ نہیں کر سکتی۔ بعض اور حصّے ایسے ہیں جنھیں اسلام اپنے تزکیۂ نفس اور تربیت اخلاق اور تعلیم و تدریس کے پروگرام سے نافذ کراتا ہے۔ بعض دوسرے حصوں کو جاری کرنے کے لیے وہ رائے عام کی طاقت استعمال کرتا ہے۔ بعض اور حصّوں کو وہ مسلم سوسائٹی کے اصلاح یافتہ رواجوں کی شکل میں نافذ کراتا ہے۔ اور ان سب کے ساتھ ایک بہت بڑا حصّہ ایسا ہے جسے نافذ کرنے کے لیے وہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلم سوسائٹی اپنے اندر سیاسی اقتدار پیدا کرے کیونکہ وہ اقتدار کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتا۔ یہ سیاسی اقتدار اس غرض کے لیے درکار ہے کہ شریعت کے تجویز کردہ نظامِ زندگی کی حفاظت کرے، اس کو بگڑنے سے روکے، اس کے منشا کے مطابق بھلائیوں کے نشوونما اور بُرائیوں کے استیصال کا انتظام کرے، اور اس کے اُن احکام کو نافذ کرے جن کی تنفیذ کے لیے ایک نظامِ عدالت کا ہونا ضروری ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

یہی آخری حصّہ وہ چیز ہے جسے ہم اسلامی قانون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اگرچہ ایک لحاظ سے پوری شریعت ہی قانون ہے، کیونکہ وہ رعیت پر حاکمِ اعلیٰ کا مقرر کیا ہوا مجموعۂ احکام ہے، لیکن چونکہ اصطلاح میں "قانون" کا اطلاق اُن احکام پر ہوتا ہے جو سیاسی اقتدار کے ذریعہ سے نافذ کیے جائیں، اس لیے ہم شریعت کے صرف اُس حصّے کو "قانونِ اسلام" قرار دیتے ہیں جسے نافذ کرنے کے لیے وہ خود اپنے اصول و مزاج کے مطابق ایک سیاسی اقتدار کی تشکیل چاہتی ہے۔

اسلامی قانون کے اہم شعبے

(۱) اس سیاسی اقتدار کی تشکیل کے لیے سب سے پہلے ایک دستوری قانون (Constitutive Law) کی ضرورت ہے، اور شریعت نے اس کے تمام ضروری اصول مقرر کر دیے ہیں۔ ریاست کا اساسی نظریہ کیا ہے؟ اس کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ کون لوگ اس کے شہری ہو سکتے ہیں؟ اُن کے حقوق اور واجبات کیا ہیں؟ کس بنیاد پر کسی کو حقوقِ شہریت ملتے اور کس بنا پر سلب ہو سکتے ہیں؟ غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ ریاست کے قانونی اختیارات کا ماخذ کیا ہے؟ حکومت کا انتظام کن اصولوں پر چلایا جائے گا؟ انتظامی اختیارات کس کے سپرد کیے جائیں گے؟ اُس کا تقرر کون کرے گا؟ کس کے سامنے وہ جواب دہ ہوگا اور کن حدود کے اندر وہ کام کرے گا؟ قانون سازی کے اختیارات کس کو کس حد تک حاصل ہوں گے؟ عدالت کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے؟ دستوری قانون کے اِن تمام بنیادی مسائل کا واضح جواب شریعت نے ہم کو دے دیا ہے، پھر اِن اصولوں کو صاف صاف متعین کرنے کے بعد وہ ہمیں آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ دستور کی تفصیلی شکل و صورت ہم خود اپنے حالات اور ضروریات کے مطابق بنالیں۔ ہم اس امر کے پابند تو ضرور کیے گئے ہیں کہ اپنی ریاست کے دستور میں شریعت کے مقرر کیے ہوئے اِن اصولوں پر قائم رہیں، لیکن کوئی مفصل دستور ہر زمانے کے لیے ہم کو بنا کر نہیں دے دیا گیا ہے جس کے اندر ترمیم و تغیر و تبدل بھی جائز نہ ہو۔

(۲) تشکیل کے بعد اسلامی ریاست کو اپنا نظام چلانے کے لیے ایک انتظامی قانون (Administrative Law) کی ضرورت ہے۔ اس کے بھی تمام بنیادی اصول شریعت نے واضح کر دیے ہیں، اور مزید برآں اس معاملے میں ہماری رہنمائی کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور

خلفائے راشدین کی مثالی حکومت کے نظائر بھی موجود ہیں۔ ایک اسلامی ریاست اپنی آمدنی کے لیے کس قسم کے ذرائع اختیار کرسکتی ہے اور کس قسم کے ذرائع اختیار نہیں کرسکتی؟ حکومت کے معاملات میں کس قسم کے تصرفات درست ہیں اور کس قسم کے نادرست؟ فوج، پولیس، عدالت اور نظم ونسق کے مختلف شعبوں میں حکومت کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ باشندوں کی اخلاقی اور مادی فلاح کے لیے حکومت پر کیا فرائض عاید ہوتے ہیں؟ کون سی بھلائیاں ہیں جنہیں قائم کرنے اور فروغ دینے کے لیے اسے کوشش کرنی چاہیے اور کون سی برائیاں ہیں، جنہیں روکنا اور دبانا اس کے فرائض میں سے ہے؟ باشندگانِ ملک کے معاملاتِ زندگی میں حکومت کس حد تک دخل انداز ہونے کی مجاز ہے؟ ان امور میں شریعت ہم کو محض اصولی ہدایات ہی نہیں دیتی بلکہ خاص مسائل کے متعلق قطعی اور صریح احکام بھی دیتی ہے۔ لیکن پورے نظم ونسق کے متعلق اس نے کوئی تفصیلی ضابطہ بنا کر ہمیں نہیں دے دیا ہے جسے ایک ہی شکل وصورت پر ہمیشہ اور ہر زمانے میں قائم رکھنے پر ہم مامور ہوں اور جس میں کسی قسم کا تغیر وتبدل کرنے کی ہمیں اجازت نہ ہو۔ دستوری قانون کی طرح انتظامی قانون میں بھی تفصیلی ضوابط بنانے کی پوری آزادی ہمیں حاصل ہے، البتہ اس آزادی کو ہم اُن اصول اور حدود کے اندر ہی استعمال کرسکتے ہیں جو شریعت نے مقرر کردیئے ہیں۔

(۴) اس کے بعد ملکی قانون (Public Law) اور شخصی قانون (Personal Law) کے وہ ابواب آتے ہیں جو معاشرے میں امن اور انصاف قائم کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان ابواب میں شریعت اتنے وسیع پیمانے پر ہمیں تفصیلی احکام اور اصولی ہدایات دیتی ہے کہ کسی دَور میں اور معاملاتِ زندگی کے کسی گوشے میں بھی ہم کو اپنی قانونی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے شرعی حدود سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آسکتی۔ جو تفصیلی احکام اس نے دیئے ہیں وہ اب تک ہر ملک اور ہر دَور کی سوسائٹی میں یکساں صحت کے ساتھ جاری ہوسکتے ہیں (بشرطیکہ زندگی کا وہ مجموعی نظام بھی، جس میں آپ ان احکام کو جاری کریں، اسلام کی ہدایت پر چل رہا ہو) اور جو اصولی ہدایات اس نے دی ہیں وہ اس قدر جامع ہیں کہ قریب قریب اکثر معاملاتِ زندگی میں تمام ضروری قوانین ان کی روشنی میں بنائے جاسکتے ہیں۔ پھر جن معاملات میں شریعت کسی قسم

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے احکام اور ہدایات نہیں دیتی، اُن میں خود شریعت ہی کی رُو سے اسلامی ریاست کے اہل الرائے اور اصحاب حل و عقد باہمی مشورے سے قوانین بنانے کے مجاز ہیں۔ اور اس طرح جو قوانین بنائے جائیں گے وہ قانونِ اسلام ہی کا ایک جز شمار ہوں گے، کیوں کہ وہ شریعت کی دی ہوئی اجازت کے تحت بنائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہمارے فقہا نے استحسان اور مصالح مرسلہ وغیرہ عنوانات کے تحت جو احکام مدون کیے تھے وہ قانونِ اسلام ہی کے اجزاء سمجھے گئے۔

(۴) سب سے آخر میں قانون کا ایک شعبہ وہ بھی ہے جس کی ایک ریاست کو اپنے بین الاقوامی تعلقات کے لیے ضرورت پیش آتی ہے۔ اس باب میں شریعت نے جنگ اور صلح اور غیر جانبداری کی مختلف حالتوں کے متعلق اسلامی ریاست کا برتاؤ متعین کرنے کے لیے بہت تفصیلی ہدایات دی ہیں اور جہاں تفصیلات نہیں دیں وہاں ایسے اصول دے دیئے ہیں جن کی روشنی میں تفصیلات مرتب کی جاسکتی ہیں۔

اسلامی قانون کا استقلال اور اس کی ترقی پذیری

اس مختصر تشریح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ علمِ قانون کے جتنے شعبوں پر انسانی تصور آج تک پھیل سکا ہے، ان میں سے کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں شریعت نے ہماری رہنمائی نہ کی ہو۔ یہ رہنمائی کس کس شکل میں کی گئی ہے، اس کا اگر تفصیلی جائزہ لے کر دیکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اسلامی قانون میں کیا چیز قطعی اور مستقل ہے اور اس کے ایسا ہونے کا فائدہ کیا ہے، اور کون سی چیز ابد تک ترقی پذیر ہے اور وہ کس طریقہ سے ہر دور میں ہماری بڑھتی ہوئی تمدنی ضروریات کو پورا کرسکتی ہے۔

اس قانون میں جو چیز اٹل ہے وہ تین اجزاء پر مشتمل ہے:۔

۱۔ قطعی اور صریح احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں دیئے گئے ہیں، مثلاً شراب اور سُود اور قمار کی حرمت، چوری اور زنا اور قذف کی سزائیں اور میت کے ترکہ میں وارثوں کے حصے۔

۲۔ اصولی احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں بیان ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ ہر نشہ آور چیز حرام

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے، یا یہ کہ لین دین کے جن طریقوں میں منافع کا تبادلہ آپس کی رضامندی سے نہ ہو وہ باطل ہیں، یا یہ کہ مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

۳۔ حدود جو قرآن و سنّت میں اس غرض کے لیے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادیٔ عمل کو ان کے اندر محدود رکھیں اور کسی حال میں ان سے تجاوز نہ کریں، مثلاً تعدّدِ ازدواج کیلیے بیک وقت چار عورتوں کی حد، یا طلاق کے لیے تین کی حد، یا وصیت کے لیے ایک تہائی مال کی حد۔

اسلامی قانون کا یہ اٹل اور قطعی واجب الاطاعت حصّہ ہی دراصل وہ چیز ہے جو اسلامی تہذیب و تمدن کے حدود اربعہ اور اس کی مخصوص امتیازی شکل و صورت معیّن کرتا ہے۔ آپ کسی ایسی تہذیب کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو اپنے اندر ایک ناقابلِ تغیر و تبدل عنصر رکھے بغیر اپنی ہستی اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔ اگر کسی تہذیب میں ایسا کوئی عنصر بھی نہ ہو اور سبھی کچھ قابلِ ترمیم و تنسیخ ہو تو فی الحقیقت وہ سرے سے کوئی مستقل تہذیب ہی نہیں ہے۔ وہ تو ایک پگھلا ہوا مادہ ہے جو ہر سانچے میں ڈھل سکتا ہے اور ہر وقت اپنی شکل بدل سکتا ہے۔

علاوہ بریں ان احکام اور اصول اور حدود کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے ہر معقول آدمی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ شریعت نے حکم جہاں بھی دیا ہے ایسے موقع پر دیا ہے جہاں انسانی قوتِ فیصلہ غلطی کر کے راہِ معروف سے ہٹ سکتی ہے۔ ایسے تمام مواقع پر شریعت صاف حکم دے کر یا امر یا نہی کر کے یا اصول بتا کر، یا حد لگا کر گویا نشانات (Sign Posts) کھڑے کر دیتی ہے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ صحیح راستہ کس طرف ہے۔ یہ نشانات ہماری رفتارِ ترقی کو روکنے والے نہیں ہیں بلکہ ہمیں سیدھی راہ پر لگانے اور ہمارے سفرِ زندگی کو بے راہ روی سے بچانے کے لیے ہیں۔ ان مستقل قوانین کا ایک معتد بہ حصّہ ایسا ہے جن پر کل تک دنیا اعتراض کر رہی تھی، مگر ہمارے دیکھتے دیکھتے تجربات اور تلخ تجربات نے کل کے معترضین کو آج معترف بنا دیا ہے اور انہی قوانین کی خوشہ چینی پر وہ مجبور ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں صرف اسلام کے قانونِ ازدواج اور قانونِ میراث کی طرف اشارہ کافی سمجھتا ہوں۔

اس پائدار اور اٹل عنصر کے ساتھ ایک دوسرا عنصر ایسا ہے جو اسلامی قانون میں بے اندازہ وسعت پیدا کرتا ہے اور اسے زمانہ کے تمام بدلتے ہوئے حالات میں ترقی پذیر بناتا ہے۔ یہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

عنصر کئی اقسام پر مشتمل ہے۔

۱۔ تعبیر یا تاویلِ احکام، یعنی کوئی حکم جن الفاظ میں دیا گیا ہو ان کا مفہوم سمجھنے اور ان کا منشا متعین کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ فقہ اسلامی کا ایک بہت ہی وسیع باب ہے۔ قانونی دماغ اور نکتہ رس نگاہیں رکھنے والے لوگ جب کتاب و سنت میں غور و خوض کرتے ہیں تو وہ شریعت کے صریح احکام میں بھی مختلف تعبیرات کی گنجائش پاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے فہم و بصیرت کے مطابق کسی ایک تعبیر کو بدلائل دوسری تعبیروں پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ اختلافِ تعبیر پہلے بھی اُمت کے اہلِ علم میں رہا ہے، آج بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ بھی یہ دروازہ کھلا رہے گا۔

۲۔ قیاس، یعنی جس معاملہ میں کوئی صاف حکم نہ ملتا ہو اُس پر کسی ایسے حکم کو جاری کرنا جو اس سے ملتے جلتے کسی معاملہ میں دیا گیا ہو۔

۳۔ اجتہاد، یعنی شریعت کے اصولی احکام اور جامع ہدایات کو سمجھ کر ایسے معاملات پر اُن کو منطبق کرنا جن میں نظائر بھی نہ ملتے ہوں۔

۴۔ استحسان، یعنی مباحات کے غیر محدود دائرے میں حسبِ ضرورت ایسے قوانین اور ضوابط وضع کرنا جو اسلام کے مجموعی نظام کی روح سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتے ہوں۔

یہ چاروں چیزیں ایسی ہیں جن کے امکانات پر اگر کوئی شخص غور کرے تو وہ کبھی اس شبہ میں نہیں پڑ سکتا کہ اسلامی قانون کا دامن کسی وقت بھی انسانی تمدن کی روز افزوں ضروریات اور متغیر حالات کے لیے تنگ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیئے کہ اجتہاد و استحسان ہو یا تعبیر و قیاس، بہرحال اس کام ہر کس و ناکس نہیں ہو سکتا۔ آپ ہر راہ رو کا یہ حق تسلیم نہیں کر سکتے کہ وہ موجودہ ملکی قانون کے کسی مسئلہ پر فیصلہ صادر کر دے۔ اس کے لیے قانونی تعلیم اور ذہنی تربیت کا ایک خاص معیار آپ کے نزدیک بھی ناگزیر ہے جس پر پورا اترے بغیر کوئی شخص ماہرانہ رائے زنی کا اہل نہیں مانا جا سکتا۔ اسی طرح اسلامی قانون کے مسائل پر بھی رائے زنی کا حق صرف ان ہی لوگوں کو دیا جا سکتا ہے جنہوں نے اس کی ضروری اہلیت بہم پہنچائی ہو۔ تعبیرِ احکام کے لیے ضروری

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ہے کہ آدمی اُس زبان کی نزاکتوں سے واقف ہو جس میں احکام دیئے گئے ہیں، اُن حالات سے واقف ہو جن میں ابتداءً یہ احکام دیئے گئے تھے، قرآن کے اندازِ بیان کو اچھی طرح سمجھتا ہو اور حدیث کے ذخیرہ پر وسیع نگاہ رکھتا ہو۔ قیاس کے لیئے ضروری ہے کہ آدمی اتنی لطیف قانونی حِس رکھتا ہو کہ ایک معاملہ کو دوسرے معاملہ پر قیاس کرتے ہوتے ان کی باہمی مماثلت کے پہلوؤں کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکے، ورنہ ایک کا حکم دوسرے پر منطبق کرنے میں وہ غلطی سے نہیں بچ سکتا۔ اجتہاد کے لیئے شریعت کے احکام میں گہری بصیرت اور معاملاتِ زندگی کا محض فہم ہی نہیں بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے فہم ——— درکار ہے۔ استحسان کے لیئے بھی ناگزیر ہے کہ آدمی اسلام کے مزاج اور اس کے نظامِ زندگی کو اچھی طرح سمجھتا ہو تاکہ مباحات کے دائرے میں جو قوانین اور ضوابط وہ تجویز کرے وہ اس نظامِ زندگی کے مجموعہ میں صحیح طور پر جذب ہو سکیں۔ اِن علمی اور ذہنی صلاحیتوں سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی درکار ہے جس کے بغیر اسلامی قانون کا ارتقاء کبھی صحیح خطوط پر نہیں ہو سکتا، اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اِس کام کو انجام دیں ان کے اندر اسلام کی پیروی کا ارادہ اور خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کا احساس موجود ہو۔ یقیناً یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا نہیں ہے جو خدا اور آخرت سے بے پرواہ ہو کر محض دنیوی مصلحتوں پر نگاہ جما چکے ہوں اور اسلامی قدروں کو چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب کی قدریں پسند کر چکے ہوں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں اسلامی قانون کا ارتقاء نہیں ہو سکتا، صرف اس میں تحریف ہی ہو سکتی ہے۔

اعتراضات اور جوابات

اب میں مختصر طور پر اُن اعتراضات سے بحث کروں گا جو پاکستان میں اسلامی قانون کے اجراء کے مطالبہ پر بالعموم کیے جاتے ہیں۔ یہ اعتراضات بظاہر تو بہت سے ہیں اور اس لیئے کہ ان کے بیان کرنے میں الفاظ کی فضول خرچی ذرا دل کھول کر کی جاتی ہے، لیکن سب کا تجزیہ کرنے سے اصل اعتراض صرف چار نکلتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

۱۔ تہمت بوسیدگی

پہلا اعتراض یہ ہے کہ صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور سٹیٹ کی ضروریات کے لیے کس طرح کافی ہو سکتا ہے؟

جن حضرات کی طرف سے یہ اعتراض پیش کیا جاتا ہے، مجھے شبہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے متعلق ابتدائی اور سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ غالباً انہوں نے کہیں سے بس یہ اُڑتی اُڑتی خبر سن لی ہے کہ اس قانون کے بنیادی احکام اور اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ بات انہوں نے بطور خود فرض کر لی کہ اُس وقت سے یہ قانون جُوں کا تُوں اُسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اِسی بنا پر انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر آج ایک جدید ریاست اسے اپنا ملکی قانون بنائے تو وہ اس کی وسیع ضروریات کے لیے کیسے کافی ہو سکے گا۔ اِن لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ جو بنیادی احکام و اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دیے گئے تھے اُن پر اُسی وقت ایک ریاست قائم ہو گئی تھی اور روزمرہ پیش آنے والے معاملات میں تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے ذریعہ سے اِس قانون کا ارتقاء اوّل روز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پھر اسلامی اقتدار وسیع ہو کر بحرالکاہل سے بحراوقیانوس تک آدھی سے زیادہ مہذب دنیا میں پھیل گیا اور جتنی ریاستیں بھی بعد کے بارہ سو سال میں مسلمانوں نے قائم کیں اُن سب کا پورا نظم و نسق اسی قانون پر چلتا رہا۔ ہر دَور اور ہر ملک کے حالات و ضروریات کے مطابق اِس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا تک اِس ارتقاء کا سلسلہ ایک دن کے لیے بھی نہیں رُکا ہے۔ خود آپ کے اِس ملک میں بھی انیسویں صدی کے اوائل تک اسلام ہی کا دیوانی اور فوجداری قانون جاری رہا ہے۔ اب زیادہ سے زیادہ صرف سوا سو سال کا وقفہ ایسا رہ جاتا ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اِس زمانہ میں اسلامی قانون پر عمل درآمد بند رہا اور اس کا ارتقاء رُکا رہا۔ لیکن اوّل تو یہ وقفہ کچھ اتنا زیادہ بڑا نہیں ہے کہ ہم تھوڑی سی محنت و کاوش سے اُس کے نقصان کی تلافی نہ کر سکیں۔ دوسرے ہمارے پاس ہر صدی کی فقہی ترقیات کا پورا ریکارڈ موجود ہے جسے دیکھ کر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف پہلے کتنا کام کر چکے ہیں اور آگے ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ پھر جن بنیادوں پر اسلامی قانون کا

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ارتقاء ہوتا ہے انہیں دیکھتے ہوئے کوئی صاحب علم آدمی اس امر میں شک نہیں کر سکتا جس طرح پچھلی بارہ صدیوں میں یہ قانون ہر دور اور ہر ملک کی ضروریات کے مطابق وسیع ہوتا رہا ہے اسی طرح موجودہ صدی میں بھی ہو سکتا ہے اور آئندہ صدیوں میں بھی ہوتا رہے گا۔ ناواقف لوگ اس کو جانے بغیر ہزار قسم کے وسوسوں میں پڑ سکتے ہیں۔ مگر جو لوگ اس کو جانتے ہیں، اس کے امکانات سے واقف ہیں، اور اس کی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں، انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر تنگ دامنی کا شبہ نہیں ہو سکتا۔

۲۔ الزام وحشت

دوسرا اعتراض، جو پبلک میں تو دبی زبان سے مگر نجی صحبتوں میں بڑی کافرانہ جسارتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قانون میں بہت سی چیزیں قرونِ وسطیٰ کی تاریک خیالی کے باقیات میں سے ہیں جنہیں اس مہذب دور کے ترقی یافتہ اخلاقی تصورات کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہاتھ کاٹنے اور دُرّے مارنے اور سنگسار کرنے کی وحشیانہ سزائیں۔

یہ اعتراض سن کر بے اختیار ان حضرات سے یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ؎

اِتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

جس دور میں ایٹم بم استعمال کیا گیا ہے، اس کے اخلاقی تصورات کو ترقی یافتہ کہتے وقت آدمی کو کچھ تو شرم محسوس ہونی چاہیے۔ آج کا نام نہاد مہذب انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے اس کی مثال تو قدیم تاریخ کے کسی تاریک دور میں بھی نہیں ملتی۔ وہ سنگسار نہیں بم بار کرتا ہے۔ محض ہاتھ ہی نہیں کاٹتا جسم کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔ دُرّے برسانے سے اس کا دل نہیں بھرتا، زندہ آگ میں جلاتا ہے اور مُردہ لاشوں کی چربی نکال کر ان کے صابن بناتا ہے۔ جنگ کے ہنگامۂ غیظ و غضب ہی میں نہیں، امن کے ٹھنڈے ماحول میں بھی جن کو سیاسی مجرم یا جاسوس، یا خفیہ سازش کا مرتکب، یا قومی مفاد کا دشمن، یا معاشی اغراض کا حریف سمجھتا ہے ان کو دردناک عذاب دینے میں وہ آخر کون سی کسر اٹھا رکھتا ہے۔ ثبوتِ جرم سے پہلے محض شبہ ہی شبہ میں تفتیش کے جو طریقے اور اقبالِ جرم کرانے کے جو ہتھکنڈے آج کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مہذب حکومتوں میں اختیار کیے جا رہے ہیں وہ کس سے چھپے ہوئے ہیں۔ ان ساری باتوں کی موجودگی میں یہ دعویٰ تو کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ آج کے نام نہاد ترقی یافتہ تصورات انسان کو انسان کے ہاتھوں عذاب پاتے ہوئے دیکھنا سرے سے گوارا ہی نہیں کرتے۔ گوارا تو وہ کر رہے ہیں اور پہلے سے زیادہ سخت عذابوں کو گوارا کر رہے ہیں۔ البتہ فرق جو کچھ واقع ہوا ہے وہ دراصل اخلاقی قدروں میں ہوا ہے۔ ان کے نزدیک جو جرائم واقعی سخت ہیں اُن پر تو وہ خوب عذاب دیتے ہیں اور دل کھول کر دیتے ہیں، مثلاً ان کے سیاسی اقتدار کو چیلنج کرنا، یا ان کے معاشی مفاد میں مزاحم ہونا۔ لیکن جن افعال کو وہ سرے سے جرم ہی نہیں سمجھتے، مثلاً شراب سے ایک گونہ بے خودی حاصل کر لینا، یا تفریحاً زنا کر لینا، ان پر عذاب تو درکنار، سرزنش اور ملامت بھی انہیں ناگوار ہوتی ہے اور جرم نہ سمجھنے کی صورت میں لامحالہ وہ ناگوارِ خاطر ہوتی ہی چاہیئے۔

اب میں ان معترضین سے پوچھتا ہوں کہ آپ کن اخلاقی قدروں کے قائل ہیں؟ اسلام کی اخلاقی قدریں؟ یا موجودہ تہذیب کی؟ اگر آپ کی قدریں بدل چکی ہیں، اگر حلال و حرام اور خطا و صواب اور نیکی و بدی کے وہ معیار آپ چھوڑ چکے ہیں جو اسلام نے مقرر کیے تھے اور دوسرے معیار آپ نے دل سے قبول کر لیے ہیں، تو پھر اسلام کے دائرے میں آپ کی جگہ ہے کہاں کہ آپ اس کے قوانین میں ترمیم کی گفتگو چھیڑیں۔ آپ کا مقام اندر نہیں باہر ہے۔ اپنی ملت الگ بنائیے، کوئی اور نام اپنے لیے تجویز کیجیے، اور صاف صاف کہیے کہ ہم اسلام کو بحیثیت دین کے رد کرتے ہیں۔ جس خدا کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کو آپ وحشیانہ سمجھتے ہیں اس پر ایمان لانے کا آخر کس احمق نے آپ کو مشورہ دیا ہے اور کون احمق یہ باور کر سکتا ہے کہ اس کی بات کو وحشیانہ کہنے کے بعد بھی آپ اس کے مومن ہیں۔

۳۔ فقہی اختلافات کا بہانہ

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام میں بہت سے فرقے ہیں اور ہر فرقے کی فقہ جدا ہے۔ اب اگر یہاں اسلامی قانون جاری کرنے کا فیصلہ کیا جائے تو آخر وہ کس فرقے کی فقہ کے مطابق ہوگا۔

یہ وہ اعتراض ہے جس پر اسلامی قانون کے مخالفین بڑی اُمیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ توقع رکھتے ہیں کہ آخر کار اِسی سوال پر مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر وہ اسلام کے "خطرے" کو ٹال سکیں گے۔ خود مسلمانوں میں وہ لوگ جو حقیقت سے پوری طرح واقف نہیں اس سوال پر اکثر پریشان ہو جاتے ہیں کہ اس پیچیدگی کو آخر کیسے حل کیا جائے گا۔ حالانکہ درحقیقت یہ سرے سے کوئی پیچیدگی ہے ہی نہیں اور پچھلی بارہ صدیوں میں اس مسئلے نے کبھی اور کہیں اسلامی قانون کے نفاذ کو نہیں روکا ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ اسلامی قانون کا بنیادی ڈھانچہ جو خدا اور رسولؐ کے مقرر کیے ہوئے قطعی احکام اور اصول اور حدود پر مشتمل ہے، مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ابتداء سے آج تک یکساں مسلّم رہا ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہ پہلے تھا، نہ اب پایا جاتا ہے۔ فقہی اختلافات جتنے بھی ہوئے ہیں، تعبیرات میں، قیاسی و اجتہادی مسائل میں، اور دائرۂ اباحت کے قوانین و ضوابط میں ہوئے ہیں۔

پھر ان اختلافات کی حقیقت بھی یہ ہے کہ کسی حکم کی کوئی تعبیر جو کسی عالم نے کی ہو، یا کوئی مسئلہ جو قیاس و اجتہاد سے کسی امام نے نکالا ہو، یا کوئی فتویٰ جو استحسان کی بنا پر کسی مجتہد نے دیا ہو، بجائے خود قانون نہیں بن جاتا۔ دراصل اس کی حیثیت محض ایک تجویز کی ہوتی تھی۔ قانون وہ صرف اُسی وقت بنتا ہے جب کہ اُس پر اجماع (اتفاق رائے) ہو جائے یا جمہور (اکثریت) اس کو تسلیم کر لیں اور فتویٰ اسی پر جاری ہو جائے۔ ہمارے فقہاء جب اپنی کتابوں میں کسی مسئلے کو بیان کرنے کے بعد لکھا کرتے ہیں کہ علیہ الاجماع یا علیہ الجمہور اور علیہ الفتویٰ، تو اس سے ان کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس مسئلے کے متعلق یہ رائے اب محض رائے یا تجویز نہیں رہی ہے بلکہ اتفاق رائے یا جمہوری فیصلے کی بنا پر اب قانون بن چکی ہے۔

یہ اجماعی اور جمہوری فیصلے بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن پر تمام اُمّت کا ہمیشہ اجماع رہا ہے یا دنیائے اسلام کی اکثریت نے جن کو قبول کر لیا ہے۔ دوسرے وہ جن پر کسی وقت کسی ملک کے مسلمانوں کا اجماع ہو جائے یا ان کی اکثریت انہیں قبول کر لے۔

پہلی قسم کے فیصلے اگر اجماعی ہوں تو وہ نظر ثانی کے قابل نہیں ہیں۔ انہیں تمام مسلمانوں کو

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بحیثیت ایک قانون کے قبول کرنا ہوگا۔ اور اگر وہ جمہوری فیصلے ہوں تو ان کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم جس ملک میں اسلامی قانون جاری کر رہے ہیں، اس کی اکثریت بھی انہیں تسلیم کرتی ہے یا نہیں؟ اگر اکثریت انہیں تسلیم کرتی ہو تو وہ ملک کا قانون قرار پائیں گے۔

یہ حیثیت تو پچھلے فقہی احکام کی ہے۔ رہا آئندہ کا معاملہ، تو آگے آنے والے معاملات میں حکم خدا اور رسولؐ کی جس تعبیر، یا جس قیاس و اجتہاد اور جس استحسان پر ہمارے ملک کے اصحاب حل و عقد کا اجماع ہو جائے گا، یا ان کی اکثریت اس کو اختیار کرے گی وہ ہمارے ملک کے لیے قانون ہوگا۔ پہلے بھی ہر مسلمان ملک کا قانون ایسے ہی فتاویٰ پر مشتمل ہوتا تھا جو ملک کی تمام یا اکثر آبادی کے نزدیک مسلّم ہوتے تھے۔ اور آج بھی صرف یہی ایک صورت قابلِ عمل ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جمہوریت کے اصول پر اس کے سوا اور کون سی صورت تجویز کی جا سکتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کے جو گروہ اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں گے ان کی پوزیشن کیا ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے قلیل التعداد گروہ پرسنل لا کی حد تک اپنی فقہ کو اپنے معاملات میں جاری کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں اور یہ حق ان کو ضرور ملنا چاہیے۔ لیکن قانونِ ملکی (Law of the Land) بہرحال وہی ہوگا اور وہی ہو سکتا ہے جو اکثریت کے مسلک پر مبنی ہو۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ آج مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی یہ غیر معقول بات کہنے کے لیے تیار نہ ہوگا کہ چونکہ اسلامی قانون میں ہم متفق نہیں ہیں اس لیے یہاں کفر کا قانون جاری ہونا چاہیے۔ اسلام میں اختلاف کر کے سب مسلمانوں کا کفر پر متفق ہو جانا ایک ایسی بیہودہ بات ہے جو چند کفر پسند افراد کو چاہے کتنی ہی پسند ہو، بہرحال کسی فرقے کا مسلمان بھی اسے اپنے دل میں جگہ دینے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔

۴۔ غیر مسلم اقلیتوں کا مسئلہ

آخری اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس ملک میں صرف مسلمان ہی نہیں رہتے غیر مسلم بھی آباد ہیں، وہ کس طرح یہ گوارا کر لیں گے کہ مسلمانوں کا مذہبی قانون ان پر مسلط ہو جائے؟

یہ اعتراض جو لوگ پیش کرتے ہیں وہ دراصل اس مسئلہ پر ایک سطحی نگاہ ڈالتے ہیں۔ انہوں نے پوری طرح سے اس کا تجزیہ نہیں کیا ہے۔ اسی لیے ان کو اس میں بڑی پیچیدگی نظر آتی ہے۔

حالانکہ تھوڑی سی تحلیل کرنے کے بعد اس کی ساری اُلجھنیں خود ہی سُلجھتی چلی جاتی ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ ہم جس قانون پر بحث کر رہے ہیں وہ قانونِ ملکی ہے نہ کہ قانونِ شخصی۔ جہاں تک شخصی معاملات کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو یہ مُسلّم ہے کہ ہر گروہ پر اس کا اپنا قانون ہی جاری ہوگا۔ یہ حق دنیا میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فیاضی کے ساتھ اسلام نے اہل الذمہ کو دیا تھا، بلکہ درحقیقت وہ اسلام ہی ہے جس سے موجودہ دور کے اہلِ قانون نے مُلکی قانون اور شخصی قانون کا فرق سیکھا ہے اور یہ اصول معلوم کیا ہے کہ جس ریاست کی آبادی مختلف المذہب لوگوں پر مشتمل ہو اس میں سب گروہوں کے شخصی معاملات ان کے شخصی قوانین ہی کے تحت ہونے چاہئیں۔ لہٰذا کسی غیر مسلم اقلیت کو ہم سے یہ اندیشہ تو ہونا ہی نہ چاہیے کہ ہم ان کے شخصی معاملات پر اپنے مذہبی قوانین کو مسلط کر کے اس قاعدے کی خلاف ورزی کریں گے جو دراصل ہمارا اپنا ہی قائم کیا ہوا قاعدہ ہے اور جس کے متعلق اسلام نے ہم کو قطعی واضح احکام دے رکھے ہیں۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اس ملک میں قانونِ ملکی کونسا ہو؟ انصاف کی رُو سے اس سوال کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قانونِ ملکی وہی ہونا چاہیے جو اکثریت کے نزدیک صحیح ہو۔ اقلیت ہم سے اپنا جائز حق ضرور مانگ سکتی ہے اور وہ ہم اُس کے مانگنے سے پہلے ہی تسلیم کر رہے ہیں۔ لیکن وہ ہم سے یہ مطالبہ کس طرح کر سکتی ہے کہ اس کو راضی کرنے کے لیے ہم خود اپنے عقیدے کی نفی کریں اور کسی ایسے قانون کو اپنے ہاتھوں جاری کرنے لگیں جس کو ہم حق نہیں سمجھتے؟ جب تک ہم اپنے ملک میں خود مختار نہ تھے ہمیں مجبوراً ایک باطل قانون کو گوارا کرنا پڑتا۔ اس کی ذمہ داری سے ہم بری ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب جب کہ اختیارات ہمارے اپنے ہاتھ میں ہیں، اگر ہم جان بوجھ کر اسلامی قانون کی جگہ کوئی دوسرا قانون جاری کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم قومی حیثیت سے بالارادہ مُرتد ہو رہے ہیں۔ کیا فی الواقع کسی اقلیت کا ہم پر یہ حق ہے کہ اس کی خاطر ہم اپنا دین بدلنا گوارا کر لیں؟ کیا کوئی اقلیت کسی باختیار اکثریت سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ اپنی رائے میں جس چیز کو صحیح سمجھتی ہو اُسے چھوڑ دے اور وہ چیز اختیار کرے جسے اقلیت صحیح سمجھتی ہو؟ یا پھر کیا یہ کوئی معقول اصول ہے

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ جس ملک میں مختلف المذہب لوگ آباد ہوں اس میں سب کو لامذہب ہی ہو کر رہنا چاہیئے ؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں ہے ، تو میں نہیں سمجھتا کہ آخر ایک مسلمان اکثریت کے ملک میں اسلامی قانون کیوں ملکی قانون قرار نہ پائے ۔

(ترجمان القرآن ۔ جولائی ۱۹۴۰ء)

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاکستان میں اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے؟

(یہ تقریر ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو لاکالج لاہور میں کی گئی تھی۔)

اس سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک تقریر اس موضوع پر کر چکا ہوں کہ اسلامی قانون کی حقیقت کیا ہے، اس کی روح اور اس کا مقصد کیا ہے، اس کے بنیادی اصول کیا ہیں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے اور ہم کیوں اپنے ملک میں اسے نافذ کرنے کے پابند ہیں، اور وہ شبہات کیا وزن رکھتے ہیں جو اس کے بارے میں عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ میری وہ تقریر محض ایک تعارفی تقریر تھی۔ اب میں ذرا تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اب ہم اس ملک میں اسلامی قانون کو از سرِ نو جاری کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے کیا تدبیریں کرنی ہوں گی۔

فوری انقلاب نہ ممکن ہے نہ مطلوب

اس سلسلے میں سب سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اُس غلط فہمی کو دور کر دوں جو اسلامی قانون کے اجراء کے متعلق کثرت سے لوگوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے۔ لوگ جب سنتے ہیں کہ ہم یہاں اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس حکومت میں ملک کا قانون اسلامی قانون ہو گا تو انہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید نظامِ حکومت کے تغیر کا اعلان ہوتے ہی تمام پچھلے قوانین یک لخت

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

منسوخ ہو جائیں گے اور اسلامی قانون بیک وقت نافذ کر دیا جائے گا۔ یہ غلط فہمی صرف عام لوگوں ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ اچھے خاصے مذہبی طبقے بھی اس میں مبتلا ہیں۔ اُن کے نزدیک ایسا ہونا چاہیے کہ اِدھر اسلامی حکومت قائم ہو اور اُدھر فوراً ہی غیر اسلامی قوانین کا نفاذ بند اور اسلامی قانون کا نفاذ شروع ہو جائے۔ درحقیقت یہ لوگ اس بات کو بالکل نہیں سمجھتے کہ ایک ملک کا قانون اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انہیں معلوم نہیں ہے کہ جب تک کسی ملک کا نظامِ زندگی اپنے سارے شعبوں کے ساتھ نہ بدلے اس کے قانونی نظام کا بدل جانا ممکن نہیں ہے۔ انہیں اس کا بھی اندازہ نہیں ہے کہ پچھلے سوڈیڑھ سو برس سے ہم پر جو انگریزی اقتدار مسلط رہا ہے اس نے کس طرح ہماری زندگی کے پورے نظام کو اسلامی اصولوں سے ہٹا کر غیر اسلامی اصولوں پر چلا دیا ہے اور اب اسے پھر بدل کر دوسری بنیادوں پر قائم کرنا کتنی محنت، کتنی کوشش اور کتنا وقت چاہتا ہے۔ یہ لوگ عملی مسائل میں بصیرت نہیں رکھتے۔ اس لیے اجتماعی نظام کی تبدیلی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ پھر اُن کی یہی باتیں اُن لوگوں کو جو اسلامی نظام سے فرار کی راہیں ڈھونڈ رہے ہیں، یہ موقع دے دیتی ہیں کہ وہ اس تخیل کا مذاق اُڑائیں اور اس کے حامیوں کا استخفاف کریں۔

تدریج کا اُصول

اگر ہم فی الواقع اپنے اس تخیل کو کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں فطرت کے اس اٹل قاعدے سے غافل نہ ہونا چاہیے کہ اجتماعی زندگی میں جتنے تغیرات بھی ہوتے ہیں بتدریج ہی ہوا کرتے ہیں۔ انقلاب جتنا اچانک اور جس قدر یک رُخا ہوگا اتنا ہی وہ ناپائدار ہوگا۔ ایک مستحکم اور پائندہ انقلاب کے لیے یہ بالکل ضروری ہے کہ وہ زندگی کی ہر جہت اور ہر پہلو میں پورے توازن کے ساتھ کار فرما ہو تاکہ اس کا ہر گوشہ دوسرے گوشہ کو سہارا دے سکے۔

عہدِ نبوی کی مثال

اس کی بہترین مثال خود وہ انقلاب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں برپا کیا تھا۔ جو شخص حضورؐ کے کارنامے سے تھوڑی سی واقفیت بھی رکھتا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ آپؐ نے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پورا اسلامی قانون اس کے سارے شعبوں کے ساتھ بیک وقت نافذ نہیں کر دیا تھا بلکہ معاشرے کو بتدریج اس کے لیے تیار کیا تھا اور اس تیاری کے ساتھ آہستہ آہستہ سابق جاہلیت کے طریقوں اور قاعدوں کو بدل کر نئے اسلامی طریقے اور قاعدے جاری کیے تھے۔ آپ نے سب سے پہلے اسلام کے بنیادی تصورات اور اخلاقی اصول لوگوں کے سامنے پیش کیے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کرتے گئے انہیں آپ تربیت دے کر ایک ایسا مصلح گروہ تیار کرتے چلے گئے جس کا ذہن اور زاویہ نظر اور طرز عمل خالص اسلامی تھا۔ جب یہ کام ایک خاص حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو آپ نے دوسرا قدم اٹھایا اور وہ یہ تھا کہ مدینے میں ایک ایسی حکومت قائم کر دی جو خالص اسلامی نظریہ پر مبنی تھی اور جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ ملک کی زندگی کو اسلام کے نقشے پر ڈھال دے۔ اس طرح سیاسی طاقت اور ملکی ذرائع کو ہاتھ میں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وسیع پیمانے پر اصلاح و تعمیر کا وہ کام شروع کیا جس کے لیے آپ پہلے صرف دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے کوشش فرما رہے تھے۔ آپ نے ایک مرتب اور منظم طریقے سے لوگوں کے اخلاق، معاشرت، تمدن اور معیشت کو بدلنے کی جدوجہد کی۔ تعلیم کا ایک نیا نظام قائم کیا جو اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے زیادہ تر زبانی تلقین کے طریقے پر تھا۔ جاہلیت کے خیالات کی جگہ اسلامی طرز فکر کی اشاعت کی۔ پرانی رسموں اور طور طریقوں کی جگہ نئے اصلاح یافتہ رواج اور آداب و اطوار جاری کیے۔ اور اس ہمہ گیر اصلاح کے ذریعہ سے جوں جوں زندگی کے مختلف گوشوں میں انقلاب رونما ہوتا گیا، آپ اسی کے مطابق پورے توازن اور تناسب کے ساتھ اسلامی قانون کے احکام جاری کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ ۹ سال کے اندر ایک طرف اسلامی زندگی کی تعمیر مکمل ہوئی اور دوسری طرف پورا اسلامی قانون ملک میں نافذ ہو گیا۔

قرآن اور حدیث کے غائر مطالعے سے ہمیں واضح طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ نے یہ کام کس ترتیب و تدریج کے ساتھ کیا تھا۔ وراثت کا قانون ۳ ہجری میں جاری کیا گیا۔ نکاح و طلاق کے قوانین رفتہ رفتہ ۷ ہجری میں مکمل ہوئے۔ فوجداری قوانین کئی سال تک ایک ایک دفعہ کر کے نافذ کیے جاتے رہے یہاں تک کہ ۸ ہجری میں ان کی تکمیل ہوئی۔ شراب کی بندش کے لیے بتدریج فضا تیار کی گئی اور ۸ ہجری میں اس کا قطعی انسداد کر دیا گیا۔ سود کی برائی اگرچہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مکہ ہی میں صاف صاف بیان کی جا چکی تھی، مگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی اسے یک لخت بند نہیں کر دیا گیا، بلکہ ملک کے پورے معاشی نظام کو بدل کر جب نئے سانچوں میں ڈھال دیا گیا تب کہیں ۸ھ ہجری میں سود کی قطعی حرمت کا قانون جاری کیا گیا۔ یہ کام بالکل ایک معمار کا سا کام تھا جس نے اپنے پیش نظر نقشے کی عمارت بنانے کے لیے کاریگر اور مزدور جمع کیے، ذرائع و وسائل مہیا کیے، زمین ہموار کی، بنیادیں کھودیں، پھر ایک ایک اینٹ رکھ کر ہر جہت سے عمارت کو اٹھاتا چلا گیا اور پر تک لے گیا، اور چند سال کی مسلسل محنت کے بعد آخر کار وہ عمارت مکمل کر دی جس کا خاکہ اس کے ذہن میں تھا۔

انگریزی دور کی مثال

قریب کے زمانہ میں خود ہمارے ملک پر جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تھی تو کیا انہوں نے یک لخت یہاں کا سارا نظام بدل ڈالا تھا؟ نہیں۔ ان کی حکومت سے پہلے چھ سات سو برس سے یہاں کا پورا نظام زندگی اسلامی فقہ پر چل رہا تھا۔ اس صدیوں کی جمی ہوئی عمارت کو ڈھا دینا اور مغربی اصول و نظریات کے مطابق ایک دوسرے نظام کی عمارت کھڑی کر دینا ایک دن کا کام نہ تھا۔ تاریخ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی اقتدار قائم ہونے کے بعد بھی ایک مدت تک ہندوستان میں اسلامی فقہ ہی رائج رہی۔ عدالتوں میں قاضی ہی انصاف کے لیے بیٹھتے تھے اور اسلام کا قانون صرف پرسنل لاء کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ وہی ملکی قانون (Law of the Land) بھی تھا۔ انگریزوں کو یہاں کا قانونی نظام بدلتے بدلتے ایک صدی لگ گئی۔ انہوں نے بتدریج یہاں کا نظام بدل کر اپنے مطلب کے آدمی ڈھالے، اپنے خیالات کی اشاعت سے ذہنیتیں بدلیں، اپنے اقتدار کے اثر سے لوگوں کے اخلاق بدلے، اپنی بالادستی کے زور سے معاشی نظام بدلا اور پھر جیسے جیسے یہ مختلف قسم کے ہمہ گیر اثرات یہاں کی اجتماعی زندگی کو بدلتے گئے اسی کے مطابق پرانے قوانین منسوخ اور نئے قوانین جاری ہوتے چلے گئے۔

تدریج ناگزیر ہے

اب اگر ہم یہاں پھر اسلامی قانون جاری کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے بھی انگریزی حکومت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے صد سالہ نقوش کو کھرچ دینا اور نئے نقوش ثبت کر دینا محض ایک جنبشِ قلم سے ممکن نہیں ہے۔ ہمارا پُرانا نظامِ تعلیم زندگی اور اس کے عملی مسائل سے ایک مدت دراز تک بے تعلق رہنے کے باعث اس قدر بے جان ہو چکا ہے کہ اس کے فارغ التحصیل لوگوں میں ایک فی ہزار کے اوسط سے بھی ایسے آدمی نہیں نکل سکتے جو ایک جدید ترقی یافتہ ریاست کے جج اور مجسٹریٹ بنائے جا سکیں۔ دوسری طرف موجودہ نظامِ تعلیم نے جو آدمی تیار کیے ہیں وہ اسلام اور اس کے قوانین سے بالکل بے بہرہ ہیں اور ان میں ایسے افراد بھی خال خال ہی پائے جاتے ہیں جن کی ذہنیت ہی کم از کم اس تعلیم کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ گئی ہو۔ پھر سو ڈیڑھ سو برس تک معطل رہنے کی وجہ سے ہمارا قانونی ذخیرہ بھی زمانے کی رفتار سے اچھا خاصا پیچھے رہ گیا ہے اور اسے موجودہ دَور کی عدالتی ضروریات کے لیے کار آمد بنانا کافی محنت چاہتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک طویل مدت تک اسلامی اثر سے آزاد اور انگریزی حکومت کے تابع رہتے رہتے ہمارے اخلاق، تمدّن، معاشرت، معیشت اور سیاست کا نقشہ اصل اسلامی نقشے سے بہت مختلف ہو چکا ہے۔ اس حالت میں ملک کے قانونی نظام کو یک لخت بدل دینا ——— اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہو ——— نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس صورت میں زندگی کا نظام اور قانونی نظام دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ نہ بلکہ باہم متصادم ہوں گے، اور ایسے قانونی تغیر کا وہی حشر ہوگا جو ایک پودے کو ایسی آب و ہوا اور ایسی زمین میں لگا دینے سے ہوا کرتا ہے جو اس کے مزاج سے کوئی مناسبت نہ رکھتی ہو۔ لہٰذا یہ بالکل ناگزیر ہے کہ جس اصلاح و تغیر کے ہم طالب ہیں وہ تدریج کے ساتھ ہو، اور قانونی تبدیلیاں اخلاق، تعلیم، معاشرت، تمدّن، معیشت اور سیاست کی تبدیلیوں کے ساتھ متوازن طریقہ سے کی جائیں۔

ایک غلط بہانہ

لیکن تدریج کے اس معقول اور بجائے خود بالکل صحیح اصول کو بہانہ بنا کر جو لوگ اس بات کے حق میں استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سرِدست تو یہاں ایک غیر دینی ——— بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ایک بے دین ——— ریاست ہی قائم ہونی چاہیے، پھر جب اسلامی ماحول تیار ہو جائے گا تو وہ اسلامی ریاست بھی قائم ہو جائے گی جو اسلامی قانون جاری کر سکے، وہ سرا سر ایک

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نامعقول بات کہتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ ماحول تیار کون کرے گا؟ کیا ایک بے دین ریاست، جس کی باگیں فرنگیت زدہ حکام اور لیڈروں کے ہاتھ میں ہوں؟ کیا وہ معمار جو صرف میخانہ و قحبہ خانہ ہی کی تعمیر جانتے اور اُسی سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں ایک مسجد تعمیر کرنے کا سامان کریں گے؟ اگر ان لوگوں کا یہی مطلب ہے تو انسانی تاریخ میں یہ پہلا اور بالکل نرالا تجربہ ہوگا کہ بے دینی خود دین کو پروان چڑھا کر اپنی جگہ لینے کے لیے تیار کرے گی۔ اور اگر ان کا مطلب کچھ اور ہے تو وہ ذرا اس کی صاف صاف توضیح فرمائیں کہ اسلامی ماحول کی تیاری کا کام کون، کس طاقت اور کن ذرائع سے کریگا؟ اور اس دوران میں خود بے دین ریاست اپنے ذرائع اور اقتدار کو کس چیز کی تعمیر و ترقی میں صرف کرتی رہے گی؟

ابھی ابھی تدریج کا اصول ثابت کرنے کے لیے جو مثالیں میں نے پیش کی ہیں انہیں اگر آپ ایک مرتبہ پھر اپنے ذہن میں تازہ کرلیں تو آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اسلامی نظامِ زندگی کی تعمیر ہو یا غیر اسلامی نظامِ زندگی کی، اگرچہ وہ ہوتی تو بتدریج ہی ہے، لیکن تدریجاً اس کی تعمیر صرف اُسی صورت میں ہوسکتی ہے جب کہ ایک معمار طاقت، اپنے سامنے ایک مقصد اور ایک نقشہ رکھ کر مسلسل اُس کے لیے کام کرے۔ صدرِ اوّل میں جو اسلامی انقلاب ہوا تھا اِسی طرح ہوا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے برسوں اس کے لیے موزوں آدمی تیار کیے، تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ سے لوگوں کے خیالات بدلے، حکومت کے پورے نظم و نسق کو معاشرے کی اصلاح اور ایک نئے تمدن کی تخلیق کے لیے استعمال کیا، اور اس طرح وہ ماحول بنا جس میں اسلامی قانون جاری ہوسکا۔ ماضی قریب میں انگریزوں نے ہندوستان کے نظامِ زندگی میں جو تغیرات کیے وہ بھی تو اسی طرح ہوئے کہ زمامِ کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو اس تغیر کے خواہش مند تھے اور اس کے لیے کام کرنا جانتے تھے۔ اُنہوں نے ایک مقصد اور ایک نقشے کو نگاہ میں رکھ کر پیہم اس تغیر کے لیے کوشش کی اور آخر کار یہاں کے پورے نظامِ زندگی کو اُس سانچے میں ڈھال کر ہی چھوڑا جو ان کے اصول و قوانین سے مناسبت رکھتا تھا۔ پھر کیا اب ہماری پیشِ نظر تعمیر اُس معمار طاقت کے بغیر ہو جائے گی؟ یا ایسے معماروں کے ہاتھوں ہو سکے گی جو اس نقشے پر تعمیر کا کام نہ جانتے ہوں اور نہ چاہتے ہوں؟

صحیح ترتیبِ کار

میں سمجھتا ہوں، اور مجھے اُمید ہے کہ ہر معقول آدمی اس معاملہ میں مجھ سے اتفاق کرے گا کہ جب پاکستان اسلام کے نام سے اور اسلام کے لیے مانگا گیا ہے اور اسی بنا پر ہماری یہ مستقل ریاست قائم ہوئی ہے تو ہماری اس ریاست ہی کو وہ معمار طاقت بننا چاہیئے جو اسلامی زندگی کی تعمیر کرے۔ اور جب کہ یہ ریاست ہماری اپنی ریاست ہے اور ہم اپنے تمام قومی ذرائع و وسائل اس کے سپرد کر رہے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس تعمیر کے لیے کہیں اور سے معمار فراہم کریں۔

پہلا قدم

یہ بات اگر صحیح ہے تو پھر اس تعمیر کی راہ میں پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنی اس ریاست کو، جو ابھی تک انگریز کی چھوڑی ہوئی کافرانہ بنیادوں پر قائم ہے، مسلمان بنائیں۔ اور اسے مسلمان بنانے کی آئینی صورت یہ ہے کہ ہماری دستور ساز اسمبلی باقاعدہ اس امر کا اعلان کرے کہ :-

۱۔ پاکستان میں حاکمیت خدا کی ہے اور ریاست اس کے نائب کی حیثیت سے ملک کا انتظام کرے گی۔

۲۔ ریاست کا اساسی قانون شریعتِ خداوندی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہمیں پہنچی ہے۔

۳۔ تمام پچھلے قوانین جو شریعت سے متصادم ہوتے ہیں، بتدریج بدل دیئے جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جاسکے گا جو شریعت سے متصادم ہوتا ہو۔

۴۔ ریاست اپنے اختیارات کے استعمال میں اسلامی حدود سے تجاوز کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔

یہ وہ کلمۂ شہادت ہے جسے اپنی آئینی زبان —— یعنی دستور ساز اسمبلی —— کے ذریعہ سے ادا کر کے ہماری ریاست "مسلمان" ہو جائے گی۔

دوسرا قدم

اس اعلان کے بعد ہی صحیح طور پر ہمارے رائے دہندوں کو یہ معلوم ہوگا کہ اب انہیں کس مقصد اور کس کام کے لیے اپنے نمائندے منتخب کرنے ہیں۔ عوام میں علم و دانش کی لاکھ کمی سہی، مگر وہ اتنی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

سمجھ بوجھ ضرور رکھتے ہیں کہ انہیں کس کام کے لیے کس طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان کے درمیان کون لوگ کس مطلب کے لیے موزوں ہیں۔ آخر وہ اتنے نادان تو نہیں ہیں کہ علاج کے لیے وکیل اور مقدمہ لڑنے کے لیے ڈاکٹر کو تلاش کریں۔ وہ اس کو بھی کسی نہ کسی حد تک جانتے ہی ہیں کہ ان کی بستیوں میں ایمان دار اور خداترس کون ہیں، چالاک اور دنیا پرست کون، اور شریر و مفسد کون۔ جیسا مقصد ان کے سامنے ہوتا ہے ویسے ہی آدمی وہ اس کے لیے اپنے اندر سے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اب تک ان کے سامنے یہ مقصد آیا ہی نہ تھا کہ انہیں ایک دینی نظام چلانے کے لیے آدمی درکار ہیں۔ پھر وہ اس کے چلانے والے آخر تلاش کرتے ہی کیوں؟ جیسا بے دین اور غیر اخلاقی نظام ملک میں قائم تھا اور اس کا مزاج جس قسم کے آدمی چاہتا تھا، اس کے لیے ویسے ہی آدمیوں پر لوگوں کی نگاہِ انتخاب پڑی اور انہی کو رائے دہندوں نے چُن کر بھیج دیا۔ اب اگر ہم ایک اسلامی ریاست کا دستور بنائیں اور لوگوں کے سامنے سوال یہ آجائے کہ اس نظام کو چلانے کے لیے انہیں موزوں آدمی منتخب کرنے ہیں، تو چاہے ان کا انتخاب کمال درجہ کا معیاری نہ ہو، مگر بہرحال اس کام کے لیے ان کی نگاہیں فساق و فجار اور دینِ مغربی کے مومنین پر نہیں پڑیں گی۔ وہ اس کے لیے انہی لوگوں کو تلاش کریں گے جو اخلاقی، ذہنی اور علمی حیثیت سے اس کے اہل ہوں گے۔

پس ریاست کو مسلمان بنانے کے بعد تعمیرِ حیاتِ اسلامی کی راہ میں دوسرا قدم یہ ہے کہ جمہوری انتخاب کے ذریعہ سے اس ریاست کی زمامِ کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہوں اور اس کے مطابق ملک کے نظامِ زندگی کو ڈھالنا چاہتے بھی ہوں۔

تیسرا قدم

اس کے بعد تیسرا قدم یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ہمہ گیر اصلاح کا ایک منصوبہ (Plan) بنایا جائے اور اسے عمل میں لانے کے لیے ریاست کے تمام ذرائع و وسائل استعمال کیے جائیں۔ تعلیم کا نظام بدلا جائے۔ ریڈیو، پریس، سینما اور خطابت کی ساری طاقتیں لوگوں کے خیالات کی اصلاح اور ایک نئی اسلامی ذہنیت کی تخلیق میں صرف کی جائیں۔ معاشرت اور تمدن کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لیے پیہم اور باقاعدہ کوشش کی جائے۔ سول سروس، پولیس، جیل، عدالت اور فوج سے بتدریج اُن لوگوں کو خارج کیا جائے جو پُرانے فاسقانہ دور کا فرانہ نظام کی عادات و

www.iqbalkalmati.blogspot.com

خصائل میں ڈھل کر سُوکھ چکے ہیں، اور اُن نئے عناصر کو کام کرنے کا موقع دیا جائے جو اس اصلاح کے کام میں مددگار بن سکتے ہیں۔ معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں اور اُس کا پورا ڈھانچہ جو پرانی ہندوانہ اور جدید فرنگیانہ بنیادوں پر چل رہا ہے، اُدھیڑ ڈالا جائے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر ایک صالح اور مدبر گروہ اقتدار کے منصب پر فائز ہو اور ملک کے سارے وسائل اور حکومت کے پورے نظم ونسق کی طاقت سے کام لے کر باقاعدگی کے ساتھ اصلاح کے ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل شروع کر دے تو دس سال کے اندر اس ملک کی اجتماعی زندگی کا نقشہ بالکل بدلا جاسکتا ہے، اور جیسے جیسے یہ تبدیلی واقع ہوتی جائے ایک صحیح توازن کے ساتھ سابق قوانین کی ترمیم و تنسیخ اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا سلسلہ جاری ہوسکتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر جاہلیت کا کوئی قانون ہمارے ملک میں باقی نہ رہے اور اسلام کا کوئی حکم نافذ ہونے سے بچا نہ رہ جائے۔

اجرائے قانونِ اسلامی کے لیے تعمیری کام

اب میں خاص طور پر اُس تعمیری کام کی کچھ تفصیل آپ سے بیان کروں گا جو ملک کے قانونی نظام کو بدلنے اور اسلام کے قوانین کو جاری کرنے کے لیے ہمیں کرنا ہوگا۔ جس اصلاحی پروگرام کی طرف ابھی میں اشارہ کرچکا ہوں اس کے سلسلہ میں ہم کو قریب قریب ہر شعبۂ زندگی میں بہت سے تعمیری کام کرنے پڑیں گے، کیونکہ مدت ہائے دراز کے تعطل، انحطاط اور غلامی نے ہمارے تمدن کی عمارت کے ہر گوشے کو خراب کر کے چھوڑا ہے۔ لیکن اس وقت میری تقریر ایک خاص موضوع سے تعلق رکھتی ہے اس لیے دوسرے گوشوں کے تعمیری کام سے قطع نظر کر کے یہاں میں صرف اُس کام کے متعلق کچھ عرض کروں گا جو ہمیں قانون کے سلسلے میں کرنا ہے۔

ایک قانونی اکیڈیمی کا قیام

اس پہلو میں اوّلین کام جو ہمیں کرنا چاہیے، یہ ہے کہ ایک قانونی اکیڈیمی قائم کی جائے جو اس پورے کام کا جائزہ لے جو علم قانون میں ہمارے اسلاف اس سے پہلے کرچکے ہیں، اور ان ضروری کتابوں کو جو فقہ اسلامی کی واقفیت کے لیے ناگزیر ہیں، اُردو زبان میں صرف منتقل ہی نہ کرے بلکہ ان کے مواد کو زمانۂ حال کے طرز ترتیب کے مطابق مرتب بھی کر دے تاکہ ان سے پورا فائدہ اٹھایا جاسکے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری فقہ کا اصل ذخیرہ عربی زبان میں ہے اور ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بالعموم اس زبان سے ناواقف ہے۔ اس ناواقفیت کی وجہ سے، اور کچھ سُنی سنائی باتوں کی بنا پر ہمارے پڑھے لکھے لوگ عموماً اس فقہی ذخیرے کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان میں سے بہت سے لوگ تو یہاں تک کہہ بیٹھتے ہیں کہ دُور ازکار، لاطائل اختلافی بحثوں کے اس دفتر بے معنی کو دریا بُرد کر دیا جائے اور نئے سرے سے اجتہاد کر کے کام چلایا جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے مہمل خیالات ظاہر کرتے ہیں وہ محض اپنے علم ہی کی کمی کا نہیں، فکر و تدبر کے فقدان کا بھی راز فاش کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے بزرگوں کے فقہی کارناموں کا واقعی مطالعہ کریں تو مجھے یقین ہے کہ انہیں اپنی ان باتوں پر خود ہی شرم آنے لگے گی۔ انہیں معلوم ہوگا کہ پچھلی بارہ تیرہ صدیوں میں ہمارے اسلاف محض فضول بحثوں میں وقت ضائع نہیں کرتے رہے ہیں، بلکہ انہوں نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے بڑی قیمتی میراث چھوڑی ہے۔ وہ بہت سی ابتدائی منزلیں ہمارے لیے تعمیر کر گئے ہیں اور ہم سے بڑھ کر زیاں کار کوئی نہ ہوگا اگر ہم محض جہالت کی بنا پر اس بنی ہوئی عمارت کو خواہ مخواہ ڈھا کر نئے سرے سے ہی تعمیر کی ابتدا کرنے پر اصرار کریں۔ ہمارے لیے عقلمندی یہی ہے کہ جو اگلے بنا گئے ہیں اسے اپنی آج کی ضرورتوں کے لیے کارآمد بنائیں، اور آگے جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے اس کے لیے مزید تعمیر کرتے رہیں۔ ورنہ ہر نسل اگر یوں ہی اپنے سے پہلی نسلوں کے کام پر پانی پھیرتی رہے اور نئے سرے سے سب کچھ بنانے کی کوشش کرے تو یقیناً ترقی کی طرف قدم آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

میں اس سلسلہ کی پہلی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ پچھلی صدیوں میں دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر مسلمانوں کی جس قدر سلطنتیں قائم ہوئی تھیں ان سب کا قانون فقہ اسلامی ہی تھی۔ اس زمانے میں مسلمان نری گھاس نہیں کھودتے تھے بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کا تمدن ان کے اندر موجود تھا۔ ان کے وسیع تمدن کی ساری ہی ضروریات پر اُن کے فقہا نے اسلامی قوانین کو منطبق کیا تھا۔ یہی فقہا اُن حکومتوں کے جج، مجسٹریٹ اور چیف جسٹس ہوتے تھے اور ان کے فیصلوں سے نظائر کا ایک وسیع ذخیرہ فراہم ہو گیا تھا۔ انہوں نے قریب قریب ہر شعبۂ قانون سے بحث کی ہے۔ محض دیوانی و فوجداری قوانین ہی نہیں، دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے متعلق بھی ان کے قلم سے ایسی ایسی لطیف بحثیں نکلی ہیں کہ ان کا مطالعہ کر کے ایک قانون داں آدمی اُن کی ژرف نگاہی کی داد دیئے بغیر نہیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

رہ سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہم اہلِ علم کے ایک گروہ کو ان بزرگوں کے چھوڑے ہوئے ذخیرہ کا جائزہ لینے پر مامور کریں، اور وہ موجودہ زمانے کی قانونی کتابوں کے طرز پر اس تمام کار آمد مواد کو مرتب کر ڈالے جو اس ذخیرے میں مل سکتا ہو۔

خصوصیت کے ساتھ چند کتابیں تو ایسی ہیں جن کو اُردو زبان میں منتقل کر لینا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ احکام القرآن پر تین کتابیں، جصّاص، ابن العربی اور قرطبی۔

اِن کتابوں کا مطالعہ ہمارے قانونی طلبہ کو قرآن مجید سے احکام مستنبط کرنے کی بہترین تربیت دے گا۔ ان میں قرآن کی تمام احکامی آیات کی تفسیر کی گئی ہے، احادیث اور آثارِ صحابہ میں ان کی جو تشریح ملتی ہے اسے نقل کیا گیا ہے، اور مختلف ائمۂ مجتہدین نے ان سے جو احکام نکالے ہیں انہیں ان کے دلائل سمیت مفصل بیان کر دیا گیا ہے۔

۲۔ دوسرا قیمتی ذخیرہ کُتبِ حدیث کی شرحوں کا ہے جن میں احکام کے علاوہ نظائر اور تشریحی بیان کا بھی بہترین مواد ملتا ہے۔ ان میں خاص طور پر یہ کتابیں اُردو میں منتقل ہونی چاہئیں۔

بخاری پر	فتح الباری اور عینی
مُسلم پر	نَوَوِی اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی فتح الملہم۔
ابوداؤد پر	عون المعبود اور بذل المجہود۔
موطّا پر	شاہ ولی اللہ صاحب کی مُسَوّیٰ اور مُصفّیٰ اور موجودہ دور کے ایک ہندوستانی عالم کی اَوْجَزُ المسالک
منتقی الاخبار پر	شوکانی کی نیل الاوطار
مشکوٰۃ پر	مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی التعلیق الصبیح۔
علم الآثار میں	امام طحاوی کی شرح معانی الآثار۔

۳۔ اس کے بعد ہمیں فقہ کی ان بڑی بڑی کتابوں کو لینا چاہیئے جو اس علم میں اُمہاتِ کُتب کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ یہ کتابیں منتقل ہونی چاہئیں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

فقہ حنفی پر	امام سرخسی کی المبسوط اور شرح السیر الکبیر۔ کاسانی کی بدائع الصنائع۔ ابن ہمام کی فتح القدیر مع ہدایہ۔ اور فتاویٰ عالمگیری۔
فقہ شافعی پر	کتاب الام۔ شرح المہذب اور مغنی المحتاج۔
فقہ مالکی پر	المدونہ اور کوئی اہم کتاب جس کا اہلِ علم انتخاب کریں۔
فقہ حنبلی پر	ابن قدامہ کی المغنی
فقہ ظاہری پر	ابن حزم کی المحلّٰی
مذاہب اربعہ پر	ابن رشد کی بدایۃ المجتہد۔ اور علماء مصر کی مرتب کردہ الفقہ علی المذاہب الاربعہ۔ نیز ابن القیم کی زاد المعاد میں سے وہ حصے جو قانونی مسائل سے متعلق ہیں۔
مخصوص مسائل پر	امام ابو یوسف کی کتاب الخراج۔ یحییٰ بن آدم کی الخراج۔ ابو عُبید القاسم کی کتاب الاموال۔ ہلال بن یحییٰ کی احکام الوقف۔ دمیاطی کی احکام المواریث۔

۴۔ پھر ہمیں اصولِ قانون اور حکمتِ تشریع کی بھی چند اہم کتابوں کو اُردو کا جامہ پہنا لینا چاہیئے تاکہ ان کی مدد سے ہمارے اہلِ قانون میں اسلامی فقہ کا صحیح فہم اور اس کی رُوح سے گہری واقفیت پیدا ہو۔ میرے خیال میں اس موضوع پر یہ کتابیں قابلِ انتخاب ہیں۔

ابنِ حزم کی اصول الاحکام۔ علامہ آمدی کی الاحکام لاصولِ الاَحکام۔ خضری کی اصول الفقہ۔ شاطبی کی الموافقات۔ ابن القیم کی اعلام الموقعین۔ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ۔

ان کتابوں کے متعلق ہمیں صرف اتنا ہی نہیں کرنا ہے کہ محض ان کے ترجمے اردو زبان میں کروا لئے جائیں، بلکہ ان کے مضامین کو موجودہ زمانہ کی قانونی کتابوں کے طرز پر از سرِ نو مرتب بھی کرنا ہوگا، نئے عنوانات قائم کرنے ہوں گے، منتشر مسائل کو ایک ایک عنوان کے تحت جمع کرنا ہوگا۔ فہرستیں بنانی پڑیں گی اور انڈکس تیار کرنے ہوں گے۔ اس محنت کے بغیر یہ

کتابیں آج کل کی ضروریات کے لیے پوری طرح کارآمد نہ ہوسکیں گی۔ قدیم زمانے کا طریقِ تدوین کچھ اور تھا اور اُس زمانے میں قانونی مسائل کے لیے اتنے مختلف عنوانات بھی پیدا نہیں ہوئے تھے جتنے آج پیدا ہوگئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لوگ دستوری قانون اور بین الاقوامی قانون کے لیے کوئی الگ نام نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے مسائل کو وہ نکاح، خراج، جہاد، امارت اور میراث کے ابواب میں بیان کرتے تھے۔ فوجداری قانون ان کے ہاں کوئی الگ عنوان نہ تھا، بلکہ اس کے مسائل حدود، جنایات اور دیات کے مختلف عنوانوں میں تقسیم کر دیئے جاتے تھے۔ دیوانی قانون کو بھی انہوں نے الگ مرتب نہیں کیا تھا بلکہ ایک ہی مجموعۂ قوانین میں بہت سے عنوانات کے تحت اس کو جمع کر دیا تھا۔ مالیات اور معاشیات وغیرہ نام ان کے ہاں نہ تھے۔ اس سلسلہ کے مسائل کو وہ کتاب البیوع، کتاب الصرف، کتاب المضاربہ، اور کتاب المزارعہ وغیرہ عنوانات کے تحت بیان کرتے تھے۔ اسی طرح قانونِ شہادت، ضابطۂ دیوانی، ضابطۂ فوجداری، اور ضابطۂ عدالت وغیرہ جدید اصطلاحیں ان کے ہاں نہیں بنی تھیں۔ ان قوانین کے مسائل ان کی کتابوں میں آدابِ القاضی، کتاب الدعویٰ، کتاب الاکراہ، کتاب الشہادت اور کتاب الاقرار وغیرہ عنوانات کے تحت ملتے ہیں۔ اب اگر یہ کتابیں جُوں کی تُوں اُردو میں منتقل کر لی جائیں تو ان سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ کچھ قانونی نظر رکھنے والے اہلِ علم ان پر کام کریں اور ان کی ترتیب بدل کر ان کے مواد کو جدید طرز پر مرتب کر ڈالیں۔ اور بالفرض اگر یہ بہت زیادہ محنت طلب کام نظر آئے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہی ہونا چاہیئے کہ ان کی فہرستیں پوری باریک بینی کے ساتھ بنائی جائیں اور مختلف قسم کے انڈکس بنا دیئے جائیں جن کے ذریعہ سے ان میں مسائل کا تلاش کرنا آسان ہو جائے۔

تدوینِ احکام

اس سلسلہ کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ذمّہ دار علماء اور ماہرینِ قانون کی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جو اسلام کے قانونی احکام کو جدید دَور کی کُتبِ قانون کے طرز پر دفعہ وار مدوّن (Codify) کر دے۔

میں اپنی پہلی تقریر میں وضاحت کے ساتھ یہ بات آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ اسلامی

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نقطۂ نظر سے قانون کا اطلاق ہر اُس قول پر نہیں ہوتا جو کسی فقیہ یا امام مجتہد کی زبان سے نکلا ہو یا کسی فقہی کتاب میں لکھا ہوا ہو۔ قانون صرف چار چیزوں کا نام ہے۔

۱- کوئی حکم جو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دیا ہو۔

۲- کسی قرآنی حکم کی تشریح و تفصیل، یا کوئی مستقل حکم جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۳- کوئی استنباط، قیاس، اجتہاد یا استحسان جس پر اُمّت کا اجماع ہو، یا جمہور علماء کا ایسا فتویٰ ہو جسے ہمارے ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت تسلیم کرتی رہی ہے۔

۴- اسی قبیل کا کوئی ایسا امر جس پر ہمارے ملک کے اہلِ حل و عقد کا اب اجماع یا جمہوری فیصلہ ہو جائے۔

میری تجویز یہ ہے کہ پہلی تین قسموں کے احکام کو ماہرین کی ایک جماعت ایک مجلۂ احکام (Code) کی شکل میں مرتب کر دے۔ پھر جو جو قوانین آئندہ اجماعی یا جمہوری فیصلوں سے بنتے جائیں ان کا اضافہ ہماری کتاب آئین میں کیا جاتا رہے۔ اگر اس قسم کا ایک مجلۂ احکام بن جائے تو اصل قانون کی کتاب وہ ہوگی، اور باقی تمام فقہی کتابیں اس کے لیے شرح (Commentary) کا کام دیں گی۔ نیز اس طرح عدالتوں میں قانون اسلامی کی تنفیذ اور لا کالجوں میں اس قانون کی تعلیم بھی آسان ہو جائے گی۔

قانونی تعلیم کی اصلاح

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے ہاں قانون کی تعلیم کا سابق طریقہ بدل دیں اور اپنے لا کالجوں کے نصاب اور طریق تربیت میں ایسی اصلاحات کریں جن سے طلبہ اسلامی قانون کی تنفیذ کے لیے علمی اور اخلاقی، دونوں حیثیتوں سے تیار ہو سکیں۔

اس وقت تک جو تعلیم ہماری قانونی درس گاہوں میں دی جا رہی ہے وہ ہمارے نقطۂ نظر سے بالکل ناکارہ ہے۔ اس سے فارغ ہو کر نکلنے والے طالب علم صرف یہی نہیں کہ اسلامی قانون کے علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں بلکہ ان کی ذہنیت بھی غیر اسلامی افکار کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور ان کے اندر اخلاقی صفات بھی ویسی ہی پیدا ہو جاتی ہیں جو مغربی قوانین

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے اجراء کے لیے موزوں ترین، مگر قانونِ اسلامی نافذ کرنے کے لیے قطعاً غیر موزوں ہیں۔

اس صورتِ حال کو جب تک ہم بدل نہ دیں گے اور ان درس گاہوں میں اپنے معیار کے فقیہ پیدا کرنے کا انتظام نہ کریں گے، ہمارے ہاں وہ آدمی فراہم ہی نہ ہو سکیں گے جو ہماری عدالتوں میں قاضی اور مفتی کے فرائض انجام دینے کے لائق ہوں۔

اس مقصد کے لیے جو تجاویز میرے ذہن میں ہیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ دوسرے اہلِ علم بھی ان پر غور کریں اور ان میں اصلاح و اضافہ فرمائیں تاکہ ایک اچھی قابلِ عمل اسکیم بن سکے۔

۱۔ سب سے مقدم اصلاح یہ ہونی چاہیے کہ آئندہ سے لاکالجوں میں داخلہ کے لیے عربی زبان کی واقفیت ـــــــ اتنی واقفیت جو قرآن، حدیث اور فقہ کا مطالعہ کرنے کے لیے کافی ہو ـــــــ لازم قرار دی جائے۔ اگرچہ ہم اسلامی قانون کی پوری تعلیم اردو میں دینا چاہتے ہیں، اور اس فن کی تمام ضروری کتابوں کو بھی اردو میں منتقل کر لینا چاہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود عربی زبان کے علم کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی۔ اس لیے کہ اسلامی فقہ میں بصیرت بہرحال اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک آدمی اُس زبان سے واقف نہ ہو جس میں قرآن نازل ہوا ہے اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے۔ ابتداءً ہمیں لاکالجوں کے لیے عربی داں اُمیدوار فراہم کرنے میں دُشواری ضرور پیش آئے گی۔ ممکن ہے اس غرض کے لیے ہم کو چند سال تک ہر لاکالج میں ایک مستقل کلاس عربی تعلیم کیلیے کھولنی پڑے، اور شاید تعلیمِ قانون کی مدت میں ایک سال کا اضافہ بھی کر دینا پڑے۔ لیکن آگے چل کر جب ہمارے پورے نظامِ تعلیم میں عربی بطور ایک لازمی زبان کے شامل ہو جائے گی تو لاکالج میں داخلہ کے لیے جو گریجویٹ بھی آئیں گے وہ پہلے ہی عربی زبان سے بخوبی واقف ہوں گے۔

۲۔ عربی زبان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے طلبہ کو قرآن اور حدیث کے براہِ راست مطالعہ سے دین کا مزاج اور اس کا پورا نظام اچھی طرح سمجھا دیا جائے۔ ہماری عربی درس گاہوں میں بھی ایک مدت دراز سے یہ غلط طریقہ چلا آرہا ہے

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کہ تعلیم کی ابتداء فقہ سے کی جاتی ہے، پھر ہر مذہب (اسکول) کے لوگ اپنے مخصوص فقہی نقطۂ نظر سے حدیث پڑھاتے ہیں اور قرآن کی صرف ایک یا دو بڑی سورتیں محض تبرکاً داخلِ درس کر دی جاتی ہیں، بلکہ اُن میں بھی کلامِ الٰہی کی ادبی خوبیوں کے سوا کسی اور چیز کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جو فضلاء ان درسگاہوں سے نکلتے ہیں وہ قانون کے جزئیات و فروع سے تو خوب واقف ہوتے ہیں مگر جس دین کو قائم کرنے کے لیے یہ قانون بنایا گیا ہے اس کے مجموعی نظام، اس کے مقاصد، اس کے مزاج اور اس کی رُوح سے بڑی حد تک نابلد رہتے ہیں۔ ان کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ دین سے شریعت کا اور شریعت سے فقہی مذاہب کا تعلق کیا ہے۔ وہ قانونی جزئیات اور اپنے مذاہب خاص تک کے فروعی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اسی چیز نے ہمارے ہاں فرقہ بندی کے جھگڑے اور تعصبات پیدا کیے ہیں۔ اسی چیز کا نتیجہ یہ ہے کہ مسائلِ زندگی پر فقہی احکام کا انطباق کرنے میں بارہا شریعت کے اہم ترین مقاصد تک نظرانداز کر دیئے جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب اس غلطی کی اصلاح ہو اور کسی طالب علم کو اس وقت تک قانون نہ پڑھایا جائے جب تک وہ پہلے قرآن اور پھر حدیث سے دین کو اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

اس معاملہ میں بھی ہمیں ابتداءً چند سال تک کچھ مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا کیونکہ قرآن و حدیث سے واقف گریجویٹ نہ مل سکیں گے، اور اس کے لیے شاید ہمیں لاکالجوں ہی میں اس تعلیم کا بھی انتظام کرنا پڑے گا۔ لیکن آگے چل کر جب ہماری عام تعلیمی اصلاحات بارآور ہو جائیں گی تو آسانی کے ساتھ یہ ضابطہ بنایا جاسکے گا کہ لاکالجوں میں صرف وہی طلبہ داخلہ لے سکتے ہیں جو تفسیر اور حدیث کو مخصوص مضامین کی حیثیت سے لے کر بی اے کر چکے ہوں، ورنہ دوسرے مضامین کے طلبہ کو ایک سال زائد ان مضامین پر صرف کرنا ہوگا۔

۳۔ تعلیم قانون کے نصاب میں تین مضامین ضرور شامل ہونے چاہئیں۔ ایک جدید زمانے کے اصولِ قانون (Jurisprudence) کے ساتھ ساتھ اصولِ فقہ کا مطالعہ۔ دوسرے اسلامی فقہ کی تاریخ کا مطالعہ۔ تیسرے فقہ کے تمام بڑے بڑے مذاہب (اسکولوں) کا غیر متعصبانہ مطالعہ۔ ان تینوں چیزوں کے بغیر طلبہ میں نہ تو فقہ کا پُورا فہم پیدا ہو سکتا ہے نہ ان کے اندر وہ

اجتہادی صلاحیتیں اُبھر سکتی ہیں جو اعلیٰ درجہ کے قاضی اور مفتی بننے کے لیے ناگزیر ہیں، اور نہ ان کے اندر سے ایسے ماہرین نکل سکتے ہیں جو ہماری ترقی پذیر ریاست کی روز افزوں ضروریات کے لیے تعبیر و قیاس اور اجتہاد و استحسان کے صحیح طریقے استعمال کر کے قوانین بنا سکیں۔ اپنے قانون کے اصولوں کو پوری طرح سمجھے بغیر آخر وہ روز نت نئے پیش آنے والے مسائل پر اُن کا انطباق کیسے کر سکیں گے۔ اپنی فقہ کی تاریخ کو جانے بغیر انہیں کیونکر معلوم ہوگا کہ اسلامی قانون کا ارتقا کس طریقہ پر ہوا ہے، اور آئندہ کس طریقہ پر ہو سکتا ہے فقہائے اسلام کے جمع کیے ہوئے پورے ذخیرے پر وسیع نظر رکھے بغیر وہ کیونکر اس قابل ہو سکیں گے کہ جب کسی مسئلے میں ایک فقہی مذہب سے رہنمائی نہ ملتی ہو تو نیا اجتہاد کرنے سے پہلے دوسرے مذاہبِ فقہ سے استفادہ کریں۔ انہی وجوہ سے مَیں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری تعلیم قانون کے نصاب میں یہ تینوں مضامین داخل ہوں۔

۴۔ تعلیم کی اس اصلاح کے ساتھ ہمیں اپنے لاکالجوں میں طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بھی خاص انتظام کرنا ہوگا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے لاکالج چالاک وکیل، نفس پرست مجسٹریٹ اور بدکردار جج تیار کرنے کی فیکٹری نہیں ہے بلکہ اس کا کام تو ایسے قاضی اور مفتی پیدا کرنا ہے جو اپنی قوم میں اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے بلند ترین لوگ ہوں، جن کی راست بازی اور عدل و انصاف پر کامل اعتماد کیا جا سکے، جن کی اخلاقی ساکھ ہر شبہ سے بالاتر ہو۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سب سے بڑھ کر خدا ترسی، پرہیزگاری اور احساسِ ذمہ داری کا دَور دورہ ہونا چاہیے۔ یہاں سے نکلنے والے طلبہ کو اُس مسند کے لیے تیار ہونا ہے جس پر کبھی قاضی شریحؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور قاضی ابو یوسفؒ جیسے لوگ بیٹھ چکے ہیں۔ یہاں ایسے مضبوط کیرکٹر کے آدمی تیار ہونے چاہییں جو کسی مسئلہ شرعی میں فتوے دیتے وقت یا کسی معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت خدا کے سوا کسی کی طرف نظر نہ رکھیں۔ کوئی لالچ، کوئی خوف، کوئی ذاتی دلچسپی، کوئی محبت اور کوئی نفرت اُن کو اُس بات سے نہ ہٹا سکے جسے وہ اپنے علم اور اپنے ضمیر کے لحاظ سے حق اور انصاف کی بات سمجھتے ہوں[۱]۔

(ترجمان القرآن۔ اگست ۴۸ء)

---

[۱] تقریر کے آخری حصے کی تفصیلات یہاں حذف کر دی گئی ہیں۔ پوری تقریر کتابی شکل میں شائع شدہ موجود ہے۔ (جدید)

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مطالبۂ نظامِ اسلامی[1]

یہ اُن تقریروں کا مجموعی خلاصہ ہے جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی (حال اسیرِ حکومت پاکستان) نے اپریل اور مئی ۱۹۴۸ء میں لاہور، ملتان، کراچی، راولپنڈی، سیالکوٹ اور پشاور کے مقامات پر جماعت اسلامی کے عام اجتماعات میں فرمائی تھیں۔ ان تقریروں کو جن ہزاروں مسلمانوں نے سُنا ان کو پہلی مرتبہ واضح طور پر یہ احساس ہُوا کہ حصولِ پاکستان پر اُن کا کام ختم نہیں ہو گیا ہے، بلکہ اصل نصب العین کی طرف قدم بڑھانے کا تو ابھی آغاز ہی ہُوا ہے۔ اسے مکمل کرنے کے لیے ابھی مزید محنت و ایثار کی ضرورت ہے۔

اس تقریر کو مرتب کرنے کا وقت نکالنے سے پہلے مولانا محترم ۴ ؍ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیئے گئے۔ لیکن ادھر چونکہ اس تقریر کی اشاعت کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے اور مولانا کی رہائی میں ابھی دیر ہے اس لیے مجبوراً اخبارات کی مدد سے اسے ہم بطورِ خود

---

[1] یہ تقریر ۱۹۴۹ء کے آغاز ہی میں پمفلٹ کی صورت میں شائع ہو گئی تھی۔ ترجمان القرآن میں اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ (جدید)

مرتب کر کے پیش کر رہے ہیں۔

ناظم مکتبہ جماعت اسلامی

بعد از حمد و ثنا:

ہم دوراہے پر کھڑے ہیں

حاضرین و حاضرات! یہ وقت جس سے ہم آج گذر رہے ہیں، ہماری قومی تاریخ کے نازک ترین اوقات میں سے ہے۔ اس وقت ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں اور ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارے سامنے جو دو راستے کھلے ہوتے ہیں، اُن میں سے کس کی طرف بڑھیں۔ اس موقع پر جو فیصلہ بہ حیثیتِ قوم ہم کریں گے وہ نہ صرف ہمارے مستقبل پر بلکہ نہ معلوم کتنی مدت تک ہماری آئندہ نسلوں پر اثر انداز ہوتا رہے گا۔ ہمارے سامنے ایک راستہ تو یہ ہے کہ ہم اُن اصولوں پر اپنے نظامِ زندگی کی بنیادیں کھڑی کریں جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں۔ ہماری ساری کی ساری زندگی ——— ہماری معاشرت، ہماری معیشت، ہمارا تمدن، ہماری سیاست غرض سب کچھ ——— اُن اصولوں پر اُستوار ہو جو اسلام نے مقرر کر دیئے ہیں۔ دوسرا راستہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ ہم کسی مغربی قوم کے نظامِ زندگی کو قبول کر لیں۔ خواہ وہ اشتراکیت ہو، لادینی جمہوریت ہو یا کوئی اور نظامِ زندگی۔

اگر خدانخواستہ ہم نے دوسرے راستے کو پسند کیا تو ہم اپنے اسلام کی بہ حیثیت قوم نفی کریں گے اور اپنے اُن تمام اعلانات سے منحرف ہوں گے جو ایک مدت سے ہم خدا اور خلق دونوں کے سامنے کرتے رہے ہیں اور اس اجتماعی وعدہ خلافی کی وجہ سے خدا و خلق دونوں کے سامنے ہمیں رسوا ہونا پڑے گا۔ پھر اس راستے پر چلنے کا سب سے زیادہ افسوس ناک نتیجہ یہ ہوگا کہ برِ صغیرِ ہندوستان میں اسلام کی تاریخ کا قطعی خاتمہ ہو جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر ہم پہلا راستہ انتخاب کریں اور خالص اسلامی اصولوں پر اپنی قومی زندگی کو قائم کریں تو ہم دنیا میں بھی سرفراز ہوں گے اور آخرت میں بھی ہمارے لیے کامیابی ہوگی، ہم خدا کے حضور بھی سُرخرو ہوں گے اور خلق کے سامنے بھی ہمارا وقار قائم ہو سکے گا۔ ہم اسلامی نظامِ زندگی کے علمبردار بن کر پھر اُسی مقام پر کھڑے ہو جائیں گے جس پر ہزاروں برس پہلے جب ایک قوم کھڑی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اُسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

مخاطب کرکے ارشاد فرمایا تھا کہ " اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ " یعنی ہم نے تمہیں دنیا کی ساری اقوام پر فضیلت عطا کی۔ پھر اس کے بعد جب اسی مقامِ عظمت پر ایک دوسری قوم کھڑی ہوئی تو اسے کہا گیا "کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ" اور "وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا" یعنی تم بہترین امت ہو اور تمہیں مرکزی اُمت بنایا گیا ہے۔

ہمارے مسلمان ہونے کا تقاضا

بہرحال آج یہ دونوں مواقع ہمارے سامنے ہیں اور ان میں سے جس کا بھی ہم انتخاب کریں گے، اس کا اثر مدت ہائے دراز تک ہماری قسمتوں اور ہماری آئندہ نسلوں کی قسمتوں پر پڑے گا۔ اس موقع پر اگر ہم اسلام کے اصولوں کو اپنے لیے پسند کرتے ہیں اور اپنے نظامِ حکومت کی تشکیل اسلام کے نقشے پر کرتے ہیں تو یہ کئی وجوہ سے درست ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے مسلمان ہونے کا عین تقاضا یہی ہے۔ مسلمان ہونے کے معنی خدا کا مطیع ہو جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خود مختاری اور آزادی کو خدا کے حق میں تسلیم (Surrender) کر دیا جائے اور اقرار کر لیا جائے کہ اب میں جو زندگی بسر کروں گا، خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود اور ضابطوں کے اندر رہ کر بسر کروں گا، اس کی طرف سے جدھر بڑھنے کا اشارہ ہوگا اُدھر بڑھوں گا، اور جدھر سے رُک جانے کا حکم ہوگا اُدھر سے رُک جاؤں گا۔ جس طرح ایک فرد اپنے خدا سے یہ عہد باندھ کر جب اپنی زندگی کو اس کی رضا کے تابع کر دیتا ہے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح اجتماعی حیثیت سے ایک قوم کے مسلمان ہونے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ وہ اپنی آزادی و خود مختاری سے اللہ تعالیٰ کے حق میں دست بردار ہو جائے اور اپنے آپ کو اس کے حدود و قوانین کا پابند بنا لے۔ یہ ایک عجیب اور نرالی بات ہوگی کہ کسی قوم کا ایک ایک فرد تو اپنی اپنی جگہ مسلم ہو، لیکن جب وہ مل کر ایک اسٹیٹ بنیں تو وہ اسٹیٹ غیر مسلم ہو۔ اگر مجموعہ غیر مسلم ہو تو افراد کس طرح مسلم ہو سکتے ہیں؟ اور اگر افراد مسلم ہوں تو ان کا مجموعہ غیر مسلم کیوں ہو؟ افراد اگر مسلمان ہوں اور مسلمان رہنا چاہتے ہوں تو اُن کے لیے لازم ہے کہ وہ جب مل کر ایک قوم اور ایک اسٹیٹ کی شکل اختیار کریں تو وہ قوم اور اسٹیٹ ہونے کی حیثیت سے بھی مسلمان ہوں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پاکستان برائے اسلام

پھر ہمارے مطالبۂ پاکستان کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ہم یہاں کا نظام اسلامی اصولوں پر قائم کریں۔ پچھلے دس سال میں بحیثیت قوم ہمارا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں ایک خطۂ زمین ایسا ملنا چاہیئے جس میں ہم اپنی تہذیب و تمدن کو از سرِ نو قائم کر سکیں، اور اپنے دین کے اصولوں پر اپنی زندگی کو نشوونما دے سکیں کیونکہ ایک غیر مسلم اکثریت کے تحت ہمارے لیے اس طرح کی زندگی ممکن نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اب سے ڈیڑھ سال پہلے تک اس امر کے کوئی آثار نہ تھے کہ ہندوستان تقسیم ہو جائے گا اور یہاں مسلمانوں کی ایک آزاد سلطنت قائم ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ جو لوگ آگے چل رہے تھے اور اس مطالبے کی جدوجہد میں قیادت کا فرض ادا کر رہے تھے، خود ان کو بھی اس بات کا قطعی یقین نہ تھا کہ پاکستان قائم ہو جائے گا۔ اس کے بعد حالات جس طرح بدلے اور پاکستان کے قیام کے لیے جس طرح فضا ساز گار ہوئی اور ملک "آناً فاناً" تقسیم ہو گیا، اس کی آپ جو چاہیں عقلی توجیہیں کریں، لیکن میں اس انقلاب میں ارادۂ الٰہی کو خاص طور پر شامل پاتا ہوں۔ واقعہ درحقیقت یہ ہے کہ صدیوں کے بعد تاریخ میں یہ بات پیش آئی ہے کہ ایک قوم نے کھڑے ہو کر بحیثیتِ قوم یہ کہا کہ "ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، اور چونکہ غیر مسلم اکثریت کی حکومت میں ہمارے لیے اس کا امکان نہیں ہے لہٰذا ہمیں ایک آزاد خطۂ زمین ملنا چاہیئے، اگر ہمیں یہ آزاد خطہ مل جائے تو اس میں ہم پورے کے پورے اسلام کو غالب کریں گے"۔ خدا کے ہاں یہ بات مقبول ہوئی کہ جب یہ قوم کہتی ہے کہ ہم اسلامی نظامِ حیات کو اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ایک بار اسے اس کا موقع دینا چاہیئے۔ ایک مدت سے آپ کو پامال کیا جا رہا تھا۔ لیکن آپ نے جب یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ پنپنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اس کا موقع فراہم کر دیا۔

ایک نازک امتحان

آپ کو یہ موقع مل جانا جس طرح فضل و رحمت ہے اسی طرح یہ آزمائش و امتحان بھی ہے۔ پاکستان مل جانے کے بعد آپ سب امتحان گاہ میں کھڑے ہیں۔ اب آپ کا اس امر میں امتحان ہے کہ آپ پچھلے دس سال میں جو کچھ زبانوں سے کہتے رہے ہیں، کیا فی الواقع آپ کے دلوں میں

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بھی وہی ہے؟ جن باتوں کا آپ اعلان کرتے رہے ہیں، کیا آپ کی نیتیں بھی انہی کے مطابق ہیں؟ خدا و خلق کے سامنے جو اقرار آپ نے کیے ہیں کیا وہ سچے اقرار تھے یا جھوٹے؟ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا جو چرچا آپ نے کیا تھا، کیا وہ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے تھا یا آپ صدق دل سے آپ اپنی زبان سے نکالی ہوئی بات پر عمل کر کے دکھاتے ہیں؟ آپ کہتے تھے کہ پاکستان کا مطلب کیا، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ آپ کہتے تھے کہ ہم پاکستان اس لیے چاہتے ہیں کہ اسلام پر پوری طرح عمل کر سکیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے پاکستان دے کر آپ کو آزمائش میں ڈال دیا ہے اور وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ سچے تھے یا جھوٹے؟

اسلام کے حفظ و بقا کی واحد صورت

تیسری بات جس کی وجہ سے یہ فیصلہ اور بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے، وہ بہت زیادہ دردناک ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس انقلاب نے جو پچھلے سال ہوا ہے ہمیں ایک نازک مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ ہندوستان کا ایک اچھا خاصا بڑا حصہ اسلام سے اور اسلام کا نام لینے والوں سے بالکل خالی ہو چکا ہے۔ جس خطے نے کبھی شاہ ولی اللہ اور مجدد الف ثانی رحمہم اللہ کو جنم دیا تھا، آج وہاں اذان کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ وہاں نہ کوئی اذان دینے والا رہا ہے، نہ کوئی اس کا سننے والا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے باقی حصہ میں بھی اسلام بے دردی کے ساتھ مٹایا جا رہا ہے۔ اب وہاں صورت حالات یہ ہے کہ ریل میں سفر کرتے ہوئے یہ پہچاننا مشکل ہے کہ مسافروں میں مسلمان کون ہے۔ بہت سے لوگ جو کل تک اسلام اسلام پکار رہے تھے، آج وہ اسلام سے توبہ کر رہے ہیں۔ اب وہاں اگر کوئی مسلمان رہ سکتا ہے تو صرف اسی طرح رہ سکتا ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ اس میں اسلام کی بو بھی باقی نہیں ہے۔ اگر یہی رفتار رہی تو آئندہ چند برسوں میں مسلمان کا وجود ہندوستان میں عنقا ہو جائے گا۔ ہمارے اسلاف نے ہندوستان میں جو اسلام صدیوں کی لگاتار کوششوں سے پھیلایا تھا وہ اب آٹھ سو سال کے بعد پاکستان کے دو خطوں میں سکڑ کر رہ گیا ہے۔ اب اگر ہم نے ایک قدم بھی غلط سمت میں اٹھا دیا تو ہندوستان میں اسلام کی ایک ہزار سالہ تاریخ پر پوری طرح پانی پھر جائے گا۔ اس برِ عظیم ہند کے تین چوتھائی حصے سے تو اسلام دوسروں کے مٹانے سے مٹ رہا ہے۔

یہاں یہ ہمارے اپنے مٹاتے مٹے گا۔ اس لیے اب ہمیں اگلا قدم خوب سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیئے۔ اب صرف ایک ٹھوکر ہمارے اور اسلام کے مٹنے میں حائل ہے۔ اگر ہم نے اس موقع پر ٹھوکر کھائی تو ہمارے اسلاف کے دینی کارنامے کی ساری تاریخ حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گی۔ یہ سب وجوہ اس امر کے داعی ہیں کہ ہم فیصلہ کرلیں کہ ہمیں اس ملک کے نظام کو بہرحال اسلامی بنیادوں پر اُٹھانا ہے اور یہاں ہمارے ہاتھوں سے سیاست و تمدن کا جو نقشہ بنے گا وہ اسلام کے منشا کے مطابق ہی بنے گا۔

موجودہ نظام کو مسلمان بنانے کا طریقہ

اس موقع پر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس نظام کو جو یہاں اب تک چل رہا ہے، مسلمان بنانے کا طریقہ کیا ہے؟ کسی نظام کے مسلمان ہونے کا فطری طریقہ بالکل وہی ہے جو ایک فرد کے مسلمان ہونے کے لیے مقرر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک غیر مسلم فرد کو مسلمان بنانے کے لیے ہم یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ اس کی ظاہری شکل و صورت اور لباس میں کچھ تبدیلیاں کرادی جائیں اور اسے کہا جاتا ہے کہ اپنے کھانے پینے کی فہرست میں سے بعض چیزوں کو نکال دو اور اپنی عادات میں چند تبدیلیاں کرلو۔ اور پھر اسے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ جاؤ اب تم آہستہ آہستہ مسلمان بن جاؤ گے۔ پھر کچھ مدت کے بعد جب وہ غیر مسلم فرد اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں کر چکے تو آخر میں اسے کلمہ پڑھایا جاتا ہے؟ ——— نہیں ہم ایسا نہیں کرتے، بلکہ جب کوئی فرد مسلمان ہونا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اسے کلمہ پڑھایا جاتا ہے اور جب وہ کلمہ پڑھ کے یہ اقرار کرلیتا ہے کہ اب اسے اپنی زندگی خدا کی بندگی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں بسر کرنی ہے تو پھر ہم اسے ایک ایک کرکے دین کے احکام بتاتے ہیں اور اس کے اعمال و افعال اور اس کی عادات و اطوار میں تبدیلیاں کراتے ہیں۔ ٹھیک یہی طریقہ ایک نظام حکومت اور نظام ملکی کو بھی مسلمان بنانے کا ہے کہ پہلے اس سے چند بنیادی اصول منوائے جاتے ہیں اور پھر جب وہ ان اصولوں کو تسلیم کرلیتا ہے تو اس کے سامنے اسلام کے عملی مطالبات تدریجاً رکھے جاتے ہیں اور اس میں وہ ساری تبدیلیاں پیدا کی جاتی ہیں جو دین کو مطلوب ہیں۔

ہمارے ملک کا نظام اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء پر قائم ہے جسے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

انگریز نے اپنے اصول و مقاصد کے مطابق بنایا تھا۔ انگریز کی حکومت اسلام کی حکومت نہیں تھی، کفر کی حکومت تھی۔ پاکستان میں بھی وہی نظامِ حکومت اب تک قائم ہے۔ اگرچہ اسے مسلمان چلا رہے ہیں لیکن یہ نظام اپنی فطرت کے لحاظ سے کافرانہ ہی ہے۔ اب اس نظام کو مسلمان بنانے کے لیے اگر کوئی بنیادی تبدیلی سب سے پہلے کرنے کی ہے تو وہ یہی ہے کہ جس طرح فرد کو مسلمان بنانے کے لیے کلمہ پڑھایا جاتا ہے اسی طرح اسے بھی کلمہ پڑھایا جائے۔ ایک حکومت کو کلمہ پڑھانے کے لیے جو دستوری طریقہ ہو سکتا ہے اُسے ہم نے ایک مطالبہ کی شکل میں مرتب کیا ہے۔ میں اسے پڑھ کر سناتا ہوں اور پھر اس کی تشریح کروں گا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس اسٹیٹ کو مسلمان بنانے کے لیے پہلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ اور اس کے مطابق کیا جدوجہد کی جانی چاہیے!

دستوری "مطالبہ"

مذکورہ مطالبہ جو اس موقعہ پر پڑھ کر سُنایا گیا، درج ذیل ہے:

"چونکہ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتی ہے، اور چونکہ پاکستان کی آزادی کے لیے مسلمانوں کی ساری جدوجہد اور قربانیاں صرف اسی خاطر تھیں کہ وہ اُن اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرسکیں جن پر وہ ایمان رکھتے ہیں،

لہٰذا

اب قیامِ پاکستان کے بعد ہر پاکستانی مسلمان دستور ساز اسمبلی سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرے کہ:

۱۔ پاکستان کی بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکومتِ پاکستان کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کی مرضی اس کے ملک میں پوری کرے۔

۲۔ پاکستان کا بنیادی قانون اسلامی شریعت ہے۔

۳۔ وہ تمام قوانین جو اسلامی شریعت کے خلاف اب تک جاری رہے ہیں، منسوخ کیے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

جائیں گے اور آئندہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کیا جائے گا جو شریعت کے خلاف ہو۔

۴۔ حکومت پاکستان اپنے اختیارات اُن حدود کے اندر استعمال کرے گی جو شریعت نے مقرر کر دی ہیں۔"

اس مطالبہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا چاہیے کہ جب کسی ملک کا دستور مرتب کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے بطور اصولِ موضوعہ یہ طے کیا جاتا ہے کہ کن اصولوں کے مطابق نظام بنانا ہے۔ ابھی آپ کے سامنے ہندوستان کا دستور بن چکا ہے اور وہاں آپ دیکھ چکے ہیں کہ سب سے پہلے ملک کی دستور ساز اسمبلی نے ایک قرار داد مقاصد پاس کر کے ان مقاصد (Objectives) کا تعین کیا ہے جن کے لیے وہاں کی حکومت کام کرے گی۔ بالکل اسی طرح پاکستان میں بھی دستور سازی کا پہلا قدم یہی ہو سکتا ہے کہ مقاصد کو طے کر لیا جائے۔ انہی مقاصد کو ہم نے دستوری زبان میں چار نکات کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ اب میں اس کی ایک ایک شق کی تشریح کرتا ہوں۔

پہلی شق کی تشریح:

خدا کی حاکمیت

سیاست اور دستور (Constitution) میں بنیادی سوال یہ ہوا کرتا ہے کہ حاکمیت (Sovereignty) کس کی ہے؟ اگر حاکمیت کسی شخص یا کسی خاندان کے لیے مخصوص کی جاتی ہے تو پھر حکومت کی پوری مشینری اسی شخص یا خاندان کی مرضی کے گرد گھومتی ہے۔ اگر حاکمیت (Sovereignty) ملک کے عام باشندوں کی ہو اور مالک الملک خود ملک کے عوام ہوں تو پورا نظام باشندگانِ ملک کی مرضی کے گرد گھومتا ہے اور حکومت کے تمام ذرائع اور طاقتیں اس لیے استعمال ہوتی ہیں کہ ان مالکانِ ملک، یعنی عام لوگوں کے منشا کو پورا کیا جائے۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے اس لیے ہم نے سب سے پہلے اسی کو رکھا ہے۔ پاکستان کے باشندے چونکہ مسلمان ہیں، اس لیے وہ مالک الملک نہیں ہو سکتے، اُن کے مسلمان ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ اپنی حاکمیت اور آزادی سے خدا کے حق میں دست بردار ہو چکے ہیں۔ اب ان کا مقصدِ زندگی ہی یہ ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں خدائی حاکمیت کو تسلیم کر کے اُسی کے منشا کو پورا کریں۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پس مسلمانوں کی قائم کی ہوئی حکومت بھی اُسی صورت میں مسلمان ہو سکتی ہے جب کہ وہ اللہ تعالےٰ کو مالک الملک مان کر اس کی مرضی کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لے۔

بعض لوگوں نے اس مطالبہ کو یہ شکل دی ہے کہ حکومت یہ اعلان کرے کہ اس کا مذہب اسلام ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کافی نہیں، اس لیے کہ بہت سے ملک ایسے ہیں جنہوں نے اپنے دستور (Constitution) میں اپنی حکومت کا مذہب اسلام ہی قرار دے رکھا ہے، لیکن وہاں حاکمیت کسی فرد یا خاندان یا عام باشندگان ملک کی ہے۔ ——— میں کسی ملک کا نام لینا نہیں چاہتا کیونکہ ہم ایک آزاد قوم ہیں اور ہم کسی ہمسایہ ملک سے اپنے تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتے ——— بہرحال جب تک کوئی حکومت حاکمیت (Sovereignty) کو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص نہ قرار دے لے، دستوری حیثیت سے وہ اسلامی حکومت نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی دستور ساز اسمبلی سے پہلا مطالبہ اسی بات کا کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر ایمان لانے کا صاف صاف اعلان کرے۔

دوسری شق کی تشریح:۔

پاکستان کا بنیادی قانون

دوسری شق پہلی شق کا منطقی نتیجہ ہے۔ چونکہ مالک الملک خدا ہے اس لیے اُسی کی مرضی کو بنیادی قانون کی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے۔ اس شق کو مان لینے کے بعد یہاں کی پارلیمنٹ کا حقِ قانون سازی محدود (Limited) ہو جاتا ہے اور ہماری اسمبلیوں کے اختیارات دوسری اسمبلیوں کی طرح غیر محدود نہیں رہتے۔ دوسرے لفظوں میں ہماری اسمبلیاں خدا کی ہدایت سے آزاد ہو کر کوئی قانون سازی نہیں کر سکتیں، بلکہ اُن کے لیے دستوری طور پر لازم ہو جاتا ہے کہ جو قوانین اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر بتا دیئے ہیں، انہیں وہ جُوں کا توں بے چون و چرا قبول کر لیں اور ان کو پاکستان کے بنیادی قانون کی حیثیت سے نافذ العمل کریں۔ رہے وہ احکام جن کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہیں، ان کی مختلف تعبیروں میں سے کسی ایک تعبیر کو اختیار کرنے کا حق ان لوگوں کو ہوگا جو کتاب و سُنّت کا علم اور فہم رکھتے ہوں۔ پھر جن امور کے متعلق خدا اور رسولؐ نے کوئی واضح احکام نہیں دیئے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

وہاں واضح احکام نہ دیے کہ خدا اور رسولؐ نے خود یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ان معاملات کے بارے میں مسلمانوں کی جماعت آزاد ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق قواعد و ضوابط بنائے اور اس کام کے لیے مسلمان عوام بہرحال ان لوگوں ہی کو متعین کر سکتے ہیں جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

تیسری شق کی تشریح :-

شریعت اسلامی کا احیاء

یہ شق دوسری شق کا منطقی نتیجہ ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ جس شریعت کو منسوخ کر کے انگریز نے اپنے قوانین جاری کیے تھے اب وہی شریعت پھر نافذ ہونی چاہیے، اور انگریز کی بنائی ہوئی "کافرانہ شریعت" کو اب منسوخ کرنا چاہیے۔ اب اس ملک کا ہر قانون شریعت اسلامی کے مطابق ہوگا اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ شریعت کے خلاف کوئی قانون بنا دے۔ اب اگر کوئی مسودہ قانون شریعت کے خلاف یہاں کی پارلیمنٹ میں پیش ہوگا تو وہ از روئے دستور رد کر دیا جائے گا اور اگر کوئی ایسا قانون پاس ہو بھی جائے تو اس کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کر کے اس قانون کو منسوخ کرایا جا سکے گا۔

چوتھی شق کی تشریح :-

اسلامی حکومت کی عام پالیسی

کسی نظام کا انحصار صرف قانون پر نہیں ہوتا، بلکہ اس عام پالیسی پر ہوتا ہے جس پر نظام حکومت کو چلایا جاتا ہے۔ حکومت کو تعلیم و تربیت کے لیے ایک نظام بنانا ہوگا، وہ فوج اور پولیس کی تربیت کے لیے کوئی پالیسی اختیار کرے گی، وہ مالیات کا انتظام چلانے کے لیے کوئی خاص نقشۂ کار تجویز کرے گی، وہ صلح و جنگ اور بین الاقوامی تجارت، اور سفارتی و معاہداتی تعلقات کے لیے کوئی خاص روش اپنائے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ حکومت یہ سارے کام اُن حدود کے اندر رہ کر کرے جو اسلام نے اس کے لیے مقرر کر دی ہیں۔ اگر ہماری حکومت اپنے اختیارات کو مختلف داخلی و خارجی معاملات میں اسلام کی مرضی کے خلاف استعمال کرے تو اسلامی قانون کا اجراء

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

بے معنی ہو جاتا ہے۔ اِسی لیے ہم نے اس شق کو بھی اپنے مطالبہ میں شامل کر دیا ہے تاکہ اگر اِسلامی حدود سے باہر جا کر کوئی پالیسی اختیار کی جائے تو اس کے خلاف بھی عدالت میں دعوٰے دائر کر کے اُسے بدلوایا جا سکے۔

تبدیلی کا نقطۂ آغاز

میرے خیال میں اس تشریح کے بعد "مطالبہ" کا ٹھیک ٹھیک مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہو گی۔ کسی اسٹیٹ کو مسلمان بنانے کے لیے سب سے پہلا قدم یہی ہو سکتا ہے جس کا تقاضا اس مطالبہ میں کیا گیا ہے۔ پس اگر ہم اپنے ملک میں اِسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں حکومت سے اس مطالبہ کو منوانا چاہیئے۔ اور اگر اس مطالبہ کو مان لیا جائے تو دوسرا قدم یہ ہو گا کہ ایسے اہلِ علم کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ دستور (Constitution) اور قانون (Law) دونوں کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ وہ باہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور یہ طے کریں کہ قرآن و حدیث کی رُو سے وہ کون سے اصول ہیں جنہیں پاکستان کا بنیادی قانون قرار پانا چاہیئے۔ اور خلافت راشدہ سے وہ کون کون سی باتیں حاصل ہوتی ہیں جن کو نظائر (Precedents) کی حیثیت سے پیش نظر رکھنا ہو گا۔ لیکن یہ معاملہ تو بہرحال بعد کا ہے، اور جب اس کا وقت آئے گا تو یہ بھی ہو جائے گا۔ اس وقت تو سب سے اہم معاملہ یہی ہے کہ حکومت پاکستان اپنے دستور کی زبان سے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے۔ اس لیے اگر پاکستان کے لوگ فی الواقع یہ چاہتے ہیں کہ یہاں کا نظام حکومت اِسلامی ہو تو وہ اس مطالبہ کو اپنا مطالبہ بنائیں۔ یہ میرا یا کسی پارٹی کا مطالبہ نہیں ہے، اس میں کسی شخص کو "شیخ الاسلام" بنانے کا یا کسی خاص فرقے کے علماء کو عہدے دلوانے کا، یا کسی خاص سیاسی پارٹی کے حقوق منوانے کا کوئی سوال شامل نہیں ہے، بلکہ یہ مطالبہ پوری اُمت کا ایک عام اجتماعی مطالبہ ہے۔

مطالبہ کیوں؟

اس مطالبہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہاں ایک معنوی انقلاب رونما ہو گیا ہے۔ اگر یہ انقلاب اسلامی اصولوں کے مطابق فطری طور پر رونما ہوا ہوتا تو اس مطالبہ کی ضرورت

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پیش نہ آتی، بلکہ انقلاب کے ساتھ ہی آپ سے آپ اِس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہوجاتی۔ لیکن بحالاتِ موجودہ ایک مصنوعی انقلاب کے بعد جتنا اس امر کا امکان ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہوجائے، اُتنا ہی اس امر کا بھی امکان ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام اس ملک پر مسلط کر دیا جائے۔ اس لیے اسلامی نظام اب ایک منظّم اور پُر زور مطالبے ہی کے ذریعے قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس مطالبے کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں ہم نے اپنی باگیں دے دی ہیں وہ ایک مدت سے متضاد باتیں کہہ رہے ہیں۔ یہ حضرات کبھی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاکستان حاصل کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں اگر یہاں اسلامی نظامِ حکومت قائم نہ کیا جائے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہاں ایک لادینی جمہوری اسٹیٹ (Secular Democratic State) قائم کیا جائے گا۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہاں قرآن کی حکومت ہوگی۔ اور کبھی یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہاں سیاسی حیثیت سے نہ ہندو ہندو ہوگا نہ مسلمان مسلمان، بلکہ سب محض پاکستانی ہوکے رہیں گے۔ پھر اسلامی حکومت کی بھی مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں۔ کبھی اس کی تعبیر یہ کی جاتی ہے کہ یہ انصاف اور مساوات اور اخوت کا ہم معنی ہے اور کبھی "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ نہ معلوم یہ اسلامی سوشلزم کیا چیز ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ خود بھی اس کا مطلب نہیں جانتے۔ کبھی یہ اسلامی جمہوریت کا بھی چرچا کرتے ہیں۔ ہم ان سے صاف صاف کہے دیتے ہیں کہ اگر موجودہ نظام جمہوری نظام ہے اور اس میں آپ عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں تو آپ کا فرض ہے کہ لوگ جس معنی میں اسلامی نظام کے خواہشمند ہیں، آپ اُسی معنی میں اُسے قائم کریں، آپ کو اور کچھ کرنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔

مطالبہ کرنے کی دوسری وجہ

پھر یہ مطالبہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیارات دیئے ہیں ان میں سے بعض ان اختیارات کو بھی خلافِ اسلام طریق پر استعمال کر رہے ہیں جو قوم کو اسلام سے ہٹا کر غیر اسلام کی طرف لے جانے والا ہے۔ ان میں سے ایک اچھا خاصا گروہ ایسا ہے جو اسلام کے اصولوں پر فی الواقع عقیدہ نہیں رکھتا۔ جنہوں نے مغربی

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اصولوں کو اپنے لیے اور اپنی نسلوں کے لیے پسند کر لیا ہے اور اپنے گھروں کی فضا کو ان کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ جتنے یہ خود بگڑے ہیں، اتنا ہی پوری قوم کو بگاڑ دیں اور اس کام کے لیے وہ اُن اختیارات کو استعمال کر رہے ہیں جو قوم نے ان کے ہاتھ میں دیے ہیں۔ اس بارے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بے شمار مثالیں دن رات ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ مَیں اس کی صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ یہ ہمارے ایک فوجی بھائی کا خط ہے جو اخبار "کوثر" لاہور کے ۲۷ فروری ۱۹۴۸ء کے پرچہ میں، اور "جہانِ نو" کراچی کی ۹ اپریل کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

(خط پڑھ کر سنایا گیا جس میں ملٹری آفیسرز کے ایک تفریحی مجمع کا افسوسناک نقشہ مذکور تھا۔ جہاں کنگ جارج اور قائد اعظم کے جام صحت کے طور پر شراب پی گئی، ماتحت افسروں کو بیویوں کے بے پردہ کرنے کی تلقین کی گئی اور اس کو ترقی منصب کا لازمہ قرار دیا گیا، "نماز" کو فوجی ذائض کے مقابلہ میں مؤخر رکھنے کے لیے ریمارک دیے گئے۔)

یہ ایک مثال ہے اور اس قسم کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے روز آ رہی ہیں۔ ایک جگہ ایک چپراسی نماز کے لیے گیا تو اُسے ڈانٹا گیا۔ لاہور کے میڈیکل کالج کا واقعہ ہے کہ لدھیانہ کا ایک طالب علم جس نے جوشِ ایمان کے تقاضے سے اپنی صورت مسلمانوں کی سی بنا رکھی تھی، جب کالج میں داخلہ کے لیے گیا تو پرنسپل صاحب نے انٹرویو میں فرمایا کہ تمہارے چہرے پر ڈاڑھی ہے، تم کسی مسجد میں جا کر ملّاں بن جاؤ، کالج سے تمہیں کیا واسطہ؟ "جہانِ نو" کی ۹ اپریل کی اشاعت میں ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محکمۂ فوج میں ڈاڑھیوں پر پابندی لگائی جا رہی ہے۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری فوج کے ان اعلیٰ عہدے داروں کو کبھی کسی سکھ پر بھی اس قسم کے اعتراض کرنے یا اس طرح کی پابندیاں لگانے کی جرأت ہوتی تھی؟ مَیں نے یہ اخبار جس میں ہمارے فوجی بھائی کا خط چھپا ہے، یہاں کراچی بھیجا، اور دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے پاس بھجوایا کہ وہ حکومت سے پوچھیں کہ کیا یہ گورنمنٹ کی پالیسی ہے یا محض افسرانِ حکومت کی ذاتی روش ہے؟ لیکن

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کوئی شخص اس سوال کو اٹھانے کے لیے تیار نہ ہو سکا۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ اس کی کوئی اہمیت محسوس نہیں کرتے یا کم از کم اس کی طرف سے بے اعتنائی برتنا چاہتے ہیں۔

"دلیل معہ قوت" کی ضرورت

پھر اس مطالبے کی ضرورت اس لیے بھی پیش آئی کہ ہمارے یہ رہنما انگریز کے شاگرد ہیں۔ اگر یہ دلیل سے ماننے والے ہوتے تو ایک آدمی کا کہہ دینا کافی ہوتا۔ لیکن یہ اس طرح سے ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ کسی بات کو اس وقت تک نہیں مانتے جب تک اس کے پیچھے قوت نہ ہو۔ ہم نے خود اس مطالبہ کو بھی دستور ساز اسمبلی کے ارکان کے پاس بھجوا کر حالات کو جانچنے کی کوشش کی ہے، اور ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا اور کوئی رکن اسے دستور ساز اسمبلی میں غور و بحث کے لیے پیش کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکا۔ اس لیے اب ہم اس مطالبے کو لے کر قوم کے سامنے آتے ہیں۔ اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ آپ کو اسلامی حکومت درکار ہے یا نظامِ کفر؟

منظم اور متحدہ مطالبہ

میں مسلمانوں کے تمام گروہوں سے کہتا ہوں کہ یہاں شخصیتوں اور گروہوں کا سوال نہیں ہے، بلکہ ہم سب خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھوں سے یا ہماری نگاہوں کے سامنے یہاں غیر اسلامی نظام قائم ہو گیا تو ہم سب اُس کی عدالت میں پکڑے جائیں گے۔ اس لیے آپ اپنے سارے اختلافات کو بھول جائیے۔ آپ اگر آرام سے بیٹھے رہے تو یہ کام نہیں ہو سکے گا۔ اس مطالبہ کو منوانے کے لیے تمام ضروری تدابیر اختیار کیجیے اور آپ کو خوب معلوم ہے کہ کسی مطالبہ کو منوانے کے لیے کیا کیا تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے پاکستان کا مطالبہ منوا کر جو تجربہ کیا ہے اس سے فائدہ اُٹھائیے اور جن صحیح اور مؤثر تدابیر کو آپ نے اُس مطالبہ کو منوانے میں استعمال کیا ہے، اُن سب کو نظامِ اسلامی کے مطالبے کے لیے بھی اختیار کیجیے۔ یہ مطالبہ بھی مخلصانہ کوشش چاہتا ہے، یہ بھی منظم اور متحد طاقت چاہتا ہے اور یہ بھی مال اور وقت اور آرام کی قربانیاں چاہتا ہے۔ اگر ان شرائط کو پورا کر

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں: www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے آپ یہ ثابت کردیں کہ یہ قوم کا اجتماعی مطالبہ ہے تو کس طرح ممکن ہے کہ آپ کے لیڈر اس کے خلاف جائیں۔ آپ اس کے لیے جلسے کیجیے، اس کے لیے ریزولیوشن پاس کیجیے، اس کے پوسٹر آویزاں کیجیے، اس کو ریل کے ڈبوں اور موٹر بسوں میں لکھوا لیجئے، اسے اپنی خط و کتابت کے کارڈوں اور لفافوں پر طبع کرا لیجئے تاکہ اس مطالبے کے چار نکات آپ کے بچے بچے کی زبان پر چڑھ جائیں۔

مسلم لیگی بھائیوں کی ذمہ داری

میں اپنے مسلم لیگی بھائیوں سے کہتا ہوں کہ آپ نے پاکستان اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے مانگا تھا، آپ نے سب کچھ اسلام کے نام پر کیا، اب آپ آزمائش میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ اس آزمائش پر آپ پورے اُترنا چاہتے ہیں تو اس مطالبہ کو اپنا مطالبہ بنائیے، اسے ابتدائی مسلم لیگوں سے پاس کرائیے، پھر صوبائی مسلم لیگوں کے سامنے یہ مسئلہ لائیے اور پھر جو لوگ اس مطالبے سے متفق نہ ہوں، انہیں لیگ سے باہر نکال دیجیے۔ اب اشتراکیوں اور ملحد قسم کے لوگوں کے مسلم لیگ پر قابض رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی ہے۔ اگر یہ دونوں باتیں ہو جائیں تو پھر مسلم لیگ اور جماعت اسلامی میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا بلکہ دونوں قریب قریب ایک ہو جاتی ہیں۔

تعلیمیافتہ طبقہ کا فرض

میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے سے بھی اپیل کرتا ہوں کہ وہ وقت کی نزاکت کو محسوس کریں۔ اُن پر اس سلسلے میں بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ کسی ملک کی قوت لوہا اور کوئلہ نہیں ہے بلکہ اس کے سوچنے اور سمجھنے والے لوگ ہی اس کی اصل قوت ہوتے ہیں۔ آپ حضرات قوم کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ کو اپنا وزن کس پلڑے میں ڈالنا ہے؟ اگر آپ کو اپنے اطمینان کے لیے دلائل درکار ہیں تو ہم آپ کے تمام شکوک و شبہات دُور کرنے کے لیے تیار ہیں اور آپ کو مطمئن کر سکتے ہیں کہ آپ کی، آپ کی قوم کی، بلکہ پوری دنیا کی فلاح اسی میں ہے کہ یہاں اسلامی نظام حکومت قائم ہو۔ اگر آپ اس پر مطمئن ہو چکے ہیں تو آپ کی ساری قوتیں اور قابلیتیں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

اس کی تائید میں صرف ہونی چاہئیں۔ پہلے پاکستان بننے کا مقصد بھی قوم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوا جب تک آپ نے اپنا سارا وزن اس پلڑے میں نہیں ڈالا۔ اب نظامِ اسلامی قائم کرنے کا مقصد بھی اسی وقت پورا ہوگا جب کہ آپ اپنا پورا وزن اس پلڑے میں ڈال دیں گے۔

علماء و مشائخ سے گزارش

میں علماء اور مشائخ سے بھی کہتا ہوں کہ براہِ کرم جزئی اختلافات کو چھوڑ دیجئے اور اپنی ساری کوششیں اس کام پر مرتکز کر دیجئے۔ اگر یہ اصلاح ہوگئی تو سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی ملک میں غیر اسلامی نظام نافذ ہو جاتا ہے تو ایک ایک کر کے اس میں سے اسلام کے سارے نشانات مٹ جاتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں ایک ملک ایسا بھی ہے جس نے مسلمان ہوتے ہوئے حج کو برسوں ممنوع رکھا، قرآن کے قوانین کو منسوخ کر کے اُن کے بجائے دوسرے قوانین بنائے، قرآن مجید نے عورت کا حصہ وراثت میں مرد سے آدھا رکھا ہے اُس نے ازروئے قانون عورت کا حصہ مرد کے برابر کر دیا۔ ہمارے ملک میں اب تک اسلام سے جو رعایات روا رکھی گئی ہیں اور جو نرمی کا سلوک اس سے کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ایک غیر قوم کی حکومت تھی اور اس کی مصلحت اسی میں تھی کہ وہ مذہب کے معاملہ میں ذرا ڈھیل دے دے۔ لیکن اگر آپ کے اپنے ووٹوں سے یہاں لادینی حکومت قائم ہوگئی تو پھر اسلام کا نشان اس ملک میں باقی نہ چھوڑا جائے گا۔ کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ اسی دنیا میں ایک مسلمان ملک کی حکومت ایسی بھی ہے جس نے لادینی نظام قائم کرنے کے بعد دینی تعلیم کو قانون کی طاقت سے حرام کر دیا ہے۔ اس لیے آپ اب جزئیات اور فروعات کو بھول جائیے اور ساری قوت اس کام پر اور اس بنیادی اصول کو منوانے پر صرف کر دیجیے کہ یہاں کا نظام اپنی بنیادی فطرت کے لحاظ سے صحیح معنوں میں اسلامی ہوگا۔

یہ جو کبھی کہا جاتا ہے کہ شراب بند کی جائے، کبھی یہ کہ زنا کے اڈے اُڑا دیئے جائیں ـــــ تو یہ کام تو کانگریسی حکومت بھی کرتی رہی ہے۔ کیا ان کاموں کے کرنے

www.iqbalkalmati.blogspot.com :مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

سے کوئی حکومت اسلامی حکومت ہو جاتی ہے گی؟ پھر کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک بیت المال قائم کیا جائے جس میں زکوٰۃ کی وصولی اور صرف کا انتظام کیا جائے۔ لیکن یہ تو وہ حقوق ہیں جو کبھی ہم نے اپنی اسلامی حکومتوں میں اپنے ہاں کے ذمیوں کو دیئے تھے، اور جو امریکہ، رومانیہ اور یوگوسلاویہ، بلکہ روسی ترکستان تک کی حکومتوں نے اپنی مسلمان رعایا کو دے رکھے ہیں ---- کیا ان باتوں سے کوئی نظامِ حکومت اسلامی نظام میں بدل جاتا ہے؟

جزئی مطالبات چھوڑ دیجیے

ہم تو وہ حکومت چاہتے ہیں، جس کی ساری اسمبلیاں اور وزارتیں، نظامِ تعلیم اور نظامِ عدالت اور پورے کا پورا مالیاتی نظام اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ بیت المال تو علماء کی تحویل میں رہے اور مالیات کا نظام غیر اسلامی ہاتھوں میں رہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ملک کا پورا خزانہ اسلامی بیت المال میں بدل جائے۔ لہٰذا براہِ کرم آپ حضرات چھوٹی چھوٹی چیزیں نہ مانگیے، ورنہ ایسی دو ایک چیزیں دے کر آپ کو مطمئن کر دیا جائے گا۔ پھر اگر آپ اس کے بعد کوئی اور جزئی مطالبات سامنے لائیں گے تو کہا جائے گا کہ یہ مُلّا لوگ نہایت نامعقول ہیں، ان کے مطالبات کبھی ختم نہ ہوں گے اور یہ ملک کی ترقی اور استحکام کے راستے میں خواہ مخواہ روڑے اٹکاتے رہیں گے۔ پس آپ اپنی ساری قوت اُس بنیادی مطالبے کے منوانے پر صرف کیجیے جس کے اندر آپ کے سارے مطالبات مُضمر ہیں۔

سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو تنبیہ

اب میں کچھ باتیں اپنے ملک کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے کہنا چاہتا ہوں۔ آپ حضرات نے ناجائز طریقوں سے جو کچھ سمیٹ رکھا ہے، اسے تو اب بہرحال جانا ہے۔ سرمایہ پرستانہ طور طریقوں کا اب زمانہ نہیں رہا۔ اب روپے کی خدائی کا تخت متزلزل ہو رہا ہے۔ اب دوسروں کی محنتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور اسراف اور عیاشی کی زندگی کے لیے دوسروں کی کمائیوں میں سے سرمائے کے زور پر اپنے حق سے زائد وصول کرنے کا سلسلہ بہرحال ختم ہونا ہے۔ ان چیزوں کو ختم کرنے کے لیے آپ دو ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ کو پسند کر لیجیے۔ ایک ہاتھ وہ ہے جو

آپ کے خود ساختہ حقوق اور اعزازات کے ساتھ خود آپ کو بھی مٹا دے گا اور دوسرا ہاتھ وہ ہے جو جب بھی اُٹھے گا، انتقام کے لیے نہیں، انصاف کے لیے اُٹھے گا، اور وہ آپ سے صرف اتنا ہی چھینے گا جو آپ نے ناجائز طور پر سمیٹ رکھا ہے۔ اگر آپ نے انصاف کرنے والے خدا پرست ہاتھ کو پسند نہ کیا تو پھر یہاں دوسرا انتقامی ہاتھ بھی بہرحال دراز دستی کے لیے موجود ہے اور وہ اپنا کام کر کے رہے گا۔

مزدوروں اور کسانوں سے اپیل

اسی طرح میں اپنے ملک کے مزدوروں اور کسانوں سے بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ آدمی صرف روٹی کے لیے نہیں جیتا، آدمی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز آدمیت ہے۔ اگر آپ کو کوئی ایسا نظام ملے جو آپ کے لیے روٹیوں کا تو انتظام کر دے، مگر آپ کی آدمیت کو ختم کر دے تو اسے ہرگز قبول نہ کیجیے۔ ایک نظام ایسا بھی موجود ہے جو آپ کو روٹی بھی دیتا ہے اور آپ کی آدمیت کا بھی انتظام کرتا ہے۔ وہ آپ کے مسئلے بھی حل کرتا ہے اور آپ کو روحانیت اور انسانیت کے مدارج بھی طے کراتا ہے۔

مسلم عوام سے خطاب

اب میں مسلمان عوام سے چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کو سمجھنا چاہیئے کہ اسلام کیا ہے۔ اگر آپ اسلام کی حقیقت سے ناواقف رہے تو ہو سکتا ہے کہ اسلام کا نام لے کر آپ کو کفر کی طرف دھکیل دیا جائے، شراب کی بوتل پر شربت کا لیبل لگا کر اسے آپ کے ہاتھ فروخت کیا جائے اور آپ اسے لپک کر لے لیں، یہاں ایک غیر اسلامی نظام قائم کر دیا جائے اور اس کے ساتھ کچھ نمائشی چیزیں اسلام کی شامل کر دی جائیں اور آپ ان نمائشی چیزوں سے دھوکا کھا کر مطمئن ہو جائیں کہ بس اب اسلامی نظام قائم ہو گیا۔

ہم نے اپنی ساری قوت اس مقصد پر لگا دینے کا فیصلہ کیا ہے کہ ملک کے عوام میں صحیح اسلامی شعور بیدار ہو۔ ہم اُن کو جھنڈوں اور جلوسوں اور جذباتی نعروں سے ایک کھوکھلے اشتعال میں مبتلا کرنے کا طریق کار صحیح نہیں سمجھتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اندھے جذبات کی رو میں بہنے لگیں۔ بلکہ ہم ان کے اندر اسلام کے لیے جینے اور مرنے کا شعوری ولولہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

پر ایک حقیقت ہے کہ اگر ہمارے ملک کی حکومت کے لیے ایک ایسا دستور بنا دیا جائے جو سو فیصدی اسلامی ہو، لیکن اس کی پشت پر اسلامی سوسائٹی نہ ہو تو وہ اسلامی دستور کوئی حقیقی نتیجہ نہیں دکھا سکتا اور نہ اس کے بل پر اسلامی نظام چل سکتا ہے۔ کوئی دستور کاغذ کے اوراق پر نہیں چلا کرتا، بلکہ اس کا بننا اور اس کا کام کرنا اس بات پر موقوف ہوتا ہے کہ ملک کے عوام کی کتنی منظم طاقت اس کو چلانے کا عزم رکھتی ہے۔ اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ جو لوگ اسلام کو اپنے دین اور مسلکِ زندگی کے طور پر پسند کرتے ہیں وہ ہمارا ساتھ دیں اور دین کی خدمت کے لیے منظم ہوں۔

اب میں اُن عذرات کو رفع کرنے کی کوشش کروں گا جو وہ طبقہ ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے جو اسلامی نظام کو پسند نہیں کرتا اور اس کے قیام کا مخالف ہے۔

استحکامِ پاکستان کا عذر

ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ نوزائیدہ حکومت ابھی بنی ہے اور جمی نہیں ہے۔ سرحد پر چاروں طرف سے خطرہ ہے۔ بس اِس وقت ساری طاقت پاکستان کو مضبوط کرنے میں صَرف ہونی چاہیئے اور اسلامی حکومت کی بنیاد رکھنے کے کام کو ملتوی رکھنا چاہیئے۔

مَیں کہتا ہوں کہ پاکستان کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنا ہر اُس شخص کا فرض ہے جو اس میں رہتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کے لیے اصل خطرہ کہاں ہے؟ ——— اس کے اندر یا باہر؟ مَیں کہتا ہوں کہ اصل خطرہ باہر سے نہیں، بلکہ اندر سے ہے، اس لیے کہ اس کشتی کے ملاح دن رات اس میں چھید کرتے رہتے ہیں۔ ان کی رشوت خوری اور اقربا پروریاں پاکستان کو مسلسل کمزور کر رہی ہیں۔ جن نازک حالات کا دنیا یہ دن رات خود دیکھتے ہیں ان میں جو حرکات یہ لوگ خود کر رہے ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر اکثر مسلمان یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ اگر پاکستان میں بھی یہی کچھ ہونا تھا تو ہم ہندوستان میں کیا بُرے تھے؟ کتنے ہی مظلوم مہاجر یہ سوال کرتے پائے گئے ہیں کہ کیا پاکستان ان ہی مقاصد کے لیے بنایا گیا ہے؟ یہ چیزیں ہمارے عوام کا دل توڑنے والی اور ان کے جذبات کو سرد کرنے والی ہیں۔

پاکستان کو مضبوط بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ایک ایک نوجوان اور ایک ایک فوجی سپاہی کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ جب وہ لڑے گا تو محض زمین کے

www.iqbalkalmati.blogspot.com

لیے نہیں، بلکہ خدا کے لیے لڑے گا اور اگر وہ جان دے گا تو قوم کے کچھ لیڈروں اور عہدیداروں کے لیے نہیں، بلکہ خدا کے دین کے لیے دے گا۔ اگر آپ اپنے ہر فوجی کو اس بات پر مطمئن کر دیں کہ تیری خدمات صرف اسلام کے لیے حاصل کی گئی ہیں تو پھر دیکھیے کہ وہ کس جرأت اور دلیری سے لڑتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں اور اپنے سپاہیوں کے دلوں کو اطمینان دلانے کی اس کے سوا کوئی اور تدبیر نہیں رکھتے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کا صاف صاف دستوری اعلان کر دیں۔ پھر کون معقول آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ جو چیز ہم پیش کر رہے ہیں وہ پاکستان کو مستحکم کرنے والی ہے اور عین اس کے استحکام ہی کے لیے اس کو کامیاب بنانے کی ضرورت ہے۔

انتشار انگیز عصبیتیں

پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مختلف عناصر اور مختلف صوبے متحد ہو کر ایک بنیانِ مرصوص بن جائیں۔ لیکن جن اصولوں پر ہم آج تک کام کرتے رہے ہیں ان کا قدرتی نتیجہ یہ نمودار ہو رہا ہے کہ ہر گروہ جو اپنا کوئی مختلف مفاد رکھتا ہے وہ ایک جداگانہ عصبیت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ یہی اصولِ قومی وحدت پیدا کرنے والی مغربی سیاست کے زہر کا اثر ہے کہ اب ایک پاکستان میں ایک مسلمان قوم نہیں بلکہ پانچ علاقائی قومیں بن گئی ہیں: سندھی، بلوچی، پنجابی، افغانی اور بنگالی! ان سب کو یکجا کر کے بنیان مرصوص صرف اسلام ہی کے ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

پھر یہاں "انصار" اور "مہاجرین" کی باہمی کشمکش کے سبب سے ان کے دو الگ الگ نظام بن رہے ہیں اور دو الگ الگ ریاستیں رونما ہو رہی ہیں۔ اور اگر حالات اسی رفتار پر رہے اور ان کا کوئی سدِباب نہ کیا گیا تو یہ مسئلہ بھی پاکستان کے لیے ایک مستقل خطرہ بن

ؔ یہ الفاظ طنزیہ استعمال کیے گئے ہیں۔ ورنہ اسلامی اصطلاح کے لحاظ سے نہ مقامیوں نے کبھی "انصار" کا سا رویہ اختیار کیا اور نہ ہندوستان سے آنے والوں نے مہاجرین کا سا رویہ، اِلّا ماشاء اللہ۔ (جدید)

www.iqbalkalmati.blogspot.com مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

کے موجود رہے گا۔ آپ اس واقعہ سے خطرہ کا اندازہ کیجیے کہ مشرقی پنجاب سے آئی ہوئی ایک برادری کو جب مغربی پنجاب کی سرحد پر آباد کیا گیا تو وہاں کے مقامی باشندوں نے سکھوں کو دعوت دے کر ان پر حملہ کرا دیا۔ یہ متضاد عناصر پاکستان کے لیے اس وقت تک خطرہ ہیں جب تک ان کے درمیان عصبیتیں کام کرتی رہیں۔ ان کو اگر باہم جوڑا جا سکتا ہے تو اسلامی نظام کی فضا میں اسلامی اصولوں کے ذریعہ ہی جوڑا جا سکتا ہے، ورنہ ان کے ہر وقت متصادم ہو جانے کا امکان ہے۔

مسئلۂ مہاجرین کا واحد حل

اگر پاکستان حاصل ہونے سے پہلے ہمارے لیڈروں نے قوم کے اخلاق کی صحیح تعمیر اسلامی اصول پر کر لی ہوتی تو مہاجرین واقعی "مہاجرین" ہوتے اور انصار واقعی "انصار"، پھر ان کا مسئلہ حل کرنے میں ہمیں وہ مشکلات پیش نہ آتیں جو آج دن رات پیش ہیں۔ قوم میں اسلامی حس بیدار ہوتی تو یہاں کے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر مشرقی پنجاب کے مظلوموں کا استقبال کرتے، خود زمین پر سوتے اور اپنے بستر اور پلنگ آنے والوں کے حوالے کر دیتے۔ یہ مسئلہ کوئی آج ہی ہمارے سامنے نہیں آیا۔ اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔ مدینہ کی چھوٹی سی بستی نے مکّہ اور عرب کے مختلف قبائل کے مہاجرین کی ایک کثیر تعداد کو اس صبر و سکون سے جذب کیا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی کہ اہلِ مدینہ کو کوئی مشکل مسئلہ درپیش ہے، درآنحالیکہ اس زمانے میں تمدنی ذرائع و وسائل بہت ہی ابتدائی حالت میں تھے۔ وہاں بھی اس مسئلہ کو اسلامی اسپرٹ اور اسلامی اخلاق نے حل کیا تھا اور یہاں بھی اس گتھی کا واحد حل یہی ہے۔

اب یہ بات ہر شخص کے خود سوچنے کی ہے کہ پاکستان کو کمزور کرنے والی شے وہ ہے جسے ہم پیش کرتے ہیں یا وہ ہے جو اس کے خلاف کی جا رہی ہے؟

ہندوستان میں ہندو حکومت کے قیام کا خدشہ

دوسرا عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اگر یہاں اسلامی حکومت قائم کر دی گئی تو ہندوستان میں ہندو حکومت قائم ہو جائے گی۔ میں کہتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں ہندو حکومت قائم نہیں ہو چکی؟ کا عذر یہ کہا جا رہا ہے کہ انڈین یونین کی حکومت کا کوئی مذہب نہیں اور اس میں سب کو

www.iqbalkalmati.blogspot.com

برابر کے حقوق حاصل ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کو زمین پر چلنے کے بھی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ اس لیے آپ وہاں کی فکر نہ کریں، وہاں تو جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا۔ دوسری بات میں یہ کہتا ہوں کہ اب تک جو نقصان ہمیں پہنچا ہے وہ اسی لیے پہنچا ہے کہ ہم اسلام کا نام تو لیتے ہیں لیکن اسے اپنی زندگی کا دستور العمل نہیں بناتے۔ اگر یہاں ایک مرتبہ اسلامی نظام قائم ہو جائے جو بے لوث انصاف کے بل پر چلے اور یہاں کی حکومت دنیا کی کھری ہو، اور اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دے کہ اس کے تمام معاملات عدل و انصاف اور صداقت و دیانت پر مبنی ہوتے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی قسمت جاگ اٹھے بلکہ خود ہندوستان کی قسمت بھی بدل جائے۔ آخر پہلے یہ ہندوستان کے مسلمان کہاں سے آئے تھے؟ یہیں کے ہندو ہی تو زیادہ تر مسلمان ہوئے تھے۔ تو پھر آج بھی اگر آپ دکھا دیں کہ اسلام سے ملک کا انتظام کیسا درست ہوتا ہے، معاشی اور معاشرتی نظام کتنے صالح ہو جاتے ہیں، پالیسی کتنی بے لاگ ہوتی ہے تو ہندوستان کے لوگ سوچنے لگیں گے کہ آخر کیوں نہ ہم بھی اس نظام کو اختیار کر لیں۔ وہ آپ کے دشمن تو ہو سکتے ہیں، مگر اپنے تو دشمن نہیں ہیں۔ یہی ایک صورت ہے جس سے ہماری آٹھ سو سالہ تاریخ جس پر خطِ نسخ پھر گیا ہے، از سرِ نو زندہ کی جا سکتی ہے۔

ہندو اقلیت کا عذر

پھر یہ عذر کیا جاتا ہے کہ اسلام کی حکومت کو ہندو اقلیت کیسے گوارا کرے گی۔ یہ عذر بھی مہمل ہے۔ ابھی پچھلے دنوں سرحد اسمبلی میں کو ٹورام نے ایک ریزولیوشن پیش کیا ہے جس میں سرحد اسمبلی سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ دستور ساز اسمبلی کو صوبہ سرحد کے عوام کی اس خواہش سے آگاہ کرے کہ وہ پاکستان میں اس نظامِ حیات کو جلد از جلد نافذ کرانا چاہتے ہیں جس کی بنیاد قرآن کے قوانین پر ہو۔ یہ نظام یقیناً دنیا کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال ثابت ہو گا۔

چند ہی روز پہلے میرے پاس مدراس سے ایک خط آیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ "اسلام کا نظریہ سیاسی" اور "معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل" (میرے دو رسالے) پڑھنے کے بعد ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ "ہم پر یہ چیز کبھی واضح نہیں کی گئی کہ پاکستان میں اس طرح کا صالح نظام

www.iqbalkalmati.blogspot.com : مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حیات قائم کیا جائے گا۔ اگر مسٹر جناح اس چیز کی وضاحت فرما دیتے تو کوئی ذی فہم انسان اس کی مخالفت نہ کرتا۔

غیر مسلم اقلیتوں سے اپیل

تاہم مجھے معلوم ہے کہ ہمارے ملک کے بہت سے غیر مسلم حضرات اس سے گھبرا رہے ہیں کہ وہ ایک ایسی حکومت کے فرمانبردار کیسے ہو سکتے ہیں جو ایک مذہب کی پابند ہو۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہمارے غیر مسلم بھائی ایک چیز کو محض نہ جاننے کی وجہ سے اس سے اختلاف کر رہے ہیں، حالانکہ یہ صحیح معنوں میں وہی چیز ہے جسے گاندھی جی "رام راجیہ" کہتے تھے اور ہمارے عیسائی بھائی "آسمانی بادشاہت" کہتے ہیں۔ ہم اپنے ہندوستانی ہندو بھائیوں کے شکر گزار ہوں گے، اگر وہ ہندوستان میں حقیقی رام راجیہ قائم کر دیں، اس رام راجیہ میں بنیادی انسانی حقوق کی حفاظت موجودہ لادینی حکومت کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریق سے ہو گی۔ میں اپنے غیر مسلم بھائیوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر یہاں اسلامی حکومت قائم ہو گی تو ان کے حقوق بالکل محفوظ ہوں گے اور زمین پر بھی ان کو وہی حقوق دیئے جائیں گے جو کاغذ پر ہوں گے۔ لیکن اگر یہاں جمہوریت کی لادینی حکومت قائم ہوتی تو یہ مسلمانوں کی "قومی حکومت" ہو گی جس میں اکثریت اپنی مرضی کے مطابق اپنے سارے قومی تعصبات کے ساتھ من مانی کارروائیاں کرے گی۔ اسلامی حکومت کے قائم ہونے کی صورت میں جو حقوق اسلام میں آپ کے لیے مقرر ہیں، مسلمانوں کو اور ان کی حکومت کو اس کا اختیار ہی نہیں رہے گا کہ وہ ان میں کمی بیشی کریں۔ یہاں کا مسلمان اپنے اخلاقی طرزِ عمل کو انڈین یونین کے یا دنیا کی کسی اور غیر مسلم قوم یا حکومت کے رویّے کو دیکھ دیکھ کر نہیں بدلے گا، بلکہ اس کا طرزِ فکر یہ ہو گا کہ دوسری قومیں اور حکومتیں اگر اپنے عہد کو توڑتی ہیں تو توڑیں، میں مسلمان ہو کر اپنے عہد کو کیسے توڑ سکتا ہوں۔

یہ بات آپ کو معلوم ہے کہ گزشتہ فسادات میں اگر کسی نے یہاں غیر مسلموں کو ظلم سے بچانے کی کوئی بے غرضانہ کوشش کی ہے تو وہ دیندار لوگ ہی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان میں ان کے بھائیوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، لیکن پھر بھی ان کی خدا خوفی اور انسانی ہمدردی نے انہیں زیادتی اور ظلم سے ذرہ برابر باز رکھا، بلکہ انہوں نے حتی الامکان اپنے غیر مسلم بھائیوں کو پناہ دی اور محفوظ مقامات تک پہنچایا اور اس کام میں اپنی جان اور مال کی ذرا پروا نہ کی۔ ہمارے پاس ایسے بہت سے واقعات کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

نہ صرف یہ کہ ریکارڈ ہے، بلکہ خود غیر مسلم حضرات کے متعدد اعترافی خطوط ہم تک پہنچے ہیں اور ہندوستان جانے والے غیر مسلموں میں سے ہزاروں اس کی گواہی دیں گے۔

اسلامی حکومت کی گارنٹی

اسلامی حکومت کی صورت میں یہاں جو گارنٹی دی جائے گی وہ ہماری طرف سے نہیں، بلکہ خدا اور رسولؐ کی طرف سے ہوگی۔ حضورؐ کے الفاظ ہیں کہ جو ذمّی پر ظلم کرے یا اس کا حق مارے، قیامت کے روز میں خود اس کے خلاف مدعی ہوں گا اور وہ جنت کی بو بھی نہ سونگھے گا۔ پھر حضورؐ کی آخری وصیت میں جہاں نماز اور عورتوں کے حقوق کی تاکید تھی، وہاں ذمیوں کے حقوق کی ادائیگی کا بھی حکم تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ جب مسلمان فوج ایک جگہ سے پسپا ہونے پر مجبور ہوئی تو انہوں نے غیر مسلموں کو بلا کر ان کے ٹیکس واپس کر دیئے کہ ہم نے ٹیکس آپ کی حفاظت کی ذمہ داری کے معاوضے کے طور پر لیے تھے اور چونکہ اب ہم حفاظت کی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر ہیں، اس لیے اس رقم پر بھی اب ہمارا کوئی حق نہیں رہا جو تمہاری حفاظت کے لیے لی گئی تھی۔ میں غیر مسلم بھائیوں سے کہوں گا کہ یہ نظام آپ کے لیے رحمت ہوگا، آپ اس کے قائم کرنے میں ہمارا ساتھ دیجیے اور ہمیں مدد پہنچائیے۔ اسلامی نظام میں آپ کے لیے مغربی طرز کی بے دین جمہوریت کے مقابلے میں اتنی زیادہ برکات ہیں کہ اگر آپ کو ان کا اندازہ ہو تو آپ مغربی جمہوریت کی مخالفت اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر کوشش کریں۔

دنیا کی رائے عام کے بگڑ جانے کا ہوّل

یہ عذر بھی کیا جاتا ہے کہ اگر ہم نے مذہبی حکومت قائم کی تو دنیا کی رائے عام ہمارے متعلق خراب ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی وجہ سے ہمیں اپنے اسلام پر شرمانا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیں اسلام پر اتنا بھی ایمان نہیں جتنا ۱۹۱۷ء میں روس کے کمیونسٹوں کو کمیونزم پر تھا۔ وہ لوگ جب جنگ سے نکلے تھے تو ملک کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی، سارا نظام درہم برہم تھا، ملک چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا، فوج شکست خوردہ اور صنعت و حرفت خستہ حال تھی، اور یہ بھی واضح تھا کہ اشتراکی نظام کے قیام کے ساتھ ہی دنیا کی ساری سرمایہ دار طاقتیں اس کے خلاف ہو جائیں گی۔ لیکن ان ساری باتوں کے علی الرغم انہوں نے یہ نظام قائم کیا اور اب ہر سرمایہ دار

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com

www.iqbalkalmati.blogspot.com

طاقت اس سے لرزہ براندام ہے۔ ہمیں دوسروں کی طرف نہیں، اپنی طرف دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے مسلمان ہونے کا تقاضا کیا ہے۔ ہمیں اس تقاضے کو پورا کرنا چاہیئے۔ دنیا کی رائے عام اسلام اور مسلمانوں کے متعلق خراب ہوتی ہی اس وجہ سے ہے کہ ہم نے اسلام کو میدان عمل سے باہر رکھ کر اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے، چنانچہ اسلام بھی مضحکہ بن گیا اور مسلمان بھی۔ لیکن اب اگر ہم اسلام کو میدان عمل میں لاکر اسے پورا اقتدار دیدیں تو دنیا کی رائے عام مستقل طور پر اسلام کے بارے میں بھی درست ہوجائے گی اور ہم مسلمانوں کے بارے میں بھی! ہوسکتا ہے کہ لوگ ایک دو سال تک غلط فہمیوں میں مبتلا رہیں، لیکن دو چار سال کے بعد وہ ہمارے متعلق اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے اور یہ تسلیم کریں گے کہ یہ لوگ تو ہمارے رہنما بننے کے قابل ہیں، کیونکہ ان کے پاس وہ چیز ہے جس کی بنیاد پر ایک جہانی ریاست (World State) بن سکتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے تجربے کو دیکھ کر اُن کے دل آپ کے سامنے جھکنے نہ شروع ہوجائیں۔

"مُلاؤں" کی حکومت کا شُبہ

ایک عذر تو یہ بھی تراشا گیا ہے کہ اسلامی حکومت تو "مُلاؤں" کی حکومت ہوگی اور مُلا دنیا کے معاملات کو کیا جانیں۔ میں اس عذر کے گھڑنے والوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم آپ کے اس "بادبان" سے بھی ہوا نکال چکے ہیں۔ پاکستان میں اب جو لوگ اسلامی نظام کے مطالبے کو لے کر اُٹھے ہیں وہ "مُلا" نہیں ہیں بلکہ آپ کی طرح دنیا کے معاملات کو بھی خوب سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ قرآن وحدیث کو بھی! ——— اسلامی حکومت کے مطالبے کو لانیوالے لوگ جدید فلسفہ وسیاست کو بھی آپ سے بہتر طور پر سمجھنے والے ہیں اور قرآن کے فلسفہ دیاست سے بھی کورے نہیں ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اسلامی حکومت اگر قائم ہوگی تو وہ اپنے چلانے کیلیے ایسے ہی آدمی طلب کریگی جو موجودہ دور میں اسلامی اصول پر کام کرسکیں۔ ہمیں ملک کے باشندوں اور رائے دہندوں کو بتانا پڑے گا اور اس بارے میں ان کی ذہنی تربیت کرنی ہوگی کہ وہ اسلامی حکومت کے لیے کیسے آدمی فراہم کریں۔ اگر کہیں مندر کے انتظام کیلیے آدمی مطلوب ہوں تو لوگ ویسے ہی آدمی تلاش کرکے دیں گے، اور اگر مسجد کے انتظام کیلیے کارکن درکار ہوں تو ویسے ہی آدمی ان کے سامنے آئیں گے، اور ایک بنک کا نظام چلانا ہو تو اس کی صلاحیت رکھنے والے آدمی ہی چُنے جائیں گے۔ اسی طرح اگر اسلامی حکومت کو چلانے کے لیے کارکنوں کی

www.iqbalkalmati.blogspot.com

ضرورت ہوگی تو رائے عام اس کام کی صحیح صلاحیتیں رکھنے والوں کو چھانٹ کر آگے لانے لگے گی یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں اسلامی نظام کو چلا سکنے والے کارکنوں کا بالکل قحط ہے۔ ایسے آدمی موجود ہیں اور پبلک ہی کے اندر نہیں، بلکہ خود آپ کی حکومت کے موجودہ پرسونل میں بھی اس معیار کا ایک بڑا طبقہ موجود ہے۔

غیر اسلامی نظام میں اسلامی قانون

پھر یہ کہا جاتا ہے کہ کیوں نہ نظام تو غیر اسلامی رکھا جائے اور عدالتی قانون اسلام کا جاری کر دیا جائے؟ میں کہتا ہوں کہ پھر کیوں نہ ایک سکھ کو مسجد کا امام بنا دیا جائے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ریاست تو اپنے آپ کو لامذہب سمجھے اور قانون وہ مذہب کا جاری کرے۔ مجھے اس رائے کے پیش کرنے والوں کی عقل پر رحم آتا ہے۔ ایک غیر اسلامی نظام کے ڈھانچے میں اسلامی قانون کا صحیح طور پر نشوونما پانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اسلامی قانون کا قیام و اجرا نظام تعلیم اور معاشرتی اصولوں کو اسلام کے مطابق ڈھالے بغیر ہرگز نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ اسلام کا قانونی نظام اس کے معاشی اور معاشرتی نظاموں سے الگ ہو کر اور کسی دوسرے نظام کا جزء بن کر نہ تو پروان چڑھ سکتا ہے اور نہ وہ برگ و بار لا سکتا ہے جو اس سے مطلوب ہیں۔ یہ حرکت تو بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے آم کی ایک ٹہنی کو کیکر کے تنے پر پیوند کر دیا جائے۔ اس صورت میں اس ٹہنی سے آم ملنا تو کجا، دیر تک اس کا سرسبز رہنا بھی مشکل ہے۔ یہ پہلی باتیں اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جو اس ملک کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ آپ اگر اس ملک کو اسلام کے اصولوں پر چلانا چاہتے ہیں تو پھر اس کا دستور لازماً اسلامی ہونا چاہیے۔

ان معذرات کے علاوہ اگر کچھ اور عذر بھی ہوں تو ہم ان کو بھی سننا چاہتے ہیں اور ان کے جواب میں جو دلائل ہمارے پاس ہوں گے ہم انہیں پیش کر کے ذہنوں کو صاف کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ ہماری خواہش یہ ہے کہ اس ملک کی رائے عام کو پوری طرح مطمئن کریں اور عوام الناس خوب اچھی طرح جان لیں کہ ان کی فلاح اسی شے میں ہے کہ ان کے ملک میں اسلامی نظام قائم ہو۔

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں : www.iqbalkalmati.blogspot.com